کلیاتِ پریم چند

4



مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

4

چوگانِ ہستی

مرتبہ

مدن گوپال



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

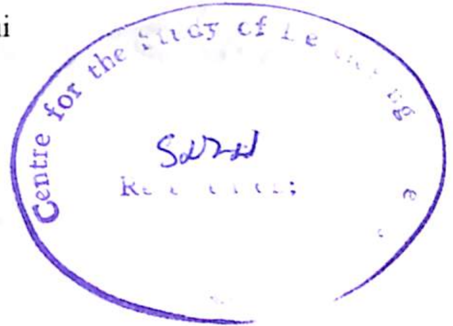
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Premchand-4

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui



سنہ اشاعت : جولائی 2002 شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/227

سلسلہ مطبوعات : 998

کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا



ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397 پہاڑی املی، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرعام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ''کلیات پریم چند'' کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

''کلیاتِ پریم چند'' میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

''کلیات پریم چند'' کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیرمقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ "کلیات پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور پروجکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

'بازارِ حسن' کے ہندی اڈیشن 'سیواسدن' اور 'گوشۂ عافیت' کے ہندی اڈیشن 'پریم آشرم' دونوں ہی ناولوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی جس کے باعث پریم چند کی بڑی شہرت ہوئی۔ 12 جولائی 1922 کو انھوں نے دیانرائن نگم کو لکھا کہ "ناول (پریم آشرم) ایک ہزار نکل گیا۔" تین ہفتے بعد : "1200 نکل گیا اب دوسرے اڈیشن کی بات چل رہی ہے" اسی خط میں لکھا: "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ناول اور اچھا لکھ کر میں خانہ نشین ہو سکتا ہوں۔ سب ضرورت گھر بیٹھے مل جائے گی۔" ناول تھا 'چوگانِ ہستی' جو اردو میں لکھا گیا پریم چند کا آخری ناول تھا۔ اس ناول کے بعد سبھی ناول پہلے ہندی میں لکھے گئے اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ 'چوگانِ ہستی' کی تصنیف اکتوبر 1922 کو شروع ہوئی۔ ان دنوں پریم چند کا سرسوتی پریس قائم کیا جا رہا تھا اور لمہی میں مکان تعمیر ہو رہا تھا اور وہ نئے ناول لکھنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ناول 1 اپریل 1924 کو ختم ہوا یعنی اٹھارہ مہینے میں مکمل ہوا۔ لکھنے میں اتنے محو تھے کہ بقول مہتاب رائے "ایک رات جب وہ گھر لوٹے تو دیکھا کہ پریم چند لکھنے میں مصروف تھے۔ دروازہ کھولا اور پھر لکھنے لگ گئے۔ اگلے دن صبح پریم چند نے مہتاب رائے سے کہا "کل رات تم بہت دیر سے آئے تھے۔ مہتاب رائے نے کہا "نہیں تو شاید دس بجے تھے۔" تب پریم چند نے کہا "اس کا مطلب ہے میں ساری رات لکھتا رہا۔" (گھر میں گھڑی نہیں تھی)۔ ہندی ترجمے کے بارے میں دلارے لال بھارگو کے اڈیٹر شیو پوجن سہائے نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے مسودہ دیکھا تو حیرت ہوئی۔ لفظ

موتی کی طرح تھے۔ کاٹ چھانٹ نہیں، روانی اتنی کہ وہ پڑھتے رہے۔ پھر دھیان آیا
اسے مرتب کرنا ہے۔

رائے کرشن داس نے پریم چند کو معاوضے کے طور پر 4500 روپے دینے کی پیش کش کی۔ مگر ادائیگی کتاب کی بکری کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ پریم چند نے کتاب دلارے لال بھارگو کو دی، جنھوں نے پانچ ہزار کاپیوں کے پہلے اڈیشن کے لیے 1800 روپے منظور کیا۔ ہندی ناول 'رنگ بھومی' 1925 میں شائع ہوا۔ دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ اپنے ایک خط میں پریم چند نے لکھا۔ "یہ کتاب ان کی سب تصانیف میں بہتر ہے۔" اس ناول کے اردو اڈیشن کی بات چلی۔ 'چوگان ہستی' کے پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں پریم چند لکھتے ہیں: 'رنگ بھومی' پہلے اردو میں ہی لکھی گئی تھی۔ مگر اس کا اردو اڈیشن، ہندی اڈیشن (رنگ بھومی) کے شائع ہو جانے کے بعد تیسرے سال شائع ہوا۔ ہندی اڈیشن تیار کرتے وقت اردو مسودے میں اتنی ترمیم ہوگئی تھی کہ وہ اس حالت میں پریس کے قابل نہ تھا۔ اس کے علاوہ کئی ابواب ہندی میں اور بڑھا دیے گئے۔ انھیں دوبارہ اردو مسودہ میں شامل کرنا ضروری تھا۔ اس لیے سارا اردو مسودہ ہندی مسودے کے مطابق کر کے دوبارہ لکھنا پڑا۔ میں اپنے کرم فرما منشی اقبال ورما سحر ہتگامی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس بار کو اپنے ذمے لیا اور کتاب کو اس صورت میں تیار کرایا جس میں وہ آج آپ کے سامنے حاضر ہے۔ ہندی میں اس کتاب کا اڈیشن پانچ ہزار جلدوں کا نکالا گیا تھا وہ اب قریب قرب ختم ہوگیا ہے۔ مراٹھی اڈیشن بھی شائع ہوگیا ہے جس کا نام ہے جیاچارہ باجار۔ میں اپنے کرم فرما سید حمید علی صاحب اور عزیز دوست سعید امتیاز علی کی خلوص عزمی اور قدر دانی کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے میری محنت ٹھکانے لگا دی۔"

'چوگان ہستی' کی اشاعت لاہور کے دارالاشاعت سے ستمبر 1928 میں ہوئی۔ ترجمہ کے معاوضہ کے بارے میں پریم چند نے منشی دیانرائن نگم کو لکھا کہ "حضرت سحر، ہندی کے ہر صفحہ کے لیے آٹھ آنہ مانگ رہے ہیں انھیں چار آنے لینے چاہئیں۔ اگر مجھے اس ناول کے لیے تین سو دلوا دیں تو میں رضامند ہوں گا باقی خود لے لیں۔ اگر

مجھے چھ سو مل جائیں تو میں قبول کر لوں گا۔" آخر فیصلہ دو سو روپیہ پر ہوا۔

'چوگان ہستی' کے کرداروں کے بارے میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ جو قارئین کو کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوں گی۔ اول کردار سورداس کے بارے میں۔ جب پریم چند کے سوتیلے بھائی مہتاب رائے لمہی کے راستہ میں راجا جمنی مادھو پرساد کی حویلی کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ پریم چند اس حویلی میں کئی بار گئے تھے۔ اس کو لے کر انھوں نے ناول میں ونے کے گھر کی تفصیل دی۔ لمہی سے قبل ایک چھوٹی سی پلیا تھی، جہاں ایک بھکاری بیٹھا کرتا تھا جو لوگوں کے پیچھے پیچھے بھاگ کر ایک ایک پیسہ کی رٹ لگایا کرتا تھا۔ اس بھکاری کو لے کر بھیّا نے آگے چل کر سورداس کے کردار کی تخلیق کی لمہی میں وہ کوٹھری دکھائی جہاں پریم چند پیدا ہوئے تھے۔ (یہ مکان اب مسمار کر دیا گیا ہے) سورداس کے کردار کے بارے میں گورکھپور کے بدھی ساگر نے مجھے 1954 میں لکھا تھا کہ 1919-1918 میں جب وہ گورکھپور کچہری میں ملازم تھے اور پریم چند گورمنٹ ہائی اسکول میں ماسٹر تھے۔ پریم چند میرے ہمسائے میں ایک اندھے بھکاری سے ملتے تھے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے مذاق بھی اڑاتے تھے۔ جسمانی طور پر سورداس کی تخلیق لمہی اور گورکھپور کے نابینا بھکاری کے بنا پر تھی۔

پریم چند نے 23 اپریل 1923 کو دیانرائن نگم کو لکھا: "بچے کی حسرت ناک موت ایک دل شکن حادثہ ہے اور اسے برداشت کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو یہی ہے کہ دنیا کو ایک تماشاگاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے میدان میں وہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھولتا نہیں ہار سے روتا نہیں۔ جیتے تب بھی کھیلتا ہے ہارے تب بھی کھیلتا ہے۔ جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہارے نہیں۔ ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے۔ ہم سب کے سب کھلاڑی ہیں۔ مگر کھیلنا نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی ایک گول جیتا تو ہپ ہرے ہپ ہرے کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اچھلنے لگیں بھول گئے کہ یہ جیت دائمی نہیں۔ ممکن ہے کہ دوسری بار ہار ہو...... کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعہ ہے۔ جو کھیل میں شرکت کرتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہار جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی۔ اس لیے اسے ہار

سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ اس کا کام تو صرف کھیلنا ہے خوب دل لگا کر کھیلنا خوب جی توڑ کر کھیلنا۔ ہارنے کے بعد پٹخنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہیے اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہیے کہ ایک بار اور۔"

سورداس مخاطب ہوتا ہے۔

"دنیا میں کون ہے جو کہے گا میں گنگا جل ہوں جب بڑے بڑے سادھو مہاتما مایاموہ میں پھنسے ہوئے ہیں تو ہماری تمھاری کیا بات ہے۔ ہماری بڑی بھول یہی ہے کہ کھیل کو کھیل کی طرح نہیں کھیلتے کھیل میں کوئی دھاندلی کرکے جیت بھی جائے تو کیا ہاتھ آئے گا۔ کھیلنا تو اس طرح چاہیے کہ نگاہ جیت پر رہے۔ پر ہار سے گھبرائے نہیں ایمان کو نہ چھوڑے، جیت کر اتنا نہ اترائے کہ اب کبھی ہاریں گے ہی نہیں، یہ ہار جیت تو زندگی کے ساتھ ہوتی ہے۔"

پریم چند نے ناول کا پلاٹ انگریزی میں بنایا تھا جو یہاں درج کیا جارہا ہے۔

I. Prabhu Sewak turns a staunch nationalist. Extremely bold and desperate, revolutionary tendencies.

II. Vinay and Sofia living quietly in a cottage in hilly village. Vinay is chivalrous and full of love. He is devoted to Sofia. As he has again to be united. She does not consent, once or twice when he approaches her. She snubs him. She says she will not have him unless given by the Rani and Kuar. (All of a sudd- کٹا ہوا ہے) Then they read in newspapers the changing attitude of Kuar Sahib. The moment is at stake. Nobody to take care. (Vinay کٹا ہوا ہے) Sofia then comes out with the intention of preserving the moment and if possible to win over the Rani.

III. She comes directly to Rani. A Scene. Rani obdurate, turns his face. She pleading-at last Rani has brought accord. Vinay is (glad کٹا ہوا ہے) beyond himself with joy to receive her letter of welcome, written by the Rani.

IV. Mr. John Sewak has succeeded in acquiring the land. The struggle.

V. Tahir Ali comes out of his jail and is broken hearted to see the plight of his family. (He goes to Mahir Ali- کٹا ہوا ہے) Mahir does not come even to see him. He falls ill and dies of grief.

VI. Ghisu, Mithua and Vidayadhar all turn bad characters. They one night try to violate Radhia. She raises an alarm. Surdas at once arrives on the spot and takes hold of two of them. Mithua makes his escaspe. X (پڑھا نہیں گیا) Surdas's true evidence. Bajrangi glad to hear the judgement, but Jagdhar is enraged and vows revenge. Bhairo saves him. Then struggle is in the end over. Indradatta now takes the field. (Surdas does not continue کٹا ہوا ہے).

VII. Prabhu Sewak and John Sewak United. The scheme is abolished. The mill is running. P. Das goes away again to Europe. While J. Sewak is grinding his wheel with desperate and pitiable patience.

VIII. Nayak Ram dreams a drama that Vinay has jumped and he jumps after him. He broke his knee part, takes much time to restore. Then he comes to his home. Sees, everything in ruins.

IX. The struggle begins. In the meantime marriage between Sofia and Vinay is also settled. Dates are fixed. Vinay now seeks excuses to keep away from the struggle for fear of imprisonment and death. Sophia is glad to have him by her side (but she کٹا ہوا ہے). She tells him to remain with Surdas. She does not quite like Vinay's cowardice. All volunteers are ready to join in the struggle but Vinay's cold heartedness. On the last day there...in a stir, some violence is feared. Police and Military came in the town and spot. The next day she herself goes the scene. Vinay

accompanies her. They watch the scene. People are flocking, brick-bats are thrown. Vinay tries to conduct Sophia safely home. Firing is ordered. She goes Surdas falling on the ground. He is overcome by emotion and runs towards her. Vinay is ashamed. He comes forward to pacify the mob but is hooted. In this agony, at his unpopularity, at his weakness, at his moral frustration he is over come by a sudden grief and remorse. He stabs himself to death.

Police and military succeeded in driving away the mob.

X. Sophia leads Surdas to hospital and attends upon him. Daily thousands come to have a look of Surdas. Bajrangi and others come. Rani also comes and showers him with flowers. (Six کٹا ہوا ہے) Ten days pass. Surdas is happy and smiling. He never complains. Then Sophia all of a sudden comes to know of Vinay's self-sacrifice. She is much unnerved. She (tries to کٹا ہوا ہے) respect at her whole life. When Surdas passes away the whole town accompanied. Raja (دو لفظ غیر واضح) are the only defaulters. Sophia returns to Rani and is warmly received. Rani drops a tear (but never loses heart کٹا ہوا ہے) and weary of life, hating this life-losing her son, losing her daughter, losing her husband, Rani becomes mad. Her brain is turned. She leaves home and is never heard of Sophia........(باقی غیر واضح).

'چوگان ہستی' بہت مقبول ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ونیٹی فیر کا چربہ اتارا گیا ہے۔ (اور گوشہ عافیت کی بنا پر) ہندی رسائل میں خوب بحث مباحثہ ہوا۔ پریم چند نے سحر ہنگامی کو ایک خط لکھا۔ ''آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے اور اوپادھیاجی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اوٹ پٹانگ باتیں لکھ کر مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ 'رنگ بھومی' (چوگان ہستی) اور ونیٹی فیر

میں ذرہ بھی مناسبت نہیں ہے اور 'پریم آشرم' (گوشہ عافیت) کو ریزیکشن کے مماثل بتلانا تو حد درجہ کی بے ہودگی ہے میں نے آج تک ریزیکشن پڑھا ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس کی تعریف بہت سن چکا ہوں ایسی مماثلت جسے اوپادھیائے جی دکھاتے ہیں قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ونیٹی فیر میں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے۔ ان کے وجود کا منشا کیا ہے۔ املیا کو آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں حالانکہ صوفیہ کا اصل اینی بست ہیں۔ اینی بست ایک انگریز خاتون تھیں جنھوں نے آزادیٔ ہند کی تحریک میں اہم رول ادا کیا تھا اور نیشنل گانگریس کی صدر بھی چنی گئی تھیں۔ مگر بیسویں صدی میں 'چوگان ہستی' کی پہلی اشاعت سے قبل اور بعد کے پس منظر کے اس روشنی میں امید کرتا ہوں کہ اکیسویں صدی کے قارئین بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

مدن گوپال

حصہ اول

(1)

شہر امیروں کے رہنے اور خرید و فروخت کرنے کی جگہ ہے اور دامنِ شہر ان کے سیر و تفریح کا مقام۔ وسط شہر میں ان کے لڑکوں کے مدرسے اور ان کے مقدمہ بازیوں کے وہ اکھاڑے ہوتے ہیں جہاں انصاف کے بہانے غریبوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شہر کے آس پاس غریبوں کی بستیاں ہوتی ہیں۔ بنارس میں پانڈے پور اسی قسم کی آبادی ہے۔ وہاں نہ شہر کے لیمپوں کی شعاعیں پہنچتی ہیں نہ شہری چھڑکاؤ کی چھینٹیں اور نہ آب رسانی کے نلوں کی روانیاں۔ لب سڑک چند چھوٹے چھوٹے بنیوں اور حلوائیوں کی دکانیں ہیں جن کے عقب میں کئی یکہ بان، گاڑی والے، گویے اور مزدور رہتے ہیں۔ دوچار گھر بگڑے ہوئے سفید پوشوں کے بھی ہیں جن کی خستہ حالی نے انھیں شہر سے خارج کردیا ہے۔ یہیں ایک غریب اندھا چمار بھی رہتا ہے جسے لوگ سورداس کہتے ہیں۔ ہندستان میں اندھے آدمیوں کے لیے نہ نام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کام کی۔ سورداس ان کا بنابنایا نام ہے، اور بھیک مانگنا ان کا بنا بنایا کام۔ ان کے اوصاف و عادات بھی مشہور زمانہ ہیں۔ گانے بجانے سے ایک خاص دلچسپی، دل میں ایک خاص محبت، روحانیت اور بھگتی سے ایک رغبت، ان کے فطرتی اطوار ہیں۔ نگاہِ ظاہر بند اور نگاہ باطن کھلی ہوئی۔

سورداس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا۔ جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لیے بنایا تھا۔ وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آبیٹھتا اور راہ گیروں کی جان کی خیر مناتا۔ ''داتا بھگوان تمھارا کلیان کریں۔'' یہی اس کی صدا تھی اور اسی کو وہ بار بار دہراتا تھا۔ شاید وہ اسے مسافروں کے تالیفِ قلوب کا منتر سمجھتا تھا۔ پاپیادہ مسافروں کو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن جب کوئی یکہ گزرتا تو وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگتا اور بگھیوں کے ساتھ تو گویا اس کے پیروں میں پر لگ جاتے تھے۔ لیکن موٹروں کو وہ اپنے نیک ارادوں کے پرے سمجھتا تھا۔ تجربہ نے اس کو بتلا دیا تھا کہ ہوا گاڑیاں کسی کی باتیں نہیں سنتیں۔ صبح سے شام تک اس کا تمام

حصہ اول

(1)

شہر امیروں کے رہنے اور خرید و فروخت کرنے کی جگہ ہے اور دامنِ شہر ان کے سیر وتفریح کا مقام۔ وسط شہر میں ان کے لڑکوں کے مدرسے اور ان کے مقدمہ بازیوں کے وہ اکھاڑے ہوتے ہیں جہاں انصاف کے بہانے غریبوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شہر کے آس پاس غریبوں کی بستیاں ہوتی ہیں۔ بنارس میں پانڈے پور اسی قسم کی آبادی ہے۔ وہاں نہ شہر کے لیمپوں کی شعاعیں پہنچتی ہیں نہ شہری چھڑکاؤ کی چھینٹیں اور نہ آب رسانی کے نلوں کی روانیاں۔ لب سڑک چند چھوٹے چھوٹے بنیوں اور حلوائیوں کی دکانیں ہیں جن کے عقب میں کئی یکہ بان، گاڑی والے، گویے اور مزدور رہتے ہیں۔ دوچار گھر بگڑے ہوئے سفید پوشوں کے بھی ہیں جن کی خستہ حالی نے انھیں شہر سے خارج کردیا ہے۔ یہیں ایک غریب اندھا چمار بھی رہتا ہے جسے لوگ سورداس کہتے ہیں۔ ہندستان میں اندھے آدمیوں کے لیے نہ نام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کام کی۔ سورداس ان کا بنابنایا نام ہے، اور بھیک مانگنا ان کا بنا بنایا کام۔ ان کے اوصاف و عادات بھی مشہور زمانہ ہیں۔ گانے بجانے سے ایک خاص دلچسپی، دل میں ایک خاص محبت، روحانیت اور بھگتی سے ایک رغبت، ان کے فطرتی اطوار ہیں۔ نگاہِ ظاہر بند اور نگاہ باطن کھلی ہوئی۔

سورداس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا۔ جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لیے بنایا تھا۔ وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آبیٹھتا اور راہ گیروں کی جان کی خیر مناتا۔ ”داتا بھگوان تمھارا کلیان کریں۔“ یہی اس کی صدا تھی اور اسی کو وہ بار بار دہراتا تھا۔ شاید وہ اسے مسافروں کے تالیفِ قلوب کا منتر سمجھتا تھا۔ پاپیادہ مسافروں کو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن جب کوئی یکہ گزرتا تو وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگتا اور بگھیوں کے ساتھ تو گویا اس کے پیروں میں پر لگ جاتے تھے۔ لیکن موٹروں کو وہ اپنے نیک ارادوں کے پرے سمجھتا تھا۔ تجربہ نے اس کو بتلا دیا تھا کہ ہوا گاڑیاں کسی کی باتیں نہیں سنتیں۔ صبح سے شام تک اس کا تمام

وقت دعائے خیر ہی میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ ماگھ پوس کے ابرو باد اور بیساکھ جیٹھ کی سوز و تپش میں بھی ناغہ نہ ہوتا تھا۔

کارتک کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خوشگوار خنکی آگئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورداس اپنی جگہ پر بت کی طرح بیٹھا ہوا کسی یکہ یا بگھی کی صدائے خوش آئندہ پر کان لگائے ہوئے تھا، سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے نیچے گاڑی بانوں نے گاڑیاں ٹھہرا دیں اور بیل کھول دیے۔ بچھائیں بیل ٹاٹ کے ٹکڑوں پر کھلی اور بھوسہ کھانے لگے۔ گاڑے بانوں نے بھی اُپلے جلا دیے۔ کوئی چادر پر آٹا گوندھتا تھا۔ کوئی باٹیاں بناکر اوپلوں پر سینکتا تھا۔ کسی کو برتنوں کی ضرورت نہ تھی۔ سالن کے لیے گھوئیوں کا بھرتہ کافی تھا اور اس بے سروسامانی پر بھی انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ بیٹھے ہوئے باٹیاں سینکتے اور گاتے جاتے تھے۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں ساز کا کام دے رہی تھیں۔ گنیش گاڑی بان نے سورداس سے پوچھا "کیوں بھگت! بیاہ کروگے؟" سورداس نے گردن ہلاکر کہا "کہیں ہے ڈول؟"

گنیش : ہاں ہے کیوں نہیں؟ایک گاؤں میں ایک سوریا ہے۔ تمھاری ہی جات برادری کی ہے۔ کہو تو بات چیت پکی کروں۔ تمھاری بارات میں مزہ سے دو دن باٹیاں لگیں۔

سوداس : کوئی ایسی جگہ بتائیے جہاں دھن ملے۔ اور اس بھیک منگائی سے پیچھا چھوٹے۔ ابھی اپنے ہی پیٹ کی فکر ہے۔ تب ایک اندھی کی اور فکر ہو جائے گی۔ ایسی بیڑی پیر میں نہیں ڈالتا۔ بیڑی ہی ہے تو سونے کی تو ہو!

گنیش : لاکھ روپے کی مہریانہ پاجاؤ گے۔ رات کو تمھارے پاؤں دبائے گی۔ سر میں تیل ڈالے گی تو ایک بار پھر جوان ہو جاؤ گے۔ یہ ہڈیاں نہ دکھائی دیں گی۔

سورداس : تو روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے گا۔ یہ ہڈیاں دیکھ کر ہی تو لوگوں کو دیا آتی ہے۔ موٹے آدمیوں کو بھیک کون دیتا ہے الٹا اور طعنے ملتے ہیں؟

گنیش : اجی نہیں۔ وہ تمھاری سیوا بھی کرے گی اور تمھیں بھوجن بھی دے گی۔ تھچن ساہ کے یہاں تاہن جھاڑے گی تو چار آنے روز پائے گی۔

سورداس : تب تو اور درگت ہو گی۔ گھر والی کی کمائی کھاکر کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا۔

دفعتاً ایک فٹن آتی ہوئی سنائی دی۔ سورداس لاٹھی ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی اس کی کمائی کا وقت تھا۔ اسی وقت شہر کے رئیس اور مہاجن ہوا خوری کو آتے تھے۔ فٹن جوں ہی سامنے آئی۔ سورداس اس کے پیچھے ''داتا بھگوان تمھارا کلیان کرے'' کہتا ہوا دوڑا۔

فٹن میں جائے صدر پر مسٹر جان سیوک اور ان کی اہلیہ مسز جان سیوک بیٹھی ہوئی تھیں۔ مقابل میں ان کا جوان لڑکا پربھوسیوک اور اس کی چھوٹی بہن مس صوفیہ سیوک تھی۔ جان سیوک دوہرے بدن کے گورے چٹے آدمی تھے۔ بڑھاپے میں بھی چہرہ سرخ تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہوگئے تھے۔ وضع انگریزی تھی جو ان پر خوب موزوں تھی۔ چہرہ پر غرور اور خودداری کا رنگ جھلکتا تھا۔ مسز سیوک کو وقت کے ہاتھوں نے زیادہ ستایا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیںاور اس سے ان کی تنگ دلی کا اظہار ہوتا تھا جس کو سنہری عینک بھی نہ چھپا سکتی تھی۔ پربھوسیوک کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ چھریرا اور اکہرا بدن، زرد رو، آنکھوں پر عینک اور چہرہ پر متانت اور غور و خوض کا گہر رنگ نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے ایک نورترحم نمودار تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ حسن قدرت سے لطف اٹھا رہا ہے۔ مس صوفیہ بڑی بڑی آنکھوں والی، شرمیلی نازنین تھی۔ نازک اندام اس قدر گویا عناصر کے بجائے پھولوں سے وجود پذیر ہوتی تھی۔ چہرہ ایسا موزوں گویا شرم و انکسار کا مجسمہ تھا۔ وہ سراپا روح تھی۔ مادیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سورداس فٹن کے پیچھے دوڑتا چلا آتا تھا۔ اتنی دور تک اور تیزی سے کوئی مشتاق کھلاڑی بھی نہ دوڑ سکتا تھا۔ مسز سیوک نے ناک سکوڑ کر کہا ''اس کم بخت کی چیخ نے تو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے۔ کیا یہ دوڑتا ہی چلا جائے گا؟

مسٹر جان سیوک بولے ''اس ملک کے سر سے یہ بلا نہ جانے کب جائے گی؟ جس ملک میں بھیک مانگنا بے شرمی میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اونچی سے اونچی ذاتیں بھی اسے کسب معاش کا ذریعہ بنائیں۔ جہاں مہاتماؤں کے گزربسر کا بھی صرف یہی ایک سہارا ہو۔ اس ملک کی نجات کے لیے ابھی صدیوں کی مدت درکار ہے۔

پربھوسیوک : یہاں یہ رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ زمانہ سلف میں راجاؤں کے

بھی درس گاہوں میں پڑھتے وقت بھیک مانگ کر اپنی نیز اپنے استادوں کی پرورش کرتے تھے۔ علماء و فقرا کے لیے بھی یہ کوئی بے عزتی کی بات نہ تھی۔ مگر وہ لوگ مکروہات دنیا سے الگ ہوکر تلاش حق میں مصروف رہتے تھے۔ اس رواج کو اب بیجا طریقہ پر برتا جارہا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ کتنے ہی برہمن جو زمیندار ہیں گھر سے خالی ہاتھ مقدمہ بازی کرنے چلتے ہیں۔ دن بھر کبھی لڑکی کے بیاہ کے حیلہ سے کبھی کسی عزیز کی موت کے بہانہ سے بھیک مانگتے ہیں۔ شام کو اناج بیچ کر پیسے کھرے کرلیتے ہیں۔ پیسے جلد روپے بن جاتے ہیں، اور بالآخر وہ وکیلوں اور کچہری کے عملوں کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں۔

مسز سیوک : سائیس! اس اندھے سے کہہ دے۔ بھاگ جائے پیسے نہیں ہیں۔

مس صوفیہ : نہیں ماما! پیسے ہوں تو دے دیجیے۔ بے چارہ نصف میل سے دوڑا چلا آرہا ہے۔ مایوس ہوجائے گا۔ اس کی آتما کو کتنا دکھ ہوگا۔

مسز سیوک : تو یہاں اس سے کس نے دوڑنے کے لیے کہا تھا؟ اس کے پیروں میں درد ہوتا ہوگا۔

صوفیہ : نہیں۔ اچھی ماما! کچھ دے دیجیے۔ بے چارہ کتنا ہانپ رہا ہے۔

پربھو سیوک نے جیب سے کیس نکالا۔ مگر تانبے یا نکل کا کوئی ٹکڑا نہ نکلا اور چاندی کا کوئی سکہ دینے میں ماں کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ بہن سے بولا ”صوفی! افسوس ہے پیسے نہیں نکلے۔ سائیس! اندھے سے کہہ دو۔ آہستہ آہستہ آگے والے گودام تک چلا آئے۔ وہاں شاید پیسے مل جائیں۔“

مگر سورداس کو اتنا صبر کہاں؟ جانتا تھا۔ گودام پر کوئی میرے لیے کھڑا نہ رہے گا۔ کہیں گاڑی آگے بڑھ گئی تو اتنی محنت بیکار ہوجائے گی۔ اس نے گاڑی کا پیچھا نہ چھوڑا اور پورے ایک میل تک دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گودام آگیا اور فٹن رکی۔ سب لوگ اتر پڑے۔ سورداس بھی ایک طرف کھڑا ہوگیا جیسے درختوں کے بیچ میں ٹھنڈ، ہانپتے ہانپتے بے دم ہورہا تھا۔

مسٹر جان سیوک نے یہاں چمڑے کی آڑھت کھول رکھی تھی۔ طاہر علی نامی ایک شخص ان کا ایجنٹ تھا۔ وہ برآمدہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر

سلام کیا۔
جان سیوک نے پوچھا "کہیے خاں صاحب! چمڑے کی آمدنی کیسی ہے؟"
طاہر علی : حضور! ابھی جیسی ہونی چاہیے ویسی تو نہیں ہے مگر امید ہے کہ آئندہ اچھی ہو جائے۔
جان سیوک : کچھ دوڑدھوپ کیجیے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں چکر لگایا کیجیے۔ میرا ارادہ ہے کہ میونسپلٹی کے چیئرمین صاحب سے مل کر یہاں ایک شراب اور تاڑی کی دکان کھلوا دوں۔ اس وقت آس پاس کے چمار یہاں روز آئیں گے۔ اور آپ کو ان سے ربط ضبط پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ آج کل ان چالوں کے بغیر کسی کاروبار کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ مجھی کو دیکھیے۔ ایسا شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا کہ میں شہر کے دو چار بڑے آدمیوں سے ملاقات نہ کرتا ہوں۔ دس ہزار کی بھی ایک پالیسی بن گئی تو ہفتوں کی دوا دوش کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔
طاہر علی : حضور! مجھے خود فکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کاروبار میں مالک کو چار پیسے کا نفع نہ ہوگا تو وہ اس کام کو کرے گا کیوں؟ مگر حضور نے میری جو تنخواہ مقرر کی ہے۔ اس میں گزر نہیں ہوتا۔ گھر کے لیے تو بیس کا اناج بھی کافی نہیں ہوتا اور سب ضروریات اس کے علاوہ۔ ابھی کہنے کی تو ہمت نہیں پڑتی مگر حضور سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟
جان سیوک : کچھ دن کام کیجیے۔ ترقی ہوجائے گی۔ کہاں ہے آپ کا حساب کتاب؟ لائیے! دیکھوں۔
یہ کہتے ہوئے مسٹر جان سیوک گودام کے برآمدے میں ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مسز سیوک ایک کرسی پر متمکن ہوئیں۔ طاہر علی نے بہی لاکر سامنے رکھ دی۔ صاحب اس کا معائنہ کرنے لگے۔ دوچار ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ذرا بگڑ کر بولے "ابھی آپ کو حساب کتاب رکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ ترقی کردیجیے۔ حساب بالکل آئینہ ہونا چاہیے۔ یہاں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کتنا مال خریدا اور کتنا روانہ کیا۔ خریدار کو فی کھال ایک آنہ دستوری ملتی ہے۔ وہ کہیں درج نہیں ہے۔

طاہر علی : کیا اسے بھی درج کروں؟
جان سیوک : کیوں نہیں؟ کیا وہ بھی میری ہی آمدنی نہیں ہے؟
طاہر علی : میں نے تو سمجھا تھا یہ مجھ خادم کا حق ہے۔
جان سیوک : ہرگز نہیں! میں آپ پر غبن کا مقدمہ دائر کر سکتا ہوں (تیور بدل کر) ملازموں کا حق ہے! خوب۔ آپ کا حق ہے تنخواہ۔ اس کے سوا آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔
طاہر علی : حضور! اب آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔
جان سیوک : اب تک اس مد میں آپ نے جو رقم وصول کی ہے وہ آمدنی میں دکھائیے۔ حساب کتاب کے معاملہ میں میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔
طاہر علی : حضور! بہت قلیل رقم ہوگی۔
جان سیوک : کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک ہی پائی سہی۔ یہ سب آپ کو بھرنی پڑے گی۔ ابھی وہ رقم قلیل ہے۔ کچھ دنوں میں اس کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس رقم سے میں یہاں ایک سنڈے اسکول کھول سکتا ہوں۔ سمجھ گئے۔ میم صاحب کی یہ بڑی زبردست خواہش ہے۔ اچھا چلیے۔ وہ زمین کہاں ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا؟

گودام کے عقب میں ایک وسیع میدان تھا۔ یہاں قرب و جوار کے مویشی چرنے جایا کرتے تھے۔ جان سیوک اس زمین کو خرید کر وہاں ایک سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پربھوسیوک کو بھی ہنر سیکھنے کے لیے امریکہ بھیجا تھا۔ جان سیوک کے ساتھ پربھوسیوک اور ان کی ماں بھی زمین کو دیکھنے چلے۔ باپ بیٹے نے مل کر اراضی کی پیمائش کی۔ کہاں کارخانہ ہوگا کہاں گودام۔ کہاں دفتر، کہاں منیجر کا بنگلہ، کہاں مزدوروں کی بارکیں، کہاں کوئلہ رکھنے کی جگہ اور کہاں سے پانی آئے گا۔ وغیرہ کے متعلق باپ بیٹے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مسٹر سیوک نے طاہر علی سے پوچھا "یہ کس کی زمین ہے؟"
طاہر علی : حضور۔ یہ تو ٹھیک نہیں معلوم۔ چل کر یہاں کسی سے دریافت کرلوں گا۔ شاید نایک رام پنڈا کی ہو۔
جان سیوک : آپ اس سے یہ زمین کتنے میں دلا سکتے ہیں؟

طاہر علی : مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ کیا وہ اسے بیچے گا بھی۔
جان سیوک : اجی! بیچے گا اس کا باپ! اس کی کیا ہستی ہے؟ روپے کے سترہ آنے دیجیے اور آسمان کے تارے منگوا لیجیے۔ آپ اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں خود باتیں کرلوں گا۔
پربھوسیوک : مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہاں خام جنس بمشکل مل سکے گی۔ اس طرف تمباکو کی کاشت کم کرتے ہیں۔
جان سیوک : کچا مال پیدا کرنا تمھارا کام ہوگا۔ کاشتکار کا رُکھ، جَو یا گیہوں سے عشق نہیں ہوتا۔ وہ جس چیز میں اپنا فائدہ دیکھے گا وہی پیدا کرے گا۔ اس کا کچھ اندیشہ نہیں ہے۔ (طاہر علی سے) خاں صاحب آپ اس پنڈے کو میرے پاس کل ضرور بھیج دیجیے گا۔
طاہر علی : بہت خوب! اس سے کہوں گا۔
جان سیوک : کہوں گا نہیں اس کو بھیج دیجیے گا۔ اگر آپ سے اتنا بھی نہ ہوسکا تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو معاملہ بندی کا مطلق شعور نہیں۔
مسز سیوک : (انگریزی میں) تمھیں اس جگہ پر کوئی تجربہ کار آدمی رکھنا چاہیے تھا۔
جان سیوک : (انگریزی میں) نہیں میں تجربہ کار آدمی سے ڈرتا ہوں۔ وہ اپنے تجربہ سے اپنا فائدہ سوچتا ہے، تمھیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔ میں تجربہ کاروں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔
اس طرح باتیں کرتے ہوئے چاروں آدمی فٹن کے پاس آئے۔ یہاں صوفیہ کھڑی ہوئی سورداس سے باتیں کر رہی تھی۔ پربھوسیوک کو دیکھتے ہی انگریزی میں بولی ”پربھو! یہ اندھا تو کوئی گیانی آدمی معلوم ہوتا ہے پورا فلاسفر ہے۔“
مسز سیوک : تو جہاں جاتی ہے وہیں تجھے کوئی نہ کوئی گیانی آدمی مل جاتا ہے۔ کیوں بے اندھے! تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟
صوفیہ : (انگریزی میں) ماما! یہ اندھا بالکل گنوار نہیں ہے۔
سورداس کو صوفیہ سے عزت پانے کے بعد یہ توہین آمیز الفاظ بہت برے معلوم ہوئے۔ اپنی عزت کرنے والوں کے سامنے اپنی ہتک کئی گنا ناقابل برداشت

ہو جاتی ہے۔ وہ سر اٹھا کر بولا۔ بھگوان نے جنم دیا ہے بھگوان کی چاکری کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کی تابعداری اب نہیں ہو سکتی۔"

مسز سیوک : تیرے بھگوان نے تجھے اندھا کیوں بنا دیا؟ اس لیے کہ تو بھیک مانگتا پھرے؟ تیرا بھگوان بڑا بے انصاف ہے۔

صوفیہ : (انگریزی میں) ماما! آپ اس کی اتنی بے عزتی کر رہی ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔

سورداس : بھگوان بے انصاف نہیں۔ میرے پہلے جنم کی کمائی ہی ایسی تھی جیسے کرم کیے ہیں ویسا پھل بھوگ رہا ہوں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔ گھروندے بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ اس کو کسی سے عداوت نہیں ہے۔ وہ کیوں بے انصافی کرنے لگا؟

صوفیہ : میں اگر اندھی ہوتی تو خدا کو کبھی معاف نہ کرتی۔

سورداس : میم صاحب! اپنے پاپ سب کو آپ بھوگنے پڑتے ہیں۔ بھگوان کا اس میں کوئی دوش نہیں۔

صوفیہ : ماما یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کردیا تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں ہیں؟ دیگر مذاہب والوں کی طرح ہماری قوم میں بھی امیر، غریب، اچھے، برے، لنگڑے، لولے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے۔

مسز سیوک نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ سورداس بول اُٹھا۔ میم صاحب! اپنے گناہوں کا کفارہ ہمیں آپ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آج معلوم ہوجائے کہ کسی نے ہمارے گناہوں کے بار کو اپنے سر لے لیا تو دنیا میں اندھیر ہو جائے۔

مسز سیوک: صوفی! مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔حالانکہ ریور نڈیم نے خود کئی بار تیرے شکوک کا دفعیہ کیا ہے۔

پربھو سیوک : (سورداس سے) تمھارے خیال میں ہم لوگوں کو ویراگی ہو جانا چاہیے ؟ کیوں؟

سورداس : ہاں! جب تک ہم ویراگی نہ ہوں گے۔ ہم دُکھوں سے نہیں بچ سکتے۔

جان سیوک : بدن پر راکھ مل کر بھیک مانگنا خود ہی سب سے بڑا دُکھ ہے۔ یہ ہم کو دکھوں سے کیوں کر نجات دلا سکتا ہے؟

سورداس: صاحب، بیراگی ہونے کے لیے راکھ ملنے اور بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مہاتماؤں نے راکھ ملنے اور جٹا بڑھانے کو تو محض ڈھکوسلا بنا دیا ہے۔ بیراگ تو من سے ہوتا ہے۔ سنسار میں رہے مگر سنسار کا ہوکر نہ رہے۔ اسی کو بیراگ کہتے ہیں۔

مسز سیوک : ہندوؤں نے یہ باتیں یونانؔ کے ,اسٹوئک، نامی فرقہ سے سیکھی ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان پر کار بند ہونا کتنا مشکل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان پر رنج و مسرت کا اثر نہ پڑے۔ اسی اندھے کو اگر اس وقت پیسے نہ ملیں تو اپنے دل میں ہمیں ہزاروں صلواتیں سنائے گا۔

جان سیوک : ہاں اسے کچھ مت دو دیکھو کیا کہتا ہے۔ اگر ذرا بھی جھنجھنایا تو میں ہنٹر سے باتیں کروں گا۔ سارا ویراگ بھول جائے گا۔ مانگتا ہے بھیک۔ ایک ایک دھیلے کے لیے میلوں کُتّے کی طرح دوڑتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ میں بیراگی ہوں۔ (کوچوان سے) گاڑی پھیرو۔ کلب ہوتے ہوئے بنگلے چلو۔

صوفیہ : ماما، کچھ تو ضرور دے دو۔ بیچارہ امیدیں باندھ کر اتنی دور دوڑا آیا ہے۔

پربھوسیوک : اوہو! مجھے تو پیسے بھنانے کی یاد ہی نہ رہی۔

جان سیوک : ہرگز نہیں۔ کچھ مت دو۔ میں اسے بیراگ کا سبق دینا چاہتا ہوں۔

گاڑی روانہ ہوئی۔ سورداس مایوسی کا مجسّمہ بنا ہوا اپنی اندھی آنکھوں سے گاڑی کی طرف تاکتا رہا۔ گویا اس کو اب بھی یقین نہ ہوتا تھا کہ کوئی انسان اتنا بے رحم ہوسکتا ہے۔ وہ اسی نیم یقینی کی حالت میں گاڑی کے پیچھے پیچھے کئی قدم چلا بھی۔ دفعتاً صوفیہ نے کہا، سورداس! افسوس کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر کبھی ادھر آؤں گی تو تم کو اس قدر مایوس نہ ہونا پڑے گا۔"

اندھوں میں فراست کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ سورداس اس موجودہ کیفیت کو بخوبی سمجھ گیا۔ دل کو تکلیف تو ہوئی مگر بے پروائی سے بولا۔ "میم صاحب! اس کی کیا فکر؟ بھگوان تمھارا کلیان کریں تمھاری دیا چاہیے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔"

صوفیہ نے ماں سے کہا۔ ماما! دیکھا آپ نے؟ اس کی طبیعت ذرا بھی مکدر نہیں ہوئی۔

پربھو سیوک: ہاں رنجیدہ تو نہیں معلوم ہوتا۔

جان سیوک: اس کے دل سے پوچھو۔

مسز سیوک: گالیاں دے رہا ہوگا۔

گاڑی ابھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ طاہر علی نے پکارا "حضور یہ زمین پنڈا کی نہیں بلکہ سورداس کی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔"

صاحب نے گاڑی روک دی۔ نادم نظروں سے مسز سیوک کو دیکھا۔ گاڑی سے اتر کر سورداس کے پاس آئے اور منکسرانہ انداز سے بولے۔ "کیوں سورداس؟" یہ زمین تمھاری ہے؟

سورداس: ہاں۔ حضور! میری ہی ہے۔

جان سیوک: تو میرا کام بن گیا۔ میں اندیشہ میں تھا کہ نہ جانے اس کا مالک کون ہے اور اس سے معاملہ طے بھی ہوگا یا نہیں۔ جب تمھاری ہے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ تم جیسے تارک الدنیا اور نیک شخص سے زیادہ جھنجھٹ نہ کرنا پڑے گا۔ جب تمھارے پاس اتنی زمین ہے تو تم نے یہ بھیس کیوں بنا رکھا ہے۔

سورداس: کیا کروں حضور۔ بھگوان کی جو مرضی ہے وہ کر رہا ہوں۔

جان سیوک: تو اب تمھاری مصیبت دور ہو جائے گی۔ بس یہ زمین مجھے دے دو۔ بھلائی کی بھلائی اور فائدہ کا فائدہ۔ میں تم کو منہ مانگی قیمت دوں گا۔

سورداس: سرکار! بزرگوں کی یہی نشانی ہے۔اسے بیچ کر ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

جان سیوک: یہیں سڑک پر ایک کنواں بنا دوں گا تمھارے پرکھوں کا نام اس سے چلتا رہے گا۔

سورداس: صاحب اس زمین سے محلّہ والوں کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔کہیں ایک انگل بھر چری نہیں ہے۔قرب و جوار کے کل مویشی یہیں چرنے آتے ہیں۔ فروخت کر ڈالوں گا تو مویشیوں کے لیے کوئی ٹھکانا نہ رہ جائے گا۔

جان سیوک: کتنے روپے سالانہ چرائی کے پاتے ہو؟

سورداس : کچھ نہیں۔ مجھے بھگوان کھانے بھر کو یوں ہی دے دیتے ہیں تو کسی سے چرائی کیا لوں؟ کسی کی اور کچھ بھلائی نہیں کر سکتا تو اتنی ہی سہی۔
جان سیوک : (تعجب سے) تم نے اتنی زمین یوں ہی چرائی کے لیے چھوڑ رکھی ہے۔صوفیہ سچ کہتی تھی کہ تم تیاگ کی مورت ہو۔ میں نے بڑوں بڑوں میں اتنا تیاگ نہیں دیکھا۔ تم کو آفرین ہے۔ لیکن جب مویشیوں پر اتنی دیا کرتے ہو تو انسان کو کس طرح مایوس کروگے؟میں یہ زمین لیے بغیر تمھارا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔
سورداس : سرکار! یہ زمین میری ہے ضرور لیکن جب تک محلّہ والوں سے پوچھ نہ لوں۔کچھ کہہ نہیں سکتا۔آپ اس کو لے کیا کریں گے؟
جان سیوک : یہاں ایک کارخانہ کھولوں گا۔ جس سے ملک و قوم کی ترقی ہوگی۔ غریبوں کا فائدہ ہوگا۔ہزاروں آدمیوں کی روٹیاں چلیں گی۔ اس کا ثواب بھی تمھیں کو ہوگا۔
سورداس : حضور! محلّہ کے لوگوں سے دریافت کیے بغیر میں کچھ نہیں عرض کر سکتا۔
جان سیوک : اچھی بات ہے۔پوچھ لو۔ میں پھر تم سے ملوں گا۔ اتنا سمجھ رکھو کہ میرے ساتھ سودا کرنے میں تم کو گھاٹا نہ رہے گا۔ تم جس طرح خوش ہوگے اسی طرح خوش کروں گا۔ یہ لو جیب سے پانچ روپے نکال کر)میں نے تم کو معمولی بھکاری سمجھ کر تمھاری توہین کی تھی۔اب مجھے معاف کرو۔
سورداس : حضور! میں روپے لے کر کیا کروں گا؟ دھرم کے ناتے دو چار پیسے دے دیجیے تو آپ کا کلیان مناؤں گا۔اور کسی ناتے سے میں روپے نہ لوں گا۔
جان سیوک : تمھیں دو چار پیسے کیا دوں؟اسے لے لو دھرم کے ناتے ہی سمجھو۔
سورداس : نہیں صاحب! دھرم میں آپ کی غرض شامل ہوگئی ہے۔اب دھرم دھرم نہیں رہا۔

جان سیوک نے بہت اصرار کیا۔ لیکن سورد ں نے روپے نہ لیے۔ صاحب مجبور ہوکر گاڑی پر جا بیٹھے مسز سیوک نے پوچھا کیا باتیں ہوئیں؟''
جان سیوک : ہے تو فقیر لیکن بہت مغرور ہے۔ پانچ روپے دیتا تھا۔ نہیں لیے۔
مسز سیوک : ہے کچھ اُمید؟
جان سیوک : جتنا آسان سمجھ رکھا تھا اتنا آسان نہیں ہے۔ گاڑی تیز ہوگئی۔

(2)

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ راستہ میں چلتے چلتے سوچنے لگا:۔یہ ہے بڑے آدمیوں کی خودغرضی۔پہلے کیسی شان دکھاتے تھے۔ مجھے کتے سے بھی بد تر سمجھا۔ لیکن جوں ہی ان کو معلوم ہواکہ زمین میری ہے تو کیسی خوشامد آمیز گفتگو کرنے لگے۔ انھیں میں اپنی زمین دیے دیتا ہوں! پانچ روپے دکھاتے تھے۔گویا میں نے روپے دیکھے ہی نہیں۔ پانچ کیا! پانچ سو بھی دیں تو میں زمین نہ دوں گا۔محلّہ والوں کو کون سا منہ دکھاؤں گا۔ان کے کارخانے کے لیے بیچاری گائیں ماری ماری پھریں۔ عیسائیوں کو دیا دھرم کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ بس سب کو عیسائی ہی بناتے پھرتے ہیں۔کچھ نہ دیناتھا تو پہلے ہیں جواب دے دیتے۔ میل بھر دوڑا کر کہہ دیا تھا ,,چل ہٹ،، معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں لڑکی کا ہی سوبھاؤ اچھا ہے۔اسی میں دیا دھرم ہے۔ بڑھیا تو پوری کرک سا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔اتنا گھمنڈ ! جیسے یہی وکٹوریہ ہیں! رام رام تھک گیا۔ ابھی تک دم پھول رہا ہے۔ ایسا آج تک کبھی نہ ہوا تھا کہ اتنا دوڑ کر کسی نے کورا جواب دے دیا ہو۔ خیر بھگوان کی یہی اچھا ہوگی۔ اے دل! اتنا غم نہ کر مانگنا تمھارا کام ہے اور دینا دوسروں کا۔ اپنا دھن ہے کوئی نہیں دیتا تو تمھیں برا کیوں لگتا ہے؟ لوگوں سے کہہ دوں کہ صاحب زمین مانگتے تھے؟ نہیں۔ سب گھبرا جائیں گے۔میں نے جواب تو دے ہی دیا۔ اب دوسروں سے کہنا فضول ہے۔“

یہ سوچتا ہوا وہ اپنے دروازہ پر پہنچا۔ بہت ہی معمولی جھونپڑی تھی۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ دروازہ پر کواڑوں کی جگہ بانس کی ٹہنیوں کی ایک ٹٹی لگی ہوئی تھی۔سورداس نے ٹٹی ہٹائی۔کمر سے پیسوں کی ایک چھوٹی پوٹلی نکالی۔جو آج دن بھر کی کمائی تھی۔ پھر جھونپڑی کی چھت میں سے ٹٹول کر ایک تھیلی نکالی۔ جو اس کی زندگی کا ماحصل تھی۔ اس میں پیسوں کو بہت آہستہ سے رکھاکہ کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑے۔ زاں بعد اس تھیلی کو چھت میں چھپا کر پڑوس کے گھر سے آگ مانگ لایا پیڑوں کے نیچے سے کچھ سوکھی ٹہنیاں جمع کر رکھی تھیں۔ انھیں سے چولہا جلایا

جھونپڑی میں دھندلی سی روشنی ہوئی۔ بے سرو سامانی کا نظارہ کتنا دل شکن تھا ! نہ کھاٹ۔ نہ بستر۔ نہ برتن۔ نہ بھانڈے۔ایک گوشہ میں ایک مٹی کا گھڑا تھا جس کی عمر کا کچھ اندازہ اس پر جمی ہوئی کائی سے ہو سکتا تھا۔ چولھے کے پاس ایک ہانڈی تھی پرانا اور سوراخوں سے چھلنی بنا ہوا ایک لوہے کا توا۔ ایک چھوٹی کٹھوت اور ایک لوٹا۔بس یہی اس گھر کی ساری دولت تھی انسانی خواہشات کا کتنا مکمل خلاصہ ! سورداس نے آج جتنا اناج پایا تھا وہ سب جوں کا توں ہانڈی میں ڈال دیا۔ کچھ جَو تھے کچھ گیہوں۔ کچھ مٹر۔ کچھ چنے۔ تھوڑی سی جوار اور مٹھی بھر چاول۔ اوپر سے قدرے نمک ڈال دیا۔ کس کی زبان نے ایسی غذائے لطیف و نفیس کا مزہ چکھا ہوگا؟ اس میں قناعت کی شیرینی تھی۔جس سے شیریں تر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ ہانڈی کو چولھے پر چڑھا کر وہ گھر سے نکلا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی۔ اور سڑک پر جاکر ایک بنئے کی دوکان سے تھوڑا سا آٹا اور ایک پیسہ کا گڑ لایا۔ آٹے کو کٹھوت میں گوندھا اور پھر نصف گھنٹہ تک چولھے کے سامنے کھچڑی کا دلکش ترانا سنتا رہا۔ اس دھندلی سی روشنی میں اس کا لاغر جسم اور اس کے بوسیدہ کپڑے انسانوں کی اس محبت کا مضحکہ اڑا رہے تھے جو ان کو زندگی کے ساتھ فطرتاً ہوا کرتی ہے۔

ہانڈی میں کئی دفعہ اُبال آیا۔ اور کئی دفعہ آگ بجھی بار بار چولھا پھونکتے پھونکتے سورداس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ آنکھیں چاہے دیکھ نہ سکیں پر رو سکتی ہیں۔آخر وہ لذیذ مرکب تیار ہوا۔اس نے اس کو اتار کر نیچے رکھا۔ چولھے پر توا چڑھایا اور ہاتھوں سے روٹیاں بنا بنا کر سینکنے لگا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا ! روٹیاں سب یکساں تھیں۔نہ چھوٹی، نہ بڑی، نہ سیوڑی نہ جلی ہوئی۔ توے سے اتار اتار کر روٹیوں کو چولھے میں پکاتا تھا اور زمین پر رکھتا جاتا تھا۔ جب روٹیاں بن گئیں تو اس نے دروازہ پر کھڑے ہوکرزور سے پکارا ”مٹھو ! مٹھو!“ آؤ بیٹا کھانا تیار ہے۔“ مگر جب مٹھو نہ آیا تو اس نے پھر دروازہ پر ٹٹی لگائی اور نایک رام کے برآمدے میں جاکر مٹھو مٹھو پکارنے لگا۔ مٹھو وہیں پڑا سو رہا تھا آواز سن کر چونکا۔ 13-12 سال کا خوبصورت اور خندہ رو لڑکا تھا۔ بھرا ہوا جسم۔ سڈول ہاتھ پاؤں۔ یہ سورداس کا بھتیجا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں طاعون میں مر چکے تھے۔ تین سال سے اس کی پروش و پرداخت کا بار

سورداس ہی پر تھا۔ وہ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔وہ خود چاہے فاقہ کرے مگر مٹھو کو ہر روز تین مرتبہ ضرور کھلاتا تھا۔ خود مٹر چبا کر رہ جاتا مگر اس کو شکر اور روٹی، کبھی گھی اور نمک کے ساتھ روٹیاں کھلاتا تھا۔اگر کوئی بھیک میں مٹھائی یا گڑ دے دیتاتو اس کو بڑی احتیاط سے اپنے انگوچھے کے گوشہ میں باندھ لیتا تھا اور مٹھو کو دیتا سب سے کہتا۔ ”یہ کمائی بڑھاپے کے لیے کر رہا ہوں۔ ابھی تو ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ مانگ کر کھاتا ہوں۔ جب اُٹھ بیٹھ نہ سکوں گا تو لوٹا بھر پانی کون دے گا؟ مٹھو کو سوتا پا کر گود میں اٹھا لیا اور جھونپڑی کے دروازہ پر اتارا۔ پھر دروازہ کھولا۔اس کا منہ دھلوایا اور سامنے گڑ اور روٹیاں رکھ دیں۔ مٹھو نے روٹیاں دیکھیں تو مچل کر بولا۔ میں روٹی اور گڑ نہ کھاؤں گا۔ یہ کہہ کر اُٹھ کر کھڑا ہوا۔

سورداس : بیٹا ! بہت اچھا گُڑ ہے۔ کھاؤ تو۔ دیکھو کیسی نرم نرم روٹیاں ہیں۔ گیہوں کی ہیں۔

مٹھو : میں نہ کھاؤں گا۔

سورداس : بیٹا! اس وقت کھالو میں سویرے دودھ لادوں گا۔

مٹھو رونے لگا۔ سورداس اسے بہلا کر تھک گیا۔ تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوا اٹھا۔ لکڑی اٹھائی اور ٹٹولتا ہوا بجرنگی اہیر کے گھر آیا جو اس کی جھونپڑی کے پاس ہی تھا۔ بجرنگی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس کی بیوی جمنی کھانا پکا رہی تھی صحن میں تین بھینسیں اور چار پانچ گائیں چرہی پر بندھی ہوئیں چارا کھا رہی تھیں۔ بجرنگی نے کہا۔ کہو سورداس۔ کیسے چلے آئے۔ آج بگھی پر کون لوگ بیٹھے ہوئے تم سے باتیں کر رہے تھے؟“

سورداس : وہی گودام کے صاحب تھے۔

بجرنگی : تم بہت دور تک گاڑی کے پیچھے دوڑے کچھ ہاتھ لگا؟

سورداس : پتھر ہاتھ لگا ! عیسائیوں میں بھی کہیں دیا دھرم ہوتا ہے۔ میری وہی زمین لینے کو کہتے ہیں۔

بجرنگی : گودام کے پیچھے والی نا؟

سورداس: ہاں! وہی۔ بہت لالچ دیتے رہے پر میں نے ہاں نہیں کہی۔

سورداس نے سوچا تھا کہ ابھی کسی سے یہ بات نہیں کہوں گا۔لیکن اس وقت دودھ لینے کے لیے کچھ خوشامد ضروری تھی۔ اپنا تیاگ دکھا کر سرخرو بننا چاہتا تھا۔

بجرنگی : تم ہاں بھی کرتے تو یہاں کون اسے چھوڑے دیتا تھا؟ تین چار گاؤں کے بیچ میں یہی تو اتنی زمین ہے وہ نکل جائے گی تو ہماری گائیں اور بھینسیں کہاں جائیں گی؟

جمنی : میں تو انھیں کے دروازہ پر ان کو باندھ آتی۔

سورداس : میری جان نکل جائے تب تو بیچوں گا ہی نہیں۔ ہزار پانچ سو کس گنتی میں ہیں؟ بہو جی ایک گھونٹ دودھ ہو تو دے دے۔ مٹھوا کھانے بیٹھا ہے۔روٹی اور گڑ چھوتا ہی نہیں۔بس دودھ دودھ کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ جو چیز گھر میں نہیں ہوتی اسی کے لیے ضد کرتا ہے۔دودھ نہ پائے گا تو بغیر کھائے ہی سو رہے گا۔

بجرنگی : لے جاؤ۔ دودھ کی کون کمی ہے؟ ابھی دوہا ہے۔ گھیسو کی ماں ! ایک کلھیا دودھ دے دو سورداس کو۔

جمنی : ذرا بیٹھ جاؤ سورداس! ہاتھ خالی ہو تو دوں۔

بجرنگی : وہاں مٹھو کھانے بیٹھا ہے تو کہتی ہے۔ ہاتھ خالی ہو تو دوں، تجھ سے نہ اٹھا جائے تو میں آؤں۔

جمنی جانتی تھی کہ یہ حضرت اٹھیں گے تو پاؤ کے بدلے آدھ سیر دے ڈالیں گے۔ جھٹ رسوئی سے نکل آئی۔ایک کلھیا میں پانی لیا۔ اوپر سے دودھ ڈال کر سورداس کے پاس اائی۔ اور دلآزارانہ میل کے لہجہ میں بولی۔ یہ لو؟ اس لونڈے کی زبان تم نے ایسی بگاڑدی ہے کہ بنا دودھ کے کور ہی نہیں اٹھاتا۔باپ جیتاتھا تو پیٹ بھر چنے بھی نہ ملتے تھے۔اب دودھ کے بنا کھانا ہی نہیں اٹھتا۔

سورداس : کیا کروں بھابھی؟رونے لگتا ہے تو ترس آجاتا ہے۔

جمنی : ابھی اس طرح پال پوس رہے ہو کہ ایک دن کام آئے گا مگر دیکھ لینا جو چلو بھر پانی کو بھی پوچھے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو۔ پرایا لڑکا کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ ہاتھ پاؤں ہوئے اور تمھیں پھٹکار کر الگ ہوجائے گا۔تم اپنے لیے سانپ پال رہے ہو۔

سورداس : جو کچھ میرا دھرم ہے کیے دیتا ہوں۔ آدمی ہوگا تو کہاں تک نہ جس مانے گا۔ ہاں اپنی تقدیر ہی کھوٹی ہوئی تو کوئی کیا کرے گا؟ اپنے ہی لڑکے کیا بڑے ہوکر

منہ نہیں پھیر لیتے؟

جمنی: کیوں نہیں کہہ دیتے۔ میری بھینسیں چرا لایا کرے؟ جوان تو ہوا۔ کیا جنم بھر ننھا ہی بنا رہے گا؟ گھیسو ہی کا جوڑی دار تو ہے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو ابھی سے کسی کام میں نہ لگایا تو کھلاڑی ہو جائے گا۔ پھر کسی کام میں اس کا جی نہ لگے گا۔ ساری عمر تمھارے ہی سر پھلوریاں کھاتا رہے گا۔

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ دود کی کلھیا لی اور لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا گھر چلا آیا۔ مٹھو زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کو پھر اٹھایا اور دودھ میں روٹیاں مل کر اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ مٹھو نیند سے گرا پڑتا تھا۔ لیکن لقمہ سامنے آتے ہی اس کا منہہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ جب وہ ساری روٹیاں کھا چکا۔ تو سورداس نے اس کو چٹائی پر لٹا دیا۔ اور ہانڈی میں سے اپنی پنچ میل کھچڑی نکال کر کھائی۔ پیٹ نہ بھرا تو ہانڈی دھو کر پی گیا زاں بعد مٹھو کو گود میں اٹھا کر باہر آیا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور مندر کی طرف چلا یہ مندر ٹھاکر جی کا تھا۔ بستی کے دوسرے سرے پر اونچی کرسی تھی۔ مندر کے چاروں طرف تین چار گز چوڑا چبوترا تھا۔ یہی محلہ کی چوپال تھی تمام دن یہاں دس پانچ آدمی لیٹے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک پختہ کنواں بھی تھا جس پر جگدھر نام کا ایک خوانچہ والا بیٹھا کرتا تیل کی مٹھائیاں مونگ پھلی رام دانے کے لڈو وغیرہ رکھتا تھا۔ راہگیر آتے اس سے مٹھائیاں لیتے۔ پانی نکال کر پیتے اور اپنی راہ چلے جاتے۔ مندر کے پجاری کا نام دیاگر تھا جو اسی مندر کے قریب ایک کٹیا میں رہتے تھے ٹھوس ایشور کے پجاری تھے۔ بھجنوں اور گانوں کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور بلا مورت والی پوجا کو ڈھونگ کہتے تھے۔ شہر کے پرانے رئیس کنور بھرت سنگھ کے یہاں سے کچھ ماہوار وثیقہ مقرر تھا۔ اسی سے ٹھاکر جی کا بھوگ لگتا تھا۔ بستی سے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا بے لوث آدمی تھا۔ لالچ چھو بھی نہیں گیا تھا۔ صبر و توکل کا پتلا تھا۔ تمام دن ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ مندر میں ایک چھوٹی سی سنگت تھی۔ آٹھ نو بجے رات کو دن بھر کے کام دھندے سے فارغ ہوکر چند خوش اعتقاد لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اور گھنٹے دو گھنٹے بھجن گا کر چلے جاتے تھے۔ ٹھاکر دین ڈھول بجانے میں مشتاق تھے۔ بجرنگی کرتال بجاتا تھا۔ جگدھر کو طنبورہ میں کمال تھا۔ نایک رام اور دیاگر سارنگی

بجاتے تھے۔ مجیرے بجانے والوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو جایا کرتی تھی۔ جو اور کچھ نہ کر سکتا وہ مجیرا ہی بجاتا تھا۔ سورداس اس مجلس کی ناک تھا۔ ڈھول، مجیرے، کرتال، سارنگی، طنبورہ سبھی میں اس کو یکساں مہارت تھی اور گانے میں تو آس پاس کے کئی محلوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ ٹھمری غزل سے اس کو رغبت نہ تھی۔ کبیر، میرا، دادو کمال پلٹو وغیرہ صوفیوں کے بھجن گاتا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جاتا تھا۔ گاتے گاتے مست ہو جاتا۔ تن بدن کی سدھ نہ رہتی۔ سارے تفکرات و ترودات بھگتی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے تھے۔

سورداس مٹھو کو لیے ہوے پہنچا تو مجلس آراستہ ہو چکی تھی۔ جملہ ارکان جمع تھے۔ صرف میر مجلس کی کمی تھی۔ سورداس کو دیکھتے ہی نایک رام نے کہا ''تم نے بڑی دیر کر دی۔ آدھ گھنٹہ سے تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لونڈا اسی طرح تمھارے گلے پڑا ہے۔کیوں نہیں ہمارے ہی گھر سے کچھ مانگ کر اسے کھلا دیا کرتے؟''

دیاگر: یہاں چلا آیا کرے تو ٹھاکر جی کی پرشاد ہی سے پیٹ بھر جائے۔

سورداس: تمھیں لوگوں کا دیا کھاتا ہے یا اور کسی کا؟ میں تو بنانے بھر کو ہوں۔

جگدھر: لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں ہے۔ گود میں لادے پھرتے ہو جیسے کوئی نکما سا لڑکا ہو۔ میرا وِدّیا دھر اس سے دو سال چھوٹا ہے۔ میں اس کو کبھی گود میں لے کر نہیں پھرتا۔

سورداس: بنا ماں باپ کے لڑکے ضدّی ہو جاتے ہیں۔ہاں کیا ہوگا؟

دیاساگر: پہلے رامائن کی ایک چوپائی ہو جائے۔

حاضرین نے اپنے اپنے ساز سنبھالے۔ سُر ملا اور آدھ گھنٹہ تک رامائن ہوتی رہی۔

نایک رام: واہ سورداس واہ! اب تمھارے ہی دم کا ظہورا ہے۔

بجرنگی: میری تو کوئی دونوں آنکھیں لے لے اور یہ ہنر مجھے دے دے تو میں خوشی سے بدل لوں۔

جگدھر: ابھی بھیرو نہیں آیا اس کے بنا رنگ نہیں جمتا۔

بجرنگی: تاڑی بیچتا ہوگا۔ پیسہ کا لالچ برا ہوتا ہے۔ گھر میں ایک عورت ہے اور بڑھیا

ماں۔ پر رات دن ہائے ہائے پڑی رہتی ہے۔ کام کرنے کو دن ہے ہی۔ بھلا رات کو تو بھگوان کا بھجن ہو جائے۔

جگدھر : سورداس کا دم اکھڑ جاتا ہے۔ اس کا دم نہیں اکھڑتا۔

بجرنگی : تم اپنا کھونچہ بیچو۔ تمھیں کیا معلوم کہ دم کس کو کہتے ہیں۔ سورداس جتنا دم سادھتے ہیں اتنا کوئی دوسرا سادھے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

جگدھر : اچھا بھیا! سورداس کے برابر دنیا میں کوئی دم نہیں سادھ سکتا۔ اب خوش ہوئے۔

سورداس : بھیا اس میں جھگڑا کاہے کا ؟میں کب کہتا ہوں کہ مجھے گانا آتا ہے؟تم لوگوں کا حکم پاکر جیسا بھلا بُرا بنتا ہے۔ سنا دیتا ہوں۔

اتنے میں بھیرو بھی آکر بیٹھ گیا۔ بجرنگی نے طنز سے کہا۔ ”کیا اب کوئی تاڑی پینے والا نہیں تھا؟اتنی جلد دوکان کیوں بڑھادی۔“

ٹھاکردین : معلوم نہیں ہاتھ پیر بھی دھوئے ہیں یا وہاں سے سیدھے ٹھاکر جی کے مندر میں چلے آئے۔اب صفائی تو کہیں رہ ہی نہیں گئی۔

بھیرو : کیا میری دیہہ میں تاڑی پوتی ہوئی ہے؟

ٹھاکردین : بھگوان کے دربار میں اس طرح نہ آنا چاہیے۔ ذات چاہے اونچی ہو یا نیچی۔ پر صفائی چاہیے ضرور۔

بھیرو : تم یہاں روز نہاکر آتے ہو؟

ٹھاکردین : پان بھگوان کے بھوگ کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے جینودھاری میرے ہاتھ کا پان کھاتے ہیں۔ تمھارے ہاتھ کا تو کوئی پانی نہیں پیتا۔

نایک رام : ٹھاکردین۔ یہ بات تو تم نے بڑی کھری کہی۔ سچ تو ہے پاسی سے کوئی گھڑے تک نہیں چھواتا۔

بھیرو : ہماری دوکان پر ایک دن آکر بیٹھ جاؤ تو دکھادوں کہ کیسے کیسے دھرماتما اور مہاتما آتے ہیں۔ سادھو مہاتماؤں کو بھی کسی نے پان کھاتے دیکھا ہے۔ تاڑی گانجہ چرس پیتے ہوئے جب چاہے دیکھ لو۔ایک سے ایک مہاتما آکر خوشامد کرتے ہیں۔

نایک رام : ٹھاکردین! اب اس کا جواب دو۔ بھیرو پڑھا لکھا ہوتا تو وکیلوں کے کان

کاٹتا۔
بھیرو: میں تو بات سچی کہتا ہوں۔جیسے تاڑی ویسے پان۔ بلکہ پراتھہ کی تاڑی کو لوگ دوا کی طرح پیتے ہیں۔
جگدھر: یارو! دو ایک بھجن ہونے دو۔ مان کیوں نہیں جاتے۔ ٹھاکردین؟ تمھیں ہارے۔ بھیرو جیتا سہی۔ چلو چھٹی ہوئی۔
نایک رام: واہ! ہار کیوں مان لیں؟ شاسترارتھ ہے کہ دل لگی؟ ہاں۔ ٹھاکردین ! کوئی جواب سوچو۔
ٹھاکردین: میری دوکان پر کھڑے ہو جاؤ۔ جی خوش ہو جائے۔ کیوڑہ اور گلاب کی خوشبو اُڑتی ہے۔ اس کی دوکان پر کوئی جائے تو بدبو کے مارے ناک پھٹنے لگتی ہے۔ کھڑا نہیں رہا جاتا۔ نابدان میں بھی ایسی بدبو نہ ہوتی ہوگی۔
بجرنگی: مجھے تو گھنٹہ بھر کے لیے راج مل جاتا۔ تو سب سے پہلے شہر بھر کی تاڑی کی دوکانوں میں آگ لگوا دیتا۔
نایک رام: اب بتاؤ بھیرو! اس کا جواب دو۔ بدبو تو سچ مچ اُڑتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟
بھیرو: جواب ایک نہیں سینکڑوں ہیں۔ پان سڑ جاتا ہے تو کوئی مٹی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ یہاں تاڑی جتنی سڑتی ہے اتنا ہی اس کا مول بڑھتا ہے۔ سرکہ بن جاتی ہے تو روپے بوتل بکتی ہے اور بڑے بڑے جینو دھاری لوگ کھاتے ہیں۔
نایک رام: کیا بات کہی ہے کہ جی خوش ہوگیا۔ میرا اختیار ہوتا تو اسی دم تم کو وکالت کی سند دے دیتا۔ ٹھاکر دین ! اب ہار مان جاؤ بھیرو سے پیش نہ پاسکو گے۔
جگدھر: بھیرو! تم چپ کیوں نہیں ہو جاتے؟ پنڈا جی کو تو جانتے ہو۔ دوسروں کو لڑا کر تماشہ دیکھنا ان کا کام ہے۔اتنا کہہ دینے میں کون سی مرجادا گھٹی جاتی ہے کہ بابا تم جیتے اور میں ہارا۔
بھیرو: کیوں اتنا کہہ دوں ؟ بات کہنے میں کسی سے کم ہوں کیا؟
جگدھر: تو ٹھاکردین ! تمھیں چپ ہو جاؤ۔
ٹھاکر دین : ہاں جی چپ نہ ہو جاؤں گا تو کیا کروں گا؟ یہاں آئے تھے کہ کچھ بھجن

کیرتن ہوگا۔ بے فائدہ کا جھگڑا کرنے لگے۔ "پنڈاجی کو کیا انھیں تو بے ہاتھ پیر ہلائے امرتیاں اور لڈّو کھانے کو ملتے ہیں۔ ان کو اسی طرح کی دل لگی سو جھتی ہے۔ یہاں تو پہر رات سے اُٹھ کر پھر چکّی میں جتنا ہے۔

جگدھر: میری تو اب کی بھگوان سے بھینٹ ہوگی تو کہوں گا کہ کسی پنڈے کے گھر جنم دینا۔

نایک رام: بھیّا! مجھ پر ہاتھ نہ بُٹھاؤ۔ دُبلا پتلا آدمی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جل پان کے لیے تمھارے ہی کھونچے سے مٹھائیاں لا یا کروں مگر اس پر اتنی مکھیّاں اُڑتی ہیں اور اوپر اتنا میل جما رہتا ہے کہ کھانے کوجی نہیں چاہتا۔

جگدھر: (چڑھ کر) تمھارے نہ لینے سے میری مٹھائیاں سڑ تو نہیں جاتیں کہ بھوکوں مرتا ہوں؟ دن بھرمیں روپے بیس آنہ بنا ہی لیتا ہوں۔ جس کو مفت میں رس گلّے مل جائیں وہ میری مٹھائیاں کیوں لے گا؟

ٹھاکردین: پنڈا جی کی آمدنی کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ جتنا روز مل جائے تھوڑا ہی ہے۔ اور اوپر سے بھوجن کھاتے ہیں۔کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنس گیا تو ہاتھی، گھوڑے، جگہ، زمین، سب دے گیا۔ ایسا بھاگوان اور کون ہوگا؟

دیاگر: کہیں نہیں۔ ٹھاکر دین ! اپنی محنت کی کمائی سب سے اچھی۔ پنڈوں کو جاتریوں کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا ہے؟

نایک رام : بابا! اگر کوئی کمائی پسینہ کی ہے تو وہ ہماری ہے۔ ہماری کمائی کا حال بجرنگی سے پوچھو۔

بجرنگی : اوروں کی کمائی پسینہ کی ہوتی ہوگی۔ تمھاری کمائی تو خون کی ہے۔ اور لوگ پسینہ بہاتے ہیں۔ تم خون بہاتے ہو۔ ایک ایک بمان کے پیچھے لہو کی ندی بہہ جاتی ہے۔جو لوگ کھونچہ سامنے رکھ کر دن بھر مکھّی مارا کرتے ہیں وہ کیا جانیں۔ تمھاری کمائی کیسی ہوتی ہے ؟ ایک دن مورچہ تھامنا پڑے تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے

جگدھر: چلو بھی! آئے ہو منہہ دیکھی کہنے۔ سیر بھر دودھ کا ڈھائی سیر بناتے ہو، اس پر بھگوان کے بھگت بنتے ہو۔

بجرنگی : (غصہ سے) اگر کوئی مائی کا لال میرے دودھ میں ایک بوند پانی نکال دے تو

اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ یہاں دودھ میں پانی، ملانا گو ہتیا سمجھتے ہیں۔ تمھاری طرح نہیں کہ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچیں اور بھولے بھالے بچوں کو ٹھگیں۔

جگدھر: اچھا بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔ تم سچے تمھارا دودھ سچا بس ہم خراب، ہماری مٹھائیاں خراب چلو چھٹی ہوئی۔

بجرنگی: میرے مزاج کو تم نہیں جانتے۔ چتیا دیتا ہوں۔ سچ کہہ کر کوئی سو جوتے مارے لیکن جھوٹی بات سن کر میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

بھیرو: بجرنگی بہت بڑھ کر باتیں نہ کرو۔ اپنے منہہ میاں مٹھو بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بس منہہ نہ کھلواؤ۔ میں نے بھی تمھارے یہاں کا دودھ پیا ہے۔اس سے تو میری تاڑی ہی اچھی۔

ٹھاکردین: بھائی منھ سے جو چاہے ایمان دار بن لے پر اب دودھ سپنا ہوگیا۔سارا دودھ جل جاتا ہے۔ ملائی کا نام نہیں۔ دودھ جب ملتا تھا تب ملتا تھا ایک آنچ میں اُنگل بھر موٹی ملائی پڑ جاتی تھی۔

دیاگر: بچہ! ابھی بھلا برا کچھ مل تو جاتا ہے۔ وہ دن آرہے ہیں کہ دودھ آنکھوں میں لگانے کو بھی نہ ملے گا۔

بھیرو: حال تو یہ ہے کہ گھر والی سیر کا تین سیر بناتی ہے اس پر دعویٰ یہ کہ ہم سچا مال بیچتے ہیں۔سچا مال بیچو تو دیوالہ نکل جائے۔ یہ ٹھاٹھ ایک دن نہ چلے۔

بجرنگی: پسینہ کی کمائی کھانے والوں کا دیوالہ نہیں نکلتا۔ دیوالہ ان کا نکلتا ہے جو دوسروں کی کمائی کھا کھا کر موٹے پڑتے ہیں۔ بھاگ کو سراہو کہ شہر میں ہو۔ کسی گاؤں میں ہوتے تو منھ میں مکھیّاں آتیں جاتیں۔میں تو ان سبھوں کو پاپی سمجھتا ہوں جو اونے پونے کرکے ادھر کا سودا اُدھر بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ سچی کمائی انھیں کی ہے جو چھاتی پھاڑ کر دھرتی سے دھن نکالتے ہیں۔

بجرنگی نے بات تو کہہ ڈالی لیکن شرمندہ ہوگیا۔ اس لپیٹ میں وہاں کے سبھی آدمی آجاتے تھے۔ وہ بھیرو جگدھر اور ٹھاکر دین و نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سورداس، نایک رامِ دیاگر سبھی پاپیوں کے درجہ میں آگئے۔

نایک رام: تب تو بھیّا تم ہمیں بھی لے بیتے۔ ایک پاپی تو میں ہی ہوں کہ سارا دن

مٹر گشت کرتا ہوں اور وہ بھوجن کرتا ہوں کہ بڑوں بڑوں کو میسّر نہ ہو۔

ٹھاکر دین : دوسرا پاپی میں ہوں کہ شوق کی چیز بیچ کر روٹیاں کماتا ہوں۔ سنسار میں تمبولی نہ رہیں تو کس کا نقصان ہوگا؟

جگدھر: تیسرا پاپی میں ہوں کہ دن بھر اُون پون کرتا رہتا ہوں۔ سیو اور خُرمے کھانے کو نہ ملیں تو کوئی مر نہ جائے گا۔

بھیرو: سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ سب کو نشہ پلا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ سچ پوچھو تو اس سے بُرا کوئی کام نہیں ہے۔ آٹھوں پہر نشہ بازوں کا ساتھ۔ انھیں کی باتیں سنتا انھیں کے بیچ میں رہنا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

دیاگر : کیوں بجرنگی؟ سادھو مہاتما تو سب سے بڑے پاپی ہوں گے کہ وہ کچھ نہیں کرتے۔

بجرنگی: نہیں بابا۔ بھگوان کے بھجن سے بڑھ کر کون کام ہوگا؟ رام نام کی کھیتی سب کاموں سے بڑھ کر ہے۔

نایک رام: تو یہاں اکیلے بجرنگی پنیاتما ہے۔ اور سب کے سب پاپی ہیں۔

بجرنگی: سچ پوچھو تو سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ گایوں کا پیٹ کاٹ کر ان کے بچھڑوں کو بھوکوں مار کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔

سورداس : بھائی! کھیتی سب سے اُتم ہے۔ بان (تجارت) اس سے مدھم ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ بان کو پاپ کیوں کہتے ہو؟ اور کیوں پاپی بنتے ہو؟ ہاں چاکری بُری ہے۔ چاہو تو اس کو پاپ کہو۔ اب تو تمھارے اوپر بھگوان کی دیا ہے۔اپنا اپنا کام کرتے ہو۔ مگر ایسے بُرے دن آرہے ہیں جب تمھیں سیوا اور ٹہل کرکے پیٹ مان پڑے گا۔ جب تم اپنے نوکر نہیں پرائے کے نوکر ہوجاؤ گے۔ جب تم میں نتیہ دھرم کا نشان بھی نہ رہے گا۔

سورداس نے یہ باتیں نہایت متانت کے ساتھ کہیں جیسے کوئی رشی پیش گوئی کر رہا ہو سب لوگ سناٹے میں آگئے۔ ٹھاکر دین نے متفکر ہوکر پوچھا۔ کیوں سورداس کوئی مصیبت آنے والی ہے کیا؟ مجھے تو تمھاری باتیں سن کر ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آرہی ہے؟"

سورداس : ہاں لچھن تو دکھائی دیتے ہیں چمڑے کے گودام والا صاحب یہاں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے جا رہا ہے۔ میری زمین مانگ رہا ہے۔ کارخانہ کا کھلنا ہی ہمارے اوپر مصیبت کا آنا ہے؟

ٹھاکردین : تو جب یہ جانتے ہی ہو تو کیوں اپنی زمین دیتے ہو؟

سورداس : میرے دینے پر تھوڑا ہی ہے۔ بھائی میں دوں تو بھی زمین نکل جائے گی۔ نہ دوں تو بھی نکل جائے گی۔ روپے والے سب کچھ کر سکتے ہیں۔

بجرنگی : صاحب روپے والے ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ ہماری زمین کیا کھاکر لیں گے؟ ماتھے گر جائیں گے ماتھے، ٹھٹھا نہیں ہے۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سید طاہر علی آکر کھڑے ہو گئے۔ اور نایک رام سے بولے۔ "پنڈاجی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ذرا ادھر چلے آیئے۔

بجرنگی : اسی زمین کے بارہ میں کچھ بات چیت کرنی ہے نا؟ وہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی : میں تم سے تھوڑا ہی پوچھتا ہوں۔ تم اس زمین کے مالک مختار نہیں ہو۔

بجرنگی : کہہ تو دیا۔ وہ زمین نہ بکے گی۔ مالک مختار کوئی ہو۔

طاہر علی : آیئے پنڈاجی آپ۔ انھیں بکنے دیجیے۔

نایک رام : آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہیے۔ یہ سب لوگ اپنے ہی ہیں کسی سے پردا نہیں ہے۔ سنیں گے تو سب سنیں گے اور جو بات طے ہوگی۔ سب کی صلاح سے ہوگی۔ کہیے کیا کہتے ہیں؟

طاہر علی : اسی زمین کے بارہ میں بات چیت کرنی تھی۔

نایک رام : تو اس زمین کا مالک آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے اسی سے کیوں نہیں کہتے۔ مجھے بیچ میں دلالی نہیں کھانی ہے۔ جب سورداس نے صاحب کے سامنے انکار کردیا تو پھر کون سی بات باقی رہ گئی؟

بجرنگی : انھوں نے سوچا ہوگا کہ پنڈاجی کو بیچ میں ڈال کر کام نکال لیں گے۔ صاحب سے کہہ دینا یہاں صاحبی نہ چلے گی۔

طاہر علی : تم اہیر ہونا۔ جبھی اتنے گرم ہورہے ہو۔ ابھی صاحب کو جانتے نہیں ہو۔ جبھی بڑھ بڑھ کرباتیں کر رہے ہو۔ جس وقت صاحب زمین لینے پر آجائیں گے لے

ہی لیں گے۔ تمھارے روکے نہ رُکیں گے۔ جانتے ہو شہر کے حاکموں سے ان کا کتنا میل جول ہے۔ ان کی لڑکی کی منگنی حاکم ضلع سے ہونے والی ہے۔ ان کی بات کو کون ٹال سکتا ہے؟ سیدھے سے رضامندی کے ساتھ دے دوگے۔ تو اچھے دام پا جاؤ گے۔ شرارت کرو گے تو زمین بھی نکل جائے گی اور کوڑی بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ ریلوں کے مالک کیا زمین اپنے ساتھ لائے تھے؟ ہماری ہی زمین تولی ہے۔ کیا اسی قاعدے سے یہ زمین نہیں نکل سکتی؟

بجرنگی : تمھیں بھی کچھ طے کرائی ملنے والی ہوگی۔ تبھی اتنی خیر خواہی کر رہے ہو۔

جگدھر : ان سے جو کچھ ملنے والا ہو وہ ہمیں سے لے لیجئے اور ان سے کہہ دیجیے کہ زمین نہ ملے گی۔ آپ لوگ جھانسہ باز ہیں۔ ایسا جھانسہ دیجیے کہ صاحب کی عقل گم ہو جائے۔

طاہر علی : میری خیر خواہی روپے کے لالچ سے نہیں ہے۔ اپنے مالک کی آنکھ بچاکر ایک کوڑی بھی لینا حرام سمجھتا ہوں۔ خیر خواہی اس لیے کرتا ہوں کہ ان کا نمک کھاتا ہوں۔

جگدھر : اچھا صاحب بھول ہوئی معاف کیجیے۔ میں نے سنسار کے چلن کی بات کہی تھی۔

طاہر علی : تو سورداس ! میں صاحب سے جاکر کیا کہہ دوں؟

سورداس : بس یہی کہہ دیجیے کہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی : میں پھر کہتا ہوں۔ دھوکا کھاؤ گے۔ صاحب زمین کو لے کر چھوڑیں گے۔

سورداس : میرے جیتے جی تو زمین نہ ملے گی ہاں مر جاؤں تو بھلے ہی مل جائے۔

طاہر علی چلے گئے تو بھیرو بولا۔ "دنیا اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے۔ اپنا کلیان ہو۔ دوسرے جئیں یا مریں۔ بجرنگی! تمھاری تو گائیں چرتی ہیں۔ اس لیے تمھاری بھلائی تو اسی میں ہے کہ زمین بنی رہے۔ میری کون گائے چرتی ہے۔ کارخانہ کھلا تو میری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ یہ بات تمھارے دھیان میں کیوں نہیں آئی ؟تم سب کی طرف سے وکالت کرنے والے کون ہو؟ سورداس کی زمین ہے۔ وہ بیچے یا رکھے تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے۔

نایک رام : ہاں بجرنگی۔ جب تم سے کوئی واسطہ سروکار نہیں ہے۔ تو تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟ بولو! بھیرو کا جواب دو۔

بجرنگی : واسطہ سروکار کیسے نہیں؟ دس گاؤں اور محلے کے جانور یہاں چرنے آتے ہیں وہ کہاں جائیں گے۔ صاحب کے گھر کہ بھیرو کے؟ انھیں تو اپنی دوکان کی ہائے ہائے پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے گھر سیند کیوں نہیں مارتے۔ جلدی سے دھنوان ہو جاؤ گے۔

بھیرو : سیند مارو تم۔ یہاں دودھ میں پانی نہیں ملاتے۔

دیاگر : بھیرو! تم سچ مچ بڑے جھگڑالو ہو۔ جب تم کو ملائم بات کہنا نہیں آتا تو چپ کیوں نہیں رہتے؟ بہت باتیں کرنا عقل مندی کی نشانی نہیں بلکہ بے عقلی کی نشانی ہے۔

بھیرو : ٹھاکر جی کے بھوگ کے بہانہ روز چھاچھ پا جاتے ہونا۔ بجرنگی کی جے کیوں نہ مناؤ گے۔

نایک رام : پٹھا بات بے لاگ کہتا ہے کہ ایک بار سُن کر پھر کسی کی زبان نہیں کھلتی۔

ٹھاکردین : اب بھجن بھاؤ ہو چکا۔ ڈھول مجیرا اٹھا، رکھ دو۔

دیاگر : تم کل سے یہاں نہ آیا کرو۔ بھیرو!

بھیرو : کیوں نہ آیا کریں؟ مندر تمھارا بنوایا ہوا نہیں ہے۔ مندر بھگوان کا ہے۔ تم کسی کو بھگوان کے دربار میں آنے سے روک دو گے؟

نایک رام : لو باباجی! اور بولو گے؟ ابھی پیٹ بھرا کہ نہیں؟

جگدھر : باباجی! تمھیں غم کھا جاؤ۔ اس سے سادھو سنتوں کی مہما نہیں گھٹتی۔ بھیرو! سادھو سنتوں کی بات کا تمھیں بُرا نہ ماننا چاہیے۔

بھیرو : تم خوشامد کرو۔ کیوں کر خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہو۔ یہاں کسی کے دَبیل نہیں ہیں۔

بجرنگی : لے اب چپ ہی رہنا۔ بھیرو! بہت ہو چکا۔ چھوٹا منھ بڑی بات۔

نایک رام : تو بھیرو کو دھمکاتے کیا ہو؟ کیا کوئی بھگوڑا سمجھ لیا ہے، تم نے جب دنگل

مارے تھے تب مارے تھے۔ اب تم وہ نہیں ہو۔ آج کل تو بھیرو کی دوہائی ہے۔

بھیرو: نایک رام کے طنزیہ مذاق پر جھلایا نہیں ہنس پڑا۔ طنز میں زہر نہیں۔ رَس تھا۔ سنکھیا مرکر رَس ہو جاتا ہے۔

بھیرو کا ہنسنا تھا کہ لوگوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے اور بھجن ہونے لگا۔ سورداس کی سُریلی تان خلا میں یوں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جیسے پانی کے اندر روشنی کی شعاعیں ناچتی ہیں۔

(بھجن)

جھینی جھینی بنی چدریا
کاہے کا تانا کاہے کی بھرنی، کون تارے بنی چدریا
اِنگلا بنگلا تانا بھرنی، سکھمن تارے بنی چدریا
آٹھ کنول دل چرکھا ڈولے پانچ تتو۔ گُن تینی چدریا
سائیں کو سیت ماس دَس لاگے۔ ٹھوک ٹھوک کے بنی چدریا
سوچا سُر نر من اور اوڑھیں، اوڑھ کے میلی کینی چدریا
داس کبیر جتن سے اوڑھی، جیوں کی تیوں دَھر دینی چدریا

باتوں میں رات زیادہ گزر چکی تھی۔ گیارہ کا گھنٹہ سنائی دیا۔ لوگوں نے ڈھول مجیرے سمیٹ دیے۔ مجلس برخاست ہوئی۔ سورداس نے مٹھو کو پھر گود میں اُٹھایا اور اپنی جھونپڑی میں لاکر ٹاٹ پر سُلا دیا۔ آپ زمین پر لیٹ رہا۔

(3)

مسٹر جان سیوک کا بنگلہ سگرا میں تھا۔ اُن کے والد مسٹر ایشور سیوک نے فوجی محکمہ سے پنشن پانے کے بعد وہیں مکان بنوا لیا تھا۔ اور اب تک اُس کے مالک تھے۔ اس کے آگے ان کے آبا و اجداد کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہمیں اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ ہاں یہ امر البتہ یقینی ہے کہ حضرت عیسیٰ پر اعتقاد لانے کا شرف ایشور سیوک کو نہیں بلکہ اُن کے والد کو ملا تھا۔ ایشور سیوک کو اب بھی اپنا عہد طفولیت کچھ کچھ یاد آجاتا تھا۔ جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتے تھے۔

ماں کی لاش جلانے کی یاد بھی ابھی نہیں بھولی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کو یاد آتا تھا کہ میرے گھر میں کئی فوجی سپاہی گھس آئے تھے اور میرے والد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد یادداشت کا سلسلہ شکست ہو جاتا تھا۔ ہاں ان کے گورے رنگ و شباہت سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ عالی نسب تھے اور شاید اسی صوبہ میں ان کی قدیم جائے رہائش بھی تھی۔

یہ بنگلہ جس زمانہ میں بنا تھا اس وقت سگرا میں زمین کی اتنی قدر نہ تھی۔ بڑے وسیع احاطہ میں پھول پتیوں کی جگہ سبزی ترکاری اور پھلوں کے درخت تھے۔ یہاں تک کہ گملوں میں بھی نفع کو نفاست پر ترجیح دی گئی تھی۔ بیلیں برول کندروسیم وغیرہ کی تھیں۔ ایک کنارے سے کھپریل کا برآمدہ تھا جس میں گائیں بھینسیں پلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اصطبل تھا۔ موٹر کا شوق نہ باپ کو تھا۔ نہ بیٹے کو۔ فٹن رکھنے میں کفایت بھی تھی اور آسائش بھی۔ ایشور سیوک کو تو موٹروں سے چڑ تھی ان کے شور سے ان کی شانتی میں خلل واقع ہوتا تھا۔ فٹن کا گھوڑا احاطہ میں ایک لمبی رسی سے باندھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اصطبل سے باغ کے لیے کھاد نکل آتی تھی اور صرف ایک سائیس سے کام چل جاتا تھا۔ ایشور سیوک کو خانہ داری کے انتظامات میں خاص ملکہ تھا۔ اور ایسے کاموں میں ان کا حوصلہ ذرا بھی پست نہ ہوتا تھا۔ ان کی آرام کرسی بنگلے کے سائبان میں پڑی رہتی تھی۔ اس پر وہ صبح سے شام تک بیٹھے جان سیوک کی فضول خرچی اور گھر کی بربادی کا رونا رویا کرتے تھے۔ وہ اب بھی باقاعدگی کے ساتھ اپنے لڑکے کو گھنٹہ دو گھنٹہ نصیحت کیا کرتے تھے۔ اور شاید اسی نصیحت کا پھل تھا کہ جان سیوک کی دولت اور عزت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کفایت ان کی زندگی کا اصل اصول تھا اور اس کی خلاف ورزی ان کے لیے نا قابل برداشت تھی۔ وہ اپنے گھر میں فضول خرچی مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔ خواہ روپیہ کسی مہمان ہی کا کیوں نہ ہو۔ مذہب کے ایسے پکے تھے کہ بلا ناغہ دونوں وقت گرجا جاتے۔ ان کی اپنی الگ سواری تھی۔ اس تامجان کو ایک آدمی کھینچ کر گرجا کے دروازہ تک پہنچا آیا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایشور سیوک اس کو فوراً ہی گھر واپس کر دیتے تھے۔ گرجا کے احاطہ میں تامجان کی حفاظت کے لیے کسی آدمی کو بیٹھے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر آکر وہ آدمی اور کوئی

کام کر سکتا تھا۔ اکثر وہ واپس کرتے وقت اس کو کام بھی بتلا دیا کرتے تھے۔ دو گھنٹہ کے بعد وہ آدمی جاکر ان کو واپس کھینچ لاتا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ حتی الامکان خالی ہاتھ نہ لوٹتے تھے۔ کبھی نارنگیاں۔ کبھی سیر آدھ سیر مکوہ۔ پادری ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس کی ساری امت میں اتنا مسن اور دوسر شخص نہ تھا۔ اس پر دھرم کا اتنا شیدائی۔ وہ اس کے مواعظ کو جتنی محویت اور توجہ سے سنتے تھے اور جتنی عقیدت سے وہاں کے بھجنوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ معیار کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

صبح کا وقت تھا یہ لوگ ناشتہ کی میز پر سے اٹھے۔ مسٹر جان سیوک نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایشور سیوک نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے کاایک پیالہ پیا تھا اور جھنجلا رہے تھے کہ اس میں شکر کیوں اتنی جھونک دی گئی ہے۔ شکر کوئی نعمت تو نہیں کہ اُبھر کر کھائی جائے۔ ایک تو مشکل سے ہضم ہوتی ہے دوسرے اتنی مہنگی۔ اس کی نصف شکر چائے کو مزے دار بنانے کے لیے کافی تھی۔ اندازہ سے کام کرنا چاہیے۔ شکر کوئی پیٹ بھرنے کی چیز نہیں ہے۔ سینکڑوں بار کہہ چکاہوں پر میری سنتا کون ہے؟ مجھے تو سب نے کتا سمجھ رکھا ہے۔ اس کے بھونکنے کی پرواہ کس کو ہے؟

مسز سیوک نے مذہبیت اور کفایت کا سبق خوب یاد کر رکھا تھا۔ ندامت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔ ”پاپا معاف کیجیے آج صوفی نے شکر زیادہ ڈال دی تھی۔ کل سے آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی۔ مگر کروں کیا؟ یہاں تو ہلکی چائے کسی کو اچھی نہیں لگتی۔ ”ایشور سیوک نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ قیامت تک تو بیٹھا رہوں گا نہیں مگر گھر کی بر بادی کی یہی علامتیں ہیں۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔

مسزسیوک۔ پاپا! میں اپنی بھول مانتی ہوں۔ مجھے اندازہ سے شکر نکال کر دینی چاہیے تھی۔

ایشور سیوک : ارے تو آج یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ روز تو یہی رونا رہتا ہے۔ جان سمجھتا ہے میں گھر کا مالک ہوں۔روپے کماتا ہوں خرچ کیوں نہ کروں؟ مگر روپیہ کمانا ایک بات ہے اور اس کا مناسب صرف دوسری بات۔ ہوشیار آدمی اس کو کہتے ہیں جو دولت کا مناسب صرف کرے۔ ادھر سے لاکر اُدھر خرچ کر دیا تو کیا فائدہ؟ اس

سے تو نہ لانا ہی اچھا۔ میں سمجھاتا ہی رہا مگر اتنی کلال راس کا گھوڑا لے لیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ تمھیں گھوڑ دوڑ نہیں کرنا ہے۔ ایک ٹٹو سے کام چل سکتا تھا۔ یہی نا کہ اوروں کے گھوڑے آگے نکل جاتے تو اس میں تمھاری کیا شیخی ماری جاتی تھی؟ کہیں دور جانا نہیں پڑتا۔ ٹٹو ہوتا تو چھ سیر کی جگہ دو سیر دانہ کھاتا۔ آخر چار سیر دانہ فضول ہی جاتا ہے نا؟ مگر میری کون سنتا ہے یسوع ! اپنے دامن میں چھپا صوفی! یہاں آ بیٹی! کلام پاک سُنا۔

صوفیہ پربھو سیوک کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی، مسیح کے اس ارشاد پر اپنا شُبہ ظاہر کر رہی تھی کہ غریبوں کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے اور امیروں کا بہشت میں جانا اسی قدر غیر ممکن ہے جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں جانا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا غریب ہونا بجائے خود کوئی ثواب ہے اور امیر ہونا بجائے خود کوئی گناہ؟ اس کی عقل سلیم اس کلام کی سچائی کو قبول نہ کرتی تھی۔ کیا مسیح نے صرف اپنے بھگتوں کو خوش کرنے ہی کے لیے دشمن کی اس قدر ہجو کی ہے؟ تاریخ بتلا رہی ہے کہ اوائل میں صرف غریب، رنجیدہ، مفلس اور جماعت سے خارج شدہ آدمیوں نے ہی مسیح کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اسی لیے تو انھوں نے دولت کی اتنی بے وقعتی نہیں کی تھی۔ کتنے ہی غریب ایسے ہیں جو سراپا بے قاعدگی اور بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاید ان کی بدکاری ہی ان کی مفلسی کا سبب ہے۔ کیا صرف مفلسی ان کے تمام گناہوں کا کفارہ کردے گی۔ کتنے ہی دولتمند لوگ ہیں جن کے دل آئینہ کی طرح صاف ہیں۔ کیا محض ان کی ثروت ان کی تمام نیکیوں کو زائل کردے گی؟

صوفیہ سچ جھوٹ کی جانچ میں ہمیشہ مصروف رہتی تھی۔ مذہبی اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر کسنا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ اور جب تک عقل دلائل کے ذریعہ قبول نہ کرے اس وقت تک وہ صرف مذہبی کتب کی بنا پر کسی اصول کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب اس کے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا تو اپنے بھائی پربھو سیوک کی مدد سے اس کے دفعیہ کی کوشش کرتی۔

صوفیہ: میں اس بارے میں بہت دیر سے غور کر رہی ہوں پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت مسیح نے مفلسی کو اس قدر اہمیت کیوں دی ؟ اور دولت و ثروت کو کیوں

قابل نفریں قرار دیا۔

پربھو سیوک : جاکر مسیح سے پوچھو۔

صوفیہ : تم کیا سمجھتے ہو۔

پربھو سیوک : میں کچھ نہیں سمجھتا اور نہ کچھ سمجھنا ہی چاہتا ہوں۔ کھانا، سونا اور کھیلنا یہی انسانی زندگی کے تین اصول ہیں۔ ان کے سوا سب گورکھ دھندا ہے۔ میں مذہب کو عقل سے بالکل الگ سمجھتا ہوں۔ مذہب کے تولنے کے لیے عقل اتنی ہی بیکار ہے۔ جتنا کہ بینگن تولنے کے لیے سنار کا کانٹا۔ مذہب مذہب ہے اور عقل عقل۔ یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یا پھر اس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ان جھگڑوں میں بے فائدہ سر کھپاتی ہو سنا! آج پاپا چلتے چلتے کیا کہہ گئے؟

صوفیہ : نہیں میرا دھیان ادھر نہ تھا۔

پربھوسیوک : یہی کہ مشینوں کے لیے جلد آرڈر دے دو۔اس زمین کو لینے کا انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا موقع بہت پسند آیا۔ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بنیاد پڑجائے۔ لیکن میرا جی اس کام سے گھبراتا ہے۔ میں نے یہ کاروبار سیکھا تو ہے پر سچ پوچھو تو میرا جی وہاں بھی نہ لگتا تھا۔ اپنا وقت فلسفہ ادب اور اشعار کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔ وہاں کے نامی گرامی عالموں اور مصنفوں سے بات چیت کرنے میں جو مسرت حاصل ہوتی تھی وہ کارخانہ میں کہاں نصیب تھی۔ سچ پوچھو تو میں اسی لیے وہاں گیا بھی تھا۔ اب عجیب کشمکش میں پڑا ہوں۔ اگر اس کام میں ہاتھ نہیں لگاتا تو پاپا کی دل شکنی ہوگی۔ وہ سمجھیں گے کہ میرے ہزاروں روپیوں پر پانی پھر گیا۔ شاید میری صورت سے نفرت کرنے لگیں۔ کام شروع کرتا ہوں تو یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں میری بیدلی سے نفع کے بجائے نقصان نہ ہو۔ مجھے اس کام میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو رہنے کو ایک جھونپڑی چاہیے اور فلسفہ و ادب کا ایک عمدہ کتب خانہ۔ اس کے سوا مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ یہ لو دادا کو تمھاری یاد آگئی۔ جاؤ! نہیں تو وہ یہیں آپہنچیں گے اور فضول کی بکواس میں گھنٹوں وقت خراب کر دیں گے۔

صوفیہ : یہ مصیبت میرے سر بُری پڑی ہے۔ جہاں کچھ پڑھنے بیٹھی۔ ان کا بلاوا

پہنچا۔ آج کل پیدائش کا بیان پڑھوا رہے ہیں۔ مجھے ایک ایک لفظ پر شک پیدا ہوتا ہے۔ کچھ بولوں تو بگر جائیں۔ بالکل بیگار کرنی پڑتی ہے۔

مسز سیوک بیٹی کو بلانے آرہی تھیں۔ آخری الفاظ ان کے کانوں میں پڑ گئے۔ تلملا گئیں۔ آکر بولیں "بیشک کلام پاک پڑھنا بیکار ہے۔ مسیح کا نام لینا پاپ ہے۔ تجھے تو اس اندھے بھکاری کی باتوں میں مزہ آتا ہے۔ ہندوؤں کے گپوڑے پڑھنے میں تیرا جی لگتا ہے۔ کلام پاک تو تیرے لیے زہر ہے۔ خدا جانے تیرے دماغ میں یہ خبط کہاں سے سما گیا ہے۔ جب دیکھتی ہوں تجھے اپنے پاک مذہب کی بُرائی کرتے ہی دیکھتی ہوں۔ تو اپنے دل میں بھلے ہی سمجھ لے کہ کلام پاک بالکل فرضی و مصنوعی ہے۔ لیکن اندھے کی آنکھوں میں اگر آفتاب کا نور نہ پہنچے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں بلکہ اندھے کی آنکھوں ہی کا قصور ہے۔ آج تین چوتھائی دنیا جس مہاتما کے نام پر جان دیتی ہے۔ جس مہاتما کی امرت بانی، آج ساری دنیا کو زندگی بخش رہی ہے۔ اس سے اگر تیرا دل منحرف ہو رہا ہے۔ تو یہ تیری نا فہمی اور بد بختی ہے۔ خدا تیرے حال پر رحم کرے۔"

صوفیہ : مہاتما عیسےٰ کی شان میں میرے منہہ سے کوئی نا مناسب بات کبھی نہیں نکلی۔ میں انھیں دھرم تیاگ اور نیک خیال کا اوتار سمجھتی ہوں۔ لیکن ان پر ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقیدت مندوں نے ان کے مواعظ میں جو نا واجب باتیں بھر دی ہیں یا ان کی ذات سے جو معجزے منسوب کر رکھے ہیں۔ ان پر بھی ایمان لاؤں اور یہ زیادتی کچھ حضرت مسیح کے ساتھ ہی نہیں کی گئی بلکہ دنیا کے سبھی مہاتماؤں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔

مسز سیوک : تجھے کلام پاک کے ہر لفظ پر ایمان لانا ہوگا ورنہ تو اپنا شمار حضرت مسیح کی بھیڑوں میں نہیں کر سکتی۔

صوفیہ : تو میں اپنے کو بدرجہ مجبوری ان کی امت کے باہر سمجھوں گی۔ کیوں کہ بائبل کے ہر لفظ پر ایمان لانا میرے لیے نا ممکن ہے۔

مسز سیکوک : تو کافر اور مردود ہے۔ حضرت مسیح تجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔

صوفیہ : اگر مذہبی تنگ خیالی سے دور رہنے کے سبب یہ نام دیے جاتے ہیں تو مجھے ان

کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔

مسز سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ ابھی تک انھوں نے اپنا قاتل وار نہ کیا تھا۔ مامتا ہاتھوں کو روکے ہوئے تھی، لیکن صوفیہ کی گستاخانہ بحث نے بالآخر ان کے تحمل کا خاتمہ کر دیا۔ بولی! حضرت مسیح سے منحرف ہونے والے کے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے۔"

پربھو سیوک: ماما۔ آپ سخت ظلم کر رہی ہیں۔ صوفیہ یہ کب کہتی ہے کہ مجھے حضرت مسیح پر اعتقاد نہیں ہے؟

مسز سیوک: ہاں وہ یہی تو کہہ رہی ہے۔ تمھاری سمجھ کا پھیر ہے۔ کلام پاک پر ایمان نہ لانے کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ اس کو حضرت یسوع کے معجزوں پر شبہ اور ان کے اخلاقی مواعظ پر شک ہے۔یہ ان کے کفارہ کی حقیقت کو نہیں مانتی۔ ان کے پاک احکامات کو تسلیم نہیں کرتی۔

پربھو سیوک: میں نے اس کو حضرت یسوع کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

صوفیہ: میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی۔ اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں۔ اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جاکر ایشور سیوک سے بولیں۔ "پاپا! آپ صوفی کو ناحق بلا رہے ہیں۔ وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔"

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے۔ "کیا کہا صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی؟"

مسز سیوک: ہاں ہاں صوفی! کہتی ہے۔ مجھے ان کے معجزوں ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک: (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ اپنی گمراہ

بھیڑوں کو راہ راست پر لا۔ کہاں ہے صوفی! مجھے اس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اُٹھاؤ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر۔ میں اس کے پیروں پر گروں گا۔ اس سے منتیں کروں گا۔ اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔

مسز سیوک : میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک : بیٹی ایسی باتیں نہ کرو، وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون، میری جان کی جان ہے۔ میں اسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینے سے لگایا تھا۔ سیاہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ وہ میری صوفیا پر ضرور رحم کرے گا۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا۔

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آکر بولے۔ ”بیٹی صوفی! کہاں ہے؟۔ ادھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا دلارا بیٹا تھا، غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا، گناہ گاروں کا شافع، دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے۔ جس کا دامن اتنا وسیع ہو۔ جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں، ساری بُرائیوں کے لیے جگہ ہو ؟ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو، کافروں کو، گناہ گاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی ؟ ہم کو بچا لینے والا کون تھا ؟“

یہ کہتے کہتے انھوں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔ ماں کے سخت الفاظ نے اس کے ضعیف غُصہ کو تیز کردیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں آکر سو رہی تھی، طبیعت بار بار پریشان ہو جاتی تھی۔ سوچتی تھی ابھی اس وقت اس گھر سے نکل جاؤں۔ کیا اس وسیع دنیا میں میرے لیے جگہ نہیں ہے ؟ میں کام کر سکتی ہوں۔ اپنا بوجھ آپ سنبھال سکتی ہوں۔ ضمیر کی آزدی کا خون کر کے اگر مجھ کو تفکراتِ زندگی سے فراغت ملی تو کیا؟ میرا ضمیر ایسی حقیر شئے نہیں ہے کہ پیٹ کے لیے اس کا خون کر دیا جائے۔ پربھو سیوک کو اپنی بہن سے ہمدردی تھی۔ مذہب پر ان کو اس سے کہیں کم اعتقاد تھا۔

لیکن وہ اپنی آزاد خیالی کو اپنے ہی دل تک محدود رکھتے تھے۔ گرجا چلے جاتے تھے۔گھر کی روزانہ دعاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی بھجن بھی گا لیتے تھے۔ وہ مذہب کو سنجیدہ خیالی کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ گرجا میں بھی اسی خیال سے جاتے، جس خیال سے تھیٹر دیکھنے۔ انھوں نے پہلے کمرہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں ماما تو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ مجھ پر ان کا قہر ابھی نازل ہو جائے۔ پھر چپکے سے صوفیہ کے پاس آئے اور بولے۔ صوفی کیوں نادان بنتی ہو ؟ سانپ کے منہہ میں انگلی ڈالنا کون سی عقل مندی ہے؟ دل میں جو چاہے خیال کرو۔ جن باتوں کو جی چاہے مانوں۔ پر اس طرح ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ۔ جماعت میں نکو بننے کی کیا ضرورت ؟ کون تمھارے دل کے اندر دیکھنے جاتا ہے؟"

صوفیہ نے بھائی کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں مذہب کے معاملہ میں قول و فعل کو یکساں رکھنا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں دونوں سے ایک ہی راگ نکلے۔ میرے لیے گندم نمائی جو فروشی نا ممکن ہے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے میں دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میرے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے۔ تو خدا کی خلق کی ہوئی وسیع دنیا تو ہے۔ کہیں بھی اپنا گز.ارہ کر سکتی ہوں۔ میں ساری تکلیفیں سہہ لوں گی۔ رسوائی کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ مگر اپنی نگاہوں میں گر کر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی مان لوں کہ میرے لیے چاروں طرف دروازے بند ہیں، تو بھی میں اپنے ضمیر کا سوداکرنے کی بہ نسبت بھوکوں مر جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہو۔

پربھو سیوک : دنیا اس سے کہیں زیادہ تنگ ہے جتنا تم خیال کرتی ہو۔
صوفیہ : قبر کے لیے تو جگہ نکل ہی آئے گی۔

یکایک ایشور سیوک نے جاکر اس کو سینہ سے لگا لیا۔ اور اپنے عقیدت مندانہ آنسوؤں سے اس کی تفتہ دلی کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ صوفیہ کو ان کی خوش اعتقادی پر رحم آگیا۔کون ایسا بے رحم ہے جو بھولے بھالے بچے کے اسپ چوبین کا مضحکہ اُڑا کر اس کا دل دُکھائے ؟ اس کے خواب مسرت کو پریشان کر دے۔

صوفیہ نے کہا۔ "دادا! آپ آکر اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کھڑے کھڑے آپ کو

تکلیف ہوتی ہے۔"
ایشور سیوک : جب تک تو اپنی زبان سے نہ کہے گی کہ میں یسوع پر اعتقاد رکھتی ہوں۔ تب تک میں تیرے دروازے پر اسی طرح فقیروں جیسا کھڑا رہوں گا۔
صوفیہ : دادا! میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں یسوع پر اعتقاد نہیں رکھتی ہوں۔ میں انھیں ایک بہت بڑا قابل تقلید بزرگ اور عفوو رحم کا اوتار سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔

ایشور سیوک نے صوفیہ کے رخساروں کو بوسہ دے کر کہا۔ "بس میرا دل مطمئن ہو گیا۔ یسوع تجھے اپنے دامن میں لے۔ اب میں بیٹھتا ہوں، مجھ کو کلام پاک سنا! میرے کانوں کو یسوع کے کلمات سے پاک بنا۔"

صوفیہ انکار نہ کر سکی۔ پیدائش کا ایک باب کھول کر پڑھنے لگی۔ ایشور سیوک آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگے۔ مسز سیوک نے یہ نظارہ دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ لیکن ایشور سیوک کے مرہم سے صوفیہ کے دل کا ناسور نہ اچھا ہو سکتا تھا۔ آئے دن اس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے اور اسے اپنے گھر میں رہنا روز بروز زیادہ نا قابلِ برداشت ہوتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پربھو سیوک کی ہمدردی بھی کم ہونے لگی۔ مسز جان سیوک کو اپنے تجارتی مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ صوفیہ کی دماغی پریشانیوں کو دفع کرتے۔ مسز سیوک کامل خود مختاری سے اس پر حکومت کرتی تھیں۔صوفیہ کے لیے سخت ترین آزمائش کا موقع وہ ہوتا تھا جب وہ ایشور سیوک کو بائبل پڑھ کرسناتی تھی۔ اس آزمائش سے بچنے کے لیے وہ ہر روز بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔پس اس کو اپنی اس مصنوعی زندگی سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ اس کا دل بار بار تقاضا کرتا کہ گھر سے کہیں نکل جائے اور آزادی کے ساتھ حق و باطل کی تحقیق میں مصروف ہو۔ لیکن اس خواہش کو عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچانا پڑتا تھا۔ پہلے پربھوسیوک سے اپنے شکوک کا اظہار کرکے وہ مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔ مگر جوں جوں ان کی بے رُخی بڑھنے لگی، صوفیہ کے دل سے بھی ان کی عزت اور محبت زائل ہونے لگی۔اس کے دل میں خیال پیداہوگیا کہ

پربھوسیوک کا دل صرف آسائش اور آرام طلبی کا غلام ہے جس کا اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار بھی جنھیں وہ پہلے بڑے شوق سے سنا کرتی تھی۔ اب اس کو محض فرضی باتوں سے مملو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اکثر ٹال دیا کرتی تھی کہ میرے سر میں درد ہے۔ سننے کو جی نہیں چاہتا! اپنے دل میں کہتی کہ ان کو ایسے پاک جذبات و خیالات کو قلمبند کرنے کا کیا حق ہے، جن کا اظہار دلی ایجاب اور تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

ایک روز جب گھر سے سب لوگ گرجا گھر جانے لگے، تو صوفیہ نے درد سر کا بہانہ کیا۔ اب تک وہ شکوک کے باوجود بھی اتوار کو گرجا چلی جایا کرتی تھی۔ پربھو سیوک اس کے دل کی بات تاڑ گئے۔ بولے۔ ”صوفی گرجا جانے میں تمھیں کیا عذر ہے؟ وہاں جاکر آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔“

پربھوسیوک بڑے شوق سے گرجا جایا کرتے تھے۔ وہاں انھیں ریا و نمود ڈھونگ اور ڈھکوسلہ کی فلسفیانہ تحقیقات کرنے اور طنز گوئیوں کے لیے مسالہ جمع کرنے کا موقع خوب ملتا تھا۔ صوفیہ کے لیے عبادت کھیل کی چیز نہ تھی، بلکہ تسکین و آسودگی کی۔ بولی۔ ”تمھارے لیے آسان ہے، مگر میرے لیے مشکل۔“

پربھوسیوک: کیوں اپنی جان وبال میں ڈالتی ہو؟ ماما کے مزاج سے خوب واقف ہو۔

صوفیہ: میں تم سے رائے نہیں طلب کرتی۔ اپنے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں۔

مسز سیوک نے آکر پوچھا۔ ”صوفی! کیا سر میں اتنا درد ہے کہ گرجا تک نہیں جا سکتیں۔

صوفیہ: جا کیوں نہیں سکتی پر جانا نہیں چاہتی۔

مسز سیوک: کیوں؟

صوفیہ: میری طبیعت نے گرجا جانے کا عہد نہیں کر رکھا ہے۔

مسز سیوک: کیا چاہتی ہے کہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟

صوفیہ: ہرگز نہیں۔ میں صرف اتنا ہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گرجا جانے کے لیے مجبور نہ کریں۔

ایشور سیوک پہلے ہی اپنے تامجان پر بیٹھ کر چل دیے تھے۔ جان سیوک نے آکر صرف اتنا پوچھا۔ "صوفی! کیا سر میں زیادہ درد ہے؟ میں ادھر سے کوئی دوا لیتا آؤں گا۔ ذرا پڑھنا کم کردو اور روز گھومنے جایا کرو۔

یہ کہہ کر وہ پربھو سیوک کے ساتھ فٹن پر جا بیٹھے۔ لیکن مسز سیوک اتنی آسانی سے اس کا گلا چھوڑنے والی نہ تھیں۔ بولیں۔ "تجھے یسوع کے نام سے کیوں اتنی نفرت ہے؟

صوفیہ : میں ان پر دل سے اعتقاد رکھتی ہوں۔

مسز سیوک : تو جھوٹ بولتی ہے۔

صوفیہ : اگر دل میں اعتقاد نہ ہوتا تو زبان سے ہرگز نہ کہتی۔

مسز سیوک : تو یسوع کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے ؟

صوفیہ : ہرگز نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ میری نجات اگر ہو سکتی ہے تو میرے اعمال کے ذریعے سے۔

مسز سیوک : تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا تیری نجات نہ ہوگی۔

یہ کہہ کر مسز سیوک بھی فٹن پر جا بیٹھیں، شام ہو گئی تھی۔ سڑک پر عیسائیوں کے دَل کوئی اوور کوٹ پہنے، کوئی ماگھ کی سردی سے سکڑے ہوئے خوش خوش گرجے چلے جارہے تھے۔ لیکن صوفیہ کو آفتاب کی کمزور کرنیں بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بیٹھ گئی۔ "تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا۔" یہ الفاظ اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھتے تھے۔ سوچنے لگی، میری تن پروری کی یہی مناسب سزا ہے میں صرف روٹیوں کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہوں۔ اتنی حقارت اور ذلت برداشت کر رہی ہوں۔ اس گھر میں کون میرا ہمدرد ہے۔ کون ہے۔ جو میرے مرنے کی خبر پاکر آنسو کی چار بوند گرا دے؟ شاید میرے مرنے سے لوگوں کو خوشی ہو۔ میں ان کی نظروں میں اتناگر گئی ہوں، ایسی زندگی پر لعنت ہے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ہندو گھروں میں مختلف عقائد کے لوگ کتنی محبت سے رہتے ہیں۔ باپ سناتنی ہے تو بیٹا آریہ سماجی۔ شوہر برھمو سماج میں ہے تو بیوی بت پرستوں میں۔ سبھی اپنے اپنے عقاید پر عامل ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں بولتا،

ہمارے یہاں آتما کچلی جاتی ہے۔ پھر بھی یہ دعویٰ ہے کہ ہماری تعلیم و تہذیب آزاد خیالی کے معاون ہیں! ہیں تو ہمارے یہاں بھی وسیع الخیال لوگ۔ پربھوسیوک ہی ان کی ایک مثال ہے لیکن ان کی وسیع الخیالی دراصل نافہمی ہے۔ ایسے وسیع الخیال آدمیوں سے تو تنگ خیال ہی اچھے۔ ان میں کچھ یقین کا مادہ تو ہے۔ بالکل بہروپیے تو نہیں ہیں۔ آخر ماما اپنے دل میں کیا سمجھتی ہیں کہ بات بات پر اپنے سخت کلامی کے تیروں سے مجھے چھیدنے لگتی ہیں؟ ان کے دل میں یہ خیال ہوگا کہ اس کا کہیں اور ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں انھیں دکھا دوں گی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہوں، اب اس گھر میں رہنا نرک میں رہنا ہے۔ اس بے حیائی کی روٹیاں کھانے سے بھوکوں مرجانا بہتر ہے۔ بلا سے۔ لوگ ہنسیں گے میں آزاد تو ہو جاؤں گی۔ کسی کے طعنے تو نہ سننے پڑیں گے۔

صوفیہ اٹھی اور کسی مقام کو تجویز کیے بغیر ہی احاطہ سے باہر نکل آئی۔ اس گھر کی ہوا اب اس کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ آگے بڑھتی جاتی تھی پر دل میں لگاتار سوال اٹھ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جب وہ گھنی آبادی میں پہنچی تو شہدوں نے اس پر ادھر ادھر سے آوازے کسنے شروع کیے۔ مگر وہ شرم سے سر نیچا کرنے کی بجائے ان آوازوں اور بُری نگاہوں کا جواب نفرت آمیز نگاہوں سے دیتی چلی جاتی تھی جیسے کوئی تیز پانی کی دھار پتھروں کو ٹھکراتی ہوئی آگے بہتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کشادہ سڑک پر آگئی جو دمسالو سیدھ گھاٹ کی طرف جاتی ہے۔

اس کے جی میں آیا۔ ذرا دریا کی سیر کرتی چلوں۔ شاید کسی بھلے آدمی سے ملاقات ہو جائے۔ جب تک دو چار آدمیوں سے شناسائی نہ ہو اور وہ میرا حال نہ جانیں، مجھ سے کون ہمدردی کا اظہار کرے گا؟ کون میرے دل کا حال جانتا ہے؟ ایسے رحم دل اشخاص اتفاق ہی سے ملتے ہیں۔ جب اپنے ماں باپ دشمن ہو رہے ہیں تو دوسرے سے بھلائی کی کیا امید؟

وہ اسی نا امیدی کی حالت میں چلی جا رہی تھی کہ یکایک اس کو ایک عالی شان محل نظر آیا جس کے سامنے بہت وسیع سبزہ زار تھا، اندر جانے کے لیے ایک اونچا پھاٹک تھا جس کے اوپر ایک سنہرا گنبد بنا ہو تھا۔ اس گنبد میں نوبت بج رہی تھی،

پھاٹک سے محل تک سُرخی کی ایک روش تھی۔ جس کے دونوں طرف بیلیں اور گلاب کی کیاریاں تھیں۔ سبزہ زار پر کتنے ہی مرد عورت بیٹھے ہوئے ماگھ کی سرد سرد ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ کوئی تکیہ دار چوکیوں پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

صوفیہ نے شہر میں ایسا پُر فضا مقام نہ دیکھا تھا۔ اس کو تعجب ہوا کہ شہر کے درمیانی حصہ میں بھی ایسے دلکش مقامات موجود ہیں، وہ ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ ''اب لوگ گرجا سے آگئے ہوں گے۔ مجھے گھر میں نہ دیکھ کر چونکیں گے تو ضرور سمجھ لیں گے۔ کہیں گھومنے گئی ہوگی۔ اگر رات بھر یہیں بیٹھی رہوں تو بھی وہاں کسی کو کچھ فکر نہ ہوگی۔ آرام سے کھا پی کر سو جائیں گے۔ ہاں دادا کو ضرور دکھ ہوگا۔ وہ بھی محض اس لیے کہ انھیں بائبل پڑھ کر سنانے والا کوئی نہیں، ماما تو دل میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا آنکھوں سے دور ہوگئی۔ میرا کسی سے تعارف نہیں۔ اسی سے کہا ہے کہ سب سے ملتے رہنا چاہیے۔ نہ جانے کب کس سے کام پڑ جائے، مجھے برسوں رہتے ہو گئے اور کسی سے راہ و رسم پیدا نہ کی۔ میرے ساتھ نینی تال میں یہاں کے کسی رئیس کی لڑکی پڑھتی تھی۔ بھلا سا نام تھا ہاں اندو، مزاج میں کتنی نرمی تھی۔ بات بات سے محبت ٹپکتی پڑتی تھی۔ ہم دونوں گلے میں باہیں ڈال کر ٹہلتی تھیں۔ وہاں کوئی لڑکی ایسی خوبصورت اور با اخلاق نہ تھی۔ میرے اور اس کے خیالات میں کتنی یکسانیت تھی۔ کہیں اس کا پتہ مل جاتا تو دس پانچ روز اس کے یہاں مہمان ہو جاتی۔ اس کے والد کا اچھا سا نام تھا۔ ہاں یاد آگیا۔ کنور بھرت سنگھ۔ پہلے یہ بات نہ سوجھی تھی ورنہ ایک کارڈ لکھ کر ڈال دیتی، مجھے بھول تو کیا گئی ہوگی۔ اتنی بے انس تو نہ معلوم ہوتی تھی۔ کم سے کم انسانی اخلاق کی پرکھ ہو جائے گی۔

مجبوری میں ہمیں ان لوگوں کی یاد آتی ہے جن کی صورت بھی بھول چکی ہوتی ہے۔ پردیس میں اپنے محلّہ کا نائی یا کہار بھی مل جائے تو ہم اس کے گلے مل جاتے ہیں۔ چاہے دیس میں اس سے کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کی ہو۔

صوفیہ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی سے کنور بھرت سنگھ کا پتہ دریافت کروں۔ اسی اثنا میں محل کے سامنے والے پختہ چبوترہ پر فرش بچھ گیا۔ کئی آدمی ستار۔ بیلا۔ مردنگ لیے ہوئے آ بیٹھے اور ان سازوں کے ساتھ سُر ملا کر کئی نو عمر لوگ ایک ہی لہجہ میں

گانے لگے۔

پاک جنگ میں کبھی بھول کر ڈر نہیں کھونا ہوگا
بجلی کا ہو وار سروں پر نہیں مگر رونا ہوگا
دشمن سے بدلہ کا من میں بیج نہیں بونا ہوگا
گھر میں کان روئی دے کر پھر تجھے نہیں سونا ہوگا
دیش داغ کو خونیں جل سے خوش ہو کر دھونا ہوگا
دیش کاج کی بھاری گٹھری سر پر رکھ ڈھونا ہوگا
آنکھیں لال بھویں ٹیڑھی کر کرودھ نہیں کرنا ہو گا
بل بیدی پر تجھے خوشی سے چڑھ کر کٹ مرنا ہوگا
فانی ہے یہ جسم موت سے کبھی نہیں ڈرنا ہوگا
سچائی کی راہ چھوڑ کر پیر نہیں دھرنا ہوگا
ہوگی جیت ضرور دھرم کی یہی بھاؤ بھرنا ہوگا
ماتری بھوم کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہوگا

گانے میں نہ کشش تھی نہ لطافت۔ لیکن وہ طاقت وہ تحریک بھری ہوئی تھی جو ہم آہنگی کا خاصہ ہے۔ ایثار و ترقی کا مقدس پیغام وسیع خلاء میں ساکت آسمان میں اور صوفیہ کے غیر مطمئن دل میں گونجنے لگا۔ وہ ابھی تک مذہبی تحقیقات ہی میں مصروف رہتی تھی۔ قومی پیغام کے سننے کا موقع اسے کبھی نہ ملا تھا۔ شمع سے نور نکلتا ہے۔ اسی طرح صوفیہ کی روئیں روئیں سے وہی آواز نکل رہی تھی۔ ”ماتری بھوم کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہوگا۔!“

اس کے دل میں ایک ترنگ اٹھی کہ میں بھی جاکر گانے والوں کے ساتھ گانے لگتی۔ طرح طرح کے جذبات و خیالات پیدا ہونے لگے۔ ”میں کسی دور دراز ملک میں جاکر ہند کی فریاد سناتی۔ یہیں کھڑی ہوکر کہہ دوں۔ میں اپنے کو ملکی خدمت کے لیے بھینٹ کرتی ہوں۔ اپنی زندگی کے مقصد پر ایک تقریر کرتی کہ ہم اپنی قسمت کا رونا رونے کے لیے اپنی تنزل پذیر حالت پر آنسو بہانے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔

سماں بندھا ہوا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے اسی قسم کے جذبات کی

تصویریں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی نغمہ کی آواز گونج رہی تھی کہ اچانک اسی احاطہ کے اندر ایک کھپریل کے مکان میں آگ لگ گئی، جب تک لوگ ادھر دوڑیں۔ آگ کے شعلے زیادہ بلند ہوگئے۔ سارا میدان جگمگا اٹھا درخت اور پودے چمک دار روشنی کے سمندر میں نہا اٹھے۔ گانے والوں نے فوراً اپنے اپنے ساز وہیں چھوڑے۔ دھوتیاں سمیٹ کر باندھیں۔ آستین چڑھائیں اور آگ بجھانے دوڑے، محل کے اندر سے اور بھی کتنے جوان نکل پڑے۔ کوئی کنوئیں سے پانی لانے دوڑا۔ کوئی آگ کے منہ میں گھس کر اندر کی چیزوں کو نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ لیکن کہیں وہ پریشانی، وہ گھبراہٹ، وہ سراسیمگی، وہ کہرام، وہ دوڑو دوڑو کا شور، وہ خود کچھ بھی نہ کرتے ہوئے دوسروں کو حکم دینے کا غُل نہ تھا۔ جو ایسی آسمانی مصیبتوں کے نزول کے موقعوں پر بالعموم ہوا کرتا ہے، سبھی لوگ ایسے عمدہ اور باقاعدہ طریقہ پر اپنا اپنا کام کر رہے تھے کہ ایک بوند پانی بھی بیکار نہ گرنے پاتا تھا۔ آگ کا زور بھی لمحہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ لوگ ایسی خوبی سے آگ میں کودتے تھے گویا وہ پانی کا حوض ہے۔

ابھی آگ اچھی طرح نہ بجھی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی ''دوڑو! دوڑو! آدمی ڈوب رہا ہے۔'' محل کی دوسری طرف ایک پختہ تالاب تھا جس کے کنارے جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ گھاٹ پر ایک چھوٹی ۔ کشتی کھونٹے سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔ آواز سنتے ہی آگ بجھانے والی جماعت سے کئی آدمی نکل کر تالاب کی طرف لپکے اور ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے، ان کے کودنے کی آواز ''دھم دھم'' صوفیہ کے کانوں میں پڑی۔ ایشور کا کیسا قہر کہ ایک ساتھ دو خاص عناصر میں یہ ہیجان! اور ایک ہی جگہ پر! وہ اُٹھ کر تالاب کی طرف جانا ہی چاہتی تھی کہ دفعتاً اس نے ایک شخص کو پانی کا ڈول لیے پھسل کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا، چاروں طرف آگ فرو ہو چکی تھی۔ لیکن جہاں وہ شخص گرا تھا وہاں اب تک بڑے زوروں کے ساتھ جل رہی تھی، آگ کی لپٹ اپنا خوف ناک منہ کھولے ہوئے اس بدنصیب شخص کی طرف لپکی۔ وہ لپٹ اس کو نگل جاتی لیکن صوفیہ بجلی کی تیزی کے ساتھ شعلہ کی طرف دوڑی اور اس شخص کو کھینچ کر باہر نکال لائی، یہ سب ایک لمحہ

میں ہو گیا۔ غریب آدمی کی جان بچ گئی لیکن صوفیہ کا نازک جسم آگ کی لپٹ سے جھلس گیا، وہ شعلوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

صوفیہ نے تین روز تک آنکھیں نہیں کھولیں۔ دل نہ جانے کس کس دنیا کی سیر میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی عجیب خوف ناک نظارے دکھائی دیتے۔ کبھی یسوع کی شانت مورتی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ کبھی کسی عقیلہ خاتون کی چاند سی صورت کے درشن ہوتے۔ جنھیں یہ سینٹ میری سمجھتی۔''

جب چوتھے روز صبح کے وقت اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے کو ایک آراستہ کمرہ میں پایا۔ گلاب اور صندل کی خوسبو آرہی تھی۔ سامنے کرسی پر وہی خاتون بیٹھی ہوئی تھی جس کو اس نے حالت خواب میں سینٹ میری سمجھا تھا۔ اور سرہانے ایک سن رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی آنکھوں سے رحم ٹپکا پڑتا تھا، انھیں کو شاید اس نے نیم خوابی کی حالت میں عیسےٰ سمجھا تھا، خواب محض یادداشت کی تکرار ہے۔

صوفیہ نے نحیف لہجہ میں پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں ؟ ماما کہاں ہیں؟''

بڈھے آدمی نے کہا۔ ''تم کنور بھرت سنگھ کے گھر میں ہو۔ تمھارے سامنے رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ تمھارا جی اب کیسا ہے؟''

صوفیہ : اچھی ہوں۔ پیاس لگی ہے ماما کہاں ہیں؟ پاپا کہاں ہیں؟ آپ کون ہیں؟

رانی : یہ ڈاکٹر گنگولی ہیں۔ تین دن سے تمھاری دوا کر رہے ہیں۔ تمھارے پاپا ماما کون ہیں؟

صوفیہ : پاپا کا نام مسٹر جان سیوک ہے ہمارا بنگلہ سگرا میں ہے۔

ڈاکٹر : اچھا تو تم مسٹر جان سیوک کی بیٹی ہو۔ ہم ان کو جانتاہے۔ ابھی بلاتا ہے۔

رانی : کسی کو ابھی بھیج دوں؟

صوفیہ : کوئی جلدی نہیں ہے۔ آجائیں گے۔ میں نے جس آدمی کو پکڑ کر کھینچا تھا اس کی کیا حالت ہے؟

رانی : بیٹی ایشور! کی دیا سے وہ بہت اچھی طرح ہے۔ اسے ذرا بھی آنچ نہیں لگی۔ وہ میرا بیٹا ونے ہے ابھی آتا ہوگا۔ تمھیں نے تو اس کی جان بچائی۔ اگر تم دوڑ کر نہ پہنچ جاتیں تو آج نہ جانے کیا ہوتا۔ میں تمھارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

تم میرے خاندان کی حفاظت کرنے والی دیوی ہو۔

صوفیہ : جس گھر میں آگ لگی تھی اس کے آدمی سب بچ گئے؟

رانی : بیٹی! وہ تو محض تماشہ تھا۔ ونّے نے یہاں ایک سیوا سمتی بنا رکھی ہے۔ جب شہر میں کوئی میلہ ہوتا ہے۔ یا کہیں سے کسی حادثے کی خبر آتی ہے تو سمتی وہاں پہنچ کر ضرور خدمت اور مدد کرتی ہے۔ اس روز سمتی وہاں پہنچ کر سمتی کے امتحان کے لیے کنور صاحب نے یہ تماشہ کیا تھا۔

ڈاکٹر : کنور صاحب دیوتا ہے۔ کتنے غریب لوگوں کی اِچھا پوری کرتا ہے۔ یہ سمتی ابھی تھوڑے دن ہوئے بنگال گئی تھی۔ یہاں سورج گرہن کا اشنان ہونے والا ہے۔ لاکھوں جاتری دور دور سے آئے گا۔ اسی کے لیے یہ سب تیاری ہو رہا ہے۔

اتنے میں ایک نوجوان حسینہ وہاں آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ سے شمع روشن کی طرح نور کی کرنیں چھٹک رہی تھیں۔ گلے میں موتیوں کے ہار کے سوا اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ صبح کی سفید روشنی مجسم نمودار تھی۔

صوفیہ نے اسے ایک لمحہ تک غور سے دیکھا۔ پھر بولی۔ ”اندو! تم یہاں کہاں؟ آج کتنے دنوں کے بعد تمھیں دیکھا ہے؟“

اندو چونک پڑی۔ تین دن سے برابر صوفیہ کو دیکھ رہی تھی۔ خیال آتا تھا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ پر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہ پڑتا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہی یادداشت تازہ ہوگئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ گلاب کھل گیا۔ بولی ”اوہو صوفی! تم ہو۔“

دونوں سہیلیاں گلے مل گئیں۔ یہ وہی اندو تھی جو صوفیہ کے ساتھ نینی تال میں پڑھتی تھی۔ صوفیہ کو امید نہ تھی کہ اندو اتنی محبت سے ملے گی۔ اندو پچھلی باتوں کو یاد کرکے کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی گلے مل جاتی۔ اپنی ماں سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ ماں اس کی محبت کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھی۔ بالآخر صوفیہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”اندو! ایشور کے لیے اب میری زیادہ تعریف نہ کرو۔ ورنہ میں تم سے نہ بولوں گی۔ اتنے عرصہ تک کبھی خط بھی نہ لکھا۔ منہ دیکھے کی محبت کرتی ہو۔“

رانی : نہیں بیٹی صوفی! اندو مجھ سے کئی بار تمھارا ذکر کر چکی ہے۔ یہاں کتنے ہی رئیسوں کی لڑکیاں اس سے ملنے آتی ہیں پر کسی سے اس کا دل نہیں ملتا۔ کسی سے

ہنس کر بولتی تک نہیں۔ تمھارے سوا میں نے اسے اور کسی کی تعریف کرتے نہیں سنا۔

اندو : بہن! تمھاری شکایت بجا ہے۔ پر کروں کیا؟ مجھے خط ہی نہیں لکھنا آتا۔ ایک تو بڑی بھول یہ ہوئی کہ تمھارا پتہ نہیں پوچھا۔ اور اگر پتہ معلوم بھی ہوتا تو بھی میں خط نہ لکھ سکتی۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ہنسنے نہ لگو۔ میرا خط کبھی ختم ہی نہ ہوتا اور نہ جانے کیا کیا لکھ جاتی۔

کنور صاحب کو معلوم ہوا کہ صوفیہ باتیں کر رہی ہے تو وہ بھی شکریہ ادا کرنے کے لیے وہاں آئے۔ پورے چھ فٹ کے آدمی تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے بال لمبی داڑھی۔ موٹے کپڑے کا ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ صوفیا نے ایسا نورانی چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے دل میں رشیوں کی جو شکل قایم کر رکھی تھی وہ بالکل اس قسم کی تھی۔ اس بڑے جسم میں بیٹھی ہوئی بڑی آتما دونوں آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ صوفی نے تعظیماً اٹھنا چاہا لیکن کنور صاحب شیریں اور سادہ لہجہ میں بولے۔ ”بیٹی لیٹی رہو۔ تمھیں اٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ لو میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تمھارے پاپا سے میری ملاقات ہے۔ پر کیا معلوم تھا کہ تم مسٹر سیوک کی بیٹی ہو۔ میں نے ان کو بلایا ہے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں ابھی تمھیں جانے نہ دوں گا۔ یہ کمرہ اب تمھارا ہے۔ اور یہاں سے چلے جانے پر بھی تم کو ایک مرتبہ روزانہ یہاں آنا پڑے گا۔ (رانی سے) جانھوی! یہاں پیانو منگوا کر رکھ دو! آج مس سہراب جی سے صوفیہ کی ایک روغنی تصویر تیار کروالو۔ سہراب جی زیادہ ہوشیار ہیں پر میں نہیں چاہتا کہ صوفیہ کو ان کے سامنے بیٹھنا پڑے۔ وہ تصویر ہم کو یاد دلاتی رہے گی کہ کس نے سخت مصیبت کے وقت ہماری مدد کی۔

رانی : کچھ اناج بھی دان کرا دوں؟

یہ کہہ کر رانی نے ڈاکٹر گنگولی کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کنور صاحب فوراً بولے۔ ”پھر وہی ڈھکوسلے! اس زمانہ میں جو غریب ہے اسے غریب ہونا چاہیے۔ جو بھوکوں مرتا ہے اسے بھوکوں مرنا چاہیے۔ جب گھنٹے دو گھنٹے کی محنت سے کھانے بھر کو مل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں کوئی شخص بھوکوں مرے؟ دان

نے ہماری قوم میں جتنے سست آدمی پیدا کردیے ہیں۔ اتنے کل نشوں نے مل کر بھی پیدا نہ کیے ہوں گے۔ دان کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

رانی: رشیوں نے بھول کی کہ تم سے صلاح نہ لے لی۔

کنور: ہاں میں ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ لوگ یہ کاہلی بداعمالی اور بدی کا بیج بو رہے ہیں۔ دان کاہلی کی جڑ ہے۔ اور کاہلی تمام گناہوں کی جڑ۔ پس دان ہی گناہوں کی جڑ ہے۔ کم سے کم اس کا معاون تو ضرور ہی ہے۔ دان نہیں۔ اگر جی چاہتا ہو تو دوستوں کی دعوت کردو۔

ڈاکٹر: صوفیہ! تم راجہ صاحب کا بات سنتا ہے؟ تمھار ایسوع تو دان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتاہے۔ تم کنور صاحب سے کچھ نہیں کہتا۔

صوفیہ نے اندو کی طرف دیکھا اور مسکراکر آنکھیں نیچی کر لیں۔ گویا کہہ رہی تھی کہ میں ان کی عزت کرتی ہوں ورنہ جواب دینے کے ناقابل نہیں ہوں۔

صوفیہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی باہمی محبت کا مقابلہ اپنے گھر والوں سے کر رہی تھی، آپس میں کتنی محبت ہے! ماں باپ دونوں اندو پر جان دیتے ہیں۔ ایک میں بدنصیب، ہوں کہ کوئی منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ چار دن یہاں پڑے ہو گئے کسی نے خبر تک نہ لی۔ کسی نے کھوج ہی نہ کی ہوگی۔ ماما نے تو سمجھ لیا ہوگا۔ کہیں ڈوب مر گئی۔ جی میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا سر سے ایک بلا ٹل گئی۔ میں ایسے نیک دل لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری ان سے کیابرابری۔

اگرچہ یہاں کسی برتاؤ میں رحم کا شائبہ بھی نہ تھا لیکن صوفیہ کو انھیں اپنی اس قدر خاطر و مدارات کرتے دیکھ کر اپنی بیکسی کی حالت پر رنج ہو تا تھا۔ اندو سے بھی تکلف کا برتاؤ کرنے لگی۔ اندو اس کو محبت سے تم کہتی تھی پر وہ اس کو آپ کہہ کر باتیں کرتی تھی۔

کنور صاحب کہہ گئے تھے۔ میں نے مسٹر سیوک کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ صوفیہ کو اب یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ آ نہ رہے ہوں۔ آتے ہی آتے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں گے۔ میرے سر پھر وہی مصیبت پڑے گی۔ اندو سے اپنی مصیبت کی داستان کہوں تو شاید اس کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہو۔ یہ خادمہ یہاں

فضول ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اندو آئی بھی تو اس سے کس طرح باتیں کروں گی؟ پاپا کے آنے سے قبل ایک بار اندو سے تنہائی میں ملنے کاموقع مل جاتا تو اچھا ہوتا۔کیا کروں؟ اندو کو بلا بھیجوں؟ نہ جانے کیا کرنے لگی؟ پیانو بجاؤں تو شاید سن کر آئے۔

اس طرف اندو بھی صوفیہ سے کتنی ہی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ رانی جی کے سامنے اس کو دل کی باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ خوف تھا کہ صوفیہ کے باپ اس کو لیتے گئے۔ تو میں پھر اکیلی ہوجاؤں گی، ڈاکٹر گنگولی نے کہا تھا کہ انھیں زیادہ باتیں نہ کرنے دینا۔ آج آرام سے سولیں تو پھر کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس لیے وہ آنے کا ارادہ کر کے بھی رُک جاتی تھی۔ آخر نو بجتے بجتے وہ بے صبر ہو گئی۔ آکر خادمہ کو اپنا کمرہ صاف کرنے کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا۔ اور صوفیہ کے سرہانے بیٹھ کر بولی۔

"کیوں بہن بہت کمزوری تو نہیں معلوم ہوتی؟"

صوفیہ : بالکل نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل اچھی ہو گئی ہوں۔

اندو : تمھارے پاپا کہیں تم کو اپنے ساتھ لے گئے تو میری جان نکل جائے گی۔ ان کے آتے ہی خوش ہوکر جاؤگی اور شاید پھر کبھی مجھے یاد بھی نہ کرو گی؟

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ جذبات کے نامناسب جوش کو ہم اکثر اپنے آنسوؤں سے چھپاتے ہیں۔ اندو کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پر وہ مسکرا رہی تھی۔

صوفیہ بولی۔ آپ مجھے بھول سکتی ہیں پر میں آپ کو کیسے بھولوں گی؟

وہ اپنا دردِ دل سنانے ہی کو تھی کہ غیرت نے زبان بند کر دی۔ بات پھیر کر بولی۔" میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آیا کروں گی۔"

اندو : میں ابھی یہاں سے تم کو پندرہ روز تک نہ جانے دوں گی۔ مذہب کی رکاوٹ نہ ہوتی تو کبھی نہ جانے دیتی۔ اماں جی تم کو اپنی بہو بنا کر چھوڑتیں۔ تمھارے اوپر بے طرح ریجھ گئی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں تمھارا ہی چرچا کرتی ہیں۔ ونے بھی تمھارے ہاتھوں بکا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤگی تو سب سے زیادہ رنج اسی کو ہوگا۔ ایک راز کی بات تم سے کہتی ہوں۔ اماں جی تم کو کوئی چیز تحفہ کے طور پر دیں تو انکار نہ کرنا۔ ورنہ ان کو بہت رنج ہوگا۔

اس محبت آمیز ضد نے تامل کا لنگر اکھاڑ دیا۔ جو اپنے گھر میں روزانہ سخت الفاظ کے سننے کا عادی ہو اس کے لیے اس قدر ہمدردی کافی سے زیادہ تھی۔ اب صوفیہ کو اندو سے اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھنا آئین دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ دردناک لہجہ میں بولی۔ ''اندو! میرا بس ہوتا تو کبھی رانی جی کے چرنوں کو نہ چھوڑتی پر اپنا کیا بس ہے ؟ یہ محبت اور کہاں ملے گی؟''

اندو اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنی فطری سادگی سے بولی۔ ''کہیں شادی کی بات چیت ہو رہی ہے کیا؟''

اس کی سمجھ میں شادی کے سوا لڑکیوں کے اس قدر غمگین ہونے کا کوئی سبب نہ تھا۔

صوفیہ : میں نے تو عہد کر لیا ہے شادی نہ کروں گی۔

اندو : کیوں؟

صوفیہ : اس لیے کہ شادی سے مجھ کو اپنی مذہبی آزادی ترک کر دینا ہوگی۔ مذہب آزاد خیالی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ میں اپنی آتما کو کسی مذہب کے ہاتھ نہیں بیچنا چاہتی۔ مجھے ایسا عیسائی شوہر ملنے کی امید نہیں جس کادل اتنا فیاض ہوکہ وہ میرے مذہبی شکوک سے در گزر کر سکے۔ میں حالات سے مجبور ہو کر حضرت یسوع کو خدا کا بیٹا اور نجات دہندہ نہیں مان سکتی۔ نہ مجبوری سے گرجا میں ایشور کی عبادت کرنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ میں یسوع کو ایشور نہیں تسلیم کر سکتی۔

اندو : میں تو سمجھتی تھی کہ تمھارے یہاں ہم لوگوں کے یہاں سے کہیں زیادہ آزادی ہے۔ جہاں چاہو تنہا جا سکتی ہو۔ ہمارا تو گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

صوفیہ : لیکن اس قدر مذہبی تنگ خیالی تو نہیں ہے؟

اندو : نہیں کوئی کسی کو پوجا پاٹ کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ بابو جی روز گنگا اشنان کرتے ہیں۔ گھنٹوں شوجی کی پوجا کرتے ہیں۔ اماں جی کبھی بھول کر بھی اشنان کرنے نہیں جاتیں۔ نہ کسی دیوتا کی پوجا ہی کرتی ہیں۔ پر بابو جی کبھی ہٹ نہیں کرتے۔ بھگتی کا انحصار تو اپنے اعتقاد اور خیال پر ہے۔ ہم بھائی بہن کے خیالات میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں کرشن کو مانتی ہوں۔ ونے ایشور کی ہستی سے بھی منکر ہے۔ پر

بابو جی ہم لوگوں سے کبھی کچھ نہیں کہتے اور نہ ہم بھائی بہن میں کبھی اس بات پر بحث مباحثہ ہوتا ہے۔

صوفیہ : ہماری آزادی جسمانی ہے اور اس لیے جھوٹی۔ آپ کی آزادی روحانی ہے اور اس لیے سچی۔

اندو : تم گرجا کبھی نہیں جاتیں۔

صوفیہ : پہلے جبراً جاتی تھی اب کے نہیں گئی۔ اس پر گھر والے بہت ناراض ہوئے۔ بُری طرح میری بے عزتی کی گئی۔

اندو نے محبت آمیز سادگی سے کہا۔ ''وہ لوگ ناراض ہوئے ہوں گے تو تم بہت روئی ہوگی؟''

صوفیہ : پہلے رویا کرتی تھی۔ اب پرواہ نہیں کرتی۔

اندو : مجھے تو کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا ہے تو دل پر تیر سا لگتا ہے۔ دن بھر روتی ہی رہ جاتی ہوں۔ آنسو ہی نہیں تھمتے۔ وہ بات بار بار دل میں چبھا کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے کسی کے غصہ پر رونا نہیں آتا رونا آتا ہے اپنے اوپر کہ میں نے کیوں انھیں ناراض کیا۔ کیوں مجھ سے ایسی بھول ہوئی۔

صوفیہ کو وہم ہوا کہ اندو مجھے اپنی خطا بخشی سے نادم کرنا چاہتی ہے۔ ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ ''بولی میری جگہ پر آپ ہوتیں تو ایسا نہ کہتیں۔ آخر کیا آپ اپنے مذہبی خیالات کو ترک کر دیتیں۔

اندو : یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کرتی پر گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔

صوفیہ : آپ کی ماتا جی اگر آپ کو جبراً کرشن کی عبادت کرنے سے روکیں۔ تو کیا آپ مان جائیں گی؟

اندو : ہاں میں تو مان جاؤں گی۔ امّاں کو ناراض نہ کروں گی۔ کرشن تو عالم الغیب ہیں۔ انھیں خوش رکھنے کے لیے عبادت کی ضرورت نہیں۔ عبادت تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے ہے۔

صوفیہ : (تعجب سے آپ کو ذرا بھی دماغی تکلیف نہ ہوگی۔

اندو : ضرور ہوگی پر ان کی خاطر سے سہ لوں گی۔

صوفیہ : اچھا اگر وہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی شادی کرنا چاہیں تو۔

اندو (شرماتے ہوئے) وہ مسئلہ تو حل ہوچکا۔ ماں باپ نے جس سے مناسب سمجھا بیاہ دیا۔ میں نے زبان تک نہ کھولی۔

صوفیہ : ارے یہ کب؟

اندو : اس کو تو دو سال ہوگئے (آنکھیں نیچی کرکے) اگر میرا اپنا بس ہوتا تو میں ان کو کبھی نہ بیاہتی۔ چاہے کنواری ہی رہتی۔ میرے مالک مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن میں ان کے دل کے صرف ایک چوتھائی کی مالکہ ہوں۔ اس کے تین حصے رفاہ عام کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ ایک کے بدلے چوتھائی پاکر کون آسودہ ہو سکتا ہے ؟ مجھے تو باجرے کی پوری بسکٹ کے چوتھائی حصے سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو رفع ہوجاتی ہے جو کھانا کھانے کا واقعی مقصد ہے۔

صوفیہ : آپ کی مذہبی آزادی میں تو خلل نہیں ڈالتے؟

اندو : نہیں۔ انھیں اتنی فرصت کہاں ہے؟

صوفیہ : تب تو میں آپ کو مبارک باد دوں گی۔

اندو : اگر کسی قیدی کو مبارکباد دینا مناسب ہو تو شوق سے دو۔

صوفیہ : زنجیر محبت کی ہو تو؟

اندو : ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے مبارک باد دینے کے لیے اصرار کرتی۔ میں بندھ گئی وہ آزاد ہیں۔ مجھے یہاں آئے تین مہینے ہونے آتے ہیں پر تین دفعہ سے زیادہ نہیں آئے اور وہ بھی ایک ایک گھنٹہ کے لیے! اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دس منٹ میں موٹر آسکتی ہے۔ مگر اتنی فرصت کس کو ہے؟ ہاں خطوط سے اپنی ملاقات کا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ اور وہ خطوط بھی کیسے ..تے ہیں؟ اول سے آخر تک اپنے دکھڑوں سے بھرے ہوئے۔ آج یہ کام ہے کل یہ کام ہے۔ ان سے ملنے جانا ہے۔ ان کاخیر مقدم کرنا ہے۔ میونسپلٹی کے چیرمین کیا ہوگئے راج مل گیا۔ جب دیکھو۔ وہی دھن سوار اور سب کاموں کے لیے فرصت ہے۔ اگر فرصت نہیں ہے تو صرف یہاں

آنے کی! میں تم کو متنبہ کیے دیتی ہوں کسی ملک و قوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گی۔ تم اس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاؤ کی چیز رہو گی۔

صوفیہ : میں تو پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکی۔ سب سے الگ ہی الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔ میں ٹھیک راستہ پر چلوں گی یا غلط پر، یہ ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لینا چاہتی ہوں۔ میں بالغ ہوں اور اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتی ہوں۔ تمام عمر کسی کی حفاظت میں نہیں رہنا چاہتی کیوں کہ اس حفاظت کے معنی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اندو : کیا تم اپنی ماما اور پاپا کے تحت میں نہیں رہنا چاہتی۔

صوفیہ : نا۔ ماتحتی میں نوعیت کا نہیں۔ صرف حدود کا فرق ہے۔

اندو : تو میرے ہی گھر کیوں نہیں رہتیں؟ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ اور اماں جی تو تم کو آنکھوں کی پتلی بناکر رکھیں گی۔ میں چلی جاتی ہوں تو وہ اکیلی گھبرایا کرتی ہیں۔ تمھیں پا جائیں تو پھر گلا نہ چھوڑیں۔ کہو تو اماں سے کہوں۔ یہاں تمھاری آزادی میں کوئی دخل نہ دے گا۔ بولو۔ کہوں جاکر اماں سے ؟

صوفیہ : نہیں ابھی بھول کر بھی نہیں۔ آپ کی اماں جی کو جب معلوم ہوگا کہ اس کے ماں باپ اس کی بات نہیں پوچھتے تو میں ان کی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔ جس کی اپنے گھر میں عزت نہیں اس کی باہر بھی عزت نہیں ہوتی۔

اندو : نہیں صوفی! اماں جی کا سو بھاؤ بالکل نرالا ہے۔ جس بات سے تمھیں اپنی بے عزتی کا خوف ہے۔ وہی بات اماں جی سے عزت پانے کی چیز ہے۔ وہ خود اپنی ماں سے کسی بات پر ناراض ہوگئی تھیں۔ جب سے مائیکے نہیں گئیں۔ نانی مر گئیں پر اماں جی نے انھیں معاف نہیں کیا، سینکڑوں بلاوے آئے پر ان کو دیکھنے تک نہ گئیں۔ انھیں جوں ہی یہ بات معلوم ہوگی۔ تمھاری دونی عزت کرنے لگیں گی۔

صوفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، "بہن! میری لاج اب آپ ہی کے ہاتھ ہے۔"

اندو نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا۔ "وہ مجھے اپنی لاج سے کم عزیز نہیں ہے۔"

ادھر مسٹر جان سیوک کو کنور صاحب کا خط ملا تو آکر بیوی سے بولے۔ "دیکھا میں کہتا نہ تھا کہ صوفی پر کوئی مصیبت آپڑی۔ یہ دیکھو۔ کنور بھرت سنگھ کا خط ہے۔ تین روز سے ان کے گھر پڑی ہوئی ہے۔ ان کے ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بجھانے میں وہ بھی مصروف تھی۔ کہیں لپٹ لگ گئی۔"

مسز سیوک : یہ سب بہانے ہیں۔ مجھے اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا۔ جس کا دل خدا سے پھر گیا اسے جھوٹ بولنے سے کیا ڈر۔ یہاں سے بگڑ کر گئی تھی۔ سمجھا ہوگا؟ گھر سے نکلتے ہی پھولوں کی سیج بچھی ہوئی ملے گی۔ جب کہیں ٹھکانا نہ لگا تو یہ خط لکھوا دیا۔ اب آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدانے اس کے کفر کی یہ سزا دی ہو۔

جان سیوک : چپ بھی رہو۔ تمھاری بیدردی پر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ میں نے تم جیسی سخت دل کی عورت نہیں دیکھی۔

مسز سیوک : میں تو نہیں جاتی۔ تمھیں جانا ہو جاؤ!

جان سیوک : مجھے تو دیکھ رہی ہو۔ مرنے کی فرصت نہیں ہے۔ اسی پانڈے پور والی زمین کے بارہ میں بات چیت کر رہا ہوں۔ ایسے موذی سے پالا پڑا ہے کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا۔ دیہاتیوں کو جو لوگ سادہ لوح کہتے ہیں۔ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ ان سے زیادہ چالاک آدمی ملنا مشکل ہے۔ تمھیں اس وقت کوئی کام نہیں ہے۔ موٹر منگائے دیتا ہوں۔ شان سے چلی جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔

ایشور سیوک وہیں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ہوئے یاد الٰہی میں محو تھے۔ جیسے بہرا آدمی مطلب کی بات سنتے ہی چونک پڑتا ہے۔ موٹرکار کا ذکر سنتے ہی دھیان ٹوٹ گیا۔ بولے۔ "موٹر کی کیا ضرورت ہے؟ کیا دس پانچ روپے کاٹ رہے ہیں؟ یوں اڑانے کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا۔ کیا گاڑی پر جانے سے شان میں فرق آجائے گا؟ تمھاری موٹر دیکھ کر کنور صاحب رعب میں نہ آئیں گے۔ انھیں خدا نے بہتیری موٹریں دی ہیں۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں لو! اب دیر نہ کرو! میری صوفی بیچاری وہاں بیگانوں میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے اتنے دن کس طرح کاٹے ہوں گے؟ خدا اس کو راہ راست پر لائے۔ میری آنکھیں اس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ جب

سے وہ گئی ہے۔ کلام پاک سننے کی نوبت نہیں آئی۔ یسوع ! اسے اپنے دامن میں لے!
وہاں اس بیچاری کا کون پوچھنے والا ہے؟ امیروں کے گھر میں غریبوں کا گزر کہاں؟

جان سیوک : اچھا ہی ہوا۔ یہاں ہوتی تو روزانہ ڈاکٹر کی فیس نہ دینی پڑتی؟

ایشور سیوک : ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کے فضل سے میں خود تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہوں۔ گھر والوں کی محبت و تیمار داری ڈاکٹر کی دواؤں سے کہیں زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ میں اپنی بچی کو گود میں لے کر کلام پاک سناتا۔ اس کے لیے خدا سے دعا مانگتا۔

مسز سیوک : تو آپ ہی چلے جائیے نا۔

ایشور سیوک : بسرو چشم۔ میرا ٹانگہ منگوا دو۔ ہم سب کو چلنا چاہیے۔ گمراہوں کو محبت ہی راہ راست پر لاتی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ بیٹی! امیروں کے سامنے عاجزی دکھلانی پڑتی ہے۔ ان سے برابری کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔

جان سیوک : مجھے ابھی ساتھ نہ لیے جائیے۔ میں کسی دوسرے موقع پر جاؤں گا۔ اس وقت وہاں بجز رسمی شکر گزاری کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ میں ان کا شکریہ ادا کروں گا، وہ میرا۔ میں اس تعارف کو غیبی امداد سمجھتا ہوں۔ اطمینان سے ملوں گا۔ کنور صاحب کا شہر میں خاصا دباؤ ہے۔ میونسپلٹی کے صدر ان کے داماد ہیں۔ ان کی مدد سے پانڈے پور والی زمین مجھ کو بہت آسانی سے مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ چند حصے بھی خرید لیں۔ مگر آج ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔

ایشور سیوک : مجھے تمھاری اس فراست پر ہنسی آتی ہے، جس آدمی سے ربط ضبط پیدا کر کے تمھارے اتنے کام نکل سکتے ہیں اس سے ملنے میں بھی تمھیں اتنا تامل ہے۔ تمھارا وقت اتنا قیمتی ہے کہ نصف گھنٹہ کے لیے بھی وہاں نہیں جا سکتے ؟ اول ہی ملاقات میں ساری باتیں طے کر لیناچاہتے ہو۔ ایسا سنہرا موقع پاکر بھی تمھیں اس سے فائدہ اٹھانا نہیں آتا۔

جان سیوک : خیر آپ کا اصرار ہے تو میں ہی چلا جاؤں گا۔ میں ایک ضروری کام کر رہا تھا۔ پھر کرلوں گا۔ آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں (بیوی سے) تم بھی تو چل رہی ہو۔

مسز سیوک : مجھے ناحق لیے چلتے ہو۔ مگر خیر چلو!

کھانا کھا کر چلنا طے ہوا۔ انگریزی رواج کے مطابق یہاں دن کا کھانا ایک بجے ہوتا تھا۔ درمیانی وقت تیاریوں میں صرف ہو' مسز سیوک نے اپنے زیور نکالے جنھیں انھوں نے عالم ضعیفی میں بھی ترک نہیں کیا تھا۔ اپنا بہترین گون اور بلاؤز نکالا۔ اتنا بناؤ سنگار وہ اپنے سال گرہ کے دن کے علاوہ اور کسی تقریب میں نہ کرتی تھیں۔ مطلب تھا صوفیہ کو جلانا اس کو دکھانا کہ تیرے چلے آنے سے میں رو رو کر مری نہیں جارہی ہوں۔ کوچوان کو گاڑی دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ پربھو سیوک کو بھی ساتھ لے چلنے کی رائے ہوئی۔ لیکن جان سیوک نے اس کے کمرہ میں جاکر دیکھا تو اس کا پتہ نہ تھا۔ اس کی میز پر ایک فلسفہ کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اٹھ کر کہیں چلا گیا ہے، در اصل یہ کتاب تین روز سے اسی طرح کھلی پڑی تھی۔ پربھو سیوک کو اسے بند کر کے رکھ دینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ صبح سے دو گھڑی رات گئے تک شہر کا چکر لگایا کرتا۔ صرف دو بار کھانا کھانے گھر پر آتا تھا۔ایسا کوئی اسکول نہ تھا جہاں اس نے صوفی کو نہ تلاش کیا ہو۔ کوئی شناسا، کوئی دوست ایسا نہ تھا۔ جس کے گھر جاکر اس نے کھوج نہ کی ہو۔ تمام دن کی داد ودہش کے بعد رات کو مایوس ہوکر لوٹ آتا اور چارپائی پر لیٹ کر گھنٹوں سو چتا اور روتا، کہاں چلی گئی ؟ پولس کے دفتر میں دن میں دس دس بار جاتا اور پوچھتا۔ کچھ پتہ چلا؟ اخباروں میں بھی اعلان کردیا تھا۔ وہاں بھی روزانہ کئی کئی بار جاکر دریافت کرتا۔ اسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ صوفی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ آج بھی حسب معمول ایک بجے تھکا ہوا اور اداس لوٹ کر گھر آیا۔ تو جان سیوک نے مژدہ سنایا کہ صوفی کا پتہ مل گیا۔

پربھو سیوک کا چہرہ شگفتہ ہوگیا بولا۔ ”سچ؟ کہاں ہے؟ کیا اس کا کوئی خطہ آیا ہے؟“

جان سیوک : کنور بھرت سنگھ کے مکان پر ہے۔ آؤ کھانا کھالو۔ تمھیں بھی وہاں چلنا ہے۔

پربھوسیوک : میں تو لوٹ کر کھانا کھاؤں گا۔ بھوک غائب ہوگئی ہے تو اچھی طرح؟

مسز سیوک : ہاں ہاں۔ بہت اچھی طرح ہے! خدا نے یہاں سے روٹھ کر جانے کی سزا دے دی۔

پربھو سیوک : ماما! خدانے آپ کا دل نہ جانے کس قدر پتھر کا بنایا ہے۔ کیا گھر سے آپ ہی آپ روٹھ کر چلی گئی تھی؟ آپ ہی نے اسے نکالا اور اب بھی آپ کو اس پر ذرا رحم نہیں آتا۔

مسز سیوک : گناہوں پر رحم کرنا گناہ ہے۔

پربھوسیوک : اگر صوفی گمراہ ہے تو عیسائیوں میں 99 فیصدی آدمی گمراہ ہیں! وہ مذہب کا سوانگ نہیں بھرنا چاہتی۔ اس میں یہی عیب ہے۔ نہیں تو حضرت عیسےؑ پر جتنا اعتقاد اس کو ہے اتنا انھیں بھی نہ ہوگا جو عیسےؑ پر جان دینے کا دم بھرتے ہیں۔

مسز سیوک : خیر معلوم ہو گیا کہ تم اس کی وکالت خوب کر سکتے ہو۔ مجھے ان دلائل کے سننے کی فرصت نہیں۔

یہ کہہ کر مسز سیوک وہاں سے چلی گئیں، کھانے کا وقت آیا۔ لوگ میز پر بیٹھے۔ پربھو سیوک بہت اصرار کرنے پر بھی نہ گیا۔ تینوں آدمی فٹن میں بیٹھے تو ایشور سیوک نے چلتے چلتے جان سیوک سے کہا۔ ”صوفی کو ضرور ساتھ لانا اور اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ یسوع تمھیں عقل عطا کریں اور کامیابی بھی۔

ذرا دیر میں فٹن کنور صاحب کے مکان پر پہنچ گئی، کنور صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز سیوک نے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں صوفیہ سے ایک لفظ بھی نہ بولوں گی۔ دور ہی سے کھڑی دیکھتی رہوں گی۔ لیکن جب صوفیہ کے کمرہ میں پہنچی اور اس کا پژمردہ چہرہ دیکھا تو دل پر قابو نہ رہا۔ ماتا ابل پڑی بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس بہاؤ میں صوفیہ کی دلی کدورت بہہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ ماں کی گردن میں ڈال دیے اور کئی منٹ دونوں محبت کے روحانی مزہ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ جان سیوک نے صوفیہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر پربھو سیوک آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ بہن کو چھوتے ہوئے اسے خوف ہوتا تھا کہ مبادا دل نہ پھٹ جائے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اور زبان دونو ں ساکت و بیکار ہو جاتے تھے۔

جب جان سیوک صوفی کو دیکھ کر کنور صاحب کے ساتھ باہر چلے گئے۔ تو مسز سیوک بولیں۔ ”تجھے اس دن کیا سوجھی کہ یہاں سے چلی آئی یہاں! اجنبیوں میں پڑے پڑے تیری طبیعت گھبراتی رہی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تیری بات بھی نہ پوچھتے ہوں گے۔“

صوفیہ : نہیں ماما۔ یہ بات نہیں ہے۔ گھمنڈ تو یہاں کسی میں چھو تک نہیں گیا ہے۔ سبھی ہمدردی اور انکسار کے پتلے ہیں۔ یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ مجھے آج چوتھے دن ہوش آیا ہے اگر ان لوگوں نے اتنی محبت سے تیمار داری نہ کی ہوتی تو شاید مجھے ہفتوں تک بستر علالت پر پڑا رہنا ہوتا۔ میں اپنے گھر میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنے ہی آرام سے رہتی۔

مسز سیوک : تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی۔ تو کیا یہ لوگ اتنا کرنے سے بھی رہے؟

صوفیہ : نہیں ماما یہ لوگ نہایت خلیق اور نیک ہیں۔ خود رانی جی عموماً میرے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھلتی رہتی ہیں۔ کنور صاحب دن میں کئی کئی بار-آکر دیکھ جاتے ہیں اور اندو سے تو میرا بہناپا سا ہو گیا ہے۔ یہی لڑکی ہے جو میرے ساتھ نینی تال میں پڑھا کرتی تھی۔

مسز سیوک (چڑکر) تجھے دوسروں میں سب وصف ہی وصف نظر آتے ہیں۔ برائیاں سب گھر والوں ہی کے حصّے میں پڑی ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے مذہب بھی اپنے سے اچھے ہیں۔

پربھو سیوک : ماما! آپ تو ذراسی بات پر بگڑ اٹھتی ہیں۔اگر کوئی اپنے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کیا اس کا احسان نہ مانا جائے؟ احسان فراموشی سے برا کوئی عیب نہیں ہے۔

مسز سیکوک : یہ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ گھر والوں کی برائی کرنا تو اس کی عادت میں داخل ہے۔ یہ مجھے جتانا چاہتی ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ دیکھوں یہاں سے جاتی ہے تو کون سی سوغات دے دیتے ہیں۔ کہاں ہیں تیری رانی صاحبہ؟ میں بھی ان کا شکریہ ادا کروں۔ ان سے اجازت لے لو اور گھر

چلو۔ پاپا اکیلے گھبرا رہے ہوں گے۔
صوفیہ : وہ تو تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ وہ یہاں کب کی آ گئی ہوتیں۔ لیکن شاید ہمارے درمیان میں بغیر بلائے آنا مناسب نہ سمجھتی ہوں گی۔
پربھو سیوک : ماما! ابھی صوفی کو یہاں دو چار دن اور آرام سے پڑا رہنے دیجیے۔ ابھی اس کو اٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ دیکھیے نا کتنی کمزور ہوگئی ہے۔
صوفیہ : رانی جی بھی یہی کہتی تھیں کہ ابھی میں تم کو نہ جانے دوں گی۔
مسز سیوک : یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا ہی جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں تجھ کو اتنا پیار کون کرے گا؟
صوفیہ : نہیں ماما! آپ میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہیں۔ میں اب یہاں ایک دن بھی اور نہیں رہنا چاہتی۔ میں اب ان لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ دوں گی۔ مگر ایک بات مجھے معلوم ہو جانی چاہیے۔ مجھ پر پھر تو ظلم نہ کیا جائے گا؟ میری مذہبی آزادی میں پھر کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی؟
پربھو سیوک : صوفی! تم خواہ مخواہ ان باتوں کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟ تمھارے ساتھ کون سا جبر کیا جاتا ہے؟ ذرا سی بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔
مسز سیوک : نہیں۔ تو نے یہ بات پوچھ لی۔ بہت اچھا کیا۔ میں بھی تجھے مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ میرے گھر میں یسوع کے مخالفین کے لیے جگہ نہیں ہے۔
پربھو سیوک : آپ ناحق اس سے الجھتی ہیں۔ سمجھ لیجیے کوئی ہذیان بک رہی ہے۔
مسز سیوک : کیا کروں؟ میں نے تمھاری طرح فلسفہ نہیں پڑھا۔ واقع کو خواب نہیں سمجھ سکتی۔ یہ وصف تو فلاسفروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ مجھے اپنی اولاد سے محبت نہیں ہے۔ خدا جانتا ہے۔ میں نے تمھاری خاطر کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔ اس وقت تمھارے پاپا ایک دفتر میں کلرک تھے۔ گھر کا سارا کام کاج مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ بازار جاتی۔ کھانا پکاتی۔ جھاڑو لگاتی۔ تم دونوں ہی بچپن میں کمزور تھے۔ روز ہی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ گھر کے کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو ڈاکٹروں کے پاس جاتی۔ اکثر تمھیں گود میں لیے ہی لیے راتیں کٹ جاتیں۔ اتنی قربانی سے پالی ہوئی اولاد کو جب ایشور سے منحرف ہوتے دیکھتی ہوں تو میں غم و غصہ سے پاگل ہو

جاتی ہوں۔ تمھیں میں سچا، ایمان کا پکا، یسوع کا بندہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے بر عکس جب تمھیں میں یسوع سے منہ موڑتے دیکھتی ہوں۔ ان کی زندگی ان کے وعظ ان کے معجزات پر شبہ کرتے پاتی ہوں۔ تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ اس کی صورت نہ دیکھوں۔ مجھے اپنا مسیح ساری دنیا سے اولاد سے یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

صوفیہ : آپ کو یسوع اتنا عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی روح اپنا ایمان اس سے کم عزیز نہیں۔ میں ان پر کسی قسم کا جبر ہوتا برداشت نہیں کر سکتی۔

مسز سیوک : خدا تجھے اس کفر کی سزا دے گا۔ میری اس سے یہی دعا ہے کہ وہ پھر مجھے تیری صورت نہ دکھائے۔

یہ کہہ کر مسز سیوک کمرہ سے باہر نکل آئیں۔ رانی صاحبہ اور اندو ادھر سے آرہی تھیں۔ دروازہ پر ان سے ملاقات ہوگئی، رانی صاحبہ مسز سیوک کے گلے لپٹ گئیں اور تشکر آمیز الفاظ کا دریا بہا دیا، مسز سیوک کو اس خالص محبت میں تصنع کی بو آئی۔ لیکن رانی صاحبہ کو مردم شناسی کا ملکہ نہ تھا اندو سے بولیں۔ "دیکھ! مس صوفیہ سے کہہ دے کہ ابھی جانے کی تیاری نہ کرے۔ مسز سیوک! آپ میری خاطر سے صوفیہ کو ابھی دو چار روز اور یہاں رہنے دیں۔ میں آپ سے عاجزانہ اصرار کرتی ہوں۔ ابھی میری طبیعت اس کی باتوں سے سیر نہیں ہوئی اور نہ میں اس کی کچھ خدمت ہی کر سکی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ میں خود اس کو آپ کے پاس پہنچا دوں گی۔ جب تک وہ یہاں رہے گی آپ سے کم از کم روزانہ ایک مرتبہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ خوش نصیب ہیں۔ آپ کو ایسی اچھی لڑکی ملی۔ رحم اور روشن خیالی کا مجسمہ ہے۔ ایثار تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

مسز سیوک : میں اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آپ جتنے دن چاہیں شوق سے رکھیں۔

رانی : بس بس میں اتنا ہی چاہتی تھی۔ آپ نے مجھے خرید لیا۔ آپ سے ایسی ہی امید بھی تھی۔ آپ خود اس قدر خلیق نہ ہوتیں تو صاحبزادی میں یہ اوصاف کہاں سے آتے؟ ایک میری اندو ہے کہ باتیں کرنے کا بھی طریقہ نہیں جانتی۔ ایک بڑی

ریاست کی رانی ہے پر اتنا بھی نہیں جانتی کہ میری سالانہ آمدنی کیا ہے۔ لاکھوں کے زیورات صندوق میں پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں چھوتی تک نہیں۔ ہاں گھومنے کو کہہ دیجیے تو دن بھر گھوما کرے، کیوں اندو جھوٹ کہتی ہوں؟

اندو : تو کیا کروں؟ من بھر سونا لادے بیٹھی رہوں؟ مجھے تو اس طرح اپنے جسم کو جکڑ نا اچھا نہیں لگتا۔

رانی : سنی آپ نے اس کی باتیں؟ گہنوں سے اس کا جسم جکڑ جاتا ہے۔ آیئے! اب آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔

مسز سیوک : مسٹر سیوک باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔دیر ہو چکی ہے۔

رانی : واہ اتنی جلدی! کم از کم آج یہیں کھانا نو تناول فرما لیجئے۔ لنچ کھا کر ہوا کھانے چلیں گے۔پھر لوٹ کر کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔ رات کا کھانا کھا لینے کے بعد میری موٹر آپ کو گھر پہنچا دے گی۔

مسز سیوک انکار نہ کر سکیں۔ رانی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے محل کی سیر کرانے لگیں، نصف گھنٹہ تک مسز سیوک گویا عالم طلسمات کی سیر کرتی رہیں۔ محل کیا تھا۔ تفریح، آسائش شوق اور عظمت کی تماشا گاہ تھا۔ سنگ مرمر کے فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ چلتے وقت ان میں پیر گھس جاتے تھے۔ دیواروں پر دلفریب مرصع کاری۔ کمروں کی دیواروں پر بڑے بڑے قد آدم آیئنے نقش و نگار اس قدر خوب صورت کہ آنکھیں محو ہو جائیں۔ شیشہ کی قیمتی کمیاب اشیاء قدیم مصوروں کی صنعت کے نمونے۔ چینی کے بڑھیا گلدان۔ جاپان۔ چین یونان۔ اور ایران کے صنعتی کمال کی عمدہ مثالیں۔ سونے کے گملے لکھنؤ کے بولتے ہوئے کھلونے۔ اٹلی کے بنے ہوئے ہاتھی دانت کے پلنگ۔ لکڑی کے نفیس طاق، دیوار گیریں، کشتیاں۔ آنکھوں کو لبھانے والی پنجروں میں چہکتی ہوئی طرح طرح کی چڑیاں۔ صحن میں سنگ مرمر کا حوض اور اس کنارے سنگ مرمر کی حوریں۔ مسز سیوک نے ان ساری چیزوں میں سے کسی کی تعریف نہیں کی۔ کہیں بھی حیرت یا مسرت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ انھیں خوشی کے بجائے حسد ہوتا تھا۔ حسد میں قدردانی کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ایک یہ خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ان کو عیش و تکلف۔ آسائش و تفریح کی

اتنی چیزیں دے رکھی ہیں۔ ایک بد قسمت میں ہوں کہ ایک جھونپڑے میں پڑی ہوئی دن کاٹ رہی ہوں! سجاوٹ اور بناوٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ ضروری چیزیں بھی کافی نہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہم صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتے ہیں۔ یہاں کوئی تنکا تک نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس کا غم کیا۔ آسمان کی بادشاہت میں تو امیروں کا حصہ نہیں۔ وہ تو ہماری میراث ہوگی۔ امیر لوگ کتوں کی طرح دتکارے جائیں گے۔ کوئی جھانکنے تک نہ پائے گا۔

اس خیال سے انھیں گونہ تشفی ہوئی۔ حسد کی ہمہ گیری ہی مساوات عامۃ کے اصولوں کی ہر دل عزیزی کا سبب ہے۔ رانی صاحبہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ ان کو میری کوئی چیز پسند نہ آئی۔ کسی چیز کی تعریف نہ کی۔ میں نے ایک ایک تصویر اور ایک ایک پیالہ کے لیے ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں۔ ایسی چیزیں یہاں اور کس کے پاس ہیں؟ اب نایاب ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی نہ ملیں گی۔ کچھ نہیں یا تو یہ بن رہی ہیں یا ان میں اتنی پرکھ نہیں کہ ایسی چیزوں کی قدر کر سکیں۔

اتنے پر بھی رانی صاحبہ مایوس نہیں ہوئیں۔ ان کو اپنا باغ دکھانے لگیں۔ طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائے۔ مالی بڑا ہوشیار تھا۔ ہر پودے کے حالات و اوصاف بیان کرتا جاتا تھا۔ کہاں سے آیا۔ کب آیا۔ کس طرح نصب کیا گیا۔ کیسے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ پر مسز سیوک کا منہ اب بھی نہ کھلا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے ایک ایسی ننھی سی جڑی بوٹی دکھائی جو یروشلم سے لائی گئی تھی۔ کنور صاحب اسے خود ہی نہایت احتیاط سے لائے تھے۔ اور اس میں ایک ایک پتی کا نکلنا ان کے لیے ایک ایک خوش خبری تھی۔ مسز سیوک نے فوراً ہی اس گملے کو اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور پتیوں کو بوسہ دیا۔ بولیں۔ ”میری خوش نصیبی ہے کہ اس نایاب شے کی زیارت نصیب ہوئی۔“

رانی نے کہا۔ ”کنور صاحب خود اس کی نہایت قدر کرتے ہیں۔ اگر یہ آج خشک ہو جائے تو دو روز تک وہ یقیناً کھانا نہ کھائیں۔“

اس اثنا میں چائے تیار ہوئی۔ مسز سیوک لنچ پر بیٹھیں۔ رانی جی کو چائے سے رغبت نہ تھی۔ ونے اور اندو کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ ونے کے عادات و

اخلاق۔ خدمت و اطاعت۔ جود وسخا کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ مسز سیوک کا جی اکتا گیا۔ اس کے جواب میں وہ اپنی اولاد کی ثنا خوانی نہ کر سکتی تھیں ؟

ادھر مسٹر جان سیوک اور کنور صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے لنچ تناول کر رہے تھے، چائے اور انڈوں سے کنور صاحب کو رغبت نہ تھی۔ ونے بھی ان دونوں چیزوں کو قابل ترک سمجھتے تھے۔ جان سیوک ان آدمیوں میں سے تھے جن کی شخصیت جلد ہی دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی باتیں اس قدر عالمانہ ہوتی تھیں کہ اور لوگ اپنی باتیں بھول کر انھیں کی سننے لگتے تھے۔ اور یہ بات نہ تھی کہ ان کی گفتگو میں فقط لسانی ہو۔ ان کے معلومات وسیع تھے۔ ان کو طبائع انسانی کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ ذہانت خداداد تھی جس کے بغیر کسی مجلس میں عزت نہیں مل سکتی۔ اس وقت وہ ملک کی صنعت و حرفت کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ موقع سے ان تجاویز کا بھی ذکر کرتے جاتے تھے۔ جو ان حالات کے اصلاح کے لیے انھوں نے سوچ رکھی تھیں۔ آخر میں بولے۔ "ہمارے ملک کی نجات صنعت و حرفت کی ترقی میں ہے۔ اس سگریٹ کے کارخانہ سے کم از کم ایک ہزار آدمیوں کے کسب معاش کی صورت نکل آئے گی اور ان کا بار زراعت کے سر سے دور ہو جائے گا۔ جتنی زمین کو ایک شخص بخوبی کاشت کر سکتا ہے اس میں گھر بھر کا لگا رہنا بالکل فضول ہے۔ میرا کارخانہ ایسے بیکاروں کو اپنی روٹی کمانے کا موقع دے گا۔

کنور صاحب : لیکن جن کھیتوں میں اس وقت اناج بویا جاتا ہے انھیں میں تمباکو کی کاشت ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اناج اور مہنگا ہو جائے گا۔

جان سیوک : میری سمجھ میں تمباکو کی کاشت کا اثر جوٹ۔ سن۔ تلہن۔ اور افیون پر پڑے گا۔ رفتنی والی جنس کچھ کم ہو جائے گی۔ غلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر ہم اس اراضی کو بھی مزروعہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ جو ابھی تک پرتی پڑی ہوئی ہے۔

کنور صاحب : لیکن تمباکو کوئی اچھی چیز تو نہیں۔ اس کا شمار مسکرات میں ہے اور اس کا اثر صحت پر بُرا ہی پڑتا ہے۔

جان سیوک (ہنس کر) یہ سب ڈاکٹروں کی محض فرضی باتیں ہیں جن پر سنجیدگی

سے غور کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اگر ہم زندگی بسر کرنا چاہیں تو زندگی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ دودھ میں دق وسل کے جراثیم ہیں۔ گھی میں چربی کی مقدار زیادہ ہے۔ چائے اور قہوہ محرک ہیں۔ یہاں تک کہ سانس لینے سے بھی امراض کے جراثیم بدن میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق تو ساری دنیا کیڑوں سے بھری ہوئی ہے۔ جو ہماری جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ کاروباری لوگ ان گورکھ دھندوں میں نہیں پھنستے۔ ان کا تعلق صرف حالات حاضرہ سے ہوا کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ممالک غیر سے کروڑوں روپے کے سگریٹ اور سگار آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان روپیوں کے بہاؤ کو دوسرے ملکوں میں جانے سے روکیں۔ اس کے بغیر ہماری اقتصادی زندگی کی نمو ناممکن ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے کنور صاحب کو فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ کنور صاحب کے شکوک بہت کچھ رفع ہو چکے تھے۔ عموماً معترض کو لاجواب ہوتے دیکھ کر ہم زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ بچہ بھی بھاگتے ہوئے کتے پر بیخوف ہو کر پتھر پھینکتا ہے۔

جان سیوک بیخوف ہو کر بولے۔ میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کر کے یہ رائے قائم کی اور آپ کے اس خادم کو (پربھو سیوک کی طرف اشارہ کرکے) اس فن میں ماہر ہونے کے لیے امریکہ بھیجا۔ میری کمپنی کے بیشتر حصے فروخت ہوچکے ہیں لیکن ابھی روپے وصول نہیں ہوئے۔ ان اطراف میں ابھی تک مشترکہ کاروبار کرنے کا رواج نہیں۔ لوگوں میں اعتبار نہیں۔ اس لیے میں نے ابھی صرف دس فی صدی سرمایا وصول کر کے کام شروع کر دینا تجویز کیا ہے۔ سال دو سال میں جب امید سے زیادہ کامیابی ہوگی۔ اور سالانہ نفع ہونے لگے گا۔ تو سرمایہ خود بہ خود دوڑا ہوا چلا آئے گا۔ چھت پر بیٹھا ہوا کبوتر آ آ کی آواز سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور زمین پر نہیں اترتا۔ مگر تھوڑا سا دانہ بکھیر دیجیے تو فوراً اتر آتا ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اول ہی سال ہم کو 25 فی صدی منافع ہوگا۔ پراسپکٹس حاضر ہے۔ اسے بغور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے منافع کا اندازہ کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے خواہ زیادہ ہو جائے کم تو ہو ہی نہیں سکتا۔

کنور صاحب: پہلے ہی سال 25 فی صدی ؟

جان سیوک : جی ہاں۔ بڑی آسانی سے آپ سے میں حصہ خریدنے کی درخواست کرتا۔ لیکن جب تک ایک سال کا منافع دکھلا نہ دوں اصرار نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس حالت میں ممکن ہے۔ حصے برابر پر نہ مل سکیں۔ سو کے حصے شاید دو سو پر ملیں۔

کنور صاحب : مجھے اب ایک ہی شک اور ہے۔ اگر اس کاروبار میں اس قدر منافع ہو سکتا ہے تو اب تک ایسی کمپنیاں کیوں نہ قائم ہوئیں ؟

جان سیوک (ہنس کر)۔ اس لیے کہ ابھی تک تعلیم یافتہ جماعت میں کاروبار کی تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں کی رگ رگ میں غلامی بھری ہوئی ہے۔ وکالت یا سرکاری ملازمت کے سوا اور کسی طرف نگاہ جاتی ہی نہیں۔ دو چار کمپنیاں کھلیں بھی لیکن انھیں کسی ماہر کی رائے اور تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو بہت مہنگا پڑا، مشینری منگانے میں ایک کے دو دینے پڑے۔ بندوبست معقول نہ ہو سکا مجبوراً ان کو کاروبار بند کرنا پڑا۔ یہاں بالعموم سبھی کمپنیوں کا یہی حال ہے ڈائرکٹروں کی جیبیں بھری جاتی ہیں۔ حصے بیچنے اور اشتہار دینے میں لاکھوں روپے اڑا دیئے جاتے ہیں۔ نہایت فیاضی سے دلالوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ عمارتوں پر سرمایہ کا بیشتر حصہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ منیجر کو بھی بہت زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ڈائرکٹر صاحبان اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ منیجر اپنی تنخواہ سے مستفید ہوتا ہے۔ دلال اپنی دلالی لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس طرح سارا سرمایہ اوپر ہی اوپر اڑ جاتا ہے۔ میرا اصول ہے کم سے کم خرچ اور زیادہ سے زیادہ نفع۔ میں نے دلالی ایک کوڑی نہیں دی۔ اشتہاروں کی مد اڑا دی۔ یہاں تک کہ میں نے منیجر کو بھی صرف پانچ سو روپے مشاہرہ دینا طے کیا ہے۔ حالاں کہ کسی دوسرے کارخانہ میں ایک ہزار آسانی سے مل جاتے۔ اس پر گھر کا آدمی۔ ڈائرکٹروں کے بارہ میں بھی میری یہ تجویز ہے کہ سفر خرچ کے سوا کچھ نہ دیا جائے۔

کنور صاحب دنیاوی آدمی نہ تھے۔ ان کا زیادہ وقت صرف مذہبی کتب کے مطالعہ کی نذر ہوتا تھا۔ وہ کسی ایسے کام میں شریک نہ ہونا چاہتے تھے جو ان کی مذہبی یکسوئی میں خلل انداز ہو۔ برے لوگوں نے انھیں انسانی عادات کا نکتہ چین بنا دیا تھا۔ انھیں

کسی پر اعتبار نہ ہوتا تھا۔ مدرسوں اور یتیم خانوں کو چندہ دیتے ہوئے وہ بہت ڈرتے تھے اور اکثر ان معاملات میں حدود مناسب سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔ مستحقین کو بھی ان سے مایوس ہو جانا پڑتا تھا۔ لیکن احتیاط میں نفع کا یقین ہو جانے پر حد سے زیادہ بے احتیاطی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسٹر جان سیوک کی تقریر تاجرانہ معاملہ فہمی سے مملو تھی۔ مگر کنور صاحب پر اس سے زیادہ اثر ان کی شخصیت کا پڑا۔ وہ اب ان کی نگاہوں میں صرف دولت کے پجاری نہ تھے۔ بلکہ ایک خیر خواہ دوست۔ ایسا شخص انھیں مغالطہ نہ دے سکتا تھا۔ بولے۔ "جب آپ اتنی کفایت سے کام کریں گے تو آپ کا کارخانہ ضرور سر سبز ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ آپ کو شاید ابھی معلوم نہ ہو۔ میں نے یہاں ایک سیوا سمیتی قائم کر رکھی ہے۔ کچھ دنوں سے یہی خبط سوار ہے۔ اس میں اس وقت تقریباً ایک سو والنٹیر ہیں۔ میلوں میں عوام کی حفاظت اور خدمت کرنا ان کا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کو مالی مشکلات سے ہمیشہ کے لیے فراغت کردوں۔ ہمارے یہاں کی کام کرنے والی جماعتیں اکثر روپیہ کی کمی کی وجہ سے صرف چند روز زندہ رہتی ہیں۔ میں اپنی اس جماعت کو مضبوط بنانا چاہتا ہوں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ اس سے ملک میں کچھ بہتری ہو۔ میں اس کام میں کسی سے کچھ مدد نہیں لینا چاہتا۔ اس کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری رکھنے کے لیے میں ایک مستقل سرمایا کی فراہمی کا بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھ کر دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کے کار خانے میں حصے لے لینے سے میرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کے خیال میں کس قدر روپیہ لگا دینے سے ایک ہزار ماہوار کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

جان سیوک کی کاروباری طمع نے ابھی ان کے نیک ارادوں کو زائل نہیں کیا تھا۔ کنور صاحب نے ان کی رائے پر فیصلہ چھوڑ کر انھیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ اگر ان کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مسئلہ در پیش ہوگا تو نفع کا تخمینہ بتلانے میں زیادہ احتیاط سے کام لیتے۔ غیروں سے چال بازی کرنا قابل عفو سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے خود غرضی کے بندے کم ملیں گے۔ جو دوستوں سے دغا کریں۔ سادہ مزاج کے آدمیوں کے سامنے فریب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔

جان سیوک ایسا جواب دینا چاہتے تھے جس میں اپنے فائدہ کا لحاظ بھی ہو اور اپنے ضمیر کا بھی۔ بولے۔ "کمپنی کی جو کچھ حالت ہے وہ میں نے بے کم و کاست آپ سے بیان کر دی۔ اس کے جاری رکھنے کی ترکیبیں بھی آپ سے بتلا چکا ہوں۔ میں نے کامیابی کے جملہ ذرائع پر نگاہ رکھی ہے۔ اس پر بھی ممکن ہے۔ مجھ سے غلطیاں ہوگئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاتھوں میں صرف ایک کھلونا ہے۔ اس کا سارا قیاس ساری عقل مندی ساری خیر اندیشی۔ قدرتی طاقت کی محتاج ہے تمباکو کی پیداوار بڑھانے کے لیے کاشتکاروں کو پیشگی رقمیں دینی ہی پڑیں گی۔ ایک رات کا پالا کمپنی کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے جلتے ہوئے سگریٹ کا ایک ٹکرا کل کارخانہ کو خاک سیاہ کر سکتا ہے ہاں میری محدود عقل کی وسعت جہاں تک ہے میں نے کوئی بات مبالغہ کے ساتھ نہیں کہی ہے۔ ناگہانی حادثات کے خیال سے آپ نفع کے تخمینہ میں کسی قدر تخفیف کر سکتے ہیں۔"

کنور صاحب: آخر کہاں تک ؟

جان سیوک: بیس فی صدی سمجھئے

کنور صاحب: اور پہلے سال

جان سیوک: کم از کم پندرہ فی صدی

کنور صاحب: میں پہلے سال دس اور اس کے بعد پندرہ فی صدی پر قناعت کر سکتا ہوں۔

جان سیوک: تو پھر میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ حصے خریدنے میں توقف نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کبھی مایوسی نہ ہوگی۔ حصے سو روپے کے تھے کنور صاحب نے پانچ سو حصے خرید لینے کا وعدہ کیا اور بولے۔ "کل اوّل قسط کے دس ہزار روپیے بینک کی معرفت آپ کے پاس بھیج دوں گا۔"

جان سیوک کا زیادہ سے زیادہ تخمینہ بھی اس حد تک کا نہ تھا۔ لیکن وہ اس کامیابی پر خوش نہ ہوئے۔ ان کا ضمیر اب بھی انھیں ملامت کر رہا تھا۔ تم نے ایک سادہ مزاج شریف آدمی کو دھوکا دیا۔ تم نے ملک کی تجارتی ترقی کے لیے نہیں بلکہ اپنے فائدہ کے لیے یہ کوشش کی ہے۔ ملک کے خادم بن کر تم اپنی پانچوں انگلیاں گھی

میں رکھنا چاہتے ہو۔ تمھارا دلی منشا یہی ہے کہ منافع کا معتدبہ حصہ کسی نہ کسی حیلہ سے خود ہضم کرو۔ تم نے اس کہاوت پر عمل کیا کہ بنیا مارے جان۔ چور مارے انجان۔"

اگر کنور صاحب کی شرکت سے عوام میں کمپنی کی ساکھ قائم ہو جانے کا یقین نہ ہو تا تو مسٹر جان سیوک صاف کہہ دیتے کہ کمپنی اتنے حصے آپ کو نہیں دے سکتی۔ ایک مفید خلاق جماعت کے روپے کو کسی مشتبہ کاروبار میں لگا کر اس کی ہستی کو معرض خطر میں ڈالنا خود غرضی کے لیے بھی ایک لقمۂ تلخ تھا۔ مگر دولت کا دیوتا ضمیر کی قربانی ہوئے بغیر خوش نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب تک وہ اس کام کو محض ذاتی نفع کے لیے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نیّت صاف نہیں تھی۔ منافع کو مختلف ناموں سے اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اب انھوں نے بے لوثی کے ساتھ نیک نیتی سے برتاؤ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے۔ "میں کمپنی کے منتظم کی حیثیت سے اس امداد کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس اپنے فیصلے پر کبھی کف افسوس نہ ملنا پڑے گا۔ اب میں آپ سے ایک اور استدعاء کرتا ہوں۔

ع: کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔

میں نے کارخانہ کے لیے جو زمین پسند کی ہے۔ وہ پانڈے پور ے کے آگے پختہ سڑک پر واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی وہاں سے نزدیک ہے قرب و جوار میں بہت سے موضع ہیں۔ رقبہ دس بیگہ کا ہے زمین پرتی پڑی ہوئی ہے۔ ہاں گاؤں کے مویشی اس میں چرنے آیا کرتے ہیں۔ اس کامالک ایک اندھا فقیر ہے اگر آپ کبھی اس طرف ہوا خوری کے لیے گئے ہوں گے تو آپ نے اس اندھے کو ضرور دیکھا ہوگا۔"

کنور صاحب : ہاں ہاں۔ ابھی تو کل ہی گیا تھا۔ وہی اندھا ہے نا؟ کالا کالا دبلا دبلا۔ جو گاڑیوں کے پیچھے دوڑا کرتا ہے؟

جان سیوک : جی ہاں۔ وہی وہی۔ وہ زمین اسی کی ہے۔ مگر وہ اس زمین کو کسی قیمت پر بھی نہیں دینا چاہتا۔ میں اسے پانچ ہزار تک دیتا تھا پر وہ راضی نہ ہوا، وہ کچھ سڑی سا ہے۔ کہتا ہے میں یہاں دھرم شالہ مندر اور تالاب بنواؤں گا۔ دن بھر بھیک مانگ

کر تو گزر کرتا ہے۔ اس پر ارادے اتنے بلند ہیں۔ شاید محلّہ والوں کے خوف سے اسے کوئی معاملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میں ایک ذاتی معاملہ میں حکام سے مدد لینا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن ایسی حالت میں بجز اس کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہ بالکل میرا ذاتی معاملہ بھی نہیں ہے۔ میونسپلٹی اور سرکار دونوں کو اس کارخانہ سے ہزاروں روپے سال کی آمدنی ہوگی۔ ہزاروں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو یہ ایک قومی کام ہے اور پس سرکار سے امداد حاصل کرنے میں میں واجبیت کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا توجہ کریں تو نہایت آسانی سے کام نکل جائے۔"

کنور صاحب : میرا اس فقیر پر کوئی دباؤ نہیں ہے اور ہوتا بھی تو میں اس سے کام نہ لیتا۔

جان سیوک : آپ راجہ صاحب چتاری......

کنور صاحب : نہیں میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے داماد ہیں اور اس معاملہ میں میرا ان سے کہنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کیا وہ آپ کے حصہ دار نہیں ہیں۔

جان سیوک : جی نہیں۔ وہ خود بے انتہا دولت کے مالک ہو کر بھی دولتمندوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کل کارخانے سرمایہ داروں کا قابو بڑھا کر عوام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ انھیں خیالات نے تو ان کو یہاں چیئرمین بنا دیا۔

کنور صاحب : یہ تو اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ ہم دو رنگی زندگی بسر کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ حقوق عامہ کے حامی جتنے اونچے درجے کے لوگوں میں ملیں گے اتنے نیچے درجہ کے آدمیوں میں نہ ملیں گے۔ خیر آپ ان سے مل کر دیکھیے تو، کیا کہوں۔ شہر کے متصل میری ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے۔ ورنہ آپ کو یہ دقت نہ ہوتی۔ میرے لائق اور جو کام ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔

جان سیوک : جی نہیں۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں خود ان سے مل کر طے کرلوں گا۔

کنور صاحب : ابھی تو مس صوفیہ کامل صحت ہونے تک یہیں رہے گی نا۔ آپ کو تو

اس میں کوئی عذر نہیں ہے۔

مسٹر جان سیوک اس بارہ میں صرف دو چار باتیں کرکے یہاں سے رخصت ہوئے۔ مسز سیوک فٹن پر پہلے ہی سے آ بیٹھی تھیں۔ پربھو سیوک ونے کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ ونے نے آکر جان سیوک سے ہاتھ ملایا۔ پربھو سیوک ان سے اگلے روز پھر ملنے کا وعدہ کر کے جان سیوک کے ساتھ چلے۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔

جان سیوک : آج ایک ملاقات میں جتنا کام ہوا۔ اتنا مہینوں کی دوا دوش سے بھی نہ ہوا تھا۔ کنور صاحب نہایت شریف آدمی ہیں۔ پچاس ہزار کے حصے خرید لیے۔ ایسے ہی دو چار بھلے آدمی اور مل جائیں تو بیڑا پار ہوجائے۔

پربھوسیوک: اس گھر کے سبھی لوگ دیا اور دھرم کے پتلے ہیں۔ میں نے ونے سنگھ جیسا رموزِ شاعری سے واقف شخص نہیں دیکھا۔ مجھے تو ان سے بے حد محبت ہوگئی ہے۔

پربھو سیوک: کچھ کام کی بات چیت بھی کی؟

پربھو سیوک: جی نہیں۔ آپ کے نزدیک تو کام کی بات چیت ہے۔ اور ان کو اس سے ذرا رغبت نہیں۔ وہ خدمتِ عامہ کا عہد کر چکے ہیں۔ اور اتنی دیر تک اپنی سیوا سمتی کی ہی چرچا کرتے رہے۔

جان سیوک: کیا تم کو یہ امید ہے کہ تمھاری یہ ملاقات چتاری کے راجہ صاحب پر بھی کچھ اثر ڈال سکتی ہے؟ ونے سنگھ راجہ صاحب سے ہمارا کچھ کام نکلوا سکتے ہیں؟

پربھو سیوک: ان سے کہے کون؟ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔ انھیں آپ وطن پرست سنیاسی سمجھیے۔ مجھ سے اپنی سمتی میں شامل ہو جانے کے لیے بہت اصرار کیا ہے۔

جان سیوک: شامل ہو گئے نا؟

پربھو سیوک: جی نہیں۔ کہہ آیا ہوں کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ بلا غور و خوض کے ایسا مشکل عہد کس طرح کر لیتا؟

جان سیوک: مگر سوچنے سمجھنے میں مہینوں نہ لگا دینا۔ دو چار روز میں جا کر نام لکھا

دینا۔ جبھی تم کو ان سے کچھ کام کی باتیں کرنے کا حق حاصل ہوجائے گا (بیوی سے) تمھاری رانی صاحبہ سے کیسی نبھی؟

مسز سیوک: مجھے تو ان سے نفرت ہوگئی۔ میں نے کسی میں اتنا غرور نہیں دیکھا۔

پربھو سیوک: ماما! آپ ان کے ساتھ سخت نا انصافی کر رہی ہیں۔

مسز سیوک: تمھارے لیے دیوی ہوں گی۔ میرے لیے نہیں ہیں۔

جان سیوک: یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمھاری ان سے نہ پٹے گی۔ کام کی باتیں نہ تمھیں آتی ہیں نہ انھیں۔ تمھارا کام تو دوسروں میں عیب نکالنا ہے۔ صوفی کو کیوں نہیں لائیں۔

مسز سیوک: وہ آئے بھی تو یا جبراً گھسیٹ لاتی ؟

جان سیوک: آئی نہیں یا رانی نے آنے نہیں دیا۔

پربھو سیوک: وہ تو آنے کو تیار تھی مگر اسی شرط پر کہ مجھ پر مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہ کیا جائے۔

جان سیوک: انھیں یہ شرط کیوں منظور ہونے لگی؟

مسز سیوک : ہاں اس شرط پر میں اس کو نہیں لا سکتی۔ وہ میرے گھر رہے گی تو میری بات ماننی پڑے گی۔

جان سیوک : تم دونوں میں سے ایک کو بھی عقل سے سروکار نہیں۔ تم احمق ہو۔ وہ ضدی۔ اس کو کسی طرح منا کر جلد لانا چاہیے۔

پربھو سیوک : اگر ماما اپنی بات پر اڑی رہیں گی تو شاید وہ پھر گھر نہ جائے۔

جان سیوک : آخر جائے گی کہاں؟

پربھو سیوک : اسے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ رانی اس پر جان دیتی ہیں۔

جان سیوک : یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ دو میں سے ایک کو دبنا پڑے گا۔

لوگ گھر پہنچے تو گاڑی کی آہٹ پاتے ہی ایشور سیوک نے بڑے محبت آمیز اشتیاق کے ساتھ۔ پوچھا ”صوفی آگئی نا ؟ آ تجھے گلے لگالوں۔ یسوع تجھے اپنے دامن میں لے۔“

جان سیوک : پاپا ! وہ ابھی یہاں آنے کے قابل نہیں ہے ۔ بہت کمزور ہوگئی ہے۔

دو چار دن کے بعد آئے گی۔

ایشور سیوک : غضب خدا کا ! اس کی یہ حالت ہے اور تم سب اسے اس کے حال پر چھوڑ آئے؟ کیا تم لوگوں میں ذرا بھی غیرت و حمیت نہیں؟ کیا بالکل خون سفید ہو گیا۔

مسز سیوک : آپ جاکر اس کی خوشامد کیجیے گا تو آئے گی۔ میرے کہنے سے تو نہیں آئی۔ بچی تو نہیں کہ گود میں اٹھا لاتی۔

جان سیوک : پاپا! وہاں بہت آرام سے ہے۔ راجہ اور رانی دونوں ہی اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو رانی ہی نے اس کو نہیں چھوڑا۔

ایشور سیوک : کنور صاحب سے کچھ کام کی بات چیت بھی ہوئی ؟

جان سیوک : جی ہاں۔ مبارک ہو۔ پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگی۔

ایشور سیوک : شکر ہے۔ شکر ہے۔ یسوع! مجھ پر اپنا سایہ کر۔ یہ کہہ کر وہ پھر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

(4)

شریر لڑکوں کے لیے اندھے دل بہلاؤ کی چیز ہوا کرتے ہیں۔ سورداس کو ان کی بے رحمانہ حرکتوں سے اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑتا اور چراغ جلنے کے بعد واپس آتا۔ جس روز اس کو جانے میں دیر ہو جاتی اس دن وہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ سڑک پر راہ گیروں کے سامنے اس کو کوئی خوف نہ تھا۔ لیکن آبادی کی گلیوں میں قدم قدم پر کسی سانحہ کا اندیشہ قائم رہتا۔ کوئی اس کی لاٹھی چھین کر بھاگتا۔ کوئی کہتا سورداس۔ "سامنے گڑھا ہے! بائیں طرف ہوجاؤ۔" سورداس ادھر گھومتا تو گڑھے میں گر پڑتا۔ مگر بجرنگی کا لڑکا گھیسو اتنا شریر تھا کہ محض سور داس کو چھیڑنے کے لیے گھڑی رات رہے اٹھ بیٹھتا اس کی لاٹھی چھین کر بھاگنے میں اسے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز قبل طلوع آفتاب سورداس گھر سے چلے تو گھیسو ایک تنگ گلی میں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ سورداس کو وہاں پہنچتے ہی کچھ شک ہوا۔ وہ کھڑا ہو کر آہٹ لینے لگا۔

اب گھیسو ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ اس نے جھپٹ کر سورداس کا ڈنڈا پکڑ لیا، سورداس ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ گھیسو نے پوری طاقت سے کھینچا۔ ہاتھ پھسل گیا۔ اپنے ہی زور میں گر پڑا۔ سر میں چوٹ لگی۔ خون نکل آیا۔اس نے خون دیکھا تو چیختا چلاتا گھر پہنچا۔ بجرنگی نے پوچھا! "کیوں روتا ہے رے؟ کیا ہوا۔" گھیسو نے اس کو کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکے خوب جانتے ہیں کہ کس عدالت میں ان کی جیت ہوگی۔ جاکر اپنی ماں سے بولا۔ "سورداس نے مجھے دھکیل دیا۔" ماں نے سر کی چوٹ کا خون دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بجرنگی کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اور بولی۔ "اب اس اندھے کی شامت آگئی ہے۔ لڑکے کو ایسا دھکیلا کہ لہو لہان ہوگیا۔ اس کی اتنی ہمت؟ روپیہ کا گھمنڈ اتار دوں گی!" بجرنگی نے مصالحانہ لہجہ میں کہا۔ "اسی نے چھیڑا ہوگا وہ بیچارہ تو اس سے آپ اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔"

جمنی : اسی نے چھیڑا سہی۔ تو بھی کیا اس کو اتنی بیدردی سے دھکیل دینا چاہیے تھا کہ سر پھٹ جائے؟ اندھوں کو سبھی لڑکے چھیڑتے ہیں پر وہ سب سے لٹھیاؤ نہیں کرتے پھرتے۔

اتنے میں سورداس بھی آکر کھڑا ہو گیا۔ چہرہ سے ندامت برس رہی تھی۔ جمنی لپک کر اس کے سامنے آئی اور بجلی کی طرح کڑک کر بولی۔ "کیوں سورداس شام ہوتے ہی روز لوٹیا لے کر دودھ کے لیے سر پر سوار ہو جاتے ہو۔ اور ابھی گھیسو نے ذرا لاٹھی پکڑ لی تو اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ جس پتّل میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ کیوں روپے کا گھمنڈ ہو گیا ہے کیا؟"

سورداس : بھگوان جانتے ہیں جو میں نے گھیسو کو پہچانا ہو۔ سمجھا کوئی شریر لونڈا ہوگا۔ لاٹھی کو مضبوط پکڑے رہا۔ گھیسو کا ہاتھ پھسل گیا وہ گر پڑا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ گھیسو ہے تو لاٹھی اس کو دے دیتا۔ اتنے دن ہوگئے کوئی مجھے کہہ دے کہ میں نے کسی لڑکے کو جھوٹ موٹ کا مارا ہے۔تمھارا ہی دیاکھاتا ہوں۔ تمھارے ہی لڑکے کو ماروں گا۔

جمنی : نہیں اب تمھیں گھمنڈ ہو گیا ہے۔ بھیک مانگتے ہو۔ پھر بھی لاج نہیں آتی۔ سب کی برابری کرنے کو مرتے ہو۔ آج میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ نہیں تو جن

ہاتھوں سے تم نے اس کو دھکیلا ہے اس میں لوکا لگا دیتی۔

بجرنگی جمنی کو منع کر رہا تھا۔ اور لوگ بھی سمجھا رہے تھے۔ مگر وہ کسی کی نہ سنتی تھی، سورداس مجرموں کی طرح سر جھکائے پھٹکاریں سن رہا تھا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتا تھا۔

بھیرو تاڑی اتارنے جا رہا تھا۔ رک گیا اور سورداس پر دوچار چھینٹے جما دیے۔ "زمانہ ہی ایسا ہے۔ سب روزگاروں سے بڑھ کر بھیک مانگنا۔ ابھی چار دن پہلے گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ اب چار پیسے کے آدمی ہوگئے ہیں۔ پیسے ہوتے ہیں۔ تبھی گھمنڈ ہوتا ہے۔ نہیں تو کیا گھمنڈ کریں گے۔ ہم اور تم جن کی ایک روپیہ کمائی ہے اور دو کا خرچ ہے۔"

جگدھر اوروں سے تو بھیگی بلی بنا رہتاتھا۔ سورداس کو لعنت ملامت کرنے کے لیے وہ بھی نکل پڑا، سورداس پچھتا رہا تھا کہ میں نے لاٹھی کیوں نہ چھوڑدی؟ کون کہے کہ کوئی دوسری لکڑی نہ ملتی؟ جگدھر اور بھیرو کے سخت الفاظ سن سن کر وہ اور بھی ملول ہو رہاتھا۔ اسے اپنی بیکسی پر رونا آتا تھا۔ اسی اثنا میں مٹھوا بھی آ پہنچا۔ یہ بھی شرارت کا پتلا تھا۔ گھیسو سے بھی دو اُنگل بڑھا ہوا۔ جگدھر کو دیکھتے ہی یہ بول سنا سنا کر چڑانے لگا۔ "لا لو کا لال منہ جگدھر کا کالا۔ جگدھر تو ہوگیا لالو کا سالا۔"

بھیرو کو بھی اس نے ایک اپنا بنایا ہوا بول سنایا۔ "بھیرو بھیرو تاڑی بیچ یا بیوی کی ساڑی بیچ۔

چڑنے والے چڑتے کیوں ہیں؟ اس کی تحقیقات تو علم الخیال کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو بالعموم پریم یا بھگتی کی وجہ سے چڑتے دیکھا ہے۔ کوئی رام یا کرشن کے ناموں سے اس لیے چڑتا ہے کہ لوگ اسے چڑانے ہی کے بہانے ایشور کا نام لیں۔ کوئی اس لیے چڑتا ہے کہ لڑکے اس کو گھیرے رہیں۔ کوئی بینگن یا مچھلی سے اس لیے چڑتا ہے کہ لوگ ان نہ کھانے لائق چیزوں سے نفرت کریں۔ خلاصہ یہ کہ چڑنا ایک فلسفیانہ عمل ہے۔ اس کا مقصد صرف سبق دینا ہے۔ لیکن بھیرو اور جگدھر میں یہ عقیدت مندانہ فیاضی کہاں ؟ وہ بچوں کے طفلانہ مشاغل سے لطف اٹھانا کیا جانیں ؟ دونوں جھلا اٹھے۔ جگدھر مٹھوا کو گالیاں دینے لگا لیکن بھیرو کو محض گالیاں

دینے سے صبر نہ ہوا۔ اس نے لپک کر مٹھوا کو پکڑ لیا اور دو تین طمانچے زور زور سے جمائے اور نہایت بے رحمی سے اس کے کان پکڑ کر کھینچنے لگا۔ مٹھوا بلبلا اٹھا، سورداس ابھی تک خفت آمیز انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ میٹھوا کا رونا سنتے ہی اس کے تیور پر بل پڑ گئے۔ اور چہرہ تمتما اٹھا۔ سر اٹھاکر اندھی آنکھوں سے تاکتا ہوا بولا۔ ''بھیرو بھلا چاہتے ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔ اس نے تم کو کون سی ایسی گولی مار دی تھی کہ تم اسے مارے ڈالتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس کے سر پر کوئی ہے ہی نہیں؟ جب تک میں جیتا ہوں کوئی اسے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ دلاوری تو جب دیکھتا کہ کڑے آدمی سے ہاتھ ملاتے۔ اس لڑکے کو پیٹ دیا تو کون سی بڑی بہادری دکھائی؟''

بھیرو : مار کی اتنی اکھر ہے تو اسے روکتے کیوں نہیں؟ ہم کو چڑائے گا تو ہم پیٹیں گے۔ ایک بار نہیں۔ ہزار بار۔ تم کو جو کرنا ہو کرلو۔

جگدھر : لڑکے کو ڈانٹنا تو دور۔ اوپر سے اور شہ دیتے ہو۔ وہ تمھارا دولارا ہوگا۔ دوسرے کیوں......

سورداس : چپ بھی رہو آئے ہو وہاں سے نیائے کرنے۔ لڑکوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے پر اس کے لیے کوئی انھیں مار بھی نہیں ڈالتا۔ تمھیں لوگوں کو اگر کسی دوسرے لڑکے نے چڑایا ہوتا تو منہ تک نہ کھولتے۔ دیکھتا تو ہوں جدھر سے نکلتے ہو۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چڑا تے ہیں۔ پر آنکھیں بند کیے اپنی راہ چلے جاتے ہو۔ جانتے ہو تاکہ جن لڑکوں کے ماں باپ ہیں انھیں ماریں گے تو وہ آنکھیں نکال لیں گے۔ کیلے کے لیے تو ٹھیکرا بھی تیز ہو تا ہے۔

بھیرو : دوسرے لڑکوں کی اور اس کی برابری ہے؟ داروغہ جی کی گالیاں سنتے ہیں تو کیا ڈومڑوں کی گالیاں بھی کھائیں۔ ابھی تو دو ہی طمانچے لگائے ہیں پھر چڑائے تو اٹھاکر پٹک دوں۔ مرے یا جیے۔

سورداس : (مٹھو کا ہاتھ پکڑ کر) مٹھوا۔ چڑا تو! دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں ؟آج جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو جائے گا۔

لیکن مٹھوا کے گالوں میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ منہ بھی سوج گیا تھا۔

سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ بھیرو کا غضب ناک چہرہ دیکھا تو اس کے رہے ہوش بھی اڑ گئے، جب بہت بڑھا وا دینے پر بھی اس کا منہ نہ کھلا۔ تو سورداس نے جھنجلا کر کہا۔
"اچھا میں ہی چڑا تا ہوں۔ دیکھوں میرا کیا بنا لیتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی مضبوط پکڑ لی۔ اور بار بار اسی بول کی رٹ لگانے لگا جیسے کوئی لڑکا اپنا سبق یاد کر رہا ہو۔

بھیرو بھیرو تاڑی بیچ۔ یا بیو کی ساڑی بیچ۔

ایک ہی سانس میں اس نے کئی بار یہی رٹ لگائی، بھیرو کہاں تو غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہاں سورداس کی یہ طفلانہ حرکت دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اب سورداس کو معلوم ہوا کہ میں کتنا عاجز و بیکس ہوں۔ میرے غصّے کی یہ عزت ہے! میں طاقت ور ہوتا تو میرا غصہ دیکھ کر یہ لوگ تھر تھر کانپنے لگتے۔ یہ تو کھڑے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کر ہی کیا سکتا ہے۔ بھگوان نے اتنا اپنگ نہ بنادیا ہوتا تو کیوں یہ ذلت اٹھانی پڑتی؟ یہ سوچ کے بے اختیار اسے رونا آگیا۔ بہت ضبط کرنے پر بھی آنسو نہ رک سکے۔

بجرنگی نے بھیرو اور جگدھر دونوں کو ملامت کی۔ "کیا اندھے سے ہیکڑی جتاتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ ایک تو بیچارے لڑکے کا طمانچوں سے منہ لال کردیا اس پر اور گرجتے ہو۔ وہ بھی تو لڑکا ہی ہے۔ غریب کا ہے تو کیا۔ جتنا لاڈ پیار اس کا ہوتا ہے۔ اتنا بھلے گھروں کے لڑکوں کا بھی نہیں ہوتا! جیسے اور سب لڑکے چڑاتے ہیں وہ بھی چڑاتا ہے۔ اس میں اتنا بگڑنے کی کیا بات ہے؟ (جمنی کی طرف دیکھ کر) یہ سب تیرے ہی کارن ہوا۔ اپنے لونڈے کو ڈانٹتی نہیں۔ بیچارے اندھے پر غصہ اتارنے چلی ہے۔"

جمنی سورداس کا رونا دیکھ کر سہم گئی تھی۔ جانتی تھی کہ بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ نادم ہوکر بولی۔ "میں کیا جانتی تھی کہ ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ بن جائے گا۔ آ بیٹا مٹھو! چل بچھوا بکڑلے تو دودھ دوہوں۔"

دولارے لڑکے تنکے کی مار بھی نہیں سہ سکتے۔ مٹھو دودھ کی دعوت سے بھی چپ نہ ہوا۔ تو جمنی نے آکر اس کے آنسو پونچھے اور گودی میں اٹھا کر گھر کے اندر

لے گئی، اس کو غصہ جلد آتا تھا مگر جلد ہی پگھل بھی جاتی تھی۔

مٹھو تو ادھر گیا۔ بھیرو اور جگدھر نے بھی اپنی اپنی راہ لی۔ مگر سورداس سڑک کی طرف نہ گیا۔ اپنی جھونپڑی میں جاکر اپنی بیکسی پر رونے لگا۔ اپنے نابینا ہونے پر آج اس کو جتنا ملال ہو رہا تھا اتنا اور کبھی نہ ہوا تھا۔ سوچا "میری یہ درگت اسی لیے ہے نہ کہ میں اندھا ہوں بھیک مانگتا ہوں۔ محنت کی کمائی کھاتا ہوتا تو میں بھی گردن اٹھاکر نہ چلتا؟ میرا بھی مان نہ ہوتا۔ کیوں چیونٹی کی طرح پیروں کے نیچے مسلا جاتا؟ آج بھگوان نے اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیا دونوں آدمی لڑکے کو مارکر ہنستے ہوئے چلے جاتے؟ ایک ایک کی گردن مروڑ دیتا۔ بجرنگی سے کیوں نہیں کوئی بولتا۔ گھِسوا نے بھیرو کی تاڑی کا مٹکا پھوڑ دیا تھا۔ کئی روپے کا نقصان ہوا لیکن بھیرو نے چوں تک نہ کی۔ جگدھر کو اس کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ ابھی دس ہی پانچ دن کی بات ہے اس کا کھونچہ الٹ دیا تھا۔ جگدھر نے سانس تک نہ لی۔ جانتے ہیں تاکہ ذرا بھی گرم ہوئے اور بجرنگی نے گردن پکڑی۔ نہ جانے اس جنم میں ایسے کون سے پاپ کیے تھے۔ جن کا یہ ڈنڈ مل رہا ہے۔ لیکن بھیک نہ مانگوں تو کھاؤں کیا؟ اور پھر زندگی پیٹ ہی پالنے کے لیے تھوڑا ہی ہے۔ کچھ آگے کے لیے بھی تو کرنا ہے۔ نہیں۔ اس جنم میں تو اندھا ہوا ہی ہوں۔ اس جنم میں اس سے بھی زیادہ دردسا ہوگی۔ پتروں کا خون سر پر سوار ہے۔ گیا جی مین ان کا سرادھ نہ کیا تو وہ بھی کیا سمجھیں گے کہ ہمارے بنس میں کوئی ہے، میرے ساتھ تو بنس کا انت ہی ہے۔ میں یہ دن نہ چکاؤں گا تو اور کون لڑکا بیٹھا ہوا ہے جو چکادے گا۔ کون اوڈم کروں۔ کسی بڑے آدمی کے گھر پنکھا کھینچ سکتا ہوں۔ مگر یہ کام بھی تو سال میں چار ہی مہینہ رہتا ہے۔ باقی آٹھ مہینے کیا کروں گا؟ سنتا ہوں۔ اندھے کرسی۔ مونڑے۔ دری۔ ٹاٹ بن سکتے ہیں۔ پر یہ کام کس سے سیکھوں؟ کچھ بھی ہو اب بھیک نہ مانگوں گا۔"

ہر طرف سے مایوس ہونے پر سورداس کے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ اس زمین کو کیوں نہ بیچ دوں۔ اس کے سوا اب مجھے کوئی سہارا نہیں ہے۔ کہاں تک باپ دادا کے نام کو روؤں۔ صاحب اسے لینے کو منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ دام بھی اچھا دے رہے ہیں۔ انھیں کو دے دوں۔ چار پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں۔ اپنے گھر میں سیٹھ کی

طرح بیٹھا ہوا چین کی بنسی بجاؤں گا۔ چار آدمی گھیرے رہیں گے۔ محلّہ میں اپنا مان ہونے لگے گا۔ یہی لوگ جو آج مجھ پر رعب جمارہے ہیں۔ میرا منہ تاکیں گے۔ میری خوشامد کریں گے۔ یہی ہوگا نا محلّہ کی گائیں ماری ماری پھریں گی پھریں۔ اس کو میں کیا کروں۔ جب تک نبھ سکا۔ نبھایا۔ اب نہیں نبھ سکتا۔ جن کی گائیں چرتی ہیں کون میری بات پوچھتے ہیں؟ آج کوئی میری پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تو بھیرو مجھے رلاکر یوں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا نہ جاتا۔ جب اتنا بھی نہیں ہے تو مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے لیے مروں؟ جی ہے تو جہان ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو جینے پر دھکار ہے۔

سورداس یہ سوچ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا گودام کی طرف چلا، گودام کے سامنے پہنچا تو دیاگر سے بھینٹ ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا۔ "ادھر کہاں چلے۔ سورداس۔ تمھاری جگہ تو پیچھے رہ گئی؟"

سورداس : ذرا انھیں میاں صاحب سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔

دیاگر : کیا اسی زمین کے بارہ میں۔

سورداس : ہاں میرا ارادہ ہے کہ یہ زمین بیچ کر کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلا جاؤں۔ اس محلّہ میں اب نباہ نہیں ہے۔

دیاگر : سنا ہے آج بھیرو تمھیں مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

سورداس : میں طرح نہ دے جاتا تو اس نے مار ہی دیا ہوتا۔ سارا محلّہ بیٹھا ہنستا رہا۔ کسی کی زبان نہ کھلی کہ اندھے اپاہج آدمی پر یہ انیائے کیوں کرتے ہو۔ تو جب میرا کوئی ہوا نہیں ہے تو میں ہی کیوں دوسروں کے لیے مروں ؟

دیاگر : نہیں سورداس۔ میں تمھیں زمین بیچنے کی صلاح نہ دوں گا۔ دھرم کا پھل اس جنم میں نہیں ملتا۔ ہمیں آنکھیں بند کرکے نارائن پر بھروسہ رکھتے ہوئے دھرم کے راستہ پر چلتے رہنا چاہیے۔ سچ پوچھو تو آج نارائن نے تمھارے دھرم کی پریچھا کی ہے۔ سنکٹ ہی میں دھیرج اور دھرم کی پریچھا ہوتی ہے۔ دیکھو گوسائیں جی نے کہا ہے۔

آپت کال پرکھئے چاری۔ دھیرج۔ دھرم۔ متر اور ناری

زمین پڑی ہے۔ پڑی رہنے دو۔ گائیں چرتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا پن ہے، کون جانتا

ہے کبھی کوئی دانی دھرماتما آدمی مل جائے تو دھرم شالہ۔ کنواں۔ مندر بنوا دے کہ مرنے پر بھی تمھارا نام امر رہے۔ رہی تیرتھ جاترا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت نہیں۔ سادھو سنت جنم بھر یہی کیا کرتے ہیں پر گھر سے روپوں کی تھیلی باندھ کر نہیں چلتے۔ میں بھی شیواتری کے بعد بدری نارائن جانے والا ہوں۔ ہمارا تمھارا ساتھ ہو جائے گا۔ راستہ میں تمھاری ایک کوڑی خرچ نہ ہوگی۔ اس کا میرا ذمہ۔

سورداس : نہیں۔ بابا۔ اب یہ انیائے نہیں سہا جاتا۔ بھاگ میں دھرم کرنا نہیں لکھا ہوا ہے تو کیسے دھرم کروں گا ؟ ذرا ان لوگوں کو بھی تو معلوم ہو جائے کہ سورداس بھی کوئی چیز ہے۔

دیاگر : سورداس ! آنکھیں بند ہونے پر بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ اہنکار (خودی) ہے۔ اسے مٹاؤ۔ نہیں تو یہ جنم بھی بگڑ جائے گا۔یہی اہنکار سب پاپوں کی جڑ ہے۔ نہ یہاں تم ہو۔ نہ تمھاری زمین ہے نہ تمھارا کوئی دوست ہے نہ دشمن۔جہاں دیکھو بھگوان ہی بھگوان ہے۔ ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔

سورداس : باباجی۔ جب تک بھگوان کی دیا نہ ہوگی۔ بھگتی اور بیراگ کسی پر من نہ جمے گا۔ اس گھڑی میرا دل رو رہا ہے اس میں اپدیش اور گیان کی باتیں نہیں سما سکتیں۔ گیلی لکڑی کھراد پر نہیں چڑھتی۔

دیاگر : پچھتاؤ گے اور کیا؟

یہ کہہ کر دیاگر اپنی راہ چلے گئے وہ ہر روز گنگا نہانے جایا کرتے تھے۔

ان کے چلے جانے پر سورداس نے دل میں کہا۔ ''یہ بھی مجھی کو گیان سکھاتے ہیں۔ غریبوں پر اپدیش کا بھی داؤں چلتا ہے۔ موٹے آدمیوں کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ وہاں تو جاکر ٹھکر سوہاتی کرنے لگتے ہیں۔ مجھے گیان سکھانے چلے ہیں۔ دونوں جون بھوجن مل جاتا ہے نا۔ ایک دن نہ ملے۔ تو سارا گیان نکل جائے۔''

تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی رکاوٹوں کو پھاند جاتی ہے۔ سورداس سمجھانے سے اور بھی ضد پکڑ گیا۔سیدھا گودام کے برآمدہ میں جاکر رکا، اس وقت وہاں بہت سے چمار جمع تھے۔ کھالوں کی خرید ہو رہی تھی۔ چودھری نے کہا ''آؤ سورداس! کیسے آئے؟''

سورداس اتنے لوگوں کے سامنے اپنی خواہش ظاہر نہ کر سکا۔ لحاظ نے اس کی

طاہر : صاحب ان سے پیچھے والی زمین مانگتے ہیں۔ منہ مانگے دام دینے پر تیار ہیں۔ مگر یہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انھوں نے دد سمجھایا۔ میں نے کتنی منت کی پر ان کے دل میں کوئی بات جمتی ہی نہیں۔

حیا میں نہایت بے حیائی بھی ہوتی ہے۔آخر وقت بھی جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی الٹی سانسیں چل رہی ہیں۔ وہ ایک دم زندہ ہو جاتی ہے۔ اور پہلے سے بھی زیادہ فرض شناس۔ ہم پریشانیوں میں مبتلا ہو کر کسی دوست سے مدد مانگنے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں۔ لیکن دوست سے آنکھیں چار ہوتے ہی حیا ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم اِدھر اُدھر باتیں کر کے واپس آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک بھی ایسا لفظ منہ سے نہیں نکلنے دیتے۔ جس سے ہماری اندرونی تکلیف کا اظہار ہو۔

طاہر علی کی باتیں سنتے ہی سورداس کی حیا قہقہہ مارتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بولا۔ "میاں صاحب یہ زمین تو پرکھوں کی نشانی ہے۔ بھلا میں اسے بیچ یا پٹہ کیسے کر سکتا ہوں ؟ میں نے اسے دھرم کاج کے لیے سنکلپ کر دیا ہے۔"

طاہر : دھرم کاج بغیر روپوں کے کیسے ہوگا؟ جب روپے ملیں گے جبھی تو تیرتھ کروگے۔ سادھو لوگوں کی سیوا کروگے۔ مندر اور کنواں بنواؤ گے۔

چودھری : سورداس۔ اس بکھت(وقت) اچھے دام ملیں گے۔ہماری تو یہی صلاح ہے کہ دے دو تمھارا اس سے کوئی لابھ تو ہوتا نہیں۔

سورداس : محلہ بھر کی گائیں چرتی ہیں۔ کیا اس سے پن نہیں ہوتا۔ گئو کی سیوا سے بڑھ کر اور کون پن کا کام ہے؟

طاہر : اپنا پیٹ پالنے کے لیے تو بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ چلے ہو دوسروں کے ساتھ پن کرنے! جن کی گائیں چرتی ہیں وہ تمھاری بات بھی نہیں پوچھتے۔ احسان ماننا تو دور رہا۔ اسی دھرم کے پیچھے تمھاری یہ حالت ہو رہی ہے ورنہ ٹھوکریں نہ کھاتے پھرتے۔

طاہر علی خود بڑے دیندار آدمی تھے۔ لیکن دوسرے مذہبوں کی برائی کرنے میں ان کو ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ در اصل وہ اسلامی مذہب کے سوا اور کسی مذہب کو مذہب نہیں سمجھتے تھے۔

سورداس نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ "میاں صاحب! دھرم احسان کے لیے نہیں

سورداس نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ ''میاں صاحب! دھرم احسان کے لیے نہیں کیا جاتا۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہیے۔''

طاہر : پچھتاؤگے اور کیا۔ صاحب سے جو کچھ کہوگے وہی کریں گے۔ تمھارے لیے گھر بنوا دیں گے۔ ماہوار وظیفہ دیں گے۔ مٹھوا کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کو بٹھا دیں گے۔ اسے نوکر رکھا دیں گے۔ تمھاری آنکھوں کی دوا کرا دیں گے۔ ممکن ہے تمھاری آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی بن جاؤگے۔ نہیں تو دھکے کھاتے رہو گے۔

سورداس پر اور کسی ترغیب کا اثر نہ ہوا لیکن آنکھوں کے علاج کا ذکر سن کر وہ نرم پڑا بولا۔ ''کیا جنم کے اندھوں کی بھی دوا ہو سکتی ہے ؟''

طاہر : تم جنم کے اندھے ہو کیا ؟ جب تو مجبوری ہے۔ لیکن تمھاری آسائش کے اتنے سامان جمع کر دیے جائیں گے کہ تمھیں آنکھوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

سورداس : نہیں میاں صاحب۔ اس میں بڑی ناموسی ہوگی۔ لوگ چاروں طرف سے دھکار نے لگیں گے۔

چودھری : تمھاری جائداد ہے بیع کرو چاہے پٹہ لکھو۔ دوسرے کو دخل دینے کا کیا اختیار ہے؟

سورداس : باپ دادا کا نام تو نہیں ڈبویا جا سکتا۔

جہلا کے پاس دلیلیں نہیں ہوتیں۔ دلائل کا جواب وہ ضد سے دیتے ہیں۔ دلیل ائل ہو سکتی ہے۔ نرم ہو سکتی ہے۔ پر ہٹ کو کون قائل کر سکتا ہے؟

سورداس کی ہٹ سے طاہر علی کو غصہ آگیا۔ بولے۔ ''تمھاری تقدیر میں بھیک مانگنا لکھا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ ان بڑے آدمیوں سے ابھی پالا نہیں پڑا ہے۔ ابھی تمھاری خوشامد کر رہے ہیں۔ معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔ لیکن تمھارامزاج نہیں ملتا۔ اور وہی جب قانونی داؤ پیچ کھیل کر زمین پر قبضہ کر لیں گے۔ دو چار سو روپے برائے نام معاوضہ دے دیں گے تو پھر سیدھے ہو جاؤگے۔ محلّہ والوں پر بھولے بیٹھے ہو پر دیکھ لینا جو کوئی پاس بھی پھٹکے۔ صاحب یہ زمین لیں گے ضرور۔ چاہے ہنس کر دو چاہے رو کر۔''

سورداس نے متکبرانہ انداز سے جواب دیا۔ ''خاں صاحب! اگر زمین جائے گی تو

اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔"
یہ کہہ کر اس نے لکڑی سنبھالی اور اپنے اڈے پر جا بیٹھا۔
ادھر دیاگر نے جاکر نایک رام سے یہ حال کہا۔ بجرنگی بھی بیٹھا تھا۔ یہ خبر سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ سورداس کے بل پر دونوں اچھلتے رہے۔ اس دن طاہر علی سے کیسی باتیں کیں اور آج سور داس ہی نے دھوکا دیا۔ بجرنگی نے متفکر ہو کر کہا۔
"اب کیا کرنا ہوگا پنڈا جی بتاؤ۔"
نایک رام : کرنا کیا ہوگا؟ جیسا کیا ہے ویسا بھوگنا ہوگا۔ جاکر اپنی گھر والی سے پوچھو۔ اسی نے آج آگ لگائی تھی۔ جانتے تو ہو کہ سورداس مٹھوا پر جان دیتا ہے۔پھر کیوں بھیرو کی مرمت نہیں کی؟ میں ہوتا تو کبھی بھیرو کو دو چار کھری کھوٹی سنائے بغیر نہ جانے دیتا اور نہیں تو دکھاوے کے لیے سہی۔ اس بیچارے کو بھی معلوم ہو جاتا کہ میری پیٹھ پر کوئی ہے۔ آج اس کو بڑا رنج ہوا ہے۔ نہیں تو زمین بیچنے کا اسے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔
بجرنگی : ارے تو اب کوئی تدبیر سوچو گے یا بیٹھ کر پچھلی باتوں کے نام کو روئیں؟
نایک رام : تدبری یہی ہے کہ آج سورداس آے تو چل کر اس کے پیروں پر گرو۔ اسے دلا سا دو۔ جیسے راضی ہو راضی کرو۔ دادا بھیا کرو۔ مان جائے تو اچھا نہیں تو صاحب سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ان کا قبضہ نہ ہونے دو۔ جو کوئی زمین کے پاس جائے اس کو مار کر بھگا دو۔ میں نے تو یہی سوچ رکھا ہے۔ آج سورداس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر دودھیا پلاؤں گا۔ اور مٹھوا کو پیٹ بھر مٹھائیاں کھلاؤں گا۔ جب نہ مانے گا تو دیکھا جائے گا۔
بجرنگی : ذرا میاں صاحب کے پاس کیوں نہیں چلے چلتے؟ سورداس سے اس نے نہ جانے کیا کیا باتیں کی ہوں۔ کہیں لکھا پڑھی کرانے کو کہہ آیا ہو تو پھر چاہے کتنی ہی آرزو منت کرو گے وہ اپنی بات نہ ٹالے گا۔
نایک رام : میں ان منشی کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔ اس کا مزاج اور بھی آسمان پر چڑھ جائے گا۔
بجرنگی : نہیں۔ پنڈا جی! میری خاطر سے ذرا چلے چلو۔

نایک رام آخری راضی ہو گئے۔ دونوں آدمی طاہر علی کے پاس پہنچے۔ وہاں اس وقت سناٹا تھا۔ خریداری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ چمار چلے گئے تھے۔ طاہر علی تنہا بیٹھے ہوئے حساب کتاب لکھ رہے تھے۔ میزان میں کچھ فرق پڑتا تھا۔ بار بار جوڑتے تھے پر غلطی پر نگاہ نہ پڑتی تھی۔ دفعتاً نایک رام نے کہا۔ ''کہئے منشی جی آج سورداس سے کیا بات چیت ہوئی؟''

طاہر : آہا! آیئے پنڈا جی۔ معاف کیجیے گا۔ میں ذرا میزان جوڑنے میں مصروف تھا۔ اس مونڈھے پر بیٹھے۔ سورداس سے کوئی بات طے نہ ہوگی۔ اس کی تو شامت آئی ہے۔ آج تو دھمکی دے کر گیا ہے کہ زمین کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔ غریب آدمی ہے مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ آخر یہی ہوگا کہ صاحب کسی قانون کی رو سے زمین پر قابض ہو جائیں گے۔ کچھ معاوضہ ملا تو خیر۔ ورنہ اس کی بھی امید نہیں۔

نایک رام : جب سورداس راضی نہیں ہے تو صاحب کیا کھا کر یہ زمین لے لیں گے۔ دیکھ بجرنگی! ہوئی نہ وہی بات۔ سورداس ایسا کچا آدمی نہیں ہے۔

طاہر علی : صاحب کو ابھی آپ جانتے نہیں ہیں۔

نایک رام : میں صاحب اور صاحب کے باپ دونوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاکموں کی خوشامد کی بدولت آج بڑے آدمی بنے پھرتے ہیں۔

طاہر : خوشامد ہی کا تو آج کل زمانہ ہے۔ وہ اب اس اراضی کو لیے بغیر نہ مانیں گے۔

نایک رام : تو ادھر بھی یہی طے ہے کہ زمین پر کسی کا قبضہ نہ ہونے دیں گے۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ اس کے لیے مر مٹیں گے۔ ہمارے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔ اسی کھیت میں سب کو ٹھہرا دیتا ہوں۔ زمین نکل گئی تو کیا جاتریوں کو اپنے سر پر ٹھہراؤں گا؟ آپ صاحب سے کہہ دیجیے گا۔ یہاں ان کی دال نہ گلے گی۔ یہاں بھی کچھ دم رکھتے ہیں بارھوں مہینہ کھلے خزانے جوا کھیلتے ہیں۔ ایک ایک دن میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ تھانہ دار سے لے کر سپرینٹنڈنٹ تک سب جانتے ہیں پر مجال کیا کہ کوئی دوڑ لے کر آئے خون تک چھپا ڈالے ہیں۔

طاہر : تو آپ یہ سب باتیں مجھ سے کیوں کہتے ہیں کیا میں جانتا نہیں ہوں۔ آپ

نے سید رضا علی تھانہ دار کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں انھیں کا لڑکا ہوں۔ یہاں کون پنڈا ہے جس کو میں نہیں جانتا۔

نایک رام : لیجیے گھر ہی بید تو مریے کیوں ؟ پھر تو آپ اپنے گھر ہی کے آدمی ہیں۔ داروغہ جی کی طرح بھلا کیا کوئی افسر ہوگا۔ کہتے تھے! "بیٹا! جو چاہے کرو لیکن میرے پنجے میں نہ آنا۔" میرے دروازہ پر بھیڑ جمتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ بالکل گھر والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کوئی بات بنی بگڑی جاکر سب کی سب سنا دیتا تھا۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتے تھے۔ "بس جاؤ۔ اب ہم دیکھ لیں گے۔" ایسے آدمی اب کہاں ؟ ست جگی لوگ تھے۔ آپ تو اپنے بھائی ہی ٹھہرے۔ صاحب کو دھتا کیوں نہیں بتاتے؟ آپ کو نارائن نے علم اور عقل دی ہے۔ بیسویں بہانے نکال سکتے ہیں۔ برسات میں پانی رکتا ہے۔ دیمک بہت ہے۔ لونی لگے گی ایسے ہی اور کتنے بہانے ہیں۔

طاہر : پنڈا جی! جب آپ سے بھائی چارہ ہوگیا تو کیا پروا ہے ؟ صاحب پرلے درجہ کا گھاگ ہے۔ حاکموں سے اس کا بڑا میل جول ہے مفت میں زمین لے لے گا۔ سورداس کو تو چاہے سو دو سو مل بھی رہیں۔ میرا انعام اکرام غائب ہو جائے گا۔ آپ سورداس سے معاملہ طے کر دیجیے تو اس کا بھی فائدہ ہو۔ میرا بھی اور آپ کا بھی۔

نایک رام : آپ کو جو یہاں سے انعام اکرام ملنے والا ہو وہ ہمیں لوگوں سے لے لیجیے۔ اسی بہانے کچھ آپ کی خدمت کریں گے۔ میں تو داروغہ جی کو جیسا سمجھتا ہوں۔ ویسا ہی آپ کو بھی سمجھتا ہوں۔

طاہر : معاذ اللہ! پنڈاجی! ایسی بات نہ کہیئے۔ میں مالک کی نگاہ بچا کر ایک کوڑی لینا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی خوشی سے جو کچھ دے دیں گے۔ میں ہاتھ پھیلا کر لے لوں گا پر ان سے چھپا کر نہیں۔ خدا اس راستہ ـ ، بچائے مرنے والے نے اتنا کمایا پر مرتے وقت گھر میں ایک کوڑی کفن کو بھی نہ تھی۔

نایک رام : ارے یار۔ میں تمھیں رشوت تھوڑا ہی دینےاکو کہتا ہوں۔ جب ہمارا آپ کا بھائی چارا ہوگیا تو ہمارا کام آپ سے نکلے گا۔ آپ کا کام ہم سے۔ یہ کوئی رشوت نہیں ہے۔

طاہر : نہیں پنڈا جی! خدا میری نیت کو پاک رکھے۔ مجھ سے نمک حرامی نہ ہوگی۔ میں

جس حال میں ہوں۔ اسی میں خوش ہوں۔ جب اس کے کرم کی نگاہ ہوگی تو میری بھلائی کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

نایک رام : سنتے ہو بجرنگی! داروغہ جی کی باتیں؟ چلو چپکے سے گھر بیٹھو۔ جو کچھ آگے آئے گا۔ دیکھا جائے گا۔ اب تو صاحب ہی سے نبٹنا پڑے گا۔

بجرنگی کے خیال میں نایک رام نے اتنی منت سماجت نہ کی تھی جتنی کرنی چاہیے تھی۔ آئے تھے اپنا کام نکالنے کہ ہیکڑی دیکھانے۔ عاجزی سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ڈینگ مارنے سے نہیں نکلتا۔ نایک رام نے تو لاٹھی کندھے پر رکھی اور چلے۔ بجرنگی نے کہا کہ میں ذرا جانوروں کو دیکھنے جاتا ہوں اور ادھر ہی سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ وہ یوں بڑا اکھڑ آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا۔ سارا محلّہ اس کے غصہ سے کانپتا تھا۔ لیکن وہ قانونی کاروائیوں سے ڈرتا تھا۔ پولیس اور عدالت کے نام ہی سے اس کی جان سوکھ جاتی تھی۔ نایک رام کو روز ہی عدالت سے کام رہتا تھا۔ وہ ان باتوں میں مشاق تھے۔ بجرنگی کو اپنی زندگی میں کبھی گواہی دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ نایک رام کے چلے آنے پر طاہر علی بھی گھر چلے گئے۔ پر بجرنگی وہیں آس پاس ٹہلتا رہا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنا دکھڑا سناؤں۔

طاہر علی کے باپ محکمۂ پولیس میں کانسٹیبل سے تھانہ داری کے درجہ تک پہنچے تھے۔ مرتے وقت کوئی جائداد تو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ ان کی تجہیز و تکفین بھی قرض لے کر کی گئی۔ لیکن طاہر علی کے سر پر دو بیواؤں اور ان کی اولاد کا بار چھوڑ گئے۔ انھوں نے تین شادیاں کی تھیں پہلی بیوی سے طاہر علی تھے دوسری سے ماہر علی اور ظاہر علی اور تیسری سے جابر علی۔ طاہر علی مستقل مزاج اور عقل مند تھے۔ باپ کی وفات ہونے پر سال بھر تو وہ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ پھر کہیں مویشی خانہ کی محرری مل گئی۔ کہیں کسی دوا فروش کے ایجنٹ ہو گئے۔ کہیں چنگی گھر کے منشی کا عہدہ مل گیا۔ ادھر کچھ عرصہ سے مسٹر جان سیوک کے یہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ ان کے عادات و اطوار اپنے والد مرحوم سے بالکل نرالے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور دل کے صاف تھے۔ حرام کی آمدنی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ ان کی ماں تو وفات پا چکی تھیں۔ مگر دونوں سوتیلی مائیں بقید حیات تھیں۔ طاہر

علی کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بیوی کے علاوہ ایک لڑکا تھا۔ صابر علی۔ اور ایک لڑکی نسیمہ۔ اتنا بڑا خاندان تھا اور صرف تیس روپیہ ماہوار آمدنی۔ اس گرانی کے زمانہ میں جب کہ اس سے پانچ گنا آمدنی میں بھی فراغت سے گزر بسر نہ ہوتی تھی۔ ان کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی لیکن نیت فاصد نہ ہوتی تھی۔ خدا کا خوف ان کی خصلت کا خاص جزو تھا۔ گھر پہنچے تو ماہر علی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ظاہر اور جابر مٹھائی کے لیے رو رہے تھے۔ اور صابر آنگن میں اچھل اچھل کر باجرہ کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ طاہر علی تخت پر بیٹھ گئے اور دونوں چھوٹے بھائیوں کو گود میں اٹھا کر چپ کرانے لگے۔ ان کی بڑی سوتیلی ماں نے جس کا نام زینب تھا۔ دروازہ پر کھڑی ہوکر نایک رام اور بجرنگی کی باتیں سنی تھیں۔ بجرنگی دس ہی پانچ قدم چلا تھا کہ ماہر علی نے پکارا۔ "سنو جی! او آدمی! ذرا یہاں آنا" تمھیں اماں بلا رہی ہیں۔" بجرنگی لوٹ پڑا۔ کچھ آس بندھی۔ آکر پھر برآمدہ میں کھڑا ہوگیا۔ زینب ٹاٹ کے پردہ کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ پوچھا۔ "کیا بات تھی جی؟"

بجرنگی : وہی زمین کی بات چیت تھی۔ صاحب اسے لینے کو کہتے ہیں۔ ہمارا گزر بسر اسی زمین سے ہوتا ہے۔ منشی جی سے کہہ رہا ہوں کسی طرح اس جھگڑا کو نبٹا دیجیے بجر نیاج (نذر نیاز) دینے کو بھی تیار ہوں پر منشی جی سنتے ہی نہیں۔

زینب : سنیں گے کیوں نہیں؟ سنیں گے نا تو غریبوں کی آہ کس پر پڑی گی؟ تم بھی تو گنوار آدمی ہو۔ ان سے کیا کہنے گئے؟ ایسی باتیں مردوں سے کہنے کی تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ ہم سے کہتے ہم طے کرا دیتے۔

جابر کی ماں کا نام تھا رقیہ۔ وہ بھی آکر کھڑی ہوگئی۔ دونوں عورتیں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں کے دل و دماغ اور خیالات یکساں تھے۔ ان میں سوکن کا جلاپا نام کو نہ تھا۔ آپس میں بہنوں کی محبت تھی۔ بولی۔ "اور کیا بھلا ایسی باتیں مردوں سے کی جاتی ہیں ؟"

بجرنگی : ماتاجی۔ میں گنوار آدمی اس کا حال کیا جانوں۔ اب آپ ہی طے کرا دیجیے۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچے جئیں گے۔

زینب : سچ سچ کہنا۔ یہ معاملہ دب جائے تو کہاں تک دوگے؟

بجرنگی :   بیگم صاحب۔ پچاس روپے تک دینے کو تیار ہوں۔
زینب :   تم بھی تو غضب کرتے ہو۔ پچاس ہی میں اتنا بڑا کام نکالنا چاہتے ہو۔
رقیہ :   (آہستہ سے) بہن! کہیں بدک نہ جائے۔
بجرنگی :   کیا کروں بیگم صاحب۔ غریب آدمی ہوں۔ لڑکوں کو جو کچھ حکم ہوگا دودھ دہی کھلاتا رہوں گا۔ لیکن نگد (نقد) تو اس سے زیادہ میرے کیے نہ ہوگا۔
رقیہ :   اچھا تو روپیوں کا انتظام کرو۔ خدا نے چاہا تو سب طے ہو جائے گا۔
زینب :   (آہستہ سے) رقیہ! تمھاری جلد بازی سے تو میں عاجز آگئی۔
بجرنگی :   ماں جی۔ یہ کام ہو گیا تو سارا محلّہ آپ کا جس گائے گا۔
زینب :   مگر تم تو پچاس سے آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اتنے تو صاحب ہی دے دیں گے۔ پھر گناہِ بے لذت کیوں کیاجائے؟
بجرنگی :   ماں جی! آپ سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ دس پانچ روپے اور جٹا دوں گا۔
زینب :   تو کب تک روپے آجائیں گے۔
بجرنگی :   بس دو دن کی مہلت مل جائے۔ تب تک منشی جی سے کہہ دیجیے صاحب سے کہیں سنیں۔
زینب :   واہ مہتو! تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ مفت ہی میں کام نکالنا چاہتے ہو۔ پہلے روپے لاؤ پھر تمھارا کام نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔

بجرنگی دوسرے دن آنے کاوعدہ کر کے خوش خوش چلا گیا۔ تو زینب نے رقیہ سے کہا۔ ”تم بے صبر ہو جاتی ہو۔ ابھی چماروں سے دو پیسے فی کھال لینے پر تیار ہو گئیں۔ میں دو آنے لیتی اور وہ خوشی سے دیتے۔ یہ اہیر پورے سو گن کر جاتا۔ بے صبری سے غرض مند چوکنا ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے شاید ہم کو بیوقوف بنا رہی ہیں۔ جتنی ہی دیر لگاؤ جتنی ہی بے رخی سے کام لو اتنا ہی اعتبار بڑھتا ہے۔
رقیہ :   کیا کروں بہن! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں بہت سختی سے نشانہ خطا نہ ہو جائے۔
زینب :   وہ اہیر روپے ضرور لائے گا۔ طاہر کو آج ہی سے بھرنا شروع کردو۔ بس عذاب کا خوف دلانا چاہیے۔ انھیں ہتھّے چڑھانے کا یہی ڈھنگ ہے۔
رقیہ :   اور کہیں صاحب نہ مانیں تو۔

زینب : تو کون ہمارے اوپر کوئی نالش کرنے جا ہے؟

طاہر علی کھانا کھاکر لیٹے تھے کہ زینب نے جاکر کہا۔ "صاحب دوسروں کی زمین کیوں لیے لیتے ہیں۔ بیچارے روتے روتے پھرتے ہیں۔"

طاہر : مفت تھوڑا ہی لینا چاہتے ہیں۔ اس کا معقول معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔

زینب : یہ تو غریبوں پر ظلم ہے۔

رقیہ : ظلم ہی نہیں ہے عذاب ہے۔ بھیا! تم صاحب سے صاف صاف کہہ دو۔ "مجھے اس عذاب میں نہ ڈالیے۔ خدا نے میرے آگے بھی بال بچے دیے ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ میں یہ عذاب سر پر نہ لوں گا۔"

زینب : گنوار تو ہیں ہی۔ تمھارے ہی سر ہو جائیں تمھیں صاف کہہ دینا چاہیے کہ میں محلّہ والوں سے دشمنی نہ مول لوں گا۔ جان جوکھم کی بات ہے۔

رقیہ : جان جوکھم تو ہے ہی۔ یہ گنوار کسی کے نہیں ہوتے۔

طاہر : کیا آپ نے بھی کچھ افواہ سنی ہے۔

رقیہ : ہاں۔ یہ سب چمار آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ صاحب نے زمین لی تو خون کی ندی بہہ جائے گی۔ میں نے تو جب سے سنا ہے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔

زینب : ہوش اڑنے کی بات ہی ہے۔

طاہر : مجھے وہ سب ناحق بدنام کر رہے ہیں۔ میں لینے نہ دینے میں۔ صاحب نے اس اندھے سے زمین کے بارہ میں بات چیت کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی جو میرا فرض تھا۔ لیکن یہ احمق یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ہی صاحب کو اس زمین کی خریداری پر آمادہ کیا ہے۔ حالانکہ خدا جانتا ہے۔ میں نے کبھی ان سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

زینب : مجھے بدنامی کا خوف تو نہیں ہے۔ ہاں خدا کے قہر سے ڈرتی ہوں۔ بیکسوں کی آہ کیوں سر پر لو؟

طاہر : میرے اوپر کیوں عذاب پڑنے لگا؟

زینب : اور کس کے اوپر پڑے گا۔ بیٹا! یہاں تو تمھیں ہو۔ صاحب تو نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ تو بھس میں آگ لگا کر دور سے تماشہ دیکھیں گے۔ آئی گئی تو تمھارے سر

آئے گی۔ اس پر قبضہ تمھیں کرنا پڑے گا۔ مقدمے چلیں گے تو پیروی تمھیں کرنا پڑے گی۔ نا بھیا! میں اس آگ میں نہیں کودنا چاہتی۔

رقیہ : میرے میکے میں ایک کارندہ نے کسی کا شتکار کی زمین نکال لی تھی دوسرے ہی دن جوان بیٹا اٹھ گیا۔ کیا اس نے زمیندار ہی کے حکم سے مگر بلا آئی اس غریب کے سر۔ دولت مندوں پر عذاب بھی نہیں پڑتا۔ اس کا وار بھی غریبوں ہی پر ہوتا ہے۔ ہمارے بچے روز ہی نظر اور آسیب کی جھپٹ میں آتے رہتے ہیں۔ پر آج تک کبھی نہیں سنا کہ کسی انگریز کے بچہ کو نظر لگی ہو۔ ان پر بلاؤں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

یہ پتہ کی بات تھی۔ طاہر علی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ ان کے گھر کے سبھی بچے گنڈے اور تعویذوں سے مڑھے ہوئے تھے۔ اس پر بھی آئے دن جھاڑ پھونک اور رائی نمک کی ضرورت پڑا ہی کرتی تھی۔

مذہب بالخصوص خوف پر مبنی ہے۔ خوف کو دور کر دیجیے۔ پھر آپ کی تیرتھ جاترا۔ پوجا پاٹ۔ اشنان دھیان۔ روزہ نماز کسی کا نشان بھی نہ رہے گا۔ مسجدیں خالی نظر آئیں گی اور مندر ویران۔

طاہر علی کو خوف نے مغلوب کر دیا۔ آقا کی خدمت گذاری یا فرض شناسی کا خیال قہر ایزادی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

(5)

چتاری کے راجہ مہندر کمار سنگھ اپنے عین عالم شباب ہی میں اپنی کار گزاری اور خاندانی شرافت کے سبب میونسپلٹی کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر کام کرنا ان کے چال چلن کا خاصہ تھا۔ رئیسوں کی عیش پسندی اور نمود طلبی کا ان کے مزاج میں شائبہ بھی نہ تھا۔ بہت ہی سادہ لباس پہنتے تھے۔ اور ٹھاٹھ باٹ سے نفرت کرتے تھے۔ شوق تو ان کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ گھوڑدوڑ، بائیسکوپ، تھیڑ، رقص و سرور سیر و شکار، شطرنج یا تاش سے ان کو ذرا بھی مس نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ رغبت تھی تو باغبانی سے۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتے تھے۔ باقی وقت شہر کے معائنہ اور میونسپلٹی کے کاموں کی انجام دہی میں صرف کرتے تھے۔ حکام سے

وہ بلا ضرورت بہت کم ملتے تھے۔ ان کے دور انتظام میں شہر کے محض انھیں حصوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی جہاں حکام کے بنگلے تھے۔ شہر کی تاریک گلیوں اور تعفن خیز بدرووں کی صفائی وسیع سڑکوں اور دلکش فضاؤں کی صفائی سے کم ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر حکام ان سے کشیدہ رہتے تھے۔ انھیں فریبی اور مغرور خیال کرتے تھے۔ لیکن شہر کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی ان سے غرور یا بیرخی کی شکایت نہ تھی۔ ہر وقت ہر شخص سے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ ضابطہ کی خلاف ورزی کے لیے انھیں عوام پر جرمانہ کرنے یا مقدمہ چلانے کی بہت کم ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ان کا اثر و اخلاق سخت طریقۂ عمل کو دبائے رکھتا تھا۔ وہ انتہا درجہ کے کم سخن تھے۔ کبر سنی کی خاموشی خیالات کی پختگی کی دلیل ہے۔ اور عالم شباب کی خاموشی ان کی مسرت کی۔ لیکن راجہ صاحب کی کم گوئی اس بات کو غلط ثابت کرتی تھی۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی تھی اس میں غور و خوض کی کافی جھلک ہوتی تھی۔ ایک باثروت تعلقہ دار ہونے پر بھی ان کی طبیعت کا میلان جمہوریت کی جانب تھا۔ ممکن ہے یہ ان کے سیاسی اصولوں کا نتیجہ ہو کیوں کہ ان کی تعلیم، ان کا اقتدار ان کے گرد و پیش کے حالات ان کا مفاد سب اس میلان کے ناموافق تھے۔ مگر ضبط اور مشق نے اب اس کو ان کے خیالی دائرہ سے نکال کر ان کی فطرت میں داخل کر دیا تھا۔ شہر کے انتخابی حلقوں کی درستی میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس لیے شہر کے اکثر رؤسا ء ان سے بدظن رہا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں راجہ صاحب کی جمہوریت پرستی صرف ان کے عہدہ کو قائم و برقرار رکھنے کا ذریعہ تھی۔ وہ عرصہ تک اپنی اس عزت کی جگہ پر متمکن رہنے کے لیے یہ خود نمائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اخباروں میں بھی کبھی کبھی اس پر نوٹ شائع ہوتے رہتے تھے۔ لیکن راجہ صاحب اس کی تردید کے لیے عقل اور وقت کا بیجا تصرف نہ کرتے تھے۔ نیک نام بننا ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا پر وہ خوب جانتے تھے کہ اس اونچے درجہ پر پہنچنے کے لیے عوام کی بے غرضانہ خدمت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ راجہ صاحب اشنان دھیان سے فارغ ہو کر شہر کے معائنہ کے لیے جا رہے تھے کہ اتنے میں مسٹر جان سیوک کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ جان سیوک کا حکام

سے زیادہ ربط ضبط تھا۔ ان کے سگریٹ کمپنی کے حصہ دار بھی زیادہ تر حکام ہی تھے۔ راجہ صاحب نے کمپنی کا پراسپیکٹس دیکھا تھا مگر جان سیوک سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے وہ بدگمانی تھی جس کی بنیاد افواہوں پر ہوتی ہے۔راجہ صاحب انھیں خوشامدی اور زمانہ ساز سمجھتے تھے۔ جان سیوک کو وہ ایک مجسم راز معلوم ہوتے تھے۔ لیکن راجہ صاحب کل اندو سے ملنے گئے تھے۔ وہاں صوفیہ سے ان کی ملاقت ہو گئی تھی۔ اسی وقت جان سیوک کا بھی کچھ ذکر آگیا تھا اس وقت سے مسٹر سیوک کے متعلق ان کے خیالات میں بہت کچھ تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ کارڈ پاتے ہی باہر نکل آئے اور جان سیوک سے ہاتھ ملا کر ان کو اپنے دیوان خانہ میں لے گئے۔ جان سیوک کو یہ کسی فقیر کی کٹی کی طرح معلوم ہوا جہاں سجاوٹ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ چند کرسیوں اور ایک میز کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ ہاں کاغذات و اخبارات کا ایک ڈھیر میز پر بے ترتیبی کے ساتھ پڑا ہو تھا۔

ہم کسی سے ملتے ہی اپنی قیاسی عقل سے معلوم کر لیتے ہیں کہ ہماری نسبت اس کا کیا خیال ہے۔ مسٹر سیوک کو ایک لمحہ تک زبان کھولنے کی جرات نہ ہوئی۔ تمہید کا کوئی مناسب پہلو نہ سوجھتا تھا۔ اس بحر بے پایاں کو پار کرنے کے لیے ایک زمین سے اور دوسرا آسمان سے مدد مانگ رہا تھا۔ راجہ صاحب کو تمہید تو سوجھ گئی تھی (صوفی کے اعلا ایثار اور خدمت کے بیان سے بڑھ کر اور کون سی تمہید ہوتی؟) مگر بعض اشخاص کو اپنی تعریف سننے سے جس قدر گریز ہو تا ہے اتنا ہی کسی دوسرے کی تعریف کرنے سے ہوتا ہے۔ جان سیوک میں یہ بات نہ تھی۔ وہ تعریف یا غیبت دونوں ہی کر سکتے تھے۔ یکساں کمال کے ساتھ۔ بولے۔ ”آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا۔ لیکن تعارف نہ ہونے کے سبب حاضر نہ ہو سکتا تھا۔ اور صاف بات تو یہ ہے (مسکرا کر) آپ کے بارہ میں حکام کے منہ سے ایسی ایسی باتیں سنتا تھا۔ جو میری خواہش کو عمل میں منتقل نہ ہونے دیتی تھیں۔ مگر آپ نے انتخابی طریقوں کو آسان بناکر جس حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے ان سے حاکموں کے جھوٹے اعتراضات کی قلعی کھول دی ہے۔“

حکام کے بیجا اعتراضات کا تذکرہ کر کے جان سیوک نے اپنی زبان کی صفائی

ثابت کردی۔ راجہ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ آسان کوئی تدبیر نہ تھی۔ راجہ صاحب کو حکام سے یہی شکایت تھی۔ اسی سبب سے ان کے انتظامات میں مشکلیں آپڑتی تھیں، تاخیر ہو جاتی تھی اور رکاوٹیں پیدا ہو تی تھیں۔ بولے۔ ''یہ میری بد قسمتی ہے کہ حکام مجھ سے اس قدر بدظن رہتے ہیں۔ میری اگر کوئی خطا ہے تو اتنی ہی کہ میں عوام کے لیے بھی صحت اور سہولت کی اتنی ہی ضرورت سمجھتا ہوں جتنی حکام اور رؤسا کے لیے۔''

مسٹر سیوک : جناب! ان لوگوں کے دماغ کی کچھ نہ پوچھیے۔ دنیا ان کی آسائش کے لیے ہے اور کسی کو اس میں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے جو شخص ان کے آستانے پر جبیں سائی نہ کرے وہ نا اہل نا مہذب اور باغی ہے اور جو شخص قومیت کا ذرا بھی احساس رکھتا ہو۔ بالخصوص جو یہاں کی صنعت حرفت کو فروغ دینا چاہتا ہو وہ بلا شبہ قابل تعزیر ہے اور گردن زدنی ہے۔ حب الوطنی ان کی نگاہ میں بدترین گناہ ہے۔ آپ نے میرے سگریٹ کے کارخانہ کا دستور العمل ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

مہندر : جی ہاں دیکھا تھا۔

جان سیوک : پراسپکٹس کا نکلنا تھا کہ حکام کی نگاہیں مجھ سے یک دم پھر گئیں۔ مجھ پر ان کی نوازش تھی۔ اکثر حکام سے میری دوستی تھی۔ مگر اسی روز سے میں ان کی برادری سے خارج کردیا گیا۔ میرا حقّہ پانی بند ہو گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی رؤساء اور حکام نے بھی آنا کانی شروع کردی۔ اب میں ان لوگوں کی نگاہوں میں شیطان سے بھی زیادہ مکروہ ہوں۔

اتنی طولانی تمہید کے بعد جان سیوک اپنے مطلب پر آئے۔ بہت کچھ ہچکتے ہوئے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ راجہ صاحب قیافہ شناس تھے۔ پیران پارسا کو خوب پہچانتے تھے۔ انھیں مغالطہ دینا آسان نہ تھا۔ لیکن موقع ایسا آ پڑا تھا کہ ان کو اپنے اصولوں کی حفاظت کے لیے تجاہل سے کام لینا پڑا کسی دوسرے موقع پر وہ اس تجویز کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیتے۔ ایک غریب بیکس اندھے کی زمین کو جو اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہو۔ اس کے قبضہ سے نکال کر ایک سرمایہ دار کو دے دینا ان کے اصول کے منافی تھا۔ لیکن آج اول مرتبہ انھیں اپنے اصوں کو طاق پر رکھ دینا پڑا۔ یہ جانتے

ہوئے کہ مس صوفیہ نے ان کے ایک قریبی رشتہ دار کی جان بچائی ہے یہ جانتے ہوئے کہ جان سیوک کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا کنور بھرت سنگھ کو احسان کے بھاری بوجھ سے سبکدوش کردینا ہوگا وہ اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ احسان مندی ہم سے وہ سب کچھ کرالیتی ہے جو اصولی نقطہ خیال سے مذموم و قابل تحقیر ہے۔ یہ وہ چکی ہے جو ہمارے اصولوں اور قاعدوں کو پیس ڈالتی ہے۔ آدمی جتنا ہی بے لوث ہوتا ہے۔ اس کے لیے احسان کا بار اتنا ہی نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب نے اس معاملہ کو جان سیوک کے حسب منشا طے کر دینے کا وعدہ کیا اور مسٹر سیوک اپنی کامیابی پر پھولے ہوئے گھر آئے۔

بیوی نے پوچھا۔ "کیا طے کر آئے۔"

جان سیوک : وہی جو طے کرنے گیا تھا۔

بیوی : شکر ہے مجھے امید نہ تھی۔

جان سیوک : یہ سب صوفی کے احسان کی برکت ہے۔ یہ اسی کے ایثار کی طاقت ہے جس نے مہندر کمار جیسے مغرور اور بے مروت آدمی کو نیچا دکھا دیا۔ ایسے تپاک سے طے ہوا گویا میں ان کا ایک پرانا دوست تھا۔ یہ مسئلہ واقعی نا قابل حل تھا اور اس کے حل کے لیے میں صوفی کا مرہون منت ہوں۔

مسز سیوک : (ترش رو ہوکر) تو تم جاکر اسے لے آؤ۔ میں نے منع تو نہیں کیا ہے۔ مجھے ایسی باتیں بار بار کیوں سناتے ہو؟ میں تو اگر پیاسی مرتی بھی ہوں گی۔ تو اس سے پانی نہ مانگوں گی۔ مجھے للو پتو نہیں آتی۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر بھی۔ اگر وہ خدا سے منحرف ہو کر اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے تو میں بھی اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے کیوں اس کی خوشامد کروں ؟

پربھو سیوک روزانہ ایک بار صوفیہ سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کنور صاحب اور ونے دونوں کی منکسر مزاجی اور شرافت نے اس کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ کنور صاحب جوہر شناس تھے۔ انھوں نے اول ہی روز ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا تھا کہ یہ نو جوان معمولی دل و دماغ والا نہیں ہے۔ ان پر یہ بات بھی مخفی نہ رہی کہ اس کا فطرتی میلان ادب اور فلسفہ کی طرف ہے۔ تجارتی کاروبار سے اسے اتنی مناسبت ہے جتنی ونے کو زمینداری

سے۔ اس لیے وہ پربھو سیوک سے بالعموم ادب اور فلسفہ پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس کے فطرتی رجحان کو قومیت کے جذبات سے معمور کردینا چاہتے تھے۔ پربھوسیوک کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص فن شاعری کا ماہر ہے۔ ان سے اسے وہ انس ہو گیا تھا۔ جو شعرا کو اصحاب ذوق سے ہوا کرتا ہے۔ اس نے انھیں اپنی کئی نظمیں سنائی تھیں۔ ان کی فیاضانہ داد ہی سے اس پر ایک نشہ سا چڑھا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت شاعری کے خیال میں محو رہتا۔ وہ شک اور مایوسی جو عموماً نو مشق ادیبوں کو اپنے کلام کی اشاعت اور قبولیت کے بابت ہوا کرتی ہے۔ کنور صاحب کی ہمت افزائیوں کے باعث یقین اور حوصلہ کی صورت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ وہی پربھوسیوک جو ہفتوں تک قلم نہ اٹھاتا تھا۔ اب ایک ایک دن میں کئی کئی نظمیں لکھ ڈالتا۔ اس کے خیالات میں دریا کی سی روانی اور فراوانی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اس وقت بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جان سیوک کو آتے دیکھ کر وہاں گیا کہ دیکھوں کیا خبر لائے ہیں؟ زمین کے ملنے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوگئی تھیں ان سے اسے امید ہو گئی تھی کہ غالباً کچھ دنوں تک اس بندش میں نہ پڑوں۔ جان سیوک کی کامیابی نے اس امید کو منقطع کردیا۔ دل کی اس حالت میں ماں کے آخری الفاظ اسے نہایت ناگوار معلوم ہوئے۔ بولا۔ ”ماما۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ صوفی وہاں کسم پرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اکتا کر خود بخود چلی آئے گی تو آپ غلطی پر ہیں۔ صوفی وہاں اگر برسوں رہے تو بھی وہ لوگ اس کا گلا نہ چھوڑیں گے۔ میں نے ایسے سیر چشم اور خلیق آدمی نہیں دیکھے۔ ہاں صوفی کی حمیت یہ گوارا نہ کرے گی کہ وہ عرصہ تک ان کی مہمان نوازی سے مستفیض ہوتی رہے۔ ان دو ہفتوں میں وہ جتنی کمزور ہوگئی ہے اتنی مہینوں بیمار رہ کر بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اسے تمام دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں۔ لیکن جس طرح کسی سرد ملک کا پودا گرم ملک میں آکر ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی روز بروز سوکھتا ہی جاتا ہے۔ وہی حالت اس کی بھی ہو گئی ہے۔ اس کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ اگر آپ نے اس کو وہاں سے جلدی نہ بلا لیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ وہ آج کل بدھ اور جین مذہب کی کتابیں دیکھا کرتی ہے۔ اور مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔“

جان سیوک : تم تو روز وہاں جاتے ہو۔ کیوں اپنے ساتھ نہیں لاتے؟
مسز سیوک : مجھے اس کا اندیشہ نہیں ہے۔ یسوع کا دشمن میرے یہاں جگہ نہیں پا سکتا۔
پربھوسیوک : گرجا نہ جانا ہی اگر یسوع کا دشمن ہونا ہے تو لیجئے آج سے میں بھی گرجا نہ جاؤں گا۔ نکال دیجیے مجھے بھی گھر سے۔
مسز سیوک : (روکر) تو یہاں میرا ہی کیا رکھا ہے؟ اگر میں ہی بس کی گانٹھ ہوں تو میں ہی منہ میں سیاہی لگا کر کیوں نہ نکل جاؤں؟ تم اور صوفی آرام سے رہو میرا بھی خدا مالک ہے۔
جان سیوک : پربھو! تم میرے سامنے اپنی ماں کی تحقیر نہی کر سکتے۔
پربھوسیوک : خدا نہ کرے کہ میں اپنے ماں کی تحقیر کروں۔ لیکن میں دکھاوا والے مذہب کے لیے اپنی روح پر یہ جبر نہ ہونے دوں گا۔ آپ لوگوں کی ناراضگی کے خوف سے اب تک میں نے اس بارہ میں کبھی زبان نہیں ہلائی۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ اور کسی بات میں تو مذہب کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ساری مذہبی محبت کا دکھاوا کے طریقہ پر ہی اظہار کیا جا رہا ہے تو مجھے شک ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ اور تو نہیں۔
جان سیوک : تم نے کس بات میں مجھے مذہب کے خلاف عمل کرتے دیکھا ہے؟
پربھوسیوک : سینکڑوں ہی باتیں ہیں۔ ایک ہو تو کہوں۔
جان سیوک : نہیں ایک ہی بتلاؤ۔
پر بھو سیوک : اس بیکس اندھے کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے آپ جن ذرائع سے کام لے رہے ہیں کیا وہ مذہب کے مطابق ہیں؟ مذہب کا خاتمہ وہیں ہوگیا جب اس نے کہہ دیا کہ میں اپنی زمین کو کسی طرح بھی نہ دوں گا۔ اب قانونِ حکمت اور دھمکیوں سے اپنا مطلب نکالنا آپ کو مذہب کے موافق معلوم ہوتا ہو تو ہو۔ مجھے تو وہ سراسر لا مذہبی اور نا منصفی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔
جان سیوک : تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے حجت نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے جاکر ٹھنڈے ہو آؤ۔ پھر میں تمھیں اس کا جواب دوں گا۔

پربھو سیوک غصہ سے بھرا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ یہاں تک تو اس کا ستیا گرہ محض لفظی تھا اب اس کے عمل ہونے کا موقع آ گیا۔ لیکن عمل کی طاقت اس کے دل میں بالکل نہ تھی۔ اس جھنجھلاہٹ کی حالت میں وہ کبھی ایک کوٹ پہنتا کبھی اس کو اتار کر دوسرا پہنتا۔ کبھی کمرہ کے باہر چلا جاتا کبھی اندر آجاتا۔ اسی اثناء میں مسٹر جان سیوک آکر بیٹھ گئے اور متانت آمیز لہجہ میں بولے ''پربھو! آج تمھارا جوش دیکھ کر مجھ کو جس قدر رنج ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے اب تک تمھاری عملی دانائی پر اعتماد تھا۔ لیکن اب وہ اعتماد جاتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم زندگی اور مذہب کے تعلق کو خوب سمجھتے ہو لیکن اب معلوم ہوا کہ صوفی اور اپنی ماں کی طرح تم بھی وہم میں مبتلا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اور مجھ سے اور ہزاروں اشخاص جو روز گرجا جاتے ہیں۔ بھجن گاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ کیا وہ واقعی مذہبی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ ہر گز نہیں اگر اب تک تمھیں نہیں معلوم ہے تو اب معلوم ہو جانا چاہیے کہ مذہب صرف خود غرضی کا نام ہے۔ ممکن ہے تمھیں یسوع پر اعتقاد ہو۔ شاید تم انھیں خدا کا بیٹا یا کم از کم مہاتما سمجھتے ہو۔ پر مجھے تو اس قدر یقین نہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے اتنی ہی عقیدت ہے جتنی کسی معمولی فقیر کے لیے۔ اسی طرح فقیر بھی عفو و عطا کے گیت گاتا ہے۔ عقبیٰ کی خوشیوں کا راگ الاپتا پھرتا ہے۔ وہ بھی اتنا ہی بے لوث، اتنا ہی منکسر مزاج اور اتنا ہی مذہب کا دلدادہ ہے۔ لیکن اس قدر بدظنی ہونے پر بھی میں اتوار کو سو کام چھوڑ کر گرجا ضرور جاتا ہوں۔ نہ جانے سے اپنی جماعت میں بے تعلقی ہو گی۔ اس کا میرے کاروبار پر برا اثر پڑے گا۔ پھر اپنے ہی گھر میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی۔ میں صرف تمھاری ماں کی خاطر سے اپنے اوپر یہ ظلم کرتا ہوں اور تم سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ بیجا ضد سے کام نہ لو۔ تمھاری ماں غصہ کے نہیں بلکہ رحم کے قابل ہے۔ بولو تمھیں کچھ کہنا ہے؟

پربھو سیوک : جی نہیں۔

جان سیوک : اب تو پھر اتنی شرارت نہ کروگے؟

پربھو سیوک نے مسکرا کر کہا۔ ''جی نہیں۔''

(6)

مذہبی خوف میں جہاں بہت سی بھلائیاں ہیں وہیں ایک برائی بھی ہے۔ اس میں سادگی ہوتی ہے۔ مکر و فریب کا داؤں اس پر آسانی سے چل جاتا ہے۔ مذہب سے ڈرنے والا آدمی منطقی نہیں ہوتا۔ اس کی بحثی طاقت ست پڑ جاتی ہے۔ طاہر علی نے جب سے اپنی دونوں سوتیلی ماؤں کی باتیں سنی تھیں۔ ان کا دل بہت زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ بار بار خدا سے دعا مانگتے تھے۔ آئینی کتب سے اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دن تو کسی طرح گذرا۔ شام ہوتے ہی وہ مسٹر جان سیوک کے پاس پہنچے اور نہایت عاجزانہ لہجہ میں بولے۔ ''حضور کی خدمت میں اس وقت ایک خاص عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں ارشاد ہو تو کہوں۔''

جان سیوک : ہاں ہاں کہیے۔ کوئی نئی بات ہے کیا؟

طاہر : حضور اس اندھے کی زمین لینے کا خیال ترک کردیں تو عین مناسب ہے۔ ہزاروں دقتیں ہیں۔ تنہا سورداس ہی نہیں۔ سارا محلّہ مخالفت پر آمادہ ہے۔ خصوصاً نایک رام پنڈا بہت ہی بگڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا خوف ناک آدمی ہے۔ جانے کتنی بار فوجداریاں کر چکا ہے۔ اگر یہ سب دقتیں کسی طرح دور بھی ہو جائیں تو بھی آپ سے یہی استدعا کروں گا کہ اس کے بجائے کسی دوسری زمین کی فکر کیجیے

جان سیوک : یہ کیوں ؟

طاہر : حضور! یہ کار عذاب ہے۔ صدہا آدمیوں کا کام اس زمین سے نکلتا ہے۔ سب کی گائیں وہیں چرتی ہیں۔ براتیں ٹھہرتی ہیں۔ پلیگ کے ایام میں لوگ وہیں چھونپڑے ڈالتے ہیں۔ وہ زمین نکل گئی تو سارے محلّہ کو تکلیف ہوگی۔ اور لوگ دل میں ہمیں سیکڑوں بددعائیں دیں گے۔ اس کا عذاب ضرور پڑے گا۔

جان سیوک : (ہنس کر) عذاب تو میری گردن پر پڑے گا نا؟ میں اس کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔

طاہر : حضور میں بھی تو آپ ہی کے دامن سے وابستہ ہوں۔ میں اس عذاب سے کب بچ سکتا ہوں؟ بلکہ محلّہ والے تو مجھی کو باغی سمجھتے ہیں۔ حضور تو یہاں تشریف

رکھتے ہیں۔ میں تو آٹھوں پہر ان کی آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔ ہر وقت ان کی نظروں میں کھٹکتا رہوں گا۔ عورتیں بھی راہ چلتے دو چار کھری کھوٹی سنا دیا کریں گی۔ عیال دار آدمی ہوں خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ آخر شہر کے مضافات میں اور زمینیں بھی تو مل سکتی ہیں۔

مذہبی خوف مادہ پرستوں کی نظر میں مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ خصوصاً ایک جوان شخص میں اس کا ہونا تو نا قابل عفو سمجھا جاتا ہے۔ جان سیوک نے بناوٹی غصہ دکھلا تے ہوئے کہا۔ "میرے بھی تو بال بچے ہیں۔ جب میں نہیں ڈرتا تو آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اپنے بال بچے پیارے نہیں۔ یا میں خدا سے نہیں ڈرتا؟"

طاہر : آپ صاحب اقبال ہیں۔ آپ کو عذاب کا خوف نہیں۔ اقبال مندوں سے عذاب بھی ڈرتا ہے۔ خدا کا قہر غریبوں ہی پر نازل ہوتا ہے۔

جان سیوک : اس نئے مذہبی اصول کے بانی شاید آپ ہی ہوں گے کیوں کہ میں نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ اقبال مندی سے قہر ایزدی بھی ڈرتا ہے۔ بلکہ ہماری مذہبی کتب میں تو اہل ثروت کے لیے بہشت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے۔

طاہر : حضور مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھیں تو بہتر ہے۔

جان سیوک : آج آپ کو اس جھگڑے سے دور رکھوں کل آپ کو یہ خبط ہو کہ جانوروں کو ہلاک کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ آپ مجھے کھالوں کی خریداری سے دور رکھیں تو میں آپ کو کن کن باتوں سے دور رکھوں گا اور کہاں کہاں قہر ایزدی سے آپ کی حفاظت کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ کو اپنے ہی سے دور رکھوں۔ میرے یہاں رہ کر آپ کو قہر ایزدی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

مسز سیوک : جب آپ کو قہر ایزدی کا اتنا خوف ہے۔ تو آپ سے ہمارا کام نہیں ہو سکتا۔

طاہر : مجھے حضور کی خدمت سے انکار تھوڑا ہی ہے۔ میں تو صرف......

مسز سیوک : آپ کو ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ خواہ اس سے آپ کا خدا خوش ہو یا نا خوش۔ ہم اپنے کاموں میں آپ کے خدا کو دخل اندازی نہ کرنے

دیں گے۔

طاہر علی مایوس ہو گئے۔ دل کو سمجھانے لگے۔ ''خدا رحیم ہے۔ کیا وہ دیکھتا نہیں ہے کہ میں کیسی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میرا اس میں کیا بس ہے۔ اگر مالک کے احکام کی تعمیل نہ کروں تو کنبہ کی پرورش کیسے ہو۔ برسوں تک خاک چھاننے کے بعد تو یہ مستقل ملازمت ملی ہے۔ اسے چھوڑدوں تو پھر اسی طرح کوچہ گردی اختیار کرنی ہوگی۔ ابھی کچھ اور نہیں ہے تو روٹی دال کا سہرا تو ہے۔خانہ داری و فکر ضمیر کی آزادی کے لیے مہلک ہے۔

طاہر علی کو لاجواب ہو جانا پڑا۔ بیچارے اپنی بیوی کے سارے گہنے بیچ کر کھا چکے تھے۔ اب ایک چھلا بھی نہ تھا۔ ماہر علی انگریزی پڑھتا تھا۔ اس کے لیے اچھے کپڑے بنوانے پڑتے۔ ماہ بہ ماہ فیس دینی پڑتی۔ ظاہر علی اورجابر علی اردو مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ لیکن ان کی والدہ روز ہی جان کھایا کرتی تھی کہ انھیں بھی انگریزی مدرسہ میں بھرتی کرا دو۔ اردو پڑھا کر کیا چپراس گری کرانی ہے؟ انگریزی تھوڑی بھی آجائے گی تو کسی نہ کسی دفتر میں گھس ہی جائیں گے۔ بھائیوں کی ناز برداری پر ان کی ساری ضرورتیں قربان تھیں۔ پاجامہ میں اتنے پیوند لگ جاتے کہ کپڑے کی اصل شکل ہی چھپ جاتی تھی۔ نئے جوتے پہننا تو شاید ان پانچ برسوں میں انھیں نصیب ہی نہیں ہوا۔ ماہر علی کے پرانے جوتوں پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ خوش نصیبی سے ماہر علی کے پیر بڑے تھے۔ حتی الامکان وہ اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن کبھی ہاتھ تنگ رہنے کے سبب ان کے لیے نئے کپڑے نہ بنوا سکتے یا فیس دینے میں دیر ہو جاتی، یا ناشتہ نہ مل سکتا۔ یا مدرسہ میں کچھ کھانے کے لیے پیسہ نہ ملتے تو دونوں مائیں تلخ اور طعن آمیز باتوں سے ان کو چھید ڈالتی تھیں۔ بیکاری کے ایام میں وہ اکثر اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بیوی اور بچوں کو اپنی سسرال پہنچا دیا کرتے تھے۔ غیرت کے سبب سے ایک آدھ مہینہ کے لیے بلا لیتے اور پھر کسی نہ کسی حیلہ سے رخصت کر دیتے۔ جب سے مسٹر جان سیوک کے یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ جبھی سے گویا ان کے دن پھر گئے تھے۔ کل کی فکر سر پر سوار نہ رہتی تھی۔ ماہر علی کی عمر پندرہ سال سے تجاوز کرگئی تھی۔ اب ان کی ساری امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ

تھیں۔ سوچتے تھے جب ماہر علی میٹرک ہو جائے گا تو صاحب سے سفارش کر کے پولیس میں بھرتی کرادوں گا۔ تنخواہ پچاس روپے ماہوار سے کیا کم ہوگی۔ ہم دونوں بھائیوں کی آمدنی مل کر اسّی روپے ہو جائے گی۔ جبھی زندگی کا کچھ لطف ملے گا۔ اس وقت تک ظاہر علی بھی ہاتھ پیر سنبھال لے گا۔ پھر تو چین ہی چین ہے۔ بس تین چار برس کی تکلیف اور ہے۔" بیوی سے اکثر جھگڑا ہو جاتا۔ وہ کہا کرتی۔ "یہ بھائی بند ایک بھی تمھارے کام نہ آئیں گے۔ جوں ہی وقت آیا پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ تم کھڑے تاکتے رہ جاؤ گے۔" طاہر علی ان باتوں پر بیوی سے روٹھ جاتے۔ اسے گھر میں آگ لگانے والی بس کی گانٹھ کہہ کر رلاتے۔

امیدوں اور فکروں سے اتنا دبا ہوا شخص مسز سیوک کی تلخ کلامی کا کیا جواب دیتا۔ آقا کے قہر نے خدا کے قہر کو مغلوب کردیا۔ دُکھ بھری آواز میں بولے۔ "حضور کا نمک خوار ہوں۔ آپ کا حکم میرے لیے خدا کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کتابوں میں آقا کو خوش رکھنے کا وہی ثواب لکھا ہے جو خدا کو خوش رکھنے کا ہے۔ حضور کی نمک حرامی کر کے خدا کو کیا منہ دکھلاؤں گا؟"

جان سیوک : ہاں۔ اب آپ آئے راہ راست پر۔ جائیے اپنا کام کیجیے۔ مذہب اور تجارت کو ایک ترازو میں تولنا ایک بیوقوفی ہے۔ مذہب مذہب ہے اور تجارت تجارت۔ ان میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے تجارت کی ضرورت ہے۔ مذہب کی نہیں۔ مذہب تو تجارت کا سنگار ہے۔ وہ دولت مندوں کے لیے ہی زیبا ہے۔ خدا آپ کو مقدرت دے۔ موقع ملے گھر میں فاضل روپے ہوں تو نماز پڑھیے، حج کیجیے، مسجد بنوایئے، کنواں کھدوایئے، جبھی مذہب ہے۔ خالی پیٹ خدا کا نام لینا گناہ ہے۔

طاہر علی نے جھک کر سلام کیا اور گھر واپس چلے گئے۔

(7)

شام ہو گئی تھی لیکن پھاگن شروع ہو جانے پر بھی سردی سے ہاتھ پاؤں اکڑتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن کی ہڈیوں میں چبھے جاتے تھے۔ جاڑا بارش کی مدد پا

کر پھر اپنی بکھری ہوئی طاقتوں کو مجتمع کر رہا تھا۔ اور دل سے کوشاں تھا کہ موجودہ موسم کو پلٹ دے۔ بادل بھی تھے۔ بوندیں بھی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا بھی تھی۔ کہرا بھی تھا۔ ان مختلف طاقتوں کے مقابلہ میں موسم بہار کی ایک نہ چلتی تھی۔ لوگ لحاف میں اس قدر منہ چھپائے ہوئے تھے۔ جیسے چوہے بلوں میں سے جھانکتے ہوں۔ دکان دار انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔ پیسوں کے سودے نہیں۔ مروت کے سودے بیچتے تھے راہ چلتے لوگ الاؤ پریوں گرتے تھے۔ جیسے شمع پر پروانے۔ بڑے گھروں کی عورتیں مناتی تھیں۔ مصرافی نہ آئے۔ تو آج کھانا پکائیں۔ چولھے کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملے۔ چائے کی دکانوں پر جمگھٹ رہتا تھا۔ ٹھاکردین کے پان چھبڑی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ پر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کو پھیرے۔ سورداس اپنی جگہ پر تو آ بیٹھا تھا پر ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے جلا لی تھیں۔ اور ہاتھ سینک رہا تھا۔ سواریاں آج کہاں؟ ہاں کوئی اِکّا دکّا مسافر نکل جاتا تھا تو بیٹھے بیٹھے اس کا کلیان منا لیتا تھا۔ جب سے سید طاہر علی نے اسے دھمکیاں دی تھیں۔ زمین کے نکل جانے کا خوف اس پر سوار رہتا تھا۔ سوچتا۔ "کیا اسی دن کے لیے میں نے اس زمین کی اتنی حفاظت کی تھی۔ میرے دن سدا ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔ کبھی تو کچھی خوش ہوں گی۔ اندھوں کی آنکھیں نہ کھلیں مگر نصیب تو کھل سکتے ہیں۔ کون جانے۔ کوئی دانی داتا مل جائے یا میرے ہی پاس دھیرے دھیرے کچھ روپے اکٹھے ہو جائیں۔ بنتے دیر نہیں لگتی۔ یہی خواہش تھی کہ یہاں ایک کنواں اور چھوٹا سا مندر بنوا دیتا تو مرنے کے پیچھے اپنی کچھ نشانی رہتی۔ نہیں تو کون جانے گا کہ اندھا کون تھا؟ پسنہاری نے کنواں کھدوایا تھا آج تک اس کا نام چلا آتا ہے۔ جھکڑ سائیں نے باؤلی بنوائی تھی آج تک جھکڑ کی باؤلی مشہور ہے۔ زمین نکل گئی تو نام ڈوب جائے گا۔ کچھ روپے ملے بھی تو کس کام کے؟ نایک رام اسے دھارس دیتا تھا۔ "تم کچھ مت کرو۔ کون مائی کا لال ہے جو میرے رہتے تمھاری زمین نکال لے؟ لہو کی ندی بہا دوں گا۔ اس کرنٹے کی کیا مجال؟ گودام میں آگ لگا دوں گا۔ ادھر کا راستہ چھڑا دوں گا۔ وہ ہے کس گمان میں۔ بس تم حامی نہ بھرنا۔" مگر ان الفاظ سے جو تشفی ہوتی تھی وہ بھیرو اور جگدھر کی حاسدانہ بحث سے مٹ جاتی تھی اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جاتا تھا۔

وہ انھیں خیالات میں محو تھا کہ نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے اور ایک انگوچھا کندھے پر ڈالے پان کے بیڑے منہ میں بھرے وہاں آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "سورداس! بیٹھے تاپتے ہی رہو گے۔ سانجھ ہوگئی۔ ہوا کھانے والے اب اس ٹھنڈ میں نہ نکلیں گے۔ کھانے بھر کو مل گیا کہ نہیں؟"

سورداس : کہاں مہاراج۔ آج تو ایک بھاگوان سے بھی بھینٹ نہ ہوئی۔

نایک رام : جو بھاگ میں تھا مل گیا۔ چلو گھر چلیں۔ بہت ٹھنڈ لگتی ہو تو میرا یہ انگوچھا کندھے پر ڈال لو۔ میں تو ادھر آیا تھا کہ کہیں صاحب مل جائیں تو دو دو باتیں کر لوں۔ پھر ایک بار ان کی اور ہماری بھی ہوجائے۔

سورداس جانے کو اٹھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک گاڑی کی آہٹ سنائی دی رک گیا۔ آس بندھی۔ ایک لمحہ میں فٹن آ پہنچی۔ سورداس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "داتا بھگوان تمھارا کلیان کریں اندھے کی کھبر (خبر) لیجیے۔"

فٹن رک گئی اور چتاری کے راجہ صاحب اتر پڑے۔ نایک رام ان کا پنڈا تھا سال میں دو چار سو روپے ان کی ریاست سے پاتا تھا۔ ان کو آشیر واد دے کر بولا۔ "سرکار کا ادھر کیسے آنا ہوا؟ آج تو بڑی ٹھنڈ ہے۔"

راجہ صاحب : یہی سورداس ہے جس کی زمین آگے پڑتی ہے؟ آؤ تم دونوں آدمی میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا اس زمین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

نایک رام : سرکار چلیں۔ ہم دونوں پیچھے پیچھے آتے ہیں۔

راجہ صاحب : اجی آکر بیٹھ جاؤ۔ تمھیں آنے میں دیر ہوگی اور میں نے ابھی سندھیا نہیں کی ہے۔

سورداس : پنڈا جی! تم بیٹھ جاؤ میں دوڑتا ہوا چلوں گا۔ گاڑی کے ساتھ ہی ساتھ پہنچوں گا۔

راجہ صاحب : نہیں نہیں۔ تمھارے بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے تم اس وقت بھکاری سورداس نہیں۔ زمیندار سورداس ہو۔

نایک رام : بیٹھو سور بیٹھو۔ ہمارے سرکار ساکشات دیوتا سروپ ہیں۔

سورداس : پنڈا جی! میں....

راجہ صاحب : پنڈا جی! تم ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا دو۔ یوں نہ بیٹھیں گے۔

نایک رام نے سورداس کو گود میں اٹھا کر گدی پر بٹھا دیا۔ آپ بھی بیٹھے اور فٹن روانہ ہوئی۔ سورداس کو اپنی زندگی میں فٹن میں سوار ہونے کا یہ پہلا ہی موقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اڑا جا رہا ہوں۔ تین چار منٹ میں جب گودام پر گاڑی رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے تو سورداس کو تعجب ہوا کہ اتنی جلد کیوں کر آگئے۔

راجہ صاحب : زمین تو بڑے موقع کی ہے۔

سورداس : سرکار! باپ دادا کی نسانی ہے۔

سورداس کے دل میں طرح طرح کی بد گمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ "کیا صاحب نے ان کو یہ زمین دیکھنے کے لیے بھیجا ہے؟ سنا ہے یہ بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔ تو انھوں نے صاحب کو سمجھا کیوں نہ دیا؟ بڑے آدمی سب ایک سے ہوتے ہیں۔ چاہے ہندو ہو یا مسلمان۔ تبھی تو میرا اتنا آدر کر رہے ہیں جیسے بکرے کی گردن کاٹنے سے پہلے اسے پیٹ بھر دانہ کھلا دیتے ہیں۔ لیکن میں ان کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

راجہ صاحب : اسامیوں کے ساتھ بندو بست ہے؟

نایک رام : نہیں سرکار۔ ایسی ہی پرتی پڑی رہتی ہے۔ سارے محلہ کی گائیں یہیں چرنے آتی ہیں۔ اٹھا دی جائے تو دو سو سے کم نفع نہ ہو پر یہ کہتا ہے۔ اب بھگوان مجھے یوں ہی کھانے بھر کو دے دیتے ہیں، تو اسے کیوں اٹھاؤں؟

راجہ صاحب : اچھا تو سورداس دان لیتا ہی نہیں دیتا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے درشن ہی سے پن ہوتا ہے۔

نایک رام کی نگاہ میں سورداس کی اتنی عزت کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے۔ "حضور اس جنم کا کوئی بڑا بھاری مہاتما ہے۔"

راجہ صاحب : اُس جنم کا نہیں اِس جنم کا مہاتما ہے۔

سچا سخی شہرت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ سورداس کو اپنی قربانی اور سخاوت کی اہمیت کا علم ہی نہ تھا۔ شاید ہوتا تو مزاج میں اتنی سادگی اور عاجزی نہ رہتی بلکہ اپنی تعریف کانوں کو اچھی لگتی۔ مہذب نگاہوں میں سخاوت کا یہی بہترین انعام ہے۔

سورداس کا دان زمین یا آسمان کا دان تھا۔ جسے تعریف یا شہرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اس کو راجہ صاحب کی فیاضی میں فریب کا شائبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا کہ راجہ صاحب کا ان باتوں سے مطلب کیا ہے؟

نایک رام راجہ صاحب کو خوش کرنے کے لیے سورداس کی تعریف کرنے لگے۔ ''دھرم اوتار! اتنے پر بھی انھیں چین نہیں ہے۔ یہاں دھرم شالہ مندر اور کنواں بنوانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

راجہ صاحب : واہ پھر تو بات ہی بن گئی۔ کیوں سورداس! تم اس زمین سے نو بیگھے مسٹر جان سیوک کو دے دو ان سے جو روپے ملیں انھیں دھرم کاج میں لگا دو۔ اس طرح تمھاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اور صاحب کا کام بھی نکل جائے گا۔ دوسروں سے اتنے اچھے دام نہ ملیں گے۔ بولو کتنے روپے دلادوں۔

نایک رام سورداس کو خاموش دیکھ ڈر گئے کہ کہیں یہ انکار کر بیٹھا تو میری بات گئی۔ بولے۔ ''سورداس! ہمارے مالک کو جانتے ہو؟'' چتاری کے مہاراجہ ہیں۔ اسی دربار سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔ میونسپلٹی کے سب سے بڑے حاکم ہیں۔ آپ کے حکم بنا کوئی اپنے دروازے پر کھونٹا بھی نہیں گاڑ سکتا۔ چاہیں تو سب یکہ بانوں کو پکڑ وا لیں۔ سارے شہر کا پانی بند کرا دیں۔

سورداس : جب آپ کا اتنا بڑا اختیار ہے تو صاحب کو کوئی دوسری زمین کیوں نہیں دلا دیتے؟

راجہ صاحب : ایسے اچھے موقع پر شہر میں دوسری زمین ملنی مشکل ہے۔ لیکن تمھیں اس کے دینے میں کیا قباحت ہے۔ اس طرح تو نہ جانے کتنے دنوں میں تمھاری آرزوئیں پوری ہوں گی۔ یہ تو بہت اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ روپے لے کر دھرم کاج میں لگا دو۔

سورداس : مہاراج۔ میں خوشی سے اپنی زمین نہ بیچوں گا۔

نایک رام : سورداس! کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟ کچھ خیال ہے کس سے باتیں کر رہے ہو۔

سورداس : پنڈاجی! سب خیال ہے۔ آنکھیں نہیں ہیں تو کیا بدھی (عقل) بھی نہیں

ہے؟ پر جب میری چیز ہے ہی نہیں تو میں اس کا بیچنے والا کون ہوں ؟

راجہ صاحب : یہ زمین تو تمھاری ہی ہے؟

سورداس : نہیں سرکار! میری نہیں۔ میرے باپ دادا کی ہے۔ میری چیز وہی ہے جو میں نے اپنے بانہہ بل (ہاتھوں کی مشقت) سے پیدا کی ہو۔ یہ زمین مجھے دھروہر (امانت) ملی ہے۔ میں اس کا مالک نہیں ہوں۔

راجہ صاحب : سورداس! تمھاری یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اگر اور زمینداروں کے دل میں ایسے ہی خیالات ہوتے تو آج سینکڑوں گھر اس طرح تباہ نہ ہوتے۔ صرف عیش و عشرت کے لیے لوگ بڑی بڑی ریاستیں برباد کر دیتے ہیں۔ پنڈا.جی! میں نے کونسل میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ زمینداروں کو اپنی جائداد بیچنے کا اختیار نہیں ہے۔ لیکن جو جائداد دھرم کاج کے لیے بیچی جائے اس کو میں بیچنا نہیں کہتا۔

سورداس : دھرما وتار! میرا تو اس زمین کے ساتھ اتنا ہی ناتا ہے کہ جب تک جیوں اس کی حفاظت کروں اور مروں تو اسے جیوں کا توں چھوڑ جاؤں۔

راجہ صاحب : لیکن یہ تو سوچو کہ تم اپنی زمین کا ایک حصہ صرف اس لیے دوسرے کو دے رہے ہو کہ مندر وغیرہ بنوانے کے لیے روپے مل جائیں۔

نایک رام : بولو۔ سورداس مہاراج کی اس بات کا کیا جواب.دیتے ہو؟

سوراداس : میں سرکار کی باتوں کا جواب دینے جوگ(لائق) ہوں کہ جواب دوں۔ مگر اتنا تو سرکار جانتے ہی ہیں کہ لوگ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑ لیتے ہیں۔ صاحب پہلے تو نہ بولیں گے۔ پھر دھیرے دھیرے احاطہ بنا لیں گے۔ کوئی مندر میں جانے نہ پائے گا۔ ان سے کون روز روز لڑائی کرے گا؟

نایک رام : مہاراج! سورداس نے یہ بات پکی کہی۔ بڑے آدمیوں سے کون لڑتا پھرے گا۔

راجہ صاحب : صاحب کیا کریں گے؟ کیا تمھارا مندر کھود کر پھینک دیں گے؟

نایک رام : بولو سورداس اب کیا کہتے ہو؟

سورداس : سرکار! غریب کی گھر والی گاؤں کی بھاوج ہوتی ہے۔ صاحب کرستان ہیں۔ دھرم شالا میں تمباکو کا گودام بنائیں گے۔ مندر میں ان کے مجور (مزدور) سوئیں گے۔

کنوئیں پر ان کے مجوروں کا اڈا ہوگا۔ بہو بیٹیاں پانی بھرنے نہ جا سکیں گی۔ صاحب نہ کریں گے تو صاحب کے لڑکے کریں گے۔ میرے باپ دادوں کا نام ڈوب جائے گا۔ نا سرکار! مجھے اس دلدل میں نہ پھنسایئے۔

نایک رام : دھرما وُتار! سورداس کی بات میرے من میں بھی بیٹھتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں مندر، دھرم شالا، کنواں سب صاحب کا ہو جائے گا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

راجہ صاحب : اچھا۔ یہ بھی مانا۔ لیکن ذرا یہ بھی سوچو کہ اس کارخانہ سے لوگوں کا کیا فائدہ ہوگا۔ہزاروں مزدور، مستری، بابو، منشی، لوہار، بڑھئی، آکر آباد ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بستی ہو جائے گی۔ بنیوں کی نئی نئی دکانیں کھل جائیں گی۔ آس پاس کے کسانوں کو اپنی ساگ بھاجی لے کر شہر نہ جانا پڑے گا۔ یہیں کھرے دام مل جائیں گے۔ کنجڑے، گوالے، دھوبی، درزی سبھی کو فائدہ ہوگا۔ کیا اس کا ثواب تم کو نہ ہوگا؟

نایک رام : اب بولو۔ سورداس! اب تو کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے سرکار کی بھل مانسی ہے۔ تم سے اتنی دلیلیں کر رہے ہیں۔ دوسرا حاکم ہوتا تو ایک حکم نامہ میں ساری زمین تمھارے ہاتھ سے نکل جاتی۔

سورداس : اس لیے تو لوگ چاہتے ہیں کہ حاکم دھرماتما ہوں۔ نہیں تو کیا دیکھتے نہیں ہیں کہ حاکم لوگ بناڈیم۔ فول۔ سور کے بات نہیں کرتے۔ ان کے سامنے کھڑے نہ ہونے کا تو ہیاؤ ہی نہیں ہوتا۔ باتیں کون کرتا؟ اسی لیے تو مناتے ہیں کہ ہمارے راجوں مہاراجوں کا راج ہوتا جو ہمارا دکھ درد سنتے۔ سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلّہ کی رونق ضرور بڑھے گی روز گاری لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا۔ لیکن جہاں یہ رونق ہوگی وہاں تاڑی شراب کا بھی تو پرچار بڑھ جائے گا۔ کسبیاں بھی تو آکر بس جائیں گی۔ پردیسی آدمی ہماری بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادھرم ہوگا؟ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کے لالچ میں دوڑیں گے۔ یہاں بری بری باتیں سیکھیں گے اور اپنے برے آچرن (چال چلن) اپنے گاؤں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتوں کی بیٹیاں بہوئیں مجوری کرنے آئیں گی اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔جو رونق شہروں میں ہے۔ وہی رونق یہاں ہوجائے گی۔ بھگوان نہ کریں یہاں وہ بات ہو۔ سرکار مجھے

اس کو کرم اور ادھرم سے بچائیں یہ سارا پاپ میرے سر پڑے گا۔
نایک رام : دین بندھو! سورداس بہت پکی بات کہتا ہے۔ کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، کانپور آپ کے اکبال (اقبال) سے سبھی جگہ گھوم آیا ہوں۔ جَجمان لوگ بلاتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں کل کارخانے ہیں وہاں وہاں یہی حال دیکھا ہے۔
راجہ صاحب : کیا یہ برائیاں تیرتھ کے مقاموں میں نہیں ہیں؟
سورداس : سرکار! ان کا سدھار بھی تو بڑے آدمیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں بری باتیں پہلے ہی سے ہیں۔ وہاں سے ہٹانے کے بدلے انھیں اور پھیلانا تو مناسب نہیں۔
راجہ صاحب : ٹھیک کہتے ہو۔ سورداس۔ بہت ٹھیک کہتے ہو۔ تم جیتے۔ میں ہار گیا۔ تمھاری باتوں سے طبیعت خوش ہوگئی۔ کبھی شہر آنا تو میرے یہاں ضرور آنا۔ جس وقت میں نے صاحب سے اس زمین کے طے کرا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ باتیں میرے دھیان میں نہ آئی تھیں۔ اب تم خاطر جمع رکھو۔ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ سورداس زمین نہیں دیتا۔ نایک رام! دیکھو۔ سورداس کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ لو سورداس! یہ تمھارے اتنی دور آنے کی مزدوری ہے۔
یہ کہہ کر انھوں نے ایک روپیہ سورداس کے ہاتھ میں رکھا اور چل دیے۔ نایک رام نے کہا۔ ”سورداس اب راجہ صاحب بھی تمھاری کھوپڑی کو مان گئے۔“

(8)

صوفیا کو اندو کے ساتھ رہتے چار مہینے گزر گئے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد آتے ہی اس کے دل میں ایک آگ سی جل اٹھتی تھی۔ پربھوسیوک روزانہ ایک بار اس سے ملنے آیا کرتا پر کبھی اس سے گھر کے حالات نہ پوچھتی۔ وہ ہوا کھانے بھی نہ جاتی کہ کہیں ماما سے سامنا نہ ہو جائے۔ اگر چہ اندو نے اس کے ذاتی حالات کو سب سے مخفی رکھا تھا۔ لیکن قیاس سے سبھی اس کے واقعی حالات سے واقف ہوگئے تھے۔ اس لیے ہر شخص کو یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو اس کو ناگوار ہو۔ اندو کو تو اسے سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ زیادہ تر اسی کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس

کی صحبت سے اندو کو بھی مذہب اور فلسفہ کی کتابوں سے رغبت ہونے لگی تھی۔

گھر ٹپکتا ہو تو اس کی مرمت کی جاتی ہے۔ گرجائے تو اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ صوفی کو جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ میری ساری باتیں جان گئے تو اس نے پردہ رکھنے کا خیال ترک کردیا۔ مذہبی کتب کے مطابعہ میں، مصروف ہوگئی۔ پرانی کدورتیں دل سے مٹنے لگیں۔ ماں کی دل خراش باتوں کا زخم مندمل ہونے لگا۔ وہ تنگ خیالی جو ذاتی جذبات اور خیالات کو نا مناسب اہمیت دے دیتی ہے۔ اس اطاعت اور اخلاق کے دائرہ میں آکر ہیچ معلوم ہونے لگی۔ دل نے کہا یہ ماما کا قصور نہیں بلکہ ان کی مذہبی تنگ خیالی کا قصور ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ محدود ہے۔ ان میں آزاد خیالی کا احترام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ان سے میں ناحق ناراض ہو رہی ہوں۔ یہی ایک کانٹا تھا جو اس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ جب وہ نکل گیا تو دل کو سکون ہوگیا۔ اس کا وقت مذہبی اصولوں کی تحقیقات میں گزرنے لگا۔ انہماک، دردِ دل کا بہترین علاج ہے۔

لیکن اس مطالعہ اور تحقیقات سے اس کے دل کو قرار آجاتا ہو، یہ بات نہ تھی۔ طرح طرح کے شکوک ہر روز پیدا ہوتے رہتے تھے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر مذہب میں اس کا جدا جدا جواب ملتا تھا۔ لیکن ایک بھی ایسا نہیں ملا جس کو دل قبول کرے۔ معجزات کیا ہیں؟ کیا صرف عقیدت مندوں کی فرضی باتیں ہیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ عبادت کا مقصد کیا ہے؟ خدا کیوں انسانوں سے اپنی عبادت کرنے کے لیے کہتا ہے؟ اس سے اس کی منشا کیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی خلقت سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے؟ وہ ان سوالوں پر غور کرنے میں اتنی محو رہتی کہ کئی کئی روز کمرہ کے باہر نہ نکلتی۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اندو کا آنا اسے برا معلوم ہوتا۔

ایک روز صبح کے وقت وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اندو آکر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ صوفیہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئی۔ حسب سابق مطالعہ میں مصروف رہی۔ اندو بولی۔ ”صوفی! اب یہاں دو چار دن کی اور مہمان ہوں مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟“

صوفی نے سر اٹھائے بغیر ہی کہا ”ہاں؟“

اندو : تمھارا دل تو اپنی کتابوں میں بہل جائے گا۔ میری یاد بھی نہ آئے گی پر مجھ سے تمھارے بغیر ایک دن بھی نہ رہا جائے گا۔

صوفی نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " ہاں،،

اندو : پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ سارا دن تنہا پڑے پڑے سوچا کروں گی۔ صوفی نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"

اب اندو صوفیہ کی اس سرد مہری کو برداشت نہ کر سکی۔ کسی دوسرے وقت وہ ناراض ہوکر چلی جاتی یا اس کو مطالعہ میں محو دیکھ کر کمرہ میں قدم ہی نہ رکھتی۔ لیکن اس وقت اس کا ملائم دل جدائی کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں روٹھنے کے خیال کی گنجایش نہ تھی۔ رو کر بولی۔ "بہن! ایشور کے لیے ذرا کتاب بند کردو۔ میں چلی جاؤں گی تو پھر خوب پڑھ لینا۔ وہاں سے تمھیں چھیڑنے نہ آؤں گی۔"

صوفی نے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا مراقبہ سے بیدار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ چہرہ اداس تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بولی۔ "ارے اندو! بات کیا ہے؟" روتی کیوں ہو ؟"

اندو : تم اپنی کتاب پڑھو۔ تمھیں کسی کے رونے دھونے کی کیا پرواہ ہے؟ ایشور نے نہ جانے کیوں تمھارے جیسا دل مجھ کو نہیں دیا۔

صوفیہ : بہن! معاف کرنا! اس ایک بڑی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ ابھی تک وہ گتھی نہیں سلجھی۔ میں بت پرستی کو بالکل لغو خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی کہ رشیوں نے صرف جہلاء کی روحانی تسکین کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے۔ لیکن اس کتاب میں بت پرستی کا جواز ایسے عالمانہ دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آج میں مورتی پوجا کی قائل ہوگئی۔ مصنف نے اس کو سائنٹیفک طریقہ پر ثابت کیا ہے۔ یہاں تک کہ مورتوں کی بناوٹ اور دکھاوٹ کو بھی انھیں طریقوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔

اندو : میرے لیے بلاوا آگیا۔ آج کے تیسرے دن چلی جاؤں گی۔

صوفیہ : یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔ پھر میں یہاں کیسے رہوں گی؟

اس جملہ میں ہمدردی نہیں بلکہ خود غرضی تھی۔ لیکن اندو نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ صوفی کے لیے میری جدائی ناقابل برداشت ہوگی۔ بولی۔ "تمھارا جی تو کتابوں

میں بہل جائے گا۔ میں البتہ تمھاری یاد میں تڑپا کروں گی۔ سچ جانوں تمھاری صورت ایک لمحہ کے لیے بھی خیال سے نہ ہٹے گی۔ یہ موہنی مورت آنکھوں کے سامنے پھرا کرے گی۔ بہن! اگر تمھیں برا نہ لگے تو ایک استدعاء کروں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم بھی کچھ دن میرے ساتھ رہو ؟ تمھاری صحبت سے میری زندگی بھی سدھر جائے گی۔ میں اس کے لیے ہمیشہ تمھاری ممنون رہوں گی۔"

صوفیہ : تمھاری محبت کی اسیر ہوں۔ جہاں چاہو لے چلو۔ چاہوں تو جاؤں گی۔ نہ چاہوں تو جاؤں گی۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے راجہ صاحب سے بھی پوچھ لیا ہے۔"

اندو : یہ ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے ان کی صلاح لینی پڑے۔ مجھ سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ تمارے لیے ایک لیڈی کی ضرورت ہے۔ اکیلے تمھارا جی گھبراتا ہوگا۔ یہ تجویز سن کر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔

رانی جانھوی تو اندو کے رخصت کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اندو صوفیہ کے لیے لیس اور کپڑے لا لا کر رکھتی تھی۔ انواع و اقسام کی پوششوں سے کئی صندوق بھر دیے۔ وہ اسے ایسے ٹھاٹھ سے لے جانا چاہتی تھی کہ گھر کی لونڈیاں باندیاں اس کا مناسب احترام کریں۔ پر بھوسیوک کو صوفیہ کا اندو کے ساتھ جانا اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کو اب بھی امید تھی کہ ماما کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور وہ صوفی کو گلے لگائیں گی۔ صوفی کے چلے جانے سے مغائرت کا بڑھنا یقینی امر تھا۔ اس نے صوفیہ کو سمجھایا لیکن وہ اندو کی تجویز کو نا منظور نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب گھر نہ جاؤں گی۔

تیسرے روز راجہ مہیندر کمار اندو کو رخصت کرانے آئے۔ تو اندو نے اور باتوں کے ساتھ صوفی کو ساتھ چلنے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بولی۔ "میرا جی وہاں اکیلے گھبرایا کرتا ہے۔ مس صوفیہ کے رہنے سے میرا جی بہل جائے گا۔"

مہیندر : کیا مس سیوک ابھی تک یہیں ہیں؟

اندو : بات یہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں آزاد خیالی چاہتی ہیں اور ان کے گھر والے اس آزاد خیالی کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں۔

مہیندر : لیکن یہ تو سوچو کہ ان کے میرے یہاں رہنے سے میری کتنی بدنامی ہوگی۔ مسٹر سیوک کو یہ بات بری لگے گی اور یہ بالکل غیر مناسب ہے کہ میں ان کی لڑکی کو ان کی مرضی کے بغیر اپنے گھر میں رکھوں۔ اس میں سراسر بدنامی ہوگی۔

اندو : مجھے تو اس میں بدنامی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ کیا سہیلی اپنی سہیلی کے یہاں مہمان نہیں ہوتی ؟ صوفی کا مزاج بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ ادھر ادھر گھومنے لگے گی۔

مہیندر : وہ دیوی سہی۔ لیکن ایسے کتنے ہی وجوہ ہیں کہ میں ان کا تمھارے ساتھ جانا نامناسب سمجھتا ہوں۔ تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ تم کسی کام کو کرنے سے پہلے اس پر غور کر لینا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔ کیا تمھاری رائے میں خاندانی رواج کی مخالفت کرنے میں کوئی برائی نہیں؟ ان کے گھر والے یہی تو چاہتے ہیں کہ وہ ظاہرا طریقہ پر اپنے مذہبی احکام کی پابندی کریں۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتیں تو میں یہی کہوں گا کہ ان کی آزاد خیالی موزونیت کی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گئی ہے۔

اندو : لیکن میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میں کئی دنوں سے انھیں تیاریوں میں مصروف ہوں۔ یہاں اماں جی سے اجازت لے چکی ہوں۔ گھر کے سبھی لوگ نوکر چاکر جانتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں ان کو نہ لے گئی تو لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ سوچیے اس میں میری کتنی رسوائی ہوگی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔

مہیندر : بدنامی سے بچنے کے لیے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمھیں مس سیوک سے کہتے شرم آتی ہو تو میں کہہ دوں۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں کہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھیں۔

اندو : مجھے ان کے ساتھ رہتے رہتے ان سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ اب ان سے ایک دن بھی علیحدہ رہنا مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تو خیر پرواہ نہیں۔ جانتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی ان سے جدائی ہوگی ہی۔ اس وقت سب سے زیادہ فکر مجھے اپنی سبکی کی ہے۔ لوگ کہیں گے۔ بات کہہ کر پلٹ گئی۔ صوفی نے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرے بہت کہنے سننے پر راضی ہوئی ہے۔ آپ میری خاطر سے اب کے

میری یہ استدعا قبول کیجیے۔ پھر میں آپ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کروں گی۔

مہیندر کمار کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اندو روئی۔ اس نے منت سماجت کی۔ وہ پیروں پڑی۔ اس نے وہ سبھی منتر پھونکے جو کبھی بے اثر نہیں ہوتے لیکن شوہر کا پتھر دل نہ پسیجا۔ ان کو اپنا نام دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھا۔

جب مہیندر کمار باہر چلے گئے تو اندو بہت دیر تک حالت غم میں بیٹھی رہی بار بار یہی خیال آتا۔ ''صوفی اپنے دل میں کیا کہے گی؟ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ میرے سوامی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب وہ سمجھے گی کہ وہ اس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ بات بھی ایسی ہی ہے۔ انھیں میری کیا پرواہ ہے؟ باتیں ایسی کریں گے گویا ان سے زیادہ فیاض طبع دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے۔ پر وہ سب کوری بکواس ہے۔ انھیں تو یہی منظور ہے کہ یہ دن بھر تنہا بیٹھی اپنے نام کو رویا کرے۔ دل میں جلتے ہوں گے کہ صوفی کے ساتھ اس کے دن بھی آرام سے کٹیں گے۔ مجھے قیدیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں ضد کرنا آتا ہے تو میں کیا ضد نہیں کر سکتی؟ میں بھی کہے دیتی ہوں آپ صوفی کو نہ چلنے دیں گے تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں! کچھ نہیں۔ دل میں ڈرتے ہیں کہ صوفی کے جانے سے گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ خسیس تو ہیں ہی۔ اس خباست کو چھپانے کے لیے بدنامی کا بہانہ نکالا ہے۔'' دل غمگین ہو کر دوسروں کی نیک نیتی پر شک کرنے لگتا ہے۔

شام کے وقت جانھوی سیر کرنے چلی۔ تو اندو نے اس سے یہ باتیں کہیں اور اصرار کیا کہ تم مہیندر کو سمجھا کر صوفی کو لے جانے پر راضی کردو۔ جانھوی نے کہا۔ ''تمھیں کیوں نہیں مان جاتیں۔''

اندو : اماں میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔ میں ضد نہیں کرتی۔ اگر میں نے پہلے ہی صوفیہ سے نہ کہہ دیا ہوتا تو مجھے ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ پر ساری تیاریاں کر کے اب اس کو نہ لے جاؤں تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گی؟ میں اس کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ یہ اتنی چھوٹی سی بات ہے کہ اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ ایسی حالت میں آپ کیوں کر امید کر سکتی ہیں کہ میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں؟

جانھوی : وہ تمھارے سوامی ہیں۔ ان کی سبھی باتیں تمھیں ماننی پڑیں گی۔

اندو: خواہ وہ میری ذرا ذرا سی بات بھی نہ مانیں؟

جانہوی: ہاں انھیں اس کا اختیار ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میری نصیحتوں کا تمھارے اوپر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ میں تم کو شوہر پرست ستی دیکھنا چاہتی ہوں جسے اپنے شوہر کے حکم یا مرضی کے سامنے اپنی عزت یا ذلت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ اگر وہ تمھیں سر کے بل چلنے کو کہیں تو بھی تمھارا فرض ہے کہ سر کے بل چلو۔ تم اتنے ہی میں گھبرا گئیں۔

اندو: آپ مجھ سے وہ کرنے کے لیے کہتی ہیں جو میرے لیے ناممکن ہے۔

جانہوی: چپ رہو۔ میں تمھارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں صوفی کی آزاد خیالی کا جادو تمھارے اوپر بھی تو نہیں چل گیا؟

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ خوف تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل پڑے۔ جس کا اماں کے دل میں یہ شک اور بھی جگہ پکڑ لے تو بیچاری صوفی کا یہاں رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ وہ راستہ بھر یک دم خاموش بیٹھی رہی۔ جب گاڑی پھر مکان پر پہنچی اور وہ اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو جانہوی نے کہا۔ ''بیٹی! تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں۔ مہیندر سے اس بارہ میں اب ایک لفظ بھی نہ کہنا، نہیں تو مجھے بہت رنج ہوگا۔''

اندو نے ماں کو کچھ اس انداز سے دیکھا جس سے اس کی خستہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ خوش قسمتی سے مہیندر کمار کھانا کھا کر سیدھے باہر چلے گئے ورنہ اندو کے لیے اپنے خیالات کا روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر اس امر کی تحریک ہوتی تھی کہ چل کر صوفیہ سے معافی مانگوں۔ صاف صاف کہہ دوں۔ ''بہن میرا کچھ بس نہیں ہے۔ میں کہنے کو رانی ہوں مگر دراصل مجھے اس قدر آزادی بھی نصیب نہیں جس قدر کہ میرے گھر کی مہریوں کو ہے۔'' لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ شوہر کی غیبت کرنا میرے مذہبی فرض کے خلاف ہے۔ میں صوفی کی نگاہوں میں گر جاؤں گی وہ سمجھے گی اس میں ذرا بھی خودداری نہیں ہے۔

نو بجے ونے سنگھ اس سے ملنے آئے۔ وہ دماغی ہیجان کی حالت میں بیٹھی ہوئی اپنے صندوق میں سے صوفی کے لیے خریدے ہوئے کپڑے نکال رہی تھی اور سوچ

رہی تھی کہ انھیں اس کے پاس کیسے بھیجوں۔ خود جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ونے سنگھ کو دیکھ کر بولی۔ ”کیوں ونے! اگر تمھاری استری اپنی کسی سہیلی کو چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو تم اسے منع کردو گے یا خوش ہوگے؟“

ونے : میرے سامنے یہ سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔ اس لیے میں اس خیال سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

اندو : یہ سوال تو پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔

ونے : بہن! مجھے تمھاری باتوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اندو : اس لیے کہ تم اپنے کو دھوکا دے رہے ہو لیکن در اصل تم اس سے بہت گہرے پانی میں ہو جتنا تم سمجھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارا کئی کئی روز تک گھر میں نہ آنا۔ ہر وقت سیوا سمتی کے کاموں میں مشغول رہنا۔ مس صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا اس کے سایہ سے بھاگنا۔ اس ہل چل کو چھپا سکتا ہے جو تمھارے دل میں تیزی کے ساتھ مچی ہوئی ہے۔ لیکن یاد رکھنا کہ اس ہل چل کی آواز ذرا بھی نہ سنائی دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ صوفیہ تمھارا اس قدر احترام کرتی ہے جتنا کوئی ستی اپنے شوہر کا بھی نہ کرتی ہوگی۔ وہ تم پر عقیدت رکھتی ہے۔ تمھارے ضبط ایثار اور خدمت کے جذبات نے اس کو فریفتہ بنا دیا ہے۔ لیکن اگر میں ٹھیک سمجھتی ہوں تو اس کی عقیدت میں عشق کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ اگر چہ تمھیں صلاح دینا بے سود ہے۔ کیوں کہ تم اس راستہ کی مشکلات سے خوب واقف ہو۔ پھر بھی میں تم سے بالاصرار کہتی ہوں کہ تم کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے جاؤ۔ تب تک شاید صوفی بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گی۔ ممکن ہے اس وقت کی ہوشیاری سے دو جانداروں کا ستیا ناس ہونے سے بچ جائے۔

ونے : بہن! جب تم سب کچھ جانتی ہی ہو تو تم سے کیا چھپاؤں؟ اب میں ہوشیار نہیں بن سکتا۔ ان چار پانچ مہینوں میں میں نے جو روحانی تکلیف برداشت کی ہے۔ اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ میری عقل بگڑ گئی ہے۔ میں آنکھیں کھلی ہونے پر بھی گڈھے میں گر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کوئی رکاوٹ، کوئی دقت، کوئی خوف، اب مجھ کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ البتہ میں تمھیں اس کا یقین دلاتا ہوں

کہ اس آگ کی ایک چنگاری یا ایک لپٹ بھی صوفی تک نہ پہنچے گی۔ میرا سارا بدن جل جائے۔ ہڈیاں تک خاک ہو جائیں۔ لیکن صوفی کو اس شعلہ کی چمک نہ دکھائی دے گی۔ میں نے بھی یہی تہیہ کر لیا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اپنی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ صوفی کی حفاظت کے لیے۔ آہ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ صوفی نے مجھے اسی آگ میں جل جانے دیا ہوتا۔ میرا پردہ ڈھکا رہ جاتا۔ اگر والدہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ان کی کیا حالت ہو گی۔ اس کے تصور ہی سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بس اب میرے لیے منہ میں سیاہی لگا کر کہیں ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ ایک دم باہر چلے گئے۔ اندو بیٹھو بیٹھو کہتی ہی رہ گئی۔ وہ اس وقت جوش میں اس سے بہت زیادہ کہہ گئے تھے جتنا وہ کہنا چاہتے تھے۔ اور دیر تک بیٹھتے تو نہ جانے اور کیا کیا کہہ جاتے۔ اندو کی حالت اس جاندار کی سی تھی جس کے پیر بندھے ہوں اور سامنے اس کا گھر جل رہا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ یہ آگ سارے گھر کو جلا دے گی۔ ونے کے اونچے اونچے منصوبے ماں کی بڑی بڑی خواہشیں باپ کے بڑے بڑے حوصلے سب ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ وہ اسی قسم کے رنجیدہ خیالات میں پڑی ہوئی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اٹھی تو دروازہ پر اس کے لیے پالکی تیار کھڑی تھی۔ وہ ماں کے گلے سے لپیٹ کر روئی۔ باپ کے قدموں کو آنسوؤں سے دھویا اور گھر سے رخصت ہوئی۔ راستہ میں صوفی کا کمرہ پڑا تھا۔ اندو نے اس کمرے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صوفیہ اٹھ کر دروازہ پر آئی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس نے ہاتھ ملایا۔ اندو نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھ گئی۔

(9)

صوفیا اس وقت اس حالت میں تھی۔ جب ایک معمولی ہنسی کی بات ایک معمولی آنکھوں کا اشارہ کسی کا اس کو دیکھ کر مسکرا دینا۔ کسی مہری کا اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحہ توقف کرنا۔ ایسی ہزاروں باتیں جو روز ہی گھروں میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور جن کی کوئی پرواہ بھی نہیں کرتا اس کا دل دکھانے کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ چوٹ

کھایا ہوا عضو معمولی ٹھیس نہیں سہ سکتا۔ پھر اندو کا اسے کچھ کہے بغیر ہی چلا جانا کیوں نہ رنجیدہ ہوتا۔ اندو تو چلی گئی مگر وہ بہت دیر تک اپنے کمرہ کے دروازہ پر بت بنی کھڑی سوچتی رہی۔ ''یہ تحقیر کیوں؟ میں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے۔ جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے؟ اگر اس کو یہ منظور نہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جاتی تو صاف صاف کہہ دینے میں کیا ہرج تھا؟ میں نے اس کے ساتھ جانے کے لیے اصرار تو کیا نہ تھا! کیا میں اتنا نہیں جانتی کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ وہ رانی ہے۔ اس کی اتنی نوازش کیا کم تھی کہ وہ میرے ساتھ ہنس بول لیا کرتی تھی۔ میں اس کی سہیلی بننے لایق کب تھی؟ کیا مجھے اتنی سمجھ بھی نہ تھی؟ لیکن اس طرح آنکھیں پھیر لینا کون سی شرافت ہے؟ راجہ صاحب نے نہ مانا ہوگا۔ یہ صرف ایک بہانہ ہے۔ راجہ صاحب اتنی سی بات کو کبھی نا منظور نہیں کر سکتے۔ اندو نے خود ہی کچھ سوچا ہوگا۔ وہاں بڑے بڑے آدمی آئیں گے۔ ان سے اس کا تعارف کیوں کر کراؤں گی۔ شاید یہ خیال ہوا ہو کہ کہیں اس کے سامنے میرا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ بس یہی بات ہے۔ اگر میں جاہل اور صورت وسیرت سے بے بہرہ ہوتی تو وہ مجھے ضرور ساتھ لے جاتی میری بد رنگی سے اس کا رنگ اور چمک اٹھتا۔ میری بد نصیبی۔''

یہ ابھی دروازہ پر کھڑی ہی تھی کہ جانھوی بیٹی کو رخصت کر کے لوٹیں اور صوفی کے کمرہ میں آکر بولیں۔ ''بیٹی! میرا قصور معاف کرو۔ میں نے ہی تم کو روک لیا۔ اندو کو برا معلوم ہوا پر کروں کیا؟ وہ تو گئی ہی تم بھی چلی جاتیں تو میرا دن کیسے کٹتا؟ ونے بھی راجپوتانہ جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میری تو موت ہو جاتی۔ تمھارے رہنے سے میرا دل بہلتا رہے گا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی! تم نے میرے اوپر کوئی موہنی منتر پھونک دیا ہے۔''

صوفیہ : آپ کی شرافت ہے۔ جو ایسا کہتی ہیں۔ مجھے رنج یہی ہے کہ اندو نے جاتے وقت مجھ سے ہاتھ بھی نہ ملایا۔

جانھوی : ایسا اس نے کیا تو محض ندامت کی وجہ سے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ ایسی سیدھی سادی لڑکی دنیا میں نہ ہوگی۔ تجھے روک کر میں نے اس کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ میری بچی کا وہاں ذرا بھی جی نہیں لگتا مہینہ بھر رہ جاتی ہے تو صحت

بگڑ جاتی ہے۔ اتنی بڑی ریاست ہے۔مہیندر سارا بوجھ اسی کے سر ڈال دیتے ہیں۔ انھیں تو میونسپلٹی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ بیچاری آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتے لکھتے گھبرا جاتی ہے۔ پھر حساب کیسا؟ ایک ایک پیسہ کا۔ مہیندر کو حساب رکھنے کا خبط ہے۔ ذرا سا بھی فرق پڑا تو اس کے سر ہو جاتے ہیں تو اندو کو اختیار ہے۔ جتنا چاہے خرچ کرے مگر حساب ضرور رکھے۔ راجہ صاحب کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ کوئی نوکر ایک پیسہ بھی کھا جائے تو اس کو برطرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس نے ساری عمر ان کی خدمت کی ہو۔ یہاں میں اندو کو کبھی کڑی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتی چاہے وہ گھی کا گھڑا کیوں نہ لڑھکا دے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر راجہ صاحب کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ بچی سے بات نہیں برداشت ہو سکتی۔ جواب تو دیتی نہیں (اور یہی ہندو عورت کا دھرم ہے) پر رونے لگتی ہے۔ وہ دیا کی مورت ہے۔ کوئی اس کاسب کچھ کھا جائے۔ لیکن وہ جوں ہی اس کے سامنے آکر رویا کہ اس کا دل پگھل گیا۔ صوفی! مجھے بھگوان نے دو بچے دیئے اور دونوں ہی کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اندو جتنی نرم دل اور سادہ مزاج ہے، ونے اتنا ہی مستقل مزاج اور ہمتی ہے۔ تھکنا تو جانتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے ہی اس کا جنم ہوا ہے۔ گھرمیں کسی ٹہلنی کو بھی کوئی شکایت ہوئی اور وہ سب کام چھوڑ کر اس کی دوا دارو کرنے لگا۔ ایک بارمجھ کو بخار آنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے تین ماہ تک دروازہ کا منہ نہیں دیکھا۔ ہر وقت میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی پنکھا جھلتا، کبھی پاؤں سہلاتا، کبھی رامائن اور مہابھارت پڑھ کر سناتا۔ کتنا ہی کہتی بیٹا جاؤ گھومو پھرو۔ آخر یہ لونڈیاں باندیاں کس دن کام آئیں گی۔ ڈاکٹر روز آتے ہی ہیں۔ تم کیوں میرے ساتھ ستی ہوتے ہو۔ لیکن وہ کسی طرح بھی نہ جاتا۔ اب کچھ دنوں سے سیوا سمتی کا انتظام کر رہا ہے۔ کنور صاحب کو جو سیوا سمتی سے اتنی دل چسپی ہے وہ ونے ہی کی صحبت کی برکت ہے۔ورنہ آج سے تین سال پیشتر ان کا سا عیش پسند سارے شہر میں نہ تھا۔ دن میں دو بار حجامت بنتی تھی۔ درجنوں دھوبی اور درزی کپڑے دھونے اور سینے کے لیے نوکر تھے۔ پیرس سے ایک ہوشیار دھوبی کپڑے سنوار نے کے لیے آیا تھا۔ کشمیر اور اٹلی کے باورچی کھانا پکاتے تھے۔ تصویروں کا اتنا شوق تھا کہ کئی بار عمدہ تصاویر خریدنے کے

لیے اٹلی تک کا سفر کیا۔ تم ان دنوں مسوری میں تھیں۔ سیر کرنے نکلتے تو مسلح سواروں کی ایک جماعت ساتھ چلتی۔ شکار کھیلنے کی لت تھی۔ مہینوں شکار ہی کھیلتے رہتے۔ کبھی کشمیر کبھی بیکانیر کبھی نیپال۔ صرف شکار کھیلنے کی غرض سے جاتے۔ ونے نے ان کی کایا پلٹ کر دی۔ جنم کا بیراگی ہے۔ پہلے جنم میں ضرور کوئی رشی رہا ہوگا۔

صوفی : آپ کے دل میں خدمت اور اعتقاد کے ایسے بلند جذبات کس طرح پیدا ہوئے؟ یہاں تو عموماً رانیاں عیش پرستی ہی میں محو رہتی ہیں۔

جانہوی : بیٹی یہ ڈاکٹر گنگولی کی نصیحتوں کے سبب ہوا۔ جب اندو دو سال کی تھی۔ تب بیمار پڑی۔ ڈاکٹر گنگولی میرے معالجہ کی غرض سے آگئے۔ ضعف قلب کی شکایت تھی۔ طبیعت گھبرا یا کرتی۔ گویا کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مہا بھارت پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس میں میرا جی اس قدر لگا کہ کبھی کبھی آدھی رات تک بیٹھی پڑھا کرتی۔ تھک جاتی تو ڈاکٹر صاحب سے پڑھوا کر سنتی۔ پھر تو بہادری کی داستانوں کے پڑھنے کا مجھے ایسا چسکا لگا کہ راجپوتوں کی ایسی کوئی داستان نہیں جو میں نے نہ پڑھی ہو۔ اسی وقت سے میرے دل میں قومی محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ ایک نئی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے بطن سے بھی کوئی ایسا لڑکا جنم لیتا جو ابھمن۔ درگا داس اور پرتاپ کی طرح قوم کا سر اونچا کرتا۔ میں نے عہد کیا کہ لڑکا ہوا تو اس کو ملک و قوم کی فلاح کے لیے وقف کر دوں گی۔ میں ان دنوں تپسّیا کرتی تھی زمین پر سوتی۔ صرف ایک بار روکھا کھانا کھاتی۔ اپنے برتن تک اپنے ہاتھ سے دھوتی تھی۔ ایک وہ دیویاں تھیں جو قوم کی لاج رکھنے کے لیے جان تک دے دیتی تھیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں کہ دنیا و عاقبت کے سارے تفکرات سے کنارہ کرتے ہوئے صرف عیش و عشرت میں مبتلا ہوں۔ مجھے اس قومی زوال کو دیکھ کر عیش پسندی پر شرم آتی تھی۔ خیر ایشور نے میری سن لی۔ تیسرے سال ونے کا جنم ہوا۔ میں نے بچپن سے ہی اس کو سختیاں اٹھانے کا عادی بنانا شروع کیا۔ نہ کبھی گدّوں پر سلاتی۔ نہ کبھی مہریوں اور دائیوں کی گود میں جانے دیتی، نہ کبھی میوے کھانے کو دیتی۔ دس برس کی عمر تک صرف مذہبی داستانوں کے ذریعہ اس کو تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈاکٹر گنگولی کے سپرد کر دیا مجھے ان پر پورا اعتماد تھا اور مجھ کو فخر ہے کہ ونے کی تعلیم

و تربیت کا بار جس شخص پر رکھا وہ اس کام کے لیے ہر طرح اہل تھا۔ ونے روئے زمین کے بیشتر ملکوں کا سفر کر چکا ہے۔ سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ یورپ کی خاص خاص زبانوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ گانے میں اس کو اس قدر مشق ہے کہ اچھے اچھے استاد اس کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کمبل بچھا کر زمین پر سوتا ہے۔ اور کمبل ہی اوڑھتا ہے پیدل چلنے میں کئی بار انعام پا چکا ہے۔ ناشتہ کے لیے مٹھی بھر چنے۔ کھانے کے لیے روٹی اور ساگ بس ان کے سوا دنیا کے اور سارے کھانے اس کے لیے ممنوع ہیں۔ بیٹی! میں تجھ سے کہاں تک کہوں پورا تیاگی ہے۔ اس کے تیاگ کا سب سے عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ کو بھی تیاگی بننا پڑا۔ جوان بیٹے کے سامنے بوڑھا باپ نفس پرستی کا غلام بنا رہ سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ عیش و عشرت سے ان کا دل آسودہ ہو گیا اور یہ بہت اچھا ہوا۔ تیاگی لڑکے کا بھوگی باپ یہ واقعی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ وہ کھلے دل سے ونے کے نیک کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کی اس رغبت و مصروفیت کے بغیر ونے کو کبھی اس قدر کامیابی نہ حاصل ہوتی۔ سیوا سمتی میں اس وقت ایک سو نوجوان ہیں۔ جن میں کتنے ہی امیر گھرانوں کے ہیں۔ کنور صاحب کی تمنا ہے کہ سمتی کے ممبران کی پوری تعداد پانچ سو تک بڑھا دی جاوے۔ ڈاکٹر گنگولی اس پیرانہ سالی کے باوجود بھی بڑے حوصلہ اور خوشی کے ساتھ سمتی کا کام کرتے ہیں۔ وہی اس کے منتظم ہیں۔ جب کونسل کے کاموں سے فراغت ملتی ہے۔ تو ہر روز دو ڈھائی گھنٹے نوجوانوں کے سامنے جسمانی علم پر لکچر دیتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم پورے تین سالوں میں ختم ہوتی ہے۔ تب خدمتی کام شروع کیا جاتا ہے اب کے بیس نو جوان پاس ہوں گے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ دو سال تک ہندوستان کا سفر کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ لوٹا ڈور۔ دھوتی اور کمبل کے سوا اور کسی قسم کا رخت سفر نہ ہو۔ یہاں تک کہ خرچ کے لیے روپے بھی نہ رکھے جائیں۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ نوجوانوں کو مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت پڑے گی۔ انھیں ملک کی صحیح حالت کا علم ہوگا۔ نظری زاویہ وسیع ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ چال چلن درست و مضبوط ہوگا۔ استقلال۔ جرأت۔ تدبیر ارادہ وغیرہ اوصاف کی فراوانی ہوگی۔ ونے ان لڑکوں کے

ساتھ جا رہا ہے اور میں غرور سے پھولی نہیں سماتی کہ میرا لڑکا قومی فلاح و بہبود کے لیے یہ کام کر رہا ہے۔ اور تم سے سچ کہتی ہوں اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ قوم کی بھلائی کے لیے اس کو جان بھی دینا پڑی تو مجھے ذرا بھی رنج نہ ہوگا۔رنج تب ہوگا جب میں اس کو دولت و ثروت کے سامنے سر جھکاتے یا حدّ فرض سے پیچھے قدم رکھتے دیکھوں گی۔ ایشور نہ کرے میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ شاید میں ونے کے خون کی پیاسی ہو جاؤں۔ شاید میرے ان کمزور ہاتھوں میں اتنی سکت آجائے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں! یہ کہتے کہتے رانی کے چہرہ پر ایک عجیب رونق نظر آنے لگی۔ اشک آلود آنکھوں میں خودداری کی سرخی جھلکنے لگی۔ صوفیا حیرت سے رانی کا منہ تاکنے لگی۔ نازک جسم میں اس قدر محبت آگیں اور بلند حوصلہ دل چھپا ہوا ہے اس کا اسے خیال بھی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد ہی رانی نے پھر کہا۔ ’’بیٹی میں جوش میں تم سے اپنے دل کی کتنی ہی باتیں کہہ گئی۔ پر کیا کروں تمھارے چہرے پر ایسی دلکش سادگی ہے جو میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچتی ہے۔ اتنے دنوں میں میں نے تم کو خوب پہچان لیا۔ تم صوفیا نہیں تم عورت کی شکل میں ونے ہو۔ کنور صاحب تم پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو تمھارا چرچا ضرور کرتے ہیں۔ اگر مذہبی رکاوٹ نہ ہوتی تو (مسکراکر) انھوں نے مسٹر سیوک کے پاس ونے کی شادی کا پیغام کبھی کا بھیج دیا ہوتا۔

صوفیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بڑی بڑی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور لبوں پر ایک نہایت خفیف سکون بخش اور دلکش تبسم کی جھلک دکھائی دی اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور بولی۔ ’’آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں۔ میں بھاگ جاؤں گی۔‘‘

رانی : اچھا شرماؤ مت۔ میں یہ ذکر ہی نہ کروں گی۔ میرا تم سے یہی کہنا ہے کہ اب تمھیں یہاں کسی بات میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ اندو تمھاری سہیلی تھی۔ تمھارے مزاج سے واقف تھی۔ تمھاری ضروریات کو سمجھتی تھی۔ مجھ میں اتنی تمیز نہیں ہے۔ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ جس چیز کی ضرورت ہو۔ بلا تامّل کہہ دو۔ اپنی مرضی کے موافق کھانا بنوا لو۔ جب سیر کرنے کو جی چاہے۔ گاڑی تیار کرا لو۔ کسی نوکر کو کہیں

بھیجنا چاہو، بھیج دو۔ مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو فوراً چلی آؤ پیشتر سے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ کمرہ اگر پسند نہ ہو تو میرے بغل والے کمرہ میں چلو۔ جس میں اندو رہتی تھی۔وہاں جب میرا جی چاہے گا تم سے باتیں کر لیا کروں گی۔ جب فرصت ملے مجھے ادھر ادھر کی خبریں سنا دینا۔ بس یہ سمجھو کہ تم میری پرئیویٹ سکریٹری ہو۔

یہ کہہ کر جانہوی چلی گئی۔ صوفی کا دل ہلکا ہو گیا۔ اس کو بڑی فکر تھی کہ اندو کے چلے جانے پر یہاں میں کیسے رہوں گی۔ کون میری بات پوچھے گا۔ ناخواندہ مہمان کی طرح پڑی رہوں گی۔ یہ اندیشہ جاتا رہا۔

اس دن سے اس کی اور بھی خاطر و مدارات ہونے لگی۔ لونڈیاں اس کا منہ دیکھتی رہتیں۔ بار بار آکر پوچھ جاتیں۔ "مس صاحب! کوئی کام تو نہیں ہے؟" کوچوان دونوں وقت دریافت کرتا۔ "حکم ہو تو گاڑی تیار کروں۔" رانی جی بھی دن میں ایک بار ضرور آکر بیٹھ جاتیں۔ صوفی کو اب معلوم ہوا کہ ان کا دل استری جاتی کے ساتھ بھلائی کرنے والے جذبات سے کس قدر معمور تھا۔ انھیں ہندوستان کی دیویوں کو اینٹ اور پتھر کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر دلی رنج ہوتا تھا۔ وہ ان کی مادہ پرستی۔ وہم پرستی اور خود پرستی کو ملکی زوال کا خاص سبب سمجھتی تھیں۔ ان امور پر صوفی سے گھنٹوں گفتگو کیا کرتیں۔

اس مہربانی و محبت نے آہستہ آہستہ صوفی کے دل سے مغائرت کے خیالات کو مٹانا شروع کیا۔ اس کے خیالات و اطوار میں تغیر ہونے لگا۔ لونڈیوں سے کچھ کہتے ہوئے اب ہچک نہ ہوتی۔ مکان کے کسی حصہ میں جاتے ہوئے اب تامل نہ ہوتا۔ لیکن تفکرات میں جوں جوں کمی ہوتی تھی۔ عیش پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی فراغت کے اوقات میں ترقی ہونے لگی۔ تفریح سے رغبت پیدا ہوئی۔ کبھی مصوران قدیم کی تصاویر دیکھتی۔ کبھی باغ کی سیر کرنے چلی جاتی۔ کبھی پیانو پرجا بیٹھتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی رانی کے ساتھ شطرنج بھی کھیلنے لگی۔ زیورات اور کپڑوں کی طرف سے اب وہ بے پروائی نہ رہی۔ گاؤن کے بدلے ریشمی ساڑیاں پہننے لگی۔ رانی جی کے اصرار سے کبھی کبھی پان بھی کھا لیتی۔ کنگھی چوٹی سے انس ہوا۔ فکر بے تعلقی پیدا کرتی

ہے۔ بے فکری کا کھیل تماشہ سے میل ہے۔

ایک روز تیسرے پہر وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ گرمی اتنی سخت تھی کہ برقی پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی بدن سے پسینہ نکل رہا تھا۔ باہر لو سے جسم جھلسا جاتا تھا۔ دفعتاً پربھوسیوک آکر بولے۔ "صوفی! ذرا چل کر ایک جھگڑے کا تصفیہ کر دو۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ ونے سنگھ کو اس کے متعلق کئی شکوک ہیں۔ میں کچھ کہتا ہوں وہ کچھ کہتے ہیں۔ فیصلہ تمھارے اوپر چھوڑا گیا ہے۔ ذرا چلو۔"

صوفی : میں شاعرانہ نزاع کا کیا فیصلہ کروں گی۔ عروض سے ذرا بھی واقفیت نہیں اور نہ استعارات کا کوئی علم ہے مجھے بے فائدہ لے جاتے ہو۔

پربھوسیوک : اس نزع کا فیصلہ کرنے کے لیے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ میرے اور ان کے معیار میں اختلاف ہے چلو تو۔

صوفی صحن میں آئی تو بدن میں لپٹ سی لگی۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ونے کے کمرہ میں گئی جو محل کے دوسرے حصہ میں تھا۔ آج تک وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ کمرہ میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ایک کمبل بچھا ہوا تھا اور زمین ہی پر دس پانچ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ نہ پنکھا، خس کی ٹٹی، نہ پردے، نہ تصویریں، پچھوا ہوا سیدھی کمرہ میں آتی تھی۔ کمرہ کی دیواریں جلتے توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہیں ونے سر جھکائے کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کرسی لانے دوڑے۔

صوفی : کہاں جا رہے ہیں؟

پربھو سیوک : (مسکرا کر) تمھارے لیے کرسی لانے۔

صوفی : وہ کرسی لائیں گے اور میں بیٹھوں گی۔ کتنی بھدی بات ہے۔

پربھوسیوک : میں روکتا بھی تو وہ نہ مانتے۔

صوفی : اس کمرہ میں ان سے کیسے رہا جاتا ہے؟

پربھوسیوک : پورے جوگی ہیں۔ میں تو دلی محبت کے سبب آجایا کرتا ہوں۔

اتنے میں ونے نے ایک گدے دار کرسی لاکر صوفی کے لیے رکھ دی۔ صوفی

شرم اور تامل سے گڑی جاتی تھی۔ ونے کی ایسی حالت تھی گویا پانی میں بھیگ رہے ہیں۔صوفی دل میں کہتی تھی۔ "کیسی اعلیٰ زندگی ہے۔" ونے دل میں کہتے تھے۔ "کیسا بے مثال حسن ہے۔" دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر ونے کو ایک بات سوجھی۔ پربھو سیوک کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ہم اور تم فریق مقدمہ ہیں پس کھڑے رہ سکتے ہیں لیکن حاکم کو اونچے مقام پر بیٹھنا ہی مناسب ہے۔"

صوفی نے پربھو سیوک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "کھیل میں لڑکا اپنے کو بھول نہیں جاتا۔"

بالآخر ہر سہ اشخاص کمبل ہی پر بیٹھے۔ پربھوسیوک نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم حلاوت میں ڈوبی ہوئی پاکیزہ اور بلند جذبات سے مملو تھی۔ شاعر نے نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ عنوان تھا۔ "ایک ماں کا اپنی بیٹی کو دعا دینا۔"

بیٹی سسرال جا رہی ہے۔ ماں اس کو گلے لگا کر دعا دیتی ہے۔ "بیٹی تو شوہر پرست ہو۔ تیری گود پھلے۔ اس میں پھول جیسے نازک بچے کھیلیں۔ ان کے شیریں قہقہوں سے تیرا گھر اور صحن گونجے۔ تجھ پر لچھمی کا کرم ہو۔ تو پتھر بھی چھوئے تو سونا ہو جائے۔ تیرا شوہر تجھ پر اسی طرح محبت کا سایہ رکھے جس طرح چھپر دیوار کو اپنے سایہ میں رکھتا ہے۔"

شاعر نے انھیں خیالات میں شادی شدہ زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی تھی کہ اس میں پھولوں کی روشنی اور محبت کی کثرت تھی۔ کہیں بھی وہ تاریک گھاٹیاں نہ تھیں جن میں ہم گر پڑتے ہیں۔ کہیں بھی وہ کانٹے نہ تھے جو ہمارے پیروں میں چبھتے ہیں۔ کہیں بھی وہ نقص نہ تھا جو ہم کو راستہ سے ہٹا دیتا ہے۔ نظم ختم کرکے پربھوسیوک نے ونے سنگھ سے کہا۔ "اب آپ کو اس کے بارہ میں جو کچھ کہنا ہو کہیئے۔"

ونے سنگھ نے تامل کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔"

پربھو سیوک : پھر سے کہیے

ونے سنگھ : بار بار وہی باتیں کیا کہوں۔

پربھوسیوک : میں آپ کے کہنے کا خلاصہ بیان کر دوں۔

ونے سنگھ : میرے دل میں ایک بات آئی کہہ دی۔ آپ بے فائدہ اسے اتنا طول دے رہے ہیں۔

پر بھوسیوک : آخر آپ ان جذبات کو صوفی کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے کیوں شرماتے ہیں؟

ونے سنگھ : شرماتا نہیں ہوں لیکن میرا آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آپ کو انسانی زندگی کا یہ معیار بہترین معلوم ہوتا ہے۔ مجھے وہ اپنی موجودہ حالت کے خلاف جچتا ہے۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پر بھو سیوک : (ہنس کر) ہاں یہی تو میں آپ سے کہلانا چاہتا ہوں کہ آپ اس کو موجودہ حالت کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں شادی شدہ زندگی بالکل حقیر ہے اور کیا دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے؟

ونے سنگھ : میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ایسی زندگی خود غرضی کو بڑھانے والی ہے۔ اس کے لیے ثبوت کی ضرورت نہیں اور اس انحطاط کی حالت میں جب کہ خود غرضی ہماری رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جب کہ ہم اپنی غرض کے بغیر کوئی بات یا کوئی کام نہیں کرتے یہاں تک کہ ماں بیٹے کے تعلق میں۔ استاد شاگرد کے تعلق میں۔ زن شوہر کے تعلق میں خود غرضی کا خاص جزو ہے تو ایسا ہوتے ہوئے کسی بلند پایہ شاعر کے لیے اس زندگی کی سراہنا کرنا۔ اس کی تعریفوں کے پل باندھنا زیبا نہیں دیتا۔ ہم اس زندگی سے پیدا ہونے والے سکھوں کے غلام ہو رہے ہیں۔ ہم نے اسی کو اپنی زندگی کا معیار سمجھ رکھا ہے! اس وقت ہم کو ایسے وفا شعار! ایثار نفس اور بے غرض کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو قومی اصلاح کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیں۔ ہمارے شعرا کو ایسے ہی پاک اور بلند جذبات کو محرک کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ہماری بھارت ماتا افزوئی نسل کے بار کو اب نہیں سنبھال سکتی۔ اسکولوں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں، اب اتنے لڑکے نظر آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا کریں گے۔ ہمارے ملک میں اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی کہ سب کو ایک بار بھی حسب مرضی خوراک مل سکے۔ خوراک کا ملنا ہی

ہمارے اخلاقی اور اقتصادی انحطاط کا خاص سبب ہے۔ آپ کی نظم بالکل بے موقع ہے میرے خیال میں اس سے سوسائٹی کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہمارے شعرا کا فرض ہے ایثار کی اہمیت دکھلانا۔ تجرد کی لگن پیدا کرنا۔ دل پر قابو رکھنے کی تلقین کرنا۔ شادی شدہ زندگی تو غلامی کی جڑ ہے اور یہ وقت اس کی ثنا خوانی کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پربھوسیوک : آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟

ونے سنگھ : ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔

پربھوسیوک : میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایثار اور قربانی کے معیار کی میں برائی نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے لیے سب سے اونچا درجہ ہے اور وہ شخص بلا شبہ قابل تحسین ہے جو اس کو حاصل کرلے۔ لیکن جس طرح کچھ برت کرنے والوں کے بلا کھائے پڑے رہنے سے۔ کھانے اور پانی کی فائدہ رسانی میں کوئی نقص نہیں آتا اسی طرح دو چار جوگیوں کے تارک الدنیا ہو جانے سے شادی شدہ زندگی قابل ترک نہیں ہوجاتی۔ یہ زندگی انسان کی جماعتی زندگی کی جڑ ہے۔ اس کو ترک کر دیجیے۔ بس ہمارے جماعتی اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔اور ہماری حالت جانوروں کی سی ہو جائے گی۔ رشیوں نے گرہستی کو بہترین دھرم کہا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ رشیوں کا یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ رحم، ہمدردی، تحمل، فیاضی، ایثار وغیرہ اعلیٰ اوصاف کی ترقیوں کے جیسے موقع گرہست آشرم میں ملتے ہیں وہ اور کسی آشرم میں نہیں مل سکتے۔ مجھے تو یہاں تک کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ انسان کے لیے یہی ایک ایسا دھرم ہے جو فطرتی کہا جا سکتا ہے۔ جن کارناموں نے انسانی قومیت کے چہرہ کو جلا بخشی ہے۔ ان کا سہرا جوگیوں کے سر نہیں۔ بلکہ گرہستی زندگی کا سکھ بھوگنے والوں کے سر ہے۔ ہری چندر جوگی نہیں تھے۔ رام چندر جوگی نہیں تھے۔ کرشن تارک الدنیا نہیں تھے۔ نپولین تارک الدنیا نہیں تھا۔ نلسن جوگی نہیں تھا۔ مذہب اور علم کے میدان میں جوگیوں نے ضرور شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن میدان عمل میں شہرت کا سہرا بھوگیوں کے سر بندھا ہے۔ تاریخ میں ایسا ایک بھی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی قوم کی نجات تیاگیوں کے ذریعے ہوئی ہو۔ آج

بھی ہندوستان میں دس لاکھ سے زیادہ تیاگی بستے ہیں پر کون کہہ سکتا ہے کہ ان سے سوسائٹی کو کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے پوشیدہ طریقہ پر ایسا ہوتا ہو لیکن ظاہراً تو نہیں دکھائی دیتا۔ پھر یہ امید کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ گرہستی سے بچنے میں قوم کا کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ہاں اگر کم فہمی کو آپ فائدہ سمجھتے ہیں تو ضرور فائدہ ہوگا۔

یہ گفتگو ختم کر کے پر بھو سیوک نے صوفیا سے کہا۔ "تم نے فریقین کی باتیں سن لیں۔ تم اس عدل گستری کی جگہ پر ہو۔ سچ جھوٹ کا فیصلہ کر و۔"

صوفی : اس کا فیصلہ تو تم آپ ہی کر سکتے ہو۔ تمھاری سمجھ میں گانا تو بہت اچھی چیز لگتی ہے؟

پر بھو سیوک : ضرور۔

صوفی : لیکن اگر کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو تو وہاں رہنے والوں کو گاتے بجاتے دیکھ کر تم کیا کہو گے؟

پر بھو سیوک : بیو قوف کہوں گا اور کیا۔

صوفی : کیوں؟ گانا تو کوئی بری چیز نہیں ؟

پر بھوسیوک : تو یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے انھیں ڈگری دے دی۔ میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم انھیں کی طرف جھکو گی۔

صوفی : اگر یہ اندیشہ تھا تو تم نے مجھے پنچ کیوں بنایا تھا۔ تمھاری نظم نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ میں اس کو سراپا دلکش کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن تمھارا یہ فرض ہے کہ اپنی اس روحانی طاقت سے برادران وطن کو فائدہ پہنچاؤ۔ زوال کے حسن و عشق کے راگ الاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تم بھی قبول کرو گے۔ معمولی شعراء کے لیے کوئی قید نہیں ہے۔ ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن تم کو ایشور نے جتنی ہی خاص قدرت عطا کی ہے۔ تمھارے اوپر ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔

جب صوفی چلی گئی تو ونے نے پر بھوسیوک سے کہا۔ "میں اس فیصلہ کو پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ تم نادم تو نہ ہوئے ہوگے؟"

پر بھو سیوک : اس نے تمھاری مروّت کی ہے۔

ونے : بھائی تم بڑے بے انصاف ہو۔ اس قدر مدلل فیصلہ پر بھی ان کے سر الزام

عائد ہی کر دیا۔ میں تو ان کی پختہ خیالی کا پیشتر ہی سے قائل تھا۔ آج سے معتقد ہوگیا۔ اس فیصلہ نے میری قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پربھو مجھے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی کہ میں اتنی آسانی سے خواہشات کا غلام بن جاؤں گا۔ میں راستہ سے ہٹ گیا۔ میرا ضبط کسی بنے ہوئے دوست کی طرح امتحان کے اوّل ہی موقع پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں آسمان کے تارے توڑنے جا رہا ہوں وہ پھل کھانے جا رہا ہوں۔ جو میرے لیے ممنوع ہے۔ خوب جانتا ہوں۔ پربھو! کہ میں اپنی زندگی کو مایوسی کی بیدی پر قربان کر رہا ہوں۔ اپنی والدہ محترمہ کے دل پر کلہاڑے چلا رہا ہوں۔اپنی عزت و آبرو کی کشتی کو ذلت و رسوائی کے سمندر میں ڈبو رہا ہوں۔ اپنی عظمت کی خواہشات کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ لیکن میرا دل اس کے لیے مجھے ملامت نہیں کرتا۔ صوفیہ کسی طرح میری نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں اس کا ہو چکا اور تمام عمر اسی کا رہوں گا۔

پربھوسیوک : ونے! اگر صوفی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ یہاں ایک منٹ بھی نہ رہے گی۔ کہیں وہ خود کشی نہ کر لے۔ خدا کے لیے ایسا کام نہ کرو۔

ونے سنگھ : نہیں پربھو۔ میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی نہ آؤں گا۔ میرا دل جل کر خاک سیاہ ہو جائے مگر صوفی کو آنچ نہ لگنے پائے گی۔ میں کسی دور مقام میں بیٹھا ہوا اس علم دانائی اور پاکیزگی کی دیوی کی پرستش کیا کروں گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے عشق میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ میری زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے یہ محبت ہی کافی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنی ملکی خدمت کے کام کو ترک کر رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ میں اب بھی اسی راستہ پر چلتا رہوں گا۔فرق صرف اتنا ہوگا کہ غیر مجسم کی جگہ مجسم کی۔ نہ دکھائی دینے والے کی جگہ دکھائی دینے والے کی پوجا اور بھگتی کروں گا۔

اسی وقت جانہوی نے دفعتاً آکر کہا۔ "ونے ذرا اندو کے پاس چلے جاؤ۔ کئی روز سے اس کا کچھ حال نہیں ملا۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئی۔ خط بھیجنے میں اتنی دیر تو کبھی نہ کرتی تھی۔"

ونے تیار ہوگئے۔ کرتہ پہنا۔ ہاتھ میں سونٹا لیا اور چل دیے۔ پربھوسیوک صوفی

کے پاس جاکر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ "ونے سنگھ کی باتیں اس سے کہوں یا نہ کہوں؟" صوفی نے انھیں متفکر دیکھ کر پوچھا "کنور صاحب کچھ کہتے تھے؟"

پربھوسیوک : اس بارہ میں تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر تمھارے بارہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صوفی نے لمحہ بھر زمین تاکنے کے بعد کہا۔ "میں سمجھتی ہوں پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔ مگر میں اس سے پریشان نہیں ہوں۔ یہ جذبہ میرے دل میں اسی وقت پیدا ہوا جب یہاں آنے کے چوتھے روز میں نے آنکھیں کھولیں اور نیم ہوشی کی حالت میں ایک فرشتہ صورت انسان کو سامنے کھڑا ہوا اپنی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا پایا۔ وہ صورت اور وہ نگاہ آج تک میرے دل میں منقوش ہے۔اور ہمیشہ منقوش رہے گی۔"

پربھوسیوک : صوفی! تمھیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

صوفی : نہیں۔ شرم نہیں آتی۔ شرم کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنے عشق کے قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ایسے درویش سیرت ایسے ایثار مجسّم ایسے حوصلہ مند شخص کی معشوقہ بننے میں کوئی شرم نہیں ہے۔ اگر عشق کا تحفہ پاکر کسی نوجوان دوشیزہ کو فخر ہو سکتا ہے تو وہ دوشیزہ میں ہوں۔ یہی برکت تھی جس کے حصول کے لیے میں اتنے دنوں تک صبر و استقلال کی تپسیا کر رہی تھی۔ آج اسی برکت کا مجھ پر نزول ہوا ہے تو یہ میرے لیے شرم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔

پربھو سیوک : مذہبی تضاد ہوتے ہوئے بھی؟

صوفیہ : اس کا خیال وہ لوگ کرتے ہیں جن کا عشق خواہشات نفسانی پر مشتمل ہے۔ عشق اور خواہش میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا کہ سونا اور کانچ (شیشہ) میں۔ عشق اعتقاد کے مشابہ ہے۔ دونوں میں صرف کمی بیشی کا فرق ہے۔ اعتقاد میں عزت اور عشق میں خدمت والے جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ عشق کے لیے مذہبی تضاد کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا۔ ایسی رکاوٹ اس ارادہ کے لیے ہے جس کا نتیجہ شادی ہے نہ کہ اس عشق کے لیے جس کا نتیجہ قربانی ہے۔

پر بھو سیوک : میں نے تمھیں جتا دیا۔ یہاں سے چلنے کے لیے تیار رہو۔
صوفیہ : مگر گھر پر کسی سے اس کی چرچا کرنے کی ضرورت نہیں۔
پر بھو سیوک : اس سے بے فکر رہو۔
صوفیہ : کچھ طے ہوا۔ یہاں سے ان کے جانے کا کب قصد ہے۔
پر بھو سیوک : تیاریاں ہو رہی ہیں۔ رانی جی کو یہ بات معلوم ہوئی تو ونے کی خیر نہیں۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر ماما سے اس کی شکایت کریں۔

صوفیہ نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ "پر بھو! کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ عشق بے خوفی کا منتر ہے۔ عشق کی پرستش کرنے والا دنیا کے سبھی تفکرات اور بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔"

پر بھو سیوک چلے گئے تو صوفیہ نے کتاب بند کر دی اور باغ میں جاکر ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کو آج کھلے ہوئے پھولوں میں آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا میں درختوں پر چہکنے والی چڑیوں کی آواز میں۔ آسمان کی سرخی میں ایک عجیب رونق، ایک ناقبل بیان خوبصورتی ایک روحانی جلوہ کا سماں نظر آتا تھا۔وہ عشق کا انمول موتی پا گئی تھی۔

ایک ہفتہ ہوگیا مگر ونے سنگھ نے راجپوتانہ کا سفر نہ کیا۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے دن ٹالتے جاتے تھے۔ کوئی تیاری نہ کرنی تھی پھر بھی تیاریاں پوری نہ ہوتی تھیں۔ اب ونے اور صوفیہ دونوں ہی کو معلوم ہونے لگا کہ عشق کو جب کہ وہ عورت اور مرد دونوں ہی میں ہو خواہشات نفسانی سے مبرا رکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا انھوں نے سمجھا تھا۔ صوفی ایک کتاب بغل میں دبا کر علی الصباح باغ میں جا بیٹھی۔ شام کو بھی کہیں اور جگہ سیر کرنے نہ جا کر وہیں چلی جاتی۔ ونے بھی اس سے کچھ فاصلے پر لکھتے پڑھتے، کتے سے کھیلتے یا کسی دوست سے باتیں کرتے ضرور دکھائی دیتے۔دونوں ایک دوسرے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے پر شرم کے سبب کوئی بات چیت کرنے میں پیش قدمی نہ کرتا تھا۔ دونوں ہی حیا دار تھے پر دونوں ہی اس خاموش بیانی کامطلب سمجھتے تھے۔ پہلے اس زبان کا علم نہ تھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خواہش ایک ہی بیقراری ایک ہی تڑپ۔ ایک ہی آگ تھی۔ خاموش بیانی

سے انھیں تسکین نہ ہوتی لیکن کسی کو گفتگو کرنے کی کچھ جرأت نہ ہوتی۔ دونوں اپنے اپنے دلوں میں عشقیہ گفتگو کی نئی نئی باتیں سوچ کر آتے اور وہاں جا کر سب بھول جاتے۔ دونوں ہی عہد کے پکے اور معیار کے پجاری تھے۔ لیکن ایک کا مذہبی کتابوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسرا سمتی کو اپنے مجوزہ مضامین پر تقریر سنانے کا موقع بھی نہ پاتا تھا۔ دونوں ہی کے لیے عشق کا موتی عشق کا نشہ ثابت ہو رہا تھا۔

ایک روز رات کو کھانا کھانے کے بعد صوفیہ رانی جی کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ونے سنگھ آکر بیٹھ گئے۔ صوفی کی عجیب حالت ہو گئی پڑھتے پڑھتے بھول جاتی کہ کہاں تک پڑھ گئی ہوں اور پڑھی ہوئی سطروں کو دو بارہ پڑھنے لگتی۔ وہ بھی اٹک اٹک کر الفاظ پر نظر نہ جمتی۔ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ کمرہ میں رانی کے علاوہ کوئی اور شخص بیٹھا ہوا ہے مگر ونے کی طرف دیکھے بغیر ہی اس کو غائبانہ علم سا ہو جاتا تھا کہ اب وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں اور فوراً ہی اس کا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ جانہوی نے کئی بار ٹوکا۔ ”سوتی تو نہیں ہو؟ کیا بات ہے؟ رک کیوں جاتی ہو؟ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے بیٹی؟“ دفعتاً ان کی نگاہ ونے سنگھ پر پڑی۔ اسی وقت جب وہ عاشقانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جانہوی کا شگفتہ اور مطمئن چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا باغ میں آگ لگ گئی۔ تیز نگاہی سے ونے سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم کب جا رہے ہو؟“

ونے : بہت جلد

جانہوی : میں بہت جلد کا مطلب یہ سمجھتی ہوں کہ تم کل ہی علی الصباح روانہ ہو جاؤ گے۔

ونے : ابھی ساتھ جانے والے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں۔

جانہوی : کوئی ہرج نہیں۔ وہ پیچھے سے چلے جائیں گے۔ تمھیں کل ہی جانا ہوگا۔

ونے : جو ارشاد۔

جانہوی : ابھی جاکر سب آدمیوں کو اطلاع دے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ طلوع آفتاب کے وقت اسٹیشن پر پہنچ جاؤ۔

ونے : اندو سے ملنے جانا ہے۔

جانہوی : کوئی ضرورت نہیں۔ ملنے کا رواج عورتوں کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے نہیں۔ جاؤ۔

ونے کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آہستہ سے اٹھے اور چلے گئے۔

صوفی نے ہمت کر کے کہا۔ ''آج کل تو راجپوتانہ میں آگ برستی ہوگی۔''

جانہوی نے طے شدہ انداز سے کہا۔ '' فرض کو کبھی آگ اور پانی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جاؤ تم بھی سو رہو۔ سویرے اٹھنا ہے۔''

صوفی ساری رات بیٹھی رہی۔ ونے سے ایک بار ملنے کے لیے اس کا دل چھٹ پٹا رہا تھا۔ آہ وہ کل چلے جائیں گے اور میں ان سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکوں گی! وہ بار بار کھڑکی سے جھانکتی کہ کہیں ونے کی آہٹ مل جائے۔ چھت پر چڑھ کر دیکھا تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے اس کی بے قراری پر ہنس رہے تھے۔ اس کے دل میں کئی بار زبردست تحریک ہوئی کہ چھت پر سے نیچے باغ میں کود پڑوں۔ ان کے کمرہ میں جاؤں اور کہوں میں تمھاری ہوں! آہ اگر مذہب نے میرے اور ان کے درمیان میں رکاوٹ نہ کھڑی کردی ہوتی تو وہ اتنے متفکر کیوں ہوتے۔ مجھ کو اتنا پس و پیش کیوں ہوتا۔ رانی مجھ سے بے رخی کیوں کرتیں؟ اگر میں راجپوتنی ہوتی تو رانی خوشی سے مجھ کو قبول کرتیں۔ مگر میں یسوع کی مقلد ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہوں۔ یسوع اور کرشن میں کتنی یکسانیت ہے۔ لیکن ان کے مقلدوں میں کتنا اختلاف! کیسی زبردستی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مذہبی اختلافات نے ہمارے دلوں پر کتنا ظلم کیا ہے۔

جوں جوں رات گزرتی تھی صوفی کا دل فرط یاس سے بیٹھا جاتا تھا۔ ہائے! میں یوں ہی بیٹھی رہوں گی۔ اور سویرا ہو جائے گا۔ ونے چلے جائیں گے۔ کوئی ایسا بھی تو نہیں جس کے ہاتھوں ایک خط لکھ کر بھیج دوں۔ میرے ہی سبب سے تو ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ ماں کا دل بھی بے رحم ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی میں ہی بد نصیب ہوں پر اب معلوم ہوا ایسی مائیں اور بھی ہیں۔

وہ چھت پر سے اتری اور اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہی۔ مایوسی نے نیند کی گود میں پناہ لی۔ لیکن فکر کی نیند حالت گرسنگی کا کھیل ہے۔ سکون سے بری اور لذت سے

خالی۔ ذرا ہی دیر سوئی تھی کہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ سورج کا اجالا کمرہ میں پھیل گیا تھا۔ اور ونے سنگھ اپنے بیسوں ہمراہیوں کے ساتھ اسٹیشن جانے کو تیار کھڑے تھے۔ باغ میں ہزاوروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔

وہ فوراً باغ میں جا پہنچی۔ اور مجمع کو ہٹاتی ہوئی مسافروں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ قومی گیت گایا جا رہا تھا۔ مسافر ننگے سر ننگے پیر۔ ایک ایک کرتہ پہنے ہاتھ میں لاٹھی لیے گردنوں میں ایک ایک جھولی لٹکائے۔ سفر پر جانے کو تیار تھے۔ سب کے سب خوشی اور جوش سے بھرے ہوئے قومیت کے غرور سے بیخود ہو رہے تھے۔ جن کو دیکھ کر تماشائیوں کے دل جذبۂ افتخار غرور سے معمور تھے۔ ایک لمحہ بعد رانی جانہوی آئیں اور مسافروں کی پیشانیوں پر زعفران کے قشقے لگائے۔ پھر کنور بھرت سنگھ نے آکر ان کے گلوں میں ہار پہنائے۔ زاں بعد ڈاکٹر گنگولی نے نہایت منتخب الفاظ میں ان کو اپنا وعظ سنایا۔ وعظ سن کر جانے والے روانہ ہو گئے۔ جے جے کا نعرہ ہزار ہزار گلوں سے نکل کر فضا میں گونجنے لگا۔ عورتوں مردوں کا ایک مجمع ان کے پیچھے چلا۔ صوفیا بت بنی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر امنگ اٹھتی تھی کہ میں بھی انھیں کے ساتھ چلی جاؤں۔ اور اپنے دکھی بھائیوں کی خدمت کروں۔ اس کی آنکھیں ونے سنگھ پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتاً ونے کی آنکھیں بھی اس کی جانب پھریں۔ انھیں کتنی مایوسی تھی۔ کتنی باطنی تکلیف۔ کتنی مجبوری۔ کتنی عاجزی۔ وہ سب جانے والوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ صوفیا ہوش اور بے ہوشی کی حالت میں مسافروں کے پیچھے پیچھے چلی۔ اور اسی طرح سڑک پر جا پہنچی۔ پھر چوراہا ملا۔ اس کے بعد کسی راجہ کا عظیم الشان محل۔ پر ابھی تک صوفی کو خبر نہ ہوئی کہ میں ان کے ساتھ چلی جا رہی ہوں۔ اس کو اس وقت ونے سنگھ کے سوا اور کوئی نظر ہی نہ آتا تھا۔ کوئی زبردست کشش اسے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن کے سامنے والے چوراہے پر پہنچ گئی۔ دفعتاً اس کے کانوں میں پربھوسیوک کی آواز پڑی جو بڑی تیزی سے فٹن دوڑائے چلے آرہے تھے۔

پربھو سیوک نے پوچھا۔ ”صوفی! تم کہاں جا رہی ہو؟ جوتے تک نہیں صرف زیر

پائیاں پہنے ہوئے ہو۔" صوفیا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آہ! میں اس بھیس میں کہاں چلی آئی؟ مجھے سدھ نہ رہی۔ لجاتی ہوئی بولی۔ "کہیں تو نہیں۔"

پربھوسیوک : کیا ان لوگوں کے ساتھ اسٹیشن تک جاؤ گی۔ آؤ! گاڑی پر بیٹھ جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتا ہوں۔ مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں۔ جلد ہی گاڑی تیار کرا کے آ پہنچا ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔

صوفی : میں اتنی دور نکل آئی اور ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کہاں جا رہی ہوں۔

پربھوسیوک : آکر بیٹھ نہ جاؤ۔ اتنی دور آئی ہو تو اسٹیشن تک اور چلی چلو۔

صوفی : میں اسٹیشن تک نہ جاؤں گی۔ یہیں سے واپس ہوں گی۔

پربھوسیوک : میں اسٹیشن سے واپسی پر آؤں گا۔ آج تمھیں میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔

صوفی : میں وہاں نہ جاؤں گی۔

پربھوسیوک : بڑے پاپا بہت ناراض ہوں گے۔ آج تم کو انھوں نے بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا ہے۔

صوفی : جب تک ماما خود آکر مجھے نہ لے جائیں گی اس وقت تک گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔

یہ کہہ کر صوفیہ لوٹ پڑی اور پربھوسیوک اسٹیشن کو چل دیے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر ونے نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا صوفی نہ تھی۔

پربھوسیوک نے ان کے کان میں کہا۔ "دھرم بسالہ تک یوں ہی رات کے کپڑے پہنے چلی آئی تھی۔ وہاں سے لوٹ گئی۔ جاکر خط ضرور لکھئے گا ورنہ وہ راجپوتانہ جا پہونچے گی۔"

ونے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "صرف جسم لے جا رہا ہوں۔ "دل یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔"

(10)

لڑکوں پر محبت کی طرح نفرت کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جب سے مٹھوا اور گھیسو کو معلوم ہوا تھا کہ طاہر علی ہمارا میدان زبردستی لے رہے ہیں۔ اس وقت سے دونوں ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چتاری کے راجہ صاحب اور سورداس میں جو باتیں ہوئی تھیں ان کا انھیں علم نہ تھا۔ سورداس کو خود بھی دغدغہ لگا ہوا تھا کہ اگر چہ راجہ صاحب نے اطمینان دلایا ہے مگر جلد ہی یہ مسئلہ پھر چھڑے گا۔ جان سیوک صاحب اتنی آسانی سے گلا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ بجرنگی۔ نایک رام وغیرہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے تھے مٹھوا اور گھیسو یہ باتیں بڑی چاہ سے سنتے۔ اور ان کی آتش غضب اور بھی مشتعل ہوتی۔ گھیسو جب بھینسیں لے کر میدان کی طرف جاتا توزور زور سے پکارتا "دیکھیں کون ہماری جمین (زمین) لیتا ہے اٹھا کر ایسا پٹکوں کہ وہ بھی یاد کرے۔ دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کچھ کھیل سمجھ لیا ہے۔" وہ ذرا تھا بھی کڑے دم کا۔ کشتی لڑتا تھا۔ بجرنگی خود بھی جوانی میں اچھا پہلوان تھا۔ گھیسو کو وہ شہر کے پہلوانوں کی ناک بنا دینا چاہتا تھا جس کے سامنے پنجابی پہلوانوں کو بھی خم ٹھونکنے کی ہمت نہ پڑے۔ دور دور جاکر دنگل مارے۔ لوگ کہیں۔ "یہ بجرنگی کا بیٹا ہے!" وہ ابھی سے گھیسو کو اکھاڑے بھیجتا تھا۔ گھیسو اپنے زعم میں سمجھتا تھا کہ مجھے جو پیچ معلوم ہیں ان سے جس کو بھی چاہوں گرا دوں۔ مٹھوا کشتی تو نہ لڑتا پر کبھی اکھاڑے میں جا بیٹھتا تھا۔ اس کو اپنی پہلوانی کی ڈینگ مارنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ دونوں جب طاہر علی کو کہیں دیکھتے تو سنا سنا کر کہتے "دشمن جاتا ہے۔ اس کا منہ کالا۔" مٹھوا کہتا۔ "جے شنکر کانٹا نہ لگے کنکر۔ دشمن کو تنگ کر۔" گھیسو کہتا۔ "بم بھولا بیری کے پیٹ میں گولا۔ اس سے کچھ نہ جائے بولا۔"

طاہر علی ان چھوکروں کی چھچھورپن کی باتیں سنتے اور ان سنی کر جاتے۔ لڑکوں کے منہ کیا لگیں۔ سوچتے کہیں یہ سب گالیاں دے بیٹھیں تو ان کا کیا بنا لوں گا؟ دونوں سمجھتے ڈر کے مارے نہیں بولتے وہ اور بھی شیر ہو جاتے۔ گھیسو پر ان پیچوں کی آزمائش کرتا جن سے وہ طاہر علی کو پٹکے گا۔ پہلے یہ ہاتھ پکڑا پھر اپنی طرف کھینچا۔

تب وہ ہاتھ گردن میں ڈال دیا اور اڑنگی لگائی۔ بس چاروں شانے چت مٹھوا فوراً گر پڑتا تھا اور اس کو اس پیچ کے عجیب اثر کا یقین ہو جاتا تھا۔

ایک روز دونوں نے صالاح کی۔ "چل کر میاں جی کے لڑکوں کی خبر لینی چاہیے۔" میدان میں جاکر ظاہر اور جابر کو کھیلنے کے لیے بلایا۔ اور خوب چپتیں لگائیں۔ جابر چھوٹا تھا اسے میٹھوا نے دبایا۔ ظاہر اور گھیسو کا جوڑ تھا۔ لیکن گھیسو اکھاڑا دیکھے ہوئے تھا۔ کچھ داؤں پیچ جانتا تھا۔ آن کی آن میں ظاہر کو دبا بیٹھا۔ مٹھوا نے جابر کے چٹکیاں کاٹنی شروع کیں۔ بے چارہ رونے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو کئی رگڑے دیے۔ وہ بھی چوندھیا گیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو مار ہی ڈالے گا تو اس نے بھی پکار مچائی۔ ان دونوں کا رونا سن کر ننھا صابر ایک پتلی سی قمچی لیے اکڑتا ہوا غم زدوں کی مدد کرنے آیا اور گھیسو کو قمچی سے مارنے لگا۔ جب اس مار کا گھیسو پر کچھ اثر نہ ہوا تو اس نے اس سے زیادہ چوٹ پہنچانے والا ہتھیار نکالا۔ وہ گھیسو پر تھوکنے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو چھوڑ دیا اور صابر کے دو تین طمانچے لگائے۔ ظاہر موقع پاکر پھر اٹھا اور اب کے زیادہ ہوشیار ہو کر گھیسو سے لپٹ گیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ آخر گھیسو نے اسے پھر پٹکا اور مشکیں چڑھا دیں۔ ظاہر کو اب رونے کے سوا کوئی اور تدبیر نہ سوجھی۔ یہی کمزوروں کا آخری ہتھیار ہے۔ تینوں کے رونے کی آواز ماہر علی کے کانوں میں پہنچی وہ اس وقت مدرسہ جانے کو تیار تھے۔ فوراً کتابیں پٹک دیں اور میدان کی طرف دوڑے۔ دیکھا تو ظاہر اور جابر نیچے پڑے ہائے ہائے کر رہے ہیں اور صابر الگ رو رہا ہے شرافت کا خون جوش میں آ گیا۔ میں سید پولیس کے افسر کا بیٹا۔ چنگی کے محرر کا بھائی۔ انگریزی کے آٹھویں درجہ کا متعلم یہ جاہل۔ گنوار۔ اہیر کا لونڈا اس کی اتنی مجال کہ میرے بھائیوں کو نیچا دکھائے۔ اس نے گھیسو کو ایک ٹھوکر لگائی اور مٹھوا کو کئی طمانچے۔ مٹھوا تو رونے لگا مگر گھیسو دل کا مضبوط تھا۔ ظاہر کو چھوڑ کر اٹھا۔ حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ دو مورچے سر کر چکا تھا۔ خم ٹھونک کر ماہر علی سے بھی لپٹ گیا۔ ماہر کا سفید پاجامہ میلا ہو گیا۔ آج ہی جوتہ میں روغن لگایا تھا۔ اس پر گرد پڑ گئی۔ سنوارے ہوئے بال بکھر گئے۔ غضب ناک ہو کر گھیسو کو ایسی گردنی دی کہ دو قدم پر جا گرا۔ صابر، ظاہر سب ہنسنے لگے۔ لڑکوں کی چوٹ بدلہ لینے کے ساتھ ہی غائب ہو

جاتی ہے۔ گھیسو ان کو ہنستے دیکھ کر اور بھی جھنجھلایا۔ پھر اٹھا اور ماہر سے لپٹ گیا۔ ماہر نے اس کا گلا پکڑا اور زور سے دبانے لگا۔ گھیسو نے سمجھا اب مرا۔ یہ مارے بغیر نہ چھوڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ماہر کے ہاتھ میں دانت جما دیے۔ تین دانت گڑ گئے۔ خون بہنے لگا۔ ماہر چیخ اٹھا۔ اس کا گلا چھوڑ کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ مگر گھیسو کسی طرح نہ چھوڑتا تھا۔ خون بہتا دیکھ کر تینوں بھائیوں نے پھر رونا شروع کیا۔ زینب اور رقیہ یہ شوروغوغا سن کر دروازہ پر آ گئیں۔ دیکھا تو میدان جنگ خون سے سرخ ہورہا ہے۔ گالیاں دیتی ہوئیں طاہر علی کے پاس گئیں۔ زینب نے حقارت آمیز آواز سے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھے کھالیں نوچ رہے ہو۔ کچھ دین دنیا کی بھی خبر ہے؟ وہاں وہ اہیر کا لونڈا ہمارے بچوں کا خون کیے ڈالتا ہے۔ موئے کو پکڑپاتی تو خون ہی پی لیتی۔“

رقیہ : موا آدمی بچّہ ہے کہ دیو بچّہ۔ ماہر علی کے ہاتھ میں اتنے زور سے دانت کاٹا ہے کہ خون کے فوارے نکل رہے ہیں۔ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو اسی بات پر موئے کو جیتا گاڑ دیتا۔“

زینب : کوئی اپنا ہوتا تو اس وقت مونڈی کاٹے کو کچا ہی چبا جاتا۔

طاہر علی گھبرا کر میدان کی طرف دوڑے ماہر کے کپڑے خون سے تر دیکھے تو جامہ سے باہر ہو گئے۔ گھیسو کے دونوں کان پکڑ زور سے ملے اور طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کیے۔ مٹھوا نے دیکھا اب پٹنے کی باری آئی۔ میدان ہمارے ہاتھ سے گیا گالیاں دیتا ہوا بھاگا۔ ادھر گھیسو نے بھی گالیاں دینا شروع کیں۔ شہر کے لونڈے گالی دینے میں مشّاق ہوتے ہیں۔ گھیسو نئی نئی گالیاں اختراع کر رہا تھا اور طاہر علی گالیوں کاجواب طمانچوں سے دے رہے تھے۔ مٹھوا نے جاکر اس معرکہ کی خبر بجرنگی کو دی۔ ”سب لوگ مل کر گھیسو کو مار رہے ہیں۔ اس کے منہ سے لہو نکل رہا ہے۔ وہ بھینسیں چرا رہا تھا کہ تینوں لڑکے آکر بھینسوں کو بھگانے لگے۔ گھیسو نے منع کیا۔ تو سب نے مل کر مارا اور بڑے میاں بھی نکل کر مار رہے ہیں۔“ بجرنگی یہ خبر سنتے ہی آگ ہوگیا۔ اس نے طاہر علی کی ماں کو پچاس روپے دیے تھے۔ اور اس زمین کو اپنی سمجھے بیٹھا تھا۔ لاٹھی اٹھائی اور دوڑا۔ دیکھا تو طاہر علی گھیسو کے ہاتھ پاؤں بندھوا رہے ہیں۔ پاگل ہوگیا بولا۔ ”بس منشی جی! بھلا چاہتے ہو تو ہٹ جاؤ نہیں تو ساری سیکھی (شیخی)

بھلادوں گا۔ یہاں جیل خانہ کا ڈر نہیں ہے۔ سال دو سال وہیں کاٹ آؤں گا۔ مگر تم کو کسی کام کا نہ رکھوں گا۔ زمین تمھارے باپ کی نہیں ہے۔ اس کے لیے تمھیں پچاس روپے دیے ہیں۔ کیا حرام کے روپے تھے؟ بس ہٹ ہی جاؤ نہیں تو کچا چبا جاؤں گا۔ میرا نام بجرنگی ہے۔"

طاہر علی نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ گھیسو نے باپ کو دیکھتے ہی زور سے چھلانگ ماری اور ایک پتھر اٹھا کر طاہر علی کی طرف پھینکا۔ وہ سر نیچا نہ کر لیتے تو ماتھا پھٹ جاتا۔ جب تک گھیسو دوسرا پتھر اٹھائے۔ انھوں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اتنے زور سے اینٹھا کہ "وہ آہ مرا آہ مرا" کہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اب بجرنگی آپے سے باہر ہوگیا۔ جھپٹ کر ایسی لاٹھی ماری کہ طاہر علی تیورا کر گر پڑے۔ کئی چمار جو اب تک اسے لڑکوں کا جھگڑا سمجھ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ طاہر علی کو گرتے دیکھ کر دوڑے اور بجرنگی کو پکڑ لیا۔ میدان کارزار میں سناٹا چھا گیا۔ ہاں زینب اور رقیہ دروازہ پر کھڑی ہوئیں لفظی تیروں سے برابر کام لے رہی تھیں۔ مونڈی کاٹے نے غضب کر دیا اس پر خدا کا قہر نازل ہو۔ اگلا دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اس کی میت اٹھے۔ کوئی دوڑتے ہوئے صاحب کے پاس جاکر کیوں اطلاع نہیں دیتا۔ ارے او چمارو۔ بیٹھے منہ کیا تاکتے ہو؟ جاکر صاحب کو خبر کیوں نہیں دیتے؟ کہنا ابھی چلیے۔ ساتھ لانا۔ کہنا پولیس لیتے چلیے یہاں جان دینے نہیں آئے ہیں۔"

بجرنگی نے طاہر علی کو گرتے دیکھا تو سنبھل گیا۔ دوسرا ہاتھ نہ چھوڑا گھیسو کا ہاتھ پکڑا اور گھر چلا گیا۔ یہاں گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو چمار جان سیوک کے بنگلہ کی طرف گئے۔ طاہر علی کو لوگوں نے اٹھایا اور چارپائی پر لاد کر کمرہ میں لائے۔ کندھے پر لاٹھی لگی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ابھی تک بے ہوش تھے۔ چماروں نے فوراً ہلدی پیسی اور اسے گڑ چونہ میں ملاکر ان کے کندھے پر لگایا۔ ایک آدمی لپک کر ارنڈے کے پتے توڑ لایا۔ وہ آدمی بیٹھ کر چوٹ سینکنے لگے۔ زینب اور رقیہ تو ماہر علی کی مرہم پٹی کرنے لگیں۔ بیچاری کلثوم دروازہ پر کھڑی رو رہی تھی۔ شوہر کی طرف اس سے دیکھا بھی نہ جاتا تھا۔ گرنے سے ان کے سر میں چوٹ آگئی تھی۔ خون بہہ کر ماتھے پر جم گیا تھا۔ بالوں پر لٹیں پڑ گئی تھیں گویا کسی مصور کے برش پر رنگ

خشک ہو گیا ہو۔ دل میں درد ہو رہا تھا لیکن شوہر کو دیکھتے ہی اس کو بے ہوشی سی ہونے لگی تھی۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ اس کو شوہر سے ذرا بھی محبت نہیں۔ کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ کیا کروں ان کا چہرہ نہ جانے کیسا ہو گیا ہے وہی چہرہ جس کی کبھی بلائیں لی جاتی تھیں۔ مرنے کے بعد خوف ناک ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف نگاہ کرنے کے لیے کلیجہ کو مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی طرح موت کا بھی سب سے زیادہ نمایاں اثر چہرہ ہی پر پڑتا ہے۔ طاہر علی کی دن بھر سینک باندھ ہوئی۔ چماروں نے اس طرح دوڑ دھوپ کی گویا ان کا کوئی خاص دوست ہو۔ عملی ہمدردی کا ہونا دہقانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ رات کو بھی کئی چمار ان کے پاس بیٹھے ہوئے سینکتے اندھتے رہے۔ زینب اور رقیہ بار بار کلثوم کو طعنے دیتیں۔ ”بہن تمھارا دل بھی غضب کا ہے۔ وہاں شوہر کا برا حال ہو رہا ہے۔ اور تم یہاں مزہ سے بیٹھی ہو۔ ہمارے میاں کے سر میں ذرا سا درد ہوتا تھا تو ہماری جان ناخن میں آجاتی تھی۔ آج کل کی عورتوں کا کلیجہ سچ مچ پتھر کا ہوتا ہے۔“ کلثوم کا دل ان تیروں سے چھدا جاتا تھا۔ مگر یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تمھیں دونوں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر تم بھی تو انھیں کی کمائی کھاتی ہو اور مجھ سے زیادہ۔ لیکن اتنا کہتی تو بچ کر کہاں جاتی۔ دونوں اس کے گلے پڑ جاتیں۔ بے چاری ساری رات جاگتی رہی۔ بار بار دروازہ پر جا کر آہٹ لے آتی تھی۔ کسی طرح رات بیت گئی۔ صبح طاہر علی کی آنکھ کھلی۔ درد سے اب بھی کراہ رہے تھے۔ مگر اب ان کی حالت اس قدر تشویش انگیز نہ تھی۔ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ کلثوم نے ان کو چماروں سے باتیں کرتے سنا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آواز کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ چماروں نے جوں ہی انھیں ہوش میں دیکھا سمجھ گئے کہ اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔ اب گھر والوں کی تیمار داری کا وقت آگیا۔ ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ اب کلثوم نے دل کو مضبوط کیا اور شوہر کے پاس آ بیٹھی۔ طاہر علی نے اس کو دیکھا تو کمزور آواز میں بولے۔ ”خدا نے مجھے نمک حرامی کی سزا دی ہے۔ جن کے لیے اپنے آقا کا برا چاہا وہی اپنے دشمن ہو گئے۔“

کلثوم : تم یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جب تک زمین کا معاملہ طے نہ ہو

جائے گا۔ نت نیا جھگڑا ہوتا ہی رہے گا۔ لوگوں سے دشمنی بڑھتی جائے گی۔ یہاں جان تھوڑا ہی دینی ہے۔ خدا نے جس طرح اتنے دن رزق دیا اسی طرح آگے بھی دے گا۔ جان تو سلامت رہے گی۔

طاہر: جان تو سلامت رہے گی مگر گزر کیسے ہوگی؟ کون اتنا دیے دیتا ہے؟ دیکھتی ہو کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔

کلثوم: نہ اتنا ملے گا نہ سہی۔ اس کا نصف تو ملے گا۔ دونوں وقت نہ کھائیں گے۔ ایک ہی وقت سہی۔ جان تو آفت میں نہ رہے گی۔

طاہر: تم ایک وقت کھا کر خوش رہوگی۔ گھر میں اور بھی تو ہیں۔ ان کے دکھڑے روز کون سنے گا؟ مجھے اپنی جان سے دشمنی تھوڑا ہی ہے پر مجبور ہوں خدا کو جو منظور ہے وہی ہوگا۔

کلثوم: گھر کے اور لوگوں کے پیچھے کیا جان دے دوگے؟

کلثوم: کیسی باتیں کرتی ہو؟ آخر وہ لوگ کوئی غیر تو نہیں ہیں اپنے ہی بھائی ہیں۔ یا مائیں ہیں۔ ان کی پرورش میرے سوا اور کون کرے گا؟

کلثوم: تم سمجھتے ہوگے وہ لوگ تمھارے محتاج ہیں مگر ان کو تمھاری رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ جب تک مفت ملے اپنے خزانہ میں کیوں ہاتھ لگائیں میرے بچے پیسے پیسے کو ترستے ہیں اور وہاں مٹھائیوں کی ہانڈیاں آتی ہیں۔ ان کے لڑکے مزہ میں کھاتے ہیں۔ دیکھتی ہوں اور آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

طاہر علی: میرا جو فرض ہے اسے پورا کرتا ہوں۔ اگر ان کے پاس روپے ہیں تو اس کا مجھے کیوں افسوس ہو۔ وہ شوق سے کھائیں اور آرام سے رہیں۔ تمھاری باتوں سے حسد کی بو آتی ہے۔ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔

کلثوم: پچھتاؤگے۔ جب سمجھاتی ہوں۔ مجھی پر ناراض ہوتے ہو۔ لیکن دیکھ لینا کوئی بات نہ پوچھے گا۔

طاہر: یہ سب تمھاری نیت کا قصور ہے۔

کلثوم: ہاں عورت ہوں۔ مجھ میں عقل کہاں؟ پڑے تو ہو کسی نے جھانکا تک نہیں۔ قلق ہوتا تو یوں چین سے نہ بیٹھی رہتیں۔

طاہر علی نے کروٹ بدلی تو کندھے میں شدت کا درد محسوس ہوا آہ آہ کر کے چیخ اٹھے۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ کلثوم گھبرا کر بولی۔ ”کسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ کہیں ہڈی پر ضرب نہ آ گئی ہو۔“

طاہر : ہاں مجھے بھی ایسا ہی اندیشہ ہو رہا ہے مگر ڈاکٹر کو بلاؤں تو اس کی فیس کے روپے کہاں سے آویں گے۔

کلثوم : تنخواہ تو ابھی ملی تھی کیا اتنی جلد خرچ ہو گئی۔

طاہر : خرچ تو نہیں ہوگئی لیکن فیس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب کے ماہر کی تین ماہ کی فیس دینی ہوگی۔ بارہ روپے تو فیس ہی کے نکل جائیں گے۔ صرف اٹھارہ بچیں گے۔ ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہوا ہے کیا فاقہ کریں گے۔

کلثوم : جب دیکھو ماہر کی فیس کا تقاضا سر پر سوار رہتا ہے۔ ابھی دس دن ہوئے فیس دی نہیں گئی؟

طاہر : دس دن نہیں ہوئے ایک مہینہ ہو گیا۔

کلثوم : فیس اب کے نہ دی جائے گی۔ڈاکٹر کی فیس اس فیس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ پڑھ کر روپے کمائیں گے تو میرا گھر نہ بھریں گے۔ مجھے تو تمھاری ہی ذات کا بھروسہ ہے۔

طاہر : (بات بدل کر) ان موذیوں کی جب تک بخوبی تنبیہ نہ ہو جائے گی۔ شرارت سے باز نہ آئیں گے۔

کلثوم : ساری شرارت اسی ماہر کی تھی۔ لڑکوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ وہاں نہ جاتا تو کیوں معاملہ اتنا طول کھینچتا اس پر جواہیر کے لونڈے نے ذرا دانت کاٹ لیا تو آپ بھنا اٹھے۔

طاہر : مجھے تو خون کے چھینٹے دیکھتے ہی جیسے سر پر شیطان سوار ہو گیا۔

اتنے میں گھیسو کی ماں جمنی آ پہنچی۔ زینب نے اسے دیکھتے ہی فوراً بلا لیا اور ڈانٹ کر کہا ”معلوم ہوتا ہے تیری شامت آ گئی ہے۔“

جمنی : بیگم صاحب! شامت نہیں آئی ہے۔ برے دن آئے ہیں اور کیا کہوں۔ میں کل دہی بیچ کر لوٹی تو یہ حال سنا۔ سیدھے آپ کی کھدمت (خدمت) میں دوڑی پر

یہاں بہت سے آدمی جمع تھے۔ لاج کے مارے لوٹ گئی۔ آج دہی بیچنے نہیں گئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے آئی ہوں۔ جو کچھ بھول چوک ہوئی اسے معاف کیجیے نہیں تو اجڑ جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

زینب: اب ہمارے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔ صاحب بلا مقدمہ چلائے نہ مانیں گے اور وہ نہ چلائیں گے تو ہم چلائیں گے۔ ہم کوئی دھنئے جلاہے ہیں! یوں سب سے دبتے پھریں تو عزت کیسے رہے؟ میاں کے باپ تھانہ دار تھے۔ سارا علاقہ ان کے نام سے کانپتا تھا۔ بڑے بڑے رئیس ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ ان کی اولاد کیا اب ایسی گئی گزری ہو گئی کہ چھوٹے چھوٹے آدمی بے عزتی کریں؟ تیرے لونڈے نے ماہر کو اتنے زور سے دانت کاٹا کہ لہو لہان ہو گیا۔ پٹی باندھے پڑا ہے۔ تیرے شوہر نے آکر لڑکے کو ڈانٹ دیا ہوتا تو بگڑی بات بن جاتی۔ لیکن اس نے تو آتے ہی آتے لاٹھی چلا دی۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ اتنی رعایت نہیں کر سکتے۔

رقیہ: جب پولیس آکر مارتے مارتے کچومر نکال لے گی تب ہوش آئے گا۔ نذر نیاز دینا پڑے گی وہ الگ۔ جبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔

جمنی کو اپنے شوہر پر غصہ کی عملی واقفیت بھی حاصل تھی۔ ان دھمکیوں سے ذرا بھی نہ ڈری بولی۔ بیگم صاحب یہاں اتنے روپے کہاں دھرے ہیں۔ دودھ پانی کر کے دس پانچ روپے اکٹھے کیے ہیں بس وہیں تک اپنی دوڑ ہے۔ اس روزگار میں اب کیا رکھا ہے؟ روپیہ کا تین پنسیری تو بھوسہ ملتا ہے۔ ایک روپیہ میں ایک بھینس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس پر کھلی۔ بنولہ۔ بھوسی۔ چوکر۔ سبھی کچھ چاہیے۔ کسی طرح دن کاٹ رہے ہیں۔ آپ کے بال بچوں کو سال چھ مہینے دودھ پلا دوں گی۔"

زینب سمجھ گئی کہ یہ اہیرن کچی گولیاں نہیں کھیلی ہے۔ اس کے لیے کسی دوسرے ہی منتر سے کام لینا پڑے گا۔ ناک سکوڑتے ہوئے بولی۔ "تو اپنا دودھ اپنے گھر رکھ۔ یہاں دودھ گھی کے ایسے بھوکے نہیں ہیں۔ یہ زمین اپنی ہوئی جاتی ہے جتنے مویشی چاہوں گی پال لوں گی۔ مگر تجھے کہے دیتی ہوں کہ تو گھر میں کل سے نہ بیٹھنے پائے گی۔ پولیس کی رپٹ تو صاحب کے ہاتھ میں ہے پر ہمیں بھی خدا نے ایسا علم دیا ہے کہ جہاں ایک نقش لکھ کر دم کیا جنات اپنا کام کرنے لگے۔ جب ہمارے میاں

زندہ تھے۔ تو ایک بار پولیس کے ایک بڑے انگریز حاکم سے کچھ حجت ہوگئی۔ بولا ہم تم کو نکال دیں گے۔ میاں نے کہا ہم کو نکال دوگے تو تم بھی آرام سے نہ بیٹھوگے۔ میاں نے آکر مجھ سے کہا۔ میں نے اسی رات کو سلیمانی نقش لکھ کر دم کیا۔ اس کی میم کا پورا حمل گر گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ خوشامدیں کیں۔ پیروں پر گرا میاں سے قصور معاف کرایا تب میم کی جان بچی۔ کیوں رقیہ تمھیں یاد ہے نا؟

رقیہ : یاد کیوں نہیں ہے۔ میں نے ہی تو دعا پڑھی تھی۔ صاحب رات بھر دروازہ پر پکارتا رہا تھا۔

زینب : ہم اپنی طرف سے کسی کی برائی نہیں چاہتے۔ لیکن جب جان پر آ بنتی ہے۔ تو سبق بھی ایسا دے دیتے ہیں کہ زندگی بھر نہ بھولے۔ ابھی اپنے پیر سے کہہ دیں تو خدا جانے کیا غضب ڈھائیں۔ تمھیں یاد ہے رقیہ؟ ایک اہیر نے انھیں دودھ میں پانی ملا کر دیا تھا۔ ان کی زبان سے اتنا ہی نکلا۔ ”جا تجھے خدا سمجھے“ اہیر نے گھر آکر دیکھاتو اس کی دو سو روپے کی بھینس مری پڑی تھی۔

جمنی نے یہ باتیں سنیں تو ہوش اڑ گئے۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی تھانہ، پولیس، کچہری اور دربار کی بہ نسبت بھوت پریت سے زیادہ خوف زدہ رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں بھوتوں کی لیلا دیکھنے کے موقع آئے دن ملتے ہی رہتے تھے۔ ملاؤں کے جنتر منتر کہیں زیادہ لاگو ہوتے ہیں۔ یہ بھی جانتی تھی۔ زینب نے اس کے شیطانی خوف کو محرک کر کے اپنی کمال ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ جمنی ڈر کر بولی۔ ”نہیں بیگم صاحب آپ کو بھی بھگوان نے بال بچے دیے ہیں۔ ایسا ظلم نہ کیجیے گا۔ نہیں تو مر جاؤں گی۔“

زینب : یہ بھی نہ کریں وہ بھی نہ کریں تو عزت کیسے رہے؟ کل کو تیرا اہیر پھر لٹھ لے کر آ پہنچے تو؟ خدا نے چاہا تو اب وہ لٹھ اٹھانے لائق رہ ہی نہ جائے گا۔

جمنی کانپتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور بولی۔ ”بی بی۔ جو حکم ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔“

زینب نے چوٹ پر چوٹ لگائی اور جمنی کے بہت رونے گڑ گڑانے پر پچیس روپے لے کر جنات سے اس کو بے خوٹ کیا جمنی گھر گئی۔ روپے لاکر دیے اور پیروں

پر گری مگر بجرنگی سے یہ بات نہ کہی۔ وہ چلی گئی تو زینب نے ہنس کر کہا۔ خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ تم بے صبر ہو جاتی ہو ورنہ میں نے کچھ نہ کچھ اور اینٹھا ہوتا۔ سوار کو چاہیے باگ ہمیشہ کڑی رکھے۔

دفعتاً صابر نے آکر زینب سے کہا۔ "آپ کو ابا بلاتے ہیں۔" زینب وہاں گئی تو طاہر علی کو پڑے کراہتے دیکھا۔ کلثوم سے بولی۔ بی بی غضب کا تمھارا جگر ہے۔ ارے بھلے آدمی! جاکر ذرا مونگ کا دلیا پکا دے۔ غریب نے رات کو کچھ نہیں کھایا اس وقت بھی منہ میں کچھ نہ جائے گا تو کیا حال ہوگا؟"

طاہر: نہیں میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ روپے ہوں تو مجھے قرض کے طور پر دے دیجیے۔ میرے شانوں میں بڑا درد ہے۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھلانا چاہتا ہوں مگر اس کی فیس کے لیے روپوں کی ضرورت ہے۔

زینب: بیٹا بھلا سوچو تو میرے پاس روپے کہاں سے آئیں گے۔ تمھارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ مگر تم ڈاکٹر کو بلاتے ہی کیوں ہو؟ تمھیں سیدھے صاحب کے یہاں جانا چاہیے۔ یہ ہنگامہ انھیں کی بدولت تو ہوا ہے ورنہ یہاں ہم سے کسی سے کیا غرض تھی؟ ایک یکہ منگوا لو اور صاحب کے یہاں کے چلے جاؤ۔ وہ ایک رقعہ لکھ دیں گے تو سرکاری شفاخانہ میں خاصی طرح علاج ہو جائے گا۔ تمھیں سو چو۔ ہماری حیثیت ڈاکٹر بلانے کی ہے؟

طاہر علی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ماں کا شکریہ ادا کیا۔ سو چا نہ جانے یہی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی، یکہ منگوایا۔ لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے اس پر سوار ہوئے اور صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔

مسٹر سیوک راجہ مہیندر کمار سے ملنے کے بعد کمپنی کے حصص بیچنے کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ کل وہ راجہ صاحب سے پھر ملے تھے۔ مگر جب ان کا فیصلہ سنا تو بہت مایوس ہوئے۔ بہت دیر تک بیٹھے بحث مباحثہ کرتے رہے لیکن راجہ صاحب نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا نا امید ہو کر آئے اور مسز سیوک سے سارا حال کہہ سنا یا۔

مسز سیوک کو ہندوستانیوں سے چڑ تھی۔ اگرچہ اسی ملک کے آب و گل سے ان کا جسم بنا تھا۔ لیکن اپنے خیال میں مذہب عیسوی کو اختیار کر کے وہ ان بد اطواریوں سے نجات پا چکی تھیں جو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے خیال میں خدا نے ہندوستانیوں کو شرافت، ہمدردی، فیاضی، انسانیت وغیرہ اعلیٰ اوصاف سے بالکل ہی محروم رکھا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی معتقد تھیں اور طرز معاشرت میں اسی کی تقلید کرتی تھیں۔ کھانا پینا وضع قطع بودو باش۔ سب انگریزی تھی۔ مجبوری صرف اپنے سانولے رنگ سے تھی۔ صابن اور دیگر کیمیاوی اشیاء کے متواتر استعمال سے بھی دلی مراد بر نہ آتی تھی۔ ان کی زندگی کا اعلیٰ مقصد یہی تھا کہ ہم عیسائیوں کے درجہ سے نکل کر انگریزوں سے مل جائیں۔ ہمیں لوگ صاحب سمجھیں۔ ہمارا ربط ضبط انگریزوں سے ہو۔ ہمارے لڑکوں کی شادیاں اینگلو اڈین یا کم از کم اعلیٰ طبقہ والے یوریشین لوگوں کے یہاں ہوں۔ صوفیہ کی تعلیم و تربیت انگریزی طریقہ پر ہوئی تھی۔ لیکن وہ ماں کے بہت اصرار کرنے پر بھی انگریزی پارٹیوں اور دعوتوں میں نہ شریک ہوتی تھی۔ ناچ سے تو اس کو نفرت ہی تھی۔ لیکن مسز سیوک ان مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ یوں کام نہ چلتا تو خاص کوشش کرکے دعوتی کارڈ منگواتیں تھیں۔ اگر خود ان کے گھر پر دعوتیں اور پارٹیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ تو اس کا سبب تھی ایشور سیوک کی کنجوسی۔

یہ حال سن کر مسز سیوک نے کہا۔ ”دیکھ لی ہندوستانیوں کی شرافت؟ پھولے نہ سماتے تھے اب تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کس قدر نا اہل ہیں؟ ایک اندھے فقیر کے مقابلہ مین تمھاری یہ قدر ہے! جانبداری تو ان رگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ ان بڑے بڑے آدمیوں کا حال ہے جو اپنی قوم کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی فیاضی پر لوگوں کو ناز ہے۔ میں نے ایک بار مسٹر کلارک سے یہ ذکر کیا تھا انھوں نے تحصیل داروں کو حکم دے دیا کہ اپنے اپنے علاقہ میں تمباکو کی پیداوار بڑھاؤ۔ یہ صوفی کے آگ میں کودنے کا انعام ہے۔ذرا سا میونسپلٹی کا اختیار کیا مل گیا۔ سبھوں کے دماغ پھر گئے۔ مسٹر کلارک کہتے تھے کہ اگر راجہ صاحب زمین کامعاملہ نہ طے کریں گے تو میں اسے ضابطہ سے آپ کو دلا دوں گا۔“

مسٹر جو زف کلارک حاکم ضلع تھے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے یہاں آئے تھے۔ مسٹر سیوک نے ان سے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا۔ در اصل انھوں نے کلارک کو صوفی کے لیے منتخب کیا تھا۔ دو ایک دفعہ انھیں اپنے گھر بھی بلا چکی تھیں۔ گھر چھوڑ دینے کے پیشتر صوفی کی ان سے دو تین بار ملاقات بھی ہو چکی تھی مگر وہ ان کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوئی تھی۔ تو بھی مسز سیوک ابھی اس بارہ میں نا امید نہیں ہوئی تھیں۔ کلارک سے کہتی تھیں کہ صوفی مہمانی کرنے گئی ہے۔ اسی طرح موقع پا کر ان کی آتش عشق کو مشتعل کرتی رہتی تھیں۔

جان سیوک نے نادم ہو کر کہا۔ "میں کیا جانتا تھا کہ یہ حضرت بھی دغا دیں گے۔ یہاں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اپنے قول کے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں اب کوئی دوسری تدبیر سوچنی پڑے گی۔"

مسز سیوک : میں مسٹر کلارک سے کہوں گی۔ پادری صاحب سے بھی سفارش کراؤں گی۔

جان سیوک۔ : مسٹر کلارک کو میونسپلٹی کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔

جان سیوک اسی اندیشہ میں غرق تھے۔ کہ ان کو ہنگامہ کی خبر ملی۔ سناٹے میں آگئے۔ پولیس میں رپورٹ کی۔ دوسرے روز گودام جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ طاہر علی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ پہنچے۔ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ یکہ کے ہچکولوں نے ادھ موًا سا کر دیا تھا۔

مسز سیوک نے انگریزی میں کہا۔ "کیسی صورت بنا لی ہے گویا مصیبت کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے۔"

جان سیوک : کہیے منشی جی معلوم ہوتا ہے آپ کو سخت چوٹ آئی۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔

طاہر : حضور کچھ نہ پوچھیے۔ کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔

جان سیوک : اور انھیں مفسدوں کی آپ مجھ سے سفارش کر رہے تھے!

طاہر : حضور! اپنی خطا کی خوب سزا پا چکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری گردن کی

ہڈی پر ضرب آ گئی ہے۔
جان سیوک : یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ ہڈی ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ یہاں کسی طرح نہ آسکتے تھے۔ چوٹ ضرور آئی ہے مگر دو چار روز مالش کر لینے سے صحت ہو جائے گی۔ آخر یہ مار پیٹ ہوئی کیوں؟
طاہر : حضور! یہ سب اسی شیطان بجرنگی اہیر کی حرکت ہے۔
جان سیوک : مگر مضروب ہو جانے ہی سے آپ جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔ میں اس کو آپ کی نادانی اور بے احتیاطی سمجھتا ہوں۔ آپ ایسے لوگوں سے الجھے ہی کیوں؟ آپ کو کیا معلوم ہے۔ اس میں میری کتنی بدنامی ہے؟
طاہر : میری طرف سے تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔
جان سیوک : ضرور ہوئی ورنہ دیہاتوں کے آدمی کسی سے بغیر چھیڑ کے لڑنے نہیں آتے۔ آپ کو اس طرح رہنا چاہیے کہ لوگوں پر آپ کا رعب رہے۔ یہ نہیں کہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو آپ سے مار پیٹ کرنے کی ہمت ہو۔
مسز سیوک : کچھ نہیں۔ یہ سب ان کی کمزوری ہے۔ کوئی راہ چلتے کسی کو نہیں مارتا۔
ایشور سیوک کرسی پر پڑے پڑے بولے۔ "خدا کے بیٹے! مجھے اپنے سایہ میں لے۔ سچے دل سے اس کی بندگی نہ کرنے کی یہی سزا ہے۔"
طاہر علی کو یہ باتیں زخم پر نمک کی طرح معلوم ہوئیں۔ ایسا غصہ آیا کہ اسی وقت کہہ دوں۔ جہنم میں جائے تمھاری نوکری۔ لیکن جان سیوک کو ان کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ فٹن تیار کرائی اور طاہر علی کو لیے ہوئے راجہ مہیندر کمار کے مکان پر جا پہنچے۔ راجہ صاحب شہر کا گشت لگا کر مکان پر پہنچے ہی تھے کہ جان سیوک کا کارڈ ملا۔ کچھ جھنجھلائے لیکن مروت دامن گیر ہوئی۔ باہر نکل آئے۔ مسٹر سیوک نے کہا۔ "معاف کیجیے گا میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی مگر پانڈے پور والوں نے اتنا فساد برپا کر رکھا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے سوا کس کا دامن پکڑوں، کل سب نے مل کر گودام پر حملہ کر دیا۔ شاید آگ لگا دینا چاہتے تھے پر آگ تو نہ لگا سکے۔ ہاں میرے ایجنٹ ہیں بس سب کے سب ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کو اور ان کے بھائیوں کو مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ اتنے پر بھی ان کو

تسکین نہ ہوئی۔ زنانہ مکان میں گھس گئے اور اگر عورتیں اندر سے دروازہ نہ بند کر لیں تو ان کی آبرو ریزی میں کوئی شک نہ تھا۔ ان کو تو ایسی چوٹیں لگی ہیں شاید مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوں۔ کندھے کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔"

مہیندر کمار سنگھ عورتوں کی بہت عزت کر تے تھے۔ ان کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر طیش میں آ جاتے تھے۔ غضب ناک ہو کر بولے۔ "سب زنانہ میں گھس گئے؟"

جان سیوک : کواڑ توڑنا چاہتے تھے مگر چماروں نے دھمکایا تو ہٹ گئے۔

مہیندر کمار : کمینے! عورتوں پر ظلم کرنا چاہتے تھے!

جان سیوک : یہی تو اس ڈراما (ناٹک) کا سب سے زیادہ شرمناک حصہ ہے۔

مہیندر کمار : شرمناک نہیں صاحب قابل نفرین کہئے!

جان سیوک : اب یہ بے چارہ کہتے ہیں کہ یا تو میرا استعفا لیجئے یا گودام کی حفاظت کے لیے چوکیداروں کا بندو بست کیجیے۔ عورتیں اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتیں۔ یہ ساری باتیں اسی اندھے کی بدولت ہو رہی ہیں۔

مہیندر کمار : مجھے تو وہ بہت ہی غریب اور سیدھا سا آدمی معلوم ہوتا ہے مگر ہے چھٹا ہوا! میں نے اسی کی بے چارگی پر ترس کھا کر تجویز کیا تھا کہ آپ کے لیے کوئی دوسری زمین تلاش کروں لیکن جب ان لوگوں کی شرارت پر کمر باندھی ہے اور آپ کو وہاں سے جبراً ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کی سزا انھیں ضرور ملے گی۔

جان سیوک : بس یہی بات ہے۔ وہ لوگ مجھے وہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اگر رعایت کی گئی تو میرے گودام میں ضرور آگ لگا دیں گے۔

مہندر کمار : میں خوب سمجھ رہا ہوں۔ یوں میں خود جمہوریت کا دلدادہ ہوں اور اس کے اصول کی دل وجان سے حمایت کرتا ہوں۔ لیکن جمہوریت کے نام پر ملک میں جو بد امنی پھیلی ہوئی ہے اس کا میں ایک زبردست مخالف ہوں۔ ایسی جمہوریت سے تو سرمایہ داری یا شخصی اقتدار وغیرہ سبھی بہتر ہیں۔ آپ مطمئن رہئے۔

اسی طرح کچھ دیر اور باتیں کر کے اور راجہ صاحب کو خوب بھر کر جان سیوک رخصت ہوئے۔ راستہ میں طاہر علی سوچنے لگے۔ صاحب کو میری بد حالی سے اپنا کام نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔ کیا ایسے صاحب ثروت، با عزت، ذہین اور ذی علم

لوگ ایسے خود غرض ہوتے ہیں؟

جان سیوک نے قیافہ سے ان کے خیالات کو معلوم کر لیا۔ بولے آپ سوچ رہے ہوں گے میں نے اس قدر مبالغہ اور رنگ آمیزی کیوں کی۔ صرف سانحہ کا واقعی حال ہی کیوں نہ بیان کیا؟ لیکن سوچئے کہ کیا ایسی صورت میں مجھے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا؟ دنیا میں کسی کام کا اچھا یا برا ہونا محض کامیابی پر محمول ہے۔ ایک شخص حکومت سے بغاوت کرتا ہے۔ اگر حکام نے اس پر تشدد کرنے کا موقع پا لیا۔ تو وہ باغی کہا جاتا ہے اور سزائے موت پاتا ہے۔ اگر اس کا مقصد پورا ہوگیا تو وہ اپنے ملک کا نجات دہندہ اور فاتح سمجھا جاتا ہے اور اس کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ کامیابی میں عیوب کے مٹا دینے کی عجیب قوت ہے۔ آپ جانتے ہیں دو سال پہلے مصطفےٰ کمال کیا تھا؟ باغی! ملک اس کے خون کا پیاسا تھا۔ آج وہ اپنی قوم کا روح رواں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کامیاب ہوا۔ لینن کئی سال قبل اپنی جان کے خوف سے امریکہ بھاگ گیا تھا۔ آج وہ جمہور روس کا پریزیڈنٹ ہے۔ یہ محض اس لیے کہ اس کی بغاوت کامیاب ہوئی۔ میں نے راجہ صاحب کو طرفدار بنا لیا پھر مبالغہ کا عیب کہاں رہا؟"

اتنے میں فٹن بنگلہ پر آ پہنچی۔ ایشور سیوک نے آتے ہی آتے پوچھا۔ "کہو کیا کر آئے۔"

جان سیوک نے فخر سے کہا۔ "راجہ کو اپنا مرید بنا لیا۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی تو ضرور کرنی پڑی پر اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔"

ایشور سیوک: خدا تجھ پر رحم کی نگاہ رکھے۔ بیٹا! رنگ آمیزی بغیر بھی دنیا کا کوئی کام چلتا ہے؟ کامیابی کی یہی کنجی ہے اور تجارتی کامیابی کے لیے تو اس کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ آپ کے پاس اچھی سے اچھی چیز ہے۔ جب تک آپ اس کی تعریف نہیں کرتے کوئی گاہک کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عمدہ مال کو لاجواب نایاب وغیرہ کہنا بیجا نہیں۔ اپنی دوا کو آب حیات اکسیر زندگی بخش تیر بہدف جو بھی چاہیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب نہیں کسی واعظ سے پوچھو۔ کسی وکیل سے پوچھو۔ کسی مضمون نگار سے پوچھو۔ سبھی ایک آواز سے یہی کہیں گے کہ رنگ آمیزی اور کامیابی مترادف ہیں۔ یہ وہم ہے کہ مصور ہی کو رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تو تمھیں یقین ہو

گیا کہ وہ زمین مل جائے گی ؟

جان سیوک : جی ہاں۔ اب کوئی شبہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے پربھو سیوک کو پکارا۔ اور حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ ”بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ذرا پانڈے پو ر کیوں نہیں چلے جاتے؟ اگر تمھارا یہی حال رہا۔ تو میں کہاں تک تمھاری مدد کرتا رہوں گا۔“

پربھوسیوک : مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں مگر اس وقت مجھے صوفی کے پاس جانا ہے۔

جان سیوک : پانڈے پور سے لوٹتے ہوئے صوفی کے پاس بہت آسانی سے جا سکتے ہو۔

پربھوسیوک : میں صوفی سے ملنا زیادہ ضروری خیال کرتا ہوں۔

جان سیوک : تمھارے روز روز ملنے سے کیافائدہ جب تم آج تک اسے یہاں لانے میں میں کامیاب نہ ہو سکے؟

پربھوسیوک کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے نکلتے رہ گئے۔ ”ماما نے جو آگ لگادی ہے وہ میرے بجھاتے نہیں بجھ سکتی۔“ وہ فوراً اپنے کمرہ میں گئے۔ کپڑے پہنے اور اسی وقت طاہر علی کے ساتھ پانڈے پور جانے کو تیار ہو گئے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ زمین سے آگ کی لپٹ نکل رہی تھی۔ دو پہر کا کھانا تیار تھا۔ میز لگادی گئی تھی۔ لیکن پربھو سیوک والدین کے بے حد اصرار پر بھی کھانے کی میز پر نہ بیٹھے۔ طاہر علی خدا سے دعا کررہے تھے کہ کسی طرح دو پہر یہیں کٹ جائے۔ پنکھوں کے نیچے۔ خس کی ٹٹیوں سے چھن کر آنے والی ٹھنڈی ہوا نے ان کے درد کو بہت کم کر دیا تھا لیکن پربھوسیوک کی ضد نے ان کو لطف اندوزی سے محروم ہی رکھا۔

(11)

بھیرو پاسی اپنی ماں کا سپوت بیٹا تھا۔ حتے الامکان اسے آرام سے رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں بہو اپنی ساس کو بھوکا نہ رکھے وہ اس کی تھالی اپنے سامنے پرسا لیا کرتا۔ اور اس کو اپنے ساتھ ہی بیٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ بڑھیا

تمباکو پیتی تھی اس کے واسطے ایک پیتل سے منڈھا ہوا خوب صورت ناریل لایا تھا۔ آپ چاہے زمین پر سوئے پر اس کو کھاٹ پر سلاتا تھا۔ کہتا کہ اس نے نہ جانے کتنی تکلیف برداشت کر کے مجھے پالا پوسا ہے۔ میں اس سے جیتے جی کبھی اُرِن نہیں ہو سکتا۔ اگر ماں کا سر بھی کبھی درد کرتا تو بے چین ہو جاتا اجھے سیانے بلا لاتا۔ بڑھیا کو کپڑے گہنے کا بھی شوق تھا۔ شوہر کے راج میں جو آرام نہ ملا تھا وہ بیٹے کے راج میں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بھیرو نے اس کے لیے ہاتھوں کے کڑے اور گلے کی ہنسلی اور ایسی ہی کئی چیزیں بنوا دی تھیں۔ پہننے کے لیے موٹے کپڑے کی بجائے کوئی رنگین چھینٹ لایا کرتا تھا۔ اپنی بیوی کو تاکید کرتا رہتا کہ ماں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس طرح بڑھیا کے مزاج میں کچھ رعونت آگئی تھی۔ ذرا سی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوتی تو روٹھ جاتی اور بہو کو آڑے ہاتھوں لیتی۔ بہو کا نام سو بھاگی تھا۔ بڑھیا نے اس کا نام ابھاگی رکھ چھوڑا تھا۔ بہو نے ذرا چلم بھرنے میں دیر کی۔ چار پائی بچھانا بھول گئی یا منہ سے نکلتے ہی ان کا پیر دبانے یا سر کی جوئیں نکالنے نہ آپہنچی تو بڑھیا اس کے سر ہو جاتی۔ اس کے باپ اور بھائیوں کے منہ کو کالا بناتی۔ سبھوں کی داڑھیاں جلاتی۔ اور اسے گالیوں سے صبر نہ ہوتا بلکہ جوں ہی بھیرو دوکان سے آتا تو ایک ایک کی سوسو لگاتی۔ بھیرو سنتے ہی آگ ہو جاتا کبھی جلی کٹی باتوں سے اور کبھی ڈنڈے سے بیوی کی خبر لیتا۔ جگدھر سے اس کی گہری دوستی تھی۔ اگر چہ بھیرو کا گھر آبادی کے مغربی سرے پر تھا اور جگدھر کا مشرقی سرے پر لیکن جگدھر کے یہاں زیادہ آمدو رفت تھی۔ یہاں مفت تاڑی پینے کو مل جاتی تھی جسے مول لینے کے لیے اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ اس کے گھر میں کھانے والے بہت تھے۔اور کمانے والا تنہا وہی تھا۔ پانچ لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک بیوی۔ خوانچہ سے اتنا نفع کہاں کہ اتنے پیٹ بھرے اور تاڑی شربت بھی بچے ؟ یہ بھیرو کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا۔ اس لیے سو بھاگی اس سے جلتی تھی۔

دو تین برس پہلے کی بات ہے ایک رات کو بھیرو اور جگدھر بیٹھے ہوئے تاڑی پی رہے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ بڑھیا کھا پی کر انگیٹھی سامنے رکھے آگ تاپ رہی تھی۔ بھیرو نے سو بھاگی سے کہا۔ ”تھوڑے سے مٹر بھون لا۔ نمک مرچ پیاز

بھی لیتی آنا۔" تاڑی کے لیے گزک کی ضرورت تھی۔ سوبھاگی نے مٹر تو بھونے لیکن پیاز گھر میں نہ تھا۔ ہمت نہ پڑی کہ کہہ دے۔ "پیاز نہیں ہے۔" دوڑی ہوئی کنجڑے کی دوکان پر گئی۔ کنجڑا دوکان بند کر چکا تھا۔ سوبھاگی نے بہت خوشامد کی پر اس نے دوکان نہ کھولی۔ مجبوراً اس نے بھنے ہوئے مٹر لا کر بھیرو کے سامنے رکھ دیے۔ بھیرو نے پیاز نہ دیکھا تو تیور بدلے۔ بولا۔ "کیا مجھے بیل سمجھتی ہے کہ بھونے ہوئے مٹر لا کر رکھ دیے؟ پیاز کیوں نہیں لائی؟"

سوبھاگی نے کہا۔ "پیاز گھر میں نہیں ہے تو کیا میں پیاز ہو جاؤں؟"

جگدھر: پیاز کے بغیر مٹر کیا اچھے لگیں گے۔

بُڑھیا: پیاج تو ابھی کل ہی دھیلے کا آیا تھا۔ گھر میں کوئی چیز تو بچتی ہی نہیں۔ نہ جانے اس چڑیل کا پیٹ ہے یا بھاڑ۔

سوبھاگی: مجھ سے کسم (قسم) لے لو جو پیاج ہاتھ سے بھی چھوئی ہو۔ ایسی جبان (زبان) ہوتی تو اس گھر میں ایک دن بھی نباہ نہ ہوتا۔

بھیرو: پیاج نہیں تھے لائی کیوں نہیں؟

جگدھر: جو چیز گھر میں نہ رہے اس کی فکر رکھنی چاہیے۔

سوبھاگی: میں کیا جانتی تھی کہ آج آدھی رات کو پیاج کی دھن سوار ہوگی۔

بھیرو تاڑی کے نشہ میں تھا۔ نشہ میں غصہ کی خاصیت ہے۔ کمزوروں ہی پر اترتا ہے۔ ڈنڈا پاس ہی رکھا تھا۔ اٹھا کر ایک ڈنڈا سوبھاگی کو مارا۔ اس کے ہاتھ کی سب چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ گھر سے بھاگی۔ بھیرو پیچھے دوڑا۔ سوبھاگی ایک دوکان کی آڑ میں چھپ گئی۔ بھیرو نے ڈھونڈا۔ جب نہ پایا تو گھر جاکر کواڑ بند کر لیے اور پھر رات بھر خبر نہ لی۔ سوبھاگی نے سوچا کہ اس وقت جاؤں گی تو جان کی خیر نہیں۔ لیکن رات بھر رہوں گی کہاں؟ وہ بجرنگی کے گھر گئی اس نے کہا۔ ”نا بابا میں یہ روگ نہیں پالتا۔ کھوٹا آدمی ہے۔کون اس سے لڑائی مول لے؟“ ٹھاکر دین کا دروازہ بند تھا۔ سورداس بیٹھا کھانا پکا رہا تھا۔ سوبھاگی اس کی جھونپڑی میں گھس گئی اور بولی۔ ”سورداس آج کی رات مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ وہ مارے ڈالتا ہے۔ ابھی جاؤں گی تو ایک ہڈی بھی نہ بچے گی۔“

سورداس نے کہا۔ ”آؤ پڑ رہو۔ سویرے چلی جانا ابھی نشہ میں ہوگا۔“

دوسرے روز جب بھیرو کو یہ بات معلوم ہوئی تو سورداس سے خوب گالی گلوج کی اور مارنے کی بھی دھمکی دی۔ سوبھاگی۔ اسی وقت سے سورداس پر مہر بانی کرنے لگی۔ جب فرصت پاتی تو اس کے پاس آبیٹھتی۔ کبھی کبھی اس کے گھر میں جھاڑو لگا جاتی۔ کبھی گھر والوں کی آنکھ بچا کر اس کو کچھ دے جاتی۔ مٹھوا کو اپنے گھر لے جاتی اور اسے گڑ بنا دیتی۔

بھیرو نے کئی بار اس کو سورداس کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ جگدھر نے دونوں کو باتیں کرتے ہوئے پایا۔ بھیرو کے دل میں شک ہو گیا کہ ضرور ان دونوں میں کچھ سانٹھ گانٹھ ہے۔ جبھی سے وہ سورداس سے خار کھاتا تھا۔ اس سے چھیڑ کر لڑتا پر نایک رام کے خوف سے اس کو مار نہ سکتا تھا۔ سوبھاگی پر اس کی سختیاں روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھیں اور جگدھر اپنی نرم مزاجی کے باوجود بھی بھیرو کی طرف داری کرتا۔

جس دن بجرنگی اور طاہر علی میں جھگڑا ہوا تھا۔ اسی دن بھیرو اور سورداس میں بھی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ بڑھیا دوپہر کو نہائی تھی۔ سوبھاگی اس کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ گرمی کا موسم تھا ہی رات کو 9 بجے بڑھیا کو پھر گرمی معلوم ہوئی۔ گرمیوں میں روز دو مرتبہ نہاتی تھی۔اور جاڑوں میں دو مہینوں میں ایک مرتبہ۔ جب وہ نہا کر دھوتی

مانگنے لگی تو سوبھاگی کو یاد آئی۔ کاٹو تو لہو نہ تھا۔ بدن میں۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "اماں! آج دھوتی دھونے کو بھول گئی تم ذرا دیر میری دھوتی پہن لو تو میں اسے دھو کر ابھی سکھائے دیتی ہوں۔"

بڑھیا اس قدر متحمل مزاج نہ تھی۔ اس نے بہو کو ہزاروں گالیاں دیں اور گیلی دھوتی پہنے بیٹھی رہی اتنے میں بھیرو دوکان سے آیا۔ اور سوبھاگی سے بولا۔ جلدی کھانا لا۔ "آج سنگت ہونے والی ہے۔ آؤ اماں! تم بھی کھا لو۔"

بڑھیا بولی۔ نہا کر گیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہوں۔ اب اپنے ہاتھوں دھوتی دھو لیا کروں گی۔

بھیرو : کیا اس نے دھوتی نہیں دھوئی؟

بڑھیا : وہ اب میری دھوتی کیوں دھونے لگی؟ گھر کی مالکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ ایک روٹی کھانے کو دے دیتی ہے۔

سوبھاگی نے بہت کچھ معذرت کی پر بھیرو نے ایک نہ سنی۔ ڈنڈا لے کر مارنے دوڑا۔ سو بھاگی بھاگی اور آکر سورداس کے گھر میں گھس گئی۔ پیچھے پیچھے بھیرو بھی وہیں پہنچا۔ جھونپڑے میں گھسا اور چاہتا تھا کہ سوبھاگی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے کہ سورداس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "کیا بات ہے بھیرو اسے کیوں مار رہے ہو؟"

بھیرو گرم ہو کر بولا۔ "دروازہ سے ہٹ جاؤ نہیں تو پہلے تمھاری ہی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ساری بگلا بھگتی نکل جائے گی۔ بہت دنوں سے تمھارا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ آج ساری کسر نکال لوں گا۔"

سورداس : تم نے میرا کیا رنگ دیکھا؟ بس یہی نا کہ میں نے سوبھاگی کو گھر سے نکال نہیں دیا۔

بھیرو : بس اب چپ ہی رہنا۔ ایسے پاپی نہ ہوتے تو بھگوان نے آنکھیں کیوں پھوڑ دی ہوتیں۔ بھلا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ۔

سورداس : میرے گھر میں تم اسے نہ مارنے پاؤ گے۔ یہاں سے چلی جائے تو جتنا چاہے مار لینا۔

بھیرو : ہٹتا ہے آگے سے کہ نہیں،

سورداس : میں اپنے گھر میں ہی اودھم نہ مچانے دوں گا۔

بھیرو نے غصہ میں آکر سورداس کو دھکا دیا۔ بیچارہ بے سہارے کھڑا تھا گر پڑا۔ پر پھر اٹھا اور بھیرو کی کمر پکڑ کر بولا۔ "اب چپکے سے چلے جاؤ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔"

سورداس تھا تو دبلا پتلا اس کی ہڈیاں لوہے کی تھیں۔ بادل بوندی، سردی گرمی جھیلتے جھیلتے اس کے اعضا سخت اور مضبوط ہو گئے تھے۔ بھیرو کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا کوئی آہنی شکنجہ ہے۔ بہت زور مارتا تھا مگر شکنجہ ذرا ڈھیلا نہ ہوتا تھا۔ سوبھاگی نے موقع پایا تو بھاگی اب بھیرو زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ محلّہ والے یہ شور سن کر آپہنچے۔ نایک رام نے مذاقاً کہا۔ "کیوں سورداس۔ اچھی صورت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں کیا؟ محلّہ ہی میں؟"

سورداس : پنڈا جی تمھیں دل لگی سوجھی ہے اور یہاں منہ میں کالکھ لگائی جا رہی ہے۔ اندھا تھا، اپاہج تھا، بھکاری تھا، نیچ تھا، پر چوری بدمعاشی کے الجام (الزام) سے تو بچا ہوا تھا۔ آج وہ الجام بھی لگ گیا۔

بجرنگی : آدمی جیسا آپ ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا ہے۔

بھیرو : تم کہاں کے بڑے سادھو ہو؟ ابھی آج ہی لاٹھی چلاکر آئے ہو۔ میں دو سال سے دیکھ رہا ہوں۔ میری گھر والی اس سے آکر اکیلے میں گھنٹوں باتیں کرتی ہے۔ جگدھر نے بھی اس کو یہاں سے رات میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ آج ابھی اسی کے پیچھے مجھ سے یہ لڑنے پر تیار تھا۔

نایک رام : شبہ ہونے کی بات ہی ہے۔ اندھا آدمی دیوتا تھوڑا ہی ہوتا ہے اور پھر دیوتا لوگ بھی تو کام دیو کے بان سے نہیں بچے۔ سورداس تو پھر بھی آدمی ہے اور ابھی عمر ہی کیا ہے۔

ٹھاکر دین : مہاراج! کیوں اندھے کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ چلو کچھ بھجن کیرتنا ہو۔

نایک رام : تمھیں بھجن کی سوجھتی ہے یہاں ایک بھلے آدمی کی عزت کا معاملہ آپڑا ہے۔ بھیرو ہماری ایک بات مانو تو کہیں۔ تم سوبھاگی کو مارتے بہت ہو اس سے اس کا دل تم سے نہیں ملتا۔ ابھی دوسرے دن باری آتی ہے۔ اب مہینہ میں دو بار سے زیادہ نہ آنے پاوے۔

بھیرو دیکھ رہا تھا کہ مجھے لوگ بنا رہے ہیں۔ بگڑ کر بولا۔ ''اپنی عورت ہے مارتے پیٹتے ہیں تو کسی کا ساجھا ہے۔ جو گھوڑے پر کبھی سوار ہی نہیں ہوا وہ دوسرے کو سوار ہونا کیا سکھائے گا؟ وہ کیا جانے عورت کیسے قابو میں رہتی ہے۔''

یہ طنز نایک رام پر تھا۔ جس کی شادی ہنوز نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں دولت تھی۔ ججمانوں کی بدولت کسی بات کی فکر نہ تھی پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی شادی ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ وہ ہزار پانچ سو روپے سے غم کھانے کو تیار تھا لیکن کہیں ڈول نہ لگتا تھا۔ بھیرو نے سمجھا تھا نایک رام دل میں کٹ جائیں گے مگر وہ چھنٹا ہوا شہری گنڈا ایسے طنزوں کو کب خیال میں لاتا بولا۔ ''کہو بجرنگی! اس کا کچھ جواب دو عورت کیسے بس میں رہتی ہے؟''

بجرنگی : مار پیٹ سے ننھا سا لڑکا تو بس میں آتا ہی نہیں۔ عورت کیا بس میں آئے گی؟

بھیرو : بس میں تو آئے عورت کا باپ۔ عورت کس کھیت کی مولی ہے؟ مار سے تو بھوت بھاگتا ہے۔

بجرنگی : تو عورت بھی بھاگ جائے گی مگر قابو میں نہ آئے گی۔

نایک رام : بہت اچھی کہی بجرنگی۔ بہت پکی کہی۔ واہ واہ۔ مار سے بھوت بھاگتا ہے تو عورت بھی بھاگ جائے گی۔ اب تو کٹ گئی تمھاری بات۔

بھیرو : بات کیا کٹ جائے گی دل لگی ہے؟ چونے کو جتنا ہی کوٹو اتنا ہی چمٹتا ہے۔

جگدھر : یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عورت اپنی طبیعت سے بس میں آتی ہے اور کسی طرح نہیں۔

نایک رام : کیوں بجرنگی ہے کوئی جواب؟

ٹھاکردین : پنڈا جی تم دونوں کو لڑا کر تبھی آرام لوگے۔ بیچارے اپاہج آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔

نایک رام : تم سورداس کو کیا سمجھتے ہو۔ یہ دیکھنے ہی میں اتنے دبلے پتلے ہیں۔ ابھی ہاتھ ملاؤ تو معلوم ہو۔ بھیرو! اگر انھیں پچھاڑ دو تو پانچ روپے انعام دوں۔

بھیرو : نکل جاؤ گے۔

نایک رام : نکلنے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ یہ دیکھو ٹھاکر دین کے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں۔

جگدھر : کیا تاکتے ہو بھیرو؟ لے پڑو۔

سورداس : میں نہیں لڑتا۔

نایک رام : سورداس دیکھو نام ہنسائی مت کراؤ۔ مرد ہو کر لڑنے سے ڈرتے ہو۔ ہار ہی جاؤ گے یا اور کچھ؟

سورداس : لیکن بھائی۔ میں داؤں پیچ نہیں جانتا۔ پیچھے سے یہ نہ کہنا کہ ہاتھ کیوں پکڑا میں جیسے چاہوں گا لڑوں گا۔

جگدھر : ہاں ہاں تم جیسے چاہنا ویسے لڑنا۔

سورداس : اچھا تو آؤ۔ کون آتا ہے؟

نایک رام : اندھے آدمی کا جیوٹ دیکھنا۔ چلو بھیرو۔ آؤ میدان میں۔

بھیرو : اندھے سے کیا لڑوں!

نایک رام : بس اسی پر اتنا اکڑتے تھے؟

جگدھر : نکل آؤ بھیرو۔ ایک جھپٹ میں تو مار لوگے۔

بھیرو : تمھیں کیوں نہیں لڑ جاتے؟ تمھیں انعام لے لینا۔

جگدھر کو روپوں کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ کنبہ بڑا ہونے کے سبب کسی طرح چول نہ بیٹھتی تھی۔ گھر میں ایک نہ ایک چیز گھٹی ہی رہتی تھی۔ روپیہ کمانے کی کسی تدبیر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ بولا "کیوں سورداس! ہم سے لڑو گے۔

سورداس : تمھیں آ جاؤ۔ کوئی سہی۔

جگدھر : کیوں پنڈا جی۔ انعام دو گے نا۔

نایک رام : انعام تو بھیرو کے لیے تھا۔ لیکن کوئی ہرج نہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ایک ہی جھپٹ میں گرا دو۔

جگدھر نے دھوتی اوپر چڑھائی اور سورداس سے لپٹ گیا۔ سورداس نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی اور اتنے زور سے کھینچا کہ جگدھر دھم سے گر پڑا۔ چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔ بجرنگی بولا "واہ سورداس واہ" نایک رام نے دوڑ کر اس کی

پیٹھ ٹھونکی۔

بھیرو: مجھے تو کہتے تھے ایک ہی جھپٹ میں گرا دو گے اب تم کیسے گر گئے۔

جگدھر: سورداس نے ٹانگ پکڑ لی نہیں تو کیا گرا دیتا۔ وہ اڑنگا مارتا کہ چاروں شانے چت گر جاتا۔

نایک رام: اچھا تو ایک بازی اور ہو جائے۔

جگدھر: ہاں ہاں۔ اب کی دیکھنا۔

دونوں سورماؤں نے پھر زور آزمائی شروع کی۔ سورداس نے اب کے جگدھر کا ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ آہ آہ کرتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ سورداس نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور گردن پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے ایسا دبوچا کہ جگدھر کی آنکھیں نکل آئیں۔ نایک رام نے دوڑ کر سورداس کو ہٹا دیا۔ بجرنگی نے جگدھر کو اٹھا کر بیٹھایا اور ہوا کرنے لگا۔ بھیرو نے بگڑ کر کہا: ”یہ کوئی کشتی ہے کہ جہاں پکڑ پایا وہیں دھر دبایا۔ یہ تو گنواروں کی لڑائی ہے کشتی تھوڑا ہی ہے۔“

نایک رام: یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔

جگدھر سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور چپکے سے سرک گیا۔ بھیرو بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا۔ ان کے جانے کے بعد وہاں خوب قہقہے مچے۔ اور سورداس کو خوب خوب شاباشی دی گئی۔ سب کو تعجب تھا کہ سورداس جیسا نحیف شخص جگدھر جیسے موٹے تازے آدمی کو کس طرح دبا بیٹھا۔ ٹھاکردین جادو منتر کا قائل تھا۔ بولا ”سورداس پر ضرور کسی دیوتا کا سایہ ہے۔ ہم کو بھی بتاؤ سورداس! کون سا منتر جگایا تھا؟“

سورداس: سو منتروں کا منتر ہے ہمت۔ یہ روپے جگدھر کو دے دینا نہیں تو میری بھلائی نہیں ہے۔

ٹھاکر دین: روپے کیوں دے دوں؟ کوئی لوٹ ہے؟ تم نے باجی (بازی) ماری ہے۔ تمھیں کو ملیں گے۔

نایک رام: اچھا سورداس! ایمان سے بتادو۔ سوبھاگی کو کس منتر سے بس میں کیا؟ اب تو یہاں سب لوگ اپنے ہی ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں بھی کہیں کانپا لگاؤں۔

سورداس نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”پنڈا جی۔ اگر تم بھی مجھ سے ایسی باتیں

کروگے تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں گا۔ میں پرائی عورت کو اپنی ماں، بہن، یا بیٹی سمجھتا ہوں۔ جس دن میرا من اتنا چنچل ہو جائے گا۔ اس دن تم مجھے جیتا نہ دیکھوگے۔" یہ کہہ کر سورداس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ذرا دیر میں آواز سنبھال کر بولا۔ "بھیرو روز اس کو مارتا ہے۔ بیچاری کبھی-کبھی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا قصور اتنا ہی ہے کہ میں اس کو دتکار نہیں دیتا۔ اس کے لیے چاہے کوئی مجھ کو بدنام کرے چاہے جو الزام لگائے۔ میرا جو دھرم تھا وہ میں نے کیا۔ بدنامی کے ڈر سے جو آدمی دھرم سے منہ پھیر لے وہ آدمی نہیں ہے۔"

بجرنگی : تمھیں ہٹ جانا تھا۔ اس کی عورت تھی۔ مارتا چاہے پیٹتا تم سے مطلب۔

سورداس : بھیا! آنکھوں دیکھ کر نہیں رہا جاتا۔ یہ تو سنسار کا بیوہار ہے۔ پر اتنی سی بات پر کوئی اتنابڑا کلنک تو نہیں لگا دیتا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ آج مجھے جتنا دکھ ہو رہا ہے۔ اتنا دادا کے مرنے پر بھی نہ ہوا تھا۔ میں اپاہج دوسروں کے ٹکرے کھانے والا اور مجھ پر یہ کلنک! (رونے لگا)۔

نایک رام : تو روتے کیا ہو۔ بھلے آدمی! اندھے ہو تو کیا مرد نہیں ہو؟ مجھ پر تو کوئی ایسا کلنک لگاتا تو میں اور خوش ہوتا۔ یہ ہزاروں آدمی جو تڑکے گنگا نہانے جاتے ہیں۔ وہاں نظر بازی کے سوا اور کیا کرتے ہیں۔ مندروں میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ میلوں ٹھیلوں میں بھی یہی بہار رہتی ہے۔ یہی تو مردوں کا کام ہے۔ اب سرکار کے راج میں لاٹھی تلوار کا تو کہیں نام نہیں رہا۔ ساری مردی اسی نظر بازی میں رہ گئی ہے۔ اس کی کیا چنتا (فکر) چلو بھگوان کا بھجن کرو۔ سب دکھ دور ہو جائے گا۔

بجرنگی کو اندیشہ تھا۔ "آج کی مار پیٹ کا نہ جانے کیا پھل ہو۔ کل پولیس دروازہ پر آجائے گی غصہ حرام ہوتا ہے۔"

نایک رام نے تشفی کی۔ "بھلے آدمی! پولیس سے کیا ڈرتے ہو؟ کہو تھانہ دار کو بلا کر نچاؤں۔ کہو انسپکڑ کو بلا کر چپتیاؤں۔ بے فکر ہوکر رہو۔ کچھ نہ ہونے پائے گا تمھارا بال بھی بانکا ہوجائے تو میرا ذمہ۔"

ہر سہ اشخاص یہاں سے چلے۔ دیاگر پہلے ہی سے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کئی گاڑی بان اور بنئے بھی آبیٹھے تھے۔ ذرا دیر میں بھجن کی تانیں اٹھنے لگیں۔ سورداس

اپنے تفکرات بھول گیا۔ مست ہو کر گانے لگا۔ کبھی وجد میں آکر ناچتا۔ اچھلنے کودنے لگتا۔ کبھی روتا اور کبھی ہنستا۔ محفل برخاست ہوئی تو سب لوگ خوش تھے۔ دل صاف تھے کدورت مٹ گئی تھی۔ گویا کسی دلکش فضا کی سیر کر کے آئے ہوں۔ سورداس تو مندر کے چبوترے ہی پر لیٹا۔ باقی لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سورداس کو انھیں تفکرات نے پھر آ گھیرا۔ "میں کیا جانتا تھا کہ بھیرو کے دل میں میری طرف سے اتنا میل ہے نہیں تو سوبھاگی کو اپنے جھونپڑے میں آنے ہی کیوں دیتا جو سنے گا وہی مجھ پر تھوکے گا۔ لوگوں کو ایسی باتوں پر کتنی جلدی یقین ہو جاتا ہے۔ محلّہ میں کوئی اپنے دروازہ پر کھڑا نہ ہونے دے گا۔ اونھ! بھگوان تو سب کے من کی بات جانتے ہیں۔ آدمی کا دھرم ہے۔ جب کسی کو دکھ میں دیکھے تو اسے تسلی دے۔ اگر اپنا دھرم پالنے میں بھی کلنک لگتا ہے تو بھلے ہی لگے۔ اس کے لیے کہاں تک روؤں۔ کبھی نہ کبھی تو لوگوں کو میرے دل کا حال معلوم ہی ہو جائے گا۔"

مگر جگدھر اور بھیرو دونوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جگدھر کہتا تھا۔ "میں نے تو سمجھا کہ پانچ روپے سچ ہی مل جائیں گے۔ نہیں تو کیا کتے نے کاٹا تھا کہ اس سے بھڑنے جاتا؟ آدمی کا ہے کو ہے لوہا ہے۔"

بھیرو : میں اس کی طاقت آزما چکا ہوں۔ ٹھاکردین سچ کہتا ہے۔ اسے کسی دیوتا کا اشٹ ہے۔

جگدھر : اشٹ وشٹ کچھ نہیں۔ یہ سب بے فکری ہے۔ ہم تم گرہست کے جنجال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نمک، تیل، لکڑی، کی فکر سر پر سوار رہتی ہے۔ گھاٹے نفع کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ اس کو کون فکر ہے؟ مزہ سے جو کچھ مل جاتا ہے کھاتا ہے اور میٹھی نیند سوتا ہے۔ ہم کو روٹی دال بھی دونوں بکھت (وقت) نصیب نہیں ہوتی۔ اسے کیا کمی ہے۔ کسی نے چاول دیے۔ کہیں سے مٹھائی پا گیا۔ گھی دودھ بجرنگی کے گھر سے مل ہی جاتا ہے۔ بل تو کھانے سے ہوتا ہے۔

بھیرو : نہیں یہ بات نہیں ہے۔ نشہ کھانے سے بل کا ناس ہو جاتا ہے۔

جگدھر : کیسی الٹی باتیں کرتے ہو۔ ایسا ہوتا تو فوج میں گوروں کو برانڈی کیوں پلائی جاتی؟ انگریز سبھی شراب پیتے ہیں تو کیا کمزور ہوتے ہیں؟

بھیرو : آج سوبھاگی آئے گی تو گلا گھونٹ دوں گا۔
جگدھر : کسی کے گھر میں چھپی بیٹھی ہو گی۔
بھیرو : اندھے نے میری آبرو بگاڑ دی۔ برادری میں یہ بات پھیلے گی تو حقہ بند ہو جائے گا۔ بھوج دینا پڑے گا۔
جگدھر : تمھیں تو ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔ یہ نہیں ٹپکنی کھائی تھی تو چپکے سے گھر چلے آتے۔ سوبھاگی گھر آتی تو اس سے سمجھ لیتے۔ تم لگے وہیں دہائی دینے۔
بھیرو : اس اندھے کو میں ایسا کپٹی نہ سمجھتا تھا نہیں تو اب تک کبھی اس کو مزہ چکھا چکا ہوتا۔ اب اس چڑیل کو گھر میں نہ رکھوں گا۔ چمار کے ہاتھوں یہ بے آبروئی۔
جگدھر : اب اس سے بڑی اور کیا بدنامی ہو گی؟ گلا کاٹنے کا کام کیا ہے۔
بھیرو : بس یہی جی میں آتا ہے چل کر ایک گنڈا سا مار کر کام تمام کردوں لیکن نہیں۔ میں اسے گھلا گھلا کر ماروں گا۔ سو بھاگی کا دکھ نہیں ہے۔ سارا طوفان اسی عیبی اندھے کا کھڑا کیا ہوا ہے۔
جگدھر : دکھ دونوں کا ہے۔
بھیرو : لیکن چھیڑ چھاڑ تو پہلے مرد ہی کرتا ہے۔ اس سے تو اب مجھے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جہاں چاہے جائے۔ جیسے چاہے رہے۔ مجھے تو اب اسی اندھے سے بھگتنا ہے۔ صورت سے کیسا گریب (غریب) جان پڑتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں۔ اور من میں اتنا کپٹ بھرا ہوا ہے۔ بھیک مانگتے دن جاتے ہیں اس پر بھی ابھاگے کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ جگدھر! اس نے میرا سر نیچا کر دیا۔ میں دوسروں پر ہنسا کرتا تھا۔ اب دنیا مجھ پر ہنسے گی۔ مجھے سب سے بڑا ملال تو یہ ہے کہ ابھاگن گئی بھی تو چمار کے ساتھ گئی۔ اگر کسی ایسے آدمی کے ساتھ جاتی جو جات پات میں، دیکھنے سننے میں، دھن دولت میں، مجھ سے بڑھ کر ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔ جو سنے گا اپنے من میں یہی کہے گا کہ میں اس اندھے سے بھی گیا بیتا ہوں۔
جگدھر : عورتوں کا سو بھاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہیں تو کہاں تم اور کہاں وہ اندھا منہ پر مکھیاں بھنکا کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جوتے کھا کر آیا ہے۔
بھیرو : اور بے حیا کتنا بڑا ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ اندھا ہے۔ پر جب دیکھو ہنستا ہی رہتا

ہے۔ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا؟

جگدھر: گھرمیں روپے گڑے ہیں۔ روئے اس کی بلا۔ بھیک تو دکھانے کو مانگتا ہے۔

بھیرو: اب روئے گا۔ ایسا رلاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

یوں تو باتیں کرتے کرتے دونوں اپنے اپنے گھر گئے رات کو دو بجے ہوں گے کہ یکایک سورداس کی جھونپڑی سے آگ کا شعلہ بلند ہوا۔ لوگ اپنے اپنے دوازہ پر سو رہے تھے۔ حالتِ خواب میں بھی باطنی حواس بیدار رہتے ہیں۔ دم کے دم میں سینکڑوں آدمی جمع ہوگئے۔ آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان کی طرف دوڑنے لگے۔ کبھی ان کی صورت کسی مندر کے سنہرے کلس کی سی ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ ہوا کے جھونکوں سے اس طرح کانپنے لگتے تھے جیسے پانی میں چاند کا عکس۔ آگ بجھانے کی تدبیر کی جا رہی تھی۔ لیکن جھونپڑے کی آگ آتش حسد کی طرح کبھی نہیں بجھتی۔ کوئی پانی لا رہا تھا۔ کوئی یوں ہی شور مچا رہا تھا۔ لیکن زیادہ تر لوگ خاموش کھڑے مایوسانہ نظروں سے یہ آگ کا جلنا دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی عزیز یا دوست کی چتا کی آگ ہو۔

دفعتاً سورداس دوڑا ہوا آیا اور چپ چاپ آگ کی روشنی میں کھڑا ہوگیا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ "یہ آگ کیسے لگی۔ سورداس؟ چولھے میں تو آگ نہیں چھوڑ دی تھی؟"

سورداس: جھونپڑے میں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

بجرنگی: اب تو اندر باہر سب ایک ہوگیا۔ دیواریں جل رہی ہیں۔

سورداس: کسی طرح بھی نہیں جا سکتا؟

بجرنگی: کیسے جاؤ گے؟ دیکھتے نہیں ہو۔ یہاں تک لپٹیں آرہی ہیں۔

جگدھر: سورداس! کیا آج چولھا نہیں ٹھنڈا کیا تھا؟

نایک رام: چولھا ٹھنڈا کیا ہوتا تو دشمنوں کا کلیجا کیسے ٹھنڈا ہوتا؟

جگدھر: پنڈاجی! میرا لڑکا کام نہ آئے۔ اگر مجھے کچھ بھی معلوم ہو۔ تم مجھ پر ناحق شبہ کرتے ہو۔

نایک رام: میں جانتا ہوں جس نے آگ لگائی ہے۔ بگاڑ نہ دوں گا تو کہنا۔

ٹھاکر دین: تم کیا بگاڑوگے؟ بھگوان آپ ہی بگاڑ دیں گے۔ اسی طرح جب میرے گھر

میں چوری ہوئی تھی تو سب سوا ہا ہو گیا تھا۔

جگدھر : جس کے من میں اتنی کھوٹ ہو۔ بھگوان اس کا ستیاناس کر دیں۔

سورداس : اب تو لپٹ نہیں آتی؟

بجرنگی : ہاں پھوس جل گیا ہے اب دھرن جل رہی ہے۔

سورداس : اب تو اندر جا سکتا ہوں؟

نایک رام : اندر تو جا سکتے ہو پر باہر نہیں نکل سکتے۔ اب چلو آرام سے سو رہو جو ہونا تھا ہو گیا۔ پچھتانے سے کیا ہوگا؟

سورداس : ہاں سو رہوں گا۔ جلدی کیا ہے؟

تھوڑی دیر میں بچی کچھی آگ بھی بجھ گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اور کسی کے گھر میں آگ نہ لگی۔ سب لوگ اس سانحہ پر رائے زنی کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ سناٹا چھا گیا۔ لیکن سورداس اب بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے جھونپڑے کے جل جانے کا غم نہ تھا۔ برتن وغیرہ کے بھی جل جانے کا غم نہ تھا۔ غم تھا اس پوٹلی کا جو اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ جس پر اس کی زندگی کی ساری تمناؤں کا انحصار تھا۔ جو اس کی ساری تکلیفوں اور التجاؤں کا ماحصل تھی۔ یہ چھوٹی سی پوٹلی اس کی، اس کے بزرگوں کی، اس کے نام لیوا لوگوں کی نجات کا ذریعہ تھی۔ یہی اس کے لوک اور پرلوک، دین و دنیا کی امیدوں کی شمع فروزاں تھی۔ اس نے سوچا۔ ”پوٹلی کے ساتھ روپے تھوڑے ہی جل گئے ہوں گے۔ اگر روپے پگھل بھی گیے ہوں گے۔ تو چاندی کہاں جائے گی؟ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں تو یہیں نہ سوتا۔ پہلے تو کوئی جھونپڑی کے پاس آتے ہی نا۔ اور اگر آگ لگاتا تو پوٹلی کو پہلے ہی نکال لیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں روپیوں کو رکھنا ہی نہ چاہیے تھا۔ پر رکھتا کہاں؟ محلّہ میں ایسا کون ہے جسے رکھنے کو دیتا، ہائے پورے پانچ سو روپے تھے۔ کچھ پیسے اوپر اوپر ہو گئے تھے۔ کیا اسی دن کے لیے پیسے پیسے بٹور رہا تھا؟ کھا لیا ہوتا تو کچھ تسکین ہوتی۔ کیا سوچتا تھا اور کیا ہوا۔ گیا جی جاکر پتروں کو پنڈ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اب ان سے کیسے گلا چھوٹے گا؟ سوچتا تھا کہیں مٹھوا کی سگائی ٹھہر جائے تو کر ڈالوں۔ بہو گھر میں آجائے تو ایک روٹی کھانے کو ملے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کر کھاتے ایک جگ بیت گیا۔ بڑی

بھول ہوئی۔ چاہئے تھا کہ جیسے جیسے ہاتھوں میں روپے آتے ایک ایک کام پورا کرتا جاتا۔ بہت پاؤں پھیلانے کا یہی پھل ہے۔"

اس وقت راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔سورداس انکل سے دروازہ کی طرف سے جھونپڑی میں گھسا۔ پر دو تین قدم کے بعد دفعتاً پاؤں بھوبل میں پڑ گیا۔ اوپر راکھ تھی لیکن نیچے آگ۔ سورداس نے فوراً پاؤں کھینچ لیا اور اپنی لکڑی سے راکھ کو الٹنے پلٹنے لگا کہ نیچے کی آگ بھی جلد ہی راکھ ہو جائے۔ آدھ گھنٹہ میں اس نے ساری آگ نیچے سے اوپر کر دی اور پھر ڈرتے ڈرتے راکھ میں پیر رکھا۔ راکھ گرم تھی مگر ناقابل برداشت نہ تھی۔ اس نے ٹھیک اسی مقام کی سیدھ میں راکھ کو ٹٹولنا شروع کیا جہاں چھپر میں پوٹلی رکھی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ روپے ملیں یا نہ ملیں پر چاندی تو کہیں گئی ہی نہیں ہے۔ یکایک وہ اچھل پڑا۔ کوئی بھاری چیز ہاتھ لگی اسے اٹھا لیا۔ پر ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اینٹ کا ٹکڑا ہے۔ پھر ٹٹولنے لگا۔ جیسے کوئی شخص پانی میں مچھلیاں ٹٹولتا ہے۔ کوئی چیز ہاتھ نہ لگی۔ پھر تو اس نے مایوسانہ عجلت اور اضطراب کے ساتھ ساری راکھ چھان ڈالی۔ ایک ایک مٹھی راکھ ہاتھ میں لے کر دیکھی۔ لوٹا ملا توا ملا پر پوٹلی نہ ملی ۔ اس کا وہ پیر جو اب تک سیڑھی پر تھا۔ پھسل گیا اور اب وہ اتھاہ گہرائی میں جا پڑا۔ اس کے منہ سے دفعتاً ایک چیخ نکل گئی۔ وہ وہیں راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔ یہ پھوس کی راکھ نہ تھی۔ اس کی تمناؤں کی راکھ تھی اپنی بے بسی پر اس کو اتنا رنج کبھی نہ ہوا تھا۔

تڑکا ہو گیا۔ سورداس اب راکھ کے ڈھیر کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ امید سے زیادہ سخت جان اور کوئی چیز دنیا میں نہیں ہوتی۔

اسی وقت جگدھر آکر بولا۔ "سورداس سچ کہنا تمھیں مجھ پر تو شبہ نہیں ہے؟"

سورداس کو شبہ تو تھا پر اس نے اسے چھپا کر کہا۔ "تمھارے اوپر کیوں شبہ کروں گا۔ تم سے میری کون سی عداوت تھی؟"

جگدھر: محلہ والے تمھیں بھڑکائیں گے۔ پر میں بھگوان کو ساکھی بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

سورداس: اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ کون جانے کسی نے لگا دی یا کسی کی چلم سے

اڑ کر لگ گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چولھے میں آگ رہ گئی ہو بلا جانے بوجھے کس پر شبہا کروں۔

جگدھر : اسی سے تمھیں جتا دیا کہ کہیں شبہے میں میں بھی نہ مارا جاؤں۔

سورداس : تمھاری طرف سے میرا دل صاف ہے۔

جگدھر کو بھیرو کی باتوں سے اب یقین ہو گیا کہ یہ اسی کی شرارت ہے۔ اس نے سورداس کو رلانے کی بات کہی تھی۔ اس دھمکی کو اس طرح پورا کیا۔ وہ یہاں سے سیدھا بھیرو کے پاس گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ لیکن چہرہ سے پریشانی اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی جگدھر کو دیکھتے ہی بولا۔ "کچھ سنا۔ لوگ کیا بات چیت کر رہے ہیں؟"

جگدھر : سب لوگ تمھارے اوپر سبھا (شبہ) کرتے ہیں۔ نایک رام کی دھمکی تو تم نے اپنے کانوں سنی۔

بھیرو : مجھے ایسی دھمکیوں کی پرواہ نہیں ہے۔ ثبوت کیا ہے کہ میں نے آگ لگائی؟

جگدھر : سچ کہو۔ تمھیں نے لگائی؟

بھیرو : ہاں چپکے سے ایک دیا سلائی لگا دی۔

جگدھر : میں کچھ کچھ پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ پر یہ تم نے برا کیا۔ جھونپڑی جلانے سے کیا ملا؟ دو چار دن میں پھر دوسری جھونپڑی تیار ہو جائے گی۔

بھیرو : کچھ ہو! دل کی آگ تو ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ دیکھو۔

یہ کہہ کر اس نے ایک تھیلی دکھائی جس کا رنگ دھوئیں سے سیاہ ہو گیا تھا۔ جگدھر نے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟ ارے اس میں تو روپے بھرے ہوئے ہیں۔"

بھیرو : یہ سوبھاگی کو بہکا لے جانے کا جریانہ (جرمانہ) ہے۔

جگدھر : سچ بتاؤ یہ روپے کہاں ملے؟

بھیرو : اسی جھونپڑی میں بڑے جتن سے دھرن کی آڑ میں رکھے ہوئے تھے۔ پاجی روز راہگیروں کو ٹھگ ٹھگ کر پیسے لاتا تھا۔ اور اسی تھیلی میں رکھتا تھا۔ میں نے گنے ہیں۔ پانچ سو روپے سے اوپر ہیں۔ نہ جانے کیسے اتنے روپے جمع ہو گئے۔ بچہ کو انھیں روپیوں کی گرمی تھی۔ اب گرمی نکل گئی۔ اب دیکھوں کس بل پر اچھلتا ہے۔ برادری

کو بھوج دینے کا سامان ہوگیا۔ نہیں تو اس بکھت (وقت) اتنے روپے کہاں ملتے؟ آج کل تو دیکھتے ہو۔ بلم ٹیروں کے مارے بکری کتنی مندی ہے۔

جگدھر : میری تو صلاح ہے کہ روپے اس کو لوٹا دو۔ بڑی مسکت (مشقت) کی کمائی ہے۔ ہضم نہ ہوگی۔

جگدھر دل کا کھوٹا نہیں تھا۔ پر اس وقت اس نے یہ صلاح نیک نیتی سے نہیں حسد سے دی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ بھیرو کے ہاتھ اتنے روپے لگ جائیں۔ بھیرو نصف روپے اسے دے دیتا تو شاید اس کو تسکین ہو جاتی۔ مگر بھیرو سے یہ امید نہ کی جا سکتی تھی۔ بے پروائی سے بولا۔ ”مجھے اچھی طرح ہجم (ہضم) ہو جائے گی۔ ہاتھ میں آئے ہوئے روپے کو لوٹا نہیں سکتا۔ اس نے بھیک ہی مانگ کر تو جمع کیا ہے۔ گیہوں تو نہیں تولا تھا؟“

جگدھر : پولیس سب کھا جائے گی۔

بھیرو : سورداس پولیس میں نہ جائے گا۔ رو دھو کر چپ ہو رہے گا۔

جگدھر : گریب (غریب) کی ہائے بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔

بھیرو : وہ گریب ہے۔ اندھا ہونے ہی سے گریب ہوگیا؟ جو آدمی دوسروں کی عورتوں پر ڈورے ڈالے۔ جس کے پاس سیکڑوں روپے جمع ہوں۔ جو دوسروں کو روپے ادھار دیتا ہو۔ وہ گریب ہے؟ گریب جو کہو تو ہم تم ہیں۔ گھر بھر میں ڈھونڈ آؤ۔ ایک پورا روپیہ نہ نکلے گا۔ ایسے پاپیوں کو گریب نہیں کہتے۔ اب بھی میرے دل کا کانٹا نہیں نکلا۔ جب تک اسے روتے نہ دیکھوں گا۔ یہ کانٹا نہ نکلے گا۔ جس نے میری آبرو بگاڑ دی اس کے ساتھ جو چاہے کروں مجھے پاپ نہیں لگ سکتا۔

جگدھر کا دل آج خوانچہ لے کر گلیوں کا چکر لگانے میں نہ تھا۔ چھاتی پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ اسے دم کی دم میں اتنے روپے مل گئے۔ اب موج اڑائے گا۔ تقدیر اس طرح کھلتی ہے۔ یہاں کبھی پڑا ہوا پیسہ بھی نہ ملا۔ پاپ پن کی کوئی بات نہیں۔ میں ہی کون دن بھر پن کیا کرتا ہوں۔ دمڑی، چھدام، کوڑیوں، کے لیے ٹنی مارتا ہوں۔ باٹ کھوٹے رکھتا ہوں۔ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچتا ہوں۔ ایمان گنوانے پر بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ جانتا ہوں یہ برا کام ہے۔ پر بال بچوں کو پالنا بھی تو ضروری ہے۔ اس

نے ایمان کھویا تو کچھ لے کر کھویا۔ گناہ بے لذت نہیں رہا۔ اب وہ تین دوکانوں کا ٹھیکہ لے لے گا۔ ایسا ہی کوئی مال میرے ہاتھ بھی پڑ جاتا تو جنم سپھل ہو جاتا۔"

جگدھر کے دل میں حسد نے جگہ کی۔ وہ بھیرو کے گھر سے لوٹا تو دیکھا کہ سورداس راکھ بٹور کر اسے آٹا کی طرح گوندھ رہا ہے۔ سارا جسم راکھ سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور پسینہ خوب بہہ رہا ہے۔ بولا۔ "سورداس! کیا ڈھونڈ تے ہو؟"

سورداس: کچھ نہیں یہاں رکھتا ہی کیا تھا۔ یہی لوٹا تو ا دیکھ رہا تھا۔

جگدھر: اور وہ تھیلی کس کی ہے جو بھیرو کے پاس ہے؟

سورداس چونکا۔ کیا اسی لیے بھیرو آیا تھا؟ ضرور یہی بات ہے؟ گھرمیں آگ لگانے سے پہلے روپے نکال لیے ہوں گے۔

لیکن اندھے بھکاری کے لیے مفلسی اتنی شرم کی بات نہیں ہے۔ جتنی دولت مندی۔ سورداس جگدھر سے اپنے مالی نقصان کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مٹھوا کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ کنواں بنوانا چاہتا تھا۔ مگر اس انداز سے کہ لوگوں کو تعجب ہو کہ اس کے پاس روپے کہاں سے آئے اور لوگ، یہی سمجھیں کہ بھگوان ہی محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ بھکاریوں کے لیے دولت کا جمع کرنا گناہ گاری سے کم ذلت کی بات نہیں ہے۔ بولا۔ "میرے پاس تھیلی ویلی کہاں؟ ہوگی کسی کی۔ تھیلی ہوتی تو بھیک کیوں مانگتا۔

جگدھر: مجھ سے اڑتے ہو بھیرو مجھ سے خود کہہ رہا تھا کہ جھونپڑے میں دھرن کے اوپر یہ تھیلی ملی پانچ سو روپے سے کچھ بیسی ہے۔

سورداس: وہ تم سے ہنسی کرتا ہوگا۔ ساڑھے پانچ روپے تو کبھی اکٹھے ہی نہیں ہوئے۔ ساڑھے پانچ سو کہاں سے آتے؟

اتنے میں سوبھاگی وہاں آ پہنچی۔ رات بھرمندر کے پیچھے امرود کے باغ میں چھپی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آگ بھیرو نے لگائی ہے۔ بھیرو نے اس پر جو تہمت لگائی تھی۔ اس کی اسے خاص فکر نہ تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہ آئے گا۔ لیکن میری خاطر سورداس یوں تباہ ہوا۔ بس کا اسے بے حد ملال تھا۔ وہ اس وقت اس کی تشفی کرنے آئی تھی۔ جگدھر کو وہاں کھڑے دیکھا تو جھجکی خوف ہوا کہ

کو بھوج دینے کا سامان ہوگیا۔ نہیں تو اس بکھت(وقت) اتنے روپے کہاں ملتے؟ آج کل تو دیکھتے ہو۔ بلم ٹیروں کے مارے بکری کتنی مندی ہے۔

جگدھر: میری تو صلاح ہے کہ روپے اس کو لوٹا دو۔ بڑی مسکت (مشقت) کی کمائی ہے۔ ہضم نہ ہوگی۔

جگدھر دل کا کھوٹا نہیں تھا۔ پر اس وقت اس نے یہ صلاح نیک نیتی سے نہیں حسد سے دی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ بھیرو کے ہاتھ اتنے روپے لگ جائیں۔ بھیرو نصف روپے اسے دے دیتا تو شاید اس کو تسکین ہو جاتی۔ مگر بھیرو سے یہ امید نہ کی جا سکتی تھی۔ بے پروائی سے بولا۔ "مجھے اچھی طرح ہجم(ہضم) ہو جائے گی۔ ہاتھ میں آئے ہوئے روپے کو لوٹا نہیں سکتا۔ اس نے بھیک ہی مانگ کر تو جمع کیا ہے۔ گیہوں تو نہیں تولا تھا؟"

جگدھر: پولیس سب کھا جائے گی۔

بھیرو: سورداس پولیس میں نہ جائے گا۔ رو دھو کر چپ ہو رہے گا۔

جگدھر: گریب(غریب) کی ہائے بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔

بھیرو: وہ گریب ہے۔ اندھا ہونے ہی سے گریب ہوگیا؟ جو آدمی دوسروں کی عورتوں پر ڈورے ڈالے۔ جس کے پاس سیکڑوں روپے جمع ہوں۔ جو دوسروں کو روپے ادھار دیتا ہو۔ وہ گریب ہے؟ گریب جو کہو تو ہم تم ہیں۔ گھر بھر میں ڈھونڈ آؤ۔ ایک پورا روپیہ نہ نکلے گا۔ ایسے پاپیوں کو گریب نہیں کہتے۔ اب بھی میرے دل کا کانٹا نہیں نکلا۔ جب تک اسے روتے نہ دیکھوں گا۔ یہ کانٹا نہ نکلے گا۔ جس نے میری آبرو بگاڑ دی اس کے ساتھ جو چاہے کروں مجھے پاپ نہیں لگ سکتا۔

جگدھر کا دل آج خوانچہ لے کر گلیوں کا چکر لگانے میں نہ تھا۔ چھاتی پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ اسے دم کی دم میں اتنے روپے مل گئے۔ اب موج اڑائے گا۔ تقدیر اس طرح کھلتی ہے۔ یہاں کبھی پڑا ہوا پیسہ بھی نہ ملا۔ پاپ پن کی کوئی بات نہیں۔ میں ہی کون دن بھر پن کیا کرتا ہوں۔ دمڑی، چھدام، کوڑیوں، کے لیے ٹینی مارتا ہوں۔ باٹ کھوٹے رکھتا ہوں۔ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچتا ہوں۔ ایمان گنوانے پر بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ جانتا ہوں یہ برا کام ہے۔ پر بال بچوں کو پالنا بھی تو ضروری ہے۔ اس

نے ایمان کھویا تو کچھ لے کر کھویا۔ گناہ بے لذت نہیں رہا۔ اب وہ تین دوکانوں کا ٹھیکہ لے لے گا۔ ایسا ہی کوئی مال میرے ہاتھ بھی پڑ جاتا تو جنم سپھل ہو جاتا۔"

جگدھر کے دل میں حسد نے جگہ کی۔ وہ بھیرو کے گھر سے لوٹا تو دیکھا کہ سورداس راکھ بٹور کر اسے آٹا کی طرح گوندھ رہا ہے۔ سارا جسم راکھ سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور پسینہ خوب بہہ رہا ہے۔ بولا۔ "سورداس! کیا ڈھونڈ تے ہو؟"

سورداس : کچھ نہیں یہاں رکھتا ہی کیا تھا۔ یہی لوٹا توا دیکھ رہا تھا۔

جگدھر : اور وہ تھیلی کس کی ہے جو بھیرو کے پاس ہے؟

سورداس چونکا۔ کیا اسی لیے بھیرو آیا تھا؟ ضرور یہی بات ہے؟ گھرمیں آگ لگانے سے پہلے روپے نکال لیے ہوں گے۔

لیکن اندھے بھکاری کے لیے مفلسی اتنی شرم کی بات نہیں ہے۔ جتنی دولت مندی۔ سورداس جگدھر سے اپنے مالی نقصان کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مٹھوا کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ کنواں بنوانا چاہتا تھا۔ مگر اس انداز سے کہ لوگوں کو تعجب ہو کہ اس کے پاس روپے کہاں سے آئے اور لوگ۔ یہی سمجھیں کہ بھگوان ہی محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ بھکاریوں کے لیے دولت کا جمع کرنا گناہ گاری سے کم ذلت کی بات نہیں ہے۔ بولا۔ "میرے پاس تھیلی ویلی کہاں؟ ہوگی کسی کی۔ تھیلی ہوتی تو بھیک کیوں مانگتا۔

جگدھر : مجھ سے اڑتے ہو بھیرو مجھ سے خود کہہ رہا تھا کہ جھونپڑے میں دھرن کے اوپر یہ تھیلی ملی پانچ سو روپے سے کچھ بیسی ہے۔

سورداس : وہ تم سے ہنسی کرتا ہوگا۔ ساڑھے پانچ روپے تو کبھی اکٹھے ہی نہیں ہوئے۔ ساڑھے پانچ سو کہاں سے آتے؟

اتنے میں سوبھاگی وہاں آ پہنچی۔ رات بھر مندر کے پیچھے امرود کے باغ میں چھپی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آگ بھیرو نے لگائی ہے۔ بھیرو نے اس پر جو تہمت لگائی تھی۔ اس کی اسے خاص فکر نہ تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہ آئے گا۔ لیکن میری خاطر سورداس یوں تباہ ہوا۔ اس کا اسے بے حد ملال تھا۔ وہ اس وقت اس کی تشفی کرنے آئی تھی۔ جگدھر کو وہاں کھڑے دیکھا تو جھجکی خوف ہوا کہ

کہیں یہ مجھے پکڑ نہ لے۔ جگدھر کو یہ بھیرو ہی کا دوسرا اوتار سمجھتی تھی۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب بھیرو کے گھر نہ جاؤں گی۔ الگ رہوں گی اور محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کروں گی۔ یہاں کون لڑکے رو رہے ہیں۔ ایک میرا ہی پیٹ اسے بھاری ہے نا؟ اب اکیلے ٹھونکے اور کھائے اور بڑھیا کے پاؤں دھو دھو کر پئے۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنے دن ہوئے کبھی اس نے اپنی طبیعت سے دھیلے کا سیندور بھی لے کر نہ دیا ہوگا۔ تو میں ہی کیوں اس کے پیٹے مروں؟

وہ پیچھے لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ جگدھر نے پکارا۔ ''سوبھاگی! کہاں جاتی ہے؟ دیکھی اپنے کھسم کی کرتوت۔ بیچارے سورداس کو کہیں کا نہ رکھا۔''

سوبھاگی نے سمجھا کہ مجھے جھانسہ دے رہا ہے میرے پیٹ کی تھاہ لینے کے لیے یہ جال پھینکا ہے۔ طنز سے بولی۔ ''اس کے گرو تو تمھیں ہو۔ تمھیں نے منتر دیا ہوگا۔

جگدھر: ہاں یہی میرا کام ہے۔ چوری ڈاکہ نہ سکھاؤں تو روٹیاں کیوں کر چلیں؟

سوبھاگی نے پھر طنز سے کہا۔ ''کیا رات تاڑی پینے کو نہیں ملی۔ کیا؟''

جگدھر: تاڑی کے بدلے کیا اپنا ایمان بیچ دوں گا؟ جب تک سمجھا تھا بھلا آدمی ہے۔ ساتھ بیٹھتا تھا۔ ہنستا بولتا تھا۔ تاڑی بھی پی لیتا تھا۔ کچھ تاڑی کے لالچ سے نہیں جاتا تھا (کیا کہنا ہے آپ ایسے ہی دھر ماتما تو ہیں۔) لیکن آج سے جو کبھی اس کے ساتھ بیٹھتے دیکھنا تو کان پکڑ لینا۔ جو آدمی دوسروں کے گھر میں آگ لگائے گریبوں (غریبوں) کے روپے چرالے جائے۔ وہ اگر میرا بیٹا بھی ہو تو اس کی صورت نہ دیکھوں۔ سورداس نے نہ جانے کتنے جتن سے پانچ سو روپے اکٹھے کیے تھے۔ وہ سب اڑا لے گیا۔ کہتا ہوں۔ لوٹا دو تو لڑنے پر تیار ہوتا ہے۔

سورداس: پھر وہی رٹ لگائے جاتے ہو۔ کہہ تو دیا کہ میرے پاس روپے نہیں تھے کسی اور جگہ سے مار لایا ہوگا۔ میرے پاس پانچ سو روپے ہوتے تو چین کی بنسی نہ بجاتا۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ کیوں پسارتا؟

جگدھر: سورداس! اگر تم بھری گنگا میں کہو کہ میرے روپے نہیں ہیں تو میں نہ مانوں گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ تھیلی دیکھی ہے۔ بھیرو نے اپنے منہ سے کہا ہے کہ یہ تھیلی جھونپڑے میں دھرن کے اوپر ملی۔ تمھاری بات کیسے مان لوں؟

سبھاگی : تم نے تھیلی دیکھی ہے؟
جگدھر : ہاں دیکھی نہیں تو کیا جھوٹ بولتا ہوں ؟
سبھاگی : سورداس سچ سچ بتا دو۔ روپے تمھارے ہیں؟
سورداس : پاگل ہوگئی ہو کیا؟ ان کی باتوں میں آ جاتی ہے۔ بھلا میرے پاس روپے کہاں سے آتے؟
جگدھر : ان سے پوچھو۔ روپے نہ تھے تو اس وقت راکھ بٹور کر کیا ڈھونڈ رہے تھے؟

سبھاگی نے سورداس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا اس کی حالت اس مریض کی سی تھی جو اپنے عزیزوں کی تسکین کے لیے اپنی ناقابل برداشت تکلیف کے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ جگدھر کے قریب آکر بولی۔ "روپے ضرور تھے۔ اس کا چہرہ کہے دیتا ہے۔"

جگدھر : میں نے تھیلی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔
سبھاگی : اب چاہے وہ مجھے مارے یا نکالے پر رہوں گی اس کے گھر میں۔ کہاں کہاں تھیلی کو چھپائے گا ؟ کبھی تو میرے ہاتھ لگے گی۔ میرے ہی کارن ان پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ میں نے ہی اجاڑا ہے۔ میں ہی بساؤں گی۔ جب تک اس کے روپے نہ دلا دوں گی۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

یہ کہہ کر وہ سورداس سے بولی۔ "تو اب رہو گے کہاں؟"

سورداس نے یہ بات نہ سنی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "روپے میں نے ہی تو کمائے تھے۔ کیا پھر نہیں کما سکتا؟ یہی ہوگا نہ کہ جو کام اس سال ہوتا وہ کچھ دنوں بعد ہوگا۔ میرے روپے تھے ہی نہیں۔ شاید اس جنم میں میں نے بھیرو کے روپے چرائے ہوں گے۔ یہ اسی کا ڈنڈ ملا ہے۔ مگر بیچاری سبھاگی کا اب کیا حال ہوگا ؟ بھیرو اسے اپنے گھر میں کبھی نہ رکھے گا۔ بیچاری کہاں ماری ماری پھرے گی؟ یہ کلنک بھی میرے سر لگنا تھا۔ کہیں کا نہ رہا۔ دھن گیا، گھر گیا، آبرو گئی، جو دھرتی بچ رہی ہے وہ بھی نہ جانے بچے گی کہ نہیں۔ اندھا ہونا ہی کیا تھوڑی بپت تھی کہ نت نئی چپت اور پڑتی رہتی ہے۔ جس کے جی میں آتا ہے چار کھری کھوٹی سنا دیتا ہے۔"

ان دکھ دینے والے خیالات سے متاثر ہو کر وہ رونے لگا۔ سبھاگی جگدھر سے

ساتھ بھیرو کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اور یہاں سورداس تنہا بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔

دفعتاً وہ چونک پڑا۔ کسی طرف سے آواز آئی۔ "تم کھیل میں روتے ہو؟"

مٹھوا گھیسو کے گھر سے روتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ شاید گھیسو نے مارا تھا۔ اس پر گھیسو اس کو چڑا رہا تھا۔ "تم کھیل میں روتے ہو۔"

سورداس کہاں تو حسرت ویاس۔ رنج و حرماں کے گہرے دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔ کہاں یہ بات سنتے ہی اس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنارے پر کھڑا کر دیا ہو۔ واہ میں تو کھیل میں روتا ہوں! کتنی بری بات ہے! لڑکے بھی کھیل میں رونا برا خیال کرتے ہیں۔ رونے والے کو چڑاتے ہیں۔ اور میں کھیل میں روتا ہوں۔ پکے کھلاڑی کبھی روتے نہیں۔ بازی پر بازی ہارتے ہیں۔ چوٹ پر چوٹ کھاتے ہیں۔ دھکے پر دھکے سہتے ہیں پر میدان میں ڈٹے رہتے ہیں۔ ان کے تیوروں پر بل نہیں پڑتے۔ ہمت ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دل میں کدورت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو کسی سے جلتے ہیں۔ نہ چڑتے ہیں۔ کھیل میں رونا کیسا؟ کھیل تو ہنسنے کے لیے دل بہلانے کے لیے ہے رونے کے لیے نہیں۔

سورداس اٹھ کھڑا ہوا اور فاتحانہ تکبر کے نشہ میں راکھ کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اڑانے لگا۔

ہم جوش کی حالت میں مقررہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ضبط کہاں ہے جو دشمن پر فتح پانے کے بعد تلوار کو میان میں کر لے۔

ایک لمحہ میں مٹھوا گھیسوا اور محلّہ کے بیسوں لڑکے آکر اس راکھ کے ڈھیر کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اپنے بے انتہا سوالات سے سورداس کو پریشان کردیا۔ اس کو راکھ اڑاتے دیکھ کر ان سب کو بھی ایک مشغلہ ہاتھ آیا۔ راکھ کی بارش ہونے لگی۔ ذرا دیر میں ساری راکھ بکھر گئی اور زمین پر صرف سیاہ نشانات رہ گئے۔

مٹھوا نے پوچھا۔ "دادا اب ہم رہیں گے کہاں؟"

سورداس: دوسرا گھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو کوئی پھر آگ لگا دے۔

سورداس: تو پھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو پھر لگا دے۔

سورداس: تو ہم پھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو کوئی ہجار (ہزار) بار لگا دے۔

سورداس: تو ہم ہزار بار بنائیں گے۔

لڑکوں کو گنتی سے خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ مٹھوا نے پھر پوچھا۔ "اور جو کوئی سو لاکھ بار لگا دے؟" سورداس نے اسی طفلانہ سادگی سے جواب دیا۔ "تو ہم بھی سو لاکھ بار بنائیں گے۔"

جب وہاں راکھ کی ایک چٹکی بھی نہ رہی تو سب لڑکے کسی دوسرے مشغلہ کی تلاش میں دوڑے۔ آفتاب کی روشنی خوب پھیل گئی تھی۔ سورداس نے بھی لکڑی سنبھالی اور سڑک کی طرف چلا، ادھر جگدھر یہاں سے نایک رام کے پاس گیا۔ اور وہاں بھی یہ سب حال کہہ سنایا۔ پنڈا نے کہا۔ "میں بھیرو کے باپ سے روپے وصول کروں گا۔ جاتا کہاں ہے؟ اس کی ہڈیوں سے روپے نکال کر دم لوں گا۔ اندھا اپنے منہ سے کچھ کہے یا نہ کہے۔"

جگدھر وہاں سے بجرنگی دیاگر۔ ٹھاکردین وغیرہ محلّہ کے سب چھوٹے بڑے آدمیوں سے ملا اور یہ قصہ بیان کیا۔ حسب ضرورت واقعی بات میں نمک مرچ بھی لگاتا جاتا تھا، سارا محلّہ بھیرو کا دشمن ہو گیا۔

سورداس تو سڑک کے کنارے راہگیروں کے جان و مال کی خیر منا رہا تھا۔ یہاں محلّہ والوں نے اس کی جھونپڑی بنانی شروع کی، کسی نے پھوس دیا، کسی نے بانس دیے، کسی نے دھرن دی۔ کئی آدمی جھونپڑی بنانے میں لگ گئے۔ جگدھر ہی اس جماعت کا خاص مشیر تھا۔ اپنی زندگی میں شاید ہی اس نے اتنا حوصلہ دکھلایا ہو۔ حسد میں صرف سیاہی نہیں ہوتی بلکہ کچھ سفیدی بھی ہوا کرتی ہے۔ شام تک جھونپڑا تیار ہو گیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور مظبوط۔ جمنی مٹی کے دو گھڑے اور دو تین ہانڈیاں لاکر رکھ دیں۔ ایک چولھا بھی بنا دیا۔ سب نے صلاح کر رکھی تھی کہ سورداس کو جھونپڑی کے بننے کی ذرا بھی خبر نہ ہو۔ جب وہ شام کو آئے تو گھر کو دیکھ کر متعجب ہو جائے اور

پوچھنے لگے۔ کس نے بنایا۔ اس وقت سب لوگ کہیں کہ آپ ہی آپ تیار ہو گیا۔

(12)

پربھو سیوک طاہر علی کے ساتھ چلے تو باپ پر جھلائے ہوئے تھے۔ یہ مجھے کولھو کا بیل بنانا چاہتے ہیں۔ آٹھوں پہر تمباکو کے نشے میں ڈوبا پڑا رہوں۔ حکام کے آستانوں پر سجدے کروں۔ حصص فروخت کرتا پھروں۔ اخبار میں اشتہارات چھپواؤں بس مجسّم سگریٹ کی ڈبیہ بن جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں دولت کمانے کی مشین نہیں ہوں، انسان ہوں، زر کی ہوس نے ابھی تک میرے جذبات کو فنا نہیں کیا۔ اگر میں اپنی خداداد طباعی سے کام نہ لوں تو یہ میری احسان فراموشی ہو گی۔ قدرت نے مجھے دولت کمانے کے لیے بنایا ہی نہیں ورنہ وہ مجھ کو یہ جذبات کیوں عطا کرتی؟ کہتے تو ہیں کہ اب مجھے روپوں کی کیا فکر۔ تھوڑے دنوں کا مہمان ہوں گویا یہ سب تیاریاں میرے لیے ہو رہی ہیں! لیکن ابھی کہہ دوں کہ آپ میرے لیے یہ تکلیف نہ اٹھایئے۔ میں جس حالت میں ہوں اسی میں خوش ہوں تو کہرام برپا ہو جائے اچھی بلا گلے پڑی۔ جاکر دیہاتیوں پر رعب جمایئے، ان کو دھمکایئے، انھیں گالیاں سنایئے، کیوں؟ ان سب نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ کوئی ان کی جائداد پر جبراً قبضہ کرے گا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے۔ اپنے حقوق کے تحفظ کا ان کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ آج میرے گھر پر کوئی قبضہ کرنا چاہے تو میں کبھی چپ چاپ نہ بیٹھوں گا۔ صبر تو نا امیدی کی انتہائی حالت کا نام ہے۔ جب تک ہم بالکل مجبور نہیں ہو جاتے۔ صبر نہیں کرتے ان میاں جی کو بھی ذرا سی چوٹ آگئی تو فریاد لے کر پہنچے۔ خوشامدی ہے۔ تملق سے اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان کو بھی غریبوں پر رعب جمانے کی دھن سوار ہوگی۔ مل کر نہیں رہتے بنتی۔ پاپا کی بھی یہی خواہش ہے۔ خدا کرے سب کے سب بگڑ کھڑے ہوں۔ گودام میں آگ لگا دیں۔ اور ان حضرت کی ایسی خبر لیں کہ وہاں سے بھاگتے ہی بنے۔" طاہر علی سے خفا ہو کر بولے۔ "کیا بات ہوئی کہ سب کے سب بگڑ کھڑے ہوئے؟"

طاہر : حضور! بالکل بے سبب۔ میں تو خود ہی ان سب سے اپنی جان بچاتا رہتا

ہوں۔

پربھو سیوک : معمول کے لیے علت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک فلسفیانہ راز ہے کیوں ؟

طاہر : (بات نہ سمجھ کر) جی ہاں اور کیا ؟

پربھو سیوک : جی ہاں اور کیا کے کیا معنے؟ کیا آپ بات بھی نہیں سمجھتے؟ یا بہرے پن کا مرض ہے؟ میں کہتا ہوں۔ بلا چنگاری کے آگ نہیں لگ سکتی۔ آپ فرماتے ہیں۔ جی ہاں اور کیا۔ آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟

طاہر : (خائف ہوکر) حضور! مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ مگر بدقسمتی سے پاس نہ ہو سکا۔ پھر بھی جو کام میں کر سکتا ہوں۔ اس کو مڈل پاس کر دے تو جو جرمانہ کہیے دوں۔ عرصہ تک چنگی میں محرر رہ چکا ہوں۔

پربھو سیوک۔ تو پھر آپ کی علمیت و فضیلت پر کسے شک ہو سکتا ہے؟ آپ کے کہنے پر مجھے مان لینا چاہیے کہ آپ خاموش بیٹھے ہوئے کتب بینی میں محو تھے یا شاید یاد الٰہی میں غرق تھے۔ اور مخالفوں کی ایک مسلح جماعت پہنچ کر آپ پر حملے کرنے لگی۔

طاہر : حضور تو خود ہی چل رہے ہیں۔ میں کیا عرض کروں۔ تحقیقات کر لیجیے گا۔

پربھو سیوک : آفتاب کو بتلانے کے لیے چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دہقانی عموماً امن پسند ہوتے ہیں۔ جب تک انھیں بھڑکایا نہ جائے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ آپ کی طرح انھیں یاد الٰہی سے روٹیاں نہیں ملتیں۔ سارا دن سر کھپاتے ہیں جب روٹیاں میسر آتی ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ پر جو کچھ بیتی اس کا سبب بھی نہیں بتلا سکتے۔ اس کے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ یا تو آپ کو خداوند تعالیٰ نے بہت موٹی عقل دی ہے یا آپ اپنا رعب جمانے کے لیے لوگوں پر بیجا دباؤ ڈالتے ہیں۔

طاہر : حضور! لڑائی کی ابتدا تو لڑکوں سے ہوئی۔ محلّہ کے کئی لڑکے میرے لڑکوں کو مار رہے تھے۔ میں نے جاکر ان سبھوں کی گوش مالی کردی۔ بس اتنی ذرا سی بات پر لوگ چڑھ آئے۔

پربھوسیوک : خیر شکر ہے۔ آپ کے ساتھ خدا نے اس قدر بے انصافی نہیں کی۔

جتنا میں سمجھتا تھا۔ آپ کے اور محلہ کے لڑکوں میں مارپیٹ ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنے لڑکوں کے رونے کی آواز سنی اور آپ کا خون جوش میں آیا۔ دہقانوں کے لڑکوں میں اتنی جرأت کہ وہ آپ کے لڑکوں کو ماریں؟ غضب خدا کا۔ آپ کی شرافت اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ آپ نے مصلحت دور اندیشی، دانائی سب کو سمیٹ کر طاق پر رکھ دیا۔ اور ان گستاخ لڑکوں کو مارنے دوڑے۔ تو اگر آپ جیسے مہذب شخص کو لڑکوں کی طفلانہ جنگوں میں مداخلت کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی آپ کی تقلید کریں تو آپ کو شکایت نہ ہونی چاہیے۔ آپ کو دنیا میں اتنے عرصہ تک رہنے پر یہ تجربہ ہو جانا چاہیے تھا کہ لڑکوں کے بیچ میں بوڑھوں کو نہ پڑنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ برا ہوتا ہے اگر آپ کو یہ تجربہ نہ تھا تو اب سبق کے لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ جس کے ذریعہ آپ کو ایک نہایت ضروری اور اہم تجربہ حاصل ہوا۔ اس کے لیے فریاد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

فٹن اڑی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ طاہر علی کے ہوش بھی اڑے جا رہے تھے۔ دل میں کہہ رہے تھے۔ "میں سمجھتا تھا کہ ان حضرات میں زیادہ انسانیت ہوگی پر دیکھتا ہوں تو یہ اپنے پدر بزرگوار سے بھی دو انگل اونچے ہیں۔ نہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ یہ طعنے برداشت نہیں ہو سکتے۔ کچھ مفت تنخواہ نہیں دیتے۔ کام کرتا ہوں اجرت لیتا ہوں۔ کنایۃً مجھے رزیل، احمق، جاہل، سب کچھ بنا ڈالا۔ ابھی عمر میں مجھ سے کتنے چھوٹے ہیں۔ ماہر سے دو چار سال بڑے ہوں گے مگر مجھے اس طرح آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔ گویا میں نادان بچہ ہوں۔ دولت زیادہ ہونے سے کیا عقل بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ جبھی یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔ روٹیوں کے لیے ٹھوکریں کھانی پڑتی۔ تو معلوم ہو جاتا کہ تجربہ کیا چیز ہے۔ آقا کوئی بات اعتراض کے قابل دیکھے تو سمجھانے کا اس کو حق ہے۔ اس کی مجھے شکایت نہیں مگر جو کچھ ہو نرمی اور ہمدردی کے ساتھ۔ یہ نہیں زہر اگلنے لگو۔ کلیجہ کو چھلنی بنا ڈالو۔"

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ پانڈے پور آ پہنچا۔ سورداس آج بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اور روز سواریوں کے نکل جانے کے بعد دوڑتا تھا۔ آج آگے ہی سے ان کا خیر

مقدم کرتا تھا۔ فٹن دیکھتے ہیں دوڑا۔ پربھو سیوک نے فٹن روک دی اور تند لہجہ میں بولے۔ ”کیوں سورداس! مانگتے ہو بھیک بنتے ہو سادھو اور کام کرتے ہو بد معاشوں کا؟ تجھے فوج داری کرنے کا حوصلہ ہوا ہے؟“

سورداس : کیسی فوجداری حضور؟ میں اندھا اپاہج بھلا کیا فوجداری کروں گا؟

پربھو سیوک : تمھیں نے تو محلّہ والوں کو ساتھ لے کر میرے منشی پر حملہ کیا تھا اور گودام میں آگ لگا دینے کو تیار تھے۔

سورداس : سرکار بھگوان کی کسم پر کہتا ہوں۔ میں نہیں تھا۔ آپ لوگوں کا منگتا ہوں۔ جان و مال کا کلیان مناتا ہوں۔ میں کیا پھوجداری کروں گا؟

پربھو سیوک : کیوں منشی جی۔ یہی شخص سرغنہ تھا نہ؟

طاہر : نہیں حضور۔ اشارہ اسی کا تھا پر یہ وہاں نہ تھا۔

پربھوسیوک : میں ان چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم جانتے ہوگے۔ ان دھمکیوں سے یہ لوگ ڈر جائیں گے مگر ایک ایک سے چکی نہ پسوائی تو کہنا کہ کوئی کہتا تھا۔ صاحب کو تم نے کیا سمجھا ہے؟ اگر حاکموں سے جھوٹوں بھی کہہ دیں تو سارا محلّہ بندھ جائے۔ میں تمھیں جتائے دیتا ہو۔

فٹن آگے بڑھی تو جگدھر ملا۔ خوانچہ ہتھیلی پر رکھے ایک ہاتھ سے مکھیاں اڑاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ پربھوسیوک کو دیکھتے ہی سلام کرکے کھڑا ہوگیا۔ پربھوسیوک نے پوچھا۔ ”تم بھی کل فوجداری کرنے والوں میں سے تھے؟“

جگدھر : سرکار! میں ٹکے کا آدمی کیا کھا کر پھوجداری کروں گا اور بے چارے سورداس کی کیا مجال ہے کہ سرکار کے سامنے اکڑ دکھائے۔ اپنی ہی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ کسی نے رات کو بے چارہ کی جھونپڑی میں آگ لگا دی۔ برتن بھانڈا سب جل گیا۔ نہ جانے کس کس جتن سے کچھ روپے جٹائے تھے وہ بھی لٹ گئے۔ گریب نے ساری رات رو رو کر کاٹی ہے۔ آج ہم لوگوں سے اس کا جھونپڑا بنایا ہے۔ ابھی چھٹی ملی ہے تو خوانچہ لے کر نکلا ہوں۔ حکم ہو تو کچھ کھلاؤں۔ کچالو خوب چٹ پٹے ہیں۔

پربھوسیوک کا جی للچا گیا۔ خوانچہ اتارنے کو کہا اور کچالو، دہی بڑے اور پکوڑیاں کھانے لگے۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں بہت لذیذ معلوم ہوئیں۔ کہا۔ ”سورداس

نے تو یہ بات مجھ سے نہیں کہی۔"

جگدھر : وہ کبھی نے کہے گا۔ کوئی گلا بھی کاٹ ڈالے تو شکایت نہ کرے گا۔

پربھوسیوک : تب تو واقعی کوئی مہاتما ہے۔ کچھ پتہ چلا کس نے جھونپڑے میں آگ لگائی تھی۔

جگدھر : سب معلوم ہوگیا ہجور! پر کیا کیا جائے؟ کتنا کہا گیا کہ اس پر تھانہ میں رپٹ کر دے پر وہ کہتا ہے کہ کون کسی کو پھنسائے۔ جو کچھ بھاگ میں لکھا تھا وہ ہوا۔ ہجور ساری کرتوت اسی بھیرو تاڑی والے کی ہے۔

پربھوسیوک : کیسے معلوم ہوا۔ کسی نے اسے آگ لگاتے دیکھا؟

جگدھر : ہجور وہ خود مجھ سے کہہ رہا تھا۔ روپیوں کی تھیلی لاکر دکھائی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا؟

پربھوسیوک : بھیرو کے منہ پر کہو گے۔

جگدھر : نہیں سرکار۔ خون ہو جائے گا۔

دفعتاً بھیرو سر پر تاڑی کا گھڑا رکھے آتا ہوا نظر آیا۔ جگدھر نے فوراً خوانچہ اٹھایا اور بلا پیسے لیے قدم بڑھاتا دوسری طرف چل دیا۔ بھیرو نے سامنے آکر سلام کیا۔ پربھوسیوک نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔ "تو ہی بھیرو تاڑی والا ہے نہ؟"

بھیرو : (کانپتے ہوئے) ہاں ہجور۔ میرا ہی نام بھیرو ہے۔

پربھوسیوک : تو یہاں لوگوں کے گھروں میں آگ لگاتا پھرتا ہے؟

بھیرو : ہجور! جوانی کی کسم کھاتا ہوں کسی نے ہجور سے جھوٹ کہہ دیا ہے۔

پربھوسیوک : تو کل میرے گودام پر فوجداری کرنے میں شریک تھا۔

بھیرو : ہجور کا تابعدار ہوں۔ آپ سے پھوجداری کروں گا۔ منشی جی سے پوچھئے جھوٹ کہتا ہوں یا سچ۔ سرکار نہ جانے کیوں سارا محلّہ مجھ سے دشمنی کرتا ہے۔ اپنے گھر میں ایک روٹی کھاتا ہوں۔ وہ بھی لوگ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ جو اندھا ہے۔ ہجور ایک ہی بدماس ہے۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بری نگاہ رکھتا ہے۔ مانگ مانگ کر روپے جوڑے ہیں۔ لین دین کرتا ہے۔ سارا محلّہ اس کے کہنے میں ہے۔ اسی کے چیلے بجرنگی اہیر نے پھوجداری کی ہے۔ مال مست ہے۔ گائیں بھینسیں لگتی ہیں۔ پانی ملا ملا کر

دودھ بیچتا ہے۔ اس کے سوا کس کا گردہ ہے کہ بجور سے پھوجداری کرے۔

پربھو سیوک: اچھا اس اندھے کے پاس روپے بھی ہیں؟

بھیرو: ہجور! بنا روپیوں کے اتنی گرمی اور کیسے ہوگی؟ جب پیٹ بھرتا ہے تبھی تو بہو بیٹیوں پر نگاہ ڈالنے کی سوجھتی ہے۔

پربھو سیوک: بیکار کیا بکتا ہے۔ اندھا آدمی کیا بری نگاہ ڈالے گا؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت سیدھا سادہ آدمی ہے۔

بھیرو: آپ کا کتا آپ کو تھوڑا ہی کاٹتا ہے آپ تو اس کی پیٹھ سہلاتے ہیں۔ پر جنھیں کاٹنے دوڑتا ہے وہ تو اس کو اتنا سیدھا نہ سمجھیں گے۔

اتنے میں بھیرو کی دوکان آگئی۔ کئی گاہک اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی دوکان میں چلا گیا۔ اس وقت پربھو سیوک نے طاہر علی سے کہا "آپ کہتے ہیں سارا محلہ مجھے مل کر مارنے آیا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ جہاں لوگوں میں اتنی نااتفاقی اور ناچاقی ہے وہاں اس قدر اتفاق ہونا غیر ممکن ہے۔ دو آدمی ملے۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس باہمی ناچاقی سے حسب مرضی فائدہ اٹھاتا۔ ان کو آپس میں لڑا کر دور سے تماشہ دیکھتا۔ مجھے تو ان لوگوں پر غصہ کی بجائے رحم آتا ہے۔"

بجرنگی کا گھر ملا۔ تیسرا پہر ہو گیا تھا۔ وہ بھینسوں کی ناند میں پانی ڈال رہا تھا۔ فٹن پر طاہر علی کے ساتھ پربھو سیوک کو بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا۔ میاں جی اپنے مالک کو لے کر رعب جمانے آئے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس طرح میں دب جاؤں گا۔ صاحب امیر ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ مجھے کایل (قائل) کردیں تو ابھی جو جربانہ (جرمانہ) لگا دیں۔ وہ دینے کو تیار ہو لیکن جب میرا کوئی قصور نہیں بلکہ قصور سولھوں آنے میاں ہی کا ہے۔ تو میں کیوں دبوں۔ نیائے سے دبالیں پد (عہد) سے دبالیں پر بھپکی سے دبنے والے کوئی اور ہوں گے۔

طاہر علی نے اشارہ کیا۔ یہی بجرنگی ہے۔ پربھوسیوک نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ "کیوں بے کل کے ہنگامے میں تو بھی شریک تھا؟"

بجرنگی: سریک کس کے ساتھ تھا؟ میں اکیلا تھا۔

پربھوسیوک : تیرے ساتھ سورداس اور محلہ کے دوسرے لوگ نہ تھے۔ جھوٹ بولتا ہے؟

بجرنگی : جھوٹ نہیں بولتا۔ کسی کا دبیل ہوں۔ میرے ساتھ نہ سورداس تھا اور نہ محلہ کا دوسرا آدمی۔ میں اکیلا تھا۔

گھیسو نے ہانک لگائی۔ "پادڑی! " پادڑی!"

مٹھوا بولا۔ "پادڑی آیا۔ پادڑی آیا۔"

دونوں اپنے ہمجولیوں کو یہ خوش خبری سنانے دوڑے۔ پادڑی گائے گا تصویریں دکھائے گا۔کتابیں دے گا۔ مٹھائیاں اور پیسے بانٹے گا۔" لڑکوں نے سنا تو وہ بھی اس لوٹ کا مال بٹانے کو دوڑے ایک لمحہ میں وہاں بیسیوں لڑکے جمع ہوگئے۔ شہر کے دور افتادہ محلوں میں انگریزی لباس والا آدمی پادڑی کا مترادف ہے۔ نایک رام بھنگ پی کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پادڑی کا نام سنتے ہی اٹھے۔ ان کی بے سری تانوں میں انھیں خاص مزہ ملتا تھا۔ ٹھاکردین نے بھی دوکان چھوڑ دی۔ انھیں پدریوں سے مذہبی مباحثہ کرنے کی عادت تھی۔ اپنی مذہبی واقفیت کے اظہار کے ایسے عمدہ موقعوں کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ دیاگر بھی آ پہنچے۔ لیکن جب لوگ فٹن کے پاس پہنچے اس وقت بھید کھلا۔ پربھوسیوک بجرنگی سے کہہ رہے تھے۔ "تمھاری شامت نہ آئے ورنہ صاحب تم کو تباہ کر دیں گے۔ کسی کام کے نہ رہو گے۔ تمھاری اتنی مجال!"

بجرنگی اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ نایک رام نے آگے بڑھ کر کہا۔ " اس پر آپ کیوں بگڑتے ہیں؟ فوجداری میں نے کی ہے جو کہنا ہو مجھ سے کہیے۔"

پربھوسیوک نے متحیر ہو کر پوچھا۔ " تمھارا نام کیا ہے؟"

نایک رام کو کچھ تو راجہ مہیندر کمار کی نوازش کچھ بھنگ کی ترنگ اور کچھ اپنی طاقت کے زعم نے گستاخ بنا دیا تھا۔ لاٹھی سیدھی کرتا ہوا بولا۔ "لٹھ مار پانڈے۔"

اس جواب میں شیخی کی جگہ ظرافت کی فراوانی تھی۔ پربھوسیوک کا مصنوعی غصہ ہوا ہو گیا۔ ہنس کر بولے۔ "تب تو یہاں ٹھہرنے میں خیریت نہیں ہے۔"

نایک رام اکھڑ آدمی تھا۔ پربھوسیوک کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔ اسے خیال ہوا کہ یہ میری ہنسی اڑا رہا ہے۔ گویا کہہ رہے ہیں کہ "تمھاری بکواس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم

زمین لیں گے اور ضرور لیں گے۔" ذرا بگڑ کر بولا "آپ ہنستے کیا ہیں؟ کیا سمجھ رکھا ہے کہ اندھے کی جمین (زمین) سچ ہی مل جائے گی؟ اس دھوکے میں نہ رہئے گا۔"

پربھوسیوک کو بھی اب غصہ آیا۔ پہلے انھوں نے سمجھا تھا کہ نایک رام مذاق کر رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ واقعی لڑنے پر آمادہ ہے۔ بولے "اس دھوکے میں نہیں ہوں۔ مشکلات کو خوب جانتا ہوں۔ اب تک بھروسہ تھا کہ سمجھوتہ سے ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔ اسی لیے آیا تھا۔ لیکن تمھاری خواہش کچھ اور ہو تو وہی سہی۔ اب تک میں تمھیں کمزور سمجھتا تھا اور کمزوروں پر اپنی طاقت کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آج جانا کہ تم زبردست ہو۔ تمھیں اپنی طاقت پر غرور ہے۔ اس لیے اب ہم بھی تم کو اپنی طاقت دکھائیں تو اس میں کوئی نا انصافی نہیں ہے۔"

ان الفاظ میں نیک نیتی جھلک رہی تھی۔ ٹھاکردین نے کہا۔ "ہجور! پنڈا جی کی باتوں کا خیال نہ کریں۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے جو کچھ منہ میں آیا بک ڈالتے ہیں۔ ہم لوگ آپ کے تابعدار ہیں۔"

نایک رام: آپ دوسروں کے بل پر کودتے ہوں گے۔ یہاں اپنے ہاتھوں کے بل کا بھروسہ رکھتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دل میں جو ارمان ہو نکال ڈالیے۔ پھر نہ کہنا کہ دھوکے میں وار کیا (آہستہ سے) ایک ہی ہاتھ میں ساری کرستانی نکل جائے گی۔

پربھوسیوک: کیا کہا؟ ذرا زور سے کیوں نہیں کہتے۔

نایک رام: (کچھ ڈر کر) کہہ تو رہا ہوں۔ جو ارمان ہو نکال ڈالیے۔

پربھوسیوک: نہیں۔ تم نے کچھ اور کہا ہے۔

نایک رام: جو کچھ کہا ہے وہی پھر کہہ رہا ہوں کسی کا ڈر نہیں ہے۔

پربھوسیوک: تم نے گالی دی ہے۔

یہ کہتے ہوئے پربھو سیوک فٹن سے نیچے اتر پڑے۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ نتھنے پھڑک اٹھے۔ سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ ایڑیاں اس طرح اچھل رہی تھیں۔ گویا کسی ابلتی ہوئی ہانڈی کا ڈھکنا ہیں چہرہ کی حالت تبدیل ہو گئی۔ ان کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ فٹن سے اترتے ہی وہ جھپٹ کر نایک رام کے گلے پر پہنچ گئے۔ اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر پھینک دی اور متواتر کئی بیت لگائے۔ نایک

رام دونوں ہاتھوں سے واروں کو روکتا ہوا پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔ وہ یہ جانتا تھا کہ شریف لوگ مار کھا کر چاہے چپ ہو جائیں پر گالی نہیں بر داشت کر سکتے۔ کچھ پشیمانی کچھ حملہ کی تیزی، کچھ انجام کا خوف، ان باتوں نے اس کو وار کرنے کی مہلت نہ دی۔ لگاتار واروں سے وہ چوندھیا سا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پربھوسیوک اس کے جوڑ کے نہ تھے۔ مگر اس میں وہ پاک ہمت و حق بجانب ہونے کی بات نہ تھی جس کو تعداد اور اسلحہ اور طاقت کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اور لوگ بھی بدحواس سے کھڑے تھے۔ کسی نے بیچ بچاؤ تک نہ کیا۔ بجرنگی نایک رام کے پسینہ کی جگہ خون بہانے والوں میں تھا۔ دونوں ساتھ کھیلے اور ایک ہی اکھاڑے میں لڑے تھے۔ ٹھاکر دین اور کچھ نہ کر سکتا تھا تو پربھو سیوک کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا۔ لیکن دونوں کے دونوں گم سم سے تاکتے رہے۔ یہ سب کچھ پلک مارنے میں ہو گیا۔ پربھو سیوک ابھی تک بیت مارتے جاتے تھے۔ جب دیکھا کہ چھڑی سے کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ تو ٹھوکر لگانی شروع کی۔ یہ چوٹ کار گر ہوئی دو ہی تین ٹھوکریں پڑی تھیں کہ نایک رام ران میں چوٹ کھا کر گرگیا۔ اس کے گرتے ہی بجرنگی نے دوڑ کر پربھو سیوک کو ہٹا دیا اور بولا۔ ”بس صاحب بس۔ اب اسی میں خیریت ہے کہ آپ چلے جائیے نہیں تو خون ہو جائے گا۔“

پربھو سیوک : ہم کو کوئی چرکٹا سمجھ لیا ہے۔ بدمعاش! خون پی لوں گا۔ گالی دیتا ہے۔

بجرنگی : بس اب بہت نہ بڑھئے۔ یہ اسی گالی کا پھل ہے کہ آپ یوں کھڑے ہیں نہیں تو اب تک نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔

پربھو سیوک جنون کے درجہ گزر کر مصلحت کے درجہ میں پہنچ چکے تھے۔ جاکر فٹن پر بیٹھ گئے اور گھوڑے کو چابک ماری گھوڑا ہوا ہو گیا۔

بجرنگی نے جاکر نایک رام کو اٹھایا۔ گھٹنوں میں بہت چوٹ آئی تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ بجرنگی کا کندھا پکڑ کر آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے گھر چلے۔

ٹھاکردین نے کہا۔ ”نایک رام! بھلا مانو یا برا۔ بھول تمھاری تھی۔ یہ لوگ گالی

نہیں سہہ سکتے۔
نایک رام: ارے تو میں نے گالی کب دی تھی۔ بھائی؟ میں نے تو یہی کہا تھا کہ ایک ہی ہاتھ میں کرستانی نکل جائے گی۔ بس اسی پر بگڑ گیا۔

جمنی اپنے دروازہ پر کھڑی ہوئی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ آکر بجرنگی کو کوسنے لگی۔
''کھڑے منہ تاکتے رہے اور لونڈا مار پیٹ کر چلا گیا۔ ساری پہلوانی دھری رہ گئی۔''
بجرنگی: میں تو جیسے گھبرا گیا۔
جمنی: چپ بھی رہو۔ لاج نہیں آتی؟ ایک لونڈا آکر سب کو پچھاڑ گیا۔ یہ تم لوگوں کے گھمنڈ کا ڈنڈ ہے۔
ٹھاکردین: بہت سچ کہتی ہو جمنا۔ یہ تماشہ دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بھگوان کو ہمارے گرور (غرور) کی سجا (سزا) دینی تھی نہیں تو کیا ایسے ایسے جودھا کٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے رہتے۔ بھگوان کسی کا گھمنڈ نہیں رکھتے۔
نایک رام: یہی بات ہوگی۔ میں اپنے گھمنڈ میں کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔

یہ باتیں کرتے ہوئے لوگ نایک رام کے گھر آئے۔ کسی نے آگ جلائی۔ کوئی ہلدی پیسنے لگا۔ ذرا دیر میں محلے کے اور لوگ آکر جمع ہوگئے۔ سب کو تعجب تھا کہ نایک جیسا پھنکیت اور لٹھباز کس طرح زک کھا گیا۔ کہاں سیکڑوں کے بیچ سے بے داغ نکل آتا تھا۔ کہاں ایک چھوکرے نے لتھاڑ ڈالا۔ بھگوان کی مرضی!

جگدھر ہلدی کی لیپ کرتا ہوا بولا۔ ''یہ ساری آگ بھیرو کی لگائی ہوئی ہے اس نے راستہ ہی میں صاحب کے کان بھر دیے تھے۔ میں نے تو دیکھا کہ اس کی جیب میں پستول بھی تھا۔''
نایک رام: پستول اور بندوق سب دیکھوں گا۔ اب تو لاگ پڑ گئی ہے۔
ٹھاکر دین: کوئی انستھان کروا دیا جائے۔
جگدھر: انستھان کا کرستانوں پر کچھ بس نہیں چلتا۔
نایک رام: اسے بیچ بازار میں فٹن روک کر ماروں گا۔ پھر کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہے گا۔ اب من میں یہی ٹھن گئی ہے۔

اسی وقت بھیرو بھی آکر کھڑا ہوگیا۔ نایک رام نے طنزاً کہا۔ ''تم کو تو بڑی

خوشی ہوئی ہوگی۔ بھیرو؟"

بھیرو : کیوں بھیا؟

نایک رام : مجھ پر مار پڑی ہے نا۔

بھیرو کیا میں تمھارا دشمن ہوں بھیا؟ میں نے تو ابھی دوکان پر سنا۔ ہوش اڑ گئے۔ صاحب دیکھنے میں تو بہت سیدھا سادہ معلوم ہوتا تھا مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ یہاں آکر نہ جانے کون بھوت اس کے سر پر سوار ہوگیا؟

نایک رام : اس کا بھوت میں اتار دوں گا۔ اچھی طرح اتار دوں گا۔ ذرا کھڑا تو ہونے دو۔ ہاں یہ جو کچھ رائے ہو اس کی خبر وہاں نہ ہونے پائے۔ نہیں تو چوکنا ہوجائے گا۔

بجرنگی : یہاں ہمارا کون ایسا بیری بیٹھا ہوا ہے؟

جگدھر : یہ نہ کہو۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ کون جانے کوئی آدمی ساباسی لوٹنے کے لیے انعام لینے کے لیے یا سرکھرو (سرخرو) بننے کے لیے وہاں ساری باتیں لگا آئے۔

بھیرو : مجھی پر شک کر رہے ہو تو میں اتنا نیچ نہیں ہوں کہ گھر کا بھید دوسروں سے کھولتا پھروں۔ اس طرح چار آدمی ایک جگہ رہتے ہیں تو آپس میں کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے لیکن اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ بھبھیکن کی طرح اپنے بھائی کے گھر میں آگ لگوا دوں۔ کیا اتنا نہیں جانتا کہ مرنے جینے میں، بپت سمپت میں محلّہ ہی کے لوگ کام آتے ہیں؟ کبھی کسی کے ساتھ بسواس گھات کیا ہے؟ پنڈاجی ہی کہہ دیں کہ میں نے کبھی ان کی بات دو لکھی ہے۔ ان کی آڑ نہ ہوتی تو پولیس نے اب تک مجھے کب کا لدوا دیا ہوتا۔ نہیں تو رجسٹر میں نام تک نہیں ہے۔

نایک رام : بھیرو! تم نے وقت پڑنے پر کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ اتنا تو ماننا ہی پڑے گا۔

بھیرو : پنڈاجی تمھارا حکم ہو تو آگ میں کود پڑوں۔

اتنے میں سورداس بھی آپہنچا۔ سوچتا آتا تھا۔ آج کھانا کہاں بناؤں گا۔ اس کی کیا فکر ہے۔ بس نیم کے پیڑ کے نیچے بائیاں لگاؤں گا۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ کون سا پانی برس رہا ہے۔ اسی سوچ بچار میں وہ جوں ہی بجرنگی کے دروازہ پر پہنچا جمنی نے آج کا سارا حال کہہ سنایا۔ ہوش اڑ گئے۔ اپلے ایندھن کی سدھ نہ رہی۔ سیدھے نایک رام

کے یہاں پہنچا۔ بجرنگی نے کہا۔ "آؤ سورداس! بڑی دیر لگائی۔ کیا ابھی چلے آتے ہو۔ آج تو یہاں بڑا گول مال ہو گیا۔"

سورداس : ہاں۔ جمنا نے ابھی مجھ سے کہا۔ میں تو سنتے ہی ٹھک سے رہ گیا۔

بجرنگی : ہونہار تھی اور کیا۔ ہے تو لونڈا پرہمت کا پکا ہے۔ جب تک ہم لوگ ہاں ہاں کریں تب تک فٹن پر سے کود ہی تو پڑا اور لگا ہاتر پر ہاتھ چلانے۔

سورداس : تم لوگوں نے پکڑ بھی نہ لیا؟

بجرنگی : سنتے تو ہو۔ جب تک دوڑیں تب تک تو اس نے ہاتھ چلا ہی دیا۔

سورداس : بڑے آدمی گالی سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جگدھر : جب بیچ باجار (بازار) میں بے بھاؤ کی پڑیں گی تب روئیں گے۔ ابھی تو پھولے نہ سماتے ہوں گے۔

بجرنگی : جب چوک میں نکلے تو گاڑی روک کر جوتوں سے ماریں۔

سورداس : ارے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی آبرو بگاڑنے سے کیا ملے گا؟

نایک رام : تو کیا میں یوں ہی چھوڑ دوں گا ؟ ایک ایک بیت کے بدلے اگر سو سو جوتے نہ لگاؤں تو میرا نام نایک رام نہیں۔ یہ چوٹ میرے بدن میں نہیں میرے کلیجہ پر لگی ہے۔ میں بڑوں بڑوں کا سر نیچا کر چکا ہوں۔ انھیں مٹاتے کیا دیر لگتی ہے؟ (چٹکی بجا کر) اس طرح اڑا دوں گا۔

سورداس : بیر بڑھانے سے کچھ پھائدہ (فائدہ) نہ ہوگا۔ تمھارا تو کچھ نہ بگڑے گا پر محلّہ کے سب آدمی بندھ جائیں گے۔

نایک رام : کیسی پاگلوں سی باتیں کرتے ہو ؟ میں کوئی دھنیا چمار ہوں کہ اتنی بے عزتی کر کے چپ ہو جاؤں۔ تم لوگ سورداس کو قائل کیوں نہیں کرتے؟ جی! کیا چپ ہو کے بیٹھ رہوں؟ بولو بجرنگی! تم لوگ بھی ڈر رہے ہو کہ وہ کرستان سارے محلّہ کو پیس کر پی جائے گا؟

بجرنگی : اوروں کو تو میں نہیں کہتا لیکن میرا بس چلے تو اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ یہ تمھاری ہی بے اجتی (بے عزتی) نہیں ہے۔ محلّہ بھر کے منہ میڈ کالکھ لگ گئی ہے۔

بھیرو : بس تم نے تو میرے منہ سے بات چھین لی۔ کیا کہوں اس بکھت (وقت) نہ تھا نہیں تو ہڈی توڑ ڈالتا۔

جگدھر : پنڈاجی۔ منہ دیکھی نہیں کہتا۔ تم چاہے دوسروں کے کہنے سننے میں آجاؤ لیکن میں بنا اس کی مرمت کیے نہ مانوں گا۔

اس پر کئی آدمیوں نے کہا۔ ''مکھیا کی اجت گئی تو سب کی گئی۔ وہی تو کرسٹان ہیں جو گلی گلی عیسیٰ مسیح کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ دو مڑا چمار جو گرجا میں جاکر کھانا کھائے وہی کرسٹان ہو جاتا ہے۔ وہی پیچھے کوٹ پتلون پہن کر صاحب بن جاتے ہیں۔''

ٹھاکر دین : میری تو صلاح یہی ہے کہ کوئی انسٹھان کرا دیا جائے۔

نایک رام : اب بتاؤ سورداس! تمھاری بات مانوں یا اتنے آدمیوں کی؟ تمھیں ڈر ہوگا کہ کہیں میری دھرتی پر آنچ نہ آجائے تو اس سے تم نسچنت رہو۔ راجہ صاحب نے جو بات کہہ دی اسے پتھر کی لکیر سمجھو۔ صاحب سر رگڑ کر مرجائیں تو بھی اب اس دھرتی کو نہیں پاسکتے۔

سورداس : دھرتی کی مجھے چنتا نہیں ہے۔ مروں گا تو سر پر لاد کر تھوڑا ہی جاؤں گا مگر آخر میں یہ سارا پاپ میرے ہی سر پڑے گا۔ میں ہی تو اس سارے توپھان (طوفان) کی جڑ ہوں۔ میرے ہی کارن تو یہ رگڑ جھگڑ مچی ہوئی ہے نہیں تو صاحب کو تم سے کون دشمنی تھی؟

نایک رام : یارو۔ سورداس کو سمجھاؤ۔

جگدھر : سورداس۔ سوچو۔ ہم لوگوں کی کتنی بے آبروئی ہوئی ہے۔

سورداس : آبرو کا بنانے بگاڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ بھگوان ہے۔ اسی کی نگاہ میں آبرو بنی رہنی چاہیے۔ آدمیوں کی نگاہ میں آبرو کی پرکھ کہاں ہے۔ جب سود کھانے والا بنیا اور گھوس کھانے والا حاکم اور جھوٹ بولنے والا گواہ بے آبرو نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ ان کا آدر مان کرتے ہیں تو یہاں سچی آبرو کی قدر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

بجرنگی : تم سے کچھ مطلب نہیں۔ ہم لوگ جو چاہیں گے وہ کریں گے۔

سورداس : اگر تم میری بات نہ مانو گے تو میں جاکر صاحب سے سارا ماجرا کہہ

سناؤں گا۔
نایک رام : اگر تم نے ادھر پیر رکھا تو یاد رکھنا وہیں کھود کر گاڑ دوں گا۔ اندھا اپاہج سمجھ کر تمھاری مروت کرتا ہوں نہیں تو تم ہو کس کھیت کی مولی؟ کیا تمھارے کہنے سے اپنی عزت گنوا دوں۔ باپ دادوں کے منہ کالکھ لگوا دوں؟ بڑے آئے ہو وہاں سے گیانی بن کے۔ تم بھیک مانگتے ہو۔ تمھیں اپنی عزت کی فکر نہ ہو یہاں تو آج تک پیٹھ میں دھول نہیں لگی۔

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے اٹھا اور مندر کے چبوترہ پر جا کے لیٹ گیا۔ مٹھوا پرشاد کے انتظار میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پیسے نکال کر دیے کہ ستو گڑ لا کھالے۔ مٹھوا خوش ہو کر بنئے کی دوکان کی طرف دوڑا۔ لڑکوں کو ستو اور چربن روٹیوں سے لذیذ تر معلوم ہوتا ہے۔

سورداس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک سب لوگ سناٹے میں بیٹھے رہے۔ اس کی مخالفت نے ان کو شک میں ڈال دیا تھا۔ اس کی صاف گوئی سے سب لوگ ڈرتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے پورا کر دکھاتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے سورداس ہی سے نبٹ لیا جائے۔ اس کو قائل کرنا مشکل تھا۔ دھمکی سے بھی کوئی کام نہ نکل سکتا تھا۔ نایک رام نے اس پر لگے ہوئے الزام کی تائید کر کے اسے شکست دینا تجویز کیا۔ بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اندھے کو پھوڑ لیا۔"

بھیرو : مجھے بھی یہی شک ہوتا ہے۔
جگدھر : سورداس پھوٹنے والا آدمی نہیں ہے۔
بجرنگی : کبھی نہیں۔
ٹھاکر دین : ایسا سو بھاؤ تو نہیں ہے پر کون جانے کسی کی نہیں چلائی جاتی۔ میرے ہی گھر چوری ہوئی تو کیا باہر کے چور تھے؟ پڑوسیوں کی ہی کرتوت ہے۔ پورے ایک ہزار کا مال اٹھ گیا اور وہی لوگ جنھوں نے مال اڑایا۔ اب تک میرے دوست بنے ہوئے ہیں۔ آدمی کا من چھن بھر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔
نایک رام : شاید زمین کا معاملہ کرنے پر راضی ہو گیا ہو۔ پر صاحب نے ادھر آنکھ

اٹھا کر بھی دیکھا تو بنگلہ میں آگ لگا دوں گا (مسکرا کر) بھیرو میری مدد کریں گے ہی۔

بھیرو : پنڈا جی۔ تم لوگ میرے اوپر شبہ کرتے ہو پر میں جوانی کی قسم کھاتا ہوں جو اس کے جھونپڑے کے پاس گیا بھی ہوں۔ جگدھر میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔ ایمان سے پوچھئے انھیں سے......

نایک رام : جو آدمی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ کرے اس کے گھر میں آگ لگانا برا نہیں۔ مجھے پہلے تو بسواس نہیں آتا تھا پر آج اس کے مجاج (مزاج) کا رنگ بدلا ہوا ہے۔

بجرنگی : پنڈا جی! سور داس کو تم آج تیس برس سے دیکھ رہے ہو۔ ایسی بات نہ کہو۔

جگدھر : سورداس میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں پر یہ برائی نہیں ہے۔

بھیرو : مجھے بھی ایسا جان پڑتا ہے کہ ہم نے ناہک (ناحق) اس پر کلنک لگایا۔ سبھاگی آج سویرے آکر میرے پیروں پر گر پڑی اور تب سے گھر کے باہر نہیں نکلی۔ سارے دن اماں کی سیوا ٹہل کرتی رہی۔

یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں کہ پربھوسیوک کی خاطر مدارت کیوں کر کی جائے گی۔ ادھر پربھوسیوک گھر چلے تو آج کے کام پر ان کو وہ خوشی نہ تھی جو نیک کام کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل مطمئن تھا۔

کوئی شریف آدمی برے کلمات کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ کرنا ہی چاہئے۔ اگر کوئی گالیاں کھا کر چپ ہو رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں مردانگی نہیں ہے۔ خودداری نہیں ہے۔ گالیاں کھاکر بھی جس کے خون میں جوش نہ آئے وہ بے جان اور مردہ ہے۔

پربھوسیوک کو افسوس یہ تھا کہ میں نے یہ نوبت آنے ہی کیوں دی؟ مجھے ان سے دوستی کرنی چاہئے تھی۔ ان لوگوں کو طاہر علی کے گلے ملانا چاہئے تھا۔ مگر یہ زمانہ سازی کس سے سیکھوں؟ اونھ یہ چالیں وہ چلے جسے پھیلنے کی چاہ ہو۔ یہاں تو سمٹ کر رہنا چاہتے ہیں۔ پاپا سنتے ہی جھلا اٹھیں گے۔ سارا الزام میرے ہی سر تھوپیں گے۔ میں ہی کوتاہ فہم، نامصلحت شناس، ناتجربہ کار ہوں۔ ضرور ہوں۔ جسے دنیا میں رہ کر دنیاداری نہ آئے وہ ضرور خر دماغ ہے۔ پاپا ناخوش ہوں گے۔ میں خاموشی سے ان کی ناخوشی

برداشت کرلوں گا۔ اگر وہ میری طرف سے مایوس ہو کر یہ کارخانہ کھولنے کا ارادہ ترک کر دیں تو میں منہ مانگی مراد پاجاؤں گا۔

لیکن پربھوسیوک کو کتنا تعجب ہوا جب سارا ماجرا سن کر بھی جان سیوک کے چہرہ پر غصہ کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ یہ خاموشی تنبیہ و تہدید سے زیادہ ناقابل برداشت تھی۔ پربھوسیوک چاہتے تھے کہ پاپا مجھے خوب تنبیہ کریں کہ مجھے اپنی صفائی دینے کا موقع ملے۔ میں ثابت کردوں کہ اس ناگوار واقعہ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میرے بجائے کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس پر بھی یہی افتاد پڑتی۔ انھوں نے دو ایک بار اپنے والد کے غصہ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی لیکن جان سیوک نے صرف ایک مرتبہ ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور اٹھ کر چلے گئے۔ کسی شاعر کی داد پانے کی تمنا سامعین کے سکوت سے اتنی برباد نہ ہوئی ہوگی۔

مسٹر جان سیوک چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو نہ بہاتے تھے۔ پربھوسیوک کے کام کی برائی کرنا بے سود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے خود ہی اس جذبہ کی پرورش کی تھی۔ سوچنے لگے اس گتھی کو کیسے سلجھاؤں؟ نایک رام محلہ کا مکھیا ہے۔ سارا محلہ اس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ سورداس تو محض برائے وزن بیت ہے۔ اور نایک رام مکھیا ہی نہیں ہے بلکہ شہر کا مشہور گنڈا بھی ہے۔بڑی خیریت ہوئی کہ پربھوسیوک وہاں سے جیتا جاگتا لوٹ آیا۔ راجہ صاحب بڑی مشکل سے راہ راست پر آئے تھے۔ نایک رام ان سے ضرور فریاد کرے گا۔ اب کے ہماری زیادتی ثابت ہوگی۔ راجہ صاحب کو سرمایہ داروں سے یوں ہی چڑ ہے۔ یہ حال سنتے ہی جامہ سے باہر ہو جائیں گے۔ پھر کسی طرح ان کا منہ سیدھا نہ ہوگا۔" ساری رات جان سیوک اسی ادھیڑ بن میں پڑے رہے۔ دفعتاً انھیں ایک بات سوجھی۔ چہرہ پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ "ممکن ہے یہ چال سیدھی پڑ جائے تو بگڑا ہوا کام پھر بن جائے۔" صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد فٹن تیار کرائی اور پانڈے پور روانہ ہوگئے۔

نایک رام نے پیروں میں پٹیاں باندھ لی تھیں۔ بدن میں ہلدی کی مالش کرائے ہوئے تھے۔ ایک ڈولی منگوا رکھی تھی اور راجہ مہیندر کمار کے پاس جانے کو تیار تھے۔ ابھی مہورت میں دو چار پل کی کسر تھی۔ بجرنگی اور جگدھر بھی ساتھ جانے والے

تھے۔ یکایک فٹن پہنچی تو لوگ متحیر ہو گئے۔ یک محہ میں سارا محلّہ آکر جمع ہو گیا کہ آج کیا ہوگا؟

جان سیوک نایک رام کے پاس جاکر بولے۔ ''آپ ہی کا نام نایک رام پانڈے ہے نہ؟ میں آپ سے کل کی باتوں کے لیے معافی مانگنے آیا ہوں۔ جوں ہی لڑکے نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا میں نے اسے خوب ڈانٹا اور رات زیادہ نہ گئی ہوتی تو میں اسی وقت آپ کے پاس آتا۔ لڑکا نالائق تھا اور ناتجربہ کار ہے۔ کتنا ہی چاہتا ہوں کہ اس میں ذرا آدمیت آجائے پر ایسی الٹی سمجھ ہے کہ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجا وہاں سے بھی پاس، ہوآیا۔ لیکن آدمیت نہ آئی۔ اس نادانی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اتنے آدمیوں کے بیچ میں وہ آپ سے بے ادبی کر بیٹھا۔ اگر کوئی آدمی شیر پر پتھر پھینکے تو یہ اس کی بہادری نہیں بلکہ نادانی ہے۔ ایسا شخص رحم کے قابل ہے کیوں کہ دیر میں یا جلد ہی وہ شیر کے منہ کا لقمہ بن جائے گا۔ اس لونڈے کی بجنسہ یہی حالت ہے۔ آپ نے مروت نہ کی ہوتی۔ تحمل سے کام نہ لیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ جب آپ نے اتنی رعایت کی ہے تو دل سے ملال بھی نکال ڈالیے۔''

نایک رام چارپائی پر لیٹ گئے گویا کھڑے رہنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ بولے۔ ''صاحب! دل سے ملال تو نہ نکلے گا چاہے جان نکل جائے۔

اسے چاہے ہم لوگوں کی مروت کہیے چاہے ان کی تقدیر کہیے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے گئے۔ لیکن ملال تو دل میں بنا ہوا ہے۔ وہ تبھی نکلے گا جب ہم دونوں میں سے ایک نہ رہے گا۔ رہی بھل منسی سو بھگوان نے چاہا تو جلد ہی سیکھ جائیں گے۔ بس ایک بار ہمارے ہاتھ میں پھر پڑ جانے دیجیے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو بھلا مانس بنا دیا۔ ان کی کیا ہستی ہے؟

جان سیوک : اگر آپ اتنی آسانی سے اسے بھل منسی سکھا سکیں تو کہیے آپ ہی کے پاس بھیج دوں۔ میں تو سب کچھ کرکے ہار گیا۔

نایک رام : بولو بھائی بجرنگی۔ صاحب کی باتوں کا جواب دو۔ مجھ سے تو بولا نہیں جاتا۔ رات کراہ کراہ کر کاٹی ہے۔ صاحب کہتے ہیں ماپھ (معاف) کر دو۔ دل میں ملال

نہ رکھو۔ میں تو یہ سب بیوہار نہیں جانتا۔ یہاں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھا ہے۔

بجرنگی : صاحب لوگوں کا یہی دستور ہے پہلے تو مارتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے اوپر بھی مار پڑا چاہتی ہے تو چٹ کہتے ہیں۔ ماپھ کردو۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس نے مار کھائی ہے اس کو بنا مارے کیسے تسکین ہوگی۔

جان سوک : تمھارا یہ کہنا ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ معافی انتقام کے خوف سے نہیں مانگی جاتی۔ خوف سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد مانگنے دوڑتا ہے۔ معافی نہیں مانگتا۔ معافی آدمی اسی وقت مانگتا ہے جب اس کو اپنی بے انصافی اور زیادتی کا یقین ہو جاتا ہے اور جب اس کا دل اسے شرمندہ کرنے لگتا ہے۔ پربھو سیوک سے تم معافی مانگنے کو کہو تو ہرگز نہ مانے گا۔ تم اس کی گردن پر تلوار چلا کر بھی اس کے منہ سے معافی کا ایک لفظ نہیں نکلوا سکتے۔ اگر یقین نہ ہو تو اس کا امتحان لے لو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے۔ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ان لوگوں نے گالیاں دیں۔ لیکن میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ آپ لوگوں نے اس کو گالیاں دی ہوں گی۔ شریف آدمی نہ گالیاں دیتا ہے، نہ گالیاں سنتا ہے۔ میں جو معافی مانگ رہا ہوں تو اس لیے کہ مجھے یہاں سراسر اس کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ میں اِس کی حرکت پر دل سے نادم ہوں اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہاں کیوں آنے دیا۔ سچ پوچھیے تو اب مجھے یہی پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اس زمین کو لینے کی بات ہی کیوں اٹھائی؟ آپ لوگوں نے میرے ملازم کو مارا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ تک نہ کی۔ میں نے قصد کر لیا کہ اب اس زمین کا نام نہ لوں گا۔ میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ لوگوں کواجاڑ کر اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر تم لوگ خوشی سے دوگے تو لوں گا ورنہ چھوڑ دوں گا۔ کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہ کر دیں گے میرے دل کو چین نہ آئے گا۔"

شرارت سادگی کی محض ایک خوفناک شکل ہے۔ صاحب کی شیریں بیانی نے نایک رام کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ کوئی دوسرا شخص اتنی ہی آسانی سے اس کو صاحب کی گردن پر تلوار چلانے کے لیے آمادہ کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ پربھوسیوک کو دیکھ کر

اس کے سر پر پھر خون سوار ہوجاتا۔ لیکن اس وقت صاحب کی باتوں نے اس پر جادو سا کر دیا۔ بولا۔ "کہو بجرنگی۔ کیا کہتے ہو؟"

بجرنگی: کہنا کیا ہے؟ جو اپنے سامنے سر جھکائے اس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ صاحب یہ بھی تو کہتے ہیں کہ اب ہم جمین (زمین) سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے تو ہمارے اوران کے بیچ میں جھگڑا ہی کیا رہا؟

جگدھر: ہاں جھگڑے کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ عداوت اور لڑائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بھیرو: چھوٹے صاحب کو چاہئے کہ آکر پنڈاجی سے ماپھی (معافی) مانگیں اب وہ کوئی چھوٹے بچہ نہیں ہیں کہ آپ ان کی طرف سے سپارس کریں۔ چھوٹا لڑکا ہوتا تو دوسری بات تھی تب ہم لوگ آپ ہی کو اولہنا دیتے۔وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مونچھ داڑھی نکل آئی ہے۔ انھیں خود آکر پنڈاجی سے کہنا سننا چاہئے۔

نایک رام: ہاں یہ بات پکی ہے۔ جب تک وہ تھوک کر نہ جائیں گے میرے دل سے ملال نہ دور ہوگا۔

جان سیوک: تو تم سمجھتے ہو کہ داڑھی مونچھ آ جانے سے عقل بھی آ جاتی ہے؟ کیا ایسے آدمی نہیں دیکھے ہیں جن کے بال پک گئے ہیں۔ دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ اور ابھی تک عقل نہیں آئی؟ پربھو سیوک اگر بے عقل نہ ہوتا تو اتنے آدمیوں کے بیچ میں پنڈاجی جیسے پہلوان پر ہاتھ نہ چلاتا۔ اسے تم کتنا ہی دباؤ۔ پر وہ معافی نہ مانگے گا۔ رہی زمین کی بات۔ سو اگر تم لوگوں کی مرضی ہے کہ اس معاملہ کو دبا رہنے دوں تو یہی سہی۔ مگر شاید ابھی تک تم لوگوں نے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ ورنہ کبھی مخالفت نہ کرتے بتلایئے پنڈاجی آپ کو اس معاملہ میں کیا اعتراض ہے؟

نایک رام: بھیرو اس کاجواب دو۔ اب تو صاحب نے تم کو کائل (قائل) کر دیا۔

بھیرو: کائل کیا کر دیا۔ صاحب یہی کہتے ہیں ناکہ چھوٹے صاحب کو اکل (عقل) نہیں ہے تو وہ کنوئیں میں کیوں نہیں کود پڑتے؟ اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کیوں نہیں کاٹ لیتے؟ ایسے آدمیوں کو کیسے پاگل سمجھ لے؟

جان سیوک: جو آدمی یہ نہ سمجھے کہ کس موقع پر کون کام کرنا چاہیے۔ وہ پاگل نہیں

تو اور کیا ہے؟

نایک رام: صاحب انھیں میں پاگل تو کسی طرح نہ مانوں گا۔ ہاں آپ کا منہ دیکھ کے ان سے بیر نہ بڑھاؤں گا۔ آپ کی بنتی نے میرا سر جھکا دیا۔ سچ کہتا ہوں آپ کی بھل منسی نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ نہیں تو میرے دل میں نہ جانے کتنا گبار(غبار) بھرا ہوا تھا۔ اگر آپ تھوڑی دیر اور نہ آتے توآج شام تک چھوٹے صاحب سپتال میں ہوتے۔ آج تک کبھی میری پیٹھ میں دھول نہیں لگی۔ جندگی (زندگی) میں پہلی بار میری اتنی بے عزتی ہوئی اور پہلی بار میں نے ماپھ (معاف) کرنا بھی سیکھا۔ یہ آپ کی عقل کی برکت ہے۔ میں آپ کی کھوپڑی کو مان گیا۔ اب صاحب کی دوسری بات کا جواب دو بجرنگی۔

بجرنگی: اس میں اب کاہے کا سوال جواب۔ صاحب نے تو کہہ دیا کہ میں اس کا نام نہ لوں گا۔ بس جھگڑا مٹ گیا۔

جان سیوک: لیکن اگر اس زمین کے میرے ہاتھ میں آنے سے تمھارا سولہوں آنے فائدہ ہو تو بھی تم ہمیں نہ لینے دوگے۔

بجرنگی: ہمارا پھائدہ کیا ہوگا؟ ہم تو مٹی میں مل جائیں گے۔

جان سیوک: میں تو دکھا دوں گا کہ تمھارا بھرم ہے۔ بتلاؤ تمھیں کیا اعتراض ہے۔

بجرنگی: پنڈاجی کے ہزاروں جاتری آتے ہیں وہ سب اسی میدان میں ٹھہرتے ہیں۔ دس دس بیس بیس دن پڑے رہتے ہیں۔ وہیں کھانا پکاتے ہیں وہیں سوتے ہیں۔ شہر کے دھرم سالوں میں دیہات کے لوگوں کو آرام کہاں؟ یہ دھرتی نہ رہے تو کوئی جاتری یہاں جھانکنے بھی نہ آئے۔

جان سیوک: جاتریوں کے لیے سڑک کے کنارے کھپریل کے مکانات بنوا دیے جائیں تو کیسا رہے؟

بجرنگی: اتنے مکان کون بنوائے گا۔

جان سیوک: اس بات کا میرا ذمہ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں دھرم شالا بنوا دوں گا۔

بجرنگی: میرے محلّہ کے دوسرے آدمیوں کی گائیں بھینسیں کہاں چریں گی؟

جان سیوک : احاطہ میں گھاس چرانے کا تمھیں اختیار رہے گا۔ پھر اب تم کو اپنا سارا دودھ لے کر شہر جانا پڑتا ہے۔ حلوائی تم سے دودھ لے کر ملائی مکھن دہی بناتا ہے اور تم سے کہیں زیادہ خوش حال نظر آتا ہے۔ یہ نفع اس کو تمھارے ہی دودھ سے تو ہوتا ہے۔ تم ابھی یہاں ملائی مکھن بناؤ تو لے گا کون؟ جب یہاں کارخانہ کھل جائے گا تو ہزاروں آدمیوں کی بستی ہو جائے گی۔ تم دودھ کی ملائی بیچو گے۔ دودھ علیحدہ بکے گا۔ اس طرح تمھیں دوہرا منافع ہوگا۔ تمھارے اپلے گھر بیٹھے بک جائیں گے۔ تمھیں تو کارخانہ کھلنے سے سب نفع ہی نفع ہے۔

نایک رام : آتا ہے سمجھ میں نا۔ بجر نگی۔

بجر نگی : سمجھ میں کیوں نہیں آتا لیکن ایک میں دودھ کی ملائی بنا لوں گا اور لوگ بھی تو ہیں جو دودھ کھانے کے لیے جانور پالے ہوئے ہیں انھیں تو مشکل پڑے گی۔

ٹھاکر دین : میرے ہی ایک گائے ہے چوروں کا بس چلتا تو اسے بھی لے گئے ہوتے۔ دن بھر وہاں چرتی ہے۔ سانجھ سیرے (سویرے) دودھ دوہ کر چھوڑ دیتا ہوں۔ دھیلے کا بھی چارا نہیں لینا پڑتا۔ جب تو آٹھ آنے روج کا بھوسہ بھی پورا نہ پڑے گا۔

جان سیوک : تمھاری پان کی دوکان ہے نا۔ ابھی تم دس بارہ آنے کے پیسے کماتے ہو گے۔ اس وقت تمھاری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ ادھر کی کمی ادھر پوری ہو جائے گی۔ مزدوروں کو پیسے کی پکڑ نہیں ہوتی۔ کام سے ذرا فرصت ہوئی کہ کوئی پان پر گرا کوئی سگریٹ پر دوڑا۔ خوانچہ والوں کو بھی خاص بکری ہوگی اور شراب تاڑی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چاہے تو پانی کو شراب بنا کر بیچو۔ گاڑی والوں کی مزدوری بڑھ جائے گی۔ یہی محلّہ چوک کا ٹکڑا ہو جائے گا۔ ابھی تمھارے لڑکے پڑھنے کے لیے شہر جاتے ہیں۔ تب یہیں مدرسہ کھل جائے گا۔

جگدھر : کیا یہاں مدرسہ بھی کھلے گا؟

جان سیوک : ہاں کارخانہ کے آدمیوں کے لڑکے آخر پڑھنے کہاں جائیں گے۔ انگریزی بھی پڑھائی جائے گی۔

جگدھر : پھیس کچھ کم لی جائے گی؟

جان سیوک : فیس بالکل ہی نہ لی جائے گی۔ کم زیادہ کیسی؟

جگدھر : تب تو بڑا آرام ہو جائے گا۔

نایک رام : جس کا مال ہے اسے کیا ملے گا۔

جان سیوک : جو تم لوگ طے کر دو۔ میں تمھیں کو پنچ مانتا ہوں۔ بس اسے راضی کرنا تمھارا کام ہے۔

نایک رام : وہ راجی ہی ہے۔ آپ نے بات کی بات میں سب کو راجی کر لیا نہیں تو یہاں لوگ من میں نہ جانے کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے۔ سچ ہے بدیّا بڑی چیز ہے۔

بھیرو : وہاں تاڑی کی دوکان کے لیے کچھ دینا تو نہ پڑے گا؟

نایک رام : کوئی اور کھڑا ہو گیا تو ضرور چڑھا اوپری ہوگی۔

جان سیوک : نہیں تمھارا حق سب سے بڑھ کر سمجھا جائے گا۔

نایک رام : تو پھر تمھاری چاندی ہے۔ بھیرو۔

جان سیوک : تو اب میں چلوں پنڈاجی۔ آپ کے دل میں ملال تو نہیں ہے؟

نایک رام : اب کچھ کہلایئے نا۔ آپ کا سا بھلا مانس آدمی کم دیکھا۔

جان سیوک چلے گئے تو بجرنگی نے کہا۔ ”کہیں سورداس راجی نہ ہوئے تو؟“

نایک رام : ہم تو راجی کریں گے۔ چار ہجار روپے دلانے چاہئے۔ اب اسی سمجھوتہ میں کسل ہے۔ جمین(زمین) رہ نہیں سکتی۔ وہ آدمی اتنا ہشیار ہے کہ ہم لوگ اس سے پیش نہیں پا سکتے۔ یوں ہی نکل جائے گی تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کون کرے گا؟ مفت میں جس ملتا ہو تو چھوڑنا نہ چاہئے۔

جان سیوک گھر پہنچے تو ڈینر تیار تھا۔ پربھو سیوک نے پوچھا۔ ”آپ کہاں گئے تھے؟“ جان سیوک نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ہر ایک کام کرنے کو تمیز چاہیے۔ اشعار کہہ لینا دوسری بات ہے، کام کر دکھانا دوسری بات! تم ایک کام کرنے گئے محلہ بھر سے لڑائی ٹھان کر چلے آئے۔ جس وقت میں پہنچا ہوں سارے آدمی نایک رام کے دروازہ پر جمع تھے۔ وہ ڈولی پر بیٹھ کر شاید راجہ مہیندر سنگھ کے پاس جانے کو تیار تھا۔ مجھے سب نے یوں دیکھا گویا پھاڑ کھائیں گے۔ لیکن میں نے کچھ اس طرح تحمل اور انکسار سے کام لیا۔ ان کو دلیوں اور چکنی چپڑی باتوں سے ایسا ڈھرے پر

لایا کہ جب وہاں سے چلا تو سب میرا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ زمین کا معاملہ بھی طے ہو گیا۔اس کے ملنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔"

پربھوسیوک : پہلے تو سب اس زمین کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے۔

جان سیوک : اور کچھ کسر تھی تو وہ تم نے جاکر پوری کردی۔ مگر یاد رکھو کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ "ڈرائنگ مومنٹ پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ شکاری جانتا ہے کس وقت ہرن پر نشانہ مارنا چاہیے۔ وکیل جانتا ہے عدالت پر اس کی دلیلوں کا بہترین اثر کب پڑ سکتا ہے۔ ایک مہینہ نہیں ایک دن پہلے میری باتوں کا ان آدمیوں پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ کل تمھاری زیادتیوں نے وہ موقع پیدا کر دیا۔ میں معافی کا خواستگار بن کر ان کے سامنے گیا۔ مجھے دب کر، جھک کر، عاجزی سے، انکسار سے اپنے مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ اگر ان کی زیادتی ہوتی تو میری جانب سے بھی سختی کا اظہار ہوتا۔ اسی حالت میں دبنا آئین اخلاق کے خلاف ہوتا۔ زیادتی ہماری طرف سے ہوئی۔ بس یہی میری جیت تھی۔

ایشور سیوک بولے۔ "یسوع اس گناہ گار کو اپنے دامن میں لے۔ برف آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کیوں اتنی بیدردی سے خرچ کی جاتی ہے؟ صراحی کا پانی تو کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔"

جان سیوک : پاپا معاف کیجیے۔ بلا برف کے پیاس ہی نہیں بجھتی۔

ایشور سیوک : خدا نے چاہا بیٹا۔ تو اس زمین کا معاملہ طے ہو جائے گا۔ آج تم نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔

مسز سیوک : مجھے ان ہندوستانیوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔ دغا بازی کوئی ان سے سیکھ لے۔ ابھی سب کے سب ہاں ہاں کر رہے ہیں۔ موقع پڑنے پر سب نکل جائیں گے۔ مہندر سنگھ ہی نے دھوکا نہیں دیا۔ یہ قوم ہی ہماری دشمن ہے۔ ان کا بس چلے تو ایک عیسائی بھی ملک میں نہ رہنے پائے۔

پربھوسیوک : ماما! یہ آپ کی زیادتی ہے۔ پہلے ہندوستانیوں کو عیسائیوں سے کتنی نفرت رہی ہو لیکن اب حالت تبدیل ہو گئی ہے۔ ہم خود انگریزوں کی نقل کر کے چڑاتے ہیں۔ ہر موقع پر انگریزوں کی مدد سے انھیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن

یہ ہماری سیاسی غلطی ہے۔ ہماری نجات اہل ملک کے ساتھ برادرانہ تعلق رکھنے میں ہے۔ ان پر رعب جمانے میں نہیں۔ آخر ہم بھی تو اسی بھارت ماتا کی اولاد ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ گوری قومیں صرف مذہب کے تعلق سے ہمارے ساتھ برابری کا برتاؤ کریں۔ امریکہ کے حبشی عیسائی ہیں۔ لیکن وہاں کے گورے ان کے ساتھ کتنا وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ ہماری نجات ہندوستانیوں ہی کے ساتھ ہے۔

مسز سیوک: خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم ان کافروں کی دوستی کو اپنی نجات کا ذریعہ بنائیں۔ ہم حکمرانوں کے مذہب ہیں۔ ہمارا مذہب ہمارا رواج۔ ہمارا طرز معاشرت وہی ہے جو انگریزوں کا ہے۔ ہم اور وہ ایک کلیسا میں ایک خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں حاکم بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ محکوم بن کر نہیں۔ تمھیں شاید کنور بھرت سنگھ نے یہ کلمہ پڑھایا ہے۔ کچھ دن اور ان کی صحبت میں رہ کر شاید تم بھی یسوع سے منکر ہو جاؤ۔

پربھوسیوک: مجھے تو عیسائیوں میں بیداری کے کوئی خاص آثار نظر نہیں آتے۔

جان سیوک: پربھو سیوک تم نے ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ میرے خیال میں ہمارا مفاد انگریزوں سے رشتۂ اخوت قائم کرنے میں ہے۔ انگریز اس وقت ہندوستانیوں کی متفقہ قوت سے متردد ہو رہے ہیں۔ ہم انگریزوں کے دوست بن کر ان پر اپنی وفاداری کا سکہ جما سکتے اور من مانی رعایتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہماری قوم نے ابھی تک سیاسی میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ حالانکہ ملک میں ہماری جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ مگر سیاسی دائرہ میں اب تک ہم کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ ہندوستانیوں میں مل کر ہم گم ہو جائیں گے۔ ان سے الگ رہ کر خاص اقتدار اور خاص عزت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چپراسی نے آکر ایک خط دیا۔ یہ خط مسٹر کلارک حاکم ضلع کا تھا۔ ان کے یہاں ولایت سے کئی مہمان آئے ہوئے تھے۔ کلارک نے ان کی خاطر سے ایک ڈنر دیا تھا اور مسز سیوک کو مع مس صوفیہ سیوک کے اس میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔ ساتھ ہی مسز سیوک سے یہ اصرار بھی کیا گیا تھا کہ صوفیا کو ایک ہفتہ کے لیے ضرور بلا لیجیے۔

چپراسی کے چلے جانے پر مسز سیوک نے کہا۔ "صوفی کے لیے یہ سنہرا موقع ہے۔"

جان سیوک : ہاں۔ ہے تو پر وہ آئے گی کیسے ؟

مسز سیوک : اس کے پاس یہ خط بھیج دوں؟

جان سیوک : صوفی اس کو کھول کر دیکھے گی بھی نہیں۔ اسے جاکر بلا کیوں نہیں لاتیں؟

مسز سیوک : وہ تو آتی ہی نہیں۔

جان سیوک : تم نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ آتی کیوں کر؟

مسز سیوک : وہ آنے کے لیے کیسی شرط لگاتی ہے۔

جان سیوک : اگر اس کی بھلائی چاہتی ہو تو اپنی شرطیں توڑ دو۔

مسز سیوک : وہ گرجا نہ جائے تو بھی زبان نہ کھولوں؟

جان سیوک : ہزاروں عیسائی کبھی گرجا نہیں جاتے اور انگریز تو بہت کم جاتے ہیں۔

مسز سیوک : خداوند یسوع کی توہین کرے تو بھی چپ رہوں؟

جان سیوک : وہ یسوع کی توہین نہیں کرتی۔ جسے خدا نے ذرا بھی عقل دی ہے وہ خداوند یسوع کی دل و جان سے عزت کرے گا۔ ہندو تک یسوع کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ اگر صوفی یسوع کو اپنا نجات دہندہ خدا کا بیٹا یا خدا نہیں سمجھتی تو اس پر جبر کیوں کیا جائے ؟ کتنے ہی عیسائیوں کو اس قسم کے شکوک ہیں۔ خواہ وہ انھیں علانیہ نہ بیان کریں۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص نیک کاموں کو کرتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے اور دل میں ویسے ہی خیالات رکھتا ہے تو وہ اس مسیحی سے کہیں بہتر ہے جو مسیح کا نام تو جپتا ہے پر نیت کا برا ہے۔

ایشور سیوک : یا خدا اس خاندان پر اپنا سایہ پھیلا۔ بیٹا۔ ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ مسیح کا بندہ کبھی راہ راست سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ اس پر مسیح کی نظر نوازش رہتی ہے۔

جان سیوک : (بیوی سے) تم کل صبح چلی جاؤ۔ رانی سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور صوفی کو بھی ساتھ لیتے آؤ گی۔

مسز سیوک : اب تو جانا ہی پڑے گا۔ جی تو نہیں چاہتا پر جاؤں گی۔ اسی کی ہٹ رہے۔

سورداس شام کو گھر آیا۔ اس نے سارا حال سنا تو نایک رام سے بولا۔ "تم نے میری دھرتی صاحب کو دے دی؟"

نایک رام : میں نے کیوں دی؟ مجھ سے واسطہ؟

سورداس : میں تمھیں کو سب کچھ سمجھتا تھا اور تمھارے ہی بل پر کودتا تھا پر آج تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اچھی بات ہے۔ میری بھول تھی کہ تمھارے بل پر پھولا ہوا تھا۔ یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ اب نیائے کے بل پر لڑوں گا۔ بھگوان ہی کا بھروسہ کروں گا۔

نایک رام : بجرنگی جرا (ذرا) بھیرو کو بلالو انھیں سب باتیں سمجھا دے۔ میں ان سے کہاں تک مگج (مغز) لڑاؤں؟

بجرنگی : بھیرو کو کیوں بلاؤں؟ کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ بھیرو کو اتنا سر چڑھا دیا اسی سے تو اس کو گھمنڈ ہو گیا ہے۔

یہ کہہ کر بجرنگی نے جان سیوک کی ساری تجویزیں کم و بیش طریقہ پر بیان کردیں اور بولا۔ "بتاؤ جب کارخانہ سے سب کا پھائدہ ہے تو ہم صاحب سے کیوں لڑیں۔"

سورداس : تمھیں بسواس ہو گیا کہ سب کا پھائدہ ہوگا ؟

بجرنگی : ہاں ہو گیا۔ ماننے لائق بات ہوتی ہے تو مانی ہی جاتی ہے۔

سورداس : کل تک۔ تم لوگ دھرتی کے پیچھے جان دینے کو تیار تھے۔ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں نے صاحب سے میل کرلیا۔ آج صاحب کے ایک ہی چکمہ میں پانی ہو گئے۔

بجرنگی : اب کسی نے سب باتیں اتنی صفائی سے نہ سمجھائی تھیں۔ کارکھانہ سے سارے محلّہ کا سارے سہر کا پھائدہ ہے۔ مجوروں کی مجوری بڑھے گی۔ دوکانداروں کی بکری بڑھے گی۔ تو اب ہم کو جھگڑا نہیں ہے۔ تم کو بھی ہم یہی صلاح دیتے ہیں کہ چوکھے دام مل رہے ہیں۔ دھرتی کو دے ڈالو۔ یوں نہ دو گے تو جابطے سے لے لی جائے گی۔ اس سے کیا پھائدہ؟

سورداس : ادھرم اور پاپ کتنا بڑھ جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہے۔

بجرنگی۔ دھن سے ادھرم ہوتا ہی ہے پر دھن کو کوئی چھوڑ نہیں دیتا۔

سورداس : تو اب تم لوگ میرا ساتھ نہ دو گے؟ مت دو۔ جدھر نیائے ہے ادھر کسی کی مدد کی اتنی بھی جرورت نہیں ہے۔ میری چیج (چیز) ہے باپ دادوں کی کمائی ہے۔ کسی دوسرے کا اس پر کوئی اکھتیار نہیں ہے اگر دھرتی گئی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔

یہ کہہ کر سورداس اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر جاکر نیم کے نیچے لیٹ رہا۔

(13)

ونے سنگھ کے جانے کے بعد صوفیہ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ رانی جانہوی مجھ سے کچھ کشیدہ خاطر ہیں۔ وہ اب اس کو کتاب یا اخبار پڑھنے کے لیے یا خطوط لکھنے کے لیے بہت کم بلاتیں۔ اس کے حرکات و سکنات کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتیں۔ اگرچہ وہ کنایتہً بھی اپنی بدگمانی کا اظہار نہ کرتیں۔ لیکن صوفیہ کو یہ خیال ہوتا کہ مجھ پر شک کیا جا رہا ہے۔ وہ جب کبھی باغ میں سیر کرنے چلی جاتی یا کہیں گھومنے کو نکل جاتی تو واپس آنے پر اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ میری کتابیں الٹ پلٹ دی گئی ہیں۔ یہ بدگمانی اس وقت اور بھی شاق گزرتی۔ جب ڈاکیہ کے آنے پر رانی صاحبہ خود ہی اس کے ہاتھوں سے خطوط لیتیں اور نہایت غور سے دیکھتیں کہ صوفیہ کا کوئی خط تو نہیں ہے۔ کئی بار صوفیہ کو اپنے خطوں کے لفافے پھٹے ملے۔ وہ ان بدگمانیوں کے راز کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ روک تھام صرف اس لیے ہے کہ میرے اور ونے سنگھ کے درمیان خط و کتابت نہ ہونے پائے۔ پہلے رانی صاحبہ صوفیہ سے ونے اور اندو کا تذکرہ اکثر کیا کرتیں۔ اب بھول کر بھی ونے کا نام نہ لیتیں۔ یہ محبت کا پہلا امتحان تھا۔

مگر تعجب یہ تھا کہ صوفیہ میں اب وہ خودداری نہ تھی جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اب وہ نہایت بردبار ہو گئی تھی۔ رانی سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ان کی بدگمانی دور کرنے کے لیے موقع و محل کی تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کو رانی صاحبہ کا

طرز عمل بالکل قرین انصاف معلوم ہوتا تھا وہ سوچتی۔ ان کی دلی تمنا ہے کہ ونے سنگھ کی زندگی ایک معیارانہ زندگی ہو اور میں ان کی تربیت میں مخل نہ ہوں۔ میں انھیں کسی طرح سمجھاؤں کہ آپ کی تمنا کو میرے ہاتھوں ذرا بھی جھونکا نہ لگے گا۔ میں تو خود ہی اپنی زندگی کو ایک ایسے مقصد کے لیے قربان کر چکی ہوں جس کے لیے وہ کافی نہیں۔ میں خود ہی کسی خواہش کو اپنے مقصد کے راستہ کا کانٹا نہ بناؤں گی۔" لیکن اس کو ایسا موقع نہ ملتا تھا۔ جو باتیں زبان پر نہیں آ سکتیں ان کے لیے کبھی موقع نہیں ملتا۔

صوفیہ کو اکثر اپنے دل کی کمزوریوں پر افسوس ہوتا۔ وہ اپنی طبیعت کو ادھر سے ہٹانے کے لیے مطالعہ کتب میں محو ہو جانا چاہتی۔ لیکن جب کتاب سامنے کھلی رہتی اور دل کہیں اور جا پہنچتا تو وہ جھنجھلا کر کتاب بند کر دیتی اور یہ سوچتی۔ "یہ میری کیا حالت ہے؟ کیا میرا نفس یہ بھیس اختیار کر کے مجھے راہ راست سے ہٹا دینا چاہتا ہے؟ میں جان کر کیوں انجان بنی جاتی ہوں؟" تب وہ عہد کرتی کہ میں اس کانٹے کو دل سے نکال ڈالوں گی۔

لیکن عشق و محبت کے دلدادگان کا عہد بزدلوں کی تمنائے جنگ کے مشابہ ہے جو حریف کا نعرہ سنتے ہی ہوا ہو جاتی ہے۔ صوفیہ ونے کو تو بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھول نہ جائیں۔ جب کئی روز تک ان کا کوئی حال نہ ملا تو اس نے سمجھا "مجھے بھول گئے۔ ضرور بھول گئے۔ مجھے ان کا پتہ معلوم ہوتا تو شاید ہر روز ایک خط لکھتی۔ روز کئی کئی خط بھیجتی مگر ان کو ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ وہ ایک عیسائی عورت سے کیوں محبت کرنے لگے؟ ان کے لیے کیا ایک سے ایک نہایت خوبصورت تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق راجکماریاں نہیں ہیں؟

ایک روز انھیں خیالات نے اس کو اس قدر بے تاب کیا کہ وہ رانی کے کمرہ میں جاکر ونے کے خطوط کو پڑھنے لگی۔ دم کے دم میں اس نے سارے خطوط پڑھ ڈالے۔ دیکھوں میری طرف کوئی اشارہ ہے یا نہیں؟ کوئی فقرہ ایسا ہے جس میں سے محبت کی خوشبو آئے؟ لیکن ایسا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ جس سے کھینچ تان کرنے پر بھی

وہ کوئی پوشیدہ بات پیدا کر سکتی۔ ہاں اس کوہستانی علاقہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا مفصل تذکرہ کیا گیا تھا۔ جوان العمری کو مبالغہ سے انس ہوتا ہے۔ ہم مشکلات پر فتح پاکر نہیں بلکہ ان کی طولانی صراحت سے اپنا وقار دلوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر معمولی حرارت ہے تو اسے سرسامی بخار کہا جاتا ہے۔ ایک روز پہاڑوں پر چلنا پڑا تو اسے روزانہ پہاڑوں سے سر ٹکرانا بتلایا جاتا ہے۔ ونے سنگھ کے خطوط اسی قسم کی بہادرانہ داستانوں سے معمور تھے۔ صوفیہ پڑھ کر بے قرار ہوگئی۔ وہ اتنی سختیاں جھیل رہے ہیں اور میں یہاں آرام سے پڑی ہوں۔ وہ اسی سراسیمگی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور ونے کو ایک طولانی خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاتمہ پر اس نے نہایت دردناک الفاظ میں استدعا کی کہ مجھے اپنی خدمت میں آنے کی اجازت دیجیے۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس کا اندازبیان نادانستہ طور پر شاعرانہ ہو گیا۔ خط پورا کر کے وہ اسی وقت قریب کے لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

خط چھوڑ دینے کے بعد جب اس کو سکون ہوا تو اسے خیال آیا کہ رانی صاحبہ کے کمرہ میں چھپ کر جانا اور خطوں کو پڑھنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ وہ سارا دن اسی فکر میں پڑی رہی۔ بار بار اپنے کو ملامت کرتی۔ ایشور میں کتنی بد نصیب ہوں۔ میں نے اپنی زندگی سچے مذہب کی تلاش کے لیے وقف کر دی تھی۔ برسوں سے سچائی کی تحقیقات میں مصروف ہوں مگر نفس کی پہلی ہی ٹھوکر میں نیچے گر پڑی۔ میں کیوں اتنی کمزور ہوگئی ہوں؟ کیا میرا پاک مقصد نفسانی خواہشات کے بھنور میں پڑ کر ڈوب جائے گا۔ میری عادت اتنی بری ہو جائے گی کہ میں کسی کی چیزیں چراؤں گی۔ یہ بات تو کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ جن کا مجھ پر اتنا اعتبار۔ اتنا بھروسہ اتنی محبت اتنی مہربانی ہے انھیں کے ساتھ میری یہ دغا بازی! اگر ابھی یہ حالت ہے تو بھگوان ہی جانے۔ آگے چل کر کیا حالت ہوگی؟ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ کاش وہ خط جسے میں ابھی ڈال آئی ہوں۔ واپس مل جاتا تو میں اس کو ابھی چاک کر ڈالتی!

وہ اسی تفکر و پشیمانی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رانی صاحبہ کمرہ میں آ گئیں۔ صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی اپنی آنکھیں چھپانے کے لیے زمین کی طرف تاکنے لگی۔

لیکن آنسو پی جانا آسان نہیں ہے۔ رانی نے کرخت آواز میں پوچھا۔ ”صوفی کیوں روتی ہو؟“

جب ہم اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں تو سچ بات خود بخود ہمارے منہ سے نکل پڑتی ہے۔ صوفی ہچکتی ہوئی بولی۔ ”جی کچھ نہیں......

مجھ سے ایک خطا سرزد ہوگئی ہے۔ آپ سے اس کی معافی چاہتی ہوں۔“

رانی نے زیادہ کرخت لہجہ میں پوچھا ”کیا بات ہے؟“

صوفی : آج جب آپ سیر کرنے گئی تھیں تو میں آپ کے کمرہ میں چلی گئی تھی۔

رانی : کیا کام تھا؟

صوفی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بولی۔ ”میں نے آپ کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔“

رانی : میں تم کو اتنا نیچ نہیں سمجھتی۔

صوفی : ایک...... ایک خط دیکھنا تھا۔

رانی : ونے سنگھ کا؟

صوفیہ نے سر جھکا لیا۔ وہ اپنی نگاہوں میں خود اتنی ذلیل ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا۔ زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ رانی نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”صوفی! تم مجھ کو احسان فراموش سمجھو گی۔ مگر میں نے تمھیں اپنے گھر میں رکھ کر بڑی غلطی کی۔ ایسی غلطی میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم آستین کا سانپ بنو گی۔ اس سے بہت بہتر ہوتا کہ ونے اسی روز آگ میں جل گیا ہوتا۔ تب مجھے اس قدر رنج نہ ہوتا۔ میں تمھارے طرز عمل کو پہلے نہ سمجھی۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑا تھا۔ تم جانتی ہو میں نے کیوں ونے کو اتنی جلدی یہاں سے بھگا دیا؟ تمھاری ہی وجہ سے تمھاری محبت کے حملوں سے بچانے کی غرض سے۔ لیکن اب بھی تم قسمت کی طرح اس کا دامن نہیں چھوڑتیں آخر تم اس سے کیا چاہتی ہو۔ تمھیں معلوم ہے کہ تم سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میں حیثیت اور خاندانی رواج کا لحاظ نہ کروں تو بھی تمھارے اور ہمارے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔ اس محبت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تم اپنے ساتھ اس کو بھی لے ڈوبوگی۔ اور

میری دیرینہ تمناؤں کو خاک میں ملا دو گی۔ میں ونے کو ایسا انسان بنانا چاہتی ہوں جس پر قوم کو فخر ہو۔ جس کے دل میں لگن ہو ہمت ہو استقلال ہو۔ جو خطرات کے سامنے منہ نہ موڑے۔ جو قوم کی خدمت کے لیے ہمیشہ سر کو ہتھیلی پر لیے رہے۔ جس میں نفس پروری کا شائبہ بھی نہ ہو۔ جو خود کو دھرم پر قربان کر دے۔ میں اسے سپوت بیٹا۔ وفادار دوست اور بے غرض خادم بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کی شادی کا شوق نہیں۔ اپنے پوتوں کو گود میں کھلانے کی خواہش نہیں۔ ملک میں نفس پرست مردوں اور اولاد پرست عورتوں کی کمی نہیں۔ زمین ان کے بوجھ سے دبی جاتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو سچا راجپوت بنانا چاہتی ہوں۔ آج وہ کسی کی حفاظت کے لیے اپنی جان دے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ماں دنیا میں نہ ہوگی۔ تم میرے اس سنہرے خواب کو پریشان کر رہی ہو میں تم سے سچ کہتی ہوں صوفی! اگر میں تمھارے احسانات کے بوجھ سے دبی نہ ہوتی تو تمھیں اس حالت میں زہر دے کر راستہ سے ہٹا دینا اپنا فرض سمجھتی۔ میں راجپوتنی ہوں۔ مرنا بھی جانتی ہوں اور مارنا بھی۔ اس کے قبل کہ ونے سے تمھیں خط وکتابت کرتے دیکھوں۔ میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گی۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ونے کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ تمھیں ایشور نے فہم و فراست عطا کی ہے عقل سے کام لو۔ میرے خاندان کو یک لخت تباہ مت کرو۔

صوفی نے روتے ہوئے کہا۔ مجھے اجازت دیجیے۔ آج ہی یہاں سے چلی جاؤں۔

رانی کچھ نرم ہو کر بولیں۔ "میں تمھیں جانے کو نہیں کہتی۔ تم میرے آنکھوں پر رہو (نادم ہوکر) میری زبان سے اس وقت جو ثقیل الفاظ نکلے ہیں ان کے لیے مجھے معاف کرو۔ بڈھے آدمی زود رنج ہوتے ہیں۔ یہ تمھارا گھر ہے۔ شوق سے رہو۔ ونے اب شاید پھر نہ آئے گا۔ ہاں وہ شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے پر میرے غصہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ جنگلوں کی خاک چھانے گا لیکن اب گھر نہ آئے گا۔ اگر تمھیں اس سے محبت ہے تو اپنے کو اس کی بہبود کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو جاؤ اب اس کی سلامتی کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا "نہیں۔"

رانی : جاننا چاہتی ہو؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔“

رانی : قربانی کے لیے تیار ہو؟

صوفی : نے پھر سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔“

رانی : تو تم کسی قابل شخص سے شادی کرلو۔ ونے کو دکھا دو کہ تم اسے بھول چکی ہو۔ تمھیں اس کی فکر نہیں ہے۔ یہی مایوسی اس کو بچا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مایوسی اس کو زندگی سے بیزار کر دے۔ وہ گیان کے حصول کا سہارا لے جو مایوسی کی واحد جائے پناہ ہے۔ لیکن ایسا امکان ہونے پر بھی اس کے سوا دوسری تدبیر نہیں ہے۔ تم منظور کرتی ہو ؟

صوفی رانی کے پیروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی۔ ”ان کی بہتری کے لیے...... کر سکتی ہوں۔“

رانی نے صوفی کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور رقت آمیز میں لہجہ میں بولیں۔ میں جانتی ہوں تم ان کے لیے سب کچھ کر سکتی ہو۔ ایشور تمھیں اس عہد کو پورا کرنے کی طاقت عطا کرے۔

یہ کہہ کر رانی جانہوی وہاں سے چلی گئیں۔ صوفی ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کا بال بال پشیمانی سے تکلیف پا رہا تھا۔ اسے رانی پر غصہ نہ تھا اسے ان پر بے حد اعتقاد تھا۔ کتنا بلند اور پاک مقصد ہے۔ در اصل میں ہی دودھ کی مکھی ہوں اور مجھی کو نکل جانا چاہیے۔ لیکن رانی کا آخری حکم اس کے لیے تلخ ترین لقمہ تھا۔ ووہ جوگن بن سکتی تھی لیکن محبت کو بدنام کرنے کے خیال ہی سے اس کو نفرت ہوتی تھی۔ اس کی حالت اس فقیر کی سی تھی جو کسی باغ میں سیر کرنے جائے اور پھل توڑنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ ونے کے ایثار نے اسے ان کا عقیدت مند بنا دیا۔ عقیدت نے جلد ہی محبت کی شکل اختیار کرلی اور اب وہی محبت اس کو جبراً دوزخ کی تاریکی کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ اگر وہ ہاتھ پیر چھڑاتی ہے تو خوف ہے...... وہ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ سوچنے کی طاقت زائل ہو گئی سارے تفکرات ساری پشیمانیاں، ساری مایوسی ساری تکلیف ایک

دم سر میں سما کر غائب ہو گئیں!

شام ہو گئی تھی۔ صوفیا من مارے اداس بیٹھی ہوئی باغ کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ جیسے کوئی بیوہ اپنے خاوند کے سوگ میں محو ہو۔ یکایک پربھوسیوک کمرہ میں داخل ہوئے۔

صوفیہ نے پربھوسیوک سے کوئی بات نہ کی چپ چاپ اپنی جگہ پر بت بنی بیٹھی رہی۔ نا امیدی کا آخری درجہ ترک تعلق ہے۔

لیکن پربھوسیوک اپنی نئی تصنیف سنانے کے لیے اس قدر بے تاب تھے کہ صوفی کے چہرہ کی طرف ان کا دھیان ہی نہ گیا۔ آتے ہی بولے۔ "صوفی! دیکھو آج رات میں نے یہ نظم لکھی ہے۔ ذرا غور سے سننا۔ میں نے ابھی کنور صاحب کو سنائی وہ نہایت محظوظ ہوئے۔"

یہ کہہ کر پربھوسیوک نے شیریں بیانی کے ساتھ اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ شاعر نے اس دار فانی کے ایک غم زدہ دل کے وہ جذبات منظوم کیے تھے جو ستارو کو دیکھ کر اس میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک شعر جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ اور اس کو دو دو تین تین بار دہراتے تھے۔ لیکن صوفیہ نے ایک بار بھی داد نہ دی گویا اس میں سخن فہمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ نظم کو ختم کر کے پربھوسیوک نے پوچھا۔ "اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟"

صوفیہ نے کہا۔ "اچھی تو ہے۔"

پربھوسیوک : میرے اشعار پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ آج تک کسی شاعر نے بھی ستاروں کو ملائک کی ارواح سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہوتے ہی شعراء کی جماعت میں ہل چل پیدا ہو جائے گی۔

صوفیہ : مجھے تو یاد آتا ہے کہ شیلی اور ورڈ سورتھ اس استعارہ کو پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔ یہاں کے شاعروں نے بھی کچھ ایسے ہی استعارے باندھے ہیں۔ شاید ہیوگو کی ایک نظم کا عنوان بھی یہی ہے۔ ممکن ہے تمھارا تخیل ان کے تخیل سے لڑ گیا ہو۔

پربھوسیوک : میں نے استادوں کا کلام تم سے زیادہ دیکھا ہے لیکن یہ تشبیہ مجھ کو کہیں

نہیں دکھائی دی۔
صوفیہ : خیر ہو سکتا ہے۔ مجھی کو یاد نہ ہو گا۔ نظم بری نہیں ہے۔
پربھوسیوک : اگر کوئی دوسرا شاعر یہ اعجاز پیدا کرے تو اس کی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔
صوفیہ : تو میں کہوں گی کہ تمھاری نگاہ میں اپنی آزادی کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔
پربھوسیوک : تومیں بھی یہی کہوں گا کہ سخن فہمی میں کمال حاصل کرنے کے لیے ابھی تمھیں بہت زیادہ مشق کی ضرورت ہے۔
صوفیہ : مجھے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اہم کام کرنے ہیں۔ آج کل گھر کی کیا کیفیت ہے ؟
پربھوسیوک : وہی پرانی کیفیت۔ میں تو عاجز آگیا ہوں۔ پاپا کو اپنے کارخانہ کی دھن لگی ہوئی ہے اور مجھے اس کام سے نفرت ہے۔ پاپا اورماما دونوں ہر وقت بھنبھناتے رہتے ہیں۔ کسی کا منہ سیدھا ہی نہیں ہوتا۔ کہیں ٹھکانا نہیں ملتا ورنہ اس حرص کے آشیانے میں ایک منٹ بھی نہ رہتا۔ کہاں جاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
صوفیہ : بڑے تعجب کی بات ہے اس قدر عالم، ہنر مند ہو کر بھی تمھیں اپنی گزر بسر کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ شاید تخیل کی دنیا میں خودداری کے لیے کہیں بھی جگہ نہیں۔
پربھوسیوک : صوفی! میں اور سب کچھ کر سکتا ہوں مگر خانگی تفکرات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میں بے فکر، آزاد اور بے لوث رہنا چاہتا ہوں۔ ایک خوشنما باغ میں کسی گھنے درخت کے نیچے چڑیوں کے نغمے سنتا ہوا فکر شعر میں محو ہو کر پڑا رہوں۔ یہی میری زندگی کا معیار ہے۔
صوفیہ : تمھاری زندگی اسی طرح خواب دیکھنے میں گزرے گی۔
پربھوسیوک : کچھ ہو۔ فکر سے تو نجات حاصل ہے۔ آزاد تو ہوں۔
صوفیہ : جہاں ضمیر اور اصولوں کا خون ہوتا ہے۔ وہاں سے آزادی کوسوں دور بھاگتی ہے۔ میں اس کو آزادی نہیں کہتی۔ یہ بے حیائی ہے والدین کی بے رحمی کم تکلیف دہ

نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کا ظلم اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوتا جتنا کہ والدین کا۔
پربھوسیوک : اونہہ دیکھا جائے گا۔ سر پر جو پڑے گی۔ جھیل لوں گا۔ مرنے سے پہلے ہی کیوں روؤں۔

یہ کہہ کر پربھوسیوک نے پانڈے پور کا واقعہ بیان کیا۔ اور اتنی ڈینگیں ماریں کہ صوفی چڑکر بولی۔ "رہنے بھی دو ایک گنوار کو پیٹ لیا تو کون سا بڑا کام کیا۔ اپنی نظموں میں تو عدم تشدد کا مجسمہ بن جاتے ہو اور وہاں ذرا سی بات پر اتنا جامہ سے باہر ہوگئے۔"
پربھوسیوک : گالی سہ لیتا۔
صوفیہ : جب تم مارنے والے کو بھی مارو گے۔ گالی دینے والے کو بھی مارو گے تو عدم تشدد والے اصول پر کاربند کب ہو گے؟ راہ چلتے تو کسی کو کوئی نہیں مارتا۔ واقعی کسی نوجوان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ نصیحت کرے۔ خواہ اس کی شاعرانہ قوت کتنی ہی زبردست ہو۔ نصیحت کرنا مشاق اور پختہ کار لوگوں ہی کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ جس کو ذرا بھی تک بندی آگئی وہ لگا امن۔ براداشت اور عدم تشدد کا سبق پڑھانے! جو بات دوسروں کو سکھلانا چاہتے ہو وہ پہلے خود تو سیکھ لو۔
پربھوسیوک : ٹھیک یہی بات ونے نے بھی اپنے خط میں لکھی ہے لو یاد آگیا۔ یہ تمھارا خط ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی۔ یہ تذکرہ نہ چھڑ جاتا تو جیب میں رکھے ہی لوٹ جاتا۔

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک نے ایک لفافہ نکال کر صوفیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صوفیہ نے پوچھا۔ "آج کل کہاں ہیں؟"
پربھوسیوک : اودے پور کے کوہستانی علاقوں میں گھوم رہے ہیں میرے نام جو خط آیا ہے اس میں تو انھوں نے صاف لکھا ہے کہ میں اس خدمتی کام کے بالکل ناقابل ہوں۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت نہیں جتنی ہونی چاہئے۔ شباب کا زمانہ تجربہ حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ پختہ عمری ہی میں کارہائے عامہ میں شامل ہونا چاہئے کسی جوان آدمی کو خدمتی کام کرنے کے لیے بھیجنا، ویسا ہی ہے جیسے کسی کمسن طبیب کو مریض کی تکلیف رفع کرنے کے لیے بھیجنا۔

پر بھو سیوک چلے گئے تو صوفیہ سوچنے لگی۔ یہ خط پڑھوں یا نہ پڑھوں ؟ ونے اس کو رانی صاحبہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ور نہ یہیں کے پتہ پر نہ بھیجتے۔ میں نے ابھی رانی صاحبہ سے وعدہ کیا ہے کہ ان سے خط و کتابت نہ کروں گی۔اس خط کو کھولنا روا نہیں۔رانی صاحبہ کو دکھا دوں۔ اس سے ان کے دل میں میری طرف سے جو بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ مگر معلوم نہیں۔ کیا باتیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو جو رانی کے غصہ کو اور بھی تیز کر دے۔ نہیں۔ اس خط کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہیے۔ رانی کو دکھانا درست نہیں۔

اس نے پھر سوچا۔ پڑھنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے میرے دل کی کیا کیفیت ہو۔ مجھے اب اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اب اس محبت کے پودے کو بیخ و بن سے اکھاڑنا ہی ہے تو اسے کیوں سینچوں؟ اس خط کو رانی کے حوالہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

صوفیہ نے اور زیادہ سوچ بچار نہ کیا۔ شک ہوا کہ کہیں میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکوں۔ چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

اس نے اسی وقت وہ خط لے جاکر رانی کو دے دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ کس کا خط ہے ؟ یہ تو ونے کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ تمھارے نام آیا نا ؟ تم نے لفافہ کھولا نہیں ؟

صوفیہ : جی نہیں۔

رانی نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں تمھیں اجازت دیتی ہوں کہ اسے پڑھو تم نے اپنا قول نباہا ہے۔ اس سے میں خوش ہوں۔“

صوفیہ : مجھے معاف کیجیے۔

رانی : میں خوشی سے کہتی ہوں۔ پڑھو۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں۔

صوفیہ : جی نہیں

رانی نے خط کو جوں کا توں صندوق میں بند کر دیا۔ خود بھی نہیں پڑھا کیوں کہ ایسا کرنا آئینِ ادب کے خلاف تھا۔ پھر صوفیہ سے بولی۔ ”بیٹی! اب میری تم سے ایک التجا اور ہے۔ ونے کو خط لکھو اور اس میں صاف لکھ دو کہ ہماری اور تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ آیندہ ہم دونوں میں صرف بھائی بہن کا تعلق رہے۔ تمھارے خط سے یہ

ظاہر ہونا چاہیے کہ تم ان کی محبت کے بہ نسبت ان کے قومی جذبات کی زیادہ قدر کرتی ہو۔ تمھارا یہ خط میرے اور ان کے والد کے ہزاروں نصائح سے زیادہ موثر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارا خط پاتے ہی ان کی طبیعت بدل جائے گی اور وہ فرض کی راستہ پر مستعدی سے گامزن ہوں گے۔ میں اس مہر بانی کے لیے تمام عمر تمھاری ممنون رہوں گی۔ صوفیہ نے مغموم لہجہ میں کہا۔ ”آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔“

رانی : نہیں صرف میرے ارشاد کی تعمیل کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ظاہر ہوا کہ کسی کی ترغیب سے لکھا گیا ہے تو اس کا اثر جاتا رہے گا۔

صوفیہ : آپ کو خط لکھ کر دکھا دوں؟

رانی : نہیں۔ تمھیں بھیج دینا۔

صوفیہ جب وہاں سے آکر خط لکھنے بیٹھی تو اس کو سوجھتا ہی نہ تھا کہ کیا لکھوں۔ سوچنے لگی وہ مجھے بے درد خیال کریں گے۔ اگر لکھ دوں کہ میں نے تمھارا خط پڑھا ہی نہیں تو انھیں کتنا رنج ہوگا۔ کیسے کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔

وہ میز پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور طے کر لیا کہ کل لکھوں گی۔ ایک کتاب پڑھنے لگی کھانے کا وقت آگیا۔ نو بج گئے۔ ابھی! وہ منہ ہاتھ دھوکر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے رانی کو دروازہ سے اندر کی طرف جھانکتے دیکھا سمجھی کہ کسی کام سے جا رہی ہوں گی۔ پھر کتاب دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ رانی پھر دوسری طرف سے لوٹیں اور انھوں نے کمرہ میں پھر جھانکا۔

صو فیہ کو ان کا اس طرح منڈلانا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے سمجھا ”یہ مجھے بالکل کاٹھ کی پتلی بنانا چاہتی ہیں کہ بس ان کے اشاروں پر ناچا کروں۔ اتنا تو نہ ہو سکا کہ جب میں نے بند لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا تو مجھے پڑھ کر سنا دیتیں۔ آخر میں لکھوں کیا؟ نہیں معلوم کہ انھوں اپنے خط میں کیا لکھا ہے؟ دفعتاً اس کوخیال ہوا کہ میرا خط نصیحت کی شکل نہ اختیار کر لے۔ وہ اسے پڑھ کر شاید مجھ سے چڑ جائیں اپنے محبت کرنے والوں سے ہم سبق و نصیحت کی باتیں نہیں بلکہ محبت اور دل دہی کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ بڑی خیریت ہوئی۔ ورنہ وہ میری نصیحت آمیز تحریر کو پڑھ کر نہ جانے اپنے دل میں کیا سمجھتے۔ انھیں یال ہوتا کہ گرجا میں وعظ سنتے سنتے

اس کے جذبات محبت افسردہ و بے حس ہو گئے ہیں۔ اگر وہ مجھے ایسا خط لکھتے تو مجھے کتنا برا معلوم ہوتا آہ میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ ان سے صرف روحانی محبت کروں گی۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ روحانی محبت یا عقیدت صرف مذہبی دنیا کے لیے مخصوص ہے۔ عورت اور مرد میں پاک محبت ہونی غیر ممکن ہے محبت پہلے انگلی پکڑ کر فوراً پہنچا پکڑتی ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ محبت مجھے علم حقیقی کے بلند ترین معیار سے نیچے گرا رہی ہے۔ ہم کو زندگی اس لیے عطا کی گئی ہے کہ پاکیزہ خیالی اور نیک اعمالی سے اس کو اونچے مدارج پر پہنچائیں یہاں تک کہ ایک روز نور ازلی میں محو ہو کر نیست ہو جائیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ زندگی فانی ہے۔ چند روزہ ہے۔ اور دنیا کی ساری مسرتیں بھی فانی اور چند روزہ ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی پروانہ کی طرح شمع پر گر رہی ہوں۔ اسی لیے تو کہ محبت میں وہ بے خودی ہے کہ جو عقل احتیاط اور ارادہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اہل تصوف بھی جو روحانی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ خواہشات نفسانی سے مبرا نہیں رہ سکتے۔ جسے کوئی جبراً کھینچے لیے جا رہا ہو۔ اس کو جانے سے منع کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے۔

دُکھی لوگوں کے لیے رات ایک کٹھن تپیا سے کم نہیں ہے۔ جوں جوں رات گزرتی تھی صوفی کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات تک اپنے اندرونی جذبات سے لگاتار مقابلہ کرنے کے بعد اس نے بالآخر مجبور ہو کر اپنے دل کے دروازے عشق و محبت کی خوش فعلیوں کے لیے کھول دیے۔ جیسے کسی تماشا کا منیجر تماشائیوں کی کثرت سے تنگ آکر تماشاگاہ کو عوام کے لیے کھول دیتا ہے۔ باہر کا شور اندر کے نغمہ سرائیوں میں مخل ہوتا ہے۔ صوفی نے اپنے کو عشقیہ خیالات کی گود میں ڈال دیا اور بلا کسی ہچک یا رکاوٹ کے ان خیالات سے یوں لطف اندوز ہونے لگی۔ "کیوں ونے تم میرے لیے کیا کیا مصیبتیں جھیلوگے۔ بے عزتی! ذلت۔ نفرت والدین کی مخالفت۔ تم میرے لیے یہ سب باتیں سہ لوگے؟ لیکن مذہب؟ وہ دیکھو تمھارا چہرا اداس ہو گیا؟ تم سب کچھ کروگے پر مذہب نہیں ترک کر سکتے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں تمھارے ساتھ فاقہ کر سکتی ہوں ذلت حقارت رسوائی سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ پر مذہب کو کس طرح ترک کروں؟ یسوع کا دامن کیسے چھوڑوں۔ عیسائیت کی مجھے

پرواہ نہیں۔ یہ صرف خود غرضیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لیکن اس مقدس روح سے کیوں کر منحرف ہو سکتی ہوں۔ جو سراپا عفو و رحم تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں یسوع کے دامن سے وابستہ رہ کر بھی اپنی محبت کی خواہشات کو آسودہ کر سکوں۔ ہندو مذہب کے وسیع دامن میں کس کے لیے گنجائش نہیں؟ خدا کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ نہ ماننے والا بھی ہندو ہے۔ 33 کڑور دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ جہاں مہابیر کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے۔ مہاتما بدھ کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے وہاں کیا عیسیٰ کے بھگتوں کے لیے جگہ نہیں ہے؟ تم نے مجھے محبت کا نوید دیا ہے۔ میں اس کو نامنظور کیوں کروں؟ میں بھی تمھارے ساتھ خدمتی کاموں میں مشغول ہو جاؤں گی۔ تمھارے ساتھ جنگلوں میں پھروں گی۔ جھونپڑوں میں رہوں گی۔ آہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے وہ خط رانی صاحبہ کو ناحق دے دیا۔ میرا خط تھا۔ مجھے اس کے پڑھنے کا پورا حق تھا۔ میرے اور ان کے درمیان میں محبت کا رشتہ ہے۔ جو دنیا کے اور سبھی رشتوں سے پاکیزہ اور افضل ترین ہے۔ میں اس بارہ میں اپنے حق سے دست بردار ہو کر ونے کے ساتھ نا انصافی کر رہی ہوں۔ نہیں میں ان سے دغا کر رہی ہوں۔ میں محبت کو بدنام کر رہی ہوں۔ اور ان کے دلی جذبات کا مضحکہ اڑا رہی ہوں۔ وہ میرا خط پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تو مجھے اتنا رنج ہوتا کہ انھیں کبھی معاف نہ کرتی۔ کیا کروں؟ جاکر رانی صاحبہ سے وہ خط مانگ لوں؟ اسے دینے میں ان کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دل میں خواہ کتنا ہی برا مانیں پر میری امانت مجھے ضرور لوٹا دیں گی۔ وہ میری ماما کی طرح تنگ دل نہیں ہیں مگر ان سے مانگوں کیوں وہ تو میری چیز ہے۔ کسی اور شخص کا اس پر ذرا بھی اختیار نہیں۔ اپنی چیز لے لینے کے لیے میں کسی دوسرے کی احسان مند کیوں بنوں؟

گیارہ بج رہے تھے گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ صوفیہ نے کھڑکی سے باہر باغ کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دودھ کی بارش ہو رہی ہے۔ چاندنی خوب چھٹک رہی تھی۔ سنگ مرمر کی دونوں پریاں جو حوض کے کنارے کھڑی تھیں اس خاموش نغمہ کی نورانی مورتیں سی معلوم ہوتی تھیں۔ جس سے سارا منظر معمور تھا۔

صوفیہ کے دل میں زبردست خواہش ہوئی کہ اسی وقت چل کر اپنا خط اٹھا لاؤں وہ پختہ ارادہ کر کے اپنے کمرہ سے نکلی اور بے خوفی کے ساتھ رانی صاحبہ کے دیوان خانہ کی طرف چلی۔ وہ اپنے دل کو بار بار سمجھا رہی تھی مجھے خوف کس کا ہے۔ اپنی چیز لینے جا رہی ہوں۔ کوئی پوچھے تو اس سے صاف صاف کہہ سکتی ہوں۔ ونے سنگھ کا نام لینا کوئی جرم نہیں ہے۔

مگر لگاتار تشفی ملنے پر بھی اس کے قدم اتنی احتیاط سے پڑتے تھے کہ برآمدہ کے پختہ فرش پر بھی کوئی آہٹ نہ تھی۔ اس کے چہرہ سے وہ بے اطمینانی ظاہر ہو رہی تھی جو نیت فاسد کا نشان ہے وہ سہمی نگاہوں سے دائیں بائیں آگے پیچھے تاکتی جاتی تھی۔ ذرا سا بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو اس کے پیر خود بخود رک جاتے تھے اور برآمدہ کے ستونوں کی آڑ میں چھپ جاتی تھی۔ راستہ میں کئی کمرے تھے۔ اگر چہ ان میں تاریکی تھی اور روشنی گل ہو چکی تھی تا ہم وہ دروازہ پر ایک لحہ کے لیے رک جاتی تھی کہ کوئی ان میں بیٹھا ہو۔ دفعتاً ایک ٹیریر کتا جسے رانی صاحبہ بہت پیار کرتی تھیں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ صوفی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے ذرا بھی منہ کھولا کہ سارے مکان میں ہل چل ہو جائے گی۔ کتے نے اس کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے فیصلہ کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ صوفیہ نے آہستہ سے اس کا نام لیا اور اسے گود میں اٹھا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ کتا دُم ہلانے لگا لیکن اپنی راہ جانے کے بجائے وہ صوفیہ کے ساتھ ہولیا۔ شاید اس کی فطرت بتلا رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس طرح پانچ کمروں کے بعد رانی صاحبہ کا دیوان خانہ ملا۔ اس کے دروازے کھلے تھے۔ لیکن اندر اندھیرا تھا۔ کمرہ میں بجلی کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی بہت ہی خفیف حرکت سے کمرہ روشن ہو سکتا تھا۔ مگر اس وقت بٹن کا دبانا اسے بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگانے سے کم خطرناک نہ معلوم ہوتا تھا۔ روشنی سے وہ کبھی اس قدر خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ روشنی کے بغیر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب بھی نہ ہو سکتی تھی۔ وہی آب حیات بھی اور زہر ہلاہل بھی۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ کواڑوں میں شیشے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ پردے ہیں۔ تو بھی اس قدر باریک کہ آدمی کا منہ دکھائی دیتا ہے۔ گھر نہ ہوا کوئی سجی ہوئی دوکان ہوئی۔ بالکل

انگریزی نقل ہے۔ اور روشنی ٹھنڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے تو کوئی بہت بڑی کفایت نہیں ہو جاتی۔

ہم جب کسی تنگ سڑک پر چلتے ہیں تو ہمیں سواریوں کا آنا جانا بہت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان راستوں پر سواریوں کی آمد و رفت کی روک ہونی چاہیے۔ ہمارا اختیار ہوتا تو ان سڑکوں پر کوئی سواری نہ گزرنے دیتے۔ خصوصاً موٹروں کو، لیکن انھیں سڑکوں پر جب ہم کسی سواری پر بیٹھ کر چلتے ہیں تو قدم قدم پر مسافروں کو ہٹانے کے لیے رک جانے پر جھنجھلاتے ہیں کہ پٹری پر کیوں نہیں چلتے۔ خواہ مخواہ بیچ میں دھنسے پڑتے ہیں۔ مشکلات میں پڑ گرد و پیش کے حالات پر ناخوشی کا اظہار کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

صوفیہ کئی منٹ تک بجلی کے بٹن کے پاس کھڑی رہی۔ بٹن دبانے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ سارے صحن میں روشنی پھیل جائے گی۔ لوگ چونک پڑیں گے۔ اندھیرے میں سوتا ہوا آدمی بھی اجالا پھیلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ مجبوراً اس نے میز کو ٹٹولنا شروع کیا۔ دوات لڑھک گئی۔ سیاہی میز پر پھیل گئی اور اس کے کپڑوں پر داغ پڑ گئے۔ اسے یقین تھا کہ رانی نے خط کو اپنے ہینڈ بیگ (دستی بیگ) میں رکھا ہوگا۔ ضروری خطوط اسی میں رکھتی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس کو بیگ ملا۔ وہ اس میں سے ایک ایک خط نکال کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ لفافے زیادہ تر ایک ہی قسم کے تھے۔ نگاہیں کچھ کام نہ کر سکیں۔ آخر اس طرح مطلب بر آری ہوتے نہ دیکھ کر اس نے بیگ کو اٹھا لیا اور کمرہ سے باہر نکلی۔ سوچا کہ میرے کمرہ میں ابھی تک روشنی ہے وہاں وہ خط بآسانی مل جائے گا۔ اسے لاکر پھر یہیں رکھ دوں گی۔ لیکن واپس ہوتے وقت وہ اتنی ہوشیاری سے قدم نہ اٹھا سکی۔ آتے وقت وہ قدم قدم پر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آئی تھی۔ اب بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ خالی ہاتھ ہونے پر عذر کی گنجائش تھی۔ بھرے ہوئے ہاتھوں کے لیے کوئی عذر یا حیلہ نہ تھا۔

اپنے کمرہ میں پہنچتے ہی صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا اور پردے ڈال دیے۔ گرمی کی شدت سے سارا بدن پسینہ سے تر تھا۔ ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے رعشہ کا اثر ہو۔ وہ خطوط کو نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ اور خطوط کو محض دیکھنا نہ تھا۔ انھیں ان

کی جگہوں پر ترتیب کے ساتھ رکھنا بھی تھا۔ خطوط کا ایک دفتر سامنے تھا۔ برسوں کے خطوط بہ حفاظت رکھے ہوئے تھے۔ صوفیہ کو تلاش کرتے گھنٹوں گزر گئے۔ دفتر ختم ہونے پر آگیا پر وہ چیز نہ ملی۔ اسے اب کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخری خط بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس وقت صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ صوفیہ کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو کسی میلہ میں اپنے گم شدہ عزیز کو ڈھونڈتا ہو۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ اس کا نام لے کر زور زور سے پکارتا ہے۔ اس کو وہم ہوتا ہے کہ وہ کھڑا ہے۔لپک کر اس کے پاس جاتا ہے اور شرمندہ ہو کر واپس آتا ہے۔ بالآخر وہ مایوس ہوکر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور رونے لگتا ہے۔

صوفیہ بھی رونے لگی۔ وہ خط کہاں گیا؟ رانی نے تو اس کو میرے سامنے ہی اسی بیگ میں رکھ دیا تھا۔ ان کے اور سبھی خطوط یہاں موجود ہیں۔ کیا اسے کہیں اور رکھ دیا ؟ مگر امید اس گھاس کی مانند ہے جو گرمی کی حدّت سے جل جاتی ہے۔ زمین پر اس کا نشان تک نہیں رہتا۔ زمین ایسی صاف سفید ہو جاتی ہے۔ جیسے ٹکسال کا نیا روپیہ لیکن بارش کی بوند پڑتے ہی پھر جلی ہوئی جڑیں پنپنے لگتی ہیں اور خشک جگہ پر ہریاول لہرانے لگتی ہے۔

صوفیہ کی امید پھر ہری ہوئی۔ کہیں میں کوئی خط چھوڑ تو نہیں گئی؟ اس نے خطوط کو دو بارہ دیکھنا شروع کیا اور زیادہ غور کے ساتھ ایک ایک لفافہ کو کھول کر دیکھنے لگی کہ کہیں رانی نے اسے کسی دوسرے لفافہ میں نہ رکھ دیا ہو۔ جب دیکھا کہ اس طرح تو ساری رات گزر جائے گی تو انھیں لفافوں کو کھولنے لگی جو وزنی معلوم ہوئے۔ آخر یہ شک بھی رفع ہوگیا۔ اس لفافہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب امید کی جڑیں بھی سوکھ گئیں۔ بارش کا قطرہ نہ ملا۔

صوفیہ چار پائی پر لیٹ گئی گویا تھک گئی ہو۔ کامیابی جانفزا ہوتی ہے اور ناکامی جان گسل۔ امید ایک نشہ ہے اور مایوسی اس نشہ کا خمار۔ نشہ میں ہم گھر سے باہر دوڑتے ہیں اور خمار کے وقت ہم گھر میں آرام کرتے ہیں۔ امید مادہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور مایوسی روح کی طرف۔ امید آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ مایوسی آنکھیں

کھول دیتی ہے۔ امید سلانے والی تھپکی ہے۔ مایوسی جگانے والا چابک۔

صوفیہ کو اس وقت اپنی اخلاقی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔ میں نے ناحق اپنی روح کو گناہ گار بنایا۔ کیا میں رانی سے اپنا خط نہ مانگ سکتی تھی؟ انھیں اس کے دینے میں ذرا بھی توقف نہ ہوتا۔ پھر میں نے وہ خط انھیں دیا ہی کیوں؟ رانی صاحبہ کو کہیں میری یہ باتیں معلوم ہو گئیں اور ضروری ہی معلوم ہو جائیں گی۔ تو میری بابت اپنے دل میں کیا خیال کریں گی؟ غالباً مجھ سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص دوسرا نہ ہوگا۔

دفعتاً صوفیہ کے کانوں میں جھاڑو لگنے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑی۔ کیا سویرا ہو گیا؟ پردہ اٹھا کر دروازہ کھولا تو دن نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس نے درد آمیز نگاہوں سے دستی بیگ کی طرف دیکھا اور بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ عقل نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت اور کام پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ گردن پر چھری پھیر لوں۔ کون سا منہ دکھاؤں گی؟ رانی صاحبہ علی الصباح اٹھتی ہیں۔ مجھے ضروری ہی دیکھ لیں گی۔ لیکن اب اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ یا خدا! تو بے کسوں کا مددگار ہے۔ اب میری لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔ خدا کرے ابھی رانی صاحبہ نہ اٹھی ہوں۔ اس کی اس دعا میں کتنی عاجزی، کتنی مجبوری، کتنا درد، کتنی عقیدت اور کتنی غیرت تھی۔ شاید اس نے ایسی صاف دلی سے کبھی دعا نہ کی تھی۔

اب ذرا بھی دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے بیگ اٹھا لیا اور باہر نکلی۔ غرور کبھی اس قدر پامال نہ ہوگا۔ اس کے منہ میں سیاہی لگی ہوتی جب بھی شاید وہ اس طرح آنکھیں چراتی ہوئی نہ جاتی۔ کوئی شریف آدمی قیدی کی شکل میں بیڑیاں پہنے جاتا ہوا بھی اتنا خجل نہ ہوگا۔ جب وہ دیوان خانہ کے دروازہ پر پہنچی تو اس کا دل یوں دھڑکنے لگا گویا کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہو۔ وہ ذرا دیر ٹھٹکی۔ کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ رانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفیہ کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ گڑ گئی، کٹ گئی، سر پر بجلی گر پڑتی یا نیچے کی زمین پھٹ جاتی تو وہ بھی شاید اس بڑی مصیبت کے مقابلہ میں پھولوں کی بارش یا پانی کی چھینٹوں کی طرح خوشگوار معلوم ہوتی۔ اس نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے ہینڈ بیگ کو چپکے سے لے جا کر میز پر رکھ دیا۔ رانی نے اس کی طرف دل کو چھید ڈالنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس میں غصہ

نہ تھا، رحم نہ تھا، حقارت تھی، خالص، زندہ اور بولتی ہوئی۔

صوفیہ لوٹنا چاہتی تھی کہ رانی نے پوچھا۔ "کیا ونے کے خط کی جستجو تھی؟"

صوفیہ ساکت و خاموش رہ گئی۔ معلوم ہوا کسی نے جگر پر خنجر چلا دیا۔

رانی نے پھر کہا۔ "اسے میں نے علیحدہ رکھ دیا ہے۔ کہو تو منگوا دوں۔"

صوفیہ نے جواب نہ دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کو کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہوا۔

رانی نے تیسرا تیر چلایا۔ "کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟"

صوفیہ غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔

(14)

صوفیہ کو ہوش آیا تو کمرہ میں پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں رانی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟ وہ اپنے کو اس وقت اتنی حقیر سمجھ رہی تھی کہ گھر کا مہتر بھی اس کو گالیاں دیتا تو شاید سر نہ اٹھاتی۔ وہ نفس کے ہاتھوں اس قدر پامال ہو چکی تھی کہ اسے اپنے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ میرا دل مجھ سے وہ سب کچھ کرا سکتا ہے جس کے محض خیال سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں دوسروں پر کتنا ہنستی تھی۔ اپنی مذہبی رغبت پر کتنا فخر کرتی تھی۔ میں تناسخ اور نجات۔ خدا اور مادہ جیسے پیچیدہ مسائل پر غور و خوض کرتی تھی اور دوسروں کو خواہش اورخود غرضی کا غلام سمجھ کر ذلیل خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ خدا سے قریب تر ہو گئی ہوں۔ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے میں اپنے کو نجات کا مستحق خیال کرتی تھی۔ لیکن آج میری عقیدت کا پردہ فاش ہو گیا۔ آہ ونے کو یہ باتیں معلوم ہوں گی تو وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے؟ غالباً میں ان کی نگاہوں میں اتنی گر جاؤں گی کہ وہ مجھ سے بولنا بھی پسند نہ کریں میں بد نصیب ہوں۔ میں نے ان کو رسوا کیا۔ اپنے خاندان کو بدنام کیا۔ اپنے ضمیر کا خون کیا اور اپنے میز بانوں کی فیاضی کی توہین کی۔ میرے سبب مذہب بھی بدنام ہو گیا ورنہ کیا آج مجھ سے یہ پوچھا جاتا۔ کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے۔

اس نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ الماریوں پر مذہبی کتابیں قرینہ سے چنی ہوئی

تھیں۔ کتابوں کو دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہی میرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ میں سچ کی کھوج کرنے چلی تھی اور اس بری طرح گری کہ اب اٹھنا مشکل ہے۔

سامنے دیوار پر مہاتما بدھ کی تصویر آویزاں تھی ان کے چہرہ پر کتنا نور تھا صوفیہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ندامت ہوتی تھی بدھ کے زندہ جاوید ہونے کا اسے پہلے کبھی اتنا یقین نہ ہوا تھا۔ تاریکی میں لکڑی کا کنڈا بھی جاندار ہو جاتا ہے۔ صوفی کے دل پر ایسی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

ابھی نو بجے کا وقت تھا مگر صوفیہ کو گمان ہو رہا تھاکہ شام ہو رہی ہے۔ وہ سوچتی تھی۔ کیا سارے دن سوتی رہ گئی۔ کسی نے مجھے جگا یا بھی نہیں ؟کوئی کیوں جگانے لگا؟ یہاں اب میری پرواہ کس کو ہے؟ اور کیوں ہو؟ میں بد ذات ہوں۔ میری ذات سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔ جہاں رہوں گی وہیں آگ لگاؤں گی۔ میں نے بری ساعت میں اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ میرے ہاتھوں یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ میں ونے کو اپنے ساتھ ڈبو دوں گی۔ ماں کی بددعا کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا یا آج میرے دل میں ایسے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

یکا یک مسز سیوک کمرہ میں داخل ہوئیں۔ انھیں دیکھتے ہی صوفیہ کو اپنے سینہ میں جذبات کا ایک سیلاب سا آتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔وہی اب اس کا آخری سہارا تھا۔ یہیں اب اس کو وہ ہمدردی مل سکتی تھی۔ جس کے بغیر اس کا زندہ رہنا دشوار تھا۔ یہیں اب اس کو وہ آرام وہ سکون، وہ سایہ مل سکتا تھا۔ جس کے لیے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ ماں کی گودی کے سوا یہ روحانی خوشی اور کہاں مل سکتی ہے ؟ ماں کے سوا کون اسے چھاتی سے لگا سکتا ہے۔ کوئی اس کے دل پر مرہم رکھ سکتا ہے؟ ماں کی سخت کلامی اور اس کا دلآزارانہ سلوک۔ یہ سب اسی خوشی کی خواہش کے جوش میں غائب ہوگئے۔ اس کوایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری بے کسی پر ترس کھا کر ماما کو یہاں بھیجا ہے۔ ماں کی گودمیں اپنے دکھتے ہوئے سر کو رکھنے پر اس کو ایک بار پھر اس سکون اور تقویت کا احساس ہوا جس کی یاد اس کے دل سے اب تک محو نہ ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ کررونے لگی لیکن ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ تو مسٹر کلارک کے نوید کا مژدہ جان فزا سنانے کے لیے بے قرار ہو

رہی تھی۔ جوں ہی صوفیہ کے آنسو تھمے مسز سیوک نے کہا۔ ”آج تمھیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ مسٹر کلارک نے تمھیں اپنے یہاں بلا بھیجا ہے۔“

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا اس کو ماں کی یہ بات بے موقع معلوم ہوئی۔

مسز سیوک نے پھر کہا۔ ”جب سے تم یہاں آئی ہو وہ کئی مرتبہ تمھاری خیر و عافیت کا حال دریافت کر چکے ہیں۔جب ملتے ہیں تمھارا تذکرہ ضرور کر تے ہیں۔ ایسا شریف سویلین میں نے نہیں دیکھا۔ ان کی شادی کسی انگریز گھرانے میں ہو سکتی ہے اور یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تمھیں ابھی تک یاد کرتے ہیں۔“

صوفیہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ماں کی ثروت پسندی ناقابل برداشت تھی۔ نہ محبت کی باتیں ہیں نہ تشفی کے الفاظ۔ شاید حضرت یسوع نے بھی بلایا ہوتا تو یہ اتنا خوش نہ ہوتیں۔

مسز سیوک بولیں۔ ”اب تمھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ توقف سے محبت سرد ہو جاتی ہے اور پھر اس پر کوئی چوٹ نہیں پڑ سکتی۔ ایسا سنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک دانا کا قول ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں صرف ایک بار اپنی قسمت آزمائی کا موقع ملتا ہے اور وہی اس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ تمھاری زندگی میں یہ وہی موقع ہے اسے کھودیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گی۔“

صوفیہ نے مغموم ہوکر کہا۔ ”اگر مسٹر کلارک نے مجھے مدعو نہ کیا ہوتا تو شاید آپ مجھ کو یاد بھی نہ کر تیں۔“

مسز سیوک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے دل میں جو کچھ ہے وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پر ایسا کوئی دن نہیں جاتا میں تمھارے اور پر بھو کے لیے خدا سے دعا نہ کرتی ہوں۔ یہ انھیں دعاؤں کا اثر ہے کہ تمھیں یہ موقع نصیب ہوا ہے۔“

یہ کہہ کر مسز سیوک رانی جانہوی سے ملنے گئیں۔ رانی صاحبہ نے ان کی کوئی خاص عزت نہ نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولیں۔ ”آپ سے بہت۔دنوں میں ملاقات ہوئی۔“

مسز سیوک نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا۔ ”ابھی میری واپسی کی ملاقات آپ کے ذمہ باقی ہے۔“

رانی : آپ مجھ سے ملنے کے لیے آئیں کب؟ پہلے بھی صوفیہ سے ملنے آئی تھیں اور آج بھی۔ میں تو آج آپ کو ایک خط لکھنے والی تھی۔ اگر برا نہ مانئے تو ایک بات پوچھوں۔

مسز سیوک : پوچھئے۔ برا کیوں مانوں گی۔

رانی : مس صوفیہ کی عمر تو زیادہ ہوگئی۔ آپ نے اس کے بیاہ کی فکر کی یا نہیں؟ اب تو اس کا جتنی جلدی بیاہ ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ کیا آپ لوگوں میں لڑکیاں بہت سیانی ہونے پر بیاہی جاتی ہیں۔

مسز سیوک : اس کی شادی کب کی ہو گئی ہوتی۔ کئی انگریز بے طرح پیچھے پڑے۔ مگر یہ راضی ہی نہیں ہوتی۔ اس کو مذہبی کتب سے اس قدر دل چسپی ہے کہ شادی کو ایک جنجال سمجھتی ہے۔ آج کل حاکم ضلع مسٹر کلارک کے پیغامات آ رہے ہیں۔ دیکھوں اب بھی راضی ہوتی ہے یا نہیں۔ آج میں اس کو لے جانے ہی کے ارادہ سے آئی ہوں۔ میں ہندوستانی عیسائیوں سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی۔ ان کا طرز معاشرت مجھے پسند نہیں ہے۔ اور صوفی جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے کوئی انگریز شوہر ملنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو سکتی۔

رانی : میری رائے میں شادی ہمیشہ ہم قوم لوگوں میں کرنی چاہیے۔ یورپین لوگ ہندوستانی عیسائیوں کی کچھ بہت وقعت نہیں کرتے۔اور بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔

مسز سیوک : (غرور سے) ایسا کوئی یوروپین نہیں ہے جو میرے خاندان میں شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھے۔ ہم اور وہ ایک ہیں۔ ہم اور وہ ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ ایک ہی گرجا میں عبادت کرتے ہیں۔اور ایک ہی نبی کی امت میں ہیں۔ ہمارا اور ان کا طرز معاشرت رسم و رواج خورد و نوش سب ایک ہیں۔ یہاں انگریزوں کی سوسائٹی میں کلب میں دعوتوں میں ہماری ایک سی عزت ہوتی ہے۔ ابھی تین چار روز ہوئے لڑکیوں کو انعام تقسیم کرنے کا جلسہ تھا۔ مسٹر کلارک نے خود مجھے اس جلسہ کا صدر بنایا اور میں نے ہی انعامات تقسیم کیے۔ کسی ہندو یا مسلمان لیڈی کو یہ اعزاز نہیں حاصل ہو سکتا۔

رانی :   ہندو یا مسلمان جنھیں کچھ بھی اپنی ذاتی عزت کا خیال ہے۔ انگریزوں کے ساتھ ملنا جلنا اپنے لیے عزت کا باعث نہیں خیال کرتے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں میں جو لوگ انگریزوں کے ساتھ خورد و نوش رکھتے ہیں۔ انھیں لوگ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کا تو ذکر ہی کیا۔ سیاسی اقتدار کی بات اور ہے۔ ڈاکوؤں کی ایک جماعت عالموں کی ایک مجلس کو نہایت آسانی سے مغلوب کرسکتی ہے۔ مگر اس سے علماء کی عزت کچھ کم نہیں ہوتی۔ ہر ہندو جانتا ہے کہ حضرت مسیح بدھ مذہب کے زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ اور انھوں نے یہ تعلیم پائی تھی۔ اور جو علم انھوں نے یہاں حاصل کیا ہے۔ اسی کی اشاعت مغرب میں کی۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہندو انگریزوں کو اپنے سے بہتر خیال کریں۔

دونوں عورتوں میں اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی نیت کو سمجھتی تھیں۔ احسان مندی یا شکر گزاری کے الفاظ کسی کے منہ سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ جب مسز سیوک رخصت ہونے لگیں تو رانی ان کو پہنچانے کے لیے کمرہ کے دروازہ تک بھی نہ گئیں۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا اور ابھی مسز سیوک کمرہ ہی میں تھیں کہ وہ اپنا اخبار پڑھنے لگیں۔

مسز سیوک صوفیہ کے پاس گئیں تو وہ تیار تھی۔ کتابوں کے بنڈل بندھے ہوئے تھے۔ کئی خادمائیں ادھر ادھر انعام کے لالچ میں کھڑی تھیں۔ دل میں خوش تھیں کہ کسی طرح یہ بلا ٹلی۔ صوفیہ بہت اداس تھی۔ اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کو بہت رنج ہو رہا تھا۔اسے اپنی منزل مقصود کو پتہ نہ تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھاکہ تقدیر کہاں لے جائے گی۔ کیا کیا اذیتیں اٹھانی پڑیں گی۔ کشتیِ حیات کس گھاٹ لگے گی؟ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھاکہ ونے سنگھ سے پھر ملاقات نہ ہوگی ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہوں۔رانی صاحبہ کی اہانت آمیز گفتگو ان کا شکوہ اور اپنی غلطی سب کچھ بھول گئی۔ دل کی ایک ایک تار سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ اب ونے سے پھرملاقات نہ ہوگی۔ مسز سیوک بولیں "کنور صاحب سے بھی مل لوں؟"

صوفیہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ماما کو رات کے واقعہ کی خبر نہ مل جائے۔ کنور

صاحب کہیں مذاق ہی مذاق میں کہہ نہ ڈالیں بوئی۔ ”ان سے ملنے میں دیر نہ ہوگی۔ پھر مل لیجئے گا۔“

مسز سیوک : پھر کسے اتنی فرصت ہے ؟

دونوں کنور صاحب کے دیوان خانہ میں پہنچیں۔ وہاں اس وقت والنٹیروں کا ہجوم تھا۔ گڑھ وال میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ نہ اناج تھا نہ پانی۔ جانور مر رہے تھے۔پر انسانوں کو موت بھی نہ آتی تھی۔ ایڑیاں رگڑتے تھے اور سسکتے تھے۔ یہاں سے پچاس والنٹیروں کا ایک دستہ ان غمزدوں کی امداد کرنے کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اس وقت کنور صاحب ان کا انتخاب کر رہے تھے۔انھیں ضروری باتیں سمجھا رہے تھے۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس بڑھاپے میں بھی ان کا سردار ہونا منظور کر لیا تھا۔ دونوں اصحاب اس قدر مشغول تھے کہ مسز سیوک کی طرف کسی نے دھیان نہ کیا۔ آخر وہ خود بولیں۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب جانے کا ارادہ ہے ؟“

کنور صاحب نے مسز سیوک کو دیکھا اور بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا خیروعافیت دریافت کی اور ساتھ لے جاکر ایک کرسی پر بیٹھا دیا۔ صوفیہ اپنی ماں کے پیچھے جاکر کھڑی ہو گئی۔

کنور صاحب : یہ لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ وہاں لوگوں پر کتنی زبردشت مصیبت آ پڑی ہے۔

مسز سیوک : خدا ان لوگوں کو اپنے پاک مقصد میں کامیاب کرے۔ ان کے ایثار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں دیکھتی ہوں یہاں ان کی خاصی تعداد ہے۔

کنور صاحب : مجھے اتنی امید نہ تھی۔ ونے کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ سوچتا تھا اتنے والینٹیر (خدام وطن) کہاں ملیں گے۔ سبھوں کو نوجوانوں کی پست ہمتی کا رونا روتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ان میں جوش نہیں ہے۔ ایثار نہیں ہے۔ جان نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے ذاتی غرض کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی سیوا سمیتیاں قائم ہوئیں پر ایک بھی سرسبز نہ ہوئی۔ لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لوگوں کو ہمارے نوجوانوں کے بارہ میں کتنا وہم ہوا تھا۔ اب تک تین سو نام درج ہوچکے ہیں۔کچھ لوگوں نے تمام عمر قومی خدمت کی انجام دہی کا عہد کیا ہے۔ ان میں کئی اشخاص تو

ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی پر لات مار کر آئے ہیں۔ ان لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے بہت کچھ امید ہو گئی ہے۔

مسز سیوک : مسٹر کلارک کل آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو جلد ہی "سی آئی ای" کا خطاب ملے گا اور مجھے آپ کو مبارک باد دینے کا موقع۔

کنور صاحب : (شرما کر) میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ مسٹر کلارک مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو یہ ان کا حسن ظن ہے۔ مس سیوک۔ تیار رہنا کل تین بجے کی میل سے یہ لوگ روانہ ہوں گے۔ پربھو نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔

مسز سیوک : صوفی تو آج گھر جا رہی ہے (مسکرا کر) شاید آپ کو عنقریب ہی اس کا کنیا دان دینا پڑے۔ مسٹر کلارک جال پھیلا رہے ہیں۔

صوفیہ شرم سے گڑ گئی۔ اس کو اپنی ماں کے اوچھے پن پر غصہ آ رہا تھا۔ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ سمجھتی ہیں کہ مسٹر کلارک کا نام لینے سے کنور صاحب رعب میں آ جائیں گے۔

کنور صاحب : بڑی خوشی کی بات ہے۔ صوفی دیکھو ہم لوگوں کو اور خصوصاً اپنے غریب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ تمھیں ایشور نے جتنا اچھا دل عطا کیا ہے ویسا ہی اچھا موقع بھی مل رہا ہے۔ ہماری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی۔ تمھارے احسان سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی یاد کرتی رہنا۔ مجھے پہلے نامعلوم تھا ورنہ آج اندو کو ضرور بلا بھیجتا۔ خیر ملک کی حالت تم پر واضح ہے۔ مسٹر کلارک بہت ہی ہونہار آدمی ہیں ایک دن ضرور یہ اس ملک کے کسی صوبہ کی حاکم ہوں گے۔ میں یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔ اس وقت تم اپنے اثر اختیار اور اپنی قابلیت سے ملک کو بہت کچھ نفع پہنچا سکو گی۔ تم نے اپنے اہالیان ملک کی حالت دیکھی ہے۔ ان کی مفلسی کا تمھیں پورا احساس ہے۔ ان کی حالت کی اصلاح میں اسی احساس سے کام لینا۔

صوفیہ شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "آپ رانی صاحب کو ضرور ساتھ لایئے گا میں کارڈ بھیجوں گی۔"

کنور صاحب : نہیں۔ مسز سیوک مجھے معاف کیجئے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تقریب میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ میں حکام سے علاقہ نہ رکھوں گا۔ حکام کی نظر التفات ہم لوگوں کو دانستہ یا نا دانستہ طریقہ پر خود پسندی اور خود مختار بنا دیتی ہے۔ میں اپنے کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا کیوں کہ مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ میں اپنی قوم میں حاکم و محکوم ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق نہیں رکھنا چاہتا ہم سب محکوم ہیں۔ شاہ بھی محکوم ہے اور گدا بھی۔ جھوٹے اقتدار کے غرور سے میں اپنا سر نہیں پھرانا چاہتا۔

مسز سیوک : خدانے آپ کو راجہ بنایا ہے۔ راجوں ہی کے ساتھ تو راجہ کا میل ہوسکتا ہے۔ انگریز لوگ بابوؤں کو منہ نہیں لگاتے۔ کیوں کہ اس سے یہاں کے راجاؤں کی توہین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گنگولی : مسزسیوک۔ یہ بہت دنوں تک راجہ رہ چکا ہے۔ اب اس کا جی بھر گیا ہے۔ میں اس کا بچپن کا ساتھی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے دیکھنے میں یہ مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے پر کئی سال بڑا ہے۔

مسز سیوک : (ہنس کر) ڈاکٹر کے لیے یہ تو کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر : ہم دوسروں کا دوا کرنا جانتا ہے۔ اپنا دوا کرنا نہیں جانتا۔ کنور صاحب اسی بکھت (وقت) سے Pessimist (مایوس المزاج) ہے۔ اسی وجہ سے اس کے پڑھنے میں رکاوٹ پڑی۔ اب بھی اس کا وہی حال ہے۔ ہاں اب تھوڑا پھیر پھار ہوگیا ہے۔ پہلے فعل سے بھی۔ مایوسی پسند تھا اور قول سے بھی ۔ب اس کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہے۔ قول سے تو اب بھی ویسا ہی ہے پر کام وہ کرتا ہے جسے کوئی پکا (Optimist) امید پر بھروسہ رکھنے والاہی کر سکتا ہے۔

کنور صاحب : گنگولی تم میرے ساتھ بے انصافی کررہے ہو مجھ میں پر امید ہونے کے اوصاف ہی نہیں ہیں۔ ایسا شخص پرماتما کا بھگت ہوتا ہے۔ پکا گیانی پورا رشی۔ اس کو چاروں طرف پرماتما ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مستقبل پر بے اعتمادی نہیں ہوتی۔ میں شروع ہی سے تن آسانیوں کا غلام رہا ہوں۔ وہ روحانی علم نہیں حاصل کر سکا جسے امید کی کنجی کہنا چاہئے۔ میرے لیے نا امیدی (Pessimism)

کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسز سیوک ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ ایثار ہے۔ ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں وہ کسی عارف کامل کو بھی دہریہ بنا کر چھوڑتیں۔ جس شخص کے سات بیٹے جوان ہو ہو کر دنیا سے اٹھ جائیں لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرے۔ ایسی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ ان کی ہمت ٹوٹنا تو جانتی ہی نہیں۔ صدمات کی چوٹیں انھیں اور بھی ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ میں کم ہمت اور کمزور شخص ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی حکمران قوم محکوم قوم کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ کر سکتی ہے۔ انسانی فطرت کو میں کسی ملک میں کسی وقت بھی اس قدر بے لوث اور بے غرض نہیں پاتا۔ جس قوم نے ایک بار اپنی آزادی کھو دی۔ وہ پھر اس درجہ کو نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ غلامی ہی اس کی تقدیر ہوجاتی ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب انسانی فطرت کو اتنا خود غرض نہیں سمجھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خونخوار جانوروں کے دل میں بھی ازلی نور کی شعاعیں موجود رہتی ہیں۔ صرف پردہ ہٹانے کی ضرورت ہے۔ میں انگریزوں کی طرف سے مایوس ہوگیا ہوں۔ بر خلاف اس کے ان کو کامل یقین ہے کہ ہندوستان کی نجات انگریزوں ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور ہوگی۔

مسز سیوک : (روکھے پن سے) تو کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ شاید کسی قوم نے کسی ملک یا قوم کے ساتھ نہ کیا ہوگا؟

کنور صاحب : نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا۔

مسز سیوک : (تعجب سے) تعلیم کی اتنی اشاعت اور بھی کسی زمانہ میں ہوئی؟

کنور صاحب : میں اسے تعلیم نہیں کہتا جو انسان کو سراپا خود غرض بنا دے۔

مسز سیوک : ریل، تار، ڈاک، جہاز، یہ ساری کراماتیں انگریزوں ہی کے ساتھ آئیں۔

کنور صاحب : انگریزوں کے بغیر بھی آ سکتی تھیں اور اگر آئی بھی ہیں تو زیادہ انگریزوں ہی کے فائدہ کے لیے۔

مسز سیوک : ایسا قانون پہلے کبھی نہ تھا۔

کنور صاحب : بجا ہے۔ ایسا قانون کہاں تھا جو ناانصافی کو انصاف اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ انصاف کا گورکھ دھندا ہے۔

دفعتاً رانی صاحبہ کمرہ میں آئیں۔ صوفیہ کا چہرہ انھیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ وہ کمرہ کے باہر نکل گئی۔ رانی کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ مسز سیوک کو بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں چلتے چلاتے رانی سے پھر نہ بات بڑھ جائے۔ وہ بھی باہر چلی گئیں۔ کنور صاحب نے دونوں کو فٹن پر سوار کرایا صوفیہ نے آب دیدہ ہو کر کنور صاحب کو دست بستہ سلام کیا۔ فٹن چل دی آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ فٹن سڑک پر تیزی سے دوڑی چلی جاتی تھی اور صوفیہ رو رہی تھی۔ اس کی حالت اس بچہ کی سی تھی جو روٹی کھاتا ہوا مٹھائی والے کی آواز سن کر اس کے پیچھے دوڑے۔ ٹھوکر کھا کرگر پڑے۔ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے۔اور وہ روتا ہوا گھر لوٹ جائے۔

(15)

راجہ مہیندر کمار سنگھ اگر چہ اصولی معاملہ میں حکام سے ذرا بھی نہ دبتے تھے۔ لیکن فروعی امور میں وہ خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنا محض بیکار ہی نہیں بلکہ قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے۔ ان کو میانہ روی پر جتنا بھروسہ تھا اتنا پیش دستی پر نہ تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ موجودہ حالات گرد و پیش کے ہوتے ہوئے جو کچھ خدمت کر سکتے تھے وہ حکام کا اعتماد رکھ کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں کبھی کبھی مجبور ہوکر وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا جس سے انتہا پسندوں کو ان پر انگشت نمائی کا موقع مل جاتا تھا۔ ان میں اگر کوئی کمزوری تھی تو یہ کہ وہ عزت کے بھوکے تھے اور ایسے دیگر انسانوں کی طرح وہ اکثر مصلحت کے نقطۂ خیال سے نہیں بلکہ شہرت طلسمی کے خیال سے اپنا طرز عمل قائم کرتے تھے۔ پہلے انھوں نے انصاف کا پہلو لیتے ہوئے جان سیوک کو سورداس کی زمین دلانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب ان کو اس کے خلاف کام کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کے لیے تو پانڈے پور والوں کا طاہر علی کے گھر میں گھسنے پر آمادہ ہونا ہی کافی تھا لیکن دراصل جان سیوک اور مسٹر کلارک کی باہمی رفاقت نے ہی انھیں اپنا پہلا فیصلہ پلٹ دینے کی ترغیب دی تھی۔ لیکن ابھی انھوں نے بورڈ میں اس تجویز کو پیش نہ کیا تھا۔ یہ شک ہوتا تھا کہ کہیں لوگ مجھ پر ایک دولتمند سوداگر کی جانبداری کا الزام نہ لگائیں۔ ان کی

عادت تھی کہ بورڈ میں کوئی تجویز رکھنے سے پہلے وہ اندو سے یا اس کی عدم موجودگی میں اپنے کسی خاص دوست سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے اپنی بات کو ثابت کرتے ہوئے ان کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کر کے اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ اگرچہ ان کے ارادہ میں اس بحث مباحثہ سے کوئی فرق نہ واقع ہوتا بلکہ وہ اپنی بات پر قائم رہتے تاہم گھنٹہ دو گھنٹہ کے تبادلہ خیالات سے ان کو بہت تسکین ملتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ سمتی کے والنٹیر گڑھوال جانے کے لیے اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ اندو نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اگر چہ مطلع ابر آلود ہو رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ آسمان سیاہ تر ہوتا جا رہاتھا لیکن والنٹیروں کو رخصت کرنے اسٹیشن پر جانا ضروری تھا۔ رانی صاحبہ نے اس کو بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا تھا۔ وہ جانے کو تیار تھی کہ راجہ صاب اندر آئے اور اندو کو جانے پر تیار دیکھ کر بولے۔ ''کہاں جاتی ہو؟ بادل گھرا ہوا ہے۔''

اندو : سیوا سمتی کے لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ انھیں رخصت کرنے اسٹشن جا رہی ہوں۔ اماں جی نے بلایا بھی ہے۔

راجہ : پانی ضرور برسے گا۔

اندو : پردہ ڈال لوں گی اور بھیگ بھی گئی تو کیا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں جو قومی خدمت کے لیے اتنی دور جا رہے ہیں۔

راجہ : نہ جاؤ تو کوئی ہرج ہے؟ اسٹیشن پر مجمع زیادہ ہوگا۔

اندو : ہرج کیا ہوگا۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں وہ لوگ تو جائیں گے ہی لیکن دل نہیں مانتا۔ وہ لوگ گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کریں گے۔ نہ جانیں کب لوٹیں گے۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو کہ انھیں رخصت کر آوں۔ آپ بھی کیوں نہیں چلتے؟

راجہ : (متحیر ہوکر) میں؟

اندو : ہاں ہاں۔ آپ کے جانے میں کوئی ہرج ہے؟

راجہ : میں ایسی جماعتوں میں شریک نہیں ہوتا۔

اندو : کیسی جماعتوں میں۔

راده: اسی قسم کی جماعتوں میں۔

اندو: کیا سیوا سمتیوں سے ہمدردی رکھنا بھی قابل اعتراض ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسے مبارک کاموں میں شریک ہونا کسی کے لیے بھی شرم کی یا اعتراض کا سبب نہیں ہو سکتا۔

راجہ: تمھاری اور میری سمجھ میں بہت فرق ہے۔ اگر میں بورڈ کا صدر نہ ہوتا۔ اگر میں حکومت کا ایک رکن نہ ہوتا۔ اگر میں ایک ریاست کا مالک نہ ہوتا تو آزادی سے ہر ایک جمہوری تحریک میں حصہ لیتا۔ موجودہ حالت میں میرا کسی ایسی جماعت میں شریک ہونا اس بات کا ثبوت سمجھا جائے گا کہ حکام کی بھی اس جماعت سے ہمدردی ہے۔ میں اس غلط خیال کی اشاعت نہیں کرنا چاہتا۔ سیوا سمتی نوجوانوں کی جماعت ہے اور اگرچہ اس وقت اس نے خدمت عامہ کا معیار اپنے سامنے رکھا ہے۔ اور وہ اسی خدمت کے راستہ پر چلنے کی آرزو رکھتی ہے لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ خدمت یا فیض رسانی اکثر ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جسے کوئی حکومت مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ اور علانیہ یا پوشیدہ طریقوں سے اس کو برباد کر دینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔

اندو: تو آپ اس عہدہ سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے؟ اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہیں۔

راجہ: صرف اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ شہر کا انتظام جتنی خوبی سے میں کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اہل شہر کی خدمت کا ایسا عمدہ اور کمیاب موقع پاکر میں اپنی آزادی کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ میں ایک ریاست کا راجہ ہوں اور فطرتاً میری ہمدردی سرکار کے ساتھ ہے۔ مساوات اور جمہوریت کو جائیداد سے دشمنی ہے۔ میں اس وقت تک جمہوریت کا ساتھ نہ دوں گا۔ جب تک میں اپنی جائداد سے دست بردار ہو جانے کا ارادہ نہ کر لوں۔ میں قول سے جمہوریت کا پیرو بن کر اپنے فعل سے اس کا مخالف نہی بننا چاہتا۔ قول و فعل میں اتنا زبردست اختلاف ہونا میرے لیے نا قابلِ برداشت ہے۔ میں ان لوگوں کو فریبی اور مکار سمجھتا ہوں جو اپنی جائداد سے مستفید ہوتے ہوئے جمہوریت کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ

جمہوریت کے دیوتا کے پجاری بن کر وہ کس منہ سے عظیم الشان محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹر کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کی سیر کرتے ہیں اور دنیا کی نعمتوں کا دل کھول کر لطف اٹھاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے فرش ہٹا دینا اور سادی پوشاک پہن لینا ہی جمہوریت نہیں ہے۔ یہ بے حیائی اور دغا بازی ہے اپنے دستر خوان کے بچے کچھے ٹکڑوں کو غریبوں کے سامنے پھینک دینا جمہوریت کا منہ چڑانا ہے۔ اسے بد نام کرنا ہے۔

یہ حملہ کنور صاحب پر تھا۔ اندو سمجھ گئی۔ تیوریاں بدل گئیں۔ لیکن اس ضبط سے کام لیا اور اس ناخوشگوار قضیہ کو تمام کرنے کے لیے بولی۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تین بجنے والے ہیں ساڑھے تین بجے گاڑی چھوٹتی ہے۔ اماں جی سے ملاقات ہو جائے گی۔ ونے کی خیر و عافیت کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ایک پنتھ دوکاج ہوگا۔"

راجہ : جن وجوہ سے میرا جانا نامناسب ہے انھیں وجوہ سے تمھارا جانا بھی مناسب نہیں۔ تم جاؤ یا میں جاؤں۔ ایک ہی بات ہے۔

اندو اسی پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آئی اور سوچنے لگی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ زبردست ظلم! کہنے کو میں رانی ہوں مگر اتنا اختیار بھی نہیں کہ گھر سے باہر بھی جا سکوں۔ مجھ سے تو لونڈیاں ہی اچھی ہیں۔ دل بہت مغموم ہوگیا۔ آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ اس نے گھنٹی بجائی اور لونڈی سے کہا۔ "گاڑی کھلوا دو۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔"

مہیندر کمار بھی اس کے پیچھے ہی کمرہ میں آکر بولے۔ "کہیں سیر کیوں نہیں کر آتیں۔"

اندو : نہیں بادل گھرا ہوا ہے بھیگ جاؤں گی۔

راجہ : کیا ناراض ہوگئیں؟

اندو : ناراض کیوں ہوں؟ آپ کی لونڈی ہوں۔ آپ نے حکم دیا نہ جاؤ۔ نہ جاؤں گی۔

راجہ : میں تمھیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ اگر ہماری باتوں کو جان لینے کے بعد بھی تمھیں وہاں جانے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں معلوم ہوتی تو شوق سے جاؤ میرا

مقصد صرف تمھاری معقولیت پسندی کی تحریک سے تھا۔ میں انصاف کی طاقت سے روکنا چاہتا ہوں۔ حکم کی طاقت سے نہیں۔ بولو اگر تمھارے جانے سے میری بدنامی ہو تو تم جانا چاہو گی؟

یہ چڑیا کے پر کاٹ کر اسے اڑانا تھا۔ اندو نے اڑنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ "ہر گز نہیں یہ میرے دھرم کے خلاف ہے" لیکن اندو پر اپنی مجبوری اتنی کھل رہی تھی کہ اس نے اس سوال کو سنا ہی نہیں۔ یا سنا بھی تو اسے ان سنا کر دیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ میرے زخم پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ اماں اپنے دل میں کیا کہیں گی؟ میں نے بلایا اور نہیں آئی؟ کیا دولت کی ہوا لگ گئی؟ کس طرح معافی مانگوں گی۔ اگر لکھوں کہ طبیعت ناساز ہے تو وہ ابھی یہاں آ پہنچیں گی۔ اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ آہ اب تک تو وہاں پہنچ گئی ہوتی۔ پربھوسیوک نے بہت پراثر نظم لکھی ہوگی۔ دادا جی کا وعظ بھی معرکہ کا ہوگا۔ایک ایک لفظ محبت اور رغبت میں ڈوبا ہوا۔ والنٹیر لوگ اپنی خوشنما وردیوں میں کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہوں گے۔

اس قسم کے خیالات نے اندو کو اس قدر خواہش مند بنا دیا کہ وہ ضد کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ میں تو جاؤں گی۔ بدنامی نہیں پتھر ہوگی۔ یہ سب مجھے روک رکھنے کے بہانے ہیں۔ تم ڈرتے ہو ڈرو۔ اپنے کرموں کے پھل بھوگو۔ اپنے دل میں یہ خیالات لاتے ہوئے اس نے مصمم لہجہ میں کہا۔ "آپ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں جاتی ہوں۔"

راجہ نے بے دلی سے کہا۔ "تمھاری مرضی۔ جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔"

اندو چلی گئی تو راجہ صاحب سوچنے لگے۔ عورتیں کتنی بیدرد کتنی خود پسند اور کتنی ضدی ہوتی ہیں۔ چلی جا رہی ہے گویا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ حکام کے کانوں تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ مجھے کیا کہیں گے۔اخبارات کے نامہ نگار یہ خبر ضرور ہی لکھیں گے اور وہاں جانے والی عورتوں میں چتاری کی رانی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ میں جانتا ہوں کہ اتنی ضد کریں گی تو منع ہی کیوں کرتا۔ خود بھی ساتھ جاتا۔ ایک طرف بدنام ہوتا تو دوسری طرف نیک نام۔

اب تو دونوں طرف سے گیا۔ ادھر بھی برا بنا اور ادھر بھی۔ آج معلوم ہوا کہ عورتوں کے سامنے محض صاف گوئی سے کام نہیں چلتا۔ وہ راضی رہتی ہیں تو دل جوئی سے!

اندو اسٹیشن کی طرف چلی۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتی تھی۔ اس کا دل ایک بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ میدان میں جسے ہم فتح کہتے ہیں گھر میں اسی کا نام کج خلقی۔ بے مروتی اور نا اہلیت ہے۔ اندو کو اس فتح پر غرور نہ تھا۔ اپنی ضد کا ملال تھا۔ سوچتی جاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے دل میں کتنی خودسر و مغرور سمجھ رہے ہوں گے کہ جب یہ ذرا ذرا سی باتوں میں آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ذرا ذرا سے اختلافات میں یوں لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کسی نازک موقع پر اس سے ہمدردی و غمگساری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اماں جی یہ حال سنیں گی تو مجھی کو بھلا برا کہیں گی۔ بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ واپس چلوں اور ان سے اپنی اس غلطی کے لیے معافی مانگوں۔ میرے سر پر نہ جانے کیوں بھوت سوار ہو جاتا ہے خواہ مخواہ الجھ پڑی۔ بھگوان! مجھے کب اتنی عقل آئے گی کہ ان کی مرضی پر سر جھکانا سیکھوں گی؟ اندو نے باہر کی طرف سر نکالا کر دیکھا اسٹیشن کا سگنل نظر آ رہا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا ایک انبوہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا اس نے کوچوان سے کہا۔ ”گاڑی پھیر دو میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ گھر واپس چلو۔“

کوچوان نے کہا۔ ”سرکار اب تو آگئے وہ دیکھیے۔ کئی آدمی مجھے اشارتاً کہہ رہے ہیں کہ گھوڑوں کو بڑھاؤ گاڑی پہنچاتے ہیں۔“

اندو : کچھ پرواہ نہیں۔ فوراً گھوڑے پھیر دو۔

کوچوان : کیا سرکار کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟

اندو : بک بک مت کرو۔ گاڑی واپس لے چلو۔

کوچوان نے گاڑی پھیر دی اندو نے ایک لمبی سانس لی اور سوچنے لگی۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ گاڑی دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ اماں کتنی خوش ہوئی ہوں گی۔ پر گاڑی کو لوٹتے دیکھ کر انھیں اور دوسرے لوگوں کو کتنا تعجب ہوا ہو گا۔

کوچون سے کہا۔ "ذرا پیچھے منہ پھیر کر دیکھو کوئی آ تو نہیں رہا ہے؟"

کوچوان : حضور۔ کوئی گاڑی تو آ رہی ہے۔

اندو : گھوڑوں کو تیز کر دو۔ سر پٹ چھوڑ دو۔

کوچوان : حضور گاڑی نہیں موٹر ہے۔ صاف موٹر ہے۔

اندو : گھوڑوں کو چابک لگاؤ۔

کوچوان : حضور یہ تو اپنی ہی موٹر معلوم ہوتی ہے مہیندر سنگھ چلا رہے ہیں خوب پہچان گیا۔ اپنی ہی موٹر ہے۔

اندو : پاگل ہو۔ اپنی موٹر یہاں کیوں آنے لگی۔

کوچوان : حضور۔ اپنی موٹر نہ ہوتو جو چور کی سزا وہ میری۔ صاف نظر آ رہی ہے۔ وہی رنگ ہے۔ ایسی موٹر اس شہر میں دوسری ہے ہی نہیں۔

اندو : ذرا غور سے دیکھو۔

کوچوان۔ کیا دیکھوں۔ حضور۔ وہ آ پہنچی۔ سرکار بیٹھے ہیں۔

اندو : خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے!

کوچوان : لیجئے حضور۔ یہ برابر آگئی۔

اندو نے گھبرا کر باہر دیکھا تو سچ مچ اپنی ہی موٹر تھی، گاڑی کے برابر پہنچ کر وہ رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے۔کوچوان نے گاڑی روک دی۔ اندو نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کب آگئے؟"

راجہ : تمھارے آنے کے پانچ منٹ بعد میں بھی چل پڑا۔

اندو : راستہ میں تو کہیں نہیں دکھائی دیے۔

راجہ : لائن کی طرف سے آیا ہوں۔ ادھر کی سڑک خراب ہے۔ میں نے سمجھا ذرا چکر تو پڑے گا مگر جلد پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن کے سامنے سے کیسے لوٹ آئیں۔ کیا بات ہے؟ میں تو گھبرا گیا۔ آؤ موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن پر گاڑی آگئی ہے۔ دس منٹ میں چھوٹ جائے گی۔ لوگ ملنے کے خواہش مند ہیں۔

اندو : اب میں نہ جاؤں گی۔ آپ تو پہنچ ہی گئے تھے۔

راجہ : تمھیں چلنا پڑے گا۔

اندو : مجھے مجبور نہ کیجیے۔ میں نہ جاؤں گی۔

راجہ : پہلے تو تم یہاں آنے کے لیے اتنی بے قرار تھیں۔ اب کیوں انکار کر رہی ہو۔

اندو : آپ کی مرضی کے خلاف آئی تھی۔ آپ نے میری خاطر اپنے اصول کو توڑ دیا تو میں کس منہ سے وہاں جا سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ کے لیے رواداری کا سبق دے دیا۔

راجہ : میں ان لوگوں سے تمھیں لانے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ تم نہ چلوگی تو مجھے کتنا محجوب ہونا پڑے گا۔

اندو : آپ خواہ مخواہ اصرار کر رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا یہ آخری موقع تھا۔ اب پھر اتنی جرأت نہ کروں گی۔

راجہ : انجن سیٹی دے رہا ہے۔

اندو : ایشور کے لیے مجھے جانے دیجیے۔

راجہ نے مایوس ہو کر کہا جیسی تمھاری مرضی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور تمھارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو ہر وقت اپنا اثر دکھلاتا رہتا ہے۔

یہ کہہ وہ موٹر پر سوار ہو گئے اور بڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف چلے۔ فٹن بھی آگے بڑھی۔ کوچوان نے پوچھا کہ حضور گئی کیوں نہیں۔ سرکار برا مان گئے۔

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا مجھ سے پھر غلطی ہوئی؟ کیا جانا مناسب تھا؟ کیا وہ سچے دل سے میرے جانے کے لیے اصرار کر رہے تھے یا ایک تازیانہ لگانا چاہتے تھے؟ ایشور ہی جانے۔ وہی عالم الغیب ہے میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل پھٹ رہے تھے۔ لیکن اندو کے دل پر چھائی گھٹا لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھنی ہوتی جا رہی تھی۔ "آہ کیا واقعی ہمارے ستاروں میں کوئی فطری نا مناسبت ہے جو قدم قدم پر ہمارے ارادوں کو پامال کرتی رہتی ہے؟ میں کتنا چاہتی ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ چلوں مگر یہ طالع کی نحوست مجھے ہمیشہ زک دیتی ہے۔ اگر وہ صاف دلی سے اصرار

کر رہے تھے تو میرا انکار سراسر بیجا تھا۔ آہ انھیں میرے ہاتھوں پھر دکھ پہنچا انھوں نے اپنی جبلی شرافت سے مجھے معاف کر دیا۔ اور میری دل جوئی کے لیے اپنے اصول کی پرواہ نہ کی۔ سمجھے ہوں گے اکیلی جائے گی تو لوگ خیال کریں گے کہ شوہر کی مرضی کے خلاف آئی ہے۔ ورنہ کیا وہ بھی نہ آتے۔ مجھے اس الزام سے بچانے کے لیے انھوں نے اپنے اوپر اتنا جبر کیا۔ میری حماقت سے وہ کس قدر مایوس ہوئے ہیں ورنہ ان کے منہ سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔ میں سچ مچ ابھاگی ہوں۔"

انھیں افسوس ناک خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ چندر بھون پہنچی اور گاڑی سے اتر کر سیدھے راجہ صاحب کے دیوان خانہ میں جا بیٹھی۔ آنکھیں چرا رہی تھی کہ کسی نوکر چاکر سے سامنا نہ ہو جائے۔اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرہ پر کوئی داغ لگا ہوا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ راجہ سے آتے ہی آتے مجھ پر بگڑنے لگیں۔ مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیں۔ جگر کو طعنوں کے تیروں سے چھلنے بنا دیں۔ یہی ان کی صاف دلی کا ثبوت ہوگا۔ اگر وہ آکر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں تو سمجھ جاؤں گی کہ میری طرف سے ان کا دل صاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب محض ظاہر داری ہے۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی سخت گیری کی خواہش مند تھی۔ گرمیوں میں کسان بارش کا نہیں بلکہ حدت کا بھوکا ہوتا ہے۔

اندو کو بہت دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ بجتے بجتے راجہ صاحب آ پہنچے۔ وہ دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ راجہ صاحب اس کو دیکھتے ہی محبت آمیز لہجہ میں بولے۔ "تم نے آج قومی سرگرمی کا ایک بے مثل نظارہ دیکھنے کا موقع کھو دیا۔ بڑا ہی دلکش منظر تھا کوئی ہزار آدمیوں نے جس وقت جانے والوں پر پھول برسائے تو ساری زمین پھولوں سے ڈھک گئی۔ والینٹروں کا قومی گانا تو اتنا پر اثر تھا کہ تماشائی مست ہو گئے۔ میرا دل قومی غرور سے اچھلنے لگا۔ بار بار یہی افسوس ہوتا تھا کہ تم نہ ہوئیں یہی سمجھ لو کہ میں اس لطف کا اظہار نہیں کرسکتا۔ میرے دل میں سیوا سمتی کے متعلق جتنے شکوک تھے وہ سب رفع ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ میں بھی سب کچھ چھوڑ کر اس جماعت کے ساتھ چلا جاتا ڈاکٹر گنگولی کو اب تک میں بالکل بکواسی سمجھتا تھا۔ آج میں ان کا حوصلہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔تم نے سخت غلطی کی۔ تمھاری ماما جی بار

بار پچھتاتی تھیں۔"

اندو کو جس بات کا خوف تھا وہ پوری ہوگئی۔ سوچا کہ یہ سب ظاہر داری ہے ان کا دل صاف نہیں ہے۔ یہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ اس شیریں بیانی کے پردہ میں کتنی تلخی چھپی ہوئی ہے۔ چڑھ کر بولی۔ "میں جاتی تو آپ کو ضرور برا معلوم ہوتا۔"

راجہ : (ہنس کر) محض اس لیے کہ میں نے تمھیں جانے سے روکا تھا۔ اگر مجھے برا معلوم ہوتا تو میں خود ہی کیوں جاتا۔

اندو : معلوم نہیں۔ آپ کیا سمجھ کر گئے۔ شاید مجھے خفیف کرنا منظور تھا۔

راجہ : اندو اتنی بدگمان نہ ہو۔ سچ کہتا ہوں مجھے تمھارے جانے کا ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تمھاری ضد بری معلوم ہوئی۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے اپنا طرز عمل بالکل غیر مناسب معلوم ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ تمھاری آزادی میں اس حد تک مخل ہونا میری زیادتی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی غرض سے میں اسٹیشن گیا۔ تمھاری وہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ حکام کے دلوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہو؟ نیک نام رہنا اچھی بات ہے لیکن نیک نامی کے لیے سچی باتوں میں دبنا اپنے ضمیر کا خون کرنا ہے۔ اب تو تمھیں میری باتوں کا یقین ہوا؟

اندو : آپ کی دلیلوں کا جواب میں نہیں دے سکتی لیکن آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جب مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو تو آپ مجھ کو تنبیہ کریں مجھے ملامت کریں۔ جرم اور سزا میں علت اور معلول کا واسطہ ہے اور یہی میری سمجھ میں آتا ہے خطا کار کے سر پر تیل چپڑتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بات غیر قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

راجہ : دیوی روٹھتی ہیں تو لوگ انھیں مناتے ہیں۔ اس میں غیر قدرتی بات کیا ہے؟

دونوں میں دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ مہیندر بہیلیے (صیاد) کی طرح دانہ دکھا کر چڑیا کو پھنسانا چاہتے تھے اور چڑیا ڈر کر اڑ جاتی تھی۔ فریب سے فریب ہی پیدا ہوتا ہے۔ وہ اندو کی تشفی نہ کرسکے۔ تب وہ اس کی تکلیف کے رفع کرنے کا کام وقت

پر چھوڑ کر ایک خط پڑھنے لگے اور اندو دل پر بوجھ رکھے ہوئے اندر چلی گئی۔

دوسرے روز راجہ صاحب نے روزانہ اخبار کھولا تو اس میں رضا کاروں کی رخصتی کا تذکرہ بہ تفصیل شائع ہوا تھا۔ ضمناً راجہ صاحب کی موجودگی پر بھی رائے زنی کی گئی تھی۔ "اس موقع پر میونسپلٹی کے صدر راجہ مہیندر کمار سنگھ کی موجودگی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعجب ہے کہ راجہ صاحب جیسے معاملہ فہم شخص نے وہاں جانا کیوں ضروری سمجھا ؟ راجہ صاحب اپنی ذات کو اپنے عہدہ سے جدا نہیں کر سکتے اور ان کی موجوددگی گورنمنٹ کو ابجھن میں ڈالنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ تجربہ نے یہ بات ثابت کردی ہے۔ سیوا سمتیوں کا آغاز خواہ کتنے ہی نیک ارادوں کو لے کر ہوا ہو لیکن انجام کار وہ بغاوت اور بد امنی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ کیا راجہ صاحب اس کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ یہ سیوا سمتی بھی آگے چل کر اپنی پیشرو سمتیوں کے نقش قدم پر نہ چلے گی؟

راجہ صاحب نے اخبار بند کرکے رکھ دیا اور خیال میں غرق ہوگئے۔ ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ آج کلب میں جاتے ہی جاتے مجھ پر چاروں طرف سے مشتبہ نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ کل ہی کمشنر صاحب سے ملنے جانا ہے۔ انھوں نے اس بارہ میں کچھ پوچھا تو کیا کہوں گا۔ اس کم بخت اڈیٹر نے مجھے برا چرکا دیا۔ پولیس والوں کی طرح اس فرقہ میں بھی مروت نہیں ہوتی۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ میں اس کا منہ بند رکھنے کے لیے اسے خوش رکھنے کے لیے کتنی کوششیں کیا کرتا ہوں۔ ضروری اور غیر ضروری اعلانات چھپوا کر اس کی مٹھیاں گرم کرتا رہتا ہوں۔ جب کوئی دعوت یا تقریب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسے مدعو کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سال گذشتہ میں اسے میونسپلٹی سے انعام بھی دلا دیا تھا۔ انھیں خاطرداریوں کا یہ صلہ ہے۔ کتے کی دم کو سو برس تک گاڑ رکھو پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ اب اپنی پوزیشن کو کیوں کر صاف کروں۔ اس کے پاس جانا تو درست نہیں۔ کیا کوئی حیلہ سوچوں؟"

راجہ صاحب بہت دیر تک اسی شش و پنج میں پڑے رہے۔ کوئی ایسی بات سوچ نکالنا چاہتے تھے جس سے حکام کی نگاہوں میں وقار قائم رہے اور ساتھ ہی عوام کی

نگاہوں میں بھی۔ مگر عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ چل کر اندو سے اس گتھی کو سلجھانے میں مدد لوں۔ پر یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ کہہ دے کہ حکام ناراض ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ تمھیں ان سے کیا سروکار۔ اگر وہ تمھیں دبائیں تو فوراً استعفیٰ دے دوں تو پھر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہے گا۔ اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ تمام رات اسی فکر میں ڈوبے رہے۔ اندو بھی کچھ گم سم سی رہی۔ علی الصباح دو چار احباب آ گئے اور انھوں نے اسی مضمون کا تذکرہ کیا۔ ایک صاحب بولے۔ ''میں کمشنر سے ملنے گیا تھا تو وہ اسی مضمون کو پڑھ رہے تھے اور رہ رہ کر زمین پر پیر ٹپکتے جاتے تھے۔''

راجہ صاحب کے ہوش اور بھی اڑ گئے فوراً انھیں ایک تدبیر سو جھ گئی۔ موٹر تیار کرائی اور کمشنر کے بنگلہ پر جا پہنچے۔ یوں تو صاحب بہادر راجہ صاحب کو ان کا کارڈ پاتے ہی بلا لیا کرتے تھے۔ آج اردلی نے کہا۔ ''صاحب ایک ضروری کام کر رہے ہیں میم صاحب بیٹھی ہیں۔ آپ ایک گھنٹہ ٹھہریں۔''

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ وہیں بیٹھ کر ایک انگریزی رسالہ کی تصاویر دیکھنے لگے۔ واہ کتنی صاف اور خوشنما تصاویر ہیں۔ ہمارے رسالوں میں کتنی بھدی ہوتی ہیں۔ فضول ہی کاغذ کو لیپ پوت کر خراب کیا جاتا ہے۔

کسی نے بہت کیا تو ملک الشعرا بہاریؔ کے جذبات کی بنا پر کسی خوب صورت نازنین کی تصویر بنوا دی اور اس کے نیچے اسی نوعیت کا دوہا لکھ دیا کسی نے پدماکر کی کبت پر تصویر بنوا لی۔ بس اس کے آگے کسی کی عقل رسا نہیں ہوتی۔

کسی طرح ایک گھنٹہ گزارا اور صاحب نے بلایا۔ راجہ صاحب اندر گئے تو صاحب کے تیور پر بل پڑے ہوئے نظر آئے۔ ایک گھنٹہ کے انتظار سے جھنجھلا گئے تھے۔ کھڑے کھڑے بولے۔ ''آپ کو فرصت ہو تو میں کچھ کہوں ورنہ پھر کبھی آؤں گا۔''

کمشنر صاحب نے رکھائی سے پوچھا۔ ''میں پہلے آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس اخبار نے آپ پر جو رائے زنی کی ہے وہ آپ کی نظر سے گذری ہے؟''

راجہ صاحب : جی ہاں دیکھ چکا ہوں۔

کمشنر : کب اس کا کوئی جواب دینا چاہتے ہیں؟

راجہ صاحب : میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر محض اتنی سی بات پر مجھ پر شک کیا جا سکتا ہے اور میری سالہا سال کی وفاداری کا کچھ خیال نہیں کیا جا تا تو مجھے مجبور ہو کر اپنے عہدہ سے استعفٰے دینا پڑے گا۔ اگر آپ خود وہاں جاتے تو کیا اس کی اتنی جرأت ہوتی کہ آپ کے بارہ میں بھی اسی قسم کی رائے زنی کرتا؟ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جب تک مجھ پر اس قسم کے بیجا حملے ہوتے رہیں گے میں نہیں سمجھتا کہ اپنے فرائض کو کس طرح انجام دے سکوں گا۔

کمشنر نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "گورنمنٹ کے ہر ایک عملہ کا فرض ہے کہ اپنے اوپر ایسے الزامات لگائے جانے کا موقع نہ دے۔"

راجہ صاحب : میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح میرے بورڈ کے رفقاء کے لیے یہ بھول جانا بالکل ناممکن ہے کہ میں حکومت کا ایک رکن ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بوڈ کے سامنے مسٹر جان سیوک کو پانڈے پور والی زمین دیے جانے کی تجویز پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن جب تک میں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت نہ کر دوں گا کہ میں نے خود بغیر کسی دباؤ کے صرف رعایا کے مفاد کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے۔ اس وقت اس کی منظوری کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے میں کل اسٹیشن گیا تھا۔

کمشنر کی باچھیں کھل گئیں۔ ہنس ہنس کر باتیں بنانے لگا۔

راجہ صاحب : ایسی حالت میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جواب دینا ضروری ہے؟

کمشنر : نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔

راجہ صاحب : مجھے آپ سے پوری مدد ملنی چاہیے۔

کمشنر : میں حتی الامکان آپ کی مدد کروں گا؟

راجہ صاحب : بورڈ نے منظور بھی کر لیا تو محلّہ والوں کی طرف سے فساد کا اندیشہ ہے۔

کمشنر : کچھ پرواہ نہیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تاکید کروں گا کہ وہ آپ کی مدد کرتے رہیں۔

راجہ صاحب یہاں سے چلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان پر چل رہے ہیں۔

یہاں سے وہ مسٹر کلارک کے پاس گئے۔ اور وہاں بھی اسی حکمت سے کام لیا۔ دو پہر کو گھر آئے۔ ان کے دل میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ اس بہانہ سے میرا کام تو نکل گیا لیکن میں سورداس کے ساتھ کہیں ایسی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں کہ بالآخر مجھے شہر والوں کے سامنے نادم ہو نا پڑے۔اسی معاملہ پر گفتگو کرنے کے لیے وہ اندو کے پاس گئے۔ اور بولے۔ "تم کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہو۔ مجھے ایک معاملہ میں تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

اندو ڈر گئی کہ کہیں مشورہ ہوتے ہوتے منازعہ کی نوبت نہ آئے۔ بولی کام تو کچھ نہیں کر رہی ہوں لیکن میں آپ کو کوئی صلاح دینے کے قابل نہیں ہوں۔

ایشور نے مجھ کو اتنی عقل ہی نہیں دی۔ مجھے تو اس نے کھانے، سونے اور آپ کو دق کرنے کے لیے بنایا ہے۔"

راجہ صاحب : تمھارے دق کرنے ہی میں تو مزہ آتا ہے۔ بتلاؤ سورداس کی زمین کے بارہ میں تمھاری کیا رائے ہے؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟

اندو : آخر آپ نے کیا تجویز کیا۔

راجہ صاحب : پہلے تم بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔

اندو : میری رائے میں تو سورداس کے باپ دادوں کی زمین چھین لینا سراسر انصاف کے خلاف ہوگا۔

راجہ صاحب : تمھیں معلوم ہے کہ سورداس کو اس زمین سے کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہے۔ صرف ادھر ادھر کے مویشی چرا کرتے ہیں۔

اندو : اسے یہ اطمینان تو ہے کہ یہ زمین میری ہے۔ محلہ والے اس کا احسان تو مانتے ہی ہوں گے۔ اس کی مذہبی خواہش اس کار ثواب سے پوری ہوتی ہوگی۔

راجہ صاحب : لیکن میں شہر کے ایک خاص منتظم کی حیثیت سے ایک شخص کے واقعی یا فرضی فائدہ کے لیے شہر کے ہزاروں روپیہ کا نقصان تو نہیں کرسکتا۔ کارخانہ کھلنے سے ہزاروں مزدوروں کی پرورش ہوگی۔ شہر کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بے شمار دولت کا ایک حصہ ملک میں رہ جائے گا جو سگریٹ کے لیے دوسرے ملکوں کے حوالہ دینا پڑتا ہے۔

اندو نے راجہ صاحب کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ سوچنے لگی۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ سر مایہ داروں سے تو ان کو کوئی خاص انس نہیں ہے۔ یہ تو مشورہ نہیں۔ بحث ہے۔ کیا حکام کے دباؤ سے انھوں نے زمین کو مسٹر سیوک کے حوالہ کر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ سے اپنی تجویز کی تائید کرانی چاہتے ہیں؟ ان کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا ہے۔ بولی۔ ''اس نقطہ خیال سے تو یہ قرین انصاف ہے کہ سورداس سے وہ زمین چھین لی جائے۔''

راجہ صاحب : بھئی اتنی جلدی پہلو بدلانے کی سند نہیں۔ اپنی اسی دلیل پر قائم رہو۔ میں صرف مشورہ نہیں چاہتا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کے متعلق کیا کیا اعتراضات کر سکتی ہو اور میں ان کا معقول جواب دے سکتا ہوں یا نہیں۔ مجھے تو جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ اب تم سے بحث کر کے اپنا اطمینان کر نا چاہتا ہوں۔

اندو : اگر میری زبان سے کوئی لفظ خلاف مزاج نکل جائے تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

راجہ صاحب : اس کی پرواہ نہ کرو۔ قومی خدمت کا دوسرا نام بے حیائی ہے۔ اگر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگیں تو ہمیں پاگل خانے جانا پڑے۔

اندو : اگر ایک شخص کے ذاتی مفاد کے لیے آپ شہر کا نقصان نہیں کر نا چاہتے تو کیا سورداس ہی ایسا شخص ہے جس کے پاس دس بیگھے زمین ہو؟ شہر میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس اس سے کہیں زیادہ زمین ہے۔ کتنے ہی ایسے بنگلے ہیں جن کا احاطہ دس بیگھے سے زیادہ ہے۔ ہمارے بنگلہ کا احاطہ پندرہ بیگھے سے کم نہ ہوگا۔ مسٹر سیوک کے بنگلہ کا بھی پانچ بیگھے سے کم نہیں ہے اور دادا جی کا بنگلہ تو پورا ایک گاؤں ہے۔ آپ ان میں سے کہیں کی زمین اس کارخانہ کے لیے لے سکتے ہیں۔ سورداس کی زمین میں تو محلّہ کے مویشی چرتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو ایک محلّہ کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔ ان احاطوں سے تو ایک تنہا شخص کے سوا اور کسی کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی ان میں سیر بھی نہیں کر سکتا۔ ایک پھول یا پتی بھی نہیں توڑ سکتا اگر کوئی جانور اندر چلا جائے تو اسے فوراً گولی مار دی جائے۔

راجہ صاحب : (مسکراکر) واقعی دلیل بڑے معرکہ کی ہے۔ قائل ہوگیا۔ میرے پاس

اس کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تم اس اندھے کو جتنا بے بس و بے کس سمجھتی ہو اتنا نہیں ہے سارا محلہ اس کی حماقت پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ لوگ مسٹر سیوک کے گماشتہ کے گھر میں گھس گئے۔ ان کے بھائیوں کو مارا آگ لگا دی۔ عورتوں تک کی بے عزتی کی۔

اندو: میرے خیال میں ایسا ہونا اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ وہ زمین چھوڑ دی جائے۔ اس پر قبضہ کر لینے سے ایسے واقعات کم نہ ہوں گے۔ زیادہ ہی ہوں گے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

راجہ صاحب: جو لوگ عورتوں کی بے عزتی کر سکتے ہیں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔

اندو: جن لوگوں کی زمین آپ چھین لیں گے وہ آپ کے پاؤں نہ سہلائیں گے۔

راجہ صاحب: تعجب ہے کہ تم عورتوں کی بے حرمتی کو معمولی بات سمجھ رہی ہو۔

اندو: فوج کے گورے۔ ریل کے ملازمین روز ہی ہماری بہنوں کی بے حرمتی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے تو کوئی نہیں بولتا۔ اسی لیے کہ آپ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔اگر لوگوں نے جرم کیا ہے تو ان پر مقدمہ چلایئے انھیں سزا دلایئے۔ ان کی جائداد کیوں ضبط کرتے ہیں۔

راجہ صاحب: تم جانتی ہو۔ مسٹر سیوک کا یہاں کے حکام میں کتنا ربط و ضبط ہے مسٹر کلارک تو ان کے دروازہ کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں ان کی اتنی خدمت نہ کر سکا تو حکام کا اعتبار مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔

اندو: (متفکرانہ لہجہ میں) میں نہیں جانتی تھی کہ چیئر مین اس قدر مجبور و معذور ہوا کرتا ہے۔

راجہ صاحب: اب تو معلوم ہو گیا۔ بتلاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اندو: عہدہ سے مستعفی ہو جانا۔

راجہ صاحب: میرے مستعفی ہو جانے سے زمین نہ بچ سکے گی۔

اندو: آپ تو دکھ پاپ سے بچ جائیں گے۔

راجہ صاحب: ایسی معمولی باتوں کے لیے استعفے دے دینا مضحکہ خیز ہے۔

اندو کو اپنے شوہر کے چیئر مینی پر بہت ناز تھا۔ اس عہدہ کو وہ نہایت اعلیٰ اور قابلِ احترام سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں راجہ صاحب کامل طور پر خود مختار ہیں۔ بورڈ ان کے تحت میں ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں۔ کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ چیئر مین صرف حکام کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ ان کی مرضی سے جو چاہے کرے۔ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بمنزلہ صفر ہے جس کی قیمت دوسرے عدو کے ساتھ ملنے ہی پر ہے۔ راجہ صاحب کی اس عہدہ پرستی سے اس کے دل پر کڑی چوٹ لگی۔ بولی ''مضحکہ اتنا شرم ناک نہیں ہے۔ جتنا بے انصافی برتنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس عہدہ کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی اسے کیوں قبول کیا؟ اگر آپ انصاف کے خیال سے سورداس کی زمین چھین لیتے تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن صرف حکام کے خوف سے یا بدنامی سے بچنے کے لیے جادۂ انصاف سے منحرف ہونا نہایت اوچھی حرکت ہے۔ آپ کو اہل شہر اور خصوصاً غربا کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر حکام کسی پر زیادتی کریں توآپ کومناسب ہے کہ مظلوموں کی مدد کریں۔ اپنے ذاتی نفع یا نقصان کا خیال نہ کرکے حکام کی مخالفت کریں۔ سارے شہر میں بلکہ سارے ملک میں تہلکہ مچا دیں۔ خواہ اس کے لیے استعفیٰ ہی نہیں۔ کسی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ میں سیاسی اصولوں سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن آپ کا جو انسانی فرض ہے اسے بتلا رہی ہوں۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے حکام کے دباؤ سے سورداس کی زمین لی تو میں چپ چاپ نہ بیٹھی رہوں گی۔ عورت ہوں تو کیا۔ پر دکھا دوں گی کہ زیادہ سے زیادہ طاقتور انسان بھی کسی غریب کو آسانی سے پیروں تلے نہیں روند سکتا۔

یہ کہتے کہتے اندو رک گئی۔ اسے خیال آ گیا کہ میں جوش میں آکر حدّ مناسب سے تجاوز کر رہی ہوں۔ راجہ صاحب اس قدر نادم ہوئے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ ملتے تھے۔ بالآخر ندامت سے بولے۔ ''تمھیں معلوم نہیں کہ قومی خدمت گزاروں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو بے خوفی سے ادا کرنے لگیں۔ تو جتنی خدمت وہ اب کر سکتے ہیں اتنی بھی نہ کر سکیں۔ مسٹر کلارک اور مسٹر

سیوک میں گہرا تعلق ہوجانے کے سبب حالات بالکل تبدیل ہوگئے ہیں۔ مِس سیوک جس وقت سے تمھارے مکان سے گئی ہیں۔ مسٹر کلارک ہمیشہ انھیں کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اجلاس پر نہیں جاتے۔ کوئی سرکاری کام نہیں کرتے۔ کسی سے ملتے تک نہیں۔ مس سیوک نے ان پر جادو ڈال دیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ سیر کرنے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مس سیوک نے شادی کا وعدہ کر لیا ہے۔"

اندو : اس قدر جلد۔ ابھی اسے ہمارے یہاں سے گئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہ ہوا ہوگا۔

راجہ صاحب : مسز سیوک نے سب کچھ پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔ مس سیوک کے وہاں جاتے ہی عشق کی کار پردازیاں شروع ہو گئیں۔

اندو نے اب تک صوفیہ کو ایک معمولی عیسائی لڑکی سمجھ رکھا تھا۔ اگر چہ وہ ان سے بہن کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ اس کی قابلیت کی قدر کرتی اس سے محبت کرتی تھی۔ لیکن دل میں اسے اپنے سے کمتر سمجھتی تھی۔ مگر مسٹر کلارک سے اس کی شادی والی بات نے اس کے دلی جذبات کو محرک کر دیا۔ سوچنے لگی مسٹر کلارک سے عقد ہو جانے کے بعد جب صوفیہ مسز کلارک بن کر مجھے ملے گی تو اپنے دل میں مجھے ہیچ سمجھے گی۔ اس کے ارتباط اخلاق اور الفاظ میں مصنوعی رواداری کی جھلک ہوگی۔ وہ میرے سامنے جتنا ہی جھکے گی اتنا ہی میرا سر نیچا کرے گی۔ یہ ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میں اس سے نیچی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کمبخت کلارک کو کیا کوئی یورو پین لیڈی نہ ملتی تھی کہ صوفیہ پر گر پڑا۔ کسی ادنیٰ خاندان کا ہوگا۔ کوئی انگریز اس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنے پر راضی نہ ہوتا ہوگا۔ ونے اسی چھچھوری عورت پر جان دیتا ہے۔ ایشور ہی جانے اب اس غریب کی کیا حالت ہوگی۔ قحبہ ہے اور کیا۔ نسل اور خاندان کا اثر کہاں جائے گا؟ خوب صورت ہے؟ تعلیم یافتہ ہے ہوشیار ہے۔ عقل مند ہے۔ سب کچھ سہی مگر ہے تو عیسائی۔ باپ نے لوگوں کو ٹھگ ٹھگا کر کچھ روپیہ اور نام کما لیا ہے اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو اب بھی اس سے وہی پہلے کا سا برتاؤ کروں گی۔ جب تک وہ خود آگے نہ بڑھے گی ہاتھ نہ بڑھاؤں گی۔ لیکن میں خواہ کچھ

دھرم پیارا ہے۔"

راجہ صاحب غصہ کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اندو تنہا رہ گئی۔

ایک ہفتہ تک دونوں کی زبانوں پر مہر سکوت لگی رہی۔ راجہ صاحب کبھی گھر میں آ جاتے تو دو چار باتیں کر کے یوں بھاگتے جیسے پانی میں بھیگ رہے ہوں۔ نہ وہ بیٹھتے اور نہ اندو انھیں بیٹھنے کو کہتی۔ انھیں یہ رنج تھا کہ اس کو میری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ قدم قدم پر میرا راستہ روکتی ہے۔ میں استعفٰی دے دوں جبھی اس کو تسکین ہوگی۔ اس کی یہی تمنا ہے کہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑ لوں۔ سنسار سے قطع تعلق کروں اور گھر میں بیٹھا ہوا رام نام جپوں۔ حکام سے ملنا چھوڑ دوں۔ ان کی نظروں سے گرجاؤں اور ذلت بر داشت کروں۔ میری زندگی کی ساری تمنائیں اور میرے سارے منصوبے اس کی نگاہوں میں ہیچ ہیں۔ وہ دل میں میری نمود طلبی کی خواہش پر ہنستی ہے۔ شاید مجھے کم ظرف خود غرض اور خود پسند سمجھتی ہے۔ اتنے دنوں تک میرے ساتھ رہ کر بھی اس کو مجھ سے کچھ محبت نہیں۔ کوئی میل نہیں زوجہ اپنے خاوند کی بہی خواہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے کاموں کا مضحکہ اڑائے۔ اس کی بد گوئی کرے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ نہ جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر اخباروں میں ایک چھوٹا سا خط بھی چھپوا دے گی تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔ ڈوب مرنے کا مقام ہو گا۔ دیکھوں یہ ناؤ کیسے پار لگتی ہے۔

ادھر اندو کو افسوس تھا کہ ایشور نے انھیں سب کچھ دیا ہے۔ یہ حکام سے کیوں اتنا دبتے ہیں؟ کیوں اتنی خوشامد کرتے ہیں؟ اپنے اصولوں پر قائم کیوں نہیں رہتے؟ انھیں کیوں خود غرضی کے تحت میں رکھتے ہیں؟ قومی خدمات کا سوانگ کیوں بھرتے ہیں؟ وہ بھی کوئی انسان ہے جس نے نام و نمود کے لیے ایمان اور انصاف کا خون کر دیا ہو؟ ایک وہ بہادر لوگ تھے جو بادشاہوں کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے۔ اپنی بات اپنی آن پر مر مٹتے تھے۔ آخر لوگ انھیں کیا کہتے ہوں گے؟ دنیا کو دھوکا دینا سہل ہے۔ انھیں چاہے یہ وہم ہو کہ لوگ مجھے قوم کا سچا خادم سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعی بات تو یہ ہے کہ انھیں سبھی لوگ خوب پہچانتے ہیں۔ دل میں سبھی کہتے ہوں گے کتنا بنا

بھی کروں اس پر اپنی فوقیت کا خواہ کتنا ہی اظہار کروں۔ اس کے دل میں اس بات کا گھمنڈ تو ضرور ہی ہو گا کہ میری ایک کڑی نگاہ اس کے شوہر کے اعزاز و اقتدار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اب اور بھی زیادہ انکسار سے پیش آئے۔ اپنی طاقت کا احساس ہم کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اس سے میرا غرور کرنا اور کھنچنا دل لگی معلوم ہوگی۔ اس کی عاجزی سے تو اس کا اوچھا پن ہی اچھا۔ ایشور کرے کہ وہ مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرے۔ اس وقت دیکھنے والے اس کو اپنے دل میں ملامت کریں گے۔ اسی میں اب میری لاج رہ سکتی ہے مگر وہ اتنی کوتاہ اندیش کب ہے؟

بالآخر اندو نے طے کرلیا کہ میں صوفیہ سے ملوں گی ہی نہیں۔ میں اپنے رانی ہونے کا گھمنڈ تو اس سے کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں ایک خادم قوم کی بیوی بن کر اپنی خاندانی شرافت کا غرور دکھا کر اس سے بے اعتنائی کا برتاؤ کر سکتی ہوں۔

یہ سب خیالات ایک لحہ میں اندو کے دل میں آگئے۔ بولی۔ ”میں آپ کو کبھی دبنے کی صالاح نہ دوں گی۔“

راجہ صاحب : اور اگر دبنا پڑے۔

اندو : تو اپنے کو ابھاگنی سمجھوں گی۔

راجہ صاحب : یہاں تک تو کوئی ہرج نہیں مگر کوئی تحریک تو نہ شروع کروگی؟ اس لیے پوچھتا ہوں کہ تم نے ابھی مجھے دھمکی دی ہے۔

اندو : میں خاموش نہ بیٹھوں گی؟ آپ دبیں میں کیوں دبوں؟

راجہ صاحب : خواہ مخواہ میری کتنی ہی بدنامی ہو جائے؟

اندو : میں اسے بدنامی نہیں سمجھتی۔

راجہ صاحب : پھر سوچ لو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ زمین مسٹر سیوک کو ضرور ملے گی۔ میں روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا۔ اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ تمھیں اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا پڑے گا۔

راجہ صاحب اپنی پبلک لائف (عوام سے تعلق رکھنے والی زندگی) میں تحمل اور حسن اخلاق کے لیے مشہور تھے لیکن خانگی زندگی میں وہ اتنے نرم دل نہ تھے۔ اندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ تیز لہجہ میں بولی۔ ”اگر آپ کو اپنا اعزاز پیارا ہے تو مجھے بھی اپنا

ہوا آدمی ہے!

رفتہ رفتہ اس کے خیالات میں تغیر ہوا۔ یہ ان کا قصور نہیں۔ میرا قصور ہے۔ میں کیوں ان کو اپنے معیار کے مطابق بنانا چاہتی ہوں۔ آج کل زیادہ تر آدمی اسی قماش کے ہیں۔ انھیں دنیا چاہے کچھ کہے، کچھ سمجھے، مگر ان کے گھروں میں تو کوئی مین میکھ نہیں نکالتا۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کی رفیق بنے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے ؟ اسے تو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ دونوں اپنے اپنے اعمال کے موافق سزا و جزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ در اصل یہ ہماری قسمت کا قصور ہے ورنہ ہمارے خیالات میں اتنا فرق کیوں ہوتا۔ کتنا چاہتی ہوں کہ آپس میں کوئی نا اتفاقی نہ ہو۔ کتنا پہلو بچاتی ہوں پر آئے دن کوئی نہ کوئی بد مزگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی ایک زخم نہیں بھرنے پایا تھا کہ دوسرا چرکا لگا۔ کیا میری ساری زندگی یوں ہی گزرے گی؟ ہم زندگی میں سکون چاہتے ہیں۔ محبت اور دوستی کے لیے جان دیتے ہیں۔ جس کے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتی ہو اسے سکون کہاں؟ اندھیر تو یہ ہے کہ مجھے چپ بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔ کتنا کہتی تھی کہ مجھے اس بحث میں نہ ڈالیے۔ ان کانٹوں میں نہ گھسیٹے مگر انھوں نے نہ مانا۔ اب جو میرے پیروں میں کانٹے چبھ گئے۔ میں درد سے کراہتی ہوں تو کانوں پر انگلی رکھتے ہیں۔ مجھے رونے کی بھی آزادی نہیں۔ ”جبرا مارے اور رونے نہ دے۔“ والی مثل ہے۔ ایک ہفتہ ہوگیا۔ بات بھی نہ پوچھی کہ مرتی ہے یا جیتی؟ بالکل اسی طرح پڑی ہوں جیسے کسی سرائے میں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی۔ سکھ گیا، آرام گیا، پلے کیا پڑا؟ رونا اور جھیکنا! جب یہی حال ہے توکب تک نبھے گی؟ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ دونوں کے دل ایک دوسرے سے پھر جائیں گے۔ کوئی کسی کی صورت بھی نہ دیکھنا چاہے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ اندو کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچاکہ ذرا اماں کے پاس چلوں کہ یکایک راجہ صاحب آکر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ سے وحشت برس رہی تھی جیسے گھرمیں آگ لگی ہو ئی ہو۔ گھبرائی ہو ئی آواز میں بولے۔ ”اندو مسٹر کلارک ملنے آ ئے ہیں ضرور اسی زمین کے متعلق کچھ گفتگو کر یں گے۔ اب مجھے کیا صلاح دیتی ہو؟ میں ایک کاغذ لانے کا بہانہ کر کے چلا آیا ہوں۔“

یہ کہہ کر انھوں نے دکھ بھری نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا ساری دنیا کی مصیبت انھیں کے سر آ پڑی ہو۔ گویا کوئی دہقانی پولیس کے پنجہ میں پھنس گیا ہو۔ ذرا دم لے کر پھر بولے۔ ''اگر میں نے ان کی مُخالفت کی تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ ان انگریز حکام کو کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ یوں چاہوں تو اسے نوکر رکھ لوں مگراس کی ایک شکایت پر میری ساری آبرو پر پانی پھر جائے گا۔حکام بالا دست اس کے خلاف میری ایک بھی نہ سنیں گے۔ رئیسوں کو اتنی آزادی بھی نہیں جتنی ایک معمولی کسان کو ہے۔ ہم سب ان کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ جب چاہیں زمین پر ٹپک کر چکنا چور کردیں۔ میں اس بات کو ٹال نہیں سکتا۔مجھ پر رحم کرو۔''

اندو نے ترحمانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''مجھے آپ کیا کرنے کو کہتے ہیں؟''

راجہ صاحب : یہی کہ یا تو خاموش رہ کر اس بے انصافی اور ستم کوشی کا تماشہ دیکھو یا مجھے اپنے ہاتھوں تھوڑا سا سنکھیا کھلا دو۔

راجہ صاحب کی اس بزدلی اور مجبوری ان کے خوف زدہ چہرہ اور قابل رحم عاجزی و التجا پر اندو کو رحم آگیا۔ اس رحم میں ہمدردی یا خاطر داری نہ تھی۔ یہ وہ رحم تھا جو بھکاری کو دیکھ کر کسی فیاض طبع انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سوچنے لگی! ہائے اس خوف کا بھی کوئی ٹھکانا ہے۔ بچے ہوا سے بھی اتنا نہ ڈرتے ہوں گے۔ مان لیا۔ کلارک ناراض ہو ہی گیا تو کیا کرے گا؟ عہدہ سے برطرف نہیں کر سکتا۔ یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ ریاست ضبط نہیں کر سکتا۔ واویلا مچ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا ہے کہ افسروں کو شکایت لکھ بھیجے۔ لیکن اس وقت ان سے بحث کرنا بے فائدہ ہے ان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں۔ بولی۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کلارک کی ناراضگی آپ کے لیے ناقابل برداشت ہے تو جس بات پر وہ راضی ہو وہی کیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے کام میں ذرا بھی خلل نہ ڈالوں گی۔ جایئے۔ صاحب کو دیر ہو رہی ہے ہوگی۔ کہیں اسی بات پر ناراض نہ ہو جائیں۔

راجہ صاحب اس طنز سے دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ذرا سا منہ نکل آیا۔ چپکے سے اٹھے اور چلے گئے۔ اسی طرح جیسے کوئی غرض سے باؤلا اسامی مہاجن کے انکار سے مایوس ہوکر اٹھے۔ اندو کی تشفی سے انھیں اطمینان نہ ہوا۔سوچنے لگے کہ

میں اس کی نظروں سے گر گیا۔ میں بد نامی سے اس قدر ڈرتا تھا۔ مگر اب گھر ہی میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔

راجہ صاحب کے جاتے ہی اندو نے ایک لمبی سانس لی اور فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے یکایک یہ الفاظ نکلے۔ ''ان کی دل سے کیسے عزت کروں؟ انھیں اپنا دیوتا کیسے سمجھوں؟ معلوم نہیں۔ اس ناعقیدت مندی کی مجھے کیا سزا ملے گی؟ میں اپنے شوہر کی پرستش کرنا چاہتی ہوں۔ مگر دل پہ میرا قابو نہیں۔ بھگوان! تم مجھے اس کڑی آزمائش میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

(16)

اراولی کی پہاڑیوں میں ایک برگد کے درخت کے نیچے ونے سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ برسات نے اس سنسان، سخت، خشک اور پتھریلے مقام میں کشش فرحت اور رونق پیدا کردی ہے گویا کوئی اجڑا ہو گھر آباد ہوگیا۔ لیکن ونے کی نگاہ اس قدرتی حسن کی طرف نہیں ہے وہ تفکر کی اس حالت میں ہے جب آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ کان کھلے رہتے ہیں اور کچھ نہیں سنائی پڑتا۔ ظاہری حواس معطل ہو گئے ہیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ جسم اتنا لاغر ہے کہ پسلیوں کی ایک ایک ہڈی گنی جا سکتی ہے۔

ہماری خواہشات ہی زندگی کا منبع ہیں۔ انھیں پر پالا پڑ جائے تو زندگی کی رفتار کیوں سست نہ پڑ جائے؟ ان کے دل میں ہر وقت ایک کشمکش قائم رہتی۔ قومی خدمت ان کا مقصد تھا۔ محبت کے کانٹے اس میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس مقصد کے آڑے آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ درد دل سے بے قرار ہو کر سوچتے صوفی نے مجھے اس آتش کدے سے نکالا کیوں؟ بیرونی آگ صرف جسم کو فنا کرتی ہے جو خود ہی فانی ہے۔ مگر اندرونی آگ روح کو خاکِ سیاہ کر دیتی ہے۔

ونے کو یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے مگر ان کے دل کی بے چینی وقت کے ساتھ ہی بڑھتی جاتی۔ وہ غیرت کے سبب آنے کو تو یہاں آ گئے تھے مگر ایک ایک لمحہ ایک ایک مدت کی طرح گزر رہا تھا۔ پہلے انھوں نے یہاں کی تکالیف کی طولانی داستانیں

لکھ لکھ کر اپنی ماں کے پاس بھیجیں۔ انھیں یقین تھا کہ اماں جی مجھے بلا لیں گی۔ مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اتنے ہی میں صوفیہ کا خط مل گیا جس نے ان کے صبر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ اب ان کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹولتے پھرتے تھے مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ اب ان کی زندگی کا کوئی نصب العین نہ تھا۔ کوئی مقررہ راستہ نہ تھا۔ وہ بے ملاح کی ناؤ تھے جسے صرف امواج کے رحم کا بھروسہ ہو۔

لیکن اس تفکر اور تشویش کی حالت میں بھی وہ حتے الامکان اپنے فرض کو ادا کرتے جاتے۔ جس وقت نگر کے علاقے میں ایک بچہ بھی نہیں ہے جو انھیں نہ پہچانتا ہو۔ دیہات کے لوگ ان کے اتنے معتقد ہو گئے ہیں کہ جوں ہی وہ کسی گاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ سارا گاؤں ان کی زیارت کے لیے جمع ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ان کو اپنی مدد آپ کرنا سکھایا ہے۔ اس علاقہ کے لوگ اب جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے پولیس کے پاس نہیں دوڑے جاتے بلکہ خود جمع ہو کر انھیں بھگاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر عدالتوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے۔ پنچایتوں میں تصفیہ کر لیتے ہیں۔ جہاں کبھی کنوئیں نہ تھے وہاں اب پختہ کنوئیں تیار ہوگئے ہیں۔ صفائی کی طرف بھی لوگ دھیان دینے لگے ہیں۔ دروازوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر نہیں جمع کیے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ ہر شخص صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ہے۔ وہ اب اپنے کو مخالفین سے گھرا ہوا نہیں بلکہ معاونین سے گھرا ہوا سمجھتا ہے۔ اجتماعی زندگی کا پھر احساس پیدا ہو گیا ہے۔

ونے سنگھ کو طبابت میں بھی کافی دخل ہے۔ ان کے ہاتھوں سینکڑوں مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی گھر جو باہمی نزاع سے بگڑ گئے تھے پھر آباد ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی جتنی خاطر و مدارت کرنے کے لیے لوگ تیار رہتے ہیں اس کا قیاس کرلینا مشکل نہیں۔ دوسروں کی خدمت کرنے والوں کے نصیبوں میں آرام کہاں؟ ونے کو خشک روٹیوں اور درخت کے سایہ کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہیں ہے۔ اس فقرہ استغناء نے انھیں اس نواح میں نہایت ممتاز اور ہر دل عزیز بنا دیا ہے۔

لیکن جوں جوں ان سے رعایا کی عقیدت ہوتی جاتی ہے اسی نسبت سے ریاست کے حکام ان سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خیال میں رعایا روز بروز سرکش ہوتی جاتی ہے۔ داروغہ جی کی مٹھیاں اب گرم نہیں ہوتیں۔ کامدار اور دیگر حاکموں کے یہاں مقدمے نہیں جاتے۔ کچھ ہتھے نہیں چڑھتا۔ رعایا میں یہ آثار بغاوت نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہی بغاوت کے ننھے پودے ہیں۔ انھیں اکھاڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔

جسونت نگر سے روزانہ دربار کو نئی نئی اطلاعیں کچھ اصلی کچھ فرضی بھیجی جاتی تھیں اور ونے سنگھ کو ضابطہ کے شکنجہ میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دربار نے ان اطلاعوں سے بدظن ہو کر کئی جاسوسوں کو ونے سنگھ کی حرکات و سکنات کی دیکھ بھال کے لیے تعینات کر دیا ہے مگر ان کی بے لوث خدمات کسی کو گرفت کا موقع نہیں دیتیں۔

ونے کے پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ برگد کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دو پہر ڈھل چکی تھی فوراً اٹھ بیٹھے۔ لکڑی سنبھالی اور آگے بڑھے۔ آج انھوں نے جسونت نگر میں مقام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ دن بھاگا چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد سورج کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ شام ہوتی جاتی تھی اور ابھی جسونت نگر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ادھر بوائیوں کے سبب ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ حیران تھے کہ کیا کروں۔ کسی کسان کا جھونپڑا بھی نظر نہ آتا تھا کہ وہیں رات کاٹیں۔ پہاڑوں میں سر شام ہی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ دفعتاً انھیں دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر پڑا۔ اسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے کہ اپنی راہ چھوڑ کر کئی قدم اس کی طرف چلے۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکیہ ہے۔ وہ ونے سنگھ کو پہچانتا تھا۔ سلام کر کے بولا۔ "اس چال سے تو آدھی رات تک بھی جسونت نگر نہ پہنچیں گے۔"

ونے : پیروں میں بوائیاں پھٹ گئی ہیں، چلنا مشکل ہے۔ تم خوب ملے۔ میں بہت گھبرا رہا تھا کہ تنہا کیسے جاؤں گا۔ اب ایک سے دو ہو گئے۔ کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا بھی کوئی خط ہے؟

ڈاکیہ نے ونے سنگھ کے ہاتھ میں ایک خط رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کا خط تھا۔ اگرچہ اندھیرا ہو رہا تھا۔ مگر ونے سنگھ نے فرط اشتیاق سے فوراً لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگے۔ ایک لمحہ میں انھوں نے اس کو پڑھ ڈالا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر لفافہ میں رکھ دیا۔ ان کے سر میں ایسا چکر آیا کہ گرتے گرتے بچے۔ زمین پر بیٹھ گئے۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا کوئی بری خبر ہے؟ آپ کا منہ پیلا پڑ گیا ہے۔"

ونے : نہیں۔ کوئی ایسی خبر نہیں۔ پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ شاید میں آگے نہ جاسکوں گا۔

ڈاکیہ : یہاں اس بیہڑ میں اکیلے کیسے پڑے رہیے گا؟

ونے سنگھ : ڈر کیا ہے؟

ڈاکیہ : ادھر جانور بہت ہیں۔ ابھی کل ایک گائے اٹھا لے گئے۔

ونے سنگھ : مجھے جانور بھی نہ پوچھیں گے۔ تم جاؤ۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔

ڈاکیہ : یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی یہیں پڑا رہوں گا۔

ونے سنگھ : تم میرے لیے کیوں اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہو۔ چلے جاؤ۔ گھڑی رات گئے تک پہنچ جاؤ گے۔

ڈاکیہ : میں تو جبھی جاؤں گا جب آپ بھی چلیں گے۔ میری جان کی کون حقیقت ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے سوا اور کیا کرتا ہوں۔ آپ کے دم سے تو ہزاروں کا بھلا ہوتا ہے۔ جب آپ کو اپنی فکر نہیں ہے تو مجھے اپنی کیا فکر ہے؟

ونے سنگھ : بھائی میں تو مجبور ہوں۔ چلا ہی نہیں جاتا۔

ڈاکیہ : میں آپ کو کندھے پر بیٹھا کر لے چلوں گا۔ پر یہاں نہ چھوڑوں گا۔

ونے سنگھ : بھائی تم بہت دق کر رہے ہو۔ چلو۔ مگر میں آہستہ آہستہ چلوں گا۔ تم نہ ہوتے تو آج میں یہیں پڑا رہتا۔

ڈاکیہ : آپ نہ ہوتے تو میری جان کی خیریت نہ تھی۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں صرف آپ کی خاطر اتنی ضد کر رہا ہوں۔ میں اتنا دھرماتما نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کے لیے آپ کو ساتھ لیے چلتا ہوں (آہستہ سے) اس وقت میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں۔ دو پہر کو ایک جگہ سو گیا۔ بس دیر ہوگئی آپ میرے بھاگ سے مل گئے نہیں تو

ڈاکوؤں سے جان نہ بچتی۔

ونے سنگھ : یہ تو بڑے جوکھم کی بات ہے تمھارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟

ڈاکیہ : میرے ہتھیار آپ ہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر کسی ڈاکو کی مجال نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکے۔ آپ نے ڈکیتوں کو بھی بس میں کر لیا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا پانچ سوار بھالے اٹھائے گھوڑے بڑھائے چلے آ رہے تھے۔اس کے ہوش اڑ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بولا۔ ''لیجیے۔ سب آ ہی پہنچے۔ ان سب کے مارے ادھر راستہ چلنا مشکل ہوگیا ہے۔ بڑے خونی ہیں۔ سرکاری ملازموں کو تو چھوڑنا ہی نہیں جانتے۔ اب آپ ہی بچائیں تو میری جان بچ سکتی ہے۔ اتنے میں پانچوں سوار سر پر آ پہنچے۔ ان میں سے ایک نے پکارا۔ ''ابے ڈاکیے! ادھر آ۔ تیرے تھیلے میں کیا ہے؟''

ونے سنگھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے سہارے اٹھے کہ اتنے میں ایک سوار نے ڈاکیہ پر بھالے کا وار کیا۔ ڈاکیہ فوج میں رہ چکا تھا۔ اس نے وار کو تھیلے پر روکا بھالا تھیلے کے پار ہوگیا۔ وہ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ ونے سنگھ سامنے آکر بولے۔ ''بھائیو! یہ کیا اندھیر کرتے ہو؟ کیا تھوڑے سے روپیوں کے لیے ایک غریب کی جان لے لوگے؟''

سوار : جان اتنی پیاری ہے تو روپیے کیوں نہیں دیتا؟

ونے سنگھ : جان بھی پیاری ہے اور روپے بھی پیارے ہیں۔ دو میں سے ایک بھی نہیں دے سکتا۔

سوار : تو دونوں ہی دینے پڑیں گے۔

ونے سنگھ : تو پہلے میرا کام تمام کر دو۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ تمھارا مقصد پورا نہ ہوگا؟''

سوار : ہم سادھوؤں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔

ونے سنگھ : جب تک میری ہڈیاں تمھارے گھوڑوں کے پیروں تلے نہ روندی جائیں گی۔ میں سامنے سے نہ ہٹوں گا۔

سوار : ہم کہتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔ کیوں ہمارے سر ہتیا(خونِ ناحق) کا پاپ لگاتے ہو؟

ونے سنگھ : میرا جو دھرم ہے وہ میں کرتا ہوں۔ تمھارا جو دھرم ہو وہ تم کرو۔ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔

دوسرا سوار : تم کون ہو۔

تیسرا سوار : بیدھا ہوا ہے۔ مار دو ایک ہاتھ گر پڑے۔ پرائسچت (کفارہ) کر لیں گے۔

پہلا سوار : آخر تم ہو کون۔

ونے سنگھ : میں کوئی ہوں۔ تمھیں اس سے مطلب؟

دوسرا سوار : تم تو ادھر کے رہنے والے نہیں جان پڑتے۔ کیوں بے ڈاکیے! یہ کون ہے؟

ڈاکیہ : یہ تو نہیں جانتا پر ان کا نام ونے سنگھ ہے دھر ماتما اور پر اپکاری آدمی ہیں۔ اس علاقہ میں کئی مہینوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ونے سنگھ کا نام سنتے ہی پانچوں سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے۔ اور ونے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سردار نے کہا۔ ''مہاراج ہمارا اپرادھ چھما کیجیے۔ ہم نے آپ کا نام سنا ہے۔ آج آپ کا درشن پا کر ہمارا جینا سپھل ہوگیا۔ اس علاقہ میں آپ کا جس گھر گھر گایا جا رہا ہے۔ میرا لڑکا گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جینے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ ہی کے ساتھ کے ایک مہاراج ہیں۔ اندرت انھوں نے آکر لڑکے کو دیکھا تو فوراً مرہم پٹی کی اور ایک مہینہ تک روز آکر اس کی دوا دارو کرتے رہے۔ لڑکا چنگا ہو گیا۔ میں تو جان بھی دے دوں تو آپ سے اُرن نہیں ہوسکتا۔ اب ہم پاپیوں کا ادھار کیجیے۔ ہمیں آگیا دیجیے کہ آپ کے چرنوں کی دھول ماتھے پر لگائیں۔ ہم تو اس لائق بھی نہیں ہیں۔''

ونے نے مسکر کر کہا۔ ''اب تو ڈاکیے کی جان نہ لوگے؟ ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔

سردار : مہاراج ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔ ہمار قصور معاف کیجیے۔ ڈاکیہ جی تم آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہو نہیں تو اب تک تمھاری جان نکل گئی ہوتی۔ میرا نام سنا

ہے نہ؟ بیر پال سنگھ میں ہی ہوں جس نے راج کے نوکروں کو نیست و نا بود کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

ونے سنگھ : راج کے نو کروں پر اتنا ظلم کیوں کر تے ہو؟

بیر پال : مہاراج آپ تو کئی مہینوں سے اس علاقہ میں ہیں۔ کیا آپ کو ان لوگوں کی کرتوتیں معلوم نہیں ہیں؟ یہ لوگ رعایا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ان میں نہ دیا ہے نہ دھرم۔ ہیں ہمارے ہی بھائی بند۔ پر ہماری ہی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔ کسی نے ذرا صاف کپڑا پہنے اور یہ لوگ اس کے سر ہوئے۔ جسے رشوت نہ دیجیے وہی آپ کا دشمن ہے۔ چوری کیجیے، ڈاکے ڈالیے، گھروں میں آگ لگائیے۔ غریبوں کا گلا کاٹیے۔ کوئی آپ سے نہ بولے گا۔ بس سرکاری نوکروں کی مٹھیاں گرم کرتے رہئے۔ دن دہاڑے خون کیجیے پر پولیس کی پوجا کر دیجیے۔ آپ بے داغ چھوٹ جائیں گے۔ اور آپ کے بدلے کوئی بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کوئی فریاد نہیں سنتا۔ کون سنے؟ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہی سمجھ لیجیے کہ خونخوار جانوروں کا ایک غول ہے۔ سب کے سب مل کر شکار کرتے ہیں اور پھر مل جل کر کھاتے ہیں۔ راجہ ہے وہ کا ٹھ کا الّو۔ اسے ولایت میں جا کر علماء کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرنے کا خبط ہے۔ میں نے یہ کیا۔ میں نے وہ کیا۔ بس کوری ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے۔ یا تو ولایت کی سیر کرے گا۔ یا وہاں انگریزوں کے ساتھ شکار کھیلے گا۔ سارے دن انھیں کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔ اس کے سوا اسے کوئی کام نہیں۔ رعایا مرے یا جیے۔ اس کی بلا سے بس خیریت اسی میں ہے کہ عملے جس کل بٹھائیں اسی کل بیٹھیے۔ شکایت نہ کیجیے۔ زبان نہ ہلائیے۔ روئیے تو منہ بند کرکے۔ ہم نے مجبور ہو کر اس خونیں راستہ پر قدم رکھا ہے۔ کسی طرح تو ان بدمعاشوں کی آنکھیں کھلیں۔ انھیں معلوم ہو کہ ہمیں بھی سزا دینے والا کوئی ہے۔ یہ حیوان سے انسان بن جائیں۔

ونے سنگھ : مجھے یہاں کے حالات سے کچھ واقفیت تھی مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی بری حالت ہے۔ میں اب خود راجہ صاحب سے ملوں گا۔ اور یہ ساری باتیں ان سے کہوں گا۔

بیر پال : مہاراج کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں

گے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ راجہ میں اتنا ہی گیان ہوتا تو راج کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ وہ الٹا آپ ہی کے سر ہو جائے گا۔

ونے سنگھ : اس کی فکر نہیں۔ اطمینان تو ہو جائے گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ مجھے تم سے بھی کچھ کہنا ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ اس قتل و غارت گری سے حکام میں رعایا پروری آ جائے گی۔ میری رائے میں محض بے بنیاد اور صرف وہم ہے۔ مرض کو دور کرنے کے لیے مریض ہی کو ختم کر دینا نہ تو قرین مصلحت ہے اور نہ قرین انصاف۔ آگ آگ سے ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔

بیر پال : مہاراج! ہم آپ سے بحث تو نہیں کر سکتے۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ زہر کا اثر زہر ہی سے زائل ہوتا ہے۔ جب انسان برائی کی انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جب اس میں دیا اور دھرم کا نام و نشان نہیں رہ جاتا جب اس کی انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ حیوانیت کے کام کرنے لگتا ہے۔ جب اس میں روحانیت کی روشنی دھندلی پڑ جاتی ہے۔ تب اس کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ شیر جیسا خونخوار درندہ خدمت سے تابع ہو سکتا ہے مگر خود غرضی کو کوئی خدائی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

ونے سنگھ : ایسی طاقت ہے تو۔ ہاں اس کا مناسب استعمال ضروری ہے۔

ونے سنگھ نے ابھی بات بھی نہ پوری کی تھی کہ دفعتاً کسی طرف سے بندوق کی آواز کانوں میں آئی۔ سواروں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک طرف گھوڑے چھوڑ دیے۔ دم کے دم میں گھوڑے پہاڑوں میں جاکر غائب ہو گئے۔ ونے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بندوق کی آواز کہاں آئی اور پانچوں سوار کیوں بھاگے؟ ڈاکیے سے پوچھا۔ ”یہ سب کدھر کو جا رہے ہیں؟“

ڈاکیہ : بندوق کی آواز نے کسی شکار کی خبر دی ہو گی۔ اسی طرف گئے ہیں۔ آج کسی سرکاری نوکر کی جان پر ضرور بنے گی۔

ونے سنگھ : اگر یہاں کے سرکاری ملازموں کی یہی کیفیت ہے۔ جیسا کہ انھوں نے بیان کیا تو مجھے بہت جلد مہاراج کی خدمت میں جانا پڑے گا۔

ڈاکیہ : مہاراج۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے۔ ہم لوگ تو ٹکے

کے ملازم ٹھہرے چار پیسے اوپر سے نہ کمائیں تو بال بچوں کو کیسے پالیں؟ تنخواہ ہے سو، سال سال بھر تک نہیں ملتی۔ لیکن یہاں تو جتنے ہی اونچے عہدہ پر ہے اس کا پیٹ بھی اتنا ہی بڑا ہے۔

دس بجتے بجتے دونوں آدمی جسونت نگر پہنچ گئے۔ ونے بستی کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ڈاکیہ سے جانے کو کہا۔ ڈاکیہ نے ان سے اپنے گھر چلنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو اپنے گھر سے ان کے واسطے کھانا بنوا لایا۔ کھانے کے بعد دونوں آدمی اسی جگہ لیٹے۔ ڈاکیہ انھیں تنہا چھوڑ کر گھر نہ گیا۔ وہ تو تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ پر ونے کو نیند کہاں؟ رانی جی کے خط کا ایک ایک لفظ ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ رانی نے لکھا تھا۔ تم نے میرے ساتھ اور قوم کے ساتھ دغا کی ہے۔ میں تمھیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ تم نے میری تمناؤں کو برباد کر دیا۔ تم اتنی آسانی سے نفس کے غلام بن جاؤ گے۔ اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ تمھارا وہاں رہنا بے فائدہ ہے۔ گھر لوٹ آؤ اور شادی کر کے عیش و عشرت میں زندگی بسر کرو۔ قومی خدمت کے لیے جس طرز عمل کا ہونا ضروری ہے۔ جس دل و دماغ کا ہونا لابدی ہے۔ وہ تم نے نہیں پایا اور نہ اسے پا سکو گے۔ شباب کے زمانہ میں ہم لوگ اپنی قابلیتوں کا غلط اندازہ کر لیتے ہیں۔ تم بھی اسی مغالطہ میں پڑ گئے۔ میں تمھیں برا نہیں کہتی۔ تم شوق سے لوٹ آؤ۔ دنیا میں سبھی اپنی اپنی غرض میں لگے ہیں۔ تم بھی اسی کے خیال میں محو ہو جاؤ۔ ہاں اب مجھے تمھارے اوپر وہ گھمنڈ نہ ہوگا جس پر میں پھولی ہوئی تھی۔ تمھارے والد ماجد کو ابھی یہ حال معلوم نہیں ہے۔ وہ سنیں گے تو نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن اگر تمھیں یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے تو میں بتلائے دیتی ہوں کہ تمھیں اپنی عشق بازیوں کے لیے کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ مس صوفیہ کی منگنی مسٹر کلارک سے ہو گئی ہے اور دو چار روز میں شادی بھی ہونے والی ہے۔ یہ اس لیے لکھتی ہوں کہ تمھیں صوفیہ کے بارہ میں کسی قسم کا وہم نہ رہے اور تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ جس کے لیے تم نے اپنی زندگی کا اور اپنے والدین کی آرزوؤں کا خون کیا ہے اس کی نگاہوں میں تمھاری کتنی وقعت ہے۔

ونے سنگھ کے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ اس وقت صوفیہ سامنے آجاتی تو اسے ان الفاظ میں ملامت کرتا۔ یہی میری بے حد دلی محبت کا صلہ ہے۔ تمھارے اوپر مجھے کتنا اعتماد تھا مگر اب معلوم ہوا کہ وہ تمھاری محبت کا اظہار محض ایک تماشہ تھا۔ تم میرے لیے آسمان کی دیوی تھیں۔میں نے تمھیں ایک آسمانی اجالا ایک روحانی نور سمجھ رکھا تھا۔ آہ میں اپنا مذہب تک تمھارے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ کیا اسی لیے تم نے مجھے آگ کے منہ سے نکالا تھا؟ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ ایشور نے میرے مذہب کی حفاظت کی۔ یہ رنج بھی دور ہو جائے گا۔ میں تمھیں بے فائدہ کوس رہا ہوں۔ تم نے وہی کیا جو اس حالت میں ہر ایک عورت کرتی۔ مجھے رنج اس لیے ہو رہا ہے کہ میں تم سے کچھ اور امید رکھتا تھا۔ یہ میری خام خیالی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمھارے قابل نہیں تھا۔ مجھ میں وہ اوصاف کہاں ہیں جن کی تم قدر کر سکتیں؟ مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنی عقیدت مجھے تم سے تھی اور اب بھی ہے۔ اتنی شاید ہی کسی کو ہو سکتی ہو۔ مسٹر کلارک عالم بیدار مغز قابل اور اوصاف کے مخزن ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر میں نے تمھیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھایا ہے تو تم ان کے ساتھ خوش و خرم نہ رہ سکوگی۔

مگر اس وقت انھیں اس مایوسی سے کہیں زیادہ رنج اس خیال سے ہو رہا تھا کہ میں اپنی ماں کی نظروں سے گر گیا۔ انھیں کیسے معلوم ہوا۔ کیا صوفی نے میرا خط تو نہیں دکھا دیا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو مجھ پر اس سے زیادہ سخت چوٹ نہ کر سکتی تھی۔ کیا عشق بیدرد ہوکر نفرت انگیز بھی ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ صوفی پر ایسا شبہ کر کے میں اس کے ساتھ زیادتی نہ کروں گا۔ میں سمجھ گیا۔ اندو کی سادہ مزاجی نے یہ آگ لگائی ہے۔ اس نے ہنسی ہنسی میں ماتا جی سے کہہ دیا ہوگا۔ نہ جانے اسے کبھی عقل آئے گی یا نہیں؟ اس کی تو دل لگی ہوئی اور یہاں میری جان پر بن گئی۔

یہ سوچتے سوچتے ونے کے دل میں بدلہ کا خیال پیدا ہوا۔ مایوسی میں محبت بھی نفرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ان کی زبردست خواہش ہوئی کہ صوفی کو ایک طویل خط لکھوں اور اسے خوب طعنے دوں۔ وہ مضمون سوچنے لگے۔ تریا چرتر کی داستانیں کتابوں میں بہت پڑھی تھیں مگر کبھی یقین نہ آتا تھا۔ مجھے یہ گمان ہی نہ ہوتا کہ

عورت جسے پرماتما نے پاکیزہ لطیف اور نازک جذبات کا مخزن بنایا ہے۔ اتنی بیدرد اور کج ادا ہو سکتی ہے۔ مگر یہ تمھارا قصور نہیں ہے۔ یہ تمھارے مذہب کا قصور ہے۔ جس میں وفا کا کوئی معیار نہیں۔ اگر تم نے ہندوؤں کی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا ہے تو تم کو ایک نہیں بلکہ ایسی کئی دیویاں ملی ہوں گی جنھوں نے ایک مرتبہ عہد وفا کر لینے کے بعد زندگی بھر دوسرے مرد کا خیال تک نہیں کیا۔ ہاں تمھیں ایسی دیویاں بھی ملی ہوں گی جنھوں نے عہد وفا کر لینے پر تمام عمر بیوگی میں گزار دی۔ مسٹر کلارک کی بیوی بن کر تم ایک ہی چھلانگ میں مفتوح سے فاتح قوم کے زمرہ میں داخل ہو جاؤگی اور بہت ممکن ہے کہ اسی خواہش نے تمھیں میرے دل پر بجلیاں گرانے پر آمادہ کیا ہو۔ مگر تمھاری آنکھیں بہت جلد کھلیں گی اور تمھیں معلوم ہوگا کہ تم نے اپنا وقار بڑھایا نہیں بلکہ کھو دیا ہے۔

اس طرح ونے سنگھ نے خیالی شکوہ و شکایت کے ذریعہ اپنے دل کا غبار خوب نکالا۔ اگر ان زہریلے خیالات کا ذرا بھی علم صوفیہ کو ہو جاتاتو اس دکھیا کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ شاید اس کی جان ہی پر بن جاتی۔ مگر ونے سنگھ کو خود ہی ایسے خیالوں سے نفرت ہوئی۔ انھوں نے سوچا۔ میرے دل میں ایسے برے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا نازک دل ایسی سخت چوٹیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کو مجھ سے محبت تھی۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب بھی میری ہمدرد ہے۔ پر میری ہی طرح وہ بھی مذہب فرض اور رسم و رواج کی زنجیروں سے بندھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے والدین نے اسے مجبور کیا ہو اور اس نے خود کو ان کی مرضی پر قربان کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماتا جی نے اس کو میرے محبت کے راستہ سے ہٹانے کے لیے یہ تدبیر نکالی ہو۔ وہ جتنی ہی رحم دل ہیں اتنی غصہ ور بھی۔ میں بلا سمجھے بوجھے صوفیہ پر ایسے جھوٹے الزامات لگا کر اپنا اوچھا پن دکھلا رہا ہوں۔

اسی بے قراری کی حالت میں کروٹیں بدلتے بدلتے ونے کی آنکھیں جھپک گئیں۔ کوہستانی علاقوں میں راتیں بڑی سہاونی ہوتی ہیں۔ ایک ہی جھپکی میں تڑکا ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک پڑے سو یا کرتے۔ لیکن پانی کی بوندیں منھ پر پڑیں تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھورا پڑ رہی تھی۔ جسونت نگر

جانے کا ارادہ کر کے اٹھے تھے کہ کئی آدمیوں کو گھوڑے بھگائے اپنی طرف آتے دیکھا۔ سمجھے شاید بیر پال سنگھ اور ان کے ساتھی ہوں گے مگر قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ریاستی پولیس کے آدمی ہیں۔ ڈاکیہ ان کے پاس ہی سویا ہوا تھا۔ پر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

افسر نے پوچھا۔ تمھارا ہی نام ونے سنگھ ہے؟

ونے سنگھ : جی ہاں۔

افسر : کل رات کو تمھارے ساتھ کئی آدمیوں نے یہاں قیام کیا تھا۔

ونے سنگھ : جی نہیں۔ میرے ساتھ یہاں کے ڈاک خانہ کا صرف ایک ڈاکیہ تھا۔

افسر : تم بیر پال سنگھ کو جانتے ہو؟

ونے سنگھ : اتنا ہی جانتا ہوں کہ مجھے راستہ میں مل گیا تھا۔وہاں سے کہاں گیا یہ میں نہیں جانتا۔

افسر : تمھیں یہ معلوم تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔

ونے سنگھ : اس نے یہاں کے سرکاری نوکروں کی شان میں اسی ڈاکو لفظ کا استعمال کیا تھا۔

افسر : اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم کو یہ بات معلوم تھی۔

ونے سنگھ : آپ اس کا جو مطلب بھی چاہیں سمجھیں۔

افسر : اس نے یہاں سے تین میل پر سرکاری خزانہ کی گاڑی لوٹ لی ہے اور ایک سپاہی کو قتل کر ڈالا ہے۔ پولیس کو شک ہے کہ یہ سنگین جرم تمھارے ایماء سے ہوا ہے۔ اس لیے ہم تمھیں گرفتار کرتے ہیں۔

ونے سنگھ : یہ مجھ پر سراسر زیادتی ہے مجھے اس ڈاکہ اور قتل کی ذرا بھی خبر نہیں ہے۔

افسر : اس کا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔

ونے سنگھ : کم سے کم مجھے اتنا پوچھنے کا حق تو ہے کہ پولیس کے مجھ پر یہ شک کرنے کا کیا سبب ہے۔

افسر : اسی ڈاکیہ کا بیان ہے جو رات تمھارے ساتھ یہاں سویا تھا۔

ونے سنگھ : (حیرت سے) یہ اسی ڈاکیہ کا بیان ہے؟

افسر : ہاں اس نے ایک گھڑی رات باقی رہنے کے وقت اس کی اطلاع دی۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ریاست کی پولیس آپ جیسے بھلے آدمیوں سے کتنی چوکس رہتی ہے۔

فطرتِ انسانی کتنی پیچیدہ اور ناقابل فہم ہے اس کا ونے کو زندگی میں اول مرتبہ تجربہ ہوا۔ اس قدر اعتقاد و اعتبار کے پردے میں اس قدر فریب اور دغابازی۔

دو سپاہیوں نے ونے سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ انھیں ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور جسونت نگر کی طرف چلے۔

(17)

ونے سنگھ چھ ماہ سے جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ ڈاکوؤں کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ نہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ حکام کو اب بھی وہم ہے کہ انھیں کی ایما سے ڈاکہ پڑا تھا۔اس لیے وہ ان پر انواع و اقسام کے مظالم کرتے ہیں۔جب اس طریقہ سے کام چلتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تو ترغیب سے کام لیتے ہیں اور پھر وہی پرانا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ونے سنگھ پہلے اور قیدیوں کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ لیکن جب قیدیوں کو ان کی طرف مائل ہوتا دیکھا گیا تو اس خوف سے کہ کہیں جیل میں کوئی شورش نہ برپا ہو جائے۔ انھیں سب سے الگ ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔کوٹھڑی بہت تنگ تھی ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ دو پہر کو بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ بدبو اتنی کہ ناک پھٹتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دروازہ کھلتا۔ محافظ کھانا رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیتا۔ ونے سنگھ کو تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بھوک پیاس سہہ سکتے تھے۔ اوڑھنے اور بچھانے کی انھیں ضرورت نہ تھی۔ اس سے انھیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی تھی۔ لیکن تاریکی اور تعفن میں قید رہنا ان کے لیے بالکل نئی سزا تھی۔ اندر ان کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ صاف ستھری ہوا میں سانس لینے کے لیے وہ تڑپ، تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ تازہ ہوا کتنی بیش قیمت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ انھیں اب ہو رہا تھا۔مگران بد سلوکیوں کے باوجود بھی وہ مغموم اور دل شکستہ نہ ہوتے تھے۔

اس سخت آزمائش ہی میں انھیں قوم کی نجات نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دل میں کہتے تھے۔ یہ کٹھن تپسیا بے اثر نہیں جا سکتی۔ جب تک ہم سختیاں اٹھانا نہ سیکھیں گے۔ جب تک ہم عیش و عشرت کو ترک نہ کریں گے اس وقت تک ہم سے قوم کی کچھ بھلائی نہیں ہو سکتی۔ یہی خیال ان کو ڈھارس دیتا تھا۔

لیکن جب صوفیہ کی بے وفائی کا خیال آجاتا تو ان کا سارا صبر، حوصلہ اور ایثار، حسرت و یاس کے ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ اپنے کو کتنا ہی سمجھاتے کہ صوفیہ نے جو کچھ کیا مجبور ہو کر کیا ہو گا۔ لیکن اس دلیل سے ان کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ کیا صوفیہ صاف صاف نہ کہہ سکتی تھی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ شادی کے بارہ میں والدین کی رائے ہمارے یہاں فیصلہ کن ہے۔ لیکن عیسائیوں میں عورت کی منظوری ایک خاص اور ضروری بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر صوفیہ کو کلارک سے محبت نہ تھی تو کیا وہ انھیں ٹکا سا جواب نہ دے سکتی تھی۔ در اصل صنف نازک کا رشتہ محبت بھی نازک ہوتا ہے۔ جو ایک ہلکے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جب صوفیہ جیسی دور اندیش۔ آن پر جان دینے والی۔ اصولوں کی پابند اور نیک دل عورت یوں بے وفائی کر سکتی ہے تو دوسری عورتوں سے کیا امید۔ اس صنف کا اعتبار کرنا ہی فضول ہے۔ صوفی نے مجھے ہمیشہ کے لیے ہوشیار کر دیا۔ ایسا سبق یاد کرادیا جو کبھی نہ بھولے گا۔ جب صوفیہ دغا کر سکتی ہے تو ایسی کون عورت ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ آہ کیا معلوم تھا کہ اتنی بے لوثی، اتنی سادگی، اتنی نیک دلی بھی بالآخر غرض کے سامنے سر جھکا دے گی۔ اب تمام عمر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ اس سے یوں دور رہوں گا جیسے کالی ناگن سے۔ اس سے یوں بچ کر چلوں گا جیسے بڑے نوک دار کانٹے سے۔ کسی سے نفرت کرنا مصلحت اور شرافت کے خلاف ہے مگر اب اس جنس سے نفرت کروں گا۔

اس مایوسی رنج اور تفکرات میں پڑا ہوا دل کبھی کبھی اتنا مضطرب ہو جاتا کہ جی میں آتا کہ چل کر اس سنگ دل کے سامنے دیوار سے سر ٹکرا کر جان دے دوں جس میں اسے بھی پشیمان ہونا پڑے۔ میں یہاں آگ کے کنڈ میں جل رہا ہوں۔ دل میں پھپھولے پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی کو خبر نہیں۔ سیر و تفریح کا لطف اٹھایا جا رہا

ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا تو اسے بھی اپنی کج ادائی اور بے دردی پر شرم نہ آتی۔ ایشور! مجھے ان بد اندیشیوں کے لیے معاف کرنا۔ میں دل جلا ہوں۔ وہ بھی میری طرح مایوسی کی آگ میں جلتی۔ کلارک اس کے ساتھ اسی طرح دغا کرتا جس طرح اس نے میرے ساتھ کی ہے۔ اگر میری بد دعا میں کچھ بھی اثر ہے ایک دن ضرور ہی اسے بھی رنج و غم کے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں گا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ خونِ ناحق رنگ نہ لائے۔

لیکن یہ مایوسی سراپا درد انگیز ہی نہ تھی۔ اس میں روحانی ترقی کے آثار بھی پوشیدہ تھے۔ ونے کے دل میں پھر وہی نیک خیالی پیدا ہوگئی۔ جسے محبت کے خیالات نے ناپید کر دیا تھا۔ مایوسی نے غرض کو فنا کر دیا۔

ایک روز ونے سنگھ رات کے وقت لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ جانے میرے ساتھیوں پر کیا گزری؟ میری طرح وہ بھی تو آفتوں میں نہیں مبتلا ہو گئے۔ کسی کی کچھ خبر ہی نہیں ملتی۔ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دفعتاً ان کو اپنے سرہانے کی جانب ایک دھماکا سنائی دیا۔ وہ چونک پڑے اور کان لگاکر سننے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ دیوار کھود رہے ہیں۔ دیور پتھر کی تھی مگر بہت پرانی۔ جوڑوں میں لونی لگ گئی تھی۔ پتھر کی سلیں آسانی سے اپنی جگہ چھوڑتی جاتی تھیں۔ ونے سنگھ کو تعجب ہوا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟ اگر چور ہیں تو جیل کی دیوار توڑنے سے انھیں کیا ملے گا ؟ شاید سمجھتے ہیں کہ جیل کے داروغہ کا یہی مکان ہے۔" وہ اسی حیص بیص میں تھا کہ اندر روشنی کی ایک جھلک آئی۔ معلوم ہوا کہ چوروں نے اپنا کام پورا کر لیا۔ وہ نقب کے سامنے جا کر بولے۔ "تم کون ہو؟ یہ دیوار کیوں کھود رہے ہو۔"

باہر سے آواز آئی۔ "ہم آپ کے پرانے خادم ہیں۔ میرا نام بیرپال سنگھ ہے۔"

ونے سنگھ نے حقارت سے کہا۔ "کیا تمھارے لیے کسی خزانہ کی دیواریں نہیں ہیں جو جیل کی دیوار کھود رہے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گا۔"

بیر پال : مہاراج! ہم سے اس دن بڑا اپرادھ ہوا۔ چھما کیجیے۔ ہمیں نہ معلوم تھا کہ صرف چند منٹ ہمارے ساتھ رہنے کے سبب آپ پر آفت آجائے گی ورنہ ہم

سرکاری خزانہ نہ لوٹتے۔ ہمیں رات دن یہی چنتا لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح آپ کے درشن کریں۔اور آپ کو اس آفت سے چھڑائیں۔ آیئے! آپ کے لیے گھوڑا حاضر ہے۔

ونے سنگھ : میں پاپیوں کے ہاتھوں اپنی حفاظت نہیں کرانا چاہتا اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا بڑا الزام سر پر رکھے ہوئے جیل سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں گا تو تم دھو کے میں ہو۔ مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے۔

بیرپال : خطاوار تو ہم ہیں۔ آپ تو بالکل بے خطا ہیں۔ آپ پر تو حاکموں نے یہ محض بیجا ظلم کیا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہاں سے نکل جانے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔

ونے سنگھ : جب تک عدالت مجھے رہا نہ کر دے۔ میں کسی طرح بھی نہ جا سکتا۔

بیر پال : یہاں کی عدالتوں سے انصاف کی امید رکھنا چڑیا سے دودھ نکالنا ہے۔ ہم سب کے سب انھیں عدالتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں اپنے گاؤں میں مکھیا تھا۔ لیکن میری ساری جائداد صرف اس لیے ضبط کر لی گئی کہ میں نے علاقہ دار کے ہاتھوں سے ایک بیکس نوجوان لڑکی کو بچایا تھا۔ اس کے گھر میں اس بڑھیا ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ حال ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ علاقہ دار کی بری نگاہ اس پر پڑگئی اور وہ لڑکی کو اس کے گھر سے نکال لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے خبر مل گئی۔ رات کو جوں ہی علاقہ دار کے آدمیوں نے بڑھیا کے گھر میں گھسنا چاہا میں اپنے کئی دوستوں کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا اور ان بدمعاشوں کو مار کر وہاں سے نکال دیا۔ بس علاقہ دار اسی دن سے میرا جانی دشمن ہو گیا۔ مجھ پر چوری کا مقدمہ چلا کر قید کر دیا۔ عدالت اندھی تھی۔ جیسا علاقہ دار نے کہا۔ ویسا ہی حاکم نے کیا۔ ایسی عدالتوں سے آپ ناحق انصاف کی امید رکھتے ہیں۔

ونے سنگھ : تم لوگ اس دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے بندوق کی آواز سن کر ایسا بھاگے کہ مجھے تم پر اب اعتبار نہیں ہوتا۔

بیر پال : مہاراج! کچھ نہ پوچھیے۔ بندوق کی آواز سنتے ہی ہم پاگل سے ہو گئے۔ ہمیں جب ریاست سے بدلہ لینے کا کوئی موقع ملتا ہے تو ہم اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے

اوپر کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ریاست نے ہم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ہمارے پرکھوں نے اپنے خون سے اس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ آج وہی ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ہم آپ کے پاس سے بھاگے تو تھوڑی دور پر اپنے غول کے کئی آدمیوں کو ریاست کے سپاہیوں سے لڑتے پایا۔ ہم پہنچتے ہی سرکاری آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی بندوقیں چھین لیں۔ ایک آدمی کو مار گرایا اور روپیوں کی تھیلیاں گھوڑوں پر لاد کر بھاگ نکلے۔ جب سے سنا ہے کہ آپ ہمارا مدد کرنے کے شبہ میں گرفتار کیے گئے ہیں۔ تب سے اسی دوڑ دھوپ میں ہیں کہ آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں۔ یہ جگہ آپ جیسے دھر ماتما نڈر اور آزاد آدمیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں اسی کا نباہ ہے جو پلے سرے کا گھاگ، مکار ور بدمعاش ہو اور اپنا کام نکالنے کے لیے برے سے برا طریقہ اختیار کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکے۔

ونے سنگھ نے غرور کے ساتھ جواب دیا۔ ”اگر تمھاری باتیں لفظ بہ لفظ سچ ہوں تو بھی میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا۔ جس سے ریاست کی بدنامی ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پینا منظور ہے۔ مگر روکر ان کو مصیبت میں ڈالنا منظور نہیں۔ اس ریاست کو ہم نے ہمیشہ فخر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور مہاراجہ صاحب کو ہم آج بھی اسی احترام کی نگا سے دیکھتے ہیں۔ وہ اسی سانگا اور پرتاپ کے ور ثا میں سے ہیں۔جنھوں نے ہندو قوم کی حفاظت میں اپنی جانیں تک دے دی تھیں۔ہم مہاراجہ صاحب کو اپنا محافظ اپنا خیر اندیش اور چھتری قوم کا سردار سمجھتے ہیں۔ ان کے ملازم سب ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔پھر یہاں کی عدالتوں پر کیوں نہ اعتبار کریں؟ وہ ہمارے ساتھ بے انصافی بھی کریں تو بھی ہم زبان نہ کھولیں گے۔ ریاست کو مطعون کرکے ہم اپنے آپ کو اس درجہ کے ناقابل ثابت کرتے ہیں جو ہماری زندگی کی معراج ہے۔

بیر پال : دھوکا کھایئے گا۔

ونے سنگھ : اس کی کوئی فکر نہیں۔

بیر پال : میرے سر سے بدنامی کیسے دور ہوگی؟

ونے سنگھ : نیک اعمال سے۔

بیر پال سمجھ گیا کہ آپ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہوں گے پانچوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک لمحہ میں موسم سرما کی گھنی کہرے نے انھیں اپنے پردہ میں چھپا لیا۔ ٹاپوں کی آواز کچھ دیر تک کانوں میں آتی رہی پھر وہ بھی نہ سنائی دی۔

اب ونے سنگھ سوچنے لگے صبح جب لوگ یہ نقب دیکھیں گے تو دل میں خیال کریں گے؟ انھیں یقین ہو جائے گا کہ میں ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہوں اور پوشیدہ طریقہ پر بھاگنے کی کوششیں کر رہا ہوں لیکن نہیں۔ جب دیکھیں گے کہ میں بھاگنے کا موقع پاکر بھی نہیں بھاگا تو ان کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے انھوں نے پتھر کے ٹکڑے چن چن کر نقب کو بند کرنا شروع کیا۔ ان کے پاس صرف ایک ہلکا سا کمبل تھا۔ اور سرد سرد ہوا اس شگاف کی راہ سے سن سن کرتی آ رہی تھی۔ کھلے میدان میں شاید انھیں کبھی اتنی سردی نہ معلوم ہوئی تھی۔ ہر ہر رونگٹے میں یہ ہوا سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ شگاف بند کر کے وہ لیٹ گئے۔

صبح ہوئی تو جیل خانہ میں ہل چل مچ گئی۔ ناظم علاقہ دار۔ سبھی موقع واردات پر پہنچ گئے۔ تحقیقات ہونے لگی۔ ونے سنگھ نے سارا حال کہہ سنایا۔ افسروں کو بڑی فکر ہوئی کہ کہیں وہی ڈاکو انھیں نکال نہ لے جائیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ طے ہوگیا کہ ان پر آج ہی مقدمہ چلایا جائے۔ مسلح پولیس انھیں عدالت کی طرف لے چلی۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہو گئی۔ سب لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ "حاکم لوگ ایسے شریف نیک دل اور پراپکاری شخص پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ برا کرتے ہیں۔ بیچارے نے نہ جانے کس بری ساعت میں یہاں قدم رکھا تھا۔ ہم تو ابھاگے ہیں ہی۔ اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ ناحق اس آگ میں کودے، کتنے ہی لوگ رو رہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ حاکم انھیں سخت سزا دے گا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اور پولیس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ بگڑ نہ اٹھیں۔ دفعتاً ایک موٹر آئی۔ اور موٹر ڈرائیور نے پولیس کے افسر کو ایک رقعہ دیا۔ سب لوگ غور سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ اتنے میں ونے سنگھ موٹر میں سوار کرائے گئے اور موٹر ہوا ہو گئی۔ سب کے سب تاکتے رہ گئے۔

جب موٹر کچھ دور نکل گئی تو ونے نے شوفر (گاڑی چلانے والے) سے پوچھا۔
"مجھے کہاں لیے جاتے ہو؟"

شوفر نے کہا۔ "آپ کو دیوان صاحب نے بلایا ہے۔"

ونے سنگھ نے اور کچھ نہ پوچھا۔ انھیں اس وقت خوف کے بجائے خوشی تھی کہ دیوان سے ملنے کا یہ اچھا موقع ملا۔ اب ان سے یہاں کے متعلق کافی گفتگو ہوگی۔ سنا ہے قابل آدمی ہیں۔ دیکھوں یہاں کے موجودہ طریقوں کا جواز کیوں کر ثابت کرتے ہیں۔

یکایک شوفر نے کہا۔ "یہ دیوان ایک ہی پاجی ہے۔ رحم کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ ایک دن بچہ کو اسی موٹر سے ایسا گراؤں گا کہ ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے گا۔"

ونے سنگھ : ضرور گراؤ ایسے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

شوفر نے حیرت سے ونے کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ونے سنگھ کے منہ سے ایسی بات سننے کی اسے امید نہ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ وہ اعلیٰ ترین اوصاف کے مخزن ہیں۔ ان کا دل بہت پاک ہے بولا۔ "تو آپ کی بھی یہی مرضی ہے۔"

ونے سنگھ : کیا کیا جائے۔ ایسے آدمیوں پر اور کسی بات کا تو اثر ہی نہیں ہوتا۔

شوفر : اب تک مجھے یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ لوگ مجھے قاتل کہیں گے لیکن جب آپ جیسے فرشتہ خصلت شخص کی یہ خواہش ہے تو مجھے کیا ڈر؟ بچہ بہت رات کو گھومنے نکلا کرتے ہیں۔ ایک ٹھوکر میں تو کام تمام ہو جائے گا۔

ونے سنگھ یہ سن کر ایسا چونکے گویا کوئی خوف ناک خواب دیکھا ہو۔انھیں معلوم ہوا کہ میں نے ایک نفرت انگیز خیال کی تائید کر کے کتنی بڑی برائی کی ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ مخصوص آدمیوں کو کتنی احتیاط سے کچھ کہنا چاہیے کیوں کہ ان کا ایک ایک لفظ ترغیب و تحریک سے معمور رہتا ہے۔وہ دل میں پچھتا رہے تھے کہ میرے منہ سے ایسی بات نکلی ہی کیوں؟ اور کسی طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو پھیر لانے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ اتنے میں دیوان صاحب کا گھر آ گیا۔ بڑے پھاٹک پر دو مسلح جوان کھڑے ہوئے تھے اور پھاٹک سے ذرا فاصلہ پر دو پیتل کی توپیں رکھی ہوئی

تھیں۔ پھاٹک پر موٹر رک گئی۔ اور دونوں سپاہی ونے سنگھ کو اندر لے چلے۔ دیوان صاحب دیوان خاص میں موجود تھے۔ انھوں نے خبر پاتے ہی ونے کو بلا لیا۔

دیوان صاحب کا قد اونچا، بدن گٹھیلا اور رنگ گورا تھا۔ ادھیڑ ہو جانے پر بھی ان کے چہرہ کی رونق کسی کھلے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ تنی ہوئی مونچھیں تھیں۔ سر پر مختلف رنگوں کا اودے پوری صافہ بدن پر ایک چست شکاری کوٹ۔ نیچے اودے پوری پاجامہ اور اوپر ایک بھاری اوورکوٹ۔ سینہ پر کئی تمغے اور دیگر عزت افزا نشانات موجود تھے۔ اودے پوری رسالہ کے ساتھ یوروپ کی جنگ عظیم میں شریک ہوئے تھے۔ اور وہاں کئی نازک موقعوں پر اپنی غیر معمولی شجاعت سے فوجی افسروں کو متحیر کر دیا تھا۔ یہ اسی کام کا نتیجہ تھا کہ وہ اس عہدہ پر مقرر ہوئے تھے۔ سردار نیل کنٹھ سنگھ نام تھا۔ ایسا وجیہ شخص ونے کی نظر سے کبھی نہ گزرا تھا۔

دیوان صاحب نے ونے سنگھ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے انھیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ "یہ زیور تو آپ کے جسم پر بہت زیبا نہیں ہیں۔ لیکن عوام کی نگاہوں میں ان کی جتنی وقعت ہے اتنی میرے ان تمغوں اور پٹیوں کی ہرگز نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر میں آپ پر رشک کروں تو کیا نا مناسب ہے ؟

ونے سنگھ نے سمجھا تھا کہ دیوان صاحب جاتے ہی جاتے گرج پڑیں گے۔ لال پیلی آنکھیں دکھائیں گے وہ اس برتاؤ کے لیے تیار تھے۔ اور جو دیوان صاحب کی یہ ہمدردانہ گفتگو سنی تو پس و پیش میں پڑ گئے۔ اس سخت جوابی کے لیے یہاں ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ جسے انھوں نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ بولے۔ "یہ تو کوئی ایسی نایاب چیز نہیں ہے جس کے لیے آپ کو رشک کرنا پڑے۔"

دیوان صاحب : (ہنس کر) آپ کے لیے نایاب نہیں پر میرے لیے نایاب ہی ہے۔ مجھ میں وہ سچی ہمت وہ سچا حوصلہ نہیں ہے۔ جس کے صلہ میں یہ چیزیں ملتی ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کنور بھرت سنگھ کے سپوت بیٹے ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ اب وہ شاید مجھے بھول گئے ہوں۔ کچھ تو اس رشتہ سے کہ آپ میرے پرانے دوست کے بیٹے ہیں اور کچھ اس رشتہ سے کہ آپ نے عین عالم شباب میں نفسانی خواہشات کو ترک کرکے قومی خدمت کا ذمہ لیا ہے۔ میرے دل

میں آپ کی خاص عزت و محبت ہے۔ شخصی حیثیت سے میں آپ کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور تھوڑے سے وقت میں آپ نے ریاست کو جو نفع پہنچایا ہے، اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ بے قصور ہیں اور ڈاکوؤں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب سے بھی آپ کے متعلق ابھی ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی۔ وہ بھی کھلے دل سے آپ کے مداح ہیں۔ لیکن موجودہ حالات ہمیں آپ سے یہ التجا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ بہت اچھا ہواگر آپ...... اگر آپ رعایا سے اپنے کو جدا رکھیں۔ مجھے آپ سے یہ کہتے ہوئے دلی افسوس ہوتا ہے کہ اب یہ ریاست آپ کی مہمانداری کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔"

ونے سنگھ نے اپنے اٹھتے ہوئے غصہ کو ضبط کرکے کہا۔ "آپ نے میرے متعلق جس حسنِ ظن کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن افسوس کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ قومی خدمت میری زندگی کا خاص مدعا ہے۔اور قوم سے جدا ہوکر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔"

دیوان صاحب: اگر آپ کی زندگی کاخاص مدعا یہی ہے تو آپ کو کسی ریاست میں آنا مناسب نہ تھا۔ ریاستوں کو آپ سرکار کی محلسرا سمجھیے جہاں آفتاب کی روشنی کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔ ہم سب اس حرم سرا کے حبشی خواجہ سرا ہیں۔ ہم کسی کی عشق آمیز نگاہوں کو ادھر اٹھنے نہ دیں گے۔ کوئی منچلا جوان ادھر قدم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو تو ہم اپنے عہدہ کے ناقابل خیال کیے جائیں۔ ہماری شوقین مزاج سرکار اپنی حسب خواہش تفریح کے لیے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتی ہے۔ حرم سرا کے سوئے ہوئے بھاگ اس دن جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بیگمات کی دلی تمناؤں کا انحصار ان کی خوبصورتی نازو انداز۔ بناؤ اور سنگار پر ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری رسیلی سرکار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ ہماری سرکار کو مشرقی آرایش و زیبایش پسند ہے۔ اس کا حکم ہے کہ بیگمات کا لباس اور زیور مشرقی ہو۔ بناؤ سنگار مشرقی ہو۔ ناز و کرشمہ مشرقی ہو۔ ان کی آنکھیں شرمیلی ہوں۔ مغرب کی شوخی ان میں نہ آنے پائے۔ ان کی رفتار ہنسوں کی چال کی طرح دھیمی ہو۔ مغربی بیگمات کی

طرح اچھلتی کودتی نہ چلیں۔ وہی کنیز ہوں۔ وہی حرم کا داروغہ ہو۔ وہی حبشی غلام اور وہی اونچی چہار دیواری جس میں پرندہ پر نہ مار سکے۔ آپ نے اس محلسرا میں گھسنے کی جرأت کی ہے۔ یہ بات ہماری عشق مزاج سرکار کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور آپ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ خادمان قوم کا ایک گروہ ہے۔اس گروہ کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ نادر شاہی حکم ہے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ گستاخ گروہ حرم سرا سے دور بھگا دیا جائے۔ یہ دیکھیے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے آپ کے رفقاء کے کارناموں کی داستان لکھ بھیجی ہے۔ کوئی کوٹہ میں کسانوں کی انجمن قائم کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بیکانیر میں بیگار کی جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ کوئی میواڑ میں ریاست کے ان ٹیکسوں کی مخالفت کر رہا ہے جو زمانہ قدیم سے وصول ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ لوگ جمہوریت کا ڈنکا بجاتے پھرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر انسان کو کھانے پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ اس حرم سرا میں ان خیالات اور اصولوں کی اشاعت کر کے آپ سرکار بہادر کو بدگمان کردیں گے اور اس کی آنکھیں پھر گئیں تو ہمارا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ ہم آپ کو عشق و محبت کے اس کنج میں آگ نہ لگانے دیں گے۔

ہم اپنی کمزوریوں کو طنز کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ دیوان صاحب نے طنزیات کو مستعمل کر کے ونے کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی تھی۔ لیکن ونے سنگھ اتنے بیوقوف نہ تھے وہ چال بھانپ گئے اور بولے۔ ''ہمارا خیال تھا کہ ہم اپنی بے غرضانہ خدمت سے آپ کو اپنا ہمدرد بنا لیں گے۔''

دیون صاحب : اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ ہم کو آپ سے دلی ہمدردی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ریزیڈنٹ صاحب کی مرضی کے خلاف ہم ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتے۔ آپ ہمارے اوپر رحم کیجیے۔ ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دیجیے۔ ہم جیسے گرے ہوؤں کو اٹھانے میں آپ کو نیک نامی کے بجائے بد نامی ہی ملے گی۔

ونے سنگھ : آپ ریزیڈنٹ کے مداخلت بیجا کی مخالفت کیوں نہیں کرتے؟

دیوان صاحب : اس لیے کہ ہم آپ کی طرح بے نفس اور بے لوث نہیں ہیں۔ سرکار کی حفاظت میں ہم من مانے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ من مانے قانون بناتے

ہیں۔ من مانی سزائیں دیتے ہیں۔کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ یہی ہماری کار گزاری سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے صلہ میں ہم کو بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں اور عہدہ کی ترقی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم مخالفت کیوں کریں؟

دیوان صاحب کی بے غیرتی پر ونے سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس سے تو یہ بدرجہا بہتر تھا کہ ریاستوں کا نشان ہی نہ رہتا۔"

دیوان صاحب : اسی لیے تو ہم آپ سے التجا کر رہے ہیں کہ اب کسی اور علاقہ کی جانب اپنی توجہ مبذول فرمائیے۔

ونے سنگھ: اگر میں جانے سے انکار کروں؟

دیوان صاحب : تو مجھے کمال افسوس کے ساتھ آپ کو اسی عدالت کے سپرد کرنا پڑے گا جہاں انصاف کا خون ہوتا ہے۔

ونے سنگھ : بے گناہ؟

دیوان صاحب : آپ پر ڈاکوؤں کی اعانت کا جرم لگا ہوا ہے۔

ونے سنگھ : ابھی آپ نے کہا ہے کہ آپ کو میری نسبت ذرا بھی شک نہیں ہے۔

دیوان صاحب : وہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہ میری منصبی رائے ہے۔

ونے سنگھ : آپ کو اختیار ہے۔

ونے سنگھ پھر موٹر پر بیٹھے تو سوچنے لگے۔ جہاں ایسے ایسے بے غیرت اپنی بدنامیوں پر بغلیں بجانے والے ناخدا ہیں۔ اس کشتی کو ایشور ہی پار لگائے۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ جیل میں رہنے سے ماتا جی کو تو تسکین ہوگی۔ یہاں سے جان بچا کر بھاگتا تو وہ میری طرف سے بالکل مایوس ہوجاتیں۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کا لکھنا بالکل بے اثر نہیں ہوا۔ چلوں۔ اب عدالت کا سوانگ بھی دیکھ لوں۔"

(18)

صوفیہ گھر آئی تو اس کا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ہی نگاہوں میں ذلیل ہو چکی تھی۔ اسے اب نہ رانی صاحبہ پر غصہ آتا تھا نہ اپنے والدین پر۔ غصہ تھا تو صرف اپنے نفس پر۔ جس کے ہاتھوں اس کی اتنی رسوائی ہوچکی تھی۔ جس نے اس کو کانٹوں

میں گھسیٹا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ نفس کو پیروں تلے کچل ڈالوں گی۔ اس کا نشان مٹا دوں گی۔ دوبدھا میں پڑ کر وہ اپنے نفس کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اس کا منہ بند کر دینے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نفس کا منہ بند کر دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اب اگر نفس جادۂ فرض سے منحرف ہو تو وہ اپنے اس انحراف پر نادم ضرور ہو۔ جس طرح کوئی تلک لگائے ہوئے وشنو دیوتا کا پجاری شراب کی بھٹی میں جاتے ہوئے جھجھکتا ہے اور شرم سے گردن نہیں اٹھا سکتا اسی طرح اس کا نفس بھی خوش اطواری کی بندشوں میں پڑ کر بری باتوں سے جھجھکے۔ اس نفس کشی کے لیے وہ بے وفائی اور مکاری کا الزام سر پر لینے کو تیار تھی۔ تمام عمر مایوسی اور فراق کی آگ میں جلنے کو تیار تھی۔ وہ نفس سے اس ذلت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو رانی کے ہاتھوں اسے بر داشت کرنی پڑی تھی۔ اس کا دل شراب پینا چاہتا تھا۔ وہ اسے زہر پلاکر اس کی پیاس بجھانا چاہتی تھی اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے کو مسٹر کلارک کے سپرد کر دوں گی۔ نفس کشی کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لیکن باطن میں اس کا وقار کتنا ہی مٹ گیا ہو مگر ظاہر میں وہ اس وقت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اپنے گھرمیں اس کی اتنی خاطر و مدارات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مسز سیوک کی آنکھوں میں وہ کبھی اتنی پیاری نہ تھی۔ ان کے منہ سے اس نے کبھی اتنی میٹھی باتیں نہ سنی تھیں۔ یہاں تک کہ اب وہ اس کی مذہبی تحقیقات سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ عبادت کے معاملہ میں بھی اب اس پر کوئی جبر نہ کیا جاتا تھا۔ وہ اب اپنی مرضی کی مالکہ تھی اور مسز سیوک یہ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں کہ صوفیہ سب سے پہلے گرجا گھر پہنچ جاتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مسٹر کلارک کی صحبت کا یہ اثر ہے۔

لیکن صوفیہ کے سوا یہ ماجرا کون جان سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی اس کو روز عشق و محبت کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا جس سے اس کو دلی نفرت ہوتی تھی۔ اسے اپنی مرضی کے خلاف مصنوعی جذبات کی نقل کرنی پڑتی تھی۔ اسے عشق و محبت کے وہ الفاظ ہمہ تن گوش ہو کر سننے پڑتے تھے جو اس کے دل پر ہتھوڑوں کی ضرب

کی طرح پڑتے تھے۔ اسے ان بیباک اور محبت بھری نگاہوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا جن کے سامنے وہ آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی۔ مسٹر کلارک کی باتیں کبھی کبھی اتنی عشقیہ ہوتی تھیں کہ صوفی کا دل چاہتا تھا کہ اس خود ساختہ طرز کا پردہ فاش کر دوں۔ اس مصنوعی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دل کے درد و سوز میں ایک حاسدانہ مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ پاپی! تیری یہی سزا ہے۔ تو اسی قابل ہے۔ تونے مجھے جتنا ذلیل کیا ہے اس کا تجھے کفارہ کرنا پڑے گا۔

اسی طرح وہ ہجراں نصیب رو رو کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس پر طُرّہ یہ کہ یہ تکلیف کم ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ صوفیہ نا معلوم طریقہ پر مسٹر کلارک سے کچھ کشیدہ خاطر رہتی تھی۔ دل بہت دبانے پر بھی ان سے نہ ملتا تھا۔ اس کی یہ کشیدگی کلارک کی آتش عشق کو اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔ صوفیہ اگر اس حالت میں بھی انھیں منہ نہ لگاتی تھی تو اس کا خاص سبب مسٹر کلارک کی مذہبی رغبت تھی۔ اس کی نگاہ میں مذہب سے بڑھ کر کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ اسے تنگ خیالی نفرت اورغرور کا نشان سمجھتی تھی۔ کلارک دل ہی دل میں سمجھتے تھے کہ صوفیہ کو میں ابھی نہیں پا سکا ہوں اور اس لیے بہت زیادہ مشتاق ہونے پر بھی انھیں صوفیہ سے شادی کے متعلق گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انھیں یقین کامل نہ تھا کہ میری التجا قبول ہوگی لیکن امید کا تار انھیں صوفیہ کے دامن سے باندھے ہوئے تھا۔

اسی طرح ایک سال سے زیادہ وقت گزر گیا اور مسز سیوک کو اب شک ہونے لگا کہ صوفیہ کہیں ہمیں سبز باغ تو نہیں دکھا رہی ہے۔ آخر ایک روز انھوں نے صوفیہ سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو رات دن مسٹر کلارک کے ساتھ بیٹھی بیٹھی کیا کیا کرتی ہے؟ کیا بات ہے؟ کیاوہ شادی کی بات چیت ہی نہیں کرتے؟ یا تو ہی ان سے بھاگی بھاگی پھرتی ہے؟

صوفیہ شرم سے سرخ ہو کر بولی۔ ”وہ کہنا ہی نہیں چاہتے تو کیا میں ان کی زبان ہو جاؤں۔“

مسز سیوک: یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ عورت چاہے اور پھر بھی مرد نہ کہے۔ وہ تو آٹھوں پہر موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ تو ہی انھیں پھٹکنے نہ دیتی ہوگی۔

صوفیہ : ماما! ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔

مسز سیوک : یہ قصور تمھارا ہی ہے اور اگر تم دو چار دن میں مسٹر کلارک کو شادی کے لیے کہنے کا موقع نہ دوگی تو پھر میں تمھیں رانی صاحبہ کے پاس بھیج دوں گی۔ اور دو بارہ بلانے کا نام بھی نہ لوں گی۔

صوفی کانپ گئی۔ رانی کے پاس لوٹ کرجانے سے مر جانا کہیں بہتر تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لیا آج وہ کروں گی جو آج تک کسی عورت نے نہ کیا ہوگا۔ صاف کہہ دوں گی کہ میرے گھر کا دروازہ میرے لیے بند ہے۔ اگر آپ مجھے پناہ دینا چاہتے ہیں تو دیجیے۔ ورنہ میں اپنے لیے کوئی اور راستہ نکالوں۔ مجھ سے محبت کی امید نہ رکھیے۔ آپ میرے شوہر ہو سکتے ہیں۔ معشوق نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر مجھے قبول کر تے ہوں تو کیجیے ورنہ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھایئے گا۔

شام ہوگئی تھی۔ ماگھ کا مہینہ تھا اس پر ہوا اور بادل۔ سردی سے ہاتھ پیر اکڑے جا تے تھے۔ نہ کہیں زمین کا پتہ تھا۔ نہ آسمان کا۔ چاروں طرف کہرا ہی کہرا چھایا ہوا تھا۔ اتوار کا دن تھا عیسائی عورت مرد صاف شفاف کپڑے اور دبیز لبادے پہنے ہوئے ایک ایک کر کے گرجا گھرمیں داخل ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ میں جان سیوک، مسز سیوک، پربھوسیوک فٹن سے اترے۔ اور لوگ تو فوراً اندر چلے گئے صرف صوفیہ باہر رہ گئی۔ دفعتاً پربھو سیوک نے باہر آکر پوچھا۔ کیوں صوفی! مسٹر کلارک اندر گئے؟''

صوفیہ : ہاں۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔

پربھوسیوک : اور تم؟

صوفیہ نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ ''میں بھی چلی جاؤں گی۔''

پربھوسیوک : آج تم بہت اداس معلوم ہو تی ہو۔

صوفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی ''ہاں پربھو۔ آج میں بہت اداس ہوں۔ آج میری زندگی میں سب سے بڑی مصیبت کا دن ہے کیوں کہ آج میں کلارک کو اس امر پر مجبور کروں گی کہ وہ مجھ سے شادی کے خواستگار ہوں۔ میرا اخلاقی اور روحانی زوال ہوچکا۔ اب میں اپنے اصولوں پر جان دینے والی اپنے ضمیر کی آواز کو حکم خدا سمجھنے والی، مذہبی عقائد کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے والی صوفیہ نہیں ہوں۔ وہ صوفیہ

اب دنیا میں نہیں ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں اسے اپنی زبان سے کہتے ہوئے مجھے خود شرم آتی ہے۔"

پربھو سیوک شاعر ہونے پر بھی اس خیالی قوت سے بے بہرہ تھے جو دوسروں کے دل میں سما کر ان کی حالت کا احساس کرتی ہے۔ وہ خیالی دنیا میں ہمیشہ گھومتے رہتے تھے۔ اور دنیا کے آرام و تکلیف سے اپنے کو متفکر بنانا انھیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ یہ دنیا کے جھمیلے ہیں۔ ان میں کیوں سر کھپاؤں؟ انسان کو کھانا اور خوش رہنا چاہیے۔ وہی الفاظ صوفیہ کی زبان سے کئی مرتبہ سن چکے تھے جھنجھلا کر بولے۔ تو اس میں رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے؟ ماما سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ انھوں نے تمھیں مجبور تو نہیں کیا ہے؟"

صوفیہ نے حقارت کے لہجہ میں کہا۔ "پربھو! ایسی باتوں سے دل نہ دکھاؤ۔ تم کیا جانو میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اپنی خوشی سے، کوئی زہر کا پیالہ نہیں پیتا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہو کہ میں تم سے اپنی سیکڑوں بار کی کہی ہوئی کہانی نہ کہتی ہوں۔ پھر بھی تم کہتے ہو۔ تمھیں مجبور کس نے کیا؟ تم تو شاعر ہو۔ تم اتنے بے حس کیسے ہو گئے؟ مجبوری کے سوا آج مجھے کون یہاں کھینچ لایا۔ آج میری یہاں آنے کی ذرا بھی خواہش نہ تھی پر یہاں موجود ہوں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مذہب کی رہی سہی عزت بھی میرے دل سے اٹھ گئی۔ جہلاء کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ مذہب خدا کی برکت ہے۔ میں کہتی ہوں۔ یہ خدائی قہر ہے جو انسانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے دنیا میں نازل ہوا ہے۔ اسی کے باعث آج میں زہر کا گھونٹ پی رہی ہوں رانی جانھوی جیسی نیک دل عورت کا مجھ سے برگشتہ ہو جانے کا اور کیا سبب تھا؟ میں اس فرشتہ خصلت انسان سے کیوں بے وفائی کرتی جس کی پرستش آج بھی دل میں کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی؟ اگر یہ سبب نہ ہو تو مجھے اپنی روح کو یہ بے رحمانہ سزا دینی ہی کیوں پڑتی؟ میں اس معاملہ میں جتنا ہی غور کرتی ہوں اتنی ہی مذہب کے متعلق بے اعتباری زیادہ ہوتی ہے۔ آہ۔ میری بے وفائی سے ونے کو کتنا رنج ہوا ہوگا۔ اس کے خیال ہی سے میری جان سوکھ جاتی ہے۔ وہ دیکھو۔ مسٹر کلارک بلا رہے ہیں۔ شاید سرمن (وعظ) شروع ہونے والا ہے۔ جانا ہی پڑے گا ورنہ ماما جیتا نہ

چھوڑیں گی۔"

پربھوسیوک تو قدم بڑھاتے ہوئے جا پہنچے۔ صوفیہ دو ہی چار قدم چلی تھی کہ یکایک اسے سڑک پر کسی کے گانے کی آہٹ ملی۔ اس نے سر اٹھا کر چہار دیواری کے اوپر سے دیکھا کہ ایک اندھا آدمی ہاتھ میں کھنجڑی لیے یہ گیت گاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں

بیروں کا کام ہے مرنا۔ کچھ نام جگت میں کرنا

کیوں نج مر جادا چھوڑیں

کیوں جیت کی تجھ کو اچھا   کیوں ہار کی تجھ کو چنتا

کیوں دکھ سے ناتا جوڑیں

تو رنگ بھوم میں آیا دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

صوفیہ نے اندھے کو پہچان لیا۔ سورداس تھا۔ وہ اس گیت کو کچھ اس طرح مست ہو کر گاتا تھا کہ سننے والوں کے دلوں پر چوٹ سی لگتی تھی۔لوگ راہ چلتے سننے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔صوفیہ محو ہو کر یہ گیت سنتی رہی۔ اسے گیت کے تیسرے پد میں زندگی کا پورا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوامعلوم ہوتاتھا۔

تو رنگ بھوم میں آیا دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں   بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں

راگ اتنا سریلا۔ اتنا شیریں۔ اتنا جوش افزا تھا کہ سماں بندھ گیا۔ راگ پر کھنجڑی کی تال اور بھی غضب کرتی تھی۔ جو سنتا تھا۔ سر دھنتا تھا۔

صوفیہ بھول گئی کہ میں گرجا جارہی ہوں سر سن کی ذرا بھی یاد نہ رہی۔ وہ بڑی دیر تک پھاٹک پر کھڑی اسی سرمن کو سنتی رہی۔ یہاں تک کہ سرمن ختم ہو گیا۔ معتقدین باہر نکل کر چلے۔ مسٹر کلارک نے آکر آہستہ سے صوفیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

کلارک : لارڈ بشپ کا سرمن ختم ہو گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو!

صوفیہ : اتنی جلد؟ ذرا میں اس اندھے کا گانا سننے لگی۔ سرمن کتنی دیر تک ہوا ہوگا؟
کلارک : نصف گھنٹہ سے کم نہ ہوا ہو گا۔ لارڈ بشپ کے سرمن مختصر ہوتے ہیں مگر نہایت دلکش۔ میں نے ایسا نورانی اور دانش مندانہ سرمن آج تک نہ سنا تھا۔ انگلستان میں بھی نہیں! افسوس کہ تم نہ آئیں۔

صوفیہ : مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں یہاں نصف گھنٹہ تک کھڑی رہی۔

اسی اثنا میں مسٹر ایشور سیوک اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ آکر کھڑے ہو گئے۔ مسز سیوک نے کلارک کو مادرانہ محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیوں ولیم۔ صوفی آج کے سرمن کے بارہ میں کیا کہتی ہے؟"

کلارک : یہ تو اندر گئی ہی نہیں۔

مسز سیوک نے صوفیہ کہ قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا" صوفیہ یہ تمھارے لیے شرم کی بات ہے۔"

صوفیہ شرمندہ ہو کر بولی۔ "مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں اس اندھے کا گانا سننے کے لیے ذرا رک گئی۔ اتنے میں سرمن ختم ہو گیا۔"

ایشور سیوک : بٹی۔ آج کا سرمن آب حیات کی طرح تھا۔ جس نے روح کو آسودہ کر دیا۔ جس نے نہیں سنا وہ تمام عمر پچھتائے گا۔ پربھو مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ ایسا سرمن آج تک نہ سنا تھا۔

مسز سیوک : تعجب ہے کہ اس روحانی نغمہ کے سامنے تمھیں یہ دہقانی گیت زیادہ دلکش معلوم ہوا۔

پربھوسیوک : ماما یہ نہ کہیے۔ دہقانی نغموں میں اکثر ایسی تاثیر ہوتی ہے جو مستند شعراء کے کلاموں میں بھی نہیں ہوتی۔

مسز سیوک : ارے یہ تو وہی اندھا ہے۔ جس کی زمین ہم نے لی ہے آج یہاں کیسے آ پہنچا؟ ابھاگے نے روپے نہ لیے۔ اب گلی گلی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ دفعتاً سورداس نے بلند آواز میں کہا۔ "دوہائی ہے پنچو۔ دوہائی ہے! سیوک صاحب و راجہ صاحب نے میری زمین زبردستی چھین لی ہے۔ مجھ دکھیا کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ دوہائی ہے!

دربل کو نہ ستایئے جاکی موئی ہائے
موئی کھال کی سانس سوں سار بھسم ہوئے جائے

کلارک نے مسٹر سیوک سے پوچھا۔ ''اس کی زمین تو معاوضہ دے کر لی گئی تھی نا؟ اب یہ کیسا جھگڑا ہے۔''

مسٹر سیوک : اس نے معاوضہ نہیں لیا۔ روپے خزانہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ بدمعاش آدمی ہے۔

ایک عیسائی بیرسٹر صاحب نے جو چیئر مینی کے لیے راجہ صاحب چتاری کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے۔ سورداس سے پوچھا۔ ''کیوں اندھے کیسی زمین تھی؟ راجہ صاحب نے کیسے لے لی؟''

سورداس : ہجور میرے باپ دادوں کی جمین(زمین) ہے۔ سیوک صاحب وہاں چرٹ بنانے کا کارکھانا کھول رہے ہیں۔ ان کے کہنے سے راجہ صاحب نے وہ جمین مجھ سے چھین لی ہے۔ دوہائی ہے سرکار کی۔ دوہائی پنچو۔ گریب کی کوئی نہیں سنتا۔

عیسائی بیرسٹر نے کلارک سے کہا۔ '' میرے خیال میں خانگی فائدہ کے لیے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا خلاف قانون ہے۔''

کلارک : بہت معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔

بیرسٹر : آپ کسی کو معاوضہ لینے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے جب تک آپ یہ ثابت نہ کر دیں کہ آپ زمین کو عوام کے لیے لے رہے ہیں۔

'کاشی آئرن ورکس' کے مالک مسٹر جان برڈ نے جو جان سیوک کے پرانے مخالف تھے۔ کہا۔ ''بیرسٹر صاحب! کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ سگریٹ کا کارخانہ کھولنا کار ثواب ہے۔ سگریٹ پینے والے آدمی کو بہشت میں داخل ہونے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔''

پروفیسر چارلس سیمین۔ جنھوں نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک پمفلٹ لکھا تھا۔ بولے۔ ''اگر سگریٹ کے کارخانہ کے لیے سرکار زمین دلاسکتی ہے تو کوئی سبب نہیں کہ چکلوں کے لیے نہ دلائے۔ سگریٹ کے کارخانہ کے لیے زمین پر قبضہ کرنا اس قانونی دفعہ کا بیجا طور پر استعمال کرنا ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ میں دنیا کے بڑے بڑے علماء اور حکماء کی رائیں درج کی تھیں۔ خرابی صحت کا خاص سبب سگریٹ نوشی

کی کثرت ہے۔ افسوس کہ اس پمفلٹ کی عوام نے قدر نہ کی۔"

"کاشی ریلوے یونین" کے سکریٹری مسٹر نیل منی نے کہا۔ "یہ سارے قاعدے سرمایہ داروں کی نفع رسانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور سرمایہ داروں ہی کو یہ تجویز کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ ان قواعد کا استعمال کب اور کہاں ہو کتے کو کھال کی پاسبانی سپرد کی گئی ہے۔ کیوں اندھے تیری زمین کل کتنی ہے؟"

سورداس : ہجور دس بیگھے سے کچھ جیادہ (زیادہ) ہو گی۔ سرکار باپ دادوں کی یہی نشانی ہے۔ پہلے راجہ صاحب مجھ سے مول مانگتے تھے۔ جب میں نے نہ دیا تو جبردستی (زبردستی) چھین لی۔ ہجور۔ اندھا اپاہج ہوں۔ آپ کے سوائے کس سے پھریاد(فریاد) کروں۔کوئی سنے گا تو سنے گا نہیں بھگوان تو سنیں گے۔

جان سیوک اب یہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ باتوں باتوں میں جھگڑا ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اتفاق سے ان کے سبھی مخالفین یکجا ہو گئے تھے۔ مسٹر کلارک بھی صوفیہ کے ساتھ اپنی موٹر پر آ بیٹھے۔ راستہ میں جان سیوک نے کہا۔ "کہیں راجہ صاحب نے اس اندھے کی فریاد سن لی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔

مسز سیوک : پاجی آدمی ہے۔ اسے پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتے؟

ایشور سیوک : نہیں بیٹا۔ ایسا بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ اخبار والے اس بات کا بتنگڑ بنا کر تمھیں بدنام کر دیں گے۔ یسوع! میرا منہ اپنے دامن میں چھپا اور اس نابکار کی زبان بند کر دے!

مسز سیوک : دو چار روز میں آپ ہی خاموش ہو جائے گا ٹھیکہ داروں نے ٹھیکہ کر لیا نہ؟

جان سیوک : ہاں۔ کام تو آج کل میں شروع ہو جانے والا ہے۔ مگر اس موذی کو چپ کرانا سہل نہیں ہے۔ محلہ والوں کو تو میں نے توڑ لیا۔ وہ سب اس کی مدد نہ کریں گے۔ مگر مجھے امید تھی کہ اس طرف سے مدد نہ پا کر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ یہ امید پوری نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے راجہ صاحب کا میونسپل بورڈ میں اب وہ زور نہیں رہا ورنہ کوئی اندیشہ نہ تھا۔ انھیں پورے سال بھر تک ممبران بورڈ کی خوشامد کرنی پڑی۔ تب جا کر

یہ تجویز منظور کرا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ممبر لوگ پھر کوئی چال چلیں۔

اتنے میں راجہ مہیندر کمار کا موٹر سامنے آ کر رکا۔ راجہ صاحب بولے۔ ''آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔ میں آپ کے بنگلہ سے واپس آ رہا ہوں۔ آ یئے ہم اور آپ سیر کر آئیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے۔''

جب جان سیوک موٹر پر بیٹھ گئے تو باتیں ہو نے لگیں۔ راجہ صاحب نے کہا۔ ''آپ کا سورداس تو ایک ہی بدمعاش نکلا کل سے سارے شہر میں گھوم گھوم کر گاتا ہے اور ہم لوگوں کوبدنام کرتا ہے۔ اندھے گا،نے میں اچھے ہو تے ہی ہیں۔اس کا راگ بہت ہی لوچدار ہے۔ بات کی بات میں اسے ہزاروں آدمی گھیر لیتے ہیں۔ جب خوب مجمع ہو جاتا ہے تو وہ دہائی دیتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کر تا ہے۔

جان سیوک : ابھی گرجا میں آ پہنچا تھا بس وہی دہائیاں دیتا تھا۔ پروفیسر سیمین مسٹر نیل منی وغیرہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ لوگ اس کو اور بھی اکسا رہے ہیں۔شاید ابھی کہیں وہیں کھڑا ہو۔''

راجہ صاحب : مسٹر کلارک سے تو کوئی بات چیت نہیں ہو ئی؟

جان سیوک : مو جود تو وہ بھی تھے۔ ان کی رائے ہے کہ اندھے کو پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ میں منع نہ کرتا تو وہ اسی وقت تھانہ دار کو لکھتے۔

راجہ صاحب : آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان کو منع کر دیا۔ اسے پاگل خانہ یا جیل خانہ بھیج دینا آسان ہے لیکن عوام کو یہ یقین دلانا مشکل ہے کہ اس کے ساتھ بے انصافی نہیں کی گئی۔ مجھے تو اس کی دوہائیوں تہائیوں کی پرواہ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ اگر اس کا یہی رویہ رہا تو دس پانچ دن میں ہم سارے شہر میں نکو بن جائیں گے۔

جان سیوک : اقتدار اور بدنامی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اس کی فکر نہ کیجیے۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میں نے محلّہ والوں کو قابو میں لانے کے لیے بڑے بڑے وعدے کر لیے۔ جب اندھے پر کسی کا کچھ اثر ہی نہ ہوا تو میرے سارے وعدے بیکار ہو گئے۔

راجہ صاحب : ابھی آپ کی تو جیت ہی جیت ہے۔ ہر طرف سے گیا تو میں۔ اتنی زمین آپ کو دس ہزار سے کم میں نہ ملتی۔ دھرم سالا بنوانے میں آپ کے اسی قدر

روپے لگیں گے۔ مٹی تو میری خراب ہوئی شاید زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں عوام کی نگاہوں سے گرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ چلیے ذرا پانڈے پور تک تو چلیں۔ ممکن ہے محلہ والوں کے سمجھانے کا اب بھی کچھ اثر ہو۔

موٹر پانڈے پور کی طرف چلا۔ سڑک خراب تھی۔ راجہ صاحب نے انجینیر کو تاکید کر دی تھی کہ سڑک کی مرمت کا بندوبست کر دیا جائے۔ مگر ابھی تک کہیں کنکر بھی نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا کہ جواب طلب کیا جائے۔ چنگی گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کا منشی آرام سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور سڑک پر کئی گاڑیاں ردّ نہ کے لیے کھڑی ہیں۔ منشی جی نے دل میں یہ تجویز کر لیا ہے کہ نئی گاڑی ایک روپیہ لیے بغیر ردّ نہ ہونے دوں گا۔ ورنہ انھیں رات بھر یہیں کھڑا رکھوں گا۔راجہ صاحب نے وہاں جاتے ہی گاڑی والوں کو ردّ نہ دلا دیا۔ اور منشی کے رجسٹر میں یہ بات نوٹ کر دی۔ پانڈے پور پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ موٹر رکا۔ دونوں صاحب اتر کر مندر میں گئے۔ نایک رام لنگی چڑھائے بھنگ گھوٹ رہے تھے دوڑے ہوئے آئے۔ بجرنگی ناند میں پانی بھر رہا تھا۔ آکر کھڑا ہو گیا۔ سلام بندگی کے بعد جان سیوک نے نایک رام سے کہا۔ "اندھا تو بہت بگڑا ہوا ہے۔"

نایک رام: سرکار۔ بگڑا تو اتنا ہے کہ جس دن سے ڈونڈی پٹی اس دن سے گھر نہیں آیا۔ سارا دن شہر میں گھومتا ہے۔ بھجن گاتا ہے اور دوہائی دیتا ہے۔

راجہ صاحب: تم لوگوں نے اسے کچھ سمجھا یا نہیں؟

نایک رام: گریب پرور۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ دوسرا آدمی ہو تو مار پیٹ کی دھکی سے سیدھا ہو جائے مگر اسے تو ڈر جیسے چھو ہی نہیں گیا۔ اسی دن سے گھر نہیں آیا۔

راجہ صاحب: تم لوگ اسے سمجھا بجھا کر یہاں لاؤ۔ ساری دنیا چھان ڈالی اور ایک جاہل کو قابو نہیں لا سکتے؟

نایک رام: سرکار سمجھانا بجھانا تو میں نہیں جانتا۔ حکم ہو تو ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھا دوں آپ ہی چپ ہو جائے گا۔

راجہ صاحب: چھی چھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں دیکھتا ہوں یہاں پانی کا نل نہیں

ہے۔ تم لوگوں کو تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔

مسٹر سیوک : آپ یہاں نل پہنچانے کا ٹھیکہ لے لیجیے۔

نایک رام : بڑی دیا ہے۔ گریب پرور۔ نل آجا ئے تو کیا کہنا ہے۔

راجہ صاحب : تم لوگوں نے کبھی اس کے لیے درخواست ہی نہیں دی۔

نایک رام : سرکار یہ بستی حد سے باہر ہے۔

راجہ صاحب : کوئی ہرج نہیں۔ نل لگا دیا جائے گا۔

اتنے میں ٹھاکر دین نے آکر کہا۔ ”سرکار میری بھی کچھ خاطری ہو جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے دونوں صاحبوں کی خدمت میں پیش کیے۔ مسٹر سیوک کو انگریزی وضع رکھنے پر بھی پان سے نفرت نہ تھی۔ شوق سے کھا لیا۔

راجہ صاحب منہ میں پان رکھتے ہوئے بولے۔ ”کیا یہاں لالٹین نہیں ہیں؟ اندھیرے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔“

ٹھاکر دین نے نایک رام کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا کہ میرے بیڑوں نے رنگ جما دیا بولا۔ سرکار۔ ہم لوگوں کی کون سنتا ہے؟ اب ہجور کی نگاہ ہو گئی ہے تو لگ ہی جائے گی۔ بس اور کہیں نہیں۔ اسی مندر پر ایک لالٹین لگا دی جائے۔سادھو مہاتما آتے ہیں تو اندھیرے میں انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ لالٹین سے مندر کی سوبھا بڑھ جائے گی۔ سب آپ کو آسیرواد دیں گے۔

دونوں آدمی موٹر پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ سبھاگی ایک سرخ ساڑی پہنے گھونگٹ نکالے آکر ذرا فاصلہ پر کھڑی ہو گئی گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟“

نایک رام : سرکار۔ ایک پاسن ہے۔ کیا ہے سبھاگی۔ کچھ کہنے آئی ہے؟

سبھاگی : (آہستہ سے) کوئی سنے گا؟

راجہ صاحب : ہاں ہاں کہہ کیا کہتی ہے۔

سبھاگی : کچھ نہیں مالک یہی کہنے آئی تھی کہ سورداس کے ساتھ بڑا انیائے (بے انصافی) ہوا ہے۔ اگر ان کی پھریاد (فریاد) نہ سنی گئی تو وہ مر جائیں گے۔

جان سیوک : اس کے مرجانے کے ڈر سے سرکار اپنا کام چھوڑ دے؟
سبھاگی : ہجور سرکار کا کام پرجا کا پالنا ہے کہ اجاڑنا؟ جب سے یہ دھرتی نکل گئی ہے۔ اسے نہ کھانے کی سدھ ہے نہ پینے کی۔ ہم گریب عورتوں کا تو وہی ایک سہارا ہے نہیں تو محلے کے مرد کبھی عورتوں کو جیتا نہ چھوڑتے۔ اور مردوں کی تو ملی بھگت ہے۔ مرد چاہتا ہے عورت کے انگ انگ۔ پور پور۔ کاٹ ڈالے۔ اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔ چور چور مو سیرے بھائی ہو جاتے ہیں۔ وہی ایک بے چارہ سورداس تھا جو ہم گریبوں کی پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

بھیرو بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بولا۔ ہجور سورداس نہ ہوتا تو یہ سرکار کے سامنے کھڑی نہ ہوتی۔ اسی نے جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔

راجہ صاحب : آدمی جیوٹ کا معلوم ہوتا ہے۔

نایک رام۔ جیوٹ کیا ہے سرکار۔ بس یہ سمجھیے کہ ہتیا کے بل جیتنا ہے۔

راجہ صاحب : بس یہ بات تم نے بہت ٹھیک کہی۔ ہتیا کے بل جیتنا ہے۔ چاہوں تو آج پکڑوا دوں مگر سوچتا ہوں۔ اندھا ہے ۔ اس پر کیا غصہ دکھاؤں۔ تم لوگ اسے سمجھاؤ۔ نایک رام! ہم تم سے تاکید کر کے کہے جاتے ہیں۔

ایک گھنٹہ رات جا چکی تھی۔ کہرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ دو کانوں کے چراغوں کے چاروں طرف کوئی موٹا کاغذ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں اصحاب رخصت ہوئے مگر دونوں ہی فکر میں محو تھے۔ راجہ صاحب سوچ رہے تھے کہ دیکھیں لالٹین اور نل کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ جان سیوک کو فکر تھی کہ کہیں مجھے جیتی ہوئی بازی نہ کھونی پڑے۔

(19)

صوفیہ اپنے تفکرات میں اس قدر محو تھی کہ سورداس کو بالکل بھول سی گئی تھی۔ اس کی فریاد سن کر اس کا دل کانپ اٹھا اس غریب آدمی پر اتنا زبردست ظلم۔ اس کا درد مند دل اسے برداشت نہ کر سکا۔ سو چنے لگی۔ سورداس کو اس مصیبت سے کیوں کر نجات دلاؤں! اگر پاپا سے کہوں تو ہرگز نہ سنیں گے۔ انھیں اپنے کارخانہ کی

ایسی دھن سوار ہے کہ وہ اس بارہ میں میری زبان سے ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کریں گے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ چل کر اندو سے عرض کروں اگر وہ راجہ صاحب سے زور دے کر کہے گی تو ممکن ہے کہ راجہ صاحب مان جائیں۔ باپ سے مخالفت کرتے اسے بہت افسوس ہوتا تھا لیکن اس کی مذہبی نگاہ میں رحم کی عظمت اس قدر مسلّمہ تھی جس کے مقابلہ میں باپ کے نفع یا نقصان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجہ صاحب غریب نواز ہیں اور انھوں نے اس زمین پر صرف مسٹر کلارک کی خاطر سے یہ ظلم کیا ہے۔ جب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں اس کام کے لیے ان کی ذرا بھی ممنون نہ ہوں گی تو شاید وہ اپنے فیصلہ کی نظر ثانی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہاں جوں ہی یہ بات کھلے گی۔ سارا گھر میرا دشمن ہو جائے گا۔ مگر اس کی کیا پروا؟ اس خیال سے میں اپنا فرض تو نہیں ترک کر سکتی۔

اس حیص بیص میں تین روز گزر گئے۔ چوتھے روز علی الصباح وہ اندو سے ملنے کو چلی۔ سواری کرایہ کی تھی۔ وہ سوچتی جاتی تھی کہ میں جوں ہی قدم اندر رکھوں گی اندو دوڑ کر گلے سے لپٹ جائے گی۔ اور شکایت کرے گی کہ اتنے دنوں بعد کیوں آئیں؟ ممکن ہے وہ آج مجھے آنے بھی نہ دے۔ وہ راجہ صاحب کو ضرور رضامند کر لے گی۔ نہ جانے پاپا نے راجہ صاحب کو کیوں کر چکمہ دیا۔

یہی سوچتے سوچتے وہ راجہ صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ اندو کو خبر دی۔ اس کو یقین تھا کہ اندو خود آکر اسے لے جائے گی۔ لیکن پندرہ منٹ تک انتظار کرنے پر ایک خادمہ آئی اور اسے اندر لے گئی۔

صوفیہ نے جاکر دیکھا کہ اندو اپنے نشستگاہ میں دو شالہ اوڑھے انگیٹھی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ صوفیہ نے اندر قدم رکھا تو بھی اندو کرسی سے نہ اٹھی۔ صوفیہ نے ہاتھ بڑھایا تو بھی بے رخی سے ہاتھ بڑھا دینے کے سوا اندو منہ سے کچھ نہ بولی۔ صوفیہ نے سمجھا اس کی طبیعت ناساز ہے۔ بولی۔ سر میں درد ہے کیا؟"

اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بیماری کے سوا اس بے اعتنائی کا اور بھی کوئی سبب ہو سکتا ہے۔

اندو نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”نہیں اچھی تو ہوں۔ اس ٹھنڈ میں تو تمھیں بڑی تکلیف ہوئی۔“

صوفیہ خوددار عورت تھی۔ اندو کی اس بے اعتنائی سے اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ الٹے قدم واپس جاؤں مگر یہ سوچ کر کہ ایسا کرنا بہت مضحکہ خیز ہوگا۔ اس نے ہمت کر کے ایک کرسی کھینچی اور اسی پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ: آپ سے ملے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔

اندو: ہاں مجھے آنے جانے کی فرصت کم رہتی ہے۔ منڈیا ہوں کی رانی صاحبہ ایک مہینہ میں تین مرتبہ آچکی ہیں پر میں ایک دفعہ بھی نہیں جا سکی۔

صوفیہ دل میں ہنستی ہوئی طنز سے بولی۔ ”جب رانیوں کو یہ بات نہیں حاصل ہوتی تو میں کس شمار میں ہوں؟ کیا کچھ ریاست کا کام بھی دیکھنا پڑتا ہے؟“

اندو: کچھ نہیں بلکہ سب کچھ۔ راجہ صاحب کو قومی کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تو گھر کا کام دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہیے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ جب انھیں کاموں کے بدولت ان کی وہ عزت ہے جو بڑے سے بڑے حکام کو بھی نہیں ملتی تو ان سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتی۔

صوفیہ ہنوز نہ سمجھ سکی کہ اندو کی ناراضگی کا سبب کیا ہے۔ بولی۔ ”آپ بڑی خوش نصیب ہیں کہ اس طرح ان کے نیک کاموں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ راجہ صاحب آج سارے ملک میں نیک نام ہو رہے ہیں۔ مگر برا نہ مانئے گا۔ کبھی کبھی وہ بھی منہ دیکھی کر جاتے ہیں اور بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا خیال نہیں کرتے۔“

اندو: غالباً یہ ان کی پہلی شکایت ہے جو میرے کان تک پہنچی ہے۔

صوفیہ: ہاں بدقسمتی سے یہ کام میرے ہی سر پڑا۔ سورداس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ راجہ صاحب نے اس کی زمین پاپا کو دے دی ہے۔ اندھا بیچارہ آج کل کوچہ کوچہ دوہائی دیتا پھرتا ہے۔ باپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا میرے لیے باعثِ شرم ہے۔ یہ میں خوب سمجھتی ہوں۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس موقع پر راجہ صاحب کو ایک بے کس شخص پر زیادہ رحم کرنا چاہیے تھا۔

اندو نے صوفیہ کی طرف مفسرانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”آج کل باپ سے

بھی ان بن ہے کیا؟"

صوفیہ نے غرور سے کہا۔ "انصاف اور فرض کے سامنے باپ لڑکا یا شوہر کی جانبداری نہ کی جائے تو کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"

اندو: تو تمھیں پہلے اپنے آپ ہی کو ٹھیک راستہ پر لانا چاہیے تھا۔ راجہ صاحب نے جو کچھ کیا تمھاری خاطر سے کیا اور تمھیں ان پر الزام رکھتی ہو۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ انھیں مسٹر سیوک۔ مسٹر کلارک یا دنیا کے کسی اور شخص سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے مگر اس وقت انھوں نے تمھارے پاپا کا خیال نہ کیا ہوتا تو شاید سب سے پہلے تمھیں ان پر احسان فراموشی کا الزام عاید کرتیں۔ سور داس پر یہ ستم اس لیے ڈھایا گیا کہ تم نے ایک نازک موقع پر ونے کی حفاظت کی ہے اور تم اپنے پاپا کی بیٹی ہو۔

صوفیہ یہ سخت الفاظ سن کر تلملا گئی۔ بولی۔ "اگر میں جانتی کہ میری ناچیز خدمت کا صلہ اس طرح دیا جائے گا تو شاید ونے سنگھ کے نزدیک نہ جاتی۔ معاف کیجیے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ تمھارے پاس یہ شکایت لے کر آئی۔ سنا کرتی تھی کہ امراء کے مزاج میں تلوّن ہوتا ہے۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔ لیجیے جاتی ہوں مگر اتنا کہے جاتی ہوں کہ خواہ پاپا میری صورت سے بھی بیزار ہو جائیں لیکن میں اس معاملہ میں ہرگز خاموش نہ بیٹھوں گی۔"

اندو کچھ نرم ہو کر بولی۔ "آخر تم راجہ صاحب سے کیا چاہتی ہو؟"

صوفیہ: کیا ثروت سے عقل بھی کم ہو جاتی ہے۔

اندو: میں پیادہ سے وزیر نہیں بنی ہوں۔

صوفیہ: افسوس کہ آپ نے اب تک میرا مطلب نہ سمجھا۔

اندو: افسوس کرنے سے تو مطلب میری سمجھ میں نہ آئے گا۔

صوفیہ: میں چاہتی ہوں کہ سورداس کی زمین اس کو لوٹا دی جائے۔

اندو: تم جانتی ہو۔ اس میں راجہ صاحب کی کتنی سبکی ہوگی۔

صوفیہ: سبکی بے انصافی سے بہتر ہے۔

اندو: یہ بھی جانتی ہو کہ جو کچھ ہوا وہ تمھارے ... مسٹر کلارک کی ترغیب سے

ہوا؟

صوفیہ : یہ تو نہیں جانتی کیوں کہ اس بارہ میں میری ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ لیکن جانتی بھی تو راجہ صاحب کی بدنامی کے خیال سے پہلے راجہ صاحب ہی سے منت سماجت کرنا ٹھیک سمجھتی۔ اپنی غلطی اپنے ہی ہاتھوں درست ہو جائے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی دوسرا اسے درست کرے۔

اندو کو چوٹ لگی۔ سمجھی کہ یہ مجھے دھمکی دے رہی ہے۔ مسٹر کلارک کے بل پر اتنا گھمنڈ! تن کر بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ کسی سرکاری افسر کو بورڈ کے فیصلہ میں بھی دخل دینے کا مجاز ہے اور چاہے ایک غریب اندھے پر ظلم کیوں نہ کرنا پڑے، راجہ صاحب اپنے فیصلہ کو بحال رکھنے کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ حقیر انصاف کے مقابلہ میں راجہ کی عزت کہیں زیادہ قیمت کی چیز ہے۔"

صوفیہ نے درد ناک لہجہ میں کہا۔ "اسی حقیر انصاف کے لیے صدق پسند لوگوں نے سر کٹا دیے ہیں۔"

اندو نے کرسی کے بازو پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "انصاف کا سوانگ بھرنے کا زمانہ اب نہیں رہا۔"

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمائیے گا۔"

اندو انگیٹھی کی آگ کو اکسانے لگی۔ اس نے صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھا۔

صوفیہ وہاں سے چلی تو اندو کی کج خلقی سے اس کا نازک دل زخمی ہو رہا تھا سوچتی جاتی تھی کہ وہ شگفتہ رو، خلیق اور خوش مزاج اندو کہاں ہے؟ کیا دولت و ثروت سے انسان کا مزاج بھی اتنا بگڑ جاتا ہے؟ میں نے تو آج تک اس کا دل دکھانے والی بات نہیں کہی۔ کیا میں ہی کچھ اور ہو گئی ہوں یا وہی کچھ اور ہو گئی ہے؟ اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ بات کرنا تو دور۔ اس نے اور صلواتیں سنائیں۔ میں اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ دیوی ہے۔ آج اس کی اصلی صورت نظر آئی۔ لیکن میں اس کی ثروت کے سامنے کیوں سر جھکاؤں؟ اس نے بلا سبب اور بلا

واسطہ میری تحقیر کی۔شاید رانی صاحبہ نے اس کے کان بھرے ہوں۔لیکن شرافت بھی تو کوئی چیز ہے۔

صوفیہ نے اسی وقت اس توہین کا پورا بلکہ پڑرے سے بھی زیادہ بدلہ لینے کا تہیہ کرلیا۔ اس نے یہ خیال نہ کیا کہ ممکن ہے اس وقت کسی سبب سے اس کا دل مغموم رہا ہو یا کسی حادثہ کے باعث اس کے سکون میں فرق آگیا ہو۔اس نے سوچا۔ ایسی ناشائستگی ایسی بدسلوکی کے لیے سخت سے سخت دماغی تکلیف بڑے سے بڑے مالی نقصان۔ شدید سے شدید جسمانی درد کا عذر بھی کافی نہیں۔ اسے اپنی امارت کا غرور ہے۔ میں دکھا دوں گی کہ یہ آفتاب کی ذاتی روشنی نہیں بلکہ ماہتاب کی عارضی ضیا ہے۔ اس کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ راجہ اور رئیس سب کے سب حکمران قوت کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں جنھیں وہ اپنی مرضی کے موافق بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے۔

دوسرے ہی روز صوفیہ نے اپنی چال چلنا شروع کر دیا۔ مسٹر کلارک سے اس کی محبت بڑھنے لگی۔ نفرت کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئی۔ اب ان کی محبت بھری باتوں کو سر جھکا کر سنتی۔ ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتی کہ تم نے یہ محبت کرنا کس سے سیکھا۔ دونوں اب ہمیشہ ساتھ نظر آتے۔ صوفیہ دفتر میں بھی صاحب بہادر کا گلا نہ چھوڑتی۔ بار بار خط بھیجتی۔ ”جلد آؤ۔ میں تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔“ اور سارا عشق و محبت کا کھیل صرف اس لیے تھا کہ اندو سے ہتک کا انتقام لیا جا سکے۔ انصاف کوشی کا اب اس کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ صرف اندو کا گھمنڈ توڑنا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ مسٹر کلارک کو پانڈے پور کی طرف سیر کرانے لے گئی جب موٹر گودام کے سامنے سے ہوکر گزرا تو اسے اینٹ اور کنکر کے ڈھیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”پاپا نہایت عجلت سے کام کر رہے ہیں۔“

کلارک : ہاں مستعد آدمی ہیں۔ مجھے تو ان کی محنت و جفاکش پر رشک ہوتا ہے۔

صوفی : پاپا نے دھرم ادھر کا خیال نہیں کیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گی کہ اندھے کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔

کلارک : ہاں بے انصافی تو ہوئی۔ میرا جی تو بالکل نہ چاہتا تھا۔

صوفی : تو آپ نے کیوں اپنی منظوری دے دی؟

کلارک : کیا کرتا۔

صوفی : نامنظور کر دیتے۔ صاف لکھ دینا چاہیے کہ اس کام کے لیے کسی کی زمین ضبط نہیں کی جا سکتی۔

کلارک : تم ناراض نہ ہو جاتیں؟

صوفی : ہرگز نہیں۔ آپ نے شاید مجھے اب تک نہیں پہچانا۔

کلارک : تمھارے پاپا تو ضرور ہی ناراض ہو جاتے۔

صوفی : میں اور پاپا ایک نہیں ہیں۔ میرے اور ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کلارک : اتنی عقل ہوتی تو اب تک تمھیں کب کا اپنا بنا لیا ہوتا۔ میں تمھارے مزاج یا اصولوں سے واقف نہ تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ منظوری میرے لیے نفع بخش ہو۔

کلارک : تو خلاصہ یہ کہ میں ہی اس نا انصافی کا سبب ہوں۔ راجہ صاحب نے مجھے خوش کرنے کے لیے بورڈ میں یہ تجویز پیش کی۔ آپ نے بھی مجھی کو خوش رکھنے کے لیے یہ منظوری دے دی۔ آپ صاحبوں نے میری مٹی ہی پلید کر دی۔

کلارک : تم میرے اصولوں سے واقف ہو۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کر کے یہ تجویز منظور کی ہے۔

صوفی : آپ نے اپنے اوپر جبر نہیں کیا ہے بلکہ میرے اوپر کیا ہے اور آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہو گا۔

کلارک : میں نہ جانتا تھا کہ تم اتنی انصاف پسند ہو۔

صوفی : میری تعریف کر دینے سے اس گناہ کا کفارہ نہ ہوگا۔

کلارک : میں اندھے کو کسی دوسرے گاؤں میں اتنی ہی زمین دلا دوں گا۔

صوفیہ : کیا اسی کی زمین اسی کو واپس نہیں دی جا سکتی؟

کلارک : مشکل ہے۔

صوفیہ : ناممکن تو نہیں ہے۔

کلارک : ناممکن سے کچھ ہی کم ہے۔

صوفی : تو سمجھ گئی۔ نا ممکن نہیں ہے۔ آپ کو یہ کفارہ کرنا ہی ہو گا۔ کل ہی اس تجویز کو منسوخ کر دیجیے۔

کلارک : پیاری تمھیں معلوم نہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔

صوفیہ : مجھے اس کی فکر نہیں۔ پاپا کو برا لگے گا۔ راجہ صاحب کی سبکی ہو گی۔ ہو۔ میں کسی کے نفع یا عزت کے خیال سے اپنے اوپر گناہ کا بوجھ کیوں لوں۔ کیوں خدائی سزا کی مستوجب بنوں آپ لوگوں نے میری مرضی کے خلاف میرے سر پر ایک گناہ عظیم کا بار رکھا دیا ہے۔ میں اسے بر داشت نہیں کر سکتی آپ کو اندھے کی زمین لو ٹا دینی ہو گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سید طاہر علی نے صوفیہ کو موٹر پر بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ فوراً آکر سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ صوفی سے موٹر روک کر پوچھا۔ ”کہئے منشی جی۔ عمارت بننے لگی؟“

طاہر علی : جی ہاں کل داغ بیل پڑے گی پر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔

صوفیہ : کیوں؟ کیا کوئی واردات ہو گئی؟

طاہر : حضور جب سے اس اندھے نے شہر میں آہ و فریاد شروع کی ہے اس وقت سے عجیب مصیبت کا سامنا ہو گیا۔ محلّہ والے تو اب نہیں بولتے مگر شہر کے شہدے لچے روزانہ آکر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ کوئی گھر میں آگ لگانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ کوئی لوٹ لینے کو دوڑتا ہے اور کوئی مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ آج صبح کئی سو آدمی لاٹھیاں لیے آ گئے اور گودام کو گھیر لیا۔ کچھ لوگ سمینٹ اور چونہ کے ڈھیروں کو بکھیرنے لگے اور کئی آدمی پتھر کی سلوں کو توڑنے لگے۔ میں تنہا کیا کر سکتا تھا؟ یہاں کے مزدور خوف کے مارے جان لے کر بھاگے۔ قیامت کا سامنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ اب آن کی آن میں محشر برپا ہو جائے گا۔ دروازہ بند کیے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ ہنگامہ فرو ہو۔ بارے دعا قبول ہوئی۔ عین اسی وقت وہ اندھا نہ جانے کدھر سے آ نکلا اور بجلی کی طرح کڑک کر بولا۔ ”بھائیو تم لوگ اودھم مچا کر مجھے کیوں کلنک لگا رہے ہو؟ آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی۔ لہو بہانے

سے میرا دل شانت نہ ہوگا آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہوگی۔ پر ماتما سے کہئے میرا دکھ مٹائیں۔ بھگوان سے بنتی کیجیے۔ میرا سنکٹ ہریں۔ جنھوں نے مجھ پر جلم (ظلم) کیا ہے ان لوگوں کے دل میں ؛یا دھرم جاگے۔ بس میں آپ لوگوں سے اور کچھ نہیں چاہتا۔ اتنا سنتے ہی کچھ لوگ تو ہٹ گئے مگر کتنے ہی لوگ بگڑ کر بولے۔ "تم دیوتا ہو تو بنے رہو۔ ہم دیوتا نہیں ہیں۔ ہم تو جیسے کے ساتھ تیسا کریں گے۔ انھیں بھی تو غریبوں پر ظلم کرنے کا مزہ مل جائے۔" یہ کہہ کر وہ لوگ پتھروں کو اٹھا اٹھا کر پٹکنے لگے۔ اس وقت اس اندھے نے وہ کام کیا جو اولیا ہی کر سکتے ہیں۔ حضور مجھے تو یہ یقین کامل ہو گیا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔ اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اس کی تصویر ابھی تک آنکھوں میں کھینچی ہوئی ہے۔ اس نے زمین سے ایک بڑا پتھر کا ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے اپنی پیشانی کے سامنے رکھ کر بولا۔ "اگر تم لوگ اب بھی میری بنتی نہ سنو گے تو اسی دم اس پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا۔ مجھے مر جانا منظور ہے پر یہ اندھیر نہیں دیکھ سکتا۔" اس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا جو جہاں تھا وہ وہیں بت بن گیا۔ ذرا دیر میں لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور کوئی نصف گھنٹہ میں سارا مجمع غائب ہو گیا۔ پھر سورداس اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر ہی چلا گیا۔ حضور مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ انسان نہیں۔ کوئی فرشتہ ہے۔

صوفیہ : اس کو کسی سے ان مفسدوں کی یورش کی خبر مل گئی ہو گی۔

طاہر : حضور۔ میرا تو قیاس ہے کہ اسے علم غیب ہے۔

صوفیہ : (مسکرا کر) آپ نے پاپا کو اس کی اطلاع نہیں دی؟

طاہر : حضور جب سے موقع ہی نہیں ملا۔ خود بال بچوں کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آدمی سب پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ اسی فکر میں کھڑا تھا کہ حضور کا موٹر نظر آیا۔

کلارک : یہ اندھا ضرور کوئی غیر معمولی انسان ہے۔

صوفیہ : تم اس سے دو چار باتیں کر کے دیکھو۔ اس کے روحانی اور فلسفیانہ خیالات معلوم کر کے دنگ رہ جاؤ گے۔ فقیر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ کاش ہم اس کے فلسفہ پر عمل کر سکتے تو یقیناً یہ زندگی آرام سے گزرتی۔ جاہل ہے۔ بالکل ان پڑھ۔ لیکن اس کا

ایک ایک فقرہ علماء کی بڑی بڑی کتب سے زیادہ وزن دار ہے۔

موٹر چلا تو صوفیہ بولی۔ "آپ لوگ ایسے سادھوؤں پر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے جو اپنے دشمنوں پر ایک کنکر بھی اٹھا کر نہیں پھینکتا۔ حضرت یسوع میں بھی تو یہی بہترین صفت تھی۔"

کلارک : پیاری۔ اب شرمندہ نہ کرو۔ اس کی تلافی ضرور ہو گی۔

صوفیہ : راجہ صاحب اس کی پر زور مخالفت کریں گے۔

کلارک : اوہ۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں۔ ہمارا رخ دیکھ کر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ ہاں ان میں یہ خاص صفت ہے کہ وہ ہماری تجاویز میں کچھ ترمیم کر کے اپنا کام بنا لیتے ہیں اور انھیں عوام کے سامنے ایسی ہوشیاری سے پیش کرتے ہیں کہ عوام کی نگاہوں میں ان کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی رئیسوں اور مدبروں میں اپنے پر بھروسہ رکھنے والی قوت کی بہت کمی ہے۔ وہ ہماری مدد سے وہ کر سکتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے مگر بلا ہماری مدد کے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

موٹر سگرا آ پہنچا۔ صوفیہ اتر پڑی۔ کلارک نے اسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

(20)

مسٹر کلارک نے موٹر سے اترتے ہی اردلی کو حکم دیا کہ ڈپٹی صاحب کو فوراً ہمارا سلام دو۔ ناظر۔ اہلمد اور دیگر اہلکاروں کو بھی طلب کیا گیا۔ سب کے سب گھبرا گئے۔ یہ آج خلاف معمول طلبی کیسی؟ کسی غلطی کی گرفت تو نہیں کی گئی؟ کسی نے رشوت کی شکایت تو نہیں کر دی؟" بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ڈپٹی صاحب برہم ہو کر بولے۔ "میں کوئی صاحب کا ذاتی ملازم نہیں ہوں کہ جب چاہا طلب کر لیا۔ کچہری کے وقت کے اندر جتنی بار چاہیں طلب کریں لیکن یہ کون سی بات ہے کہ جب جی میں آیا سلام بھیج دیا؟" ارادہ کیا کہ نہ جاؤں پر اتنی ہمت کہاں کہ صاف صاف انکار کر دیں۔ بیماری کا حیلہ کرنا چاہا مگر اردلی نے کہا۔ "حضور

اس وقت نہ چلیں گے تو صاحب سخت ناراض ہوں گے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے جبھی تو موٹر سے اترتے ہی آپ کو سلام دیا۔"

آخر ڈپٹی صاحب کو مجبوراً جانا پڑا۔ چھوٹے عملوں نے ذرا بھی چوں و چرا نہ کیا۔ اردلی کی صورت دیکھتے ہی حقہ چھوڑا۔ چپکے سے کپڑے پہنے۔ بچوں کو دلاسا دیا اور "حکم حاکم مرگ مفاجات" سمجھ کر رواں دواں بنگلہ پر جا پہنچے۔ صاحب کے سامنے جاتے ہی ڈپٹی صاحب کا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ اشاروں پر دوڑنے لگے۔ مسٹر کلارک نے سورداس کے زمین والے مقدمہ کی مسل منگوائی۔ اسے نہایت غور سے پڑھوا کر سنا۔ پھر ڈپٹی صاحب سے راجہ مہندر کمار کے نام ایک پروانہ لکھایا جس کا مطلب یہ تھا۔ "پانڈے پور میں سگریٹ کے کارخانہ کے لیے جو زمین لی گئی ہے وہ اس قانونی دفعہ کے منشاء کے خلاف ہے۔ اس لیے میں اپنے حکم کو منسوخ کرتا ہوں۔ مجھے اس معاملہ میں دھوکا دیا گیا ہے۔ اور ایک شخص کے ذاتی نفع کے لیے قانون کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے۔"

ڈپٹی صاحب نے دبی زبان سے اعتراض کیا۔ "حضور۔ اب آپ کو وہ حکم منسوخ کر دینے کا اختیار نہیں۔ کیوں کہ سرکار نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔"

مسٹر کلارک نے سخت لہجہ میں کہا۔ "ہمیں سرکار ہیں۔ ہم نے وہ قانون بنایا ہے۔ ہم کو سب اختیار ہے۔ آپ ابھی راجہ صاحب کو پروانہ لکھ دیں۔ کل لوکل گورنمنٹ کو اس کی نقل بھیج دیجیے گا۔ ضلع کے مالک ہم ہیں۔ صوبہ کی سرکار نہیں۔ یہاں بلوہ ہو جائے گا تو ہم کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ صوبہ کی سرکار یہاں دوڑی نہ آئے گی۔"

عمّال تھرا اٹھے۔ ڈپٹی صاحب کو دل میں کوسنے لگے۔ یہ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں۔ انگریز ہیں۔ کہیں غصہ میں آکر مار بیٹھے تو اس کا کیا ٹھکانہ۔ ضلع کا بادشاہ ہے جو چاہے کرے۔ ہم سے کیا واسطہ؟

ڈپٹی صاحب کا سینہ بھی دہل گیا۔ پھر زبان نہ کھلی۔ پروانہ تیار ہوگیا۔ صاحب نے اس پر دستخط کیے۔ اسی وقت ایک اردلی پروانہ لے کر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ ڈپٹی صاحب یہاں سے اٹھے تو مسٹر جان سیوک کو اس حکم سے مطلع کر دیا۔

جان سیوک کھانا کھا رہے تھے۔ یہ خبر سنی تو بھوک غائب ہوگئی بولے۔ ”یہ مسٹر کلارک کو کیا سوجھی؟“ مسٹر سیوک نے صوفیہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو نے انکار تو نہیں کر دیا؟ ضرور کچھ گول مال کیا ہے۔“

صوفیہ نے سر جھکا کر کہا۔ ”بس آپ کا غصہ مجھی پر رہتا ہے۔ جو کچھ کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں۔

ایشور سیوک : خداوند یسوع! مجھ گنہگار کو اپنے دامن میں چھپا! میں آخیر تک منع کرتا رہا کہ بڈھے کی زمین نہ لو مگر کون سنتا ہے؟ دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے مگر میں نے دنیا دیکھی ہے راجہ ڈر کر کلارک کے پاس گیا ہو گا۔

پربھوسیوک : میرا بھی یہی خیال ہے۔ راجہ صاحب نے خود مسٹر کلارک سے کہا ہوگا۔ آج کل ان کا شہر میں نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اندھے نے سارے شہر میں ہل چل مچا دی ہے۔

جان سیوک : میں سوچ رہا تھا کہ کل حفظ امن کے لیے پولیس کا دستہ مانگوں گا۔ ادھر یہ گل کھلا۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا بات ہو گئی۔

پربھوسیوک : میں تو سمجھتا ہوں۔ ہمارے لیے اس زمین کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔ آج سورداس نہ پہنچ جاتا تو گودام کی خیریت نہ تھی۔ ہزاروں روپے کا سامان خراب ہو جاتا یہ فساد رفع ہونے والا نہیں ہے۔

جان سیوک نے ان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بہت اچھی بات ہے۔ ہم سب مل کر اس اندھے کے پاس چلیں اور اس کے قدموں پر سر جھکائیں۔ آج اس کے خوف سے زمین چھوڑ دوں۔ کل چمڑے کی آڑھت چھوڑ دوں اور اس کے بعد منہ چھپا کر یہاں سے کہیں چلا جاؤں۔ کیوں۔ یہی صلاح ہے نہ؟ پھر امن ہی امن ہے۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ یہ صلاح تمھیں مبارک ہو۔ تمھیں مبارک ہو دنیا امن کی جگہ نہیں بلکہ کارزار کی جگہ ہے۔ یہاں دلیروں اور بہادروں کی فتح ہوتی ہے۔ کمزور اور بزدل مارے جاتے ہیں۔ مسٹر کلارک اور راجہ مہیندر کمار کی ہستی ہی کیا ہے۔ ساری دنیا بھی اب اس زمین کو میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتی۔ میں سارے شہر میں ہل چل مچادوں گا۔ اور ہندوستان بھر کو ہلا ڈالوں گا۔ حکام کی خود مختارانہ روش کی

یہ مثال ملک کے سبھی اخباروں میں شائع ہوگی۔ کونسلوں اور مجلسوں میں ایک نہیں ہزار ہزار آوازوں کے ذریعے مشتہر کی جائے گی۔ اور اس کی گونج انگریزی پارلیمنٹ تک پہنچے گی۔ یہ قومی حرفت اور تجارت کا سوال ہے۔ اس معاملہ میں کل ہندوستان کے کارخانہ دار کیا ہندوستانی اور کیا انگریز میرے معاون و مددگار ہوں گے اور سرکار ایسی نافہم نہیں ہے کہ وہ کارخانہ داروں کی مشترکہ آواز پر کان بند کر لے۔ یہ سرمایہ کی حکومت کا دور ہے۔ یوروپ میں بڑی بڑی سلطنتیں سرمایہ داروں کے اشاروں پر بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ کسی گورنمنٹ کی مجال نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف عمل کرے۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں وہ ملائم چارہ نہیں ہوں جسے کلارک اور مہندر چر جائیں گے۔"

پربھو سیوک تو ایسے سٹ پٹائے کہ پھر زبان نہ کھلی، چپکے سے اٹھ کر چلے گئے۔ صوفیہ بھی ایک لمحہ کے لیے سناٹے میں آ گئی۔ پھر سوچنے لگی۔ اگر پاپا نے اس معاملہ میں کچھ تحریک کی بھی تو اس کا نتیجہ کہیں برسوں میں ظاہر ہوگا۔ اور یہی کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ابھی سے اس کی کیوں فکر کروں۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر فاتحانہ غرور کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس وقت وہ اندو کے چہرہ کا اڑا ہوا رنگ دیکھنے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتی تھی۔ کاش میں وہاں موجود ہوتی دیکھتی کہ اندو کے چہرہ پر کیسی جھیپ ہے خواہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق ہوجاتا۔ مگر اتنا ضرور کہتی کہ دیکھا اپنے راجہ صاحب کا اقتدار و اختیار۔ بس اسی پر اتنا اتراتی تھیں؟ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ کلارک اتنی عجلت کریں گے؟"

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرہ میں گئی اور رانی اندو کی خفت کا خیال کر کے بے حد لطف اٹھانے لگی۔ راجہ صاحب بد حواس۔ چہرہ کا رنگ اڑا ہوا۔ آکر اندو کے پاس بیٹھ جائیں گے۔ اندو دیوی لفافہ دیکھیں گی۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوگا۔ پھر روشنی تیز کر کے دیکھیں گی۔ تب راجہ کے آنسو پوچھیں گی۔ "آپ ناحق اس قدر غمگین ہوتے ہیں آپ اپنی طرف سے شہر میں منادی کرا دیجیے کہ ہم نے سورداس کی زمین سرکار سے لڑ کر واپس دلا دی۔ سارے شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم مچ جائے گی لوگ سمجھیں گے آپ نے رائے عامہ کی قدر کی ہے۔" خوشامدی ٹٹو کہیں کا! چال

سے ولیم کو الو بنانا چاہتا تھا۔ ایسی منہ کی کھائی ہے کہ یاد ہی کرے گا۔ خیر آج نہ سہی۔ کل پرسوں اترسوں کبھی تو اندو سے ملاقات ہوگی ہی۔ کہاں تک منہ چھپائیں گی؟

یہ سوچتے سوچتے صوفیہ میز پر بیٹھ گئی اور اس واقعہ پر ایک ہنسی کا ڈراما لکھنے لگی۔ سمندر فکر کے لیے حسد تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ صوفیہ نے آج تک کبھی ایسا ڈرامہ نہ لکھا تھا مگر اس وقت حسد کے اثر سے اس نے ایک گھنٹہ کے اندر چار منظروں کا ایک مضحکہ انگیز ڈراما لکھ ڈالا۔ ایسی ایسی چوٹ کرنے والی اور دل میں چٹکیاں لینے والی پھبتیاں قلم سے نکلیں کہ اسے اپنے ذہن کی رسائی پر خود ہی متحیر ہونا پڑا۔ اسے ایک بار یہ خیال آیا کہ میں کیا حماقت کر رہی ہوں فتح پا کر ہارے ہوئے دشمن کا منہ چڑانا پرلے سرے کا کمینہ پن ہے لیکن حسد نے اس کو مطمئن کر دینے کے لیے یہ دلیل ڈھونڈ نکالی۔ ایسے فریبی، دغاباز، عزت کے بھوکے رعایا کے دوست بن کر اس کے حلق پر چھری پھیرنے والے خوشامدی رئیسوں کی یہی سزا ہے۔ یہی ان کا واحد مصلح ہے۔ عوام الناس کی نگاہوں میں ذلیل ہوجانے کا خوف ہی انھیں راہ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔ رسوائی کا خوف نہ ہو تو وہ شیر ہوجائیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھیں۔

پربھوسیوک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ یکایک صوفیہ نے آکر جگایا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید اس کے کمرہ میں چور گھس آئے ہیں۔ دروازہ کی طرف دوڑے۔ گودام کا واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”کہاں بھاگے جاتے ہو؟“

پربھوسیوک : کیا چور ہیں؟ لالٹین جلا لوں۔

صوفیہ : چور نہیں ہیں۔ ذرا میرے کمرہ میں چلو۔ تمھیں ایک چیز سناؤں۔ ابھی لکھی ہے۔

پربھوسیوک : واہ۔ اتنی سی بات کے لیے نیند خراب کر دی۔ کیا پھر سویرا نہ ہوتا؟ کیا لکھا ہے؟

صوفیہ : ایک مضحکہ خیز ڈراما ہے۔

پربھوسیوک : مضحکہ خیز ڈراما؟ تم نے ایسا ڈراما لکھنے کی کب سے مشق کی؟

صوفیہ : آج ہی۔ بہت ضبط کیا کہ صبح سناؤں گی پر نہ رہا گیا۔

پربھوسیوک صوفیہ کے کمرہ میں گئے اور ایک ہی لمحہ میں دونوں نے قہقہے لگانے شروع کیے لکھتے وقت صوفیہ کو جن فقرات پر ذرا بھی ہنسی نہ آئی تھی انھیں کو پڑھتے وقت اس کی ہنسی رو کے نہ رکتی تھی۔ جب کوئی ہنسانے والی بات آجاتی تو صوفی پہلے ہی ہنس پڑتی۔ پربھوسیوک منہ کھولے ہوئے اس کی طرف تاکتا۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی مگر اس کی ہنسی پر وہ بھی ہنستا اور جوں ہی بات سمجھ آجاتی تو یہی ہنسی قہقہہ کی شکل اختیار کرلیتی۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ یہاں تک کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ ڈراما کے ختم ہوتے ہوتے قہقہہ کی جگہ کھانسی نے لے لی۔ خیریت تھی کہ دروازے دونوں طرف سے بند تھے ورنہ رات کے سناٹے میں سارا بنگلہ ہل جاتا۔

پربھوسیوک : نام بھی خوب رکھا۔ راجہ مچھندر سنگھ۔ مہیندر اور مچھندر کی تک ملتی ہے۔ پلپلی صاحب کے ہنٹر کھاکر مچھندر سنگھ کا جھک جھک کر سلام کرنا خوب رہا۔ کہیں راجہ صاحب زہر نہ کھالیں۔

صوفیہ : ایسا حیادار نہیں ہے۔

پربھوسیوک : تم ہنسی کے ناٹک لکھنے میں مشاق ہو۔

ذرا دیر بعد دونوں اپنے اپنے کمر میں سوئے۔ صوفیہ علی الصباح اٹھی اور مسٹر کلارک کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان کو ساری باتیں بالتفصیل معلوم ہوں گی۔ ابھی تو محض افواہ سنی ہے ممکن ہے راجہ صاحب گھبرائے ہوئے ان کے پاس اپنا دکھڑا رونے کے لیے گئے ہوں۔ لیکن آٹھ بج گئے اور کلارک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ بھی تڑکے ہی آنے کو تیار تھے پر آتے ہوئے شرماتے تھے کہ کہیں صوفیہ یہ نہ سمجھے کہ مجھ پر احسان جتانے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ اس بات کا خوف تھا کہ وہاں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یا تو مجھے دیکھ کر لوگ دل ہی دل میں جلیں گے یا کھلے الفاظ میں مجھے متہم کریں گے۔ سب سے زیادہ خوف ایشور سیوک کا تھا کہ کہیں کافر ملعون یا شقی نہ کہہ بیٹھیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کی باتوں کا جواب ہی کیا؟ انھیں وجوہات سے وہ آتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور دل میں دعا کر رہے تھے کہ صوفیہ ہی ادھر آ نکلے۔

نو بجے تک کلارک کا انتظار کرنے کے بعد صوفیہ بیتاب ہوگئی۔ ارادہ کیا کہ میں ہی چلوں۔ اسی وقت یکا یک مسٹر جان سیوک آ کر بیٹھ گئے اور صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ”صوفی! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے۔“

صوفیہ : میں نے! میں نے کیا کیا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

جان سیوک : میرا مطلب یہ ہے کہ تمھاری ہی ترغیب سے مسٹر کلارک نے اپنا حکم منسوخ کر دیا ہے۔

صوفیہ : آپ کو وہم ہے۔

جان سیوک : میں نے بلا ثبوت کے آج تک کسی پر الزام نہیں لگایا۔ میں ابھی اندو دیوی سے مل کر آرہا ہوں۔ انھوں نے اس کا ثبوت دیا کہ یہ تمھاری ہی کرتوت ہے۔

صوفیہ : آپ کو یقین ہے کہ اندو نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے؟
جان سیوک : اسے غلط سمجھنے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔
صوفیہ : اسے صحیح سمجھنے کے لیے اگر اندو کا کہنا کافی ہے تو اسے غلط سمجھنے کے لیے میرا کہنا کیوں کافی نہیں ہے؟
جان سیوک : سچ بات یقین کو پیدا کرتی ہے۔
صوفیہ : یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنی باتوں میں وہ نمک مرچ نہیں لگا سکتی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اندو نے ہمارے اور ولیم کے درمیان میں مغائرت پیدا کرنے کے لیے یہ سوانگ رچا ہے۔

جان سیوک نے شبہ میں پڑ کر کہا۔ ''صوفی! میری طرف دیکھ! کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔''

صوفیہ نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے والد کی طرف بے خوف آنکھوں سے دیکھے لیکن اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ باطنی احساس زبان کو بگاڑ سکتا ہے مگر اعضا پر اس کا زور نہیں چلتا۔ زبان چاہے خاموش ہو جائے مگر آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ مسٹر جان سیوک نے اس کی پر ندامت آنکھیں دیکھیں اور کبیدہ خاطر ہو کر بولے۔ ''آخر تم نے کیا سمجھ کر یہ کانٹے بوئے؟''
صوفیہ : آپ میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہیں۔ آپ کو ولیم ہی سے یہ بات صاف کر لینی چاہیے۔ہاں میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تمام شہر میں بدنام ہونے کی بہ نسبت میں اس زمین کا آپ کے قبضہ سے نکل جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں۔
جان سیوک : اچھا تو تم نے میری نیک نامی کے لیے یہ چال چلی ہے؟ میں تمھارا بہت ممنون ہوں۔ لیکن یہ خیال تمھیں بہت دیر بعد سوجھا۔ عیسائی قوم یہاں صرف اپنے مذہب کے سبب اتنی بدنام ہے کہ اس سے زیادہ بدنام ہونا غیر ممکن ہے۔ عوام کا بس چلے تو آج ہمارے سارے گرجے مٹی کے ڈھیر بن جائیں۔ انگریزوں سے لوگوں کو اتنی چڑ نہیں ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کا طرز معاشرت ان کے خیالات و اطوار سب ان کی ذاتی چیزیں ہیں۔ یعنی ان کے ملک و قوم کی ہیں۔ لیکن جب کوئی ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو انگریزی وضع اختیار کرتا ہے۔ تو لوگ اس کو بالکل

گیا گزرا سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نیکی و بدی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس سے کسی کو بھلے کاموں کی امید نہیں ہوتی اور نہ اس کے برے کاموں پر کسی کو تعجب ہوتا ہے۔ میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ تم نے میری آبرو قائم رکھنے کے لیے یہ کوشش کی ہے۔ تمھارا مقصد صرف میرے تجارتی منصوبوں کو برباد کرنا ہے۔ مذہبی تحقیقات نے تمھاری عملی فراست کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔ تمھیں اتنی سمجھ بھی نہیں ہے نفس کشی اور فیض رسانی محض ایک معیار ہے شعرا کے لیے معتقدین کے دل بہلاؤ کے لیے اور ناصحوں کی تصاویر کو مزین کرنے کے لیے مسیح بدھ اور موسیٰ کے پیدا ہونے کا وقت اب نہیں رہا۔ دولت یا ثروت مطعون ہونے پر بھی انسانی خواہشات کی معراج ہے اور رہے گی۔ خدا کے لیے تم مجھ پر اپنے مذہبی اصولوں کو نہ آزماؤ۔ میں تم سے اخلاق اور مذہب کا سبق نہیں پڑھنا چاہتا۔ تم سمجھتی ہو کہ خدا نے عدل و راستی و رحم کا تمھیں کو اجارہ دار بنا دیا ہے اور دنیا میں جتنے اہل دولت و ثروت ہیں وہ سب کے سب بے انصاف خودسر اور بے رحم ہیں۔ لیکن مشیت ایزدی کی قائل ہو کر بھی تمھارا خیال ہے کہ دنیا میں نابرابری اور تفریق کا سبب صرف انسان کی خود غرضی ہے تو مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ تم نے مذہبی کتب کا مطالعہ آنکھیں بند کرکے کیا ہے۔ ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ تمھاری اس بدسلوکی سے مجھے جتنا رنج ہو رہا ہے اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور گو میں ولی یا درویش نہیں ہوں لیکن یاد رکھنا کہ کبھی نہ کبھی تم کو اپنے والد سے دشمنی کرنے کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔

بد دعا غصہ کی انتہائی حد ہے۔ ''اس کا پھل تم ایشور سے پاؤ گے۔'' یہ جملہ تیغ و سناں سے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے جب ہم سمجھتے ہیں کسی برے کام کی سزا دینے کے لیے دنیاوی طاقت کافی نہیں ہے اس وقت ہم خدائی طاقت کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے کمتر کوئی سزا بھی ہمیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

مسٹر جان سیوک اس طرح کوس کر اٹھ گئے لیکن صوفیہ کو اس سخت کلامی سے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ اس نے اس قرض کو بھی اندو کے کھاتہ میں درج کر دیا اور اس کے جذبۂ انتقام نے زیادہ خوفناک صورت حال اختیار کرلی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس پر مذاق ڈراما کو آج ہی شائع کروں گی۔ اگر اڈیٹر نے نہ چھاپا تو میں خود ہی کتابی

صورت میں چھپواؤں گی اور عوام میں مفت تقسیم کروں گی۔ ایسی کالک لگ جائے کہ پھر کسی کو منہ نہ دکھا سکے۔

ایشور سیوک نے جان سیوک کی نالائم باتیں سنیں تو بہت ناراض ہوئے۔ مسز سیوک کو بھی یہ برتاؤ برا معلوم ہوا۔ ایشور سیوک نے کہا۔ ”نہ جانے تمھیں اپنے نفع نقصان کی تمیز کب ہوگی۔ بنی ہوئی بات کو نباہنا مشکل نہیں ہے۔ بگڑی ہوئی بات کو بنانا مشکل ہے۔ تمھیں اس موقع پر اس قدر صبر و سنجیدگی سے کام لینا تھا کہ جتنا نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ گھر کا ایک گوشہ گر پڑے تو سارا گھر گرا دینا عقل مندی نہیں ہے۔ زمین گئی تو کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ اس پر پھر تمھارا قبضہ ہو۔ یہ نہیں کہ زمین کے ساتھ اپنی عزت و آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ جاکر راجہ صاحب کو مسٹر کلارک کے فیصلہ کی اپیل کرنے پر آمادہ کرو۔ اور مسٹر کلارک سے اپنا میل جول بدستور قائم رکھو۔ یہ سمجھ لو کہ ان سے تمھیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ صوفیہ کو برہم کرکے تم مسٹر کلارک کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ حکام تک رسائی رہے گی تو ایسی کتنی زمینیں ملیں گی۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا اور مشکل کو آسان کر۔“

مسز سیوک: میں تو اتنی منتوں سے اسے یہاں لائی اور تم سارے کیے دھرے پر پانی پھیرے دیتے ہو۔

ایشور سیوک: خداوند۔ مجھے آسمان کی بادشاہت دے۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ صوفی کے ایماء سے یہ بات ہوئی تو بھی ہمیں اس سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے بلکہ میرے دل میں تو اس کی عزت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسے خدا نے سچی روشنی عطا کی ہے۔ اس میں ایمان اور اعتقاد کی برکت ہے اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی تعریف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ خداوند یسوع نے اپنے کو غریبوں اور بے کسوں پر نثار کر دیا تھا۔ بد قسمتی سے ہم لوگوں میں اتنا اعتقاد نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خود غرضی پر نادم ہونا چاہیے۔ صوفیہ کے نیک ارادوں کی تحقیر کرنا باعث مناسب نہیں ہے۔ گنہگار کسی فقیر کو دیکھ کر دل میں نادم ہوتا ہے۔ اس سے دشمنی نہیں کرتا۔

جان سیوک: یہ نہ اعتقاد ہے اور نہ ایمان بلکہ محض ضد اور نخوت ہے۔

ایشور سیوک نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اپنی لکڑی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ میں آئے اور بولے۔ ''بیٹی! میرے آنے سے تمھارا کوئی ہرج تو نہیں ہوا؟''

صوفیہ : نہیں نہیں آیئے بیٹھیے۔

ایشور سیوک : یسوع! اس گنہگار کو ایمان کی روشنی عطا کر۔ ابھی جان سیوک نے تمھیں بہت کچھ برا بھلا کہا ہے۔ انھیں معاف کرو۔ بیٹی دنیا میں خدا کی جگہ اپنا باپ ہی ہوتا ہے۔ اس کی باتوں کا برا نہ ماننا چاہیے۔ تمھارے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔ خدا کی برکت ہے۔ تمھارے والد کی ساری عمر خود پروری میں گزری ہے۔ اور وہ ابھی تک اسی طرح گزر رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ اس کے دل کی تاریکی ایمان کی تجلی سے دور کرے۔ جن لوگوں نے ہمارے خداوند یسوع کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں ان کے لیے خداوند نے کہا تھا کہ اے خدا انھیں معاف کر۔ کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

صوفیہ : میں آپ سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے پاپا کی باتوں کا ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ لیکن وہ مجھ پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ اندو کی باتوں کے سامنے میری باتوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

ایشورسیوک : بیٹی یہ ان کی غلطی ہے مگر تم اپنے دل سے انھیں معاف کر دو۔ دنیاداروں کو اس قدر مطعون کیا گیا ہے مگر انصاف کی نظر سے دیکھو تو وہ کتنے قابل رحم ہیں۔ آخر آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے بال بچوں ہی کے لیے تو کرتا ہے۔ انھیں کے آرام و اطمینان کے لیے انھیں کو دنیا کی بدنظری سے بچانے کے لیے وہ تمام بدنامیوں اور رسوائیوں کو بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بھی ان پر قربان کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب وہ دیکھتا ہے کہ میں جن لوگوں کے فائدہ کے لیے اپنا خون اور پسینہ ایک کررہا ہوں وہی مجھ سے مخالفت کر رہے ہیں تو وہ فطرتاً جھنجھلا اٹھتا ہے۔ اس وقت اسے حق و ناحق کی تمیز نہیں رہتی۔ دیکھو کلارک سے بھول کر بھی ان باتوں کا ذکر نہ کرنا ورنہ خواہ مخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے گی۔ بولو وعدہ کرتی ہو؟

ایشور سیوک جب اٹھ کر چلے گئے تو پربھوسیوک نے آکر پوچھا۔ ''وہ ڈراما کہاں

بھیجا؟"

صوفیہ : ابھی تو کہیں نہیں بھیجا۔ کیا بھیج ہی دوں؟

پربھو سیوک : ضرور ضرور مزہ آ جائے گا۔ تمام شہر میں دھوم مچ جائے گی۔

صوفیہ : ذرا دو ایک روز اور دیکھ لوں۔

پربھوسیوک : نیک کام کرنے میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ آج ہی بھیجو۔ میں نے بھی آج اپنی نظم ختم کر دی سناؤں۔

صوفیہ : ہاں ہاں پڑھو۔

پربھوسیوک نے اپنی نظم سنانی شروع کی۔ ساری نظم رحم اور عفو کے جذبات سے لبریز تھی۔ مضمون اس قدر پر درد تھا کہ صوفیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پربھو سیوک بھی رو رہے تھے۔ عفو و محبت کے جذبات ہر لفظ سے اسی طرح ٹپک رہے تھے جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں۔ نظم ختم ہو گئی تو صوفیہ نے کہا۔ مجھے کبھی خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ تم اس رنگ میں ایسا کمال دکھا سکتے ہو۔ جی چاہتا ہے۔ تمھارا قلم چوم لوں۔ اف کتنا روحانی عفو ہے۔ برا نہ ماننا۔ تمھاری تصنیف تم سے بدرجہا بلندتر ہے ایسے پاکیزہ ملائم اور پر جوش الفاظ تمھارے قلم سے کس طرح نکل آتے ہیں؟"

پربھو سیوک : اسی طرح جیسے اتنے مضحکہ خیز اور نخوت شکن جذبات کا اظہار تمھارے قلم سے ہوا۔ تمھاری تصنیف تم سے کہیں زیادہ پست ہے۔

صوفیہ : میں کیا اور میری تصنیف کیا۔ تمھارا ایک ایک شعر اس قابل ہے کہ اس پر دل نثار ہو جائیں۔ بیشک عفو انسانی جذبات میں رفیع ترین جذبہ ہے۔ رحم کا درجہ اتنا بلند نہیں۔ رحم وہ دانہ ہے جو پولی زمین پر اگتا ہے۔ اس کے خلاف عفو وہ دانہ ہے جو خار زاروں میں اگتا ہے۔ رحم وہ چشمہ ہے جو ہموار زمین پر بہتا ہے۔ اس کے برعکس عفو کا چشمہ سنگریزوں اور چٹانوں پر بہتا ہے۔ رحم کا راستہ سیدھا اور آسان ہے اور عفو کا ٹیڑھا اور مشکل۔ تمھارا ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ تم میں خود عفو کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

پربھو : صوفی! جذبات کے مقابلہ میں افعال کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ شاعر کا عملی

میدان محدود ہوتا ہے۔ مگر جذباتی میدان وسیع اور لامحدود۔ اس آدمی کو حقیر نہ سمجھو جو ترک اور استغناء کا راگ الاپتا ہے مگر خود کوڑیوں پر جان دیتا ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے الفاظ کسی بڑے گنہگار کے دل کو متاثر کر دیں۔

صوفیہ : جس کے قول و فعل میں اتنا فرق ہو اسے کسی اور ہی نام سے پکارنا چاہیے۔

پربھو سیوک : نہیں صوفی۔ یہ بات نہیں ہے۔ شاعر کے جذبات بتلاتے ہیں کہ اگر اسے موقع ملتا تو وہ کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کی بلندی تک نہ پہنچ سکا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ گرد و پیش کے حالات اس کے موافق نہ تھے۔

کھانے کا وقت آ گیا۔ اس کے بعد صوفیہ نے ایشور سیوک کو بائبل سنانا شروع کیا۔ آج کی سی عجز و رضا جوئی اس نے کبھی نہ ظاہر کی تھی۔ ایشور سیوک کی مذہبی محویت نے ان کے ہوش و حواس کو مغلوب کر دیا تھا۔ خواب کی حالت میں ہو جانا ہی ان کی اندرونی بیداری تھی۔ کرسی پر لیٹے ہوئے وہ خراٹے لے لے کر خدائی کتاب کو سن رہے تھے۔ لیکن تعجب یہ تھا کہ پڑھنے والا انھیں سوتا ہوا سمجھ کر جوں ہی خاموش ہو جاتا تو وہ فوراً ہی بول اٹھتے۔ "ہاں ہاں پڑھو۔ چپ کیوں ہو؟ میں سن تو رہا ہوں۔"

صوفیہ کو بائبل پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی تو اس کا گلا چھوٹا۔ ایشور سیوک باغ میں ٹہلنے چلے گئے اور پربھوسیوک کو صوفی سے گپ شپ کرنے کا موقع ملا۔

صوفیہ : بڑے پاپا ایک بار پکڑ پاتے ہیں تو پھر گلا نہیں چھوڑتے۔

پربھو سیوک : مجھ سے کبھی بائبل پڑھنے کو نہیں کہتے۔ مجھ سے تو ایک لمحہ بھی وہاں نہ بیٹھا جائے۔ تم نہ جانے کیسے بیٹھی پڑھتی رہتی ہو؟

صوفیہ : کیا کروں۔ ان پر رحم آتا ہے۔

پربھوسیوک : بنا ہوا ہے۔ مطلب کی بات پر کبھی نہیں چوکتا۔ یہ ساری عقیدت صرف دکھاوا ہے۔

صوفیہ : یہ تمھاری بے انصافی ہے۔ ان میں اور چاہے کوئی وصف نہ ہو لیکن یسوع پر ان کا زبردست اعتقاد ہے۔ چلو کہیں گھومنے چلتے ہو؟

پربھوسیوک : کہاں چلو گی؟ چلو یہیں حوض کے کنارے بیٹھ کر کچھ شعر و شاعری کا

چرچا کریں۔ مجھے تو اس سے زیادہ لطف اور کسی بات میں نہیں آتا۔
صوفیہ : چلو۔ پانڈے پور کی طرف چلیں۔ کہیں سورداس مل گیا تو اسے یہ خبر سنائیں گے۔
پربھوسیوک : پھولا نہ سمائے گا۔ اچھل پڑے گا۔
صوفیہ : ذرا شہ پا جائے تو راجہ کو شہر سے بھگا کر ہی چھوڑے۔

دونوں نے سڑک پر جاکر ایک تانگہ کرایہ پر کیا۔ اور پانڈے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ آفتاب غروب ہوگیا تھا۔ کچہری کے عملے بغل میں بستہ دبائے مردہ دل اور خود غرضی کا مجسمہ بنے ہوئے چلے آرہے تھے۔ بنگلوں میں ٹینس ہو رہا تھا۔ شہر کے شہدے دین و دنیا سے بے خبر۔ تمبولیوں کی دوکانوں پر جمع تھے۔ بنیوں کی دوکانوں پر مزدوروں کی عورتیں کھانے کا سامان خرید رہی تھیں۔ ٹانگہ برنانڈی کے پل پر پہنچا کہ یکایک آدمیوں کا ایک ہجوم نظر آیا سورداس کھنجڑی بجا کر گا رہا تھا۔صوفیہ نے تانگہ روک دیا اور تانگہ والے سے کہا کہ جاکر اس اندھے کو بلا لا۔

ایک لمحہ میں سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ : مجھے پہچانتے ہو سورداس۔
سورداس : ہاں۔ بھلا ہجور ہی کو نہ پہچانوں گا۔
صوفیہ : تم نے ہم لوگوں کو سارے شہر میں خوب بدنام کیا۔
سورداس : پھریاد کرنے کے سوا میرے پاس اور کون بل تھا؟
صوفیہ : فریاد کا کیا نتیجہ نکلا؟
سورداس : میری منشا پوری ہوگئی۔ حاکموں نے میری دھرتی مجھے دے دی۔ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی کام تن من سے کیا جائے۔ اور اس کا کوئی پھل نہ ہو۔ تپسیا سے تو بھگوان مل جاتے ہیں۔ بڑے صاحب کے اردلی نے کل رات ہی کو مجھے یہ حال سنایا۔ آج پانچ براہمنوں کو بھوجن کرا یا ہے۔ کل گھر چلا جاؤں گا۔
پربھوسیوک : مس صاحب ہی نے بڑے صاحب سے کہہ سن کر تمھاری زمین دلوائی ہے۔ ان کے والداور راجہ صاحب دونوں ہی ان سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ان کی تمھارے اوپر بڑی مہربانی ہے۔

صوفیہ: پربھو! تم پیٹ کے بڑے ہلکے ہو۔ یہ کہنے سے کیا فائدہ۔ کہ مس صاحب ہی نے زمین دلوائی ہے۔ یہ تو کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے۔

سورداس: صاحب یہ تو میں اسی دن جان گیا تھا۔ جب مس صاحب سے پہلے پہل باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے چت میں دیا اور دھرم ہے اس کا پھل بھگوان ان کو دیں گے۔

صوفیہ: سورداس یہ میری سفارش کا پھل نہیں۔ تمھارے تپیا کا پھل ہے۔ راجہ صاحب کو تم نے خوب چھکایا۔ اب تھوڑی سی کسر اور ہے۔ ایسا بدنام کر دو کہ شہر میں منہ دکھانے لایق نہ رہیں۔ استعفےٰ دے کر اپنے علاقہ کی راہ لیں۔

سورداس: نہیں۔ مس صاحب! یہ کھلاڑیوں کی نیت نہیں ہے کھلاڑی جیت کر ہارنے والے کھلاڑی کی ہنسی نہیں اڑاتا اس سے ملتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ بھیا اگر ہم نے کھیل میں تم سے کوئی انوچت (نا مناسب) بات کہی ہو یا کوئی ایسا برتاؤ کیا ہو تو ہمیں ماپھ (معاف) کرنا اس طرح دونوں کھلاڑی ہنس کر الگ ہوتے ہیں۔ کھیل سماپت (ختم) ہوتے ہی دونوں متر (دوست) بن جاتے ہیں۔ ان میں کوئی کپٹ نہیں رہتا۔ میں آج راجہ صاحب کے پاس گیا تھا اور ان سے ہاتھ جوڑ آیا۔ انھوں نے مجھے بھوجن کرایا۔ جب چلنے لگا تو بولے کہ میرا دل تمھاری طرف سے صاف ہے کوئی سنکا (اندیشہ) نہ کرنا۔

صوفیہ: ایسے صاف دل تو نہیں ہیں۔ موقع پاکر ضرور دغا کریں گے۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں۔

سورداس: نہیں مس صاحب۔ ایسا مت کہیے۔ کسی پر سنکا کرنے سے اپنا چت (دل) ملین (مکدر) ہوتا ہے۔ وہ بدوان (عالم) ہیں۔ دھر ماتما ہیں۔ کبھی دغا نہیں کر سکتے۔ اور جو کریں گے تو انھیں کا دھرم جائے گا۔ مجھے کیا۔ میں پھر اسی طرح فریاد کرتا پھروں گا۔ جس بھگوان نے اب کی سنی ہے وہی بھگوان پھر سنیں گے۔

پربھوسیوک: اور جو کوئی معاملہ کھڑا کر کے قید کرا دیا تو؟

سورداس: (ہنس کر) اس کا پھل انھیں بھگوان سے ملے گا۔ میرا دھرم تو یہی ہے کہ جب کوئی میری چیز پر ہاتھ بڑھائے تو اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ وہ لڑے تو لڑوں اور اس

چیز کے لیے جان تک دے دوں۔ چیز میرے ہاتھ آئے گی۔ اس سے مجھے مطلب نہیں۔ میرا کام تو لڑنا ہے اور وہ بھی دھرم کی لڑائی لڑنا۔ اگر راجہ صاحب دگا (دغا) بھی کریں گے تو میں ان سے دگا نہ کروں گا۔

صوفیہ : لیکن میں تو راجہ صاحب کو اتنے سستے نہ چھوڑوں گی۔

سورداس : مس صاحب۔ آپ ودوان ہوکر ایسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے اچرج (تعجب) ہوتا ہے آپ کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ نہیں آپ ہنسی کر رہی ہیں۔ آپ سے کبھی ایسا کام نہیں ہو سکتا۔

اتنے میں کسی نے پکارا۔ ''سورداس چلو! براہمن آگئے ہیں۔''

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا گھاٹ کی طرف چلا۔ تانگہ بھی چلا۔ پربھو سیوک نے کہا۔ ''چلو گی مسٹر کلارک کی طرف؟''

صوفیہ : نہیں گھر چلو۔

راستہ میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ صوفیہ کسی خیال میں محو تھی۔ دونوں سگرا پہنچے تو چراغ جل چکے تھے۔ صوفیہ سیدھی اپنی کمرہ میں گئی۔ میز کی دراز کھولی۔ فارس (ظرافت آمیز ڈراما) کا مسودہ نکالا اور اسے پرزہ پرزہ کرکے زمین پر پھینک دیا۔

(21)

سورداس کی آہ و فریاد نے راجہ مہیندر کمار کی ناموری اور عزت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ آسمان سے باتیں کرنے والا شہرت کا محل آن کی آن میں مسمار ہو گیا۔ اہل شہر ان کی خدمات کو بھول سے گئے۔ ان کی مساعی سے شہر کو کتنا نفع پہنچا تھا۔ اس کی یاد کسی کو نہ رہی۔ شہر کی نالیاں اور سڑکیں۔ باغیچے اور گلی کوچے ان کی مسلسل کوششوں کے کتنے رہین منت تھے۔ شہر کی صحت اور تعلیم کو انھوں نے کس گری ہوئی حالت سے اٹھا کر شاہراہِ ترقی پر پہنچایا تھا۔ اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک انقلابِ عظیم برپا ہوگیا۔ لوگ ان پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب راجے رئیسوں کے نام عزت کے ساتھ لیے جاتے تھے۔ عوام کو خود ہی ان سے عقیدت ہوتی تھی۔ وہ دن رخصت ہو گئے۔ ثروت پرستی زمانہ

قدیم کی شاہ پرستی ہی کا ایک جزو تھی۔ رعایا اپنے راجہ جاگیردار یہاں تک کہ اپنے زمیندار پر جان نثار کر دیتی تھی۔ یہ ایک مسلمہ اصول سیاست تھا کہ رعایا بادشاہ کے آرام و آسائش کے لیے ہے۔ دنیا میں یہی رواج تھا۔ لیکن آج بادشاہ اور رعایا میں وہ تعلق نہیں رہا۔ آج ان میں خادم و مخدوم کا رشتہ ہے۔ اب اگر کسی بادشاہ کی عزت ہے تو خدمتی اعتبار سے ورنہ اس کی حالت دانتوں کے نیچے دبی ہوئی زبان کی سی ہے۔ رعایا کو اس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اب تو اسی بادشاہ کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنا سب کچھ رعایا پر نثار کر دیا ہو۔ جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو۔ جب تک کوئی خدمت کے راستہ پر چلنا نہیں سیکھتا۔ عوام کے دلوں میں جگہ نہیں پاتا۔

راجہ صاحب کو اب معلوم ہوا کہ شہرت اس سفید کپڑے کی طرح ہے جس پر ایک دھبہ بھی نہیں چھپ سکتا۔ جس طرف ان کا موٹر نکل جاتا لوگ ان پر آوازیں کستے۔ یہاں تک کہ اکثر تالیاں بھی بجتیں۔ بے چارے بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ شہرت حاصل کرنے چلے تھے۔ عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور موقعوں پر اندو سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ اس سے دل کو ڈھارس ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ دروازہ بھی بند تھا۔ اندو سے ہمدردی کی کوئی امید نہ تھی۔

رات کو نو بجے تھے۔ راجہ صاحب اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے اس طرح سوچ رہے تھے۔ لوگ کتنے احسان فراموش ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے متواتر سات سال ان کی خدمت میں صرف کر دیے۔ اپنا کتنا وقت، کتنا تجربہ، کتنا آرام ان کی نذر کیا اس کا مجھے آج یہ صلہ مل رہا ہے کہ ایک اندھا بھکاری مجھے سارے شہر میں گالیاں دیتا پھرتا ہے۔ اور کوئی اس کی زبان نہیں پکڑتا بلکہ لوگ اسے اور بھی اکساتے اور بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس قدر، باقاعدگی سے اپنے علاقہ کا انتظام کرتا تو اب تک نکاسی میں لاکھوں روپوں کا اضافہ ہوگیا ہوتا۔ ایک دن وہ تھا کہ جدھر سے نکل جاتا تھا۔ لوگ کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے تھے۔ جلسوں میں میری تقریریں سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور مجھے اخیر میں بولنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اب ایک دن یہ ہے کہ مجھ پر تالیاں بجائی جاتی ہیں اور میرا سوانگ نکالنے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اندھے میں پھر بھی تمیز ہے ورنہ۔ بنارس کے شہدے دن دہاڑے میرا گھر لوٹ لیتے۔

دفعتاً اردلی نے آکر مسٹر کلارک کا حکم نامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ راجہ صاحب نے چونک کر لفافہ کھولا تو ششدر ہو گئے۔ مصیبت پر مصیبت! رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔

چپراسی : حضور کچھ جواب دیں گے؟

راجہ صاحب : جواب کی ضرورت نہیں۔

چپراسی : کچھ انعام نہیں ملا حضور ہی ....

راجہ صاحب نے اسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر پھینک دیا۔ اردلی چلا گیا۔

راجہ صاحب سوچنے لگے۔ پاجی کو انعام مانگتے شرم بھی نہیں آتی۔ گویا میرے نام کوئی سپاس نامہ لایا ہے۔ کتے ہیں اور کیا۔ کچھ نہ دو تو کاٹنے دوڑیں۔ جھوٹی سچی شکایتیں کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کلارک نے کیوں اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ جان سیوک سے کسی بات پر ان بن ہو گئی کیا؟ شاید صوفیہ نے کلارک کو ٹھکرا دیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لوگ یہ تو کہیں گے کہ اندھے نے راجہ صاحب کو نیچا دکھا دیا۔ پر اس دہائی سے تو گلا چھوٹے گا۔

اس وقت ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو اپنے منہ زور گھوڑے کے بھاگ جانے پر خوش ہو۔ اب ہڈیوں کے ٹوٹنے کا خوف تو نہیں رہا۔ میں گھاٹے میں نہیں ہوں۔ اب تو روٹھی رانی بھی خوش ہو جائیں گی۔ اندو سے کہوں گا۔ میں نے ہی مسٹر کلارک سے اپنا فیصلہ منسوخ کرنے کے لیے کہا ہے۔

وہ کئی روز سے اندو سے ملنے نہ گئے تھے۔ اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اندو کے طعنوں کا کیا جواب دوں گا۔ اندو بھی اس خوف سے ان کے پاس نہ آتی تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ناخوشگوار لفظ پھر نکل جائے۔ ہر باہمی قضیہ کے بعد جب وہ اس کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تھی تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ میں ہی خطاوار ہوں اور اپنی خود سری پر اسے دلی ملال ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے بچپن ہی سے شوہر پرستی کا بلند معیار اس کے سامنے رکھا تھا۔اس معیار سے گرنے پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی اور اپنے کو ملامت کرتی تھی۔ میرا فرض ان کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

مجھے تن من سے ان کی سیوا کرنی چاہیے۔ میرا اوّلین فرض ان کے متعلق ہے۔ ملک وقوم کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر میری نحوست باربار مجھے فرض کے راستہ سے ہٹا دیتی ہے۔ میں اس اندھے کے پیچھے ان سے ناحق مخواہ الجھ پڑی۔ وہ عالم ہیں اور دور اندیش۔ یہ میری گستاخی ہے کہ میں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کرتی ہوں۔ جب میں ذرا ذرا سی باتوں میں اپنی خودداری کا لحاظ کرتی ہوں تو ان سے کیسے امید کروں کہ ہر معاملہ میں بے لوث رہیں؟

کئی روز تک دل میں اس طرح سوچتے رہنے کے سبب اس کو سورداس سے چڑ سی ہوگئی۔ اس نے خیال کیا کہ اسی کمبخت کی وجہ سے میں اس عذاب میں مبتلا ہوں۔اسی نے ہمارے درمیان مغائرت پیدا کر دی ہے۔ آخر اس زمین سے محلّہ والوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے نہ؟ تو جب انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس اندھے کی کیوں نانی مرتی ہے۔ کسی کی زمین پر کوئی جبراً کیوں قبضہ کرے۔ یہ صرف ڈھکوسلا ہے اور کچھ نہیں۔ کمزور لوگ تو ابتدائے زمانہ سے ستائے جاتے رہے ہیں اور ستائے جاتے رہیں گے۔ جب یہ عالمگیر رواج ہے تو پھر کیا ایک کم اور کیا ایک زیادہ۔

انھیں دنوں میں جب سورداس نے راجہ صاحب کو شہر میں بدنام کرنا شروع کیا تو اس کی محبت کا پلہ نہایت تیزی سے دوسری طرف جھکا اسے سورداس کے نام سے چڑ ہو گئی ۔ یہ ٹکے کا آدمی اور اس کی اتنی جرأت کہ ہم لوگوں کے سر چڑھے۔ اگر جمہوریت کے یہی معنی ہیں تو ایشور ہمیں اس سے بچائے۔ یہ زمانہ کا انقلاب ہے ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے اوپر اس طرح چھینٹے اڑاتا۔

اندو غریبوں پر رحم کرسکتی تھی مگر ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکتی تھی۔ رحم میں فضیلت کی شان ہے اور انصاف میں جمہوریت کا جذبہ۔ وہ سوچتی کہ یہ اس بدمعاش کو پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتے؟ مجھ سے تو یہ ذلت نہ برداشت ہوتی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہوتا مگر اس وقت تو ایسی بری طرح پیش آتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

وہ اسی قسم کے برے خیالات میں غرق تھی کہ صوفیہ نے جاکر اس کے سامنے راجہ پر سورداس کے ساتھ بے انصافی کرنے کا اتہام لگایا۔ کھلی ہوئی دھمکی دی گئی۔

اندو کو اتنا غصہ آیا کہ سورداس کو پاتی تو اس کا منہ نوچ لیتی۔ صوفیہ کے چلے جانے پر وہ غصہ میں بھری راجہ صاحب کے پاس پہنچی مگر معلوم ہوا کہ وہ چند روز کے لیے علاقہ پر گئے ہوئے ہیں ۔ یہ دن اس نے بڑی بے چینی سے گزارے۔ افسوس ہوا کہ چلے گئے اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔

راجہ صاحب علاقہ سے لوٹے توانھیں مسٹر کلارک کا حکم نامہ ملا۔ وہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اندو ان کے پاس گئی اور بولی "علاقہ پر گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی گویا میں گھر ہی میں نہیں ہوں۔"

راجہ نے نادم ہو کر کہا۔ "ایسا ہی ایک ضروری کام تھا۔ ایک دن کی بھی دیر ہوجاتی تو علاقہ میں فوجداری ہو جاتی۔ مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ تعلقداروں کے اپنے علاقہ جات میں نہ رہنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

اندو: علاقہ میں رہتے تو کم سے کم اتنی بدنامی تو نہ ہوتی۔

راجہ صاحب: اچھا تمھیں بھی معلوم ہوگیا۔ تمھارا کہنا نہ مانا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس اندھے نے ایسے مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ سارے شہر میں بد نام کر رہا ہے۔ نہ جانے شہر کے باشندوں کو اس سے اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی۔ مجھے مطلقاً گمان نہ تھا کہ یہ شہر والوں کو میری مخالفت پر آمادہ کر دے گا۔

اندو: میں نے تو جب سے سنا ہے کہ اندھا تمھیں بدنام کر رہا ہے۔ تب سے ایسا غصہ آ رہا ہے کہ میرا بس چلے تو اسے زندہ در گور کر دوں۔

راجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ تو ہم دونوں گھوم گھام کر ایک ہی جگہ آپہنچے۔

اندو: اس بدمعاش کو ایسی سزا دینی چاہیے کہ عمر بھر یاد کرے۔

راجہ صاحب: مسٹر کلارک نے اس کا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ سورداس کی زمین واپس کردی گئی۔

اندو کو ایسا معلوم ہوا کہ پیروں تلے زمین دھنس رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ بھی۔ وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔ صوفیہ نے مجھے اس طرح ذلیل کیا ہے میرے ساتھ یہ چال چلی ہے۔ ہماری عزت کو خاک میں ملانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے

کہ میں اس کے قدم چوموں۔ یہ ہر گز نہ ہوگا۔

اندو نے راجہ صاحب سے کہا۔ "اب آپ کیا کریں گے؟"

راجہ صاحب: کچھ نہیں۔ کرنا کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھ کو اس کا ذرا بھی ملال نہیں۔ میری تو گلو خلاصی ہو گئی۔

اندو: اور سبکی کتنی ہوئی۔

راجہ صاحب: سبکی ضرور ہوئی مگر اس بدنامی سے بہتر ہے۔

اندو کا چہرہ غرور سے تمتما اٹھا۔ بولی۔ "یہ بات آپ کے لیے زیبا نہیں۔ یہاں نیک نامی یا بد نامی کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کا سوال ہے۔ آپ کے خاندانی وقار پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا آپ کا خاص فرض ہے۔ خواہ اس کے لیے عدل و انصاف کے اصولوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔ مسٹر کلارک کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں کسی شاہنشاہ کے ہاتھوں سے بھی اپنے وقار کی بربادی نہ ہونے دوں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ حتے کہ جان بھی دے دینی پڑے۔ آپ جلد ہی گورنر کو مسٹر کلارک کی نا منصفانہ مداخلت کی اطلاع دیجیے۔ ہمارے بزرگوں نے اس وقت انگریزوں کی حفاظت کی تھی جب ان کے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ ان احسانات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ نہیں تو آپ خود ہی جاکر گورنر سے ملیے۔ ان سے کہیے کہ مسٹر کلارک کے دخل در معقولات سے میری سراسر توہین ہوگی۔ میں عوام کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا اور تعلیم یافتہ جماعت کو گورنمنٹ پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا۔ آپ دکھلا دیں کہ رئیس کی توہین کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے تشویش ناک لہجہ میں کہا۔ "مسٹر کلارک سے ہمیشہ کے لیے دشمنی ہو جائے گی۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ان کے مقابلہ میں گورنر میرا ساتھ دے۔ تم ان لوگوں کو جانتی نہیں ہو۔ ان کی افسری یا ماتحتی محض دکھانے کے لیے ہے۔ اصل میں سبھی ایک ہیں۔ ایک جو کرتا ہے۔ سب اس کی تائید کرتے ہیں۔ اب آگے بڑھنا بے فائدہ پریشان ہونا ہے۔"

اندو: اگر گورنر نہ سنے تو گورنر جنرل کے یہاں اپیل کیجیے۔ ولایت جاکر وہاں کے

لیڈروں سے ملیے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کے سر پر ایک اہم ترین ذمہ داری کا بار آ پڑا ہے۔ اس میں ذرّہ برابر بھی دبنا آپ کی دائمی ذلت و رسوائی کا باعث ہوگا۔

راجہ صاحب نے ایک منٹ تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''تمھیں یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہوگی کہ وہ میری مدد کریں گے یا کم از کم ہمدردی کا اظہار ہی کریں گے لیکن جس دن میں نے کھلے الفاظ میں مسٹر کلارک کی شکایت کی اسی دن سے لوگ میرے گھر آنا جانا بھی بند کر دیں گے۔ کوئی منہ تک نہ دکھائے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسٹر کلارک سے میری خفیہ شکایتیں کریں گے۔ اور مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ ہمارے خواندہ اور مہذب بھائیوں کی اخلاقی کمزوری ناگفتہ بہ ہے۔ سب کے سب ظاہر یا پوشیدہ طریقہ پر گورنمنٹ کے دست نگر ہیں۔ جب تک انھیں معلوم ہے کہ حکام سے میرا ربط ضبط ہے جبھی تک میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ جس روز انھیں معلوم ہوگا کہ حاکم ضلع کی نگاہ مجھ سے پھر گئی، اسی روز سے میرے اعزاز کا خاتمہ سمجھو۔ ہمارے بھائیوں کی یہی کمزوری اور خود غرضی ہے جو ہمارے بے خوف راست گو اور جری رہنمایانِ ملک کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔

راجہ صاحب نے لطائف الحیل سے خوب کام لیا اور حالاتِ گرد و پیش کا نہایت یاس انگیز نقشہ کھینچا لیکن اندو اپنے نقطہ سے جو بھر بھی نہ ٹلی۔ وہ ان کے دل میں اس جذبہ کو بیدار کرنا چاہتی تھی جو کبھی پرتاپ اور سانگا ٹیپو اور نانا کے ناموں پر قربان ہو جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جذبہ مرا نہیں بلکہ اس پر اقتدار کی محبت کی نیند کا غلبہ ہے۔ بولی۔ ''اگر مان لیں کہ آپ کے سارے اندیشے ٹھیک نکلیں آپ کی عزت مٹ جائے۔ سارا شہر آپ کا دشمن ہو جائے۔ حکام آپ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کے علاقہ کے ضبط ہونے کی بھی نوبت آ جائے جب بھی میں آپ سے یہی کہتی جاؤں گی کہ اپنی جگہ پر اٹل رہیے۔ ہم چھتریوں کا یہی دھرم ہے۔ آج ہی اخباروں میں یہ بات شائع ہوجائے ں اورساری دنیا نہیں تو کم از کم سارا ملک آپ کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھے گا کہ آپ اس قومی وقار کی کتنی مردانگی

اور آزادی سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس جنگ میں ہماری شکست بھی ایک عظیم فتح خیال کی جائے گی۔ کیوں کہ یہ جنگ مادی نہیں روحانی ہے۔ لیکن مجھے تو یقین کامل ہے کہ آپ کے اندیشے باطل ثابت ہوں گے۔ ایک حاکم کی زیادتی کی فریاد سرکار کے کانوں تک پہنچا کر آپ اس زبردست و فاداری کا ثبوت دیں گے۔ سرکار کی عدل گستری پر اس اعتماد کامل کا علاج کریں گے جو سلطنت کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ بچہ ماں کے سامنے روئے مچلے، ہٹ کرے، پرماں کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔ مجھے تو یقین ہے کہ سرکار اپنے انصاف کی دھاک جمانے کے لیے آپ کی اور بھی عزت کرے گی۔ قومی تحریکات کے رہنماؤں کو عموماً اونچے اونچے خطابات دیے جاتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو بھی وہی اعزاز حاصل نہ ہو۔“

یہ دلیل راجہ صاحب کو غور کرنے کے لیے قابل معلوم ہوئی۔ بولے۔ ”اچھا سوچوں گا۔“ اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح مسٹر جان سیوک راجہ صاحب سے ملنے آئے۔ انھوں نے بھی یہی صلاح دی کہ اس معاملہ میں ذرا بھی نہ دبنا چاہیے۔ لڑوں گا تو میں آپ صرف میری مدد کرتے جایئے گا۔ راجہ صاحب کو کچھ تسکین ہوئی۔ ایک سے دو ہوئے۔ شام کے وقت وہ کنور صاحب سے صلاح لینے گئے۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی۔ ڈاکٹر گنگولی کو تار دے کر بلایا گیا۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ آپ خاموش بھی ہو جائیں گے تو میں کونسل میں اس معاملے کو ضرور پیش کروں گا۔ سرکار ہمارے تجارتی معاملات کی طرف سے اس قدر بے پرواہ نہیں ہو سکتی۔ یہ انصاف یا بے انصافی۔ عزت یا بے عزتی کا سوال نہیں ہے۔ صرف تجارتی مقابلہ کا سوال ہے۔

راجہ صاحب اندو سے بولے۔ ”لو بھائی۔ تمھاری صلاح ٹھیک رہی۔ جان پر کھیل رہا ہوں۔“

اندو انھیں عقیدت مند نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”ایشور نے چاہا تو آپ کی فتح ہو گی۔“

(22)

سید طاہر علی کو امید کامل تھی کہ سگریٹ کا کارخانہ تعمیر ہونا شروع ہو جائے گا تو میری کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوگی۔ مسٹر سیوک نے ان سے اس امر کا وعدہ کیا تھا اس امید کے سوا انھیں اب ان قرضہ جات کے ادا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ نظر آتا تھا جو روز بروز برساتی گھاس کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے۔ وہ خود بڑی کفایت سے بسر کرتے تھے۔ عید کے دن کے علاوہ اور شاید کسی روز بھی دودھ ان کے حلق میں نہ جاتا تھا۔ مٹھائی ان کے لیے حرام تھی۔ پان تمباکو کا انھیں شوق ہی نہ تھا۔ لیکن یہ خود چاہے کتنی ہی کفایت کریں۔ گھر والوں کی ضروریات میں قطع و برید کرنا انصاف کے خلاف سمجھتے تھے۔ زینب اور رقیہ اپنے لڑکوں کے لیے دودھ لینا ضروری خیال کرتی تھیں۔ کہتیں! یہی تو لڑکوں کے کھانے پینے کی عمر ہے۔ اسی عمر میں تو ان کی ہڈیاں چوڑی چکلی ہوتی ہیں۔ ان کے دل اور دماغ بڑھتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکوں کو مقوی غذا نہ ملے۔ تو ان کی ساری عمر ہی برباد ہو جاتی ہے۔

لڑکوں کے بارہ میں ایسا کہنا سچ ہو یا جھوٹ۔ مگر پان تمباکو کے بارہ میں طاہر علی کی سوتیلی مائیں جس دلیل کو پیش کرتی تھیں۔ اس کی سچائی مسلمہ تھی۔ عورتوں کا ان کے بغیر گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے کہ ان کے یہاں پان تک میسر نہیں۔ یہی تو اب شرافت کی ایک نشانی رہ گئی ہے۔ مامائیں نہیں۔ خواصیں نہیں تو کیا پان تمباکو سے بھی گئے۔ مردوں کو پان کی ایسی ضرورت نہیں۔ انھیں حکام سے ملنا جلنا پڑتا ہے۔ پرائی تابعداری کرتے ہیں۔ انھیں پان کی کیا ضرورت؟

مصیبت یہ تھی کہ ماہر اور جابر تو مٹھائیاں کھا کر اوپر سے دودھ پیتے اور صابر اور نسیمہ کھڑے منہ تاکا کرتے۔ زینب بیگم کہتیں۔ ان کے گڑ کے باپ کو لھو ہی خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ سب کو دکھا کر کھلائیں۔ جبھی کھلانا کہلائے۔ سب کچھ تو انھیں کی مٹھی میں ہے۔ جو چاہیں کھلائیں۔ جیسے چاہیں رکھیں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہے؟

وہ دونوں دن بھر بکری کی طرح پان چبایا کرتیں۔ کلثوم کو کھانے کے بعد بھی

ایک بیڑا بمشکل ملتا تھا۔ اپنی ان ضروریات کے لیے طاہر علی سے پوچھنے یا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہ تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ چمڑے کی خرید ہو رہی تھی۔ سینکڑوں چمار بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یہی ایک وقت تھا جب طاہر علی کو اپنے عہدہ کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت انھیں اس احساس کی وجہ سے حکومت کا خفیف سا نشہ ہو جاتا تھا۔ایک چمار دروازہ پر جھاڑو لگاتا ایک ان کا تخت صاف کرتا۔ ایک پانی بھرتا۔ کسی کو سبزی خریدنے کے لیے بازار بھیج دیتے۔ اور زینب اور رقیہ پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر پاندان کا خرچ وصول کرتیں۔ صاحب نے طاہر علی کو دستوری لینے سے منع کیا تھا۔ عورتوں کو پان پتے کا خرچ لینے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اس آمدنی سے دونوں نے اپنے اپنے لیے زیور بنوا لیے تھے۔ طاہر علی اس رقم کا حساب لینا چھوٹی بات سمجھتے تھے۔

اسی وقت جگدھر آ کر بولا۔ "منشی جی حساب کب تک چکتا کیجیے گا؟ میں کوئی لکھ پتی تھوڑے ہی ہوں کہ روز مٹھائیاں دیتا جاؤں چاہے دام ملیں یا نہ ملیں۔آپ جیسے دو چار گاہک اور مل جائیں تو میرا دوالہ ہی نکل جائے۔ لایئے۔ روپے دلوایئے۔ اب حیلہ حوالہ نہ کیجیے۔ گاؤں محلہ کی بہت مروت کر چکا۔ میرے اوپر بھی تو مہاجن کا لہنا تگادا (تقاضا) ہے۔ یہ دیکھئے کاگد (کاغذ) حساب کر دیجیے۔

باقی داروں کے لیے حساب کا کاغذ موت کا پروانہ ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ حساب دیکھنے کا مطلب ہے۔روپے ادا کرنا۔ باقی دار نے حساب کا چٹھا ہاتھ میں لیا اور پانے والے کا دل امید سے شگفتہ ہوگیا۔ حساب کی فرد ہاتھ میں لے کر پھر کوئی حیلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ باقی داروں کو خالی ہاتھ حساب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

طاہر علی نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ "بھئی حساب سب معلوم ہے اب بہت جلد تمھارا بقایا صاف ہو جائے گا۔ دو چار روز اور صبر کرو۔

جگدھر: کہاں تک صبر کروں صاحب ! دو چار دن کرتے کرتے تو مہینوں ہوگئے۔ مٹھائیاں کھاتے وقت تو میٹھی جان پڑتی ہیں دام دیتے کیوں کڑوا لگتا ہے۔

طاہر : برادر آج ذرا تنگ ہوگیا ہوں۔ مگر اب جلد ہی کارخانہ کا کام شروع ہوگا۔

میری بھی ترقی ہو گی۔ بس تمھاری کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔

جگدھر : نا صاحب۔ آج تو میں روپے لے کر ہی جاؤں گا۔ مہاجن کے روپے نہ دوں گا تو آج مجھے چھٹانک بھر بھی سودا نہ ملے گا۔ بھگوان جانتے ہیں جو میرے گھر میں ٹکا بھی ہو۔ یہ سمجھیے کہ آپ میرا نہیں۔ اپنا دے رہے ہیں۔ آپ سے جھوٹ بولتا ہوں تو جوانی کام نہ آئے۔ رات بال بچے بھوکے ہی سو رہے۔ سارے محلہ میں آواز لگائی کسی نے چار آنے پیسے بھی نہ دیے۔

چماروں کے چودھری کو جگدھر پر رحم آ گیا۔ طاہر علی سے بولا۔ "منشی جی میرا پاونا (یا فتنی) انھیں کو دے دیجیے۔ مجھے دو چار دن پیچھے دے دیجئے گا۔

طاہر : جگدھر میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ خدا کے لیے دو چار دن ٹھہر جاؤ۔

جگدھر : منشی جی جھوٹ بولنا گائے کھانا ہے۔ مہاجن کے روپے آج نہ پہنچے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔

طاہر علی نے گھر میں آکر کلثوم سے کہا۔ مٹھائی والا سر پر سوار ہے کسی طرح ٹلتا نہیں۔ کیا کروں؟ تحویل میں سے دس روپے نکال کر دے دوں؟"

کلثوم نے چڑھ کر کہا۔ جس کے دام آتے ہیں وہ سر پر سوار ہو گا ہی۔ اماں جان سے کیوں نہیں مانگتے۔ میرے بچوں کو تو مٹھائی ملی نہیں۔ جنھوں نے کود کود کر کھایا کھلایا ہے، وہ دام دینے کے وقت کیوں بھیگی بلی بنی بیٹھی ہوئی ہیں؟

طاہر : اسی وجہ سے تو میں تم سے کوئی بات کہتا نہیں۔ تحویل سے لے لینے میں کیا ہرج ہے؟ تنخواہ ملتے ہی جمع کر دوں گا۔

کلثوم : خدا کے لیے کہیں یہ غضب نہ کرنا۔ روکڑ کو کالا سانپ سمجھو کہیں آج ہی صاحب رقم کی جانچ کرنے لگے تو؟

طاہر : ابھی نہیں۔ صاحب کو اپنی فرصت کہاں کہ روکڑ ملاتے رہیں۔

کلثوم : میں امانت کی رقم چھونے کو نہ کہوں گی۔ ایسا ہی ہے تو نسیمہ کا طوق اتار کر کہیں گرو رکھ دو۔ اور تو میرے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔

طاہر علی کو رنج تو بہت ہوا مگر کرتے کیا؟ نسیمہ کا طوق اتارتے تھے۔ اور روتے

تھے کلثوم اسے پیار کرتی تھی۔ اور پھسلا کر کہتی تھی تمھارا نیا طوق بنوانے جا رہے ہیں۔ نسیمہ پھولی نہ سماتی تھی کہ مجھے نیا طوق ملے گا۔

طوق کو رومال میں لیے ہوئے طاہر علی باہر نکلے اور جگدھر کو علٰحدہ لے جا کر بولے۔ "بھئی اسے لے جاؤ کہیں گرو رکھ کر اپنا کام چلاؤ۔ گھر میں روپے نہیں ہیں۔"

جگدھر : ادھار سودا دینا پاپ ہے پر کروں کیا؟ نگد (نقد) بیچنے لگوں تو گھومتا ہی رہ جاؤں۔

یہ کہہ کر اس ذرا تامل کرتے ہوئے طوق لے لیا اور پچھتاتا ہوا چلا گیا۔ کوئی دوسرا آدمی اپنے گاہک کو اتنا دق کر کے روپیہ نہ وصول کرتا۔ اسے لڑکی پر رحم آ ہی جاتا جو مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ میرا طوق کب بنا کر لاؤ گے۔ لیکن جگدھر اخراجات خانگی کے ناقابل برداشت بار کے سبب اس سے کہیں زیادہ بے مروت بننے پر مجبور تھا جتنا کہ وہ واقعی تھا۔

جگدھر کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ بجرنگی تیور بدلے ہوئے آکر بولا۔ منشی جی روپے دینے ہوں تو دیجئے نہیں تو کہہ دیجیے۔ بابا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ بس ہم صبر کر لیں۔ سمجھ لیں گے کہ ایک گائے نہیں لگی روز روز دوڑاتے کیوں ہو؟

طاہر : برادر۔ جیسے اتنے دنوں تک صبر کیا ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور صبر کرو۔ خدا نے چاہا تو اب کے تمھاری ایک پائی بھی نہ رہے گی۔

بجرنگی : ایسے وعدے تو آپ بیسوں بار کر چکے ہیں۔

طاہر : اب کے پکّا وعدہ کرتا ہوں۔

بجرنگی : تو کس دن حساب کیجیے گا۔

طاہر علی مخمصے میں پڑ گئے۔ کون سا دن بتلائیں؟ باقی داروں کو حساب کے دن کا اتنا ہی خوف ہوتا ہے۔ جتنا گناہگاروں کو۔ وہ "دو چار" "بہت جلد" "آج کل میں" وغیرہ وغیرہ مبہم الفاظ کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ ایسے وعدے پورے کیے جانے کے لیے نہیں صرف پانے والوں کو ٹالنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ طاہر علی طبعاً خوش معاملہ شخص تھے۔ تقاضوں سے انھیں سخت پریشانی ہوتی تھی۔ وہ تقاضوں سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا شیطان سے۔ انھیں دور سے دیکھتے ہی ان کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ خیر کئی

منٹ تک سوچتے رہے کیا جواب دوں؟ خرچ کا یہ حال ہے اور ترقی کے لیے کہتا ہوں تو کورا جواب ملتا ہے آخر بولے۔ ”دن کون سا بتاؤں؟ چار چھ دن میں جب آجاؤ گے۔ اسی دن حساب ہو جائے گا۔“

بجرنگی : منشی جی! مجھ سے اڑن گھائیاں نہ بتایئے۔ مجھے بھی سبھی طرح کے گاہکوں سے کام پڑتا ہے۔ اگر دس دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے اتنی دیر کیوں کی؟ اب روپے خرچ ہو گئے۔ اگر چار پانچ دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے ابھی تو روپے ملے ہی نہیں۔ اس لیے مجھے کوئی دن بتا دیجیے جس میں میرا بھی ہرج نہ ہو اور آپ کو بھی سبھیتا ہو۔

طاہر : دن بتا دینے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوتا مگر بات یہ ہے کہ میری تنخواہ ملنے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے۔دو چار دنوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ بعد کسی لڑکے کو بھی بھیج دو گے تو روپے مل جائیں گے۔

بجرنگی : اچھی بات ہے۔ آپ ہی کا کہنا سہی۔ اگر اب کی بھی وعدہ پورا نہ کیجیے گا تو پھر مانگنے نہ آؤں گا۔

بجرنگی چلا گیا تو طاہر علی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے۔ یہ لوگ اتنی اتنی طلب پاتے ہیں۔ گھر میں بٹور کر رکھتے ہوں گے اور یہاں خرچ کا یہ حال ہے کہ آدھا مہینہ بھی نہیں ختم ہونے پاتا اور روپے اڑ جاتے ہیں۔ شرافت روگ ہے اور کچھ نہیں۔

ایک چمار نے کہا۔ ”ہجور بڑے آدمیوں کا کھرچ بھی بڑا ہوتا ہے۔ آپ ہی لوگوں کی بدولت توگریبوں کی گجر ہوتی ہے۔ گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہ سکتا ہے۔“

طاہر : اجی صرف پان میں اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ اتنے میں دو آدمیوں کا بخوبی گزر ہو سکتا ہے۔

چمار : ہجور۔ دیکھتے نہیں ہیں کیا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔

ابھی طاہر علی کی اشک شوئی کافی طور پر نہ ہونے پائی تھی کہ سامنے سے ٹھاکر دین آتا ہوا دکھائی دیا۔ بیچارے پہلے ہی سے کوئی بہانہ سوچنے لگا۔ اتنے میں اس نے آکر سلام کیا اور بولا۔ ”منشی جی۔ کار خانہ میں کب سے ہاتھ لگے گا؟“

طاہر : مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ ابھی انجینئر نے نقشہ نہیں بنایا۔ اسی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔

ٹھاکر دین : انجینئر نے بھی کچھ لیا ہو گا۔ بڑی بے ایمان جات ہے، ہجور میں نے بھی کچھ ٹھیکہ داری کی ہے۔ جو کماتا تھا۔ انجینئر کو کھلا دیتا تھا۔ آخر گھبرا کر چھوڑ بیٹھا۔ انجینئر کے بھائی ڈاکٹر ہو تے ہیں۔ روگی چاہے مر تا ہو پر فیس لیے بنا بات نہ سنیں گے۔ فیس کے نام سے رعایت بھی کریں گے تو گاڑی کے کرایہ اور دوا کے دام میں کس لیں گے (حساب کی فرو دکھا کر) جرا (ذرا) ادھر بھی ایک نجر (نظر) ہو جائے۔

طاہر : سب معلوم ہے۔ تم نے غلط تھوڑا ہی لکھا ہو گا۔

ٹھاکر دین : ہجور ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا تو مجھے کیا حکم ہوتا ہے۔

طاہر : دو چار روز کی مہلت دو۔

ٹھاکر دین : جیسی آپ کی مرضی۔ ہجور۔ چوری ہو جانے سے لاچار ہو گیا نہیں تو جو چار روپیوں کی کون بات تھی۔ اس چوری میں تباہ ہوگیا۔ گھر میں پھوٹا لوٹا تک نہ بچا۔ دانے کو محتاج ہوگیا ہجور۔ چوروں کو آنکھوں سے سامنے بھاگتے دیکھا۔ ان کے پیچھے دوڑا پاگل خانہ تک دوڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات تھی۔ اونچا کھائی کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پھر اٹھا۔ مال بڑا پیارا ہوتا ہے۔ لیکن چور نکل گئے تھے۔ تھانہ میں رپٹ کی۔ تھانہ داروں کی کھوسامد کی پر گئی ہوئی کچھی کہاں لوٹتی ہے۔ تو کب آؤں؟"

طاہر : تمھارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھجوا دوں گا۔

ٹھاکر دین : جیسی آپ کی کھسی۔ مجھے کوئی اجر نہیں ہے۔ مجھے تگادا (تقاضہ) کرتے آپ ہی سرم آتی ہے۔ کوئی بھلا مانس ہاتھ میں پیسے رہتے ہوئے ٹال مٹول نہیں کرتا فوراً نکال کر پھینک دیتا ہے۔ آج جرا پان لینے جانا تھا۔ اس لیے چلا آیا تھا سب نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت دے دیجیے۔ کسی طرح کام نہ چلا تب آپ کے پاس آیا۔ آدمی پہچانتا ہوں۔ ہجور۔ پر موکا (موقع) ایسا ہی آ پڑا ہے۔

ٹھاکر دین کی منکسر مزاجی اور شگفتہ خاطری نے طاہر علی کو گر دیدہ بنا لیا۔ فوراً صندوق کھولا اور پانچ روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے ٹھاکر دین نے روپے اٹھائے نہیں۔ وہ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہ آپ کے روپے ہیں کہ سرکاری روکڑ کے ہیں؟"

طاہر: تم لے جاؤ۔ تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے؟

ٹھاکر دین: نہیں منشی جی۔ یہ نہ ہوگا۔ اپنے روپے ہوں تو دیجیے۔ مالک کی روکڑ ہو تو رہنے دیجیے۔ پھر آکر لے جاؤں گا آپ کے پاس چار پیسے کھاتا ہوں تو آپ کو آنکھوں سے دیکھ کر گڑھے میں نہ گرنے دوں گا۔ برا مانئے تو مان جایئے۔ اس کی چنتا نہیں۔ صفا بات کہنے کے لیے بد نام ہوں۔ آپ نے روپے یوں اللے تللے کھرچ ہوں گے تو ایک دن آپ دھوکا کھائیں گے۔ بھل منسی تو ٹھاٹھ باٹھ بڑھانے میں نہیں ہے۔ اپنی آبرو بچانے میں ہے۔

طاہر علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "روپے لیتے جاؤ۔"

ٹھاکر دین: اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ جب آپ کے پاس ہوں تب دینا۔

اب تک تو طاہر علی کو کارخانہ کے بننے کی امید تھی کہ ادھر آمدنی بڑھی اور ادھر میں نے روپے دیے۔ لیکن جب مسٹر کلارک کے نئے حکم کے بموجب تعمیر کا کام غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیا گیا تو طاہر علی کو اپنے مہاجنوں کا سمجھانا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔

طاہر علی بہت متفکر رہنے لگے۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کلثوم کہتی تھی اوپر کا خرچ سب بند کر دیا جائے۔ دودھ پان اور مٹھائیوں کے بغیر آدمیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ ایسے کتنے آدمی ہیں جنھیں اس زمانہ میں یہ چیزیں میسر ہیں؟ اوروں کی کیا کہوں۔ میرے ہی لڑکے ترستے ہیں۔ میں پہلے سمجھا چکی ہوں اور اب پھر سمجھاتی ہوں کہ جن کے لیے تم اپنا لہو پسینہ ایک کر رہے ہو وہ تمھاری بات بھی نہ پوچھیں گے۔ پر نکلتے ہی صاف اڑ نہ جائیں تو کہنا۔ ابھی سے رخ دیکھ رہی ہوں۔ اوروں کو سود پر روپے دیے جاتے ہیں زیور بنوائے جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے خرچ کو کبھی کچھ مانگو تو ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ میرے پاس کہاں؟ تمھارے اوپر انھیں کچھ تو

رحم آنا چاہیے۔ آج دودھ مٹھائی بند کر دو تو گھر میں رہنا مشکل ہو جائے۔

تیسرا پہر تھا۔ طاہر علی برآمدہ میں اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک بھیرو آکر بیٹھ گیا اور بولا۔ "کیوں منشی جی کیا سچ مچ یہاں کار کھانہ نہ بنے گا؟"

طاہر : بنے گا کیوں نہیں۔ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔

بھیرو : مجھے تو بڑی آسا (آس) تھی کہ کارخانہ بن گیا تو میرا بکری بٹا بھی بڑھ جائے گا۔دوکان پر بکری بالکل مندی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سبیرے (صبح) تھوڑی دیر بیٹھا کروں۔ آپ منجور کر لیں تو اچھا ہو۔ میری تھوڑی بہت بکری ہو جائے گی۔ آپ کو بھی پان کھانے کے لیے کچھ نجر کر دیا کروں گا۔

کسی اور وقت پر تو طاہر علی نے بھیرو کو ڈانٹ بتلائی ہوتی۔ تاڑی کی دوکان کھولنے کی اجازت دینا ان کے مذہب کے خلاف تھا۔ مگر اس وقت روپیہ کی فکر نے انھیں کشمکش میں ڈال دیا۔ اس سے پیشتر بھی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اصول اور عمل میں کئی بار کشمکش پیدا ہو چکی تھی۔ اور ہر موقع پر انھیں اصول ہی کا خون کرنا پڑا تھا۔ آج پھر وہی کشمکش رونما ہوئی اور اصول نے پھر حالات موجودہ کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ وہ سوچنے لگے کیا کروں؟ اس میں میرا کیا قصور؟ میں کسی صرف بیجا کے لیے شرع کے خلاف عمل نہیں کر رہا ہوں حالات نے مجھے بالکل مجبور کر دیا ہے۔ یہ سوچ کر کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ "یہاں تاڑی کی بکری نہ ہو گی"۔

بھیرو : ہجور۔ بکری تو تاڑی کی مہک سے ہو گی۔ نشہ باجوں (نشہ بازوں) کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ نہ دیکھیں تو چاہے برسوں نہ پئیں پر نسہ سامنے دیکھ کر ان سے نہیں رہا جاتا۔

طاہر : مگر صاحب کے حکم کے بغیر میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں۔

بھیرو : آپ کی جیسی مرجی۔ میری سمجھ میں تو صاحب سے پوچھنے کی جرورت ہی نہیں۔سبیرے ایک گھڑا لاؤں گا۔ گھڑی بھر میں بیچ کر اپنی راہ لوں گا۔ انھیں خبر ہی نہ ہوگی کہ یہاں کوئی تاڑی بیچتا ہے۔

طاہر : نمک حرامی سکھاتے ہو۔ کیوں؟

بھیرو : سرکار۔ اس میں نمک حرامی کا ہے کی۔ اپنے داؤں گھات پر کون نہیں لیتا۔

سودا پٹ گیا۔ بھیرو یکمشت پندرہ روپے دینے پر راضی ہوگیا۔ جاکر سبھاگی سے بولا۔ "دیکھ سودا کر آیا نا؟ تو کہتی تھی کہ وہ کبھی نہ مانیں گے مسمان ہیں۔ ان کے یہاں تاڑی سراب منع ہے۔ پر میں نے تو کہہ نہ دیا تھا کہ مسلمان ہو چاہے برہمن ہو۔ پر دھرم کرم کسی میں نہیں رہ گیا۔ روپے پر سبھی لپک پڑتے ہیں۔ یہ میاں لوگ باہر سے اجلے کپڑے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں ہوتی۔ میاں نے پہلے تو دکھانے کے لیے ادھر ادھر کیا پھر پندرہ روپیہ میں راجی ہو گئے پندرہ روپے تو پندرہ دن میں سیدھے ہو جائیں گے۔"

سبھاگی پہلے گھر کی مالکن بننا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر روز ڈنڈے کھاتی تھی۔ اب وہ گھر بھر کی خادمہ بن کر مالکن بنی ہوئی ہے۔ روپے پیسے اسی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ساس جو اس کی صورت سے بیزار تھی۔ دن میں سوسو بار اسے دعائیں دیتی ہے۔ سبھاگی نے فوراً روپے نکال کر بھیرو کو دیے۔ شاید دو بچھڑے ہوئے دوست اس طرح ٹوٹ کر گلے نہ ملتے ہوں گے۔ جیسے طاہر علی ان روپیوں پر ٹوٹے۔ رقم قلیل تھی۔ اس کے لیے انھیں اپنے ایمان کا خون کرنا پڑا تھا۔ قرض والے اپنے اپنے روپے لے گئے۔طاہر علی کے سر کا بوجھ ہلکا ہوا۔ مگر انھیں بہت رات تک نیند نہ آئی۔ ضمیر سخت جان ہوا کرتا ہے۔ اس کا گلا کٹ جائے مگر جان نہیں نکلتی۔

(23)

جب تک سورداس شہر میں حکام کے ظلم کی دوہائی دیتا رہا اس کے محلہ والے جان سیوک کے ہوا خواہ ہونے کے باوجود بھی اس سے ہمدردی کرتے رہے۔ کمزوروں کے ساتھ ہمدردی قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن سورداس کی فتح ہوتے ہی اس ہمدردی نے حسد کی شکل اختیار کرلی۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ سورداس دل میں ہم لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہو گا۔ کہتا ہوگا کہ جب میں نے راجہ مہیندر کمار سنگھ جیسوں کو نیچا دکھا دیا۔ ان کا غرور خاک میں ملا دیا تو یہ لوگ کس کھیت کی مولی ہیں۔ سارا محلّہ اس سے دل ہی دل میں خار کھانے لگا۔ صرف ایک ٹھاکر دین تھا جو اس کے پاس اب بھی آیا جایا کرتا تھا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ سورداس کو کسی دیوتا کا اشٹ ضرور

ہے۔ اس نے ضرور کوئی منتر جگا لیا ہے ورنہ اس کی اتنی کہاں مجال کہ ایسے ایسے بڑے آدمیوں کا سر جھکا دیتا؟ لوگ کہتے ہیں کہ جنتر منتر سب ڈھکو سلا ہے۔ یہ سب دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

سورداس کے مزاج میں بھی اب کچھ تغیر ہوا۔ متحمل وہ پہلے ہی سے تھا لیکن حق و انصاف کی حمایت میں اسے کبھی کبھی غصہ آ جاتا تھا۔ اب اس میں حرارت کا نام بھی نہ رہا۔ گویا کوئی گھورا تھا جس پر سبھی کوڑا پھینکتے ہیں۔ محلّہ والے راہ چلتے اسے چھیڑتے۔ اس پر آوازے کستے۔ طعنے مار دیتے۔ وہ کسی کو جواب نہ دیتا۔ سر جھکائے بھیک مانگنے جاتا اور بھر چپکے سے آ کر اپنی جھونپڑی میں پڑ رہتا۔ ہاں مٹھوا کا مزاج نہ ملتا تھا وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ کہتا یہ کوئی نہ سمجھے کہ اندھا بھیک مانگتا ہے۔ اندھا تو بڑے بڑوں کی پیٹھ میں دھول لگا دیتا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو چھیڑتا۔ بھلے آدمیوں سے زبان لڑاتا۔ اپنے ہمجولیوں سے کہتا کہ چاہوں تو سارے محلّہ کو بندھوادوں کسانوں کے کھیتوں سے بیدھڑک چنے، مٹر، مولی، گاجر اکھاڑ لاتا۔ اگر کوئی ٹوکتا تو اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ سورداس کو روز اولہنے ملتے۔ وہ تنہائی میں مٹھوا کو سمجھاتا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ سورداس کے انکسار و تحمل پر تو کسی کی نگاہ نہ جاتی تھی۔ مٹھوا کی لن ترانیوں اور شرارتوں پر سبھی کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ لوگ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ سورداس ہی نے اس کو سر چڑھا لیا ہے۔ بچھڑا کھونٹے ہی کے بل پر کودتا ہے۔ حسد طفلانہ حرکتوں کو بھی مغالطہ بازی سمجھتا ہے۔

آج کل صوفیہ مسٹر کلارک کے ساتھ سورداس سے اکثر ملا کرتی تھی۔ وہ روزانہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتی۔ اور اس کی دل جوئی کرتی۔ پوچھتی محلّہ والے یا راجہ صاحب کے آدمی تمھیں دق تو نہیں کر رہے ہیں سور داس جواب دیتا۔ مجھ پر سب لوگ دیا کرتے ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ محلّہ والے سمجھتے تھے۔ کہ یہ بڑے صاحب سے ہم لوگوں کی شکایت کرتا ہے۔ کنایتاً طنزاً اسی قسم کے خیالات کا بھی اظہار کرتے۔ ”سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔“ یا ”پیادے سے فرزیں بھئو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے۔“ ایک بار کسی سرقہ کی علت میں نایک رام کے گھر تلاشی ہوئی۔ نایک

رام کو شک ہوا کہ سورداس ہی نے نیش زنی کی ہے۔ اسی طرح ایک بار بھیرو سے آبکاری کے داروغہ نے جواب طلب کیا۔ بھیرو نے شاید قاعدہ کے خلاف نصف شب تک دوکان کھلی رکھی تھی۔ بھیرو کا شک بھی سورداس ہی پر ہوا کہ اسی نے یہ چنگاری چھوڑی ہے۔ ان لوگوں کی بد گمانیوں سے تو سورداس کو زیادہ ملال نہ ہوا لیکن جب سبھاگی کھلم کھلا اسے مطعون و بد نام کرنے لگی تو اس کو بہت رنج ہوا۔ اسے یقین تھا کہ کم سے کم سبھا گی کو میری نیت کا حال معلوم ہے۔ اسے مجھ کو ان لوگوں کے دستِ ستم سے بچانا چاہیے تھا مگر اس کا دل بھی مجھ سے پھر گیا۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک روز رات کو سورداس کھا پی کر لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے آ کر چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ سورداس چونکا پر سبھاگی کی آواز پہچان کر بولا۔ ”کیا کہتی ہے۔“

سبھاگی : کچھ نہیں۔ زرا منڈ یا میں چلو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔

سورداس اٹھا اور سبھاگی کے ساتھ جھونپڑے میں آکر بولا۔ ”کہہ کیا کہتی ہے ؟اب تو تجھے بھی مجھ سے بیر ہوگیا ہے۔گالیا ں دیتی پھرتی ہے۔ چاروں طرف بدنام کر رہی ہے۔بتلا میں نے تیرے ساتھ کون سی برائی کی تھی کہ تونے میری برائی پر کمر باندھ لی۔ اور لوگ مجھے بھلا برا کہتے ہیں۔ مجھے رنج نہیں ہوتا لیکن جب تجھے طعنے دیتے سنتا ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ کلیجے میں درد سا ہو نے لگتا ہے۔ جس دن بھیرو کی طلبی ہوئی تھی تو نے مجھ کو کتنا کوسا تھا۔ سچ بتا۔ کیا تجھے بھی شک ہوا تھا کہ میں نے ہی دروگا جی سے سکایت کی ہے؟ کیا تو مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہے؟ بتا۔“

سبھاگی نے بھر آئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں تمھارا جتنا آدر کرتی ہوں اتنا اورکسی کا نہیں۔ تم اگر دیوتا ہو تے تو بھی میں اتنی ہی سردھا سے تمھاری پوجا نہ کرتی۔

سورداس : میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں؟ صاحب سے کس کی سکایت کرتا ہوں۔ جب دھرتی نکل گئی تھی تب تو لوگ مجھ سے نہ چڑتے تھے۔ اب شدھرتی چھوٹ جانے سے کیوں سب کے سب میرے دسمن ہو گئے ہیں؟ بتا میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ میری دھرتی چھوٹ گئی ہے تو کوئی راج مل گیا ہے کہ گھمنڈ کروں گا؟

سبھاگی: میرے من کا حال بھگوان جانتے ہوں گے۔
سورداس: تو مجھے کیوں جلایا کرتی ہے؟
سبھاگی: اس لیے۔

یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی سورداس کے ہاتھ رکھ دی۔ پوٹلی بھاری تھی۔ سورداس نے اسے ٹٹولا اور پہچان گیا۔ وہ اسی کی پوٹلی تھی جو چوری گئی تھی۔ اندازہ سے معلوم ہوا کہ روپے بھی اتنے ہی ہیں۔ تعجب سے بولا۔ ''یہ کہاں ملی؟''
سبھاگی: تمھاری محنت کی کمائی ہے۔ تمھارے پاس آ گئی۔ اب جتن سے رکھنا۔
سورداس: میں نہ رکھوں گا۔ اسے لے جا۔
سبھاگی: کیوں؟ اپنی چیج (چیز) لینے میں کوئی ہرج ہے؟
سورداس: یہ میری چیج نہیں۔ بھیرو کی چیج ہے۔ اسی کے لیے بھیرو نے اپنی آتما بیچی ہے۔ مہنگا سودا لیا ہے۔ میں اسے کیسے لے لوں؟
سبھاگی: میں یہ سب باتیں نہیں جانتی۔ تمھاری چیج ہے۔ تمھیں لینی پڑے گی۔ اس کے لیے میں نے اپنے گھر والوں سے چھل کیا ہے۔ اتنے دنوں سے اسی کے لیے مایا رچے رہی ہوں۔ تم نہ لوگے تو اسے میں کیا کروں گی؟
سورداس: بھیرو کو معلوم ہو گیا تو تمھیں جیتا نہ چھوڑے گا۔
سبھاگی: انھیں نہ معلوم ہونے پائے گا۔ میں نے اس کی تدبیر سوچ لی ہے۔

یہ کہہ کر سبھاگی چلی گئی۔ سورداس کو اور زیادہ بحث کرنے کا موقع نہ ملا۔ بڑی پس و پیش میں پڑ گیا۔ یہ روپے لوں یا کیا کروں؟ یہ تھیلی میری ہے یا نہیں۔ اگر بھیرو نے اسے خرچ کر دیا ہوتا تو؟ کیا چور کے گھر چوری کرنا پاپ نہیں ہے؟ کیا میں اپنے روپے کے بدلے اس کے روپے لے سکتا ہوں۔ سبھاگی مجھ پر کتنی دیا کرتی ہے۔ وہ اسی لیے مجھے طعنے دیا کرتی تھی کہ یہ بھید نہ کھلنے پائے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں بڑا ہوا تھا۔ کہ دفعتاً ''چور چور'' کا شور سنائی دیا۔ پہلی ہی نیند تھی۔ لوگ غافل سو رہے تھے۔ پھر آواز آئی۔ ''چور چور۔''

بھیرو کی آواز تھی۔ سورداس سمجھ گیا کہ سبھاگی نے یہ لیلا رچی ہے۔ دروازہ پر پڑا رہا۔ اتنے میں بجرنگی کی آواز سنائی دی۔ ''کدھر گیا کدھر گیا'' یہ کہہ

وہ لاٹھی لیے اندھیرے میں ایک طرف دوڑا۔ نایک رام بھی گھر سے نکلے اور کدھر کدھر کرتے ہوئے دوڑے۔ راستہ میں بجرنگی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چور سمجھا۔ دونوں نے وار کیا اور دونوں چوٹ کھا کر گر پڑے۔ ذرا دیر میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ ٹھاکردین نے پوچھا۔ ''کیا کیا لے گیا؟ اچھی طرح دیکھ لینا۔ کہیں چھت میں نہ چمٹا ہوا ہو۔ چور دیوار سے ایسا چمٹ جاتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔''

سبھاگی: ہائے۔ میں تو لٹ گئی۔ ابھی تو بیٹھی بیٹھی اماں کا پاؤں دبا رہی تھی۔ اتنے میں نہ جانے مؤا کہاں سے آ پہنچا؟

بھیرو: (چراغ سے دیکھ کر) ساری جمع جتھا لٹ گئی۔ ہائے رام۔

سبھاگی: ہائے میں نے اس کی پرچھائیں دیکھی تو سمجھی کہ یہی ہوں گے جب اس نے صندوق پر ہاتھ بڑھایا تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔

ٹھاکر دین: کھپریل پر چڑھ کر آیا ہوگا؟ میرے یہاں جو چوری ہوئی تھی اس میں بھی چور کھپریل ہی سے چڑھ کر آئے تھے۔

اتنے میں بجرنگی آیا۔ سر سے خون بہ رہا تھا۔ بولا۔ ''میں نے اسے بھاگتے دیکھا۔ لاٹھی چلائی۔ اس نے بھی وار کیا۔ میں تو چکر کھا کر گر پڑا۔ پر اس پر بھی ایسا ہاتھ پڑا ہے کہ سر کھل گیا ہو گا۔''

یکایک نایک رام ''ہائے ہائے'' کرتے ہوئے آئے اور زمین پر گر پڑے۔ سارا جسم خون سے لت پت تھا۔

ٹھاکر دین: پنڈا جی۔ کیا تم سے بھی اس کا سامنا ہو گیا کیا؟

نایک رام کی نگاہ بجرنگی کی طرف گئی۔ بجرنگی نے نایک رام کی طرف دیکھا۔ نایک رام نے دل میں کہا۔ پانی کا دودھ بنا کر بیچتے ہو۔ اب یہ ڈھنگ نکالا ہے۔ بجرنگی نے دل میں کہا۔ جاتریوں کو لوٹتے ہو۔ اب محلہ والوں پر ہی ہاتھ صاف کرنے لگے۔

نایک رام: ہاں بھئی۔ یہیں گلی میں تو ملا۔ بڑا بھاری جوان تھا۔

ٹھاکر دین: تبھی تو اکیلے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ میرے گھر میں جو چور بیٹھے تھے وہ سب دیو معلوم ہوتے تھے۔ ایسے ڈیل ڈول کے تو آدمی ہی نہیں دیکھے۔ معلوم

ہوتا ہے۔ تمھارے اوپر ان کا بھرپور ہاتھ پڑا۔

نایک رام : ہاتھ میرا بھی بھرپور پڑا ہے۔ میں نے اسے گرتے دیکھا۔ سر جرور (ضرور) پھٹ گیا ہوگا۔ جب تک پکڑوں نکل گیا۔

بجرنگی : ہاتھ تو میرا بھی ایسا پڑا ہے کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا۔ چاروں شانے چت گرا تھا۔

ٹھاکر دین : کسی جانے ہوئے آدمی کا کام ہے۔ گھر کے بھیدیا بنا کبھی چوری نہیں ہوتی۔ میرے یہاں بھی سبوں نے میری چھوٹی لڑکی کو مٹھائی دے کر گھر کا سارا بھید پوچھ لیا تھا۔

بجرنگی : تھانہ میں جرور رپٹ کرنا۔

بھیرو : رپٹ کر کے تھوڑے ہی رہ جاؤں گا۔ بچہ سے چکی نہ پسواؤں تو کہنا۔ چاہے بک جاؤں پر انھیں بھی پیس ڈالوں گا مجھے سب معلوم ہے۔

ٹھاکردین : مال کا مال لے گیا۔ دو آدمیوں کو چٹیل کر گیا۔ اسی سے میں چوروں کے نگیچ (نزدیک) نہیں گیا تھا۔ دور ہی سے لینا لینا کرتا رہا۔ جان سلامت رہے تو مال پھر آ جاتا ہے۔

بھیرو کو بجرنگی پر شبہ تھا نہ نایک رام پر۔ اسے جگدھر پر شبہ تھا۔ شبہ بھی نہیں۔ یقین تھا۔ جگدھر کے سوا کسی کو نہ معلوم تھا کہ روپے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔جگدھر لٹھیت بھی اچھا تھا۔ وہ پڑوسی ہو کر بھی موقع واردات پر سب سے پیچھے پہنچا تھا۔ یہ سارے وجوہ اس کے شبہ کو مضبوط بناتے تھے؟

یہاں سے لوگ چلے تو راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔ ٹھاکر دین نے کہا۔ کچھ اپنی کمائی کے روپے تو تھے نہیں۔ وہی سورداس کے روپے تھے۔

نایک رام : پرایا مال اپنے گھرمیں آکر اپنا ہو جاتا ہے۔

ٹھاکر دین : پاپ کا ڈنڈا جرور بھوگنا پڑتا ہے۔ چاہے جلدی ہو چاہے دیر۔

بجرنگی : تمھارے چوروں کو تو کچھ ڈنڈ نہ ملا۔

ٹھاکردین : مجھے کون کسی دیوتا کا ایشٹ تھا۔ سورداس کو ایشٹ ہے۔ اس کی ایک کوڑی بھی کسی کو ہجم نہیں ہوسکتی۔ چاہے کتنا ہی چورن کھائے۔ میں تو سرط بند کر کہتاہوں

کہ اگر اس کے گھر کی تلاشی لی جائے تو سب مال بر آمد ہو جائے۔

دوسرے روز منہ اندھیرے بھیرو نے کو توالی میں اطلاع کی۔ دو پہر تک داروغہ جی تفتیش کرنے کے لیے آ پہنچے۔ جگدھر کی خانہ تلاشی ہوئی۔ بھیرو نے سمجھا۔ اس نے مال کہیں چھپا دیا۔ اس دن سے بھیرو کے سر ایک بھوت سا سوار ہوگیا۔ وہ سویرے ہی داروغہ جی کے گھر پہنچ جاتا تمام دن ان کی خدمت کیا کرتا۔ چلم بھرتا پیر دباتا۔ گھوڑے کے لیے گھاس چھیل لاتا۔ تھانہ کے چوکیداروں کی خوشامد کرتا۔ اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا تمام دن اسی چوری کا تذکرہ کیا کرتا۔ کیا کہوں مجھے کبھی ایسی نیند نہ آتی تھی۔ اس دن نہ جانے کیسے سوگیا۔ مگر بندھوا نہ دوں تو نام نہیں۔ دروگا جی تاک میں ہیں۔ اس میں سب روپے ہی نہیں۔اشرفیاں بھی ہیں۔ جہاں بکیں گی۔ بیچنے والا پھورن پکڑا جائے گا۔ رفتہ رفتہ بھیرو کو سارے محلّہ پر شبہ ہونے لگا اور جلتے تو لوگ اس سے پہلے ہی تھے۔ اب سارا محلّہ اس کا دشمن ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخیر میں وہ اپنے گھر والوں پر ہی اپنا غصہ اتارتے۔ سبھاگی پر پھر مار پڑنے لگی۔ تو نے ہی مجھے چوپٹ کیا۔تو اتنی بے کھبر نہ سوتی تو چور کیسے گھرمیں گھس آتا؟ میں دن بھر دوری دوکان کرتا ہوں تو گھر میں پڑے پڑے کیاکیا کرتی ہے؟ اب جہاں سے بنے میرے روپے لا نہیں تو جیتا نہ چھوڑوں گا۔

اب تک اس نے اپنی ماں کا ہمیشہ ادب کیا تھا۔ پر اب اس کو بھی لے دے کرتا۔ ”تو کہا کرتی ہے کہ مجھے رات میں نیند ہی نہیں آتی۔ ساری رات جاگتی رہتی ہوں۔ اس دن تجھے کیسے نیند آ گئی؟“ خلاصہ یہ کہ اس کے دل میں کسی کی عزت، کسی کا اعتبار، کسی کی محبت نہ رہی۔ روپے کے ساتھ ہی اخلاق بھی اس سے یک دم رخصت ہو گیا۔ جگدھر کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ اسے بار بار چھیڑتا کہ یہ کسی طرح گرم پڑے تو اس کی خبرلوں۔ لیکن جگدھر اس سے بچتا رہتا تھا۔ وہ کھلی چوٹیں کرنے کی بہ نسبت چھپی چوٹیں کرنے میں زیادہ ہوشیار تھا۔

ایک روز شام کے وقت جگدھر طاہر علی کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔طاہر علی نے پوچھا۔ ”کیسے چلے جی؟“

جگدھر : آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ آبکاری کے داروگا ابھی مجھ سے ملے

تھے۔ پوچھتے تھے۔ بھیرو گدام پر دوکان رکھتا ہے کہ نہیں؟ میں نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں معلوم۔ تب چلے گئے۔ پر آج کل میں وہ اس کی جانچ کرنے جرور آئیں گے۔ میں نے سوچا۔ کہیں آپ کی بھی سکایت نہ کریں۔ اس لیے دوڑا آیا ہوں۔

طاہر علی نے دوسرے ہی روز بھیرو کو وہاں سے بھگا دیا۔

اس کے کئی دن بعد ایک روز رات کے وقت سور داس بیٹھا کھانا پکا رہا تھا کہ جگدھر نے آ کر کہا۔ "کیوں سورداس۔ تمھاری امانت تو تمہیں مل گئی نا؟"

سورداس نے تجاہل سے کہا۔ "کیسی امانت؟"

جگدھر : وہی روپے جو تمھاری جھونپڑی سے اٹھ گئے تھے۔

سورداس : میرے پاس روپے کہاں تھے؟

جگدھر : اب مجھ سے نہ اڑو۔ رتی رتی بات جانتا ہوں اور خوش ہوں کہ کسی طرح تمھاری چیج (چیز) اس پاپی کے چنگل سے نکل آئی۔ سبھاگی اپنی بات کی پکی ہے۔

سورداس : جگدھر مجھے اس جھمیلے میں نہ گھسیٹو۔ گریب آدمی ہوں بھیرو کے کان میں جرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری جان تو پیچھے لے گا پہلے سبھاگی کا گلا گھونٹ دے گا۔

جگدھر : میں اس سے کہنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔ پر بات ہوئی میرے من کی۔ بچہ نے اتنے دنوں تک حلوائی کی دوکان میں کھوب دادے کا پھاتحہ پڑھا۔ دھرتی پر پاؤں ہی نہ رکھتا تھا۔ اب ہوس ٹھکانے آ جائیں گے۔

سورداس : تم ناہک میری جان کے پیچھے پڑے ہو۔

جگدھر : ایک بار کھل کھلا کر ہنس دو تو میں ہ! جاؤں۔ اپنی گئی ہوئی چیج پاکر لوگ پھولے نہیں سماتے۔ میں تمھاری جگہ ہوتا تو ناچتا، کودتا، گاتا، بجاتا، تھوڑی دیر کے لیے پاگل ہو جاتا۔ اتنا ہنستا اتنا ہنستا کہ پیٹ میں باؤ گولا پڑ جاتا۔ اور تم سونٹھ بنے بیٹھے ہو۔ لے ہنسو تو۔

سورداس : اس بکھت ہنسی نہیں آتی۔

جگدھر : ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ میں تو ہنسا دوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے سورداس کو گدگدانا شروع کیا۔ سورداس زندہ دل آدمی تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ حاسدانہ خوش طبعی کا عجیب نظارہ تھا۔ دونوں تھیٹر کے نقالوں کی طرح

ہنس رہے تھے اور یہ خبر نہ تھی کہ ہنسی کا انجام کیا ہوگا۔ شامت کی ماری سبھاگی اسی وقت بنئے کی دوکان سے جنس لیے ہوئے آ رہی تھی۔ سورداس کے گھر سے بڑے زور کے قہقہے کی آواز سنی تو تعجب ہوا کہ اندھے کنوئیں میں پانی کیسا؟ آکر دروازہ پر کھڑی ہو گئی اور سورداس سے بولی۔ "آج کیا مل گیا ہے سورداس جو پھولے نہیں سماتے؟"

سورداس نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔ "میری تھیلی مل گئی۔ چور کے گھر میں چھچھور بیٹھا۔"

سبھاگی: تو سب مال اکیلے ہجم کر جاؤ گے؟

سورداس: نہیں تجھے ایک کنٹھی لا دوں گا۔ ٹھاکر جی کا بھجن کرنا۔

سبھاگی: اپنی کنٹھی دھر رکھو مجھے ایک سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔

جکدھر: اسے چاہے کنٹھا بنوانا یا نہ بنوانا اس کی بڑھیا کو ایک نتھ ضرور بنوا دینا۔ پوپلے منہ پر نتھ کھوب کھلے گی۔ جیسے کوئی بندریا نتھ پہنے ہو۔

اس پر تینوں نے قہقہہ مارا۔ اتفاقاً بھیرو بھی اسی وقت تا نہ سے چلا آ رہا تھا۔ قہقہے کی آواز سن کر اس نے جھونپڑی کے اندر جھانکا۔ یہ آج کیسے گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ یہ تگڈم دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جیسے کسی نے کلیجہ پر گرم لوہا رکھ دیا ہو۔ غصہ سے پاگل ہوگیا سخت سے سخت فحش سے فحش الفاظ کہے جیسے کوئی سورما اپنی جان بچانے کے لیے اپنے حربہ کا مہلک ترین استعمال کرے۔ "تو بدچلن ہے میرے دشمنوں کے ساتھ ہنستی ہے۔ فاحشہ کہیں کی۔ ٹکے ٹکے پر اپنی آبرو بیچتی ہے۔ کھبردار جو آج سے میرے گھر میں کدم رکھا۔ خون چوس لوں گا۔ اگر اپنی کسل چاہتی ہے تو اس اندھے سے کہہ دے۔ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھائے۔ نہیں تو اس کی اور تیری گردن ایک ہی گنڈا سے کاٹوں گا۔ میں تو ادھر ادھر مارا مارا پھروں۔ اور یہ کل منہی یاروں کے ساتھ نوک جھونک کرے۔ پاپی اندھے کو موت بھی نہیں آتی کہ محلّہ صاف ہو جائے۔ نہ جانے اس کے کرم میں کیا کیا دکھ بھوگنا لکھا ہے۔ شاید جھیل میں چکی پیس کر مرے گا۔"

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ سبھاگی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ معلوم ہوا سر پر بجلی

گر پڑی۔ جگدھر خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی شکاری ہرن کو تڑپتے دیکھ کر خوش ہو۔ کیسا بوکھلا رہا ہے لیکن سورداس؟ آہ۔ اس کی وہی حالت تھی جو کسی پاک باز عورت کی اپنی عصمت دری کے بعد ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد تینوں ساکت کھڑے رہے۔ بالآخر جگدھر نے کہا۔ ''سبھاگی۔ اب تو کہاں جائے گی؟''

سبھاگی نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''اپنے گھر جاؤں گی۔ اور کہاں؟''

جگدھر : بگڑا ہوا ہے۔ جان لے کر چھوڑے گا۔

سبھاگی : چاہے مارے۔ چاہے جلائے۔ گھر تو میرا وہی ہے۔

جگدھر : کہیں اور کیوں نہیں پڑ رہتی؟ گسا (غصہ)اتر جائے تو چلی جانا۔

سبھاگی : تمھارے گھر چلتی ہوں رہنے دو گے؟

جگدھر : میرے گھر؟ مجھ سے تو وہ یوں ہی جلتا ہے۔ پھر تو خون ہی کر ڈالے گا۔

سبھاگی : تمھیں اپنی جان اتنی پیاری ہے تو دوسرا کون اس سے بیر مول لے گا۔

یہ کہہ کر سبھاگی فوراً اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ سورداس نے ہاں، نہیں، کچھ نہ کہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جگدھر بولا۔ ''سورداس تم آج میرے گھر چل کر سو رہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ بھیرو رات کو کوئی اپدر نہ مچائے۔ بدماس آدمی ہے۔ اس کا کون ٹھکانہ؟ مار پیٹ کرنے لگے۔

سورداس : بھیرو کو جتنا نادان سمجھتے ہو اتنا وہ نہیں ہے۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ ہاں سبھاگی کو جی بھر کے مارے گا۔

جگدھر : نسہ میں اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔

سورداس : میں کہتا ہوں۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ تم سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ تم سے لڑائی کرنے کی اسے ہمت نہ پڑے گی۔

جگدھر کا خوف دور تو نہ ہوا مگر سورداس کی طرف سے ناامید ہو کر چلا گیا۔ سورداس ساری رات جاگتا رہا۔ اس بھاری الزام کے بعد اس کو اب وہاں رہنا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اب منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ میں نے تو کبھی کسی سے برائی نہیں کی۔ بھگوان مجھے کیوں یہ ڈنڈ دے

رہے ہیں۔ یہ کن پاپوں کا پر ایشچت کرنا پڑ رہا ہے۔ تیر تھ جاترا سے چاہے یہ پاپ اتر جائے۔ کل کہیں چل دینا چاہیے۔ پہلے بھی بھیرو نے مجھ پر یہی پاپ لگایا تھا۔ تب سارے محلّہ کے لوگ مجھے مانتے تھے۔ اس کی یہ بات ہنسی میں اڑ گئی۔ الٹے لوگوں نے اسی کو ڈانٹا۔ اب کی تو سارا محلّہ میرا دشمن ہے۔ لوگ سچ ہی میں بسواس کر لیں گے۔منہ میں کالکھ لگ جائے گی۔ نہیں اب یہاں سے بھاگ جانے ہی میں کھیریت ہے۔ دیوتوں کی سرن لوں۔ وہی اب میری رچھا کرسکتے ہیں۔ پر بچاری سبھاگی کا کیا حال ہوگا؟ بھیرو اب کی اسے جرور چھوڑ دے گا۔ادھر میں بھی چلا جاؤں گا تو بیچاری کیسے رہے گی؟ اس کے نیہر میں بھی تو کوئی نہیں ہے جوان عورت ہے۔ محنت مجوری کرنہیں سکتی۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ چل کر ایک بار بھیرو سے اکیلے میں ساری باتیں صاف صاف کہہ دوں۔ بھیرو سے میری کبھی صفائی سے بات چیت نہیں ہوئی۔ اس کے من میں گانٹھ پڑی ہوئی ہے۔ من میں میل رہنے ہی سے اس کو میرے اوپر ایسا بھرم ہوتا ہے۔ جب تک اس کا من صاف نہ ہو جائے۔ میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں۔ لوگ کہیں گے کام کیا تھا۔ تبھی تو ڈر کر بھاگا۔ نہ کرتا تو ڈرتا کیوں۔ یہ روپے بھی اسے پھیر دوں مگر جو اس نے پوچھا کہ یہ کہاں ملے تو؟ سبھاگی کا نام نہ بتاؤں گا۔ کہہ دوں گا۔ مجھے جھونپڑی میں رکھے ہوئے ملے۔ اتنا چھپائے بنا سبھاگی کی جان نہ بچے گی۔ لیکن پردہ رکھنے سے صفائی کیسے ہوگی؟ چھپانے کا کام نہیں ہے۔ سب کچھ پورا پورا اور سچ سچ کہہ دوں گا تبھی، تو اس کا من صاف ہوگا۔

اس خیال سے اسے گونہ تشفی ہوئی جیسے شاعر کو الجھے ہوئے مضمون کے موزوں ہوجانے سے ہوا کرتی ہے۔ وہ تڑکے ہی اٹھا اور جاکر بھیرو کے دروازہ پر آواز دی۔ بھیرو سویا ہوا تھا پر سبھاگی بیٹھی رو رہی تھی۔ بھیرو نے اس کے پہنچتے ہی اس کو خوب زود کوب کیا تھا۔ سبھاگی نے سورداس کی آواز پہچانی۔ چونکی کہ یہ اتنے تڑکے میں کیسے آگیا۔ کہیں دونوں میں لڑائی نہ ہو جائے۔ سورداس کتنا طاقتور ہے۔ یہ بات اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ ڈر گئی کہ۔ ”سورداس رات کی باتوں کا بدلہ لینے نہ آیا ہو۔ یوں بڑا گم کھور ہے پر آدمی ہی ہے۔گسا آ گیا ہو گا۔ جھوٹا الجام سن کر گسا آتا ہی ہے۔ کہیں گسے میں آکر انھیں مار نہ بیٹھے۔ پکڑ پائے گا تو پران ہی لے کر چھوڑے

گا۔" سبھاگی بھیرو کی مار کھاتی تھی۔ گھر سے نکالی جاتی تھی۔ لیکن یہ مجال نہ تھی کہ کوئی باہری آدمی بھیرو کو کچھ کہہ کر نکل جائے۔ اس کا منہ نوچ لیتی۔ اس نے بھیرو کو نہ جگایا۔ دروازہ کھول کر پوچھا۔ "کیا ہے سورداس؟ کیا کہتے ہو؟"

سورداس کا دل بے اختیار چاہا اس سے پوچھوں۔ رات کو تجھ پر کیا بیتی۔ لیکن ضبط کر گیا۔ مجھے اس سے واسطہ ؟ اس کی عورت ہے۔ چاہے مارے چاہے دلارے۔ میں کون ہوتا ہوں پوچھنے والا۔ بولا۔ "بھیرو کیا ابھی سوتے ہیں جرا جگا دے۔ ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

سبھاگی : کون بات ہے؟ میں بھی سنوں۔

سورداس : ویسی ہی ایک بات ہے۔ جرا جگا تو دے۔

سبھاگی : اس بکھت جاؤ۔ پھر کبھی آکر کہہ دینا۔

سورداس : دوسرا کون بکھت آئے گا۔ میں سڑک پر جابیٹھوں گا۔ انھیں بہت دیر نہ لگے گی۔

سبھاگی : اور کبھی تو اتنے تڑکے نہ آتے تھے۔ آج ایسی کون سی بات ہے؟

سورداس نے چڑ کر کہا۔ "اسی سے کہوں گا۔ تجھ سے کہنے کی بات نہیں ہے۔"

سبھاگی کو یقین کامل ہو گیا کہ یہ اس وقت آپے میں نہیں ہے۔ ضرور مار پیٹ کرے گا۔ بولی۔ "مجھے مارا پیٹا تھوڑے ہی تھا۔ بس وہیں جو کچھ کہا سنا وہی کہہ سن کر رہ گئے۔"

سورداس : چل تیرے چلانے کی آواز میں نے اپنے کانوں سنی۔

سبھاگی : مارنے کو دھمکاتا تھا۔ بس میں زور سے چلانے لگی۔

سورداس : نہ مارا ہوگا۔ مارتا بھی تو مجھے کیا؟ تو اس کی گھر والی ہے جو چاہے کرے۔ تو جاکر اسے بھیج دے۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ اب بھی سبھاگی نہ گئی تو سورداس نے بھیرو کا نام لے کر زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ کئی ہانکوں کے بعد بھیرو کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟ بیٹھو آتا ہوں۔"

سبھاگی یہ سنتے ہی اندر گئی۔ اور بولی۔ "جاتے ہو تو ایک ڈنڈا لیتے جاؤ۔ سورداس ہے کہیں لڑنے نہ آیا ہو۔"

بھیرو : چل بیٹھ۔ لڑائی کرنے آیا ہے۔ مجھ سے تریا چرتر مت کھیل۔
سبھاگی : مجھے اس کی تیوریاں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی سے کہتی ہوں۔
بھیرو : یہ کیوں نہیں کہتی کہ تو ہی اسے چڑھا کر لائی ہے۔ وہ تو اتنا کینہ نہیں رکھتا۔ اس کے من میں کبھی میل نہیں رہتا۔

یہ کہہ کر بھیرو نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور باہر آیا۔ اندھا شیر بھی ہو تو اس کا کیا خوف؟ اسے تو ایک بچہ بھی مار گرائے گا۔

سورداس نے بھیرو سے کہا۔ "یہاں اور کوئی تو نہیں ہے۔ مجھے تم سے ایک بھید کی بات کہنی ہے۔

بھیرو : کوئی نہیں ہے۔ کہو کیا کہتے ہو؟
سورداس : تمھارے چور کا پتہ مل گیا۔
بھیرو : سچ جوانی کی کسم۔
سورداس : ہاں۔ سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے پاس آکر تمھارے روپے رکھ گیا۔ اور تو کوئی چیج نہیں گئی تھی۔
بھیرو : مجھے جلانے آئے ہو۔ ابھی من نہیں بھرا؟
سورداس : نہیں بھگوان سے کہتا ہوں۔ تمھاری تھیلی میرے گھر میں جوں کی توں پڑی ملی۔
بھیرو : بڑا پاگل تھا۔ پھر چوری کاہے کو کی تھی؟
سورداس : ہاں۔ پاگل ہی تھا اور کیا؟
بھیرو : کہاں ہے؟ جرا دیکھوں تو۔

سورداس نے تھیلی کمر سے نکال کر بھیرو کو دکھائی۔ بھیرو نے لپک کر تھیلی لے لی۔ وہ جوں کی توں بند تھی۔

سورداس : گن لو۔ پورے ہیں کہ نہیں۔
بھیرو : ہیں۔ پورے ہیں۔ سچ بتاؤ کس نے چرایا تھا۔

بھیرو کو روپے ملنے کو اتنی خوشی نہ تھی جتنی چور کے نام معلوم کرنے کی خواہش۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں نے جس پر شک کیا تھا وہی ہے یا کوئی اور۔

سورداس : تم جان کر کیا کروگے۔ تمھیں اپنے مال سے مطلب ہے کہ چور کے نام سے۔

بھیرو : نہیں۔ تمھیں کسم ہے۔ بتا دو ہے تو اسی محلّہ کا نا؟

سورداس : ہاں۔ ہے تو اسی محلّہ ہی کا پر نام نہ بتاؤں گا۔

بھیرو : جوانی کی کسم۔ میں اس سے کچھ نہ کہوں گا۔

سورداس : میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ نا ٔ نہ بتا ؤں گا۔ نام بتا دوں اور تم ابھی دنگا کرنے لگو تب؟

بھیرو : بسواس مانو۔ میں کسی سے نہ بولوں گا۔ جو کسم کہو کھا جاؤں۔ اگر جبان(زبان) کھولوں تو سمجھ لینا کہ اس کی اصل میں پھرک (فرق) ہے۔ بات اورباپ ایک ہے۔ اب اور کون کسم لینا چاہتے ہو؟

سورداس : اگر بات سے پھر گئے تو یہیں تمھارے درواجے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا۔

بھیرو : اپنی جان کیوں دوگے؟ میری جان لے لینا۔ چوں تک نہ کروں گا۔

سورداس : میرے گھر میں ایک بار چوری ہوئی تھی۔ تمھیں یاد ہے نا؟ چور کو ایسا سجھا ہوا ہوگا کہ تم نے میرے روپے لیے ہیں۔ اسی سے اس نے تمھارے یہاں چوری کی۔ اور مجھے روپے لاکر دے دیے۔ بس اس نے میری گریبی پر دیا کی اور کچھ نہیں۔ اس سے میرا اور کوئی ناتا نہیں ہے۔

بھیرو : اچھا۔ یہ سب تو سن چکا۔ نام تو بتاؤ۔

سورداس : دیکھو۔ تم نے کسم کھائی ہے۔

بھیرو : ہاں بھائی۔ کسم سے پھرتا تھوڑے ہی ہوں۔

سورداس : تمھاری گھر والی اور میری بہن سبھاگی۔

اتنا سننا تھا کہ بھیرو جیسے پاگل ہوگیا گھر میں دوڑا ہوا گیا اور ماں سے بولا۔ ”اماں۔ اسی ڈائن نے میرے روپے چرائے تھے۔ سورداس اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ اس طرح میرا گھر موس کر یہ چڑیل اپنے دھنیگڑوں کا گھر بھرتی ہے۔ اس پر مجھ سے اوڑتی تھی۔ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ بتا سورداس جھوٹ کہتا ہے کہ سچ؟“

سبھاگی نے سر جھکا کر کہا۔ "سورداس جھوٹ بولتے ہیں۔"

اس کے منہ سے بات پوری نہ نکلنے پائی کہ بھیرو نے لکڑی کھینچ کر ماری۔ وار خالی گیا۔ اس سے بھیرو کا غصہ اور بھی بڑھا وہ سبھاگی کے پیچھے دوڑا۔ سبھاگی نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بھیرو نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سارے محلہ میں کہرام مچ گیا کہ بھیرو سبھاگی کو مارے ڈالتا ہے۔ لوگ دوڑ پڑے۔ ٹھاکر دین نے اندر جاکر دریافت کیا۔ "کیا ہے بھیرو۔ کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو؟ بھلے آدمی کوئی گھر کے آدمی پر اتنا گسا کرتا ہے۔"

بھیرو : کیسا گھر کا آدمی جی۔ ایسے گھر کے آدمی کا سر کاٹ لینا چاہیے۔ جو دوسروں سے ہنسی دل لگی کرے۔ آخر میں کانا ہوں، کترا ہوں، لنگڑا ہوں، لولا ہوں، مجھ میں کیا عیب ہے جو یہ دوسروں سے ہنسی دل لگی کرتی ہے۔ میں اس کی ناک کاٹ کر تبھی چھوڑوں گا۔ میرے گھر جو چوری ہوئی تھی وہ اسی چڑیل کی کرتوت تھی۔ اسی نے روپے چرا کر سورداس کو دیے تھے۔

ٹھاکر دین : سورداس کو؟

بھیرو : ہاں ہاں سوردس کو باہر تو کھڑا ہے۔ پوچھتے کیوں نہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ اب چوری نہ پچے گی تو لاکر سب روپے مجھے دے گیا ہے۔

بجرنگی : اچھا تو روپے سبھاگی نے چرائے تھے!

لوگوں نے بھیرو کو ٹھنڈا کیا اور باہر کھینچ لائے۔ یہاں سورداس پر رائے زنی ہونے لگی۔ کسی کی ہمت نہ پڑی تھی کہ صاف صاف کہے۔ سب کے سب ڈر رہے تھے کہ کہیں میم صاحب سے شکایت نہ کر دے مگر کنایتاً سبھی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سورداس کو آج معلوم ہوا کہ پہلے کوئی مجھ سے ڈرتا نہ تھا پر دل میں سب عزت کرتے تھے۔ اب سب کے سب مجھ سے ڈرتے ہیں پر میری سچی عزت کسی کے دل میں نہیں ہے۔ اسے اتنی ندامت تھی کہ وہ چاہتا تھا آسمان سے بجلی گرے اور میں یہیں جل بھن جاؤں۔

ٹھاکر دین نے آہستہ سے کہا۔ "سورداس تو کبھی ایسا نہ تھا۔ آج سے نہیں۔ لڑکپن سے دیکھتے ہیں۔"

نایک رام: پہلے نہیں تھا۔ اب ہو گیا ہے۔ اب تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔
ٹھاکردین: بل پاکر تو سبھی کو گھمنڈ ہو جاتا ہے پر سورداس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نہیں دکھائی دیتی۔
نایک رام: چھپارستم ہے۔ بجرنگی۔ مجھے تمھارے اوپر سک تھا۔
بجرنگی: (ہنس کر) پنڈاجی۔ بھگوان سے کہتا ہوں کہ مجھے تمھارے اوپر سک تھا۔
بھیرو: اور مجھ سے جو سچ پوچھو تو جگدھر پر سک تھا۔

سورداس سر جھکائے چاروں طرف کے طعنے سن رہا تھا۔ پچھتا رہا تھا کہ میں نے ایسے نیچ آدمی سے یہ بات کہی کیوں۔ میں نے تو سمجھا تھا صاف صاف کہہ دینے سے اس کا دل صاف ہو جائے گا۔اس کا یہ پھل ملا۔ میرے منہ میں تو کالکھ لگ ہی گئی۔ اس بیچاری کا نہ جانے کیا حال ہو گا۔ بھگوان اب کہاں گئے؟ کیا کتّھا پورانوں ہی میں اپنے سیوکوں کو ابارتے آتے تھے۔ اب کیوں نہیں آکاس سے کوئی دوت آکر کہتا کہ اندھا بے قصور ہے؟

جب بھیرو کے دروازہ پر یہ تماشہ ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا تو سورداس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا۔ اب چپ رہنا اس کے خیال میں بزدلی تھی۔ کمینہ پن تھا۔ ایک پاک صاف عورت پر اتنا کلنک تھوپا جا رہا ہے اور میں چپ چاپ کھڑے سنتا ہوں۔ یہ مہا پاپ ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”یارو کیوں بپت کے مارے ہوئے دکھیا پر یہ کیچڑ پھینک رہے ہو؟ کچھ تو بھگوان سے ڈرو۔ کیاسنسار میں کہیں نیائے نہیں رہا؟ میں نے تو بھل منسی کی کہ بھیرو کے روپے اسے لوٹا دیے۔ اس کا مجھے یہ پھل مل رہا ہے کہ سبھاگی نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں مجھے روپے دیے۔ یہ میں نہ بتاؤں گا۔ لیکن بھگوان میری اس سے بھی جیادہ درگت کریں اگر میں نے سبھاگی کو اپنی چھوٹی بہن کے سوا کبھی کچھ اور سمجھا ہو۔ میرا اپرادھ اتنا ہی ہے کہ وہ رات کو میری جھونپڑی میں آئی تھی۔اس وقت جگدھر وہاں بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھو کہ ہم لوگوں میں کون سی باتیں ہو رہی تھیں۔ اب اس محلّہ میں مجھ جیسے اندھے اپاہج آدمی کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جاتا ہوں پر اتنا کہے جاتا ہوں کہ سبھاگی پر جو کلنک لگائے گا اس کا بھلا نہ ہو گا۔ وہ پاک صاف ہے۔ اسے پاپ لگا کر کوئی سکھ

کی نیند نہیں سو سکتا۔ میرا کون کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے درواجے کھڑا ہو جاؤں گا وہی ایک چٹکی آٹا دے دے گا۔ اب یہاں سے دانہ پانی اٹھتا ہے۔ پر ایک دن آوے گا جب تم لوگوں کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی اور تب تم جانو گے کہ اندھا بے کسور تھا۔"

یہ کہہ کر سور داس اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

(24)

سورداس کی زمین واپس دلا دینے کے بعد صوفیہ پھر مسٹر کلارک سے کھنچ گئی۔ دن گزرتے جاتے تھے۔ اور وہ مسٹر کلارک سے دور تر ہوتی جاتی تھی۔ اس کو اب اپنی سچی محبت کے لیے ذلیل و رسوا ہونے کی بہ نسبت مصنوعی محبت کا سوانگ بھرنا کہیں زیادہ ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ سوچتی تھی کہ میں پانی سے بچنے کے لیے آگ میں کود پڑی۔ فطرت پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے اپنے دل کو جبراً ونے کی طرف سے ہٹانا چاہا تھا اب وہی دل بڑی تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس طرف اس نے بھگتی (زہد) کے متعلق چند کتابیں پڑھی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ اس کے خیالات میں ایک تغیر ہو گیا تھا۔ ذلت و بدنامی کا خوف اس کے دل سے مٹنے لگا تھا۔ اس کے سامنے محبت کا بلند ترین معیار تھا جہاں خودی کی آواز نہیں پہنچتی۔ زاہدِ خشک نے بادۂ احمر کا مزہ پا لیا تھا اور نشہ میں اب اس کو دنیاوی عیش و آرام، عزت و فضیلت سب ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ جن خیالات سے متاثر ہو کر اس نے ونے سے محترز رہنے اور کلارک سے عقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ اب اس کو سراسر غیر فطری معلوم ہوتے تھے۔ رانی جانہوی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اپنے نفس کی تنبیہ کے لیے اس نے اپنے اوپر یہ ظلم گوارا کیا تھا۔ مگر اب اس کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے اطوار میں خرابی کی کون سی بات تھی۔ اس میں ناموزونیت کیا تھی؟ اس کا دل اب اس فیصلہ کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ وہ خود اس فیصلہ کو قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ میں نے ونے کی جگہ پر کلارک کو لا بٹھانے کا فیصلہ کیوں کر کیا؟ مسٹر کلارک میں ذاتی اوصاف کی کمی نہیں۔ وہ قابل ہیں شریف ہیں، فیاض

ہیں، نیک دل ہیں، وہ کسی ایسی عورت کو خوش و خرم رکھ سکتے ہیں جسے دنیاوی عیش و آرام کی تمنا ہو۔ لیکن ان میں وہ ایثار کہاں، وہ خدمت کا جذبہ کہاں، وہ زندگی کا اونچا معیار کہاں، وہ مردانہ عہد کہاں؟ وہ شوق شہادت کہاں؟ اسے اب محبت کی داستانیں اور صوفیانہ رنگ کی نظمیں۔ جیو اور آتما۔ حادث و قدیم۔ تناسخ اور سخاوت وغیرہ وغیرہ ادق مسائل کی توضیح و تشریح کے مقابلے میں زیادہ دل کش معلوم ہوتی تھیں۔ اسی در میان میں اسے کرشن کے سوانحی حالات مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس نے اس اعتقاد کی جڑ ہلا دی جو اسے حضرت عیسیٰ پر تھا۔ وہ دل میں دونوں کا موازنہ کرتی۔ مسیح کے رحم کی بہ نسبت اسے کرشن کی محبت سے زیادہ تسکین ہوتی۔ اس نے اب تک گیتا ہی کے کرشن کو دیکھا تھا۔ اور مسیح کی دیا، خدمت اور پاکیزگی کے سامنے اسے کرشن کی پر اسرار زندگی گیتا کی مشکل فلسفیانہ تشریحات سے بھی زیادہ قابل فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سر گیتا کے اعلیٰ تخیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔ مگر اس سے دل میں بھگتی کا جذبہ نہ پیدا ہوتا تھا۔ کرشن کی طفلانہ زندگی کو اس نے عقیدت مندوں کی فرضی بات سمجھ رکھا تھا۔ اور اس پر غور کرنا ہی فضول سمجھتی تھی۔ لیکن اب عیسیٰ کا رحم کرشن کے طفلانہ کھیلوں کے سامنے بالکل خشک سا معلوم ہوتا تھا۔ عیسیٰ کے رحم میں روحانیت تھی۔ کرشن کی محبت میں جذبہ تھا۔ عیسےٰ کا رحم آسمان کی طرح غیر محدود تھا۔ کرشن کی محبت ایک نو شگفتہ باغ کی طرح دلفریب تھی۔ عیسیٰ کا رحم دریا کا نغمۂ شیریں تھا۔ کرشن کی محبت بنسی کی صبر آزما آواز۔ ایک فرشتہ تھا دوسرا انسان۔ ایک زاہد تھا دوسرا شاعر۔ ایک میں بیداری اور دانائی تھی۔ دوسرے میں رنگینی و دیوانگی۔ ایک تاجر تھا۔ نفع و نقصان پر نگاہ رکھنے والا۔ دوسرا شوقین تھا اپنے نقد و جنس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے والا۔ ایک محتاط تھا تو دوسرا آلودہ۔ اب صوفیہ کا دل ہمیشہ اسی محبت کے کھیل میں محو رہتا تھا۔ کرشن نے اسے فریفتہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی بنسی کی صدا سنا دی تھی۔

مسٹر کلارک کی دلجوئیاں اب اسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری محبت آفرینیاں ایک آزمائش کی تاب بھی نہیں لا سکتی۔ وہ اکثر ان سے بے اعتنائی برتتی۔ وہ باہر سے مسکراتے ہوئے آکر اس کی بغل میں کرسی کھینچ کر

بیٹھ جاتے اور یہ ان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی، نہ دیکھتی۔ یہاں تک کہ کئی بار اس نے اپنی مذہبی بداعتقادیوں سے مسٹر کلارک کے مذہبی دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ انھیں صوفیہ ایک معمہ سی معلوم ہوتی تھی جسے سمجھنے میں وہ قاصر تھے۔ اس کا بے مثال حسن، اس کا دلفریب انداز، اس کی غیر معمولی ذہانت، جتنے زور سے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اتنا ہی اس کی تمکنت۔ آزاد خیالی اور بے باکی۔ انھیں خائف کر دیتی تھیں۔اس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ اپنی پستی کو محسوس کرتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ انھیں معلوم ہوتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے اتنی بے تکلفی کے باوجود بھی انھیں اس سے شادی کا وعدہ لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مسز سیوک آگ میں ایندھن ڈالتی رہتی تھیں۔ ایک طرف کلارک کو اکساتیں۔ دوسری طرف صوفی کو سمجھاتیں۔ ”تو سمجھتی ہے کہ زندگی میں ایسے موقع بار بار آتے ہیں مگر یہ تیری غلطی ہے۔ انسان کو صرف ایک موقع ملتا ہے اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔“

مسٹر جان سیوک نے بھی اپنے پدر بزرگوار کے حسب الحکم دورخی چال چلنا شروع کر دی۔ وہ پوشیدہ طور سے تو راجہ مہیندر کمار سنگھ کی کل گھماتے رہتے مگر ظاہر میں مسٹر کلارک کی خاطر و مدارت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ رہے مسٹر ایشور سیوک۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ خدا نے صوفیہ کو مسٹر کلارک ہی کے لیے بنایا ہے۔ یہ اکثر ان کے یہاں جاتے تھے اور وہیں کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ جیسے کوئی دلال گاہک کو دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے اور اسے کسی دوسری دوکان پر بیٹھنے نہیں دیتا، ویسے ہی وہ مسٹر کلارک کو گھیرے رہتے تھے کہ کوئی اونچی دوکان انھیں متوجہ نہ کرے۔ مگر اتنے خیر خواہوں کے رہتے ہوئے بھی مسٹر کلارک کو اپنی کامیابی مشکل معلوم ہوتی تھی۔

صوفیہ کو ان دنوں بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ اب تک اس نے مانگ چوٹی یا زیور اور لباس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی۔ تن آسانیوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ مذہبی کتب کے یہی تعلیم تھی کہ جسم فانی ہے اور دنیا بے ثبات اور زندگی سراب کی طرح ہے۔ پس اس کے لیے آرائش و زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اصلی آرائش کچھ اور ہی

ہے۔ اسی پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ لیکن اب وہ زندگی کو اس قدر حقیر نہ سمجھتی تھی۔ اس کے حسن میں کبھی اتنی شانِ رعنائی نہ تھی۔ وہ بننے ٹھننے کے لیے کبھی اتنی بے قرار نہ تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں کسی دیوتا کی دعا کی طرح نو نہالان باغ کے دلوں کو شگفتہ کر رہی تھی۔ صوفیہ ایک کنج میں کھڑی خود بہ خود مسکرا رہی تھی کہ مسٹر کلارک کا موٹر آ پہنچا۔ وہ صوفیہ کو باغ میں دیکھ کر سیدھے اس کے پاس گئے اور ایک التفات طلب نظر سے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیہ نے منہ پھیر لیا۔ گویا اس نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا نہیں۔

یکایک ایک لمحہ کے بعد صوفیہ نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ ''آج کتنے مجرموں کو سزا دی؟''

مسٹر کلارک خفیف ہوئے۔ رکتے ہوئے بولے۔ ''پیاری یہ تو روز کی باتیں ہیں۔ ان کا کیا چرچا کروں؟''

صوفیہ : تم یہ کیسے تحقیق کرتے ہو کہ فلاں مجرم در اصل مجرم ہے؟ اس کا تمھارے پاس کوئی آلہ ہے۔

کلارک : گواہ تو رہتے ہیں۔

صوفیہ : گواہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں؟

کلارک : ہرگز نہیں۔ گواہ اکثر جھوٹے اور سکھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

صوفیہ : اور انھیں گواہوں کے بیان پر فیصلہ کرتے ہو؟

کلارک : اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟

صوفیہ : تمھاری بے چارگی دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالے ؟ اس لیے کہ تمھارے واسطے موٹر کار، بنگلہ، خانسامے، طرح طرح کی شرابیں اور تفریح کے دیگر ساز و سامان مہیا کیے جائیں؟

کلارک نے خفت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''تو کیا ملازمت سے استعفے دے دوں؟''

صوفیہ : جب تم جانتے ہو کہ موجودہ طرز حکومت میں اتنی خامیاں ہیں تو تم اس کا ایک رکن بن کر بے گناہوں کا خون کیوں کرتے ہو؟

کلارک : پیاری میں نے اس بارہ میں کبھی غور نہیں کیا۔

صوفیہ : اور بلا غور کیے ہی روز انصاف کا خون کیا کرتے ہو؟ کتنے بیدرد ہو!

کلارک : ہم تو صرف ایک مشین کے پرزہ ہیں ہمیں اتنا سوچنے سے کیا مطلب؟

صوفیہ : کیا تمھیں اس کا یقین ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟

کلارک : ایسا دعویٰ کوئی انسان نہیں کرسکتا۔

صوفیہ : تو تم اس لیے سزا سے بچے ہوئے ہو کہ تمھارے جرم پوشیدہ ہیں؟

کلارک : ایسا قبول کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً قبول کرنا ہی پڑے گا۔

صوفیہ : تعجب ہے کہ خود مجرم ہو کر تمھیں دیگر مجرموں کو سزا دیتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی!

کلارک : صوفیہ اس کے لیے تم پھر کبھی میری توہین کر لینا۔ اس وقت مجھے ایک خاص معاملہ میں تم سے صلاح لینی ہے۔ خوب سوچ کر رائے دینا۔ راجہ مہیندر کمار نے میرے فیصلہ کا اپیل گورنر کے یہاں کیا تھا۔ اس کا ذکر تو میں تم سے کر ہی چکا ہوں۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا گورنر اپیل پر توجہ نہ دیں گے۔ ایک حاکم ضلع کے خلاف کسی رئیس کی مدد کرنا ہمارے طرز حکومت کے خلاف ہے کیوں کہ اس سے حکومت میں خلل آتا ہے۔ لیکن چھ سات مہینوں میں واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی ہے اور راجہ صاحب نے اپنی خاندانی عزت، مستقل ارادہ اور استدلالی قوت سے ایسی اچھی طرح کام لیا ہے کہ اب گورنر کا فیصلہ شاید میرے خلاف ہوگا۔ کونسل میں ہندوستانیوں کی کثرت ہو جانے کے باعث اب گورنر کی ذاتی رائے کی اہمیت بہت کم ہوگئی۔ اگر چہ وہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر سکتے ہیں مگر اس اختیار سے وہ خاص حالتوں ہی میں مدد لے سکتے ہیں۔ اگر راجہ صاحب کا اپیل واپس کر دیا گیا تو دوسرے روز ملک بھر میں کہرام مچ جائے گا اور اخبارات کو غیر ملکی حکومت کے ایک نئے ظلم پر شور مچانے کا وہ موقع مل جائے گا جسے وہ روز کھوجتے رہتے ہیں۔ اس لیے گورنر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اگر راجہ صاحب کی اشک شوئی کردی جائے۔ تو تمھیں کچھ ملال تو نہ ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دوں ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔

صوفیہ : کیا رائے قائم کرنا اتنا مشکل ہے؟

کلارک : ہاں۔ اس لیے مشکل ہے کہ رائے عامہ سے حکومت کرنے کا جو بندو بست ہم لوگوں نے خود ہی کیا ہے اسے پیروں تلے کچلنا برا معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کتنا ہی طاقتور ہو لیکن انصاف کا پردہ رکھنے کے لیے کبھی کبھی اسے بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ میرے لیے کوئی بات نہیں۔ فیصلہ میرے موافق ہو یا خلاف۔ میرے اوپر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ رعایا پر ہمارے انصاف کی دھاک اور بیٹھی جاتی ہے۔ (مسکرا کر) گورنر نے مجھے اس جرم کے لیے سزا بھی دی ہے۔ وہ مجھے یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔

صوفیہ : کیا تمھیں اتنا دبنا پڑے گا؟

کلارک : ہاں۔ میں ایک ریاست کا پولیٹکل ایجنٹ بنا دیا جاؤں گا۔ یہ عہدہ بڑے مزہ کا ہے۔ راجہ تو صرف نام کے لیے ہوتا ہے۔ پورا اختیار تو ایجنٹ ہی کو رہتا ہے۔ ہم لوگوں میں جو بڑے خوش نصیب ہیں۔ انھیں کو یہ منصب ملتا ہے۔

صوفیہ : تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔

مسٹر کلارک اس طنز سے دل ہی میں کڑھ کر رہ گئے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ صوفیہ یہ خبر سن کر پھولی نہ سمائے گی اور جبھی مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہاں سے جانے کے پہلے ہمارا عقد ہو جانا ضروری ہے۔ ”تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو“ اس بیدردانہ طنز نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس جملہ میں وہ مغائرت وہ طنز وہ بے اعتنائی بھری ہوئی تھی۔ جو دوستانہ دلجوئی کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ سوچنے لگے کہ اس کی رائے کا انتظار کیے بغیر ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ کہیں یہی بات تو اسے بری نہیں لگی؟ شاید سمجھتی ہو کہ یہ اپنے ذاتی فائدے سے اتنا خوش ہو رہے ہیں مگر اس بیکس اندھے کی انھیں ذرا بھی پرواہ نہیں کہ اس پر کیا گزرے گی۔ اگر یہی کرنا تھا تو یہ راگ ہی کیوں چھیڑا تھا۔ یہ سوچ کر وہ بولے۔ ”یہ تو تمھارے فیصلہ پر منحصر ہے۔“ صوفیہ نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ”ان معاملات میں تم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہو۔“

کلارک : اس اندھے کا خیال ہے۔

صوفیہ نے بے رحمی سے کہا۔ ''اس اندھے کے خدا تمھیں نہیں ہو۔''

کلارک : میں تم سے صلاح پوچھتا ہوں اور تم مجھی پر چھوڑتی جاتی ہو۔

صوفیہ : اگر میری صلاح سے تمھارا نقصان ہو تو؟

کلارک نے دلیری سے جواب دیا۔ ''صوفیہ۔ میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمھارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

صوفیہ : (ہنس کر) اس کے لیے میں تمھاری بہت ممنون ہوں۔

اسی اثنا میں مسز سیوک وہاں آ گئیں اور کلارک سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ صوفیہ نے دیکھا اب مسٹر کلارک کو بتانے کا موقع نہیں رہا۔ تو اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ دیکھا تو پربھوسیوک وہاں بیٹھے ہوئے ہیں صوفیہ نے کہا۔ ''ان حضرت کو اب یہاں سے بوریا بندھنا سنبھالنا پڑے گا۔ کسی ریاست کے ایجنٹ ہوں گے۔''

پربھوسیوک : (چونک کر) کب؟

صوفیہ : بہت جلد۔ راجہ مہیند کمار انھیں لے بیتے۔

پربھوسیوک : تب تو تم بھی یہاں تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہو۔

صوفیہ : میں ان سے شادی نہ کروں گی۔

پربھوسیوک : سچ؟

صوفیہ : ہاں میں کئی دن سے یہ فیصلہ کر چکی ہوں پر تم سے کہنے کا موقع نہیں ملا۔

پربھوسیوک : کیا ڈرتی تھیں کہ کہیں میں شور نہ مچا دوں؟

صوفیہ : بات تو واقعی یہی تھی۔

پربھوسیوک : میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ پر اس قدر بے اعتباری کیوں کرتی ہو؟ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے تمھاری بات کسی سے نہیں کہی۔

صوفیہ : معاف کرنا پربھو۔ نہ جانے کیوں مجھے تمھارے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ تم میں ابھی کچھ ایسا لڑکپن ہے۔کچھ ایسے کھلے ہوئے بے فکر آدمی ہو کہ میں تم سے کوئی بات کہتے اسی طرح ڈرتی ہوں جیسے کوئی شخص درخت کے نازک شاخ پر پیر رکھتے ڈرتا ہے۔

پربھوسیوک : اچھی بات ہے۔ یوں ہی مجھ سے ڈرا کرو۔ واقعی میں کوئی بات سن لیتا

ہوں تو میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں۔اور جب تک کسی سے کہہ نہ دوں مجھے چین ہی نہیں آتا۔ خیر میں تمھیں اس فیصلہ پر مبارک باد دیتا ہوں۔ میں نے تم سے صاف طور پر تو کبھی نہیں کہا مگر کئی بار کنا یتاً کہہ چکا ہوں کہ مجھے کسی حالت میں کلارک کو اپنا بہنوئی بنانا پسند نہیں ہے۔ مجھے جانے کیوں ان سے چڑ ہے۔ وہ بے چارے میری بہت خاطر کرتے ہیں مگر میر اجی ان سے نہیں ملتا۔ ایک بار میں نے ان کو اپنی ایک نظم سنائی تھی۔ اسی دن سے مجھے ان سے کچھ چڑ ہو گئی ہے بیٹھے سونٹھ بنے سنتے رہے۔ گویا میں کسی دوسرے آدمی سے باتیں کر رہا ہوں۔شعریت سے کچھ مس ہی نہیں۔ انھیں دیکھ کر بس یہی دل میں آتا ہے کہ خوب بناؤں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو اپنا کلام سنایا ہو گا مگر ونے جیسا سخن شناش کوئی نہیں ملا۔ اگر وہ کچھ لکھیں تو خوب لکھیں۔ شعریت گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔

صوفیہ : تم ادھر کبھی کنور صاحب کی طرف نہیں گئے تھے؟

پربھوسیوک : آج گیا تھا اور وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔ ونے سنگھ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اودے پور کے حاکموں نے انھیں جیل میں ڈال رکھا ہے۔

صوفیہ کے چہرہ پر غصہ یا رنج کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس نے یہ نہ پوچھا کہ کیوں گرفتار ہوئے۔ کیا قصور تھا؟ یہ ساری باتیں اس نے اٹکل سے معلوم کرلیں۔ صرف اتنا پوچھا۔ ”رانی صاحبہ تو وہاں نہیں جا رہی ہیں؟“

پربھو سیوک : نہیں۔ کنور صاحب اور ڈاکٹر گنگولی دونوں جانے کو تیار ہیں مگر رانی کسی کو نہیں جانے دیتیں کہتی ہیں کہ ونے اپنی مدد آپ کرسکتا ہے۔ اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

صوفیہ تھوڑی دیر تک گہری سوچ بچار میں خاموش بیٹھی رہی۔ ونے کی مردانہ صورت اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ یکایک اس نے سر اٹھایا اور طے شدہ طریقہ پر بولی۔ ”میں اودے پور جاؤں گی۔“

پربھو سیوک : وہاں جاکر کیا کروگی؟

صوفیہ : یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہاں جاکر کیا کروں گی۔ اگر اور کچھ نہ کرسکوں گی تو کم از کم جیل میں رہ کر ونے کی خدمت تو کرسکوں گی۔ اپنی جان تو ان پر قربان کر

دوں گی۔ میں نے ان کے ساتھ جو بے وفائی کی ہے۔ خواہ کسی ارادہ سے کی ہو۔ وہ ہر وقت میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی ہے۔ اس سے ان کو جو رنج ہوا ہو گا اس کا خیال آتے ہی میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔اب میں اس گناہ کا کفارہ کروں گی کسی اور طریقہ پر نہیں تو اپنی جان دے کر۔

یہ کہہ کر صوفیہ نے کھڑکی سے جھانکا تو مسٹر کلارک ابھی تک کھڑے مسز سیوک سے باتیں کر رہے تھے۔موٹر بھی کھڑا تھا۔ وہ فوراً باہر آکر مسٹر کلارک سے بولی۔ ''ولیم آج ماما ہی سے باتیں کرنے میں رات ختم کر دوگے؟ میں سیر کرنے کے لیے تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔''

لہجہ کتنا شیریں تھا۔ کسی دلربایانہ انداز سے، کنول جیسی آنکھوں میں دلفریب ہنسی کا کتنا جادو بھر کر یہ محبت آمیز التجا کی گئی تھی۔ کلارک نے معذرت آمیز نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھا۔ یہ وہی صوفیہ ہے جو ابھی ذرا دیر پہلے میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ اس وقت پانی پر آسمان کا تاریک عکس تھا۔ اب اسی پانی پر چاند کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ اسی لہراتے ہوئے پانی کا کانپتا ہوا ہنستا ہوا اور شوخی سے بھرا ہوا جلوہ اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ وہ نادم ہو کر بولے۔ ''پیاری معاف کرو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ باتوں میں دیر ہو گئی۔''

صوفیہ نے ماں کی طرف سادگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ماما دیکھتی ہو ان کی بے رخی۔ یہ ابھی سے مجھ سے تنگ آگئے ہیں۔ میری اتنی یاد بھی نہ رہی کہ ایک بار تو رفع شکایت ہی کے لیے پوچھ لیتے۔ سیر کرنے چلے گی۔''

مسز سیوک : ہاں۔ ولیم! یہ تمھاری زیادتی ہے۔ آج صوفیہ نے تمھیں آلودہ ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ میں تمھیں بے خطا سمجھتی اور صرف اسی کو خطاوار۔

کلارک نے کچھ مسکرا کر اپنی خفت مٹائی اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر کی طرف چلے۔ مگر اب بھی انھیں شک تھا کہ میرے ہاتھ میں نازک کلائی ہے وہ در اصل کوئی شے ہے یا محض خواب و خیال۔ معمہ اور بھی پیچیدہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔یہ کوئی بندر نچانے والی مداری ہے یا کوئی معصوم بچہ جو بندر کو دور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے مٹھائی دیتا ہے مگر بندر کے نزدیک آتے ہی خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

جب موٹر چلا تو صوفیہ نے کہا۔ ''پولیٹکل ایجنٹ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ چاہے تو ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کر سکتا ہے۔ کیوں؟''

کلارک نے خوش ہو کر کہا۔ ''اس کا اختیار سب جگہ۔ یہاں تک کہ راجہ کے محل کے اندر بھی ہوتا ہے۔ریاست کا ذکر ہی کیا وہ راجہ کے کھانے سونے آرام کرنے کا وقت تک معین کر سکتا ہے۔ راجہ کس سے ملے۔ کس سے دور رہے۔ کس کی عزت کرے۔ کس کی بے عزتی کرے۔ یہ سب باتیں ایجنٹ کے اختیار میں ہے۔ وہ یہاں تک طے کر سکتا ہے کہ راجہ کی میز پر کون کون سے کھانے آئیں گے۔ راجہ کے لیے کتنے اور کیسے کپڑوں کی ضرورت ہو گی۔ یہاں تک کہ وہ راجہ کی شادی کے متعلق بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ بس یہی سمجھو کہ وہ ریاست کا خدا ہوتا ہے۔''

صوفیہ : تب تو وہاں سیر و تفریح کے لیے بھی کافی موقع ملے گا۔ یہاں کی طرح تمام دن دفتر میں تو نہ بیٹھنا پڑے گا؟

کلارک : وہاں کیسا دفتر۔ ایجنٹ کا کام دفتر میں بیٹھنا نہیں ہے۔ وہ وہاں ملک معظم کا قائم مقام ہوتا ہے۔

صوفیہ : اچھا تم جس ریاست میں چاہو جا سکتے ہو؟

کلارک : ہاں صرف پہلے سے کچھ خط و کتابت کرنی پڑے گی۔ تم کون سی ریاست پسند کرو گی۔

صوفیہ : مجھے تو کوہستانی علاقوں سے خاص انس ہے پہاڑوں کے دامن میں بسے ہوئے گاؤں۔ پہاڑوں کی گود میں چرنے والی بھیڑیں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشار۔ یہ سبھی مناظر مجھے شعریت سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کوئی دوسری ہی دنیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پر سکون و دلکش کوہستان میرے لیے ایک دلکش خواب ہے۔ پہاڑوں میں کون کون سی ریاستیں ہیں؟

کلارک : بھرت پور۔ جودھپور۔ کشمیر۔ اودے پور ...

صوفیہ : بس تم اودے پور کے لیے لکھو۔ میں نے تاریخ اودے پور کی جوش بھری داستانیں پڑھی ہیں اور جبھی سے مجھے اس علاقے کے دیکھنے کا شوق ہے۔ وہاں کے راجپوت کتنے بہادر، کتنے آزادی پسند، کتنے آن پر جان دینے والے ہوتے تھے۔ لکھا

ہے کہ چتوڑ میں جتنے راجپوت شہید ہوئے ان کے زناروں کا وزن پچھتر من تھا۔ کئی ہزار راجپوتنیاں ایک ساتھ جتا میں جل کر خاک ہو گئیں۔ ایسی بات پر مٹ جانے والی ہستیاں دنیا میں شاید ہی اور کہیں ہوں۔

کلارک : ہاں یہ واقعات میں نے بھی تاریخوں میں دیکھے ہیں۔ ایسی جانباز قوم کی جتنی بھی عزت کی جائے، کم ہے۔ اسی لیے تو اودے پور کا راجہ ہندو راجاؤں میں افضل ترین سمجھاجاتا ہے۔ ان کی بہادری کی داستانیں بہت کچھ مبالغہ آمیز ہیں۔ پھر بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس ملک میں ایسی جاں باز دوسری قوم نہیں۔

صوفیہ : تم آج ہی اودے پور کے لیے لکھو اور ممکن ہو تو ہم لوگ ایک ماہ کے اندر وہاں کو روانہ ہو جائیں۔

کلارک : لیکن۔۔۔ کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے۔۔۔ تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی۔۔۔ یہاں سے چلنے کے قبل میں تم سے وہ دیرینہ۔۔۔ میری زندگی۔۔۔

صوفیہ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔ اسے ظاہر کرنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ اتنی کوتاہ فہم نہیں ہوں لیکن میری قوتِ فیصلہ نہایت سست ہے۔ یہاں تک کہ سیر کرنے کے لیے جانے کا فیصلہ بھی گھنٹوں تک سوچنے کے بعد ہی کر سکتی ہوں۔ ایسے اہم معاملہ میں جس کا تعلق عمر بھر رہے گا۔ میں اتنی جلد کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ میں ہنوز یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھ جیسی بے فکر اور آزاد خیال عورت متاہلانہ زندگی کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ولیم میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ خانہ داری کی زندگی سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے تم جب تک میرے مزاج سے بخوبی واقف نہ ہو جاؤ۔ میں تمھارے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا کر کے تمھیں مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ ابھی میری اور تمھاری ملاقات صرف ایک سال سے ہے۔ اب تک میں تمھارے لیے ایک سر بستہ راز ہوں۔ کیوں ہے یا نہیں۔“

کلارک : ہاں۔ صوفیہ۔ واقعی میں تمھیں بخوبی نہیں پہچان پایا ہوں۔

صوفیہ : پھر ایسی حالت میں تمھیں سوچو کہ ہم دونوں کا رشتۂ عقد میں بندھ جانا کتنی بڑی نادانی ہے میرے دل کی جو پوچھو تو مجھے ایک نیک دل، شریف، خوش فہم اور

خوش اخلاق شخص کے ساتھ دوست بن کر رہنا اس کی بیوی بن کر رہنے کے مقابلے میں کم پر لطف نہیں معلوم ہوتا۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن میں زن و شوہر کے تعلق کو دو دلوں کے ملاپ کی بہترین صورت نہیں خیال کرتی۔ میں باہمی رہائش و ہمدردی کو نفس پرستی والے تعلقات سے بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں۔

کلارک : مگر جماعتی اور مذہبی رسم و رواج ایسے تعلقات کو۔۔۔

صوفیہ : ہاں ایسے تعلقات فطرت کے منافی ہوتے ہیں اور معمولاً ناقابل عمل۔ میں بھی اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کا اصول بنانے کو تیار نہیں ہوں لیکن جب تک ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں۔ جب تک ہمارے باطن ایک دوسرے کے سامنے آئینہ نہ بن جائیں۔ اس وقت تک میں اسی قسم کے تعلقات کو ضروری خیال کرتی ہوں۔

کلارک : میں تمھاری مرضی کا غلام ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے بغیر میری زندگی وہ مکان ہے جس میں مکین نہیں۔ وہ چراغ ہے جس میں روشنی نہیں۔ وہ شعر ہے جس میں تاثیر نہیں۔

صوفیہ : بس بس۔ یہ عاشقانہ گفتگو صرف عشقیہ کتب کے لیے زینت بخش ہے۔ یہ لو، پانڈے پور آگئے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ سورداس چلا گیا ہوگا۔ یہ حال سنے گا تو اس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

کلارک : اس کی پرورش کا کوئی اور بندو بست کر دوں۔

صوفیہ : اس زمین سے اس کی پرورش نہیں ہوتی تھی۔ صرف محلّہ کے مویشی چرا کرتے تھے۔ وہ غریب ہے۔ بھکاری ہے پر لالچی نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی ولی اللہ معلوم ہوتا ہے۔

کلارک : اندھے ذہین اور خدا ترس ہوتے ہیں۔

صوفیہ : مجھے اس سے خاص عقیدت ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو پاپا نے کام شروع کر دیا۔ اگر انھوں نے راجہ کی پیٹھ نہ ٹھونکی ہوتی تو انھیں تمھارے سامنے آنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

کلارک : تمھارے پاپا نہایت چالاک ہوشیار ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کامیاب ہوتے

ہیں۔ کم از کم میں تو یہ دو رخی چال نہ چل سکتا۔
صوفیہ : دیکھ لینا۔ دو ہی چار برسوں کے اندر اس محلّہ میں کار خانہ کے مزدوروں کے مکانات ہوں گے۔ یہاں کا تو ایک آدمی نہ بھی رہنے پائے گا۔
کلارک : پہلے تو اس اندھے نے بڑا شور و غل مچایا تھا۔ دیکھیں اب کیا کرتا ہے۔
صوفیہ : مجھے تو یقین ہے کہ وہ خاموش کبھی نہ بیٹھے گا۔ خواہ اس زمین کے ساتھ اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔
کلارک : نہیں صوفیہ ایسا ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ جس روز یہ نوبت آئے گی۔ سب سے پہلے سورداس کے لیے میری زبان سے "جے" کی آواز نکلے گی اور سب سے پہلے میرے ہاتھ اس پر پھول برسائیں گے۔

صوفیہ نے کلارک کو آج پہلی ہی بار عزت و محبت کی نظر سے دیکھا۔

(25)

سال بھر تک راجہ مہندر کمار اور مسٹر کلارک میں متواتر جنگ ہوتی رہی۔ کاغذ کا تختہ میدانِ کارزار تھا اور صف بستہ سورماؤں کے بجائے سورداس سے کہیں زیادہ طاقت ور دلیلیں، منوں سیاہی بہہ گئی۔ کتنے ہی قلم کام آئے۔ دلیلیں کٹ کٹ کر راون کی فوج کی طرح پھر زندہ ہوجاتی تھیں۔ راجہ صاحب بار بار ہمت ہار جاتے۔ سرکار سے مقابلہ کرنا چیونٹی کا ہاتھی سے مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن مسٹر جان سیوک اور ان سے بھی زیادہ اندو انھیں ڈھارس دیتی رہتی تھیں۔ شہر کے رئیسوں نے ہمت سے کم اور خود غرضانہ دانشمندی سے زیادہ کام لیا۔ اس عرض داشت پر جسے ڈاکٹر گنگولی نے باشندگانِ شہر کی جانب سے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لیے لکھا تھا۔ دستخط کرنے کے وقت زیادہ تر لوگ بیمار ہو گئے اور اس قدر زیادہ بیمار ہو گئے کہ ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ کوئی تیرتھ جاترا کرنے چلا گیا۔ کوئی کسی نہایت ضروری کام سے کہیں باہر روانہ ہو گیا۔ جو گنے گنائے لوگ کوئی بہانہ نہ کر سکے وہ بھی دستخط کرنے کے بعد مسٹر کلارک سے معافی مانگ آئے۔ "حضور نہ جانے اس میں کیا کیا لکھا تھا۔ ہمارے سامنے تو صرف سادہ کاغذ آیا تھا۔ ہم سے یہی کہا گیا کہ یہ پانی

کا محصول گھٹانے کی درخواست ہے۔ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ اس سادہ کاغذ پر بعد کو حضور کی شکایت لکھی جائے گی تو ہم بھول کر بھی قلم نہ اٹھاتے۔" ہاں جن بڑے لوگوں نے سگریٹ کمپنی کے حصے لیے تھے انھیں مجبور ہو کر دستخط کرنا ہی پڑے۔ اگر چہ دستخط کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر ڈاکٹر گنگولی کو کونسل میں سرکار سے سوال کرنے کا ایک حیلہ مل گیا۔ انھوں بڑے حوصلہ اور استقلال کے ساتھ سوالوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کونسل میں ڈاکٹر صاحب کا خاص احترام ہوتا تھا۔ کتنے ہی ممبروں نے ان کے سوالات کی تائید کی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گنگولی کی ایک تجویز پر کثرت رائے کی وجہ سے سرکار کو ہار ماننی پڑی۔ اس تجویز سے لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو جگہ جگہ سرکار پر بد اعتقادی ظاہر کرنے کے لیے جلسے ہونے لگے۔ رئیسوں اور زمینداروں کی تو خوف کے سبب زبان بند تھی۔ لیکن درمیانی طبقہ کے لوگوں نے کھلے الفاظ اس زبر دستی کی مخالفت کرنا شروع کی۔ کنور بھرت سنگھ ان کے سرغنہ بنے اور وہ صاف صاف کہنے لگے کہ اب ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ہماری نجات اپنے ہی ہاتھوں ہوگی مہندر کمار بھی در پردہ اس جماعت کا دل بڑھانے لگے۔ ڈاکٹر گنگولی کی بہت کچھ تشفی دینے پر بھی حکام پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ مایوسی ضعف سے پیدا ہوتی ہے مگر وہ خود قوت کو پیدا کرتی ہے۔

رات کو نو بج گئے تھے ونے سنگھ کی گرفتاری و قید کی خبر پاکر کنور صاحب نے اپنے احباب کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر گنگولی، جان سیوک، پربھوسیوک، راجہ مہیندر کمار اور دیگر اصحاب آئے ہوئے تھے۔ اندو بھی راجہ صاحب کے ہمراہ آئی تھی اور اپنی والدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ کنور صاحب نے نایک رام کو بلا بھیجا تھا اور وہ کمرہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تمباکو مل رہا تھا۔ مہیندر کمار بولے "ریاستوں پر سرکار کا بڑا دباؤ ہے۔ وہ بالکل بے دست و پا ہیں اور سرکار کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور۔"

بھرت سنگھ نے کہا۔ جس سے کسی کا فائدہ نہ ہو اور جس کا وجود مضرت رسانی ہی پر مبنی ہو۔ اس کا نام و نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ غیر ملکی لوگوں

کے ہاتھوں ظلم و تشدد کا آلہ بن کر زندہ رہنے کی بہ نسبت تو مر جانا ہی بہتر ہے۔
ڈاکٹر گنگولی : وہاں کا حاکم لوگ کھود (خود) کھراب ہے۔ ڈرتا ہے کہ ریاست میں اچھے اور نِڈرتا کے کھیال (خیال) پھیلیں گے تو ہم رعایا کو کیسے لوٹے گا۔راجہ لوگ مسند لگا کر بیٹھا رہتا ہے اور اس کا نوکر چاکر من مانا راج کرتا ہے۔

جان سیوک نے غیر جانبدارانہ طریقہ پر کہا۔ ”سرکار کسی ریاست کو ظلم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتی۔ ہاں چوں کہ وہ کمزور ہیں اور اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتیں اس لیے ایسے کاموں کے کرنے پر ضرورت سے بھی زیادہ تیار ہو جاتی ہیں۔ جن سے وہ سمجھتے ہیں کہ سرکار بہادر خوش ہوگی۔“
بھرت سنگھ : ونے کتنا سلیم، کتنا متواضع کتنا خلیق ہے۔ یہ آپ لوگوں سے مخفی نہیں۔ میں اسے باور ہی نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

پربھوسیوک کنور صاحب کے منہ لگے ہوئے تھے۔ اب تک جان سیوک کے خوف سے نہ بولے تھے۔ پر اب نہ رہا گیا۔ بولے۔ ”کیوں۔ کیا پولیس سے چوروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ کیا سادھوؤں سے بدکاروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ اور پھر کیا گائے جیسی بے زبان و مفید مخلوق کا خون بہانے والے لوگ دنیا میں نہیں ہیں۔ ونے نے مظلوم کسانوں کی خدمت کرنی چاہی تھی۔ اسی خدمت کا انھیں یہ صلہ ملا ہے۔ رعایا کے صبر و برداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے اور ہوتی بھی ہے۔ اس سے متجاوز ہوکر قانون قانون ہی نہیں رہ جاتا۔ اس وقت اس قانون کی خلاف ورزی کرنا ہی ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہوجاتا ہے۔ اگر آج ضروری علم دے کر سب لوگ منہ میں کالکھ لگا کر نکلیں تو اس حکم کا نہ ماننا ہمارا فرض ہو جائے گا اودے پور کے دربار کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کرے۔“
ڈاکٹر گنگولی : اودے پور کا دربار ایسا حکم دے سکتا ہے۔ اس کا اکھتیار ہے۔
پربھوسیوک : میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ جس حکم کی بنیاد محض حیوانی طاقت پر ہو اسی کی تعمیل ضروری نہیں۔ اگر اودے پور میں کوئی ذمہ دار سرکار ہوتی اور وہ کثرت رائے سے ایسا حکم نافذ کرتی تو دوسری بات تھی۔ مگر جب کہ رعایا کی جانب سے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود ونے سنگھ کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے

تو محض حکام کی جبر پسندی ہمیں ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔
راجہ صاحب نے ادھر ادھر خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی میرا دشمن تو نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ جان سیوک بھی تیوریاں بدلنے لگے۔

ڈاکٹر گنگولی: ہم دربار سے لڑ تو نہیں سکتا۔

پربھو سیوک: رعایا کو اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ تو کر سکتے ہیں۔

بھرت سنگھ: اس کا نتیجہ بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دربار گورنمنٹ سے مدد لے گا۔ مفت ہزاروں بے کسوں کا خون ہو جائے گا۔

پربھو سیوک: جب تک ہم خون سے ڈرتے رہیں گے۔ ہمارے حقوق بھی ہمارے پاس آنے سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کی حفاظت بھی تو خون ہی سے ہوگی۔ میدان سیاست میدان جنگ سے کم خطرناک نہیں ہے اس میں اتر کر خون سے ڈرنا محض بزدلی ہے۔

جان سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ بولے۔ ”تم جیسے پر جوش نوجوانوں کو ایسے پیچیدہ سیاسی معاملات پر کچھ کہنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب تول لینا چاہیے۔ یہ موقع تدبّر اور دور اندیشی سے کام لینے کا ہے۔“

پربھوسیوک نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ تدبّر بزدلی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: میری رائے میں گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن جانا چاہیے۔

بھرت سنگھ: گورنمنٹ کہہ دے گی۔ ہمیں دربار کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔

مہیندر کمار: دربار ہی کو کیوں نہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے۔

جان سیوک: ہاں یہی میری بھی صلاح ہے۔ ریاست کے خلاف شورش کرنا ریاست کو کمزور بنا دیتا ہے اور رعایا کو سرکش۔ ریاست کا اقتدار ہر ایک حالت میں قائم رہنے دینا ضروری ہے ورنہ اس کا انجام وہی ہو گا جو آج جمہوریت و مساوات کے عالم گیر نظارہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دنیا نے تین صدیوں تک جمہوریت کی آزمائش کی اور بالآخر

اس سے نا امیدی ہو گئی۔ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس آگ کی لپٹ ابھی تک اس ملک میں نہیں پہنچی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم آیندہ بھی اس سے محفوظ رہیں۔

کنور بھرت سنگھ جمہوریت کے گو نہ معتقد تھے۔ اپنے اصول کی تردید ہوتے دیکھ کر بولے۔ ”پھوس کا جھونپڑا بنا کر آپ آگ کی لپٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ لپٹ کے باہر سے نہ آنے پر بھی گھر ہی کی ایک چنگاری اڑ کر اس پر گر پڑے۔ آپ جھونپڑا رکھیے ہی کیوں؟ جمہوریت حکومت کا بلند ترین معیار نہ سہی مگر دنیا ابھی تک اس سے بہتر طرز حکومت نہیں بتلا سکی۔ خیر جب یہ طے ہو گیا کہ ہم دربار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تو بجز صبر اور کیا چارہ ہے۔ میں سیاسی معاملات سے الگ رہنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اس سے کوئی نفع نہیں۔ آزادی کی قیمت خون ہے۔ جب ہم میں اس کے دینے کی طاقت ہی نہیں تو ہم بے فائدہ کمر کیوں باندھیں۔ پینترے کیوں بدلیں خم کیوں ٹھونکیں۔ سب سے الگ تھلگ رہنے میں بھلائی ہے۔“

پربھو سیوک : یہ تو بہت مشکل ہے کہ آنکھوں سے اپنا گھر لٹتے دیکھیں اور زبان نہ کھولیں۔

بھرت سنگھ : ہاں بہت مشکل ہے۔ مگر اپنے نفس پر قابو رکھنا ہو گا۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ ہم کلہاڑی کا دستہ نہ بنیں۔ دستہ کلہاڑی کی مدد نہ کرے تو کلہاڑی سخت اور تیز ہونے پر بھی ہمیں سخت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم علم ثروت یا دولت کے زعم میں حکومت کا دایاں ہاتھ بن کر رعایا کا گلا کاٹیں۔ اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم بھی حاکم ہیں۔

جان سیوک : تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ سے حکومت کے سہارے رہا ہے اور رہے گا۔ حکومت سے منحرف ہو کر وہ اپنی ہستی کو نہیں مٹا سکتا۔

بھرت سنگھ : یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ جب تک حکومت سے وابستہ رہے گا۔ ہم اپنے معیار کے قریب ذرا بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ اس کو اپنے لیے تھوڑے بہت تھوڑے دنوں کے لیے کوئی دوسرا سہارا کھوجنا پڑے گا۔

راجہ مہیندر کمار بغلیں جھانک رہے تھے کہ یہاں سے کھسک جانے کا کوئی موقع

مل جائے۔ اس تصفیہ کو تمام کرنے کے ارادہ سے بولے۔ "تو آپ لوگوں نے کیا تجویز کیا۔ دربار کو وفد روانہ کیا جائے گا؟"

ڈاکٹر گنگولی : وہ کھود (خود) جاکر ونے کو چھوڑ لائے گا۔

بھرت سنگھ : اگر قصاب ہی سے جان بخشی کی بھیک مانگنا ہے۔ تو پھر خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ کم از کم بات تو بنی رہے گی۔

ڈاکٹر گنگولی : پھر وہی Pessimism (دائمی یاس) کا بات۔ ہم ونے کو سمجھا کر اسے یہاں آنے پر راضی کرے گا۔

رانی جانھوی نے ادھر آتے ہوئے اس جملہ کے آخری الفاظ سن لیے۔ تمکنت آمیز لہجہ میں بولیں۔ "نہیں ڈاکٹر گنگولی۔ آپ ونے پر اتنی مہربانی نہ کیجیے۔ یہ اس کی پہلی آزمائش ہے۔ اس میں اسے مدد دینا اس کے مستقبل کو تباہ کرنا ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے اسے کسی سے دبنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے جان کی خوف سے اس ناانصافی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو سب سے پہلے میں ہی اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگا دوں گی۔"

رانی کے جوش بھرے الفاظ نے حاضرین کو متحیر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیوی آسمان سے یہ پیغام سنانے کے لیے اتر آئی ہے۔

ایک منٹ کے بعد کنور بھرت سنگھ نے رانی کے الفاظ کا مطلب بتلایا۔ میری رائے میں ابھی ونے سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ اس کی آزمائش ہے۔ انسان بڑے سے بڑا کام جو کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے ضمیر کی آزادی کے لیے مر مٹے۔ یہی انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ ایسے ہی امتحانوں میں کامیاب ہو کر ہمیں وہ درجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم پر قوم اعتبار کر سکے۔

ڈاکٹر گنگولی : رانی ہمارا دیوی ہے۔ ہم ان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پر دیوی لوگوں کا بات دنیا والوں کے بیوہار کرنے جوگ (قابل) نہیں ہو سکتا۔ ہم کو پورا امید ہے کہ ہمارا سرکار ضرور بولے گا۔

رانی : سرکار کی انصاف پسندی کی ایک مثال تو آپ کے سامنے ہی ہے اگر اب بھی آپ کو اس پر اعتبار ہو تو میں بھی کہوں گی کہ آپ کو کچھ دنوں تک کوئی دوا استعمال

کرنی پڑے گی۔

ڈاکٹر گنگولی : دو چار دن میں یہ بات معلوم ہو جائے گا۔سرکار کو بھی تو اپنی نیک نامی بدنامی کا ڈر ہے۔

مہندر کمار : بہت دیر کے بعد بولے۔ ''راہ دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہماری امید اتنی سخت جان نہیں ہے۔''

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کنور صاحب نے پوچھا۔ ''کون صاحب ہیں؟''

ٹیلی فون سے : ''میں ہوں پران ناتھ۔ مسٹر کلارک کا تبادلہ ہوگیا۔''

کنور صاحب نے پوچھا۔ ''کہاں کو؟''

ٹیلی فون سے جواب ملا۔ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں۔ ''گریڈ کم کر دیا گیاہے؟''

ڈاکٹر گنگولی : اب بولیے میرا بات سچ ہوا کہ نہیں۔ آپ لوگ کہتا تھا۔ گورنمنٹ کا نیت بگڑا ہوا ہے پر ہم کہتا تھا کہ اس کو ہمارا بات ماننا پڑے گا۔

مہندر کمار : اجی پران ناتھ مسخرا ہے۔آپ سے دل لگی کر رہا ہوگا۔

بھرت سنگھ : نہیں۔ اس نے تو مجھ سے کبھی دل لگی نہیں کی۔

رانی : سرکار نے اتنی اخلاقی جرأت سے شاید پہلی ہی بار کام کیا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی : اب وہ جمانا (زمانہ) نہیں ہے جب گورنمنٹ پبلک اوپینین (رائے عامہ) کا انسلٹ (توہین) کر سکتا تھا۔اب کونسل کا بات اس کو ماننا پڑے گا۔

بھرت سنگھ : زمانہ تو وہی ہے اور گورنمنٹ کے طرز عمل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی سیاسی راز ہے۔

جان سیوک : ایوانِ تجارت نے میری تجویز کو منظور کر کے گورنمنٹ کے چھکے چھڑا دیے۔

مہیندر کمار : میرا ڈیپوٹیشن بڑے موقع سے پہنچا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی : میں نے کونسل کو ایسا بالکل ہی ایک کر دیا تھا کہ ہم کو اتنا بڑا میجارٹی کبھی نہ ملا۔

اندو، رانی کے پیچھے کھڑی تھی۔ بولی۔ ''عرضداشت پر میری ہی کوشش سے

اتنے آدمیوں کے نام درج ہوئے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ اسی کی کرامات ہے۔"

نایک رام اب تک چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ٹیلی فون کی بات ان کی سمجھ میں آئی اب انھیں معلوم ہوا کہ لوگ کامیابی کا سہرا اپنے اپنے سر باندھنے کی فکر میں ہیں۔ ایسے موقع پر بھلا وہ کب چوکنے والے تھے۔ بولے "سرکار یہاں بھی گاپھل بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ سول سارجنٹ کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ راجہ صاب کی طرف سے پورا ایک ہجار (ہزار) لٹھیت جوان تیار بیٹھا ہوا ہے۔ ان کا حکم بحال نہ ہوا تو کھون کھرابا(خون خرابہ) ہوجائے گا۔ سہر میں طوپھان آ جائے گا۔ انھوں نے لاٹ صاحب سے یہ بات جرور ہی کہی ہوگی۔"

مہیندر کمار : میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تمھاری دھمکیوں ہی کی برکت ہے۔

نایک رام۔ دھرما وتار، دھمکیاں کیسی۔ کھون کی ندی بہہ جاتی۔ آپ کا ایسا اکبال ہے کہ چاہوں تو ایک بار سہر لٹوا دوں۔ یہ لال صاپھے رکھے رہ جائیں۔

پربھوسیوک نے تمسخر سے کہا۔ "سچ پوچھئے تو یہ اس نظم کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے ہندوستان ریویو میں چھپوائی تھی۔"

رانی : پربھو۔ تم نے یہ چپت اچھی لگائی۔ ڈاکٹر گنگولی اپنا سر سہلا رہے ہیں کیوں کہ ڈاکٹر پڑی یا نہیں۔ ایک ایسی حقیر کامیابی پر آپ لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ اسے فتح نہ سمجھئے۔ یہ در اصل شکست ہے جو آپ کو منزلِ مقصود سے کوسوں دور ہٹا دیتی ہے۔ آپ کے گلے میں پھندے کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ باجے والے سردی میں باجے کو آگ پر سینکتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس میں سے اچھی آواز نکلے۔ آپ لوگ بھی سینکے جا رہے ہیں۔ اب ضربوں کے لیے پیٹھ مضبوط کر لیجیے۔

یہ کہتی ہوئی رانی جانھوی اندر چلی گئیں۔ مگران کے جاتے ہی ان کی تنبیہ کا اثر بھی جاتا رہا۔لوگ پھر وہی راگ الاپنے لگے۔

مہیندر کمار : کلارک صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی : اب اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ لوگ کتنا انصاپھ کرتا ہے۔

جان سیوک : اب ذرا اس اندھے کی بھی خبر لینی چاہیے۔

نایک رام : صاحب۔ اسے ہار جیت کا کوئی کھیال نہیں ہے۔ اس جمین کی دس گنی بھی مل جائے تو بھی وہ اسی طرح رہے گا۔

جان سیوک : میں کل ہی سے مل میں کام لگا دوں گا۔ ذرا مسٹر کلارک کو بھی دیکھ لوں۔

مہیندر کمار : میں تو ایڈریس نہ دوں گا۔ ان کی طرف سے کوشش تو ہوگی مگر بورڈ کی میجارٹی میرا ساتھ دے گی۔

ڈاکٹر گنگولی : ایسا حاکم لوگ کو ایڈریس دینے کا کام نہیں ہے۔

مہیندر کمار کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کہ اندو کو بھی یہ خوش خبری سناؤں۔ یوں تو وہ نہایت متین آدمی تھے مگر اس فتح نے ایک طفلانہ جوشِ مسرت پیدا کر دیا تھا۔ نشہ کا سا عالم تھا۔ رانی کے چلے جانے کے ذرا دیر بعد وہ خوش خوش ہنستے ہوئے نادانستہ طور پر اکڑتے ہوئے غرور سے سر اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندو، رانی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑی ہو کر بولی۔ ''آخر صاحب بہادر کو بوریا بندھنا سنبھالنا پڑا نہ؟''

مہیندر کمار سنگھ رانی صاحبہ کے سامنے اپنی کم ظرفانہ مسرت کا اظہار نہ کر سکے۔ بولے۔ ''ہاں۔ اب تو ٹلنا ہی پڑے گا۔''

اندو : اب کل میں ان لیڈی صاحبہ کی ذرا مزاج پرسی کروں گی جو زمین پر قدم نہ رکھتی تھیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھیں۔ بلا کر دعوت کروں؟

مہیندر کمار : کبھی نہ آئے گی اور ضرورت ہی کیا ہے؟

اندو : ضرورت کیوں نہیں ہے جھینپے گی تو۔ سر تو نیچا ہو جائے گا۔ نہ آئے گی نہ سہی۔ اماں آپ نے تو دیکھا ہے۔ صوفیہ پہلے کتنی غریب اور ملنسار تھی لیکن کلارک سے شادی کی بات چیت ہوتے ہی دماغ عرشِ معلےٰ پر چڑھ گیا۔

رانی نے متانت سے کہا۔ ''بیٹی یہ تمھارا وہم ہے۔ صوفیہ مسٹر کلارک سے کبھی شادی نہ کرے گی۔ اگر میں انسان کو کچھ پہچان سکتی ہوں تو دیکھ لینا۔ میری بات صحیح ہوتی ہے یا نہیں۔''

اندو : اماں۔ کلارک سے اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے در پردہ و شادی بھی ہو

گئی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو۔ دونوں کیسے گھلے ملے رہتے ہیں؟

رانی : کتنے ہی گھلے ملے رہیں۔ مگر ان کی شادی نہ ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ میں اپنی تنگ نظری کے سبب صوفیہ کو کتنی ہی سبک سمجھوں۔ مگر واقعی وہ ایک وفا شعار عورت ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ اسے خفیف کر کے تم پچھتاؤ گی۔

اندو : اگر وہ اتنی نیک ہے تو وہ آپ کے بلانے پر ضرور ہی آئے گی۔

رانی : ہاں مجھے یقین کامل ہے۔

اندو : تو بلا لیجئے۔ مجھے دعوت کا انتظام کیوں کرنا پڑے۔

رانی : تم یہاں بلا کر اسے خفیف کرنا چاہتی ہو۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ اگر وہ عیسائن نہ ہوتی تو آج کے پانچویں برس میں اس سے ونے کی شادی کرتی اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی۔

اندو کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ ذرا دیر میں مہیندر کمار بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ کوئی لڑکا کھیل میں جیت کر بھی اتنا بد مست نہ ہوتا ہوگا۔

ادھر دیوان خانہ میں بھی مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔جب تخلیہ ہوگیا تو کنور صاحب نے نایک رام کو بلا کر کہا۔ پنڈا جی میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ کرو گے؟"

نایک رام : سرکار حکم ہو تو سر دینے کو حاضر ہیں۔ ایسی کوئی بات ہے۔ بھلا!

کنور : دیکھو۔ دنیاداری نہ کرو۔ میں جو کام لینا چاہتا ہوں وہ سہل نہیں ہے۔ زیادہ وقت زیادہ عقل زیادہ طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔جان کا بھی خطرہ ہے۔ اگر دل اتنا مضبوط ہو تو ہاں کرو ورنہ صاف صاف جواب دے دو۔ میں کوئی جاتری نہیں ہوں جس پر تمھیں اپنی دھاک بٹھانا ضروری ہو۔ میں تمھیں جانتا ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو۔ اس لیے صاف گفتگو ہونی چاہیے۔

نایک رام : سرکار۔ آپ سے دنیاداری کر کے بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ آپ کا نمک تو روئیں روئیں میں پیوست ہو رہا ہے۔ اگر میرے بس کی بات ہوگی تو پوری کروں گا چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ آپ کے حکم کی دیر ہے۔

کنور : ونے کو چھڑا کر لا سکتے ہو۔
نایک رام : سرکار اگر جان دے کر بھی لا سکوں گا تو کوتاہی نہ کروں گا۔
کنور : تم جانتے ہو۔میں نے تم سے یہ سوال کیوں کیا ہے، میرے یہاں سینکڑوں آدمی ہیں خود ڈاکٹر گنگولی جانے کو تیار ہیں۔ مہیندر کو بھیجوں تو وہ بھی چلے جائیں گے۔ لیکن ان لوگوں کے سامنے میں اپنی بات نہیں بگاڑنا چاہتا۔ سر پر یہ الزام نہیں لینا چاہتا کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہوا ہوں پر بیٹے کی محبت نہیں مانتی۔ ہوں تو انسان ہی۔کاٹھ کا کلیجہ تو نہیں ہے۔کیسے صبر کروں ؟ اسے بڑے بڑے ارمانوں سے پالا ہے۔ وہی ایک زندگی کا سہارا ہے۔ تم اُسے کسی طرح اپنے ساتھ لاؤ۔ اودے پور کے عملے دیوتا نہیں ہیں۔ انھیں لالچ دے کر جیل میں جاسکتے ہو۔ ونے سے مل سکتے ہو اور عملوں کی مدد سے انھیں باہر بھی لاسکتے ہو۔ اتنا کرنا تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے ونے کو آنے پر راضی کرنا۔ اُسے تمھاری عقل و ہوشیاری پر چھوڑتا ہوں۔ اگر تم میری دردناک حالت سے انھیں بخوبی واقف کرسکوگے تو مجھے یقین ہے کہ وہ چلے آئیں گے۔ بولو۔ کرسکتے ہو یہ کام؟ اس کا محنتانہ ایک بڈھے باپ کی دعا کے علاوہ اور جو کچھ تم چاہوگے وہ پیش کیا جائے گا۔
نایک رام : مہاراج کل چلاجاؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو ان کو ساتھ لاؤں گا نہیں تو منہ نہ دکھاؤں گا۔
کنور : نہیں۔ پنڈا جی۔ جب انھیں معلوم ہوجائے گا کہ میں کتنا پریشان ہوں تو وہ چلے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کی جان کو اپنے اصول پر قربان نہ کریں گے۔ اُن کی لیے میں نے اپنی زندگی کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ یہ فقیروں کا بھیس لیا ہے۔ کیا وہ میرے لیے اتنا بھی نہ کریں گے۔ پنڈا جی سوچو! جس آدمی نے ہمیشہ مخملی بستروں پر آرام کیا ہو، اُسے اس کاٹھ کے تخت پر آرام مل سکتا ہے؟ ونے کی محبت ہی وہ جادو ہے جس کے بس میں ہوکر میں یہ کٹھن تپسیا کر رہا ہوں۔ جب ونے نے تیاگ (ترک) کا برت لے لیا (عہد کرلیا) تو پھر میں کس منہ سے اس بڑھاپے کی عمر میں عیش وآرام کی زندگی بسر کرتا۔ یہ سب کانٹے رانی جانھوی کے بوئے ہوئے ہیں۔ اُس کے آگے میری کچھ نہیں چلتی۔ میرا سُرگ (بہشت) اسی کے کارن نرک (دوزخ) بن

رہا ہے۔ اسی کے کارن میرا پیارا ونے میرے ہی ہاتھوں سے نکالا جاتا ہے۔ ایسا ہونہار بیٹا کھو کر یہ دنیا میرے لیے نرک ہوجائے گی۔ تم کل جاؤ گے؟ منیم سے جتنے روپے چاہو لے لو۔

نایک رام : آپ کے اکبال سے کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ آپ کی دیا چاہیے۔ آپ نے اتنے پرتاپی (اقبالمند) ہوکر جو تیاگ کیا ہے وہ کوئی دوسرا کرتا تو آنکھیں نکل پڑتیں۔ سب کچھ چھوڑ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہاں تو گھر میں بھونی بھانگ نہیں۔ جاتریوں کی سیوا ٹہل نہ کریں تو بھوجن کا ٹھکانا بھی نہ ہو پر بوٹی (بھنگ) کی ایسی چاٹ پڑگئی ہے کہ ایک دن نہ ملے تو دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ کوئی آپ کی طرح کیا کھاکے تیاگ کرے گا۔

کنور : یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تم گئے تو ونے کو لے کر ہی لوٹوگے۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمھیں کیا دچھنا (رخصتانہ) دوں؟ تمھاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

نایک رام : سرکار کی دیا بنی رہے۔ میرے لیے یہ کچھ کم نہیں ہے۔

کنور : تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرا کام نہیں کرنا چاہتے۔

نایک رام : سرکار ایسی بات نہ کہیں، آپ مجھے پالتے ہیں۔ آپ کا حکم نہ مانوں گا تو بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور پھر آپ کا کام کیسا۔ یہ تو اپنا ہی کام ہے۔

کنور : نہیں بھئی۔ میں تمھیں مفت میں اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہ سب سے بڑا سلوک ہے جو تم میرے ساتھ کررہے ہو۔ میں بھی تمھارے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا ہوں جسے تم سب سے بڑا سمجھتے ہو۔ تمھارے کتنے لڑکے ہیں؟

نایک رام نے سر جھکا کر کہا۔ ''دھرماتا اوتار۔ ابھی تو بیاہ ہی نہیں ہوا۔''

کنور : ارے یہ کیا بات ہے؟ آدھی عمر گزر گئی اور ابھی بن بیاہے بیٹھے ہو!

نایک رام : سرکار۔ تکدیر (تقدیر) کے سوا اور کیا کہوں۔

ان الفاظ میں اتنی رقت انگیز مایوسی بھری ہوئی تھی کہ کنور صاحب پر نایک رام کی دیرینہ اور دلی خواہش روشن ہوگئی۔ بولے۔ ''تو تم گھر میں اکیلے ہی رہتے ہو؟''

نایک رام : ہاں دھرماوتار۔ بھوت کی طرح اکیلا ہی پڑا رہتا ہوں۔ آپ کے اکبال سے دوہرے درجے کا گھر ہے باگ بگیچے ہیں۔ گائیں بھینسیں ہیں پر رہنے والا کوئی

نہیں۔ بھوگنے والا کوئی نہیں۔ ہماری برادری میں انھیں کا بیاہ ہوتا ہے جو بڑے بھاگوان ہوتے ہیں۔

کنور: (مسکراکر) تو تمھارا بیاہ کہیں ٹھہرا دوں؟

نایک رام: سرکار۔ ایسی تکدیر کہاں؟

کنور: تقدیر میں بنا دوں گا مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کنیا بہت اونچے کل (خاندان) کی ہو؟

نایک رام: سرکار۔ کنیاؤں کے لیے اونچا نیچا کُل نہیں دیکھا جاتا۔ کنیا اور گئو تو پاک ہیں۔ براہمن کے گھر میں آکر اور بھی پاک ہوجاتے ہیں۔ پھر جس نے دان لیا اس نے دنیا بھر کا پاپ ہجم کیا تو پھر عورت کی کیا بات ہے۔ جس کا بیاہ نہیں ہوا۔ سرکار اس کی جندگانی دوکوڑی کی ہے۔

کنور: اچھی بات ہے۔ ایشور نے چاہا تو لوٹتے ہی دولھا بنوگے۔ تم نے پہلے کبھی اس کی چرچا ہی نہیں کی۔

نایک رام: سرکار۔ یہ بات آپ سے کیا کہتا۔ اپنے میل جول والوں کے سوا اور کسی سے نہیں کہی۔ کہتے لاج آتی ہے۔ جو سنے گا وہ سمجھے گا کہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہے۔ کئی بار لباریوں کی باتوں میں آکر سینکڑوں روپے گنوائے۔ اب کسی سے نہیں کہتا۔ بھگوان کے آسرے بیٹھا ہوں۔

کنور: تو کس گاڑی سے جاؤ گے؟

نایک رام: ہجور۔ ڈاک گاڑی سے چلا جاؤں گا۔

کنور: ایشور کرے۔ جلد لوٹو۔ میری آنکھیں تمھاری طرف لگی رہیں گی۔ یہ لو خرچ کے لیے لیتے جاؤ۔

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب نے اپنے محاسب کو بلا کر اُس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے نایک رام کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنی گدی پر بیٹھ کر بولا۔ ”بولو، کتنا ہمارا اور کتنا تمھارا۔“

نایک رام: کیا یہ بھی کوئی دچھنا ہے؟

محاسب: رقم تو تمھارے ہاتھ آتی ہے۔

نایک رام : میرے ہاتھ نہیں آرہی ہے۔ ونے سنگھ کے پاس بھیجی جارہی ہے۔ بچہ مصیبت میں بھی مالک سے نمک حرامی کرتے ہو۔ ان پر تو مصیبت پڑی ہے اور تمھیں اپنا گھر بھرنے کی دھن ہے۔ تم جیسے لالچیوں کو تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی نہ ملے۔

محاسب نے شرمندہ ہوکر نوٹوں کا ایک پلندہ نایک رام کو دے دیا۔ نایک رام نے نوٹوں کو گن کر کمر میں باندھا اور محاسب سے کہا "میری کچھ دچھنا دلاتے ہو؟"

محاسب : کیسی دِچھنا؟

نایک رام : نکد روپیوں کی۔ نوکری پیاری ہے کہ نہیں؟ جانتے ہو نا کہ یہاں سے نکال دیے جاؤگے تو کہیں بھیک بھی نہ ملے گی۔ اگر بھلا چاہتے ہو تو پچاس روپیوں کی گڈی بائیں ہاتھ سے ادھر بڑھا دو نہیں تو جاکر کنور صاحب سے سب جڑے دیتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤگے۔ جانتے ہو کہ نہیں، رانی جی کو؟ نکالے بھی جاؤگے اور گردن بھی ناپی جائے گی۔ ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ چندیا گنجی ہوجائے گی۔

محاسب : گرو۔ اب یاروں ہی سے یہ گیدڑ بھبکی ! اتنے روپے مل گئے۔ کون کنور ونے سنگھ رسید لکھے دیتے ہیں۔

نایک رام : روپے لاتے ہو کہ نہیں۔ بولو چٹ پٹ؟

محاسب : گرو۔ تم تو......

نایک رام : روپے لاتے ہو کہ نہیں؟ یہاں باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ چٹ پٹ سوچو۔ میں چلا۔ یاد رکھو۔ کہیں بھیک بھی نہ ملے گی۔

محاسب : تو یہاں میرے پاس روپے کہاں ہیں؟ یہ تو سرکاری رقم ہے۔

نایک رام : اچھا تو عندالطلب (رقعہ) لکھ دو۔

محاسب : گرو۔ ذرا ادھر دیکھو۔ غریب آدمی ہوں۔

نایک رام : تم گریب ہو بچا۔ حرام کی کوڑی کھا کر موٹے پڑ گئے ہو۔ اس پر گریب بنتے ہو۔ لکھو چٹ پٹ۔ کنور صاحب جرا بھی مروت نہ کریں گے۔ یوں ہی مجھے اتنے روپے دلا دیے ہیں۔ بس میرے کہنے بھر کی دیر ہے۔ گبن کا مکدما چل جائے گا۔ بیٹا سمجھیے؟ لاؤ باپ کی پوجا کرو۔ تم جیسے لوگ روج توڑے سے ہی پھنستے ہیں۔

محاسب نے نایک رام کے تیوریوں سے بھانپ لیا کہ اب یہ دچھنا لیے بغیر نہ چھوڑے گا۔ چپکے سے پچیس روپے نکال کر ان کے ہاتھ دے دیے اور بولا۔ ''پنڈت۔ اب دیا کرو۔ زیادہ نہ ستاؤ۔''

نایک رام نے روپے مٹھی میں کیے اور بولے۔ ''لو بچہ۔ اب کسی کو نہ ستانا۔ میں تمھاری ٹوہ میں رہوں گا۔''

نایک رام چلے گئے تو محاسب نے دل میں کہا— ''لے جاؤ۔ سمجھ لیں گے کہ خیرات کیا۔''

کنور بھرت سنگھ اس وقت دیوان خانہ کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ آج ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں لطف نہ تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے طنزیہ نگاہوں کی طرح دل میں کھٹکتے تھے۔ سامنے درختوں کے کنج میں سے ونے سنگھ کی خیالی صورت۔ ''تاریک و دردناک آواز کی طرح لرزاں اور دھوئیں کی طرح پریشان، یوں نکلتی ہوئی جیسے کسی دُکھ بھرے دل سے آہ کی صدا نکلتی ہے۔ کنور صاحب چند منٹ تک کھڑے روتے رہے۔ ونے کے لیے اِن کے دل سے طرح طرح دعائیں نکل رہی تھیں۔ جیسے علی الصباح گوشہ افق سے طلوع ہوتے ہوتے آفتاب کی ہلکی ٹھنڈی اور خوشگوار کرنیں نکلتی ہیں۔

حصہ دوم

(26)

اراولی کی سرسبز جھومتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں جسونت نگر اس طرح منہ چھپائے ہوئے ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں۔ ماں کی چھاتی سے دودھ کی دھاریں جوش محبت سے بے قرار ابلتی، میٹھے سُروں میں گاتی نکلتی ہیں اور بچہ کے ننھے سے منہ میں سما کر نیچے بہہ جاتی ہیں۔ صبح کی سنہری شعاعوں میں نہا کر ماں کا چہرہ نکھر گیا ہے اور بچہ بھی آنچل سے منہ نکال نکال کر ماں کے ماتا بھرے چہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ مگر ماں بار بار اسے آنچل سے ڈھک لیتی ہے کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔

دفعتا توپ کے دغنے کی کرخت آواز سنائی دی۔ ماں کا دل دہل گیا۔ بچہ گود سے چمٹ گیا۔ پھر وہی مہیب آواز۔ ماں کانپ اٹھی۔ بچہ سمٹ گیا۔

پھر تو لگاتار توپیں چھوٹنے لگیں۔ ماں کے چہرہ پر خوف کے بادل چھاگئے۔ آج ریاست کے نئے پولیٹکل ایجنٹ یہاں آرہے ہیں۔ انھیں کے خیر مقدم میں سلامیاں اتاری جارہی ہیں۔

مسٹر کلارک اور صوفیہ کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا۔ جاگیرداروں کی ملاقاتوں، دعوتوں، نذرانوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ آپس میں کچھ بات چیت ہو۔ صوفیہ بار بار وِنے سنگھ کا تذکرہ کرنا چاہتی۔ مگر نہ تو اسے موقعہ ہی ملتا اور نہ یہی سوجھتا کہ کس طرح تذکرہ کروں۔ آخر جب پورا مہینہ ختم ہو گیا تو ایک روز اس نے کلارک سے کہا۔ ''ان خاطرداریوں کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا اور برسات گذری جارہی ہے۔ اب یہاں جی نہیں لگتا ۔ اب پہاڑی علاقوں کی سیر کرنی چاہیے۔ پہاڑیوں میں خوب بہار ہوگی۔'' مسٹر کلارک بھی راضی ہوگئے۔ ایک ہفتہ سے دونوں ریاست کی سیر کر رہے ہیں۔ ریاست کے دیوان سردار نیل کنٹھ راؤ بھی ہمراہ ہیں۔ جہاں یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے ان کا خیر مقدمِ ہوتاہے۔ سلامیاں دی جاتی ہیں۔ ایڈریس ملتے ہیں۔ خاص خاص مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ مدرسوں، شفاخانوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ صوفیہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ

قیدیوں کو ان کے کھانے کے مقامات کو نیز قید خانہ کے قواعد کو نہایت توجہ سے دیکھتی ہے اور قیدخانوں کی حالت میں اصلاح کرنے پر ملازموں سے خاص زور دیتی ہے۔ آج تک بدنصیب قیدیوں کی طرف کسی ایجنٹ نے بھی کبھی توجہ نہ کی تھی۔ان کی حالت قابل افسوس تھی۔ انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا کہ اس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر صوفیہ کی متواتر مساعی سے ان کی حالت سدھرنے لگی ہے۔ آج جسونت نگر کو مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے اور سارا شہر ان کی خاطرداریوں میں مصروف ہے۔ ریاست کے ملازمین پگڑیاں باندھے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ کسی کے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں۔ جیسے خواب میں کسی نے بھیڑیا دیکھا ہو۔ عمال نے بازاروں کو آراستہ کرایا ہے۔ جیل کے قیدیوں اور شہر کے چوکیداروں نے قلیوں اور مزدوروں کا کام کیا ہے۔ وہاں کا کوئی بھی آدمی بلا اجازت سڑکوں پر نہیں جانے پاتا۔ شہر کا کوئی شخص اس خیر مقدمی میں شریک نہیں ہوا۔ اور ریاست نے عوام کی اس بے اعتنائی کا اسی صورت میں جواب دیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف مسلح سپاہیوں کی قطاریں ایستادہ ہیں کہ رعایا کی دلی بے چینی کا کوئی نشان نظر نہ آئے۔ عام جلسوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جلوس نکلا۔ پیدل اور سوار آگے آگے تھے۔ فوجی باجے بج رہے تھے۔ سڑکوں پر روشنی ہورہی تھی۔ مگر مکانوں میں چھتوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ مگر چھتوں سے نہیں بلکہ سپاہیوں کے ہاتھوں سے۔ صوفیہ سب کچھ سمجھتی تھی مگر کلارک کی آنکھوں پر پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ اقتدار کی بے حد افزونی نے ان کی عقل خبط کر دی ہے۔ سرکاری عمال سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن عقیدت عامہ پر ان کا قابو نہیں ہوتا۔ شہر میں کہیں جوش و مسرت کا پتہ نہیں ہے، مُردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ نہ ہر قدم پر جے کے نعرے سنائی دیتے ہیں، نہ کوئی دیوی آرتی اتارنے کو آتی ہے، اور نہ کہیں گانا بجانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے سوگ میں مبتلا ماں کے سامنے جشن منایا جارہا ہے۔

شہر کا گشت کر کے صوفیہ، مسٹر کلارک، سردار نیل کنٹھ اوردو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہوگئے۔ میز پر

چائے لائی گئی۔ مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنھیں شراب کی بو سے نفرت تھی ۔ کِھسک کر صوفیہ کے پاس جابیٹھے اور بولے جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیہ: نہایت پر فضا مقام ہے۔ پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہوگیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔

نیل کنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُرامن رکھا جاسکتا ہے۔ مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہ لوگ یہاں ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہوجائے گی۔ نہ جانے اس کا کیا انجام ہو۔ بولے: ''یہاں کی ظاہری دل فریبی کے دھوکے میں نہ آیئے۔ آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آگے جاکر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔''

صوفیہ: کچھ ہی ہو۔ میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم، تمھیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک: تم یہاں رہو تو میں دفن ہوجانے کو تیار ہوں۔

صوفیہ: لیجیے سردار صاحب، ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیہ کو سردار صاحب کو دِق کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

نیل کنٹھ: پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہوگئی ہیں۔

صوفیہ: جب تو ہمارا یہاں ٹھہرنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشوونما پانے کا موقع دیا جاوے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے۔ اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لیے ان سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوفیہ سے انھوں نے یہ بات بے

خوف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسرالمزاجی سے انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذرونیاز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے: میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتی الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہیۓ کہ زہر کے قطرے سنہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والینٹروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ رضاکاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بے وقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اتار نے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنورصاحب کا لڑکا تو نہایت شریر طبعیت کا آدمی ہے۔ اس نے اس علاقہ میں اپنے باغیانہ خیالات کی یہاں تک اشاعت کی کہ اسے باغیوں کا اکھاڑا بنا دیا۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا جادو ہوتا تھا کہ رعایا پیاسوں کی طرح اس کی طرف دوڑتی تھی۔ اس کا فقیرانہ بھیس، اس کی سادہ اور بے لوث زندگی، اس کی سعی ہمدردی و غمگساری اور سب سے زیادہ اس کے حسن مردانہ کی کوشش نے سب چھوٹے بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ریاست کو بڑی فکر ہوئی۔ ہم لوگوں کی نیند حرام ہوگئی۔ ہر لحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ ونے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہوگیا مگر اس کے دیگر رفقا، ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسارہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار ونے کو جیل سے نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے۔ اورملازمین کو ہمیشہ اپنے جانوں کا خوف بنا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اس کے سوا اور کیا کرسکتے تھے؟

صوفیہ نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ واقعی حالت اس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائم مقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے

لیے نہیں۔ کیوں ولیم! تمھیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمھاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کرسکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا وہ تمھارا کام ہے۔''

نیل کنٹھ: میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لیے کچھ اور وقت دیجیے۔ آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لیے مضر ہوگا۔

ادھر تو یہ تماشہ ہو رہاتھا صوفیہ اقتدار کے تخت پر جلوہ افروز تھی۔ ثروت مورچھل ہلاتی تھی۔ رعب اردلی میں تھا۔ ادھر ونے سنگھ اپنی اندھیری کال کوٹھری میں غم و غصہ میں بھرا بیٹھا ہوا عورت کی بیدردی اور بے وفائی پر رو رہا تھا۔ اورقیدی اپنے اپنے کمرے صاف کر رہے تھے۔ انھیں کل نئے کمبل اور نئے کرتے دیے گئے تھے جو ریاست کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ تھا۔ جیل کے ملازمین قیدیوں کو پڑھا رہے تھے: ''میم صاحب پوچھیں۔ تمھیں کیا شکایت ہے تو سب لوگ یک زبان ہوکر کہنا : حضور کے اقبال سے ہم سب لوگ بہت آرام سے ہیں اور حضور کے جان و مال کی خیر مناتے ہیں۔ پوچھیں کیا چاہتے ہو؟ تو کہنا حضور کی روز بروز ترقی ہو۔ اس کے سوا ہم اورکچھ نہیں چاہتے۔ خبردار جو کسی نے سر اوپر اٹھایا یا کوئی اور بات زبان سے نکالی۔ کھال ادھیڑ دی جائے گی، قیدی جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے۔ آج میم صاحبہ کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں ملیں گی۔ ایک دن کی چھٹی ہوگی۔ بھگوان انھیں سدا سکھی رکھیں کہ ہم ابھاگوں پر اتنی دیا کرتی ہیں۔

مگر ونے کے کمرہ میں ابھی تک صفائی نہیں ہوئی۔ نیا کمبل پڑا ہوا ہے چھوا تک نہیں گیا۔ نیا کرتا جیوں کا تیوں تہہ کیا ہوا رکھا ہے۔ وہ اپنا پرانا کرتہ ہی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک جزو سے، دماغ کے ایک ایک ذرّہ سے، دل کی ایک ایک حرکت سے یہی آواز آرہی ہے۔ ''صوفی! اس کے سامنے کیوں کر جاؤں گا؟'' اس نے سوچنا شروع کیا۔ ''صوفیہ یہاں کیوں آرہی ہے؟ کیا میری تحقیر کرنا چاہتی ہے۔ صوفیہ! جو رحم و محبت کی مجسم دیوی تھی؟ کیا وہ مجھے کلارک کے سامنے بلاکر اپنے پیروں تلے کچلنا چاہتی ہے؟ اتنی بیدردی اور مجھ سے بدنصیب پر جو آپ ہی اپنے دنوں کی

گردش کو رو رہا ہے ۔ نہیں، وہ اتنی سنگدل نہیں ہے۔ واقعی اس کا نازک دل اتنا سخت نہیں ہوسکتا۔ یہ سب مسٹر کلارک کی شرارت ہے۔ وہ مجھے صوفیہ کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں انھیں یہ موقعہ نہیں دوں گا۔ میں ان کے سامنے ہی نہ جاؤں گا۔ مجھے جبراً لے جائے جس کا جی چاہے۔ کیوں بہانہ کروں کہ میں بیمار ہوں؟ صاف کہہ دوں گا۔ میں وہاں نہیں جاتا۔ اگر جیل کا یہ قانون ہو تو ہوا کرے۔ مجھے ایسے قانون کی پرواہ نہیں۔ جو بالکل بے معنی ہو۔ سنتا ہوں۔ دونوں یہاں ایک ہفتہ تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ کیا رعایا کو پیس ہی ڈالیں گے۔ اب بھی تو مشکل سے نصف آدمی بچ رہے ہوں گے۔ سینکڑوں نکال دیے گئے۔ سینکڑوں جیل میں ٹھونس دیے گئے۔کیا اس شہر کو بالکل تباہ کردینا چاہتے ہیں؟

دفعتاً جیل کا داروغہ آکر تند لہجہ میں بولا: ''تم نے کمرہ کی صفائی نہیں کی؟ ارے تم نے تو ابھی تک کرتہ بھی نہیں بدلا۔ کمبل تک نہیں بچھایا ! تمھیں حکم ملا یا نہیں؟''

ونے: حکم تو ملا مگر میں نے اس کی تعمیل کرنا ضروری نہیں خیال کیا۔

داروغہ نے اور گرم ہوکر کہا: ''اس کا یہی نتیجہ ہوگا کہ تمھارے ساتھ بھی اور قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ ہم تمھارے ساتھ اب تک شرافت کا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ اس لیے کہ تم ایک معزز رئیس کے لڑکے ہو اور یہاں غیر جگہ آپڑے ہو۔ مگر میں شرارت نہیں برداشت کرسکتا۔''

ونے: یہ بتلایئے کہ مجھے پولیٹکل ایجنٹ کے سامنے تو نہ جانا پڑے گا؟

داروغہ: اور یہ کمبل اور کرتہ کس لیے دیا گیا ہے؟ کبھی اور بھی کسی نے یہاں نیا کمبل پایا ہے؟ تم لوگوں کے تو نصیب جاگ اٹھے۔

ونے: اگر آپ میرے ساتھ اتنی رعایت کریں کہ مجھے صاحب کے سامنے جانے پر مجبور نہ کریں۔ تو میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں۔

داروغہ: کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو جی؟ میرا کوئی اختیار ہے؟ تمھیں جانا پڑے گا۔

ونے نے منت آمیز لہجے میں کہا: ''میں آپ کا یہ احسان نہ بھولوں گا۔''

کسی دوسرے موقع پر داروغہ جی شاید جامہ سے باہر ہو جاتے۔ مگر آج قیدیوں کو

خوش رکھنا ضروری تھا۔ بولے : ''مگر بھائی یہ رعایت کرنی میرے اختیار سے باہر ہے، مجھ پر نہ جانے کیا آفت آجائے۔ سردار صاحب مجھے کچا ہی کھا جائیں گے۔ میم صاحبہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا خبط ہے۔ بڑے صاحب تو اہلکاروں کے دشمن ہیں۔ مگر میم صاحبہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو جو کچھ ہیں وہ میم صاحبہ ہی ہیں۔ صاحب تو ان کے اشاروں کے غلام ہیں۔ کہیں وہ ناراض ہو گئیں تو تمھاری میعاد تو دونی ہوہی جائے گی۔ پر ساتھ ہی ہم بھی کہیں کے نہ رہیں گے۔''

ونے: معلوم ہوتاہے ۔میم صاحب ان پر بہت حاوی ہیں؟

داروغہ: حاوی! اجی یہ کہو کہ میم صاحبہ ہی پولیٹکل ایجنٹ ہیں۔ صاحب تو صرف دستخط کرنے کو ہیں۔ نذر و نیاز سب میم صاحب ہی کے ہاتھوں میں جاتی ہے۔

ونے: آپ میرے ساتھ صرف اتنی رعایت کیجیے کہ مجھے ان کے سامنے جانے کے لیے مجبور نہ کیجیے۔ اتنے قیدیوں میں ایک قیدی کی کمی معلوم ہی نہ ہوگی۔ ہاں وہ اگر مجھے نام لے کر بلائیں گی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

داروغہ: سردار صاحب مجھے زندہ ہی نگل جائیں گے۔

ونے: مگر کرنا آپ کو یہی پڑے گا۔ میں اپنی خوشی سے ہرگز نہ جاؤں گا۔

داروغہ: میں بُرا آدمی ہوں۔ مجھے دِق مت کرو۔ میں نے اسی جیل میں بڑے بڑے سرکش قیدیوں کی گردنیں ڈھیلی کر دی ہیں۔

ونے: اپنے کو کوسنے کا آپ کو اختیار ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں جبر کے سامنے سر جھکانے والا آدمی نہیں ہوں۔

داروغہ: بھئی تم عجیب آدمی ہو۔ اس کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا جارہا ہے۔ اور تم پھر بھی اپنی ضد کیے جاتے ہو لیکن تمھیں اپنی جان بھاری ہو۔ مجھے تو اپنی جان بھاری نہیں ہے۔

ونے: کیا شہرخالی کرایا جارہا ہے؟ یہ کیوں؟

داروغہ: میم صاحب کا حکم ہے اور کیا؟ جسونت نگر پر ان کا قہر ہے۔ جب سے انھوں نے یہاں کی وارداتیں سنی ہیں۔مزاج بگڑ گیا ہے۔ ان کا بس چلے تو سارا شہر کھدوا کر پھینک دیں۔ حکم ہوا ہے کہ ایک ہفتہ تک کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔

اندیشہ ہے کہ کہیں شورش برپا نہ ہوجائے۔ صدر سے فوجی امداد طلب کی گئی ہے۔

داروغہ نے حالات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ۔ اس سے ان کا مقصد ونے سنگھ پر اثر ڈالنا تھا اور ان کا مقصد پورا ہوگیا۔ ونے سنگھ کو فکر ہوئی کہ کہیں حکم عدولی سے ناراض ہوکر حکام نے مجھ پر زیادہ سختی کرنی شروع کی اور عوام کو یہ خبر ملی تو وہ یقیناً فساد برپا کردیں گے۔ اور اس حالت میں ان کی خوں ریزیوں کے گناہ کا عذاب میری گردن پر ہوگا۔ کون جانے میرے بعد میرے ساتھیوں نے عوام کو اور بھی ابھار رکھا ہو۔ کیونکہ ان میں شریر المزاج نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ نہیں حالت نازک ہے۔ مجھے اس وقت صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔ داروغہ سے پوچھا۔ ''میم صاحب یہاں کس وقت آئیں گی؟''

داروغہ: ان کے آنے کا کوئی وقت تھوڑا ہی مقرر ہے۔ دھوکا دے کر کسی ایسے وقت آ پہنچیں گی۔ جب ہم لوگ غافل پڑے ہوں گے ۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ کمرہ کی صفائی کرڈالو ۔ کپڑے بدل لو۔ کون جانے آج ہی آجائیں۔

ونے: اچھی بات ہے۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں۔ سب کر لوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔

داروغہ: سلامی کے وقت آنے سے انکار تو نہ کروگے؟

ونے: جی نہیں آپ مجھے سب سے پہلے صحن میں موجود پائیں گے۔

داروغہ: میری شکایت تو نہ کروگے؟

ونے: شکایت کرنا میری عادت نہیں۔ اسے آپ خوب جانتے ہیں۔

داروغہ چلا گیا اندھیرا ہو چلا تھا۔ ونے نے اپنے کمرہ میں جھاڑو لگائی۔ کپڑے بدلے، کمبل بچھا دیا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے کسی کی توجہ ان کی جانب مائل ہو۔ وہ اپنی بے عذری سے حکام کے شکوک کو رفع کر دینا چاہتے تھے۔ کھانے کا وقت آگیا۔ مگر مسٹر کلارک نہ آئے۔ بالآخر داروغہ نے ناامید ہو کر قید خانہ کے دروازے بند کرا دیے اور قیدیوں کو سونے کا حکم دے دیا۔ ونے لیٹے تو سوچنے لگے۔ صوفیہ میں یہ تبدیلی کیوں کر ہوگئی؟ وہی شرم وحیا کی دیوی وہی خدمت وایثار کی پتلی ۔آج اپنی مطلق العنانی کے سبب ڈائن سی بنی ہوئی ہے۔ اس کا دل کتنا نرم تھا اور رحم سے کتنا معمور، اس کے جذبات کتنے بلند اور خیالات کتنے پاکیزہ تھے۔ اس کے

مزاج میں کتنی سادگی تھی۔ اس کی ایک نگاہ دل پر کالیداس کی ایک ایک تشبیہ کا سا اثر پیدا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے جو لفظ نکلتا تھا۔ وہ شمع کے نور کی طرح دل کو منور کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف پھولوں کی خوشبو سے اس کی سرشت ہوئی ہے۔ کتنا سادہ کتنا متین کتنا دل کش حسن تھا! وہی صوفیہ اب اتنی بیدرد ہوگئی ہے!

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا گویا کوئی طوفان آرہا ہے۔ آج جیل خانہ کے صحن میں داروغہ کے مویشی نہ بندھے تھے نہ برآمدوں میں گھاس کے ڈھیر تھے۔ آج کسی قیدی کو اہلکاران جیل کے جوٹھے برتن نہیں صاف کرنے پڑے۔ کسی کو سپاہی کی چنی نہیں کرنی پڑی۔ جیل کے ڈاکٹر کی بڑھیا مہری آج قیدیوں کو گالیاں نہیں دے رہی تھی۔ اور دفتر میں قیدیوں سے ملاقات کرنے والے رشتہ داروں سے وصول کیے گیے نذرانہ کی تقسیم نہ ہوتی تھی۔ کمروں میں چراغ تھے ۔ دروازے بھی کھلے رکھے گئے تھے۔ ونے کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ بھاگ چلوں۔ ممکن ہے کہ میرے سمجھانے بجھانے سے عوام کو تسکین ہو۔ صدر سے فوج آرہی ہے۔ ذرا سی بات میں غدر ہو سکتا ہے۔ اگر میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ میرے اس گناہ کا کفارہ ہوگا۔ انھوں نے دبی ہوئی نگاہوں سے جیل کی اونچی دیواروں کو دیکھا ۔ کمرہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑی کسی نے دیکھ لیا تو؟ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں عوام کو بھڑکانے کے ارادہ سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی حیص بیص میں رات گزر گئی۔ ابھی اہلکاروں کی نیند بھی نہیں کھلی تھی کہ موٹر کی آواز نے آنے والوں کو خبر کر دی۔ داروغہ، ڈاکٹر، وارڈر، چوکیدار سب گھبرا کر جھٹ پٹ نکل پڑے۔ گھنٹی بجی قیدی میدان میں نکل آئے۔ انھیں قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی وقت صوفیہ، مسٹر کلارک اور سردار نیل کنٹھ جیل میں داخل ہوئے۔

صوفیہ نے آتے ہی قیدیوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں انتظار نہ تھا، اشتیاق نہ تھا، اضطراب تھا، بے چینی تھی جس آرزو نے اسے برسوں رلایا تھا۔ جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جس کے لیے اس نے اپنے پسندیدہ اصولوں کو قربان کردیا تھا۔ اس کو سامنے دیکھ کر وہ اس وقت مضمحل ہورہی تھی۔ جیسے کوئی پردیسی بہت دنوں کے بعد

اپنے گاؤں میں آکر اندر قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں کسی کی صدائے ماتم کانوں میں نہ آپڑے۔ دفعتاً اس نے ونے کو سر جھکائے ہوئے کھڑا دیکھا۔ دل میں محبت کا ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ گھر وہی تھا مگر ویران خس وخاشاک سے ڈھکا ہوا، پہچاننا مشکل تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ کہاں تھا جس پر شعر کی نزاکت نثار ہوتی تھی۔ وہ دست کرم کا سا فراخ سینہ کہاں تھا؟ صوفیہ نے بے اختیار چاہا کہ ونے کے پیروں پر گر پڑوں۔ اسے آنسوؤں سے دھوؤں اسے گلے سے لگاؤں۔ دفعتا ونے سنگھ غش کھا کر گر پڑے۔ ایک درد بھری آواز تھی جو ایک لمحہ تک گونج کر فرط غم سے دب گئی۔ صوفیہ فورا ونے کے پاس جا پہنچی چاروں طرف شور مچ گیا۔ جیل کا ڈاکٹر دوڑا داروغہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اب نوکروں کی خیریت نہیں۔ میم صاحب پوچھیں گی۔ اس کی حالت اتنی نازک تھی تو ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا؟ بڑی مصیبت میں پھنسا اس بھلے آدمی کو بھی اسی وقت بے ہوش ہونا تھا۔ کچھ نہیں یہ سب اس کی شرارت ہے۔ اس نے دم روک رکھا ہے۔ بنا ہوا ہے مجھے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بچہ جانے دو میم صاحب کو تو دیکھنا تمھاری کیسی خبر لیتا ہوں کہ ساری بے ہوشی غائب ہو جائے اور پھر کبھی بے ہوش ہونے کا نام نہ لے۔ یہ آخر اسے ہو کیا گیا ؟ کسی قیدی کو آج تک یوں بے ہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں قصوں میں لوگوں کا بات بات میں بے ہوش ہو جانا پڑھا ہے۔ صرع کی بیمار ہوگی اور کیا؟

داروغہ تو اپنی جان کی خیر منا رہا تھا اور ادھر سردار صاحب مسٹر کلارک سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے ریاست میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ صوفیہ نے ڈاکٹر کو جھڑک کر ہٹ جانے کو کہا اور ونے کو اٹھوا کر دفتر میں لے گئی۔ آج وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ نقرئی کرسیاں تھیں ۔ میز پر ناشتہ کی چیزیں چنی ہوئی تھیں تجویز تھی کہ معائنہ کے بعد صاحب یہاں ناشتہ کریں گے۔ صوفیہ نے ونے کو قالین کے فرش پر لٹا دیا اور سب لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا وہ ہمدردی اور رحم کے لیے مشہور تھی کسی کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ جب کمرہ میں کوئی نہ رہا تو صوفیہ نے دریچوں پر پردے ڈال دیے۔ ونے کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر اپنا رومال اس پر جھلنے لگی۔

آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر ونے کے چہرہ پر گرنے لگے۔ ان میں کس قدر جان فزائی تھی۔ ان میں اس کی ساری قلبی اور روحانی طاقت بھری ہوئی تھی ایک ایک ذرہ اس کی زندگی کے چشمہ کا ایک ایک قطرہ تھا۔ ونے سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بہشت کا ایک پھول لازوال لاانتہا خوشبو میں نہایا ہوا اور ہوا کے ہلکے جھونکوں سے ہلتا ہوا سامنے موجود تھا۔ حسن کی سب سے زیادہ دلکش اور سہاونی نمود وہ ہے جب وہ رشک آلود غم میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وہی اس کی روحانی نمود ہوتی ہے۔ ونے چونک کر اٹھ نہیں بیٹھے۔ یہی تو ان کا بہشت ہے، یہی تو ان کی سنہری سلطنت ہے یہی تو ان کی آرزوؤں کی انتہا ہے۔ اس روحانی لذت سے سیری کہاں؟ اس کے دل میں ایک درد بھری حسرت پیدا ہوئی: کاش اسی طرح محبت کی سیج پر لیٹے ہوئے یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوجاتیں۔ ساری آرزوؤں کا خاتمہ بالخیر ہوجاتا۔ مرنے کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا ہے؟

دفعتا اسے یاد آگیا کہ صوفیہ کو چھونا بھی اس کے لیے ممنوع ہے۔ اس نے فوراً اپنا سر اس کے زانوں پر سے ہٹا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" مسز کلارک آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔"

صوفیہ نے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔" احسان گالی کی شکل میں تو نہیں ظاہر کیا جاتا۔"

ونے نے متحیر ہو کر کہا۔"ایسا بڑا قصور مجھ سے کبھی نہیں ہوا۔"

صوفیہ: خواہ مخواہ کسی شخص کے ساتھ میرا رشتہ قائم کردینا گالی نہیں تو اور کیا ہے؟

ونے: مسٹر کلارک؟

صوفیہ: کلارک کو میں تمھارے جوتے کا تسمہ کھولنے کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔

ونے: لیکن اماں جی نے......

صوفیہ: تمھاری اماں جی نے جھوٹ لکھا اور تم نے اس پر یقین کرکے مجھ پر واقعی بڑا ظلم کیا۔ کوئل آم نہ پا کر بھی نمکوڑیوں پر نہیں گرتی۔

اتنے میں مسٹر کلارک نے آکر پوچھا۔" اس قیدی کی کیا حالت ہے؟ ڈاکٹر آرہا ہے۔ وہ اس کی دوا کرے گا چلو دیر ہورہی ہے۔"

صوفیہ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”تم جاؤ مجھے فرصت نہیں ہے۔“

کلارک: کتنی دیر تک تمھاری راہ دیکھوں؟

صوفیہ: یہ تو میں نہیں بتلاسکتی میرے خیال میں ایک انسان کی خدمت کرنا سیر کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔

کلارک: خیر میں تھوری دیر اور ٹھہروں گا۔

یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس وقت صوفیہ نے ونے کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ” ونے ! میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچالو۔ میں نے رانی صاحبہ کے شکوک سے بچنے کے لیے یہ سوانگ رچا تھا۔“

ونے نے مشکوک انداز سے پوچھا۔ ”تم یہاں مسٹر کلارک کے ساتھ کیوں آئیں۔ اور ان کے ساتھ کیسے رہتی ہو؟“

صوفیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بولی۔ ” ونے! اس سے پوچھو۔ مگر میں ایشور کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا تمھارے لیے کیا اور تمھیں اس قید سے نکالنے کے لیے مجھے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ میں نے کلارک کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تمھارے ہی لیے میں نے یہ جھوٹا بھیس لے رکھا ہے۔ اگر تم اس وقت کہو کہ صوفیہ تو میرے ساتھ جیل میں رہ تو میں یہاں آکر تمھارے ساتھ رہوں گی۔ اگر تم میرا ہاتھ پکڑ کر کہو کہ صوفیہ تو میرے ساتھ چل تو آج ہی تمھارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ میں نے تمھارا دامن پکڑ لیا ہے۔ اور اب اسے کسی طرح بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ تم مجھے ٹھکرا ہی کیوں نہ دو۔ میں نے اپنی خودداری تک کو تمھارے لیے وقف کردیا ہے۔ ونے یہ ایشور کی مرضی ہے۔ یہ اسی کی تحریک ہے۔ ورنہ اس قدر ذلت و خواری برداشت کرتے ہوئے تم مجھے زندہ نہ پاتے۔

ونے نے صوفیہ کے دل کی تھاہ لینے کے لیے کہا۔ اگر ایشور کی مرضی ہے۔ تو اس نے میرے اور تمھارے درمیان میں یہ دیوار کیوں کھڑی کی ہے۔

صوفیہ: یہ دیوار ایشور نے نہیں کھڑی کی بلکہ انسانوں نے کھڑی کی ہے۔

ونے: کتنی مضبوط ہے۔

صوفیہ: مگر ناقابل شکست نہیں۔

ونے: تم اسے توڑ سکوگی؟

صوفیہ: اسی لمحہ تمھاری آنکھوں کے ایک اشارہ پر۔ ایک وقت تھا جب میں اس دیوار کو ایشور کی بنائی ہوئی خیال کرتی تھی، اور اس کا احترام کرتی تھی۔ مگر اب اس کی اصلیت سے واقف ہوگئی ہوں۔ پریم (محبت) ان رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ جسمانی رشتہ نہیں۔ روحانی رشتہ ہے۔

ونے نے صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے تو آج سے تم میری ہو اور میں تمھارا ہوں۔

صوفیہ کا سر ونے سنگھ کے سینہ پر جھک گیا اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جس طرح سیاہ بادل زمین پر جھک کر ایک لمحہ میں اسے سیراب کر دیتے ہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، خاموش رہ گئی۔ غم کی انتہا خاموشی ہے مگر خشک اور جلانے والی خوشی کی انتہا بھی خاموشی ہے۔ مگر نم اور طراوت بخش۔ صوفیہ کو اب اپنے ایک ایک عضو میں نبض کی ایک ایک حرکت میں باطنی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ کشتی نے ناخدا کا سہارا پا لیا تھا۔ اب اس کے لیے منزل مقصود ایک یقینی شے تھی۔ وہ اب ہوا کے جھونکوں یا لہروں کے تھپیڑوں کے ساتھ ڈانواں ڈول نہ ہوگی۔ بلکہ ٹھیک طور سے اپنے راستہ پر چلے گی۔

ونے بھی دونوں پر کھولے ہوئے خوشی کے آسمان میں اڑ رہا تھا۔ وہاں کی ہوا میں خوشبو تھی۔ روشنی میں جان تھی۔ کسی ایسی شے کا وجود نہ تھا جو دیکھنے میں کریہہ، سننے میں کرخت، چھونے میں سخت اور ذائقہ میں تلخ ہو۔ وہاں کے پھولوں میں کانٹے نہ تھے۔ آفتاب میں اتنی تمازت نہ تھی، زمین پر آندھیاں نہ تھیں، پیری نہ تھی، مفلسی نہ تھی، فکر نہ تھی، لڑائی نہ تھی، ایک سلطنت تھی، امن و آشتی سے معمور۔ صوفیہ سلطنت کی ملکہ تھی۔ اور وہ خود اس کی آغوش محبت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس خواب مسرت کے مقابلہ میں وہ ایثار و ریاضت کی زندگی کتنی بے مزہ۔ کتنی مایوس بخش تھی۔ وہ حجرۂ تاریک کس قدر خوفناک!

دفعتاً مسٹر کلارک نے پھر آکر کہا۔ ڈارلنگ (پیاری) اب دیر نہ کرو۔ دیر تو بہت ہو رہی ہے۔ سردار صاحب مصر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اس مریض کی تیمار داری کرے گا۔

صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ونے کی طرف سے منہ پھیر کر درد سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ گھبرانا نہیں۔ میں کل پھر آؤں گی۔

ونے کو ایسا معلوم ہوا گویا رگوں میں خون منجمد اور خشک ہوتا جارہا ہے۔ وہ سُن کر پڑا رہ گیا۔ صوفیہ دروازہ تک گئی۔ پھر رومال لینے کے بہانہ سے واپس آکر ونے کے کان میں کہنے لگی۔ میں کل پھرآؤں گی۔اور جبھی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمھاری جانب سے سردار نیل کنٹھ سے کہہ دوں گی کہ وہ معافی چاہتے ہیں۔

صوفیہ کے چلے جانے کے بعد بھی یہ جلدی میں کہے گئے مگر امید سے بھرے اور محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کسی نغمہ ٔشیریں کی آخری گونج کی طرح ونے کے کانوں میں گونجتے رہے۔ مگر وہ جلد ہی ٹھوس دنیا میں آنے کے لیے مجبور ہوا۔ جیل کے ڈاکٹر نے آکر اس کو دفتر ہی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا اور مقوی دوائیں دیں۔ پلنگ پر نرم بستر تھا۔ تکیئے لگے تھے۔ پنکھا جھلا جارہا تھا۔ داروغہ ایک ایک منٹ بعد مریض کی مزاج پرسی کے لیے آتا تھا اور ڈاکٹر تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ونے نے ان تیمارداریوں سے تنگ آکر ڈاکٹر سے کہا۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ اب آپ جائیں۔ شام کو آجایئے گا۔

ڈاکٹر صاحب ڈرتے ڈرتے بولے۔ آپ کو ذرا نیند آجائے تو میں چلاجاؤں۔

ونے نے انھیں یقین دلایاکہ آپ کے رخصت ہوتے ہی مجھے نیند آجائے گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی مفروضہ خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حیلہ سے ونے نے داروغہ کو بھی ہٹایا جوآج اخلاق و رحم کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ میم صاحب کے چلے جانے پر اس کی خوب خبر لوں گا۔ مگر وہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ سردار صاحب نے جاتے وقت تاکید کردی تھی کہ ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا ورنہ میم صاحب جہنم رسید کریں گی۔

کسی بات کو اطمینان سے سوچنے کے لیے تنہائی کا ہونا اسی قدر ضروری ہے، جتنا کہ مراقبہ کے لیے۔ ہوا کی جنبش ترازو کے پلڑوں کو برابر نہیں ہونے دیتی۔ ونے کو اب خیال آیا۔ اماں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گی۔ میرے ساتھ

ان کی کتنی دلی تمنائیں وابستہ ہیں۔ صوفیہ کے دام محبت سے بچانے کے لیے انھوں نے مجھے جلا وطن کیا۔ اور اس لیے انھوں نے صوفیہ کو بدنام کیا۔ ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ رنج تو پتا جی کو بھی ہوگا۔ مگر وہ مجھے معاف کردیں گے۔ اس لیے کہ انھیں انسانی کمزوریوں سے ہمدردی ہے ۔اماں جی میں دماغ ہی دماغ ہے۔ پتاجی میں دل اور دماغ دونوں ہیں۔ لیکن میں اسے کمزوری کیوں کہوں؟ میں کوئی ایسا کام نہیں کر رہا ہوں جسے دنیا میں کسی نے کیا نہ ہو۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جنھوں نے اپنے کو قوم پر قربان کر دیاہو؟ ذاتی خیال کے ساتھ ہی قوم کا خیال رکھنے والے آدمیوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ کیا ہے۔ فنا فی القوم ہو جانے والے لوگوں کا شمار تو انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔ پھر جس قوم کے حکام میں عقل وانصاف نہیں۔ رعایا میں احساس وجوش نہیں۔ اس کے لیے قربان ہو جانا فضول ہے۔ اندھوں کے آگے رو کر اپنے دیدے کھونے کے سوا اور کیا ہاتھ آتا ہے؟

رفتہ رفتہ تخیلات نے زندگی کی آسایش کے سامان جمع کرنا شروع کیے۔ دیہات میں رہوں گا۔ وہیں ایک چھوٹا سا مکان بنواؤں گا۔ صاف کشادہ اورہوا دار۔ زیادہ تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ وہیں ہم دونوں سب سے الگ رہ کر بعافیت زندگی بسر کریں گے۔ بیجا نمود سے کیا فائدہ؟ میں باغیچہ میں کام کروں گا۔ کیاریاں بناؤں گا قلمیں لگاؤں گا اور صوفیہ کو اپنی کارگذاری سے حیرت میں ڈالوں گا۔ گلدستے بنا کر اس کے سامنے پیش کروں گا اور دست بستہ کہوں گا کہ سرکار کچھ انعام ملے۔ پھولوں کی ڈالیاں لگاؤں گا اور کہوں گا کہ رانی جی کچھ نگاہ ہو جائے کبھی کبھی صوفیہ بھی پودوں کو سینچے گی۔ میں تالاب سے پانی بھر بھر دوں گا۔ وہ لا کر کیاریوں میں ڈالے گی۔ اس کا نازک جسم پسینہ سے اور خوشنما لباس پانی سے تر ہو جائے گا۔ اس وقت کسی پیڑ کے نیچے اسے بٹھلا کر میں پنکھا جھلوں گا۔ کبھی کبھی کشتی میں سیر کریں گے۔ دیہاتی کشتی ہوگی۔ ڈانڈا سے چلنے والی۔ موٹر بوٹ میں وہ لطف کہاں، وہ سکون کہاں، اس کی تیزی سے سر چکرا جاتا ہے۔ اس کے شور سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ میں کشتی میں بیٹھ کر ڈانڈ چلاؤں گا۔ صوفیہ کنول کے پھول توڑے گی۔ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی پربھوسیوک بھی آئیں گے۔ آہ کتنی خوش کن زندگی ہوگی۔ کل

ہم دونوں عازم وطن ہوں گے جہاں خوشیاں آغوش کھولے ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

صوفیہ اور کلارک کی آج شام کو ایک جاگیردار کے یہاں دعوت تھی۔ جب میزیں آراستہ ہو گئیں اور ایک حیدرآبادی مداری نے اپنے کرتب دکھانے شروع کیے تو صوفیہ نے موقع پاکر سردار نیل کنٹھ سے کہا: ''اس قیدی کی حالت مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل کی حرکت بہت سست پڑگئی ہے۔ کیوں ولیم۔ تم نے دیکھا اس کا چہرہ کتنا زرد پڑگیا تھا؟''

کلارک نے آج پہلی مرتبہ خلاف امید جواب دیا۔ ''غشی کی حالت میں اکثر چہرہ زرد پڑجاتا ہے۔''

صوفیہ: وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ اس کی حالت اچھی نہیں۔ ورنہ غشی کیوں ہوتی۔ بہتر ہو کہ آپ اسے کسی ہوشیار معالج کے سپرد کردیں۔ میری رائے میں اب وہ اپنے قصور کی کافی سزا پاچکا ہے۔ اسے رہا کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

نیل کنٹھ: میم صاحب۔ اس کی صورت پر نہ جایئے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ یہاں عوام پر اس کا کتنا اثر ہے۔ وہ ریاست میں اتنی زبردست بدامنی پیدا کر دے گا کہ اس کا دبانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بلا کا ضدی ہے ۔ ریاست سے باہر جانے پر راضی نہیں ہوتا۔

کلارک: اس سرکش کو قید رکھنا ہی اچھا ہے۔

صوفیہ نے بگڑ کر کہا: '' میں اسے سراسر ناانصافی سمجھتی ہوں اور مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ تم اتنے بیدرد ہو۔''

کلارک: مجھے تمھارے جیسا درد مند دل رکھنے کا دعویٰ نہیں ہے۔

صوفیہ نے کلارک کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ خودسری، یہ تمکنت کہاں سے آئی؟ حقارت سے بولی ایک انسان کی زندگی اتنی حقیر شے نہیں ہے۔

کلارک: سلطنت کے تحفظ کے مقابلہ میں ایک انسان کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جس رحم سے، جس ہمدردی سے، کسی غریب کا پیٹ بھرتا ہو۔ اس کی جسمانی تکالیف کا دفعیہ ہوتا ہو۔ کسی مغموم کی تشفی ہوتی ہو۔ اس کا میں قائل ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان صفات سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن جو ہمدردی سلطنت کی جڑ کھوکھلی کر دے۔

سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقع دے۔ رعایا میں بغاوت پھیلائے۔ اسے میں ناعاقبت اندیشی ہی نہیں بلکہ حماقت سمجھتا ہوں۔

صوفیہ کے چہرہ پر ایک غیر انسانی نمود کی، جھلک دکھائی پڑی مگر اس نے ضبط کیا۔ شاید اتنے تحمل سے اس نے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ مذہب داری کو تحمل سے عناد ہے۔ مگر اس وقت اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک غیر محتاط کلمہ بھی اس کی ساری زندگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ نرم ہو کر بولی: ''ہاں اس نقطہ خیال سے بے شک شخصی زندگی کی کوئی قیمت نہیں باقی رہتی۔ میں نے اس پہلو سے خیال نہ کیا تھا مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست میں قدم نہ رکھے گا اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے وعدہ کا پکا ہے۔

نیل کنٹھ: کیا آپ سے اس نے وعدہ کیا ہے؟

صوفیہ: ہاں وعدہ ہی سمجھیے۔ میں اس کی ضمانت کرسکتی ہوں۔

نیل کنٹھ: اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول سے پھر نہیں سکتا۔

کلارک: جب تک اس کی تحریری درخواست میرے سامنے نہ آئے میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

نیل کنٹھ: ہاں یہ تو نہایت ہی ضروری ہے۔

صوفیہ: درخواست کا مضمون کیا ہوگا؟

کلارک: سب سے پہلے وہ اپنا قصور تسلیم کرے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے بعد حلفی معاہدہ کرے کہ اس ریاست میں پھر قدم نہ رکھوں گا۔ اس کے ساتھ ضمانت بھی ہونی چاہیے۔ یا تو نقد روپے ہوں یا معزز آدمیو ں کی ضمانت ہو۔ تمھاری ضمانت کی میری نظر میں کتنی ہی وقعت ہو۔ ضابطہ کی نظر میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے۔

دعوت کے بعد صوفیہ شاہی محل میں آئی تو سوچنے لگی۔ یہ عقدہ کیوں کر حل ہو؟ یوں تو میں ونے کی منت سماجت کروں تو وہ ریاست سے چلے جانے پر راضی ہوجائیں گے۔ لیکن غالبًا وہ تحریری معاہدہ نہ کریں گے۔ اگر کسی طرح میں نے رو دھوکر انھیں اس پر بھی راضی کر لیا تو یہاں کون معزز شخص اس کی ضمانت کرے گا؟ ہاں ان کے گھر سے نقد روپے آسکتے ہیں۔ مگر رانی جی بھی اسے منظور نہ کریں گی۔ ونے کو کتنی

ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے، پر ان کو رحم نہ آئے گا۔ لطف تو جب ہے کہ تحریری معاہدہ اور ضمانت کا کوئی ذکر ہی نہ رہے۔ وہ بلاکسی شرط کے آزاد کر دیے جائیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

محل برقی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ محل کے باہر چاروں طرف ساون کی کالی گھٹا تھی اور اتھاہ تاریکی۔ اس محیط تاریکی میں چمکدار محل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نیلے آسمان پر چاند نکلا ہو۔ صوفیہ اپنے آراستہ کمرہ میں آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی ان قوتوں کو بیدار کر رہی ہے جن کا اثر لامحدود ہے آج اُس نے مدت کے بعد اپنے بالوں میں پھول گوندھے ہیں۔ فیروزی ریشمی ساڑھی پہنی ہے اور کلائیوں میں کنگن باندھے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے ان حسن افزا ترکیبوں سے کام لیا ہے جن سے عورتیں واقف ہوتی ہیں۔ یہ منتر انھیں کو آتا ہے کہ کیوں کر زلفوں کا ایک خم آنچل کی ایک لہر دل کو مضطرب کر دیتی ہے۔ آج اس نے مسٹر کلارک کے سلطنت پسندی والے اصول پر فتح یاب ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے حسن کی طاقت کو آزمائے گی۔

رِم جھم بوندیں گر رہی تھیں گویا مولسری کے پھول جھڑ رہے ہوں۔ بوندوں میں ایک دلکش نغمہ تھا۔ شاہی محل اور سرِکوہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دیوتاؤں نے محفل جشن و طرب آراستہ کی ہے۔ صوفیہ پیانو پر بیٹھ گئی اور دل کو بے چین کر دینے والا راگ گانے لگی۔ جس طرح صبح صادق کا سنہرا جلوہ ظہور پذیر ہوتے ہی قدرت کے ہر ہر جزو کو بیدار کر دیتا ہے اسی طرح صوفیہ کی پہلی تان نے دل میں ایک چٹکی سی لی۔ مسٹر کلارک آکر ایک کوچ پر بیٹھ گئے۔ اور محو ہو کر سننے لگے گویا کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ انھیں کبھی کوئی کشتی اڈے ہوئے سمندر میں جھکولے کھاتی نظر آتی جس پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت چڑیاں منڈلاتی تھیں اور کبھی کسی صحرائے ناپیدا کنار میں ایک فقیر جھولی کندھے پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا نظر آتا۔ نغمہ سے تخیل با تصویر بن جاتا ہے۔

جب تک صوفیہ گاتی رہی۔ مسٹر کلارک بیٹھے سر دھنتے رہے جب وہ خاموش ہو گئی. تو اس کے پاس گئے اور اس کی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کے منہ کے پاس منہ لے جاکر بولے۔ ان انگلیوں کو دل میں رکھ لوں گا۔

صوفیہ: دل کہاں ہے؟

کلارک نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا: یہاں تڑپ رہا ہے۔

صوفیہ: شاید ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ خدا نے تم کو دل دیا ہی نہیں۔

کلارک: ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر خدا نے جو کسر رکھی تھی۔ اسے تمھاری نغمہ سرائیوں نے پورا کر دیا۔ شاید ان میں خلق کرنے کی صفت ہے۔

صوفیہ: اگر مجھ میں یہ اعجاز ہوتا تو آج مجھے ایک غیر شخص کے سامنے نادم نہ ہونا پڑتا۔

کلارک نے بے صبری سے کہا۔ کیا میں نے تمھیں نادم کیا؟ میں نے!

صوفیہ: جی ہاں۔ آپ نے! مجھے آج تمھاری بے اعتنائی سے جتنا رنج ہوا اتنا شاید اور کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے بچپن سے یہی سبق دیا گیا ہے کہ ہر جان دار پر رحم کرنا چاہیے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ یہی انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مذہبی کتب میں بھی رحم اور ہمدردی ہی انسان کی خاص صفات بتلائی گئی ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا ہے کہ بے رحمی کی اہمیت رحم سے کہیں زیادہ ہے۔ سب سے بڑا رنج مجھے اس بات کا ہے کہ اجنبی آدمی کے سامنے میری ہتک ہوئی۔

کلارک: خدا جانتا ہے صوفیہ میں تمھاری کتنی عزت کرتا ہوں۔ اس کا افسوس مجھے ضرور ہے کہ میں تمھاری مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کا سبب تمھیں معلوم ہی ہے۔ ہماری سلطنت اسی وقت تک ناقابل فتح رہ سکتی ہے جب تک رعایا کے دلوں پر ہمارا رعب قائم ہے جب تک وہ ہم کو اپنا بھی خواہ اپنا محافظ اپنا سہارا سمجھتی رہے جب تک ہمارے انصاف پر اس کا خاص اعتقاد ہو۔ جس روز رعایا کے دل سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے گا اسی روز ہماری سلطنت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہماری زندگی کا مقصد ہے تو شخصی خیالات و جذبات کے لیے اس میں ذرا بھی گنجائش نہیں۔ سلطنت کے تحفظ کے لیے ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کرسکتے ہیں۔ بڑی سے بڑی سختیاں جھیل سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سلطنت جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور جس شخص سے ہمیں نقصان کا ذرا بھی اندیشہ ہو اسے ہم کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسے بالکل فنا کردینا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت ہمدردی یہاں تک کہ

منصفانہ سلوک بھی نہیں کرسکتے۔

صوفیہ: اگر تمھارا خیال ہے کہ مجھے سلطنت سے اتنی محبت نہیں جتنی تمھیں ہے اور میں اس کے لیے اتنی قربانیاں نہیں کرسکتی جتنی تم کر سکتے ہو تو تم نے مجھے بالکل نہیں سمجھا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ اس معاملہ میں کسی سے جو بھر بھی پیچھے نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات میرے قیاس میں بھی نہیں آتی کہ دو دوستوں میں کبھی اتنا اختلاف ہوسکتا ہے کہ ہمدردی اور برداشت کے لیے کوئی گنجائش نہ رہے اور خصوصاً اس حالت میں جب کہ گوش دیوار کے لیے کوئی دوسرا کان بھی سننے کے لے موجود ہو۔ دیوان کا دل حب الوطنی کے جذبات سے ایک دم خالی ہے۔ وہ اس کی عمق و وسعت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ اس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ جب ان دونوں میں میرے روبرو اس قدر بدمزگی ہوسکتی ہے تو تخلیہ میں نہ جانے کیا ہوتا ہوگا۔ شاید آج سے اس کے دل میں میری عزت اٹھ گئی۔ اس نے اور لوگوں سے بھی یہ ماجرا بیان کیا ہوگا۔ میری تو ناک سی کٹ گئی۔ تم سمجھتے ہو کہ میں گارہی ہوں۔ یہ گانا نہیں رونا ہے۔ جب عقد والے مکان کے دروازہ ہی پر یہ حالت ہو رہی ہے جہاں پھولوں سے، خوشی کے نعروں سے، پرجوش مصافحوں سے، ہنستی ہوئی آنکھوں سے میرا خیر مقدم ہونا چاہیے تھا تو میں اس مکان کے اندر قدم رکھنے کی جرأت کیوں کر کرسکتی ہوں؟ تم نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ شاید تم مجھے بہت زیادہ ذکی الحس خیال کرتے ہوگے مگر اپنی فطرت کو فنا کردینا میرے امکان کے باہرہے۔ میں اپنے کو مبارکباد دیتی ہوں کہ میں نے اپنے عقد کے معاملہ میں اتنی دور اندیشی اور تامل سے کام لیا۔

یہ کہتے کہتے صوفیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں گرنے لگیں۔ مصنوعی غم کے اظہار میں بھی اکثر واقعی غم کا احساس ہونے لگتاہے۔ مسٹر کلارک افسوس و معذرت کا راگ الاپنے لگے۔ مگر نہ مناسب الفاظ ہی ملتے تھے نہ ویسے خیالات۔ آنسوؤں کا سیلاب دلیل اور توجیہہ کے لیے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑتا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ صوفیہ مجھے معاف کرو۔ واقعی میں نہ سمجھتا تھا کہ اس ذرا سی بات سے تمھیں اتنا ملال ہوگا۔

صوفیہ: اس کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تم میرے غلام نہیں ہو کہ میرے جا وبیجا احکامات

کی تعمیل کرو۔ مجھ میں وہ اوصاف ہی نہیں ہیں جو مردوں کا دل کھینچ لیتے ہیں۔ نہ وہ حسن ہے، نہ وہ نمود ہے، نہ وہ انداز دلکشی۔ میں ناز ونخرہ کرنا نہیں جانتی۔ روٹھ کر بیٹھ جانا نہیں جانتی۔ مجھے رنج صرف اس بات کا ہے کہ اس آدمی نے تو میرے ایک اشارہ پر میری بات مان لی اور تم اتنی محنت کرنے پر بھی انکار ہی کرتے جاتے ہو۔ وہ بھی اپنے اصولوں کا مضبوط آدمی ہے۔ حکام کی سختیاں برداشت کیں۔ ذلتیں اٹھائیں۔ جیل کے تاریک حجرہ میں قید ہونا پسند کیا۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہا۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی ضد جائز تھی یا بیجا۔ ہاں وہ اسے جائز سمجھتا تھا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا تھا اس سے خوف یا لالچ یا سزا کا خیال اسے منحرف نہیں کرسکا لیکن جب میں نے نرمی سے اسے سمجھایا کہ تمھاری حالت خطرناک ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ حسرت ناک الفاظ نکلے۔ ''میم صاحب۔ جان کی تو پرواہ نہیں۔ اپنے احباب و رفقاء کی نظروں سے گر کر زندہ رہنا قابل تعریف نہیں۔ پھر بھی میں آپ کی بات نہیں ٹالنا چاہتا۔ آپ کے الفاظ میں ثقالت نہیں۔ ہمدردی ہے اور میں ابھی تک بالکل بے حس نہیں ہوا ہوں۔'' مگر تمھارے اوپر میرا کوئی جادو نہ چلا۔ شاید تم اس سے بھی زیادہ اپنے اصولوں کے پکے ہو۔ حالانکہ ابھی اس کی آزمائش نہیں ہوئی۔ خیر میں تمھارے اصولوں سے سوتیلا سلوک نہیں کرنا چاہتی۔ سواری کا انتظام کردو۔ میں کل ہی چلی جاؤں گی اور پھر اپنی نادانیوں سے تمھارے اصولوں کی راہ کا کانٹا بننے کے لیے نہ آؤں گی۔

مسٹر کلارک نے روحانی کرب کے ساتھ کہا: ڈارلنگ تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنا خطرناک شخص ہے۔ ہم بغاوت سے سازشوں سے جنگ و جدل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس قسم کے استقلال سے، دُھن سے۔ میں بھی انسان ہوں۔ صوفیہ۔ اگرچہ اس وقت میری زبان سے ایسا دعویٰ بہت دیدہ تف نہیں معلوم ہوتا۔ مگر کم از کم اس مقدم ہستی کے نام پر جس کا میں ایک ادنی عقیدت مند ہوں۔ مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس نوجوان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اس کے آہنی ارادے کا اس کی ہمت کا اس کی سچائی کا دل سے معترف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایک باثروت باپ کا بیٹا ہے اور شاہزادوں کی طرح عیش وعشرت میں مصروف رہ سکتا ہے۔ مگر اس کے یہی پاکیزہ اوصاف ہیں۔ جنھوں نے اس کو ناقابل فتح بنا رکھا ہے۔ ایک فوج کا مقابلہ کرنا

اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ایسے محض چند آدمیوں کا جنھیں دنیا میں کسی کو خوف نہیں ہے۔ میرا قومی فرض میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔

صوفیہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ میری دھمکی بالکل بے اثر نہیں ہوئی۔ مجبوری کا کلمہ زبان پر افسوس کا خیال دل میں آیا اور رضامندی کی پہلی منزل پوری ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت نازو انداز کا اتنا اثر نہیں ہوسکتا جتنا پر زور اصرار کا۔ اصول کا پابند انسان ناز وانداز کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا دل مضبوط کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے سامنے اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن بیجا مگر پرزور اصرار کے مقابلہ میں وہ نکما ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی ایک نہیں چلتی۔ صوفیہ نے طنز سے کہا۔ اگر تمھاری قوم کا فرض تمھیں عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی خودداری عزیز ہے۔ وطن کی ابھی تک کسی نے تعریف یا توضیح نہیں کی۔ مگر عورت کا حفظ مراتب اس کا ایک نہایت ضروری جزو ہے اور ہونا چاہیے۔ اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔

یہ کہہ کر وہ مالکہ کی طرح میز کے پاس گئی اور ایک ڈاکٹ فارم نکالا۔ جس پر ایجنٹ اپنے احکام لکھا کرتا تھا۔

کلارک : کیا کرتی ہو صوفیہ؟ ضد نہ کرو۔

صوفیہ: ''جیل کے داروغہ کے نام حکم لکھوں گی'' کہتے ہوئے وہ ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھ گئی۔

کلارک: یہ اندھیر نہ کرو صوفیہ۔ غضب ہو جائے گا۔

صوفیہ: میں غضب سے کیا قیامت سے بھی نہیں ڈرتی۔

صوفیہ نے ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے حکم نامہ کو ٹائپ کیا۔ اس نے عمدا ایک لفظ بے موقع ٹائپ کر دیا جسے ایک باضابطہ حکم نامہ میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس پر کلارک نے کہا۔ یہ لفظ نہ رکھو۔

صوفیہ: کیوں شکریہ ادا نہ کروں؟

کلارک: حکم نامہ میں شکریہ کا کیا ذکر؟ کوئی پرائیویٹ خط تھوڑا ہی ہے۔

صوفیہ: ہاں درست ہے۔ یہ لفظ خارج کیے دیتی ہوں۔ نیچے کیا لکھوں؟

کلارک: نیچے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف میرے دستخط ہوں گے۔

صوفیہ نے پورا حکم نامہ پڑھ کر سنا دیا۔
کلارک: ڈارلنگ یہ تم برا کر رہی ہو۔
صوفیہ: کچھ پرواہ نہیں۔ میں برا ہی کرنا چاہتی ہوں۔ دستخط بھی ٹائپ کردوں؟ نہیں (مہر نکال کر) یہ مہر کیے دیتی ہوں۔
کلارک: جو چاہو کرو۔ جب تمھیں اپنی ضد کے آگے کچھ بھلا برا نہیں سوجھتا تو میں کیا کہوں۔
صوفیہ: کہیں اور تو اس کی نقل نہ ہوگی؟
کلارک میں کچھ نہیں جانتا۔
یہ کہہ کر مسٹر کلارک اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگے۔ صوفیہ نے کہا۔ آج اتنی جلدی نیند آگئی؟
کلارک: ہاں تھک گیا ہوں۔ اب سوؤوں گا۔ تمھارے اس خط سے ریاست میں تہلکہ مچ جائے گا۔
صوفیہ۔ ہاں اگر تمھیں اتنا خوف ہے تو میں اسے چاک کیے ڈالتی ہوں۔ اتنا نہیں گدگدانا چاہتی ہوں کہ ہنسی کے بدلے رونا آجائے۔ بیٹھے ہو تو دیکھو یہ لفافہ پھاڑتی ہوں۔
کلارک: کرسی پر بے پروائی کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔ لو بیٹھ گیا۔ کیا کہتی ہو؟
صوفیہ: کہتی کچھ نہیں شکریہ کا گیت سنتے جاؤ۔
کلارک: شکریہ کی ضرورت نہیں۔
صوفیہ نے پھر گانا شروع کیا اور کلارک خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ ان کے چہرہ پر پردرد اشتیاق کا رنگ نمودار تھا۔ جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ یہ امتحان وآزمائش کب تک؟ اس کھیل کی کوئی حد بھی ہے؟ اس اشتیاق نے انھیں سلطنت کی فکر سے آزاد کر دیا۔ ''آہ کاش اب بھی معلوم ہوجاتا کہ تو اتنی بڑی بھینٹ پا کر خوش ہوگی!'' صوفیہ نے ان کی آتش عشق کو خوب مشتعل کر دیا۔ اور اس وقت یک دم پیانو بند کر دیا۔ پھر بلا کچھ کہے ہوئے اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ کلارک وہیں بیٹھے رہے۔ جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر تنہا کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہو۔
صوفیہ نے ساری رات اپنی آئندہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں بسر کی مگر خاطرخواہ

رنگ نہ دے سکی۔ پہلے رنگ بھر کر اسے ذرا دور سے دیکھتی تو معلوم ہوتا کہ دھوپ کی جگہ چھاؤں ہے۔ چھاؤں کی جگہ دھوپ ہے۔ سرخ رنگ زیادہ ہوگیا ہے۔ باغ میں قدرتی دلکشی ہے۔ پہاڑوں پر ضرورت سے زیادہ ہریالی ہے۔ اور دریاؤں میں غیر مادی سکون ہے۔ پھر برش لے کر ان خرابیوں کو درست کرنے لگتی تو سارا منظر ضرورت سے زیادہ بے لطف، اداس اور میلا ہو جاتا۔ اس کی مذہبیت اب اپنی زندگی میں خدا کا ہاتھ دیکھتی تھی۔ اب خدا ہی اس کا محرک تھا۔ وہ اپنے نیک و بداعمال کے نیکی بدی سے مبرا تھی۔

علی الصباح وہ بستر سے اٹھی تو مسٹر کلارک سو رہے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس نے شوفر کو بلا کر موٹر کی تیاری کا حکم دیا اور ایک لمحہ میں جیل کی طرف روانہ ہوئی۔ جیسے کوئی لڑکا اسکول سے گھر کی طرف دوڑے۔

اس کے جیل پہنچتے ہی ہل چل سی مچ گئی۔ چوکیدار آنکھیں ملتے ہوئے دوڑدوڑ کر وردیاں پہننے لگے۔ داروغہ جی نے جلدی میں الٹی چکیم پہنی اور بے تحاشا دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ننگے پاؤں بھاگے۔ یاد نہ آیا کہ رات کو جوتے کہاں رکھے تھے اور اس وقت تلاش کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ونے سنگھ زیادہ رات گیے سوئے تھے اور ابھی تک خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ کمرہ میں مینہ کی شمولیت سے تروتازہ ہوا آرہی تھی۔ نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ ابھی تک رات کا لیمپ بھی نہ بجھا تھا۔ اور اس میں بڑھیا خوشبو نکل رہی تھی۔ داروغہ نے حاضر ہو کر صوفیہ کو سلام کیا۔ اور وہ ان کو لیے ونے کے کمرہ میں گئی۔ دیکھا تو نیند میں ہے۔ رات کی میٹھی نیند سے چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہے۔ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ ہے۔ گویا پھول پر شعاعیں چمک رہی ہوں۔ صوفیہ کو ونے آج تک کبھی اتنے خوبصورت نہ معلوم ہوئے تھے۔

صوفیہ نے ڈاکٹر سے پوچھا رات کو اس کی کیسی حالت تھی؟

ڈاکٹر: حضور کئی بار غش آئے مگر میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں سے نہیں ہٹا جب یہ سو گئے تو میں کھانے کے لیے چلا گیا۔اب تو ان کی حال بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

صوفیہ: ہاں مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج وہ زردی نہیں ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسے کسی دوسری جگہ میں کیوں نہ بھجوا دوں۔ یہاں کی آب وہوا

اس کے موافق نہیں ہے۔ مگر آپ لوگوں کے سامنے وہ اپنے دل کی باتیں نہ کہے گا۔ آپ لوگ ذرا باہر چلے جائیں تو میں اسے جگا کر دریافت کر لوں اور اس کی حرارت کی بھی جانچ کر لوں۔ (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب میں بھی اس علم سے واقف ہوں۔ نیم حکیم ہوں لیکن خطرہ جان نہیں۔

جب کمرہ میں تخلیہ ہوگیا تو صوفیہ نے ونے کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیشانی کو سہلانے لگی۔ ونے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اس طرح جھپٹ کر اٹھا جیسے نیند میں کسی دریا میں پھسل پڑا ہو۔ خواب کا ثمرہ شاید ہی کسی کو اس قدر جلد ملا ہو۔

صوفیہ نے مسکرا کر کہا: ''تم ابھی تک سو رہے ہو میری آنکھوں کی طرف دیکھو جو رات بھر نہیں جھپکیں۔

ونے: ''دنیا کا سب سے قیمتی جواہر پا کر بھی میٹھی نیند نہ سوؤں تو مجھ سا بدنصیب اور کون ہوگا؟''

صوفیہ: میں تو اس سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہر پا کر اور بھی تفکرات میں مبتلا ہوگئی۔ اب یہ خوف ہے کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے نیند کا لطف ناداری میں ہے جب کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔

ونے : کس بات کے لیے؟

صوفیہ: بھول گئے؟ اس تاریکی سے روشنی میں جانے کے لیے۔ اس کال کوٹھری سے جدا ہونے کے لیے۔ میں موٹر لائی ہوں تمھاری رہائی کا حکم نامہ میری جیب میں ہے ۔ کوئی ذلت آمیز شرط نہیں ہے ۔ صرف اودے پور کی ریاست میں بلااجازت نہ داخل ہونے کا وعدہ لیا گیا ہے۔ آؤ چلیں۔ میں تمھیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر لوٹ آؤں گی۔ تم وہیں پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی میں تم سے وہیں آملوں گی۔ اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

ونے سنگھ کی حالت اس بچے کی سی تھی جو مٹھائیوں کے خوانچہ کو دیکھتا ہے مگر اس خوف سے کہ ماں مارے گی منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مٹھائیوں کا ذائقہ یاد کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے رس گلے کتنے رسیلے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دانت کسی مٹھاس

کے کنڈ میں پھسل پڑے۔ امرتیاں کتنی کر کری ہیں۔ ان میں رس بھرا ہی ہوگا۔ گلاب جامن کتنی سوندھی ہوتی ہے کہ کھاتا چلا جائے۔مٹھائیوں سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ماں پیسے نہ دے گی۔ پیسے ہی نہ ہوں گے۔ وہ کس سے مانگے گی۔ زیادہ ضد کروں گا۔ تو رونے لگے گی۔ خیر ونے سنگھ آبدیدہ ہو کر بولے۔''صوفیہ میں بدنصیب شخص ہوں۔ مجھے اسی حالت میں رہنے دو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ مجھے قسمت نے رنج اٹھانے ہی کے لیے بنایا ہے میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم......

صوفیہ نے قطع کلام کر کے کہا۔ ''ونے میں مصیبت ہی کی بھوکی ہوں۔ اگر تم عیش پسند ہوتے۔ اگر تمھاری زندگی عیش وعشرت کی زندگی ہوتی۔ اگر تم نفس کے غلام ہوتے تو شاید میں تمھاری طرف سے منہ پھیر لیتی۔ تمھارے حوصلہ و ایثار نے مجھے تمھاری طرف کھینچا ہے۔''

ونے: اماں جی کو تم جانتی ہو۔ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔

صوفیہ: تمھاری محبت کا سہارا پا کر میں ان کے غصہ کو برداشت کر لوں گی۔ جب وہ دیکھیں کہ میں تمھارے پیروں کی زنجیر نہیں بلکہ تمھارے پیچھے اڑنے والی گرد ہوں تو ان کا دل پگھل جائے گا۔

ونے نے صوفیہ کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم ان کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ ہندو دھرم پر جان دیتی ہیں۔

صوفیہ: میں بھی ہندو دھرم پر جان دیتی ہوں۔ جو روحانی سکون مجھے اور کہیں نہ ملا وہ گوپیوں کی داستان الفت میں مل گیا۔ وہ پریم کا اوتار جس نے گوپیوں کو پریم کا رس چکھایا۔ جس نے کبجا کی ناؤ پار لگائی۔ جس نے پریم کا کھیل دکھانے کے لیے ہی سنسار کو اپنے قدموں سے پاک بنایا، اسی کی داسی بن کر جاؤں گی تو وہ کون سچا ہندو ہے جو مجھ سے بے رخی کر لے گا۔

ونے نے مسکرا کر کہا۔ ''اس چھلیا نے تم پر جادو ڈال دیا؟ میرے خیال میں تو کرشن کی داستان محبت صرف ان کے بھگتوں کی خیالی ایجاد ہے۔''

صوفیہ: ہو سکتی ہے۔ یسوع کا وجود بھی تو خیالی کہا جاتا ہے۔ شیکسپیر کا وجود بھی تو خیالی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالی داس کی سرشت آب وگل سے ہوئی تھی؟ لیکن ان ہستیوں

کے خیالات پر بھی ہم ان کی پاک شہرت کے معتقد ہیں اور واقعی ہستیوں کی شہرت بہ نسبت زیادہ تر شاید اسی لیے کہ اول الذکر کا وجود غلیظ عناصر سے نہیں بلکہ لطیف تخیل سے ہوا ہے۔ آدمیوں کے نام ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی معیاروں کے نام ضرور ہیں۔ ان میں سے ہر شخص انسانی زندگی کا ایک ایک معیار ہے۔

ونے: صوفیہ میں تم سے دلائل میں پیش نہ پا سکوں گا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ میں تمھارے حسن ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ تم میری اصلی صورت نہیں دیکھ رہی ہو۔ کہیں اس پر نگاہ پڑ جائے تو میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کروگی۔ تم میرے پیروں کی زنجیر چاہے نہ بن سکو مگر میری دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے والی ہوا ضرور بن جاؤ گی۔ ماں نے بہت سوچ بچار کر مجھے یہ برت دیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ایک مرتبہ میں اس پابندی سے آزاد ہوا تو نفس مجھے اس قدر تیزی سے بہا لے جائے گا کہ پھر شاید میرے وجود کا پتہ ہی نہ لگے۔ صوفیہ مجھے اس سخت ترین آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں دراصل بہت کمزور اور نفس پرور شخص ہوں تمھاری اخلاقی بلندی مجھے خائف کر رہی ہے۔ ہاں مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کرو کہ آج ہی یہاں سے کسی دوسرے مقام کو روانہ ہو جاؤں۔

صوفیہ: کیا تم مجھ سے اتنی دور بھاگنا چاہتے ہو؟

ونے: نہیں نہیں اس کا اور ہی سبب ہے۔ نہ جانے کیوں کر یہ حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ کہ جسونت نگر ایک ہفتہ کے لیے خالی کر دیا جائے۔ کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار صاحب نے تمھاری حفاظت کے لیے یہ بندوبست کیا ہے۔ مگر لوگ تم کو بدنام کر رہے ہیں۔

صوفیہ اور کلارک کی باہمی بحث سن کر سردار نیل کنٹھ نے فورا یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ میم صاحب کے سامنے صاحب کی ایک نہ چلے گی اور ونے کو رہا کر دینا پڑے گا۔ اس لیے پہلے ہی سے حفظ امن کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ صوفیہ نے متحیر ہوکر پوچھا کیا ایسا حکم دیا گیا ہے؟

ونے: یہاں مجھے خبر ملی ہے۔ کوئی چپراسی کہتا تھا۔

صوفیہ: مجھے مطلقاً خبر نہیں ہے میں ابھی جا کر پتہ لگاتی ہوں اوراس حکم کو منسوخ کیے

دیتی ہوں ایسی زیادتی ریاستوں کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتی۔ یہ سب تو ہو جائے گا مگر تم کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

ونے: نہیں صوفیہ۔ مجھے معاف کرو۔ دور کا سنہرا منظر قریب آکر ریگ کا میدان بن جاتا ہے۔ تم میرے لیے ایک زندہ معیار ہو۔ تمھاری محبت کا مزہ میں تخیل ہی کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں تمھاری نظروں سے نہ گر جاؤں۔ اپنے کو کہاں تک پوشیدہ رکھوں گا؟ تمھیں پا کر پھر میری زندگی بے لطف ہوجائے گی۔ پرستش اورحصول کے لیے پھر میرے پاس کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ صوفیہ میری زبان سے نہ جانے کیا کیا فضول باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے خود شک ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں ہوں یا نہیں۔ فقیر تخت شاہی پر بیٹھ کر اگر پریشان خاطر ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ میری تم سے یہی آخری التجا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔

صوفیہ: میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔

ونے: کم از کم مجھے یہاں سے جانے کے لیے مجبور نہ کرو۔ کیوں کہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔ شہر کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہے کہ میں عوام کو قابو میں رکھ سکوں گا۔

صوفیہ نے متانت سے کہا۔ جیسی تمھاری مرضی۔ میں جتنا تمھیں وہ مزاج سمجھتی تھی۔ تم اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو۔ میں تمھارا مطلب سمجھتی ہوں اور اسی لیے کہتی ہوں کہ جیسی تمھاری مرضی مگر شاید تمھیں معلوم نہیں ہے کہ نوجوان عورت کا دل بچوں کی طرح ہوتا ہے اسے جس چیز کے لیے منع کرو اسی کی طرف دوڑے گا۔ اگر تم اپنی تعریف کرتے، اپنے کاموں کی سراہنا کرتے تو شاید میں تمھاری جانب سے بدشوق ہو جاتی۔ اپنے عیوب ونقائص کو ظاہر کر کے تم نے مجھے اور بھی فریفتہ کر لیا ہے۔ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔ اس لیے میں تمھارے سامنے نہ آؤں گی پر رہوں گی تمھارے ہی ساتھ۔ جہاں جہاں تم جاؤگے میں سایہ کی طرح تمھارے ساتھ رہوں گی۔ محبت ایک خیالی وجود ہے۔ خیال ہی سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ خیال ہی سے وہ زندہ رہتا ہے اور خیال ہی سے وہ فنا بھی ہو جاتا ہے وہ کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ تم میرے ہو۔ یہ یقین میری محبت کو زندہ اور آرزو مند رکھنے کے لیے کافی ہے۔ جس دن اس

یقین کی جڑ ہل جائے گی اسی دن اس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم نے ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ اس قید خانہ میں رہ کر تم اپنی زندگی کے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ پورا کر سکتے ہو تو میں اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ اس بے نفسی نے میرے دل میں تمھاری عزت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ کل شام کو پھر آؤں گی۔ میں نے اس حکم نامہ کے لیے جتنا ''تریا چرتر'' کیا ہے۔ وہ تم سے بتلا دوں تو تم تعجب کروگے۔ تمھاری ایک نہیں نے میری ساری کوشش پر پانی پھیر دیا۔ کلارک کہے گا میں کہتا تھا کہ وہ راضی نہ ہوگا۔ شاید طعنے دے۔ مگر کچھ مضائقہ نہیں کوئی بہانہ کر دوں گی۔

یہ کہتے کہتے صوفیہ کے پر اشتیاق لب ونے سنگھ کی طرف جھکے۔ مگر وہ کائی پر پھسلنے والے آدمی کی طرح گرتے گرتے سنبھل گئی۔ اس نے آہستہ سے ونے سنگھ کا ہاتھ دبا دیا اور دروازہ کی طرف چلی۔ مگر باہر جا کر پھر واپس آئی اور نہایت لجاجت سے بولی۔ '' ونے تم سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم صاف صاف بتلا دوگے۔ میں کلارک کے ساتھ یہاں آئی۔ اس سے چالاکی برتی۔ اسے جھوٹی امیدیں دلائیں اور اب بھی اسے مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہوں۔ تم اسے بیجا تو نہیں خیال کرتے؟ تمھاری نگاہ میں میں قابل ملامت تو نہیں ہوں؟''

ونے کے پاس اس کا ایک ہی ممکن جواب تھا۔ صوفیہ کا رویہ اس کو قابل اعتراض معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے اس بات کو تعجب کے لہجہ میں ظاہر کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اس خیال کو ظاہر نہ کر سکا۔ یہ کتنی سخت ناانصافی ہوتی۔ کتنی بڑی بے رحمی۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیہ نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک مذہبی خیال کے تابع ہو کر۔ وہ اسے خدائی تحریک سمجھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ ناامید ہوگئی ہوتی۔ ایسی حالت میں کھری اور ٹھوس سچائی سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ عقیدت مندانہ سرگرمی سے بولے۔''صوفیہ تم یہ سوال کر کے اپنے اوپر اور اس سے زیادہ میرے اوپر ظلم کر رہی ہو۔ میرے لیے تم نے اب تک تیاگ (ترک) ہی تیاگ کیے ہیں۔ تم نے عزت، ثروت، اصول کسی ایک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر میں تمھارے اس پریم کی بے وقعتی کروں۔''

یہ کہتے کہتے وہ رک گئے۔ صوفیہ بولی۔ ''کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟ رک کیوں گئے؟ یہی نہ کہ تمھیں میرا کلارک کے ساتھ رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جس دن مجھے ناامیدی ہو جائے گی کہ میں اپنی مغالطہ آمیز روش سے تمھیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اسی دن میں کلارک کو پیروں سے اس طرح ٹھکرادوں گی۔ اس کے بعد تم مجھے پریم کی جوگن کے بھیس میں دیکھو گے۔ جس کی زندگی کا واحد مقصد ہوگا۔ تمھارے اوپر نثار ہو جانا۔''

(27)

نایک رام محلّہ والوں سے رخصت ہو کر اودے پور روانہ ہوئے۔ ریل کے مسافروں کو ان کی بہت جلد عقیدت ہوگئی۔ کسی کو تمباکو مل کر کھلاتے۔ کسی کے بچہ کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ جس مسافر کو دیکھتے کہ جگہ نہیں مل رہی۔ ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔ جس کمرہ میں جاتا وہی دھکے کھاتا ہے۔ اس کو بلا کر اپنی بغل میں بٹھا لیتے پھر ذرا دیرمیں اس سے سوالوں کا تانتا باندھ دیتے۔ کہاں مکان ہے ؟ کہاں جاتے ہو؟ کتنے لڑکے ہیں؟ کیا کاروبار ہوتا ہے؟ ان سوالات کا سلسلہ اس التجا پر ختم ہوتا۔ میرا نام نایک رام پنڈا ہے۔ جب کبھی کاشی آؤ میرا نام پوچھ لو۔ بچہ بچہ جانتاہے۔ دو دن چار دن مہینے دو مہینے جب تک جی چاہے آرام سے وہیں ٹھہرو۔ گھر دوار نوکر چاکر سب حاجر ہیں۔ گھر کا سا آرام پاؤگے۔ وہاں سے چلتے وقت جو چاہے دے دو۔ نہ ہو نہ دو۔ گھر آکر بھیج دو۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ کبھی مت سوچو ابھی روپے نہیں ہیں۔پھر چلیں گے۔ سبھ کاج کے لیے مہورت نہیں دیکھی جاتی۔ ریل کا کرایہ لے کر چل کھڑے ہو۔ کاشی میں تو میں موجود ہی ہوں۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ کام پڑ جائے تو جان لڑادیں ۔ تیرتھ جاترا کے لیے ٹال مٹول مت کرو۔ کوئی نہیں جانتا کب بڑی جاترا کرنی پڑ جائے۔ دنیا کے جھگڑے تو لگے ہی رہیں گے۔

دہلی پہنچے تو کئی نئے مسافر گاڑی میں آئے۔ آریہ سماج کے کسی جلسہ میں جا رہے تھے۔ نایک رام نے ان سے بھی وہی جرح شروع کی یہاں تک کہ ایک مہاشے گرم ہو کر بولے: تم ہمارے باپ دادا کا نام پوچھ کر کیا کروگے ؟ہم تمھارے پھندے میں پھنسنے والے نہیں۔ یہاں گنگا جی کے قائل نہیں اور نہ کاشی ہی کو بیکنٹھ سمجھتے ہیں۔

نایک رام ذرا بھی خفیف نہیں ہوئے۔ مسکرا کر بولے۔ بابوجی آپ آریہ ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ آریہ لوگوں نے ہی تو ہندو دھرم کی لاج رکھی، نہیں تو اب تک سارا دیس مسلمان، کرستان ہوگیا ہوتا۔ ہندو دھرم کے اودھارک ہو کر آپ کاشی کو بھلا کیسے نہ مانیں گے؟ اسی نگری میں راجہ ہریشچندر کی پریچھا (آزمائش) ہوئی تھی۔ وہیں بدھ بھگوان نے اپنا دھرم چکر چلایا تھا۔ وہیں شنکر بھگوان نے منڈن مسر سے ساسترارتھ کیا تھا۔ وہاں جینی آتے ہیں۔ بدھ آتے ہیں۔ ویشنو آتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی نگری نہیں ہے۔ سارے سنسار کی نگری ہے۔ دور دور کے لوگ بھی جب تک کاشی جی کے درشن نہ کر لیں۔ ان کی جاترا سپھل نہیں ہوتی۔ گنگا جی مکتی دیتی ہیں۔ پاپ کاٹتی ہیں۔ یہ سب تو گنواروں کو بہلانے کی باتیں ہیں۔ ان سے کہو کہ چل کر اس پوتر نگری کو دیکھ آؤ۔ جہاں پگ پگ پر آریہ جات کے نشان ملتے ہیں۔ جس کا نام لیتے ہی سینکڑوں مہاتماؤں، رشیوں، منیوں کی یاد آجاتی ہے۔ تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی۔ پر اصل میں بات یہی ہے کاشی کا مہاتم اس لیے ہے کہ وہ آریہ جاتی کا جیتا جاگتا پران ہے۔

ان اصحاب کو پھر کاشی کی مذمت کرنے کی ہمت نہ پڑی ۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے اورنایک رام کی مذہبی واقفیت کے قائل ہوگئے۔ حالانکہ نایک رام نے یہ چند فقرے ایسے موقعوں کے لیے کسی مقرر کی تقریر سے چن کر رٹ لیے تھے۔

ریل کے اسٹیشنوں پر وہ ضرور اترتے اور ریل کے ملازموں سے تعارف پیدا کرتے۔ کوئی انھیں پان کھلا دیتا کوئی کچھ ناشتہ کرا دیتا۔ سارا سفر ختم ہوگیا۔ مگر وہ لیٹے تک نہیں۔ ذرا بھی آنکھ نہ جھپکی۔ جہاں دو مسافروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتے آپ فوراً ثالث بن جاتے اوران میں میل کر دیتے۔ تیسرے روز وہ اودے پور پہنچ گئے اور ریاست کے حاکموں اور اہلکاروں سے ملتے جلتے گھومتے پھرتے جسونت نگر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ مسٹر کلارک کا ڈیرا پڑا ہوا ہے ۔ باہر سے آنے جانے والوں کی بڑی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ شہر کا پھاٹک بند سا ہے۔ لیکن پنڈے کو کون روکتا؟ شہر میں پہنچ کر سوچنے لگے۔ ونے سنگھ سے کیوں کر ملاقات ہو؟ رات کو تو ایک دھرم شالہ میں ٹھہرے۔ سویرا ہوتے ہی جیل کے داروغہ کے مکان میں جا پہنچے۔ داروغہ جی صوفیہ کو

بھیج کر آئے تھے اور نوکر پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے حقہ کیوں نہیں بھرا۔ اتنے میں برآمدہ میں پنڈا جی کی آہٹ پا کر باہر نکل آئے۔ انھیں دیکھتے ہی نایک رام نے گنگا جل کی شیشی نکالی اور ان کے سر پر جل چھڑک دیا۔

داروغہ جی نے ذرا رکھائی سے کہا۔'' کہاں سے آتے ہو؟''

نایک رام: مہاراج استھان تو پراگ راج ہے پر آرہا ہوں بڑی دور سے۔ جی میں آیا ادھر بھی ججمانوں کو آسیرواد دیتا چلوں۔

داروغہ جی کا لڑکا جس کی عمر ابھی ۱۴۔۱۵ سال کی تھی نکل آیا۔ نایک رام نے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ گویا اس کے دیدار سے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور پھر داروغہ جی سے بولے۔'' یہ آپ کے چرنجیو پتر ہیں نا؟ پتا پتر کی صورت کیسی ملتی ہے کہ دور ہی سے پہچان لے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب کیا پڑھتے ہو؟''

لڑکے نے کہا۔'' انگریزی پڑھتا ہوں۔''

نایک رام: یہ تو میں بھی سمجھ گیا تھا آج کل تو اسی ودیا کا دور دورہ ہے راج ودیا ٹھہری جو کس دپھا (دفعہ) میں پڑھتے ہو بھیا؟

داروغہ: ابھی تو حال ہی میں انگریزی شروع کی ہے۔ اس پر بھی پڑھنے میں جی نہیں لگاتے۔ ابھی تھوڑی ہی پڑھی ہے۔

لڑکے نے سمجھا میری تحقیر ہو رہی ہے۔ بولا۔ ''تم سے تو زیادہ ہی پڑھا ہوں۔''

نایک رام: اس کی کوئی چنتا نہیں سب آجائے گا۔ ابھی ان کی اوستھا (عمر) ہی کیا ہے۔ بھگوان کی اچھا (مرضی) ہوگی تو کُل (خاندان) کا نام روسن کردیں گے۔ آپ کے گھر پر کچھ جگہ جمین بھی ہے؟

داروغہ جی نے اب سمجھا۔ زود فہمی سے نابلد تھے۔ اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بولے ہاں چتوڑ کے علاقہ میں کئی گاؤں ہیں۔ پرانی جاگیر ہے میرے پتا جی مہارانا کے درباری تھے۔ ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں مہارانا پرتاپ نے میرے بزرگوں کو یہ جاگیر بخشی تھی اب بھی مجھے دربار میں کرسی ملتی ہے اور پان الائچی سے خاطر کی جاتی ہے ضرورت ہوتی ہے تو مہارانا کے یہاں سے آدمی آتا ہے۔ بڑا لڑکا مرا تھا تو مہارانا نے ہمدردی کا خط بھیجا تھا۔

نایک رام: جاگیرداری کا کیا کہنا۔ جو جاگیردار وہی راجہ ۔ نام کا فرق ہے ۔ اصلی راجہ تو جاگیردار ہی ہوتے ہیں ۔ رانا تو نام کے ہیں۔

داروغہ: راج گھرانے سے برابر آمد ورفت قائم ہے۔

نایک رام: ابھی ان کی کہیں بات چیت تو نہیں ہو رہی ہے؟

داروغہ اجی لوگ جان تو کھا رہے ہیں۔ روز ایک نہ ایک جگہ سے پیغام آتا رہتا ہے۔ مگر میں تو سب کو ٹکا سا جواب دے دیتا ہوں۔ جب تک پڑھ لکھ نہ لے۔ اس وقت تک اس کی شادی کر دینا حماقت ہے۔

نایک رام: یہ آپ نے پکی بات کہی۔ جتھا رتھ (اصل) میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بڑے آدمیوں کی بدھی (عقل) بھی بڑی ہوتی ہے۔ پرلوک ریت (دنیا وی رواج) پر چلنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا اب آگیا (اجازت) دیجیے۔ کئی جگہ جانا ہے۔ جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں۔ کسی کو جواب نہ دیجیے گا۔ ایسی کنیا آپ کو نہ ملے گی اور نہ ایسا اوتم کُل ہی پائیے گا۔

داروغہ: واہ واہ ۔ اتنی جلد چلے جایئے گا۔ کم سے کم بھوجن تو کر لیجیے۔ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ آپ کس کا سندیسہ (پیغام) لائے ہیں؟ وہ کون ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟

نایک رام: سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ پر ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے ۔

داروغہ نے لڑکے سے کہا۔" تلک! اندر جاؤ پنڈت جی کے لیے پان بنوا لاؤ۔ کچھ ناشتہ بھی لیتے آنا۔"

یہ کہہ کر تلک کے پیچھے پیچھے خود اندر گئے اور بیوی سے بولے۔" لو کہیں سے تلک کے بیاہ کا سندیسہ آیا ہے۔ پان طشتری میں بھیجنا۔ ناشتہ کے لیے کچھ نہیں ہے ؟ وہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ گھر میں کتنی ہی چیز آئے۔ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نہ جانے کہاں کے مربھوکے جمع ہوگئے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک قیدی کے گھر سے مٹھائیوں کا ایک پورا تھال آیا تھا۔ کیا ہوگیا؟"

بیوی: انھیں لڑکوں سے پوچھو کیا ہوگیا۔ میں تو ہاتھ سے چھونے کی بھی قسم کھاتی ہوں۔ یہ کوئی صندوق میں بند رکھنے کی چیز تو ہے نہیں۔ جس کا جب جی چاہے نکال کر کھاتا ہے۔ کل سے کسی نے روٹیوں کی طرف نہیں دیکھا۔

داروغہ: آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جو چیز گھر میں آئے اسے احتیاط سے رکھو۔ احتیاط سے خرچ کرو۔ وہ لونڈا کہاں گیا؟

بیوی: تمھیں نے تو ابھی اسے ڈانٹا تھا۔ بس چلا گیا۔ کہہ گیا ہے کہ گھڑی گھڑی کی ڈانٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔

داروغہ: یہ اور مصیبت ہوئی۔ یہ چھوٹے آدمی روز بروز چڑھتے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک ان کی خوشامد کرے۔ اب کون بازار سے مٹھائیاں لائے؟ آج تو کسی سپاہی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔ نہ جانے سر سے کب یہ بلا ٹلے؟ تم چلے جاؤ تلک۔

تلک: شربت کیوں نہیں پلا دیتے؟

بیوی: شکر بھی تو نہیں ہے۔ چلے کیوں نہیں جاتے! لوگ دیکھیں گے کہ حضرت مٹھائیاں لیے جاتے ہیں۔

داروغہ: تو اس میں کیا گالی ہے؟ کسی کے گھر چوری تو نہیں کر رہے ہو۔ برے کام سے لجانا چاہیے۔ اپنا کام کرنے میں کیا لاج؟

تلک یوں تو لاکھ سر پٹکنے پر بھی بازار نہ جاتے۔ مگر اس وقت انھیں اپنی شادی کی خوشی تھی چلے گئے۔ داروغہ جی نے طشتری میں پان رکھے اور نایک رام کے پاس لائے۔

نایک رام: سرکار آپ کے گھر پان نہیں کھاؤں گا۔

داروغہ: اجی۔ ابھی کیا ہرج ہے؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔

نایک رام: میرا من بیٹھ گیا تو سب ٹھیک سمجھیے۔

داروغہ: یہ تو آپ نے بری پخ لگائی۔ یہ بات نہیں ہوسکتی کہ آپ ہمارے دروازہ پر آئیں اور ہم بغیر کافی خاطر کیے آپ کو چلے جانے دیں۔ میں تو مان بھی جاؤں گا پر تلک کی ماں کسی طرح نہ مانیں گی۔

نایک رام: اسی سے تو میں یہ سندیسہ لے کر آنے سے انکار کر رہا تھا۔ جس بھلے مانس کے درواجے پر جائیے وہ بنا بھوجن اور دچھنا کے گلا نہیں چھوڑتا۔ اسی سے تو آج کل کچھ کباڑیوں نے برکھوجنے کو ایک دھندا بنا لیا ہے۔ اس سے یہ کام کرتے اور بھی سنکوچ (تامل) ہوتا ہے۔

داروغہ: ایسے دغا باز یہاں روز ہی آیا کرتے ہیں۔ مگر میں تو پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ جیسا منہ ہوتاہے ویسا بیڑا ملتا ہے۔ یہاں تو آدمی کو ایک نظر دیکھا اور اس کے رگ و ریشے سے واقف ہوگیا۔آپ یوں نہ جانے پائیں گے۔

نایک رام: میں جانتا کہ آپ اس طرح پیچھے پڑ جائیں گے تو کباڑیوں ہی کی سی بات چیت کرتا۔ گلا تو چھوٹ جاتا۔

داوغہ: یہاں ایسا نادان نہیں ہوں۔ اڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔

نایک رام ڈٹ گئے دوپہر ہوتے ہوتے بچہ بچہ سے ان کی دوستی ہو گئی۔ داروغائن نے بھی پالاگن کہلا بھیجا۔ ادھر سے بھی آشرواد دیا گیا۔ داروغہ تو دس بجے دفتر چلے گئے۔ نایک رام کے لیے گھر میں پوڑیاں، کچوریاں، رائیتہ، دہی، چٹنی، حلوہ، یہ سب چیزیں بڑی ترکیب سے تیار کی گئیں۔ پنڈت جی نے اندر جا کر بھوجن کیا۔ داروغائن نے خود پنکھا جھلا۔ پھر تو انھوں نے اور بھی رنگ جمایا۔ لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ دیکھے۔ داروغائن نے بھی لجاتے ہوئے ہاتھ دکھایا۔ پنڈت جی نے ریکھاؤں (خط) کی پرکھ کے علم میں اچھی واقفیت دکھلائی۔ اور بھی دھاک جم گئی۔ شام کو داروغہ جی دفتر سے لوٹے تو پنڈت جی شان سے مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پڑوس کے کئی آدمی انھیں گھیرے کھڑے تھے۔ داروغہ نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔ یہ عہدہ تو اتنا اونچا نہیں اور نہ مشاہرہ ہی کچھ ایسا زیادہ ملتا ہے۔ مگر کام اتنی ذمہ داری کا ہے کہ معتبر اشخاص کو ہی دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے آدمی کسی نہ کسی جرم کے لیے سزا پا کر آتے ہیں۔ اگر چاہوں تو ان کے گھر والوں سے ایک ایک ملاقات کے لیے ہزاروں روپے وصول کر لوں۔ لیکن اپنا یہ وتیرہ نہیں ہے۔ جو سرکار سے ملتا ہے اسی کو بہت سمجھتا ہوں۔ کسی بزدل شخص کا تو یہاں گھڑی بھر بھی نباہ نہ ہو۔ ایک سے ایک خونی ڈکیت بدمعاش آتے رہتے ہیں۔ جن کے ہزاروں مددگار ہوتے ہیں۔ چاہیں تو دن دہاڑے جیل کو لٹوالیں مگر میں ایسے ڈھنگ سے ان پر رعب جماتا ہوں کہ بدنامی بھی نہ ہو اور نقصان بھی نہ اٹھانا پڑے ۔ اب آج ہی کل دیکھئے ۔ کاشی کے کروڑپتی راجہ ہیں مہاراجہ بھرت سنگھ ان کا لڑکا بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے۔ حکام تک اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بڑے صاحب کی میم صاحبہ دن میں دو دو بار اس کی مزاج پرسی

کے لیے تشریف لاتی ہیں اور سردار نیل کنٹھ راؤ بھی برابر خطوط کے ذریعہ اس کے حالات خیروعافیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ چاہوں تو مہاراجہ بھرت سنگھ سے ایک ملاقات کے لیے لاکھوں روپے اینٹھ لوں مگر یہ اپنا شعار نہیں۔

نایک رام: اچھا کیا راجہ بھرت سنگھ کا لڑکا یہیں قید ہے؟

داروغہ: اور یہاں سرکار کو کس پر اتنا اعتبار ہے ؟

نایک رام: آپ جیسے مہاتماؤں کے درشن درلبھ ہیں۔ مگر برا نہ مانئے تو کہوں۔ بال بچوں کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ آدمی گھر سے چار پیسے کمانے ہی کے لیے نکلتا ہے۔

داروغہ: ارے تو کیا کوئی قسم کھائی ہے پر کسی کا گلا نہیں دباتا۔ چلیے آپ کو جیل خانہ کی سیر کرا آؤں بڑی صاف ستھری جگہ ہے میرے یہاں تو جو کوئی مہمان آتا ہے اس کو وہیں ٹھہرا دیتا ہوں۔ جیل کے داروغہ کی دوستی سے جیل کی ہوا کھانے کے سوا اور کیا ملے گا؟

یہ کہہ کر داروغہ جی مسکرائے وہ نایک رام کو کسی حیلہ سے ٹالنا چاہتے تھے۔ نوکر بھاگ گیا تھا۔ انھوں نے سوچا اپنے ہاتھ چلم بھرنی پڑے گی۔ بستر بچھانا پڑے گا۔ پانی لانا پڑے گا۔ عزت میں بٹہ لگے گا۔ گھر کا پردہ فاش ہو جائے گا۔ انھیں وہاں ٹھہرا دوں گا۔ کھانا بھجوا دوں گا۔ پردہ ڈھکا رہ جائے گا۔

نایک رام: کون جانے کبھی آپ کی سیوا (خدمت) میں آنا ہی پڑے۔ پہلے سے ٹھور ٹھکانا دیکھ لوں۔ مہاراجہ صاحب کے لڑکے نے کون سا کسور کیا تھا؟

داروغہ: قصور کچھ نہیں تھا بس حاکموں کی ضد ہے یہاں دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سمجھاتا پھرتا تھا۔ بعض حاکموں کو اس پر شبہ ہوگیا کہ یہ بغاوت پھیلا رہا ہے۔ یہاں لاکر قید کر دیا۔ مگر آپ تو ابھی اسے دیکھئے ہی گا۔ ایسا صابر وشاکر اور خلیق شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں وہ کسی سے دبتا نہیں۔ خوشامد کر کے چاہے کوئی پانی بھرا لے مگر چاہو کہ رعب سے اس کو دبا لیں۔ تو پھر جو بھر بھی نہ دبے گا۔

نایک رام دل میں خوش تھے کہ بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ بھگوان آپ ہی سب دروازے کھولے دیتے ہیں۔ دیکھوں اب ونے سنگھ سے کیا بات ہوتی ہے۔ یوں تو وہ نہ جائیں گے پر رانی جی کی بیماری کا بہانہ کرنا پڑے گا۔ وہ راضی ہو

جائے۔ پھر تو یہاں سے نکال لے جانا میرا کام ہے۔ بھگوان کی دیا ہو جاتی تو میری مراد پوری ہو جاتی۔ گھر بس جاتا زندگی سپھل جاتی۔

(28)

صوفیہ کے چلے جانے پر ونے کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ نفس ایک بزدل دشمن ہے جو ہمیشہ پس پشت وار کرتا ہے۔ جب تک صوفیہ سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صوفیہ کے پیٹھ پھیرتے ہی اس نے خم ٹھوکنا شروع کردیا۔" نہ جانے میری باتوں کا صوفیہ پر کیا اثر ہوا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ گئی کہ میں نے زندگی بھر کے لیے قومی خدمت کا عہد کر لیا ہے۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اسے ماتا جی کی ناراضگی کا خوف دلانے لگا۔ جیسے بھولے بھالے بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر بات پر ماں سے کہہ دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے لیے اتنی قربانیاں کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب جیسی پاک شے کو ترک کر دینے سے بھی اس کو عار نہیں۔ تو اس کے سامنے قومی خدمت اور قرض ادائی کا ڈھونگ رچنا بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ مجھے وہ اپنے دل میں کتنا بیدرد، کتنا کم ہمت، کتنا بے انس سمجھ رہی ہوگی۔ مانا کہ دوسروں کے مفاد کی کوشش کرنا معیار زندگی ہے۔ لیکن ذاتی مفاد کا خیال بھی تو یک دم قابل ترک نہیں۔ بڑے سے بڑا قومی خادم بھی ذاتی مفاد کی طرف جھکتا ہے۔ اس مفاد کا صرف ایک جزو ترک کردینا قوم پرستی کے لیے کافی ہے۔ یہی قانون قدرت ہے ۔ آہ میں نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ وہ کتنی مغرور ہے۔ پھر بھی اس نے میرے لیے کیا کیا اذیتیں برداشت کیں ۔ میری ماں نے اسے جتنا ذلیل کیا اتنا شدید اس کی ماں نے کیا ہوتا تو وہ اس کا منہ نہ دیکھتی مجھے آخر سوجھی کیا۔ بے شک میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اس کی جذباتی رفعت مجھے خائف کرتی ہے۔ مگر میری عقیدت میری کمزوریوں کی تلافی نہیں کر سکتی؟ جہانگیر جیسا نفس پرست اور کم فہم شخص اگر نورجہاں کو خوش رکھ سکتا ہے تو میں اپنی بے نفسی اپنی محبت سے اسے آسودہ نہیں کر سکتا ؟ کہیں وہ میری اداسی سے ناخوش ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے منہ نہ پھیر لے۔ اگر میری قوم پرستی اور ماں کی فرمانبرداری اور پس وپیش کا یہ

انجام ہوا تو یہ زندگی ناقابل برداشت ہوجائے گی۔

''آہ کتنا بے نظیر حسن ہے ! اعلی تعلیم وتخیل سے چہرہ پر کیسی متانت آگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی دیوی جنت سے اتر آئی ہے۔ گویا ظاہری دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ وہ صرف باطنی دنیا میں چلتی پھرتی ہے۔ پاکیزہ خیالی قدرتی حسن کو کتنا دلفریب بنا دیتی ہے۔ وہی حسن کا اصلی سنگار ہے۔ پوشاکوں اور زیوروں سے تو اس کی قدرتی رونق ہی زائل ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی اور خواہش انگیز ہو جاتی ہے۔

بے ڈھنگا کا لفظ ہی اس مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ قہقہہ اور تبسم میں جو فرق ہے ۔ وہی فرق مرصع اورمہذب حسن میں ہے. .اس کا تبسم کتنا دلآویز ہے۔ جیسے بسنت کی ٹھنڈی ہوا یا کسی شاعر کا اچھوتا خیال یہاں کسی حسینہ سے باتیں کرنے لگو تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ یا تو شین قاف درست نہیں یا تذکیر وتانیث کا خیال نہیں۔ صوفیہ کے لیے عہد، قاعدہ یا اصول سے انحراف کرنا قابل عفو ہی نہیں بلکہ زینت بخش بھی ہے۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے بغیر میری زندگی ایک سوکھے پیڑ کی طرح ہوگی۔ جس کو لگاتار بارش بھی سر سبز نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا مفاد اور مفہوم ہی باقی نہ رہے گا۔ زندگی رہے گی مگر محبت اورخوشی اور مقصد سے خالی !

ونے اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا کہ داروغہ جی آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ بلا سر سے جلد ہی ٹلے گی۔ ایجنٹ صاحب یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں سردار صاحب نے شہر میں منادی کروا دی ہے کہ اب کسی کو بستی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے میم صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔''

ونے: میم صاحب بہت دوراندیش ہیں۔

داروغہ: یہ نہایت اچھا ہوا۔ ورنہ فساد ضرور ہوجاتا اورسینکڑوں جانیں تلف ہوتیں ۔جیسا تم نے کہا میم صاحب نہایت دوراندیش ہیں۔ حالانکہ عمر ابھی کچھ نہیں ہے۔

ونے: آپ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کل یہاں سے چلی جائیں گی۔

داروغہ: ہاں اور کیا۔ سنی بات کہتا ہوں۔ حکام کی باتوں کی گھنٹہ گھنٹہ بھر میں خبر ملتی رہتی ہے۔ رسد اور بیگار جو ایک ہفتہ کے لیے لے جانے والی تھی بند کر دی گئی ہے۔

ونے: یہاں پھر نہ آئیں گی؟

داروغہ: تم تو اتنے بے قرار ہو گویا ان پر عاشق ہو۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا: ''مجھ سے انھوں نے کہا تھا کہ کل تمھیں دیکھنے آؤں گی۔''

داروغہ: کہا ہوگا۔ پر اب تو ان کی تیاری ہے یہاں تو خوش ہیں کہ بے داغ بچ گئے ورنہ اور سب جگہ جیلروں پر جرمانے ہوئے ہیں۔

داروغہ جی چلے گئے تو ونے سوچنے لگے۔ ''صوفیہ نے کل آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا اپنا وعدہ بھول گئی؟ اب نہ آئے گی؟ اگر ایک بار آجاتی تو میں اس کے قدموں پر گر کر کہتا۔ صوفیہ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ دیوی اپنی پرستش کرنے والے سے اس لیے تو ناراض نہیں ہوتی کہ وہ اس کے قدموں کو چھوتے ہوئے بھی جھجکتا ہے؟ یہ تو پوچھنے والے کی ناعقیدت مندی کا نہیں بلکہ عین عقیدت مندی کا ثبوت ہے۔''

جوں جوں دن گزرتا تھا۔ ونے کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ اس نے سوچا رات کو یہاں سے کسی طرح بھاگ کر صوفیہ کے پاس جا پہنچوں۔ وائے قسمت کہ وہ میری رہائی کا حکم نامہ تک لے کر آئی تھی۔ اس وقت میرے سر پر نہ جانے کون سا شیطان سوار ہوا تھا۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ونے سر جھکائے دفتر کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کیوں نہ پھر بے ہوشی کا بہانہ کر کے گر پڑوں ؟ یہاں سب لوگ پریشان ہو جائیں گے اور صوفیہ کو میری خبر ضرور مل جائے گی۔ اگر اس کی موٹر تیار ہوگی تو بھی وہ ایک بار مجھے دیکھنے ضرور آجائے گی۔ مگر مجھے تو سوانگ بھرنا بھی نہیں آتا۔ اپنے اوپر خود ہی ہنسی آجائے گی۔ کہیں ہنسی رک نہ سکی تو خفت اٹھانی پڑے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے بنا ہوا ہے۔ کاش اس قدر موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتی ۔ مگر شاید بارش کے دیوتا اندر کو بھی مجھ سے دشمنی ہے۔ آسمان پر بادل کا کہیں نام ونشان نہیں۔ گویا کسی قاتل کا بے رحم دل ہو۔ کلارک ہی کو کچھ ہو جاتا تو آج اس کا جانا رک جاتا۔

اب اندھیرا ہو گیا تو اسے صوفیہ پر غصہ آنے لگا۔ جب آج ہی اس کو یہاں سے چلا جانا تھا۔ تو اس نے مجھ سے کل آنے کا وعدہ ہی کیوں کیا؟ مجھ سے دیدہ و

دانستہ جھوٹ کیوں کہا؟ کیا اب کبھی ملاقات ہی نہ ہوگی۔ جبھی پوچھوں گا۔ اسے خود ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ یہ اس وقت پریشان ہے اس سے میرے دل کی حالت مخفی نہیں ہے۔ وہ اس کشمکش سے بخوبی واقف ہے جس میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف محبت وعقیدت ہے تو دوسری طرف اپنا عہد۔ ماں کی ناخوشی کا خوف اور بدنامی کا خیال اس قدر مختلف جذبات کے یکجا ہونے پر اگر کوئی بے معنی گفتگو کرنے لگے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ اس کو اس حالت میں مجھ سے ناخوش ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اپنی محبت آمیز ہمدردی سے میرے دل کی آگ کو فرو کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس کی یہی مرضی ہے کہ میں اسی حالت میں گھل گھل کر مر جاؤں۔ تو یہی سہی۔ یہ دل کی جلن زندگی کے ساتھ ہی مٹ جائے گی۔ آہ یہ دو دن کتنے خوشی کے دن تھے! رات ہو رہی ہے۔ پھر اسی تاریک اور گندی کوٹھری میں بند کیا جاؤں گا۔ کون پوچھے گا کہ مرتے ہو یا جیتے ہو۔ اس تاریکی میں چراغ کی روشنی نظر بھی آئی تو جب تک میں وہاں پہنچوں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

اتنے میں داروغہ پھر آئے۔ مگر اب کے وہ تنہا نہ تھے ان کے ساتھ ایک پنڈت جی بھی تھے۔ ونے سنگھ کو خیال آیا کہ میں نے ان پنڈت جی کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہ آتا تھا کہ کہاں۔ داروغہ جی دیر تک کھڑے رہ پنڈت جی سے باتیں کرتے رہے۔ ونے سے کوئی نہ بولا۔پس اس نے سمجھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہے۔ کوئی اور آدمی ہوگا۔

رات کو سب قیدی کھا پی کر لیٹے چاروں طرف کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ونے کانپ رہا تھا کہ مجھے بھی اپنی کوٹھری میں جانا پڑے گا۔ مگر نہ جانے کیوں اس کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔"

روشنی گل کر دی گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ونے اسی حالت اضطراب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیسے یہاں سے نکلوں۔ جانتا تھا کہ چارں طرف کے دروازے بند ہیں۔ نہ رسی ہے، نہ کوئی اوزار، نہ کوئی رفیق، نہ مددگار تاہم وہ منتظر اس دروازہ پر کھڑا تھا کہ شاید کوئی تدبیر سوجھ جائے۔ مایوسی میں انتظار اندھے کی لاٹھی کا کام دیتا ہے۔

دفعتاً سامنے سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ ونے نے سمجھا کوئی چوکی دار ہوگا۔

وہ ڈر گیا کہ مجھے یہاں کھڑا دیکھ کر کہیں اس کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ آہستہ کمرہ کی طرف چلا۔ اتنا بزدل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ توپ کے سامنے کھڑا ہوا سپاہی بھی بچھو کو دیکھ کر خائف ہو جاتا ہے۔ ونے کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے وہ آدمی بھی اندر آپہنچا ونے نے چونک کر پوچھا۔''تم کون ؟''

نایک رام بولے آپ کا غلام ہوں نایک رام پنڈا۔

ونے: تم یہاں کہاں؟ اب یاد آیا آج تمھیں تو داروغہ کے ساتھ پگڑی باندھے کھڑے تھے؟ ایسی صورت بنا لی تھی کہ پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ تم یہاں کیسے آگئے؟

نایک رام: آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔

ونے: جھوٹے ہو۔ یہاں کوئی ججمانی ہے کیا؟

نایک رام: ججمان کیسے۔ یہاں تو مالک ہی ہیں۔

ونے: کب آئے کب؟ وہاں تو سب خیریت ہے؟

نایک رام: ہاں سب خیریت ہی ہے۔ کنور صاحب نے جب سے آپ کا حال سنا ہے بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ رانی جی بھی بیمار ہیں۔

ونے: اماں جی کب سے بیمار ہیں؟

نایک رام: کوئی ایک مہینہ ہونے آیا ہے۔ بس گھلی جاتی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتی ہیں۔ نہ جانے کون روگ ہے کہ کسی بید حکیم ڈاکٹر کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ دور دور سے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں پر روگ کی تھاہ نہیں ملتی۔ کوئی کچھ بتاتا ہے ۔ کوئی کچھ ۔ کلکتہ سے کوئی کبیراج آئے ہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ اب یہ بچ نہیں سکتیں۔ ایسی گھل گئی ہیں کہ دیکھتے ہی ڈر لگتا ہے مجھے دیکھا تو دھیرے سے بولیں۔''پنڈا جی اب ڈیرا کوچ ہے۔'' میں کھڑا کھڑا روتا رہا۔

ونے نے سسکتے ہوئے کہا: ''ہائے ایشور۔مجھے ماں کے چرنوں کے درشن بھی نہ ہوں گے کیا؟''

نایک رام: میں نے جب بہت پوچھا سرکار کسی کو دیکھنا چاہتی ہو تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں ۔''ایک بار ونے کو دیکھنا چاہتی ہوں پر بھاگ میں دیکھنا بدا نہیں ہے۔ نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا ؟''

ونے اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو بولے۔
''اماں جی کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اب پریشان ہوں۔ کیسے ان کے درشن ہوں گے ؟ بھگوان نہ جانے کن پاپوں کی یہ سزا مجھے دے رہے ہیں۔''
نایک : میں نے پوچھا کہ حکم ہو تو جا کر انھیں لاؤں۔ اتنا سنا تھا کہ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ ''تم اسے لوالاؤ گے ؟ نہیں وہ نہ آئے گا۔ وہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ کبھی نہ آئے گا۔ اسے ساتھ لاؤ تو تمھارا بڑا احسان ہوگا۔'' اتنا سنتے ہی میں وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ اب دیر نہ کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماتا کی خواہش دل ہی میں رہ جائے اور آپ کو جنم بھر پچھتانا پڑے۔
ونے: کیسے چلوں گا ؟
نایک رام: اس کی چنتا مت کیجیے۔ لے تو میں چلوں گا۔ جب یہاں تک آگیا تو یہاں سے نکلنا کیا مُشکل ہے۔
ونے: کچھ سوچ کر بولے۔ پنڈا جی میں تو چلنے کے لیے تیار ہوں پر اندیشہ یہی ہے کہ کہیں اماں جی ناراض نہ ہو جائیں۔ تم تو ان کے سوبھاؤ کو نہیں جانتے۔''
نایک رام: بھیا اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ انھوں نے تو کہا ہے کہ جیسے بنے ویسے لاؤ۔ انھوں نے تو کہا کہ ماپھی (معافی) بھی مانگنی پڑے تو اس وقت مانگ لینی چاہیے۔
ونے: تو چلو کیسے چلتے ہو ؟
نایک رام: دیوال پھاند کر نکل جائیں گے۔ یہ کون مسکل ہے ۔
ونے سنگھ کو خیال ہوا کہ کہیں کسی کی نگاہ پڑ جائے تو صوفیہ اس بات کو سن کر کیا کہے گی۔ سارے حکام مجھ پر تالیاں پیٹیں گے۔ صوفیہ سوچے گی کہ بڑے سچے بنتے تھے۔ اب وہ سچائی کہاں گئی؟ کسی طرح صوفیہ کو یہ خبر دی جا سکتی تو وہ ضرور حکم نامہ بھیج دیتی۔ پر یہ بات نایک رام سے کیسے کہوں ؟ پکڑے گئے تو؟''
نایک رام: پکڑے گئے تو۔ پکڑے گا کون؟ کہیں کچی گولی نہیں کھیلے ہیں سب آدمیوں کو پہلے ہی سے گانٹھ رکھا ہے۔
ونے: خوب سوچ لو۔ پکڑے گئے تو پھر کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔

نایک رام: پکڑے جانے کا تو نام ہی لو۔ یہ دیکھو سامنے کئی اینٹیں دیوال سے ملا کر رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے وہ انتظام کر لیا ہے۔ میں اینٹوں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ میرے کندھے پر چڑھ کر اس رسی کو لیے ہوئے دیوال پر چڑھ جایئے گا۔ رسی اس طرف پھینک دیجیے گا۔ میں اسے ادھر مضبوط پکڑے رہوں گا آپ ادھر دھیرے سے اتر جایئے گا۔ پھر وہاں آپ رسی کو مضبوط پکڑے رہیے گا۔ میں بھی ادھر سے چلا آؤں گا۔ رسی بڑی مضبوط ہے۔ ٹوٹ نہیں سکتی۔ مگر ہاتھ چھوڑ نہ دیجیے گا۔ نہیں تو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔

یہ کہہ کر نایک رام رسی کا پلندہ لیے ہوئے اینٹوں کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے۔ ونے بھی آہستہ آہستہ چلے۔ دفعتا کسی چیز کے کھٹکنے کی آواز آئی۔ ونے نے چونک کر کہا۔ بھائی میں نہ جاؤں گا۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ ماتاجی کے درشن کرنا مجھے بدا نہیں ہے۔

نایک رام: تو اسی جیوٹ پر چلے تھے سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنے۔ خطرہ کے وقت حفظ مراتب کا خیال جاتا رہتا ہے۔

ونے: تم مجھے ضرور پھنساؤ گے۔

نایک رام: مرد ہو کر پھنسنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ پھنس ہی گئے تو کون چوڑیاں میلی ہو جائیں گی۔ دشمن کی قید سے بھاگنے میں لاج نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر وہ اینٹوں پر کھڑا ہوگیا اور ونے سے بولا۔ میرے کندھے پر آجاؤ۔

ونے: کہیں تم گر پڑے تو؟

نایک رام: تمھارے جیسے پانچ سوار ہو جائیں تو لے کر دوڑوں۔ دھرم کی کمائی میں بل ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ونے کا ہاتھ پکڑکر اس کو اپنے کندھے پر ایسی آسانی سے اٹھالیا گویا کوئی بچہ ہے۔

ونے: کوئی آرہا ہے۔

نایک رام: آنے دو۔ یہ رسی کمر میں باندھ لو اور دیوال پکڑ کر چڑھ جاؤ۔

اب ونے نے ہمت مضبوط کی۔ یہی فیصلہ کن موقع تھا۔ صرف ایک جست کی

ضرورت تھی۔ اوپر پہنچ گئے تو بیڑا پار ہے۔ نہ پہنچ سکے تو ذلت، بدنامی، سزا سب کچھ ہے۔ اوپر بہشت ہے نیچے دوزخ۔ اوپر نجات ہے نیچے قید۔ دیوار پر چڑھنے میں ہاتھوں کے سوا اور کسی چیز سے مدد نہ مل سکتی تھی۔ کمزور ہونے پر بھی فطرتاً مضبوط آدمی تھے۔ چھلانگ ماری اور بیڑا پار ہوگیا۔ دیوار پر جا پہنچے اور رسی پکڑ کر نیچے اتر پڑے۔ بدقسمتی سے پیچھے ہی دیوار سے ملی ہوئی گہری خندق تھی۔ جس میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا۔ ونے نے جیوں ہی رسی چھوڑی۔ گردن تک پانی میں ڈوب گئے اور پھر بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ پھر رسی پکڑ کر نایک رام کو اشارہ کیا۔ وہ مشتاق کھلاڑی تھا۔ دم زدن میں نیچے آ پہنچا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ دیوار ہی پر بیٹھا تھا اور پھر اترنے کی دیر تھی۔

ونے: دیکھنا کھائی ہے۔

نایک رام: میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ تم سے بتانے کی یاد ہی نہ رہی۔

ونے: تم اس کام میں ہوشیار ہو۔ میں کبھی نہ نکل سکتا۔ اب کدھر چلوگے؟

نایک رام: سب سے پہلے تو دیبی کے مندر میں چلوں گا اور وہاں سے پھر موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن کو۔ ایشور نے چاہا تو آج کے تیسرے دن گھر پہنچ جائیں گے۔ دیبی کی مدد نہ ہوتی تو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ کام نہ ہوتا۔ انھیں نے یہ سنکٹھ ہرا ہے۔ ان پر اپنا خون چڑھاؤں گا۔

اب دونوں آزاد تھے۔ ونے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے پیر خود بخود اٹھے جاتے ہیں۔ وہ اتنے ہلکے ہو گئے تھے۔ ذرا دیر میں دونوں سڑک پر آگئے۔

ونے: صبح ہوتے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جائے گی۔

نایک رام: تب تک ہم لوگ یہاں سے سو کوس پر ہوں گے۔

ونے: گھر سے بھی تو وارنٹ کے ذریعہ پکڑ کر منگا سکتے ہیں۔

نایک رام: وہاں کی چنتا مت کرو۔ وہ اپنا راج ہے۔

آج سڑک پر بڑی ہل چل تھی۔ سینکڑوں آدمی لالٹینیں لیے بستی سے چھاؤنی کی طرف جارہے تھے۔ ایک غول ادھر سے آتا تھا۔ دوسرا ادھر سے۔ عموماً لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ونے سنگھ کو حیرت ہوئی کہ آج یہ بھیڑ کیسی۔ عوام پر وہ سکون نما پریشانی چھائی ہوئی تھی جو کسی خوف ناک جوش کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن وہ کسی سے

کچھ پوچھ نہ سکتے تھے کہ پہچان نہ لیے جائیں۔
نایک رام: دیبی کے مندر تک تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔
ونے: پہلے ان آدمیوں سے تو پوچھو۔ کہاں دوڑے جارہے ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہو۔
نایک رام: ہوگی ہمیں ان باتوں سے کیا مطلب۔ چلو اپنی راہ چلیں۔
ونے: نہیں نہیں۔ ذرا پوچھو تو کیا بات ہے۔
نایک رام نے ایک آدمی سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نوبجے کے وقت ایجنٹ صاحب اپنی میم کے ساتھ موٹر پر بیٹھے ہوئے بازار کی طرف سے نکلے۔ موٹر بڑی تیزی سے جارہا تھا۔ چوراہے پر پہنچا تو ایک آدمی جو بائیں طرف سے آتا تھا موٹر کے نیچے آگیا۔ صاحب نے آدمی کو دبتے ہوئے دیکھا مگر موٹر کو نہ روکا۔ یہاں تک کہ کئی آدمی موٹر کے پیچھے دوڑے۔ بازار کے اس سرے تک آتے آتے موٹر کو بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ صاحب نے آدمیوں کو ڈانٹا کہ ابھی ہٹ جاؤ۔ جب لوگ نہ ہٹے تو انھوں نے پستول داغ دی۔ ایک آدمی فوراً گر پڑا۔ اب لوگ غصہ سے پاگل ہو کر صاحب کے بنگلہ کی طرف جارہے تھے۔
ونے نے پوچھا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟
ایک آدمی: جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ یہی ہوگا نہ۔ مارے جائیں گے مارے تو یوں ہی جارہے ہیں۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ دس پانچ آدمی مر گئے تو کون سنسار سونا ہو جائے گا۔
ونے کے ہوش اڑ گئے۔ یقین ہوگیا کہ اج کوئی فساد ضرور برپا ہوگا۔ بگڑی ہوئی رعایا وہ پانی کا سیلاب ہے جو کسی کے رکے نہیں رک سکتا۔ یہ لوگ جھلائے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں ان سے صبر وعفو کی باتیں کرنا فضول ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بنگلہ کو گھیر لیں۔ صوفیہ بھی وہیں ہے کہیں اس پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ غصہ میں شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نایک رام سے بولے۔ پنڈاجی ذرا بنگلہ تک ہوتے چلیں۔
نایک رام: کس کے بنگلے تک؟
ونے: پولیٹکل ایجنٹ کے۔

نایک رام: ان کے بنگلہ پر جاکر کیا کیجیے گا؟ یا ابھی تک اپکار سے جی نہیں بھرا۔ یہ جانیں وہ جانیں۔ ہم سے آپ سے مطلب؟

ونے: نہیں موقع نازک ہے۔ وہاں جانا ضروری ہے۔

نایک رام: ناحک اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ وہاں کچھ دنگا ہوجائے تو؟ آخر مرد ہیں۔ چپ چاپ کھڑے منہ تو دیکھتے نہ رہیں گے۔ دو چار ہاتھ ادھر یا ادھر چلا ہی دیں گے۔ بس دھر پکڑ ہوجائے گی۔ اس سے کیا فائدہ؟

ونے: کچھ ہی ہو۔میں یہاں یہ ہنگامہ ہوتے دیکھ کر اسٹیشن نہیں جا سکتا۔

نایک رام: رانی جی پل پل بھر میں پوچھتی ہوں گی۔

ونے: تو یہاں ہمیں کون دوچار دن لگ جاتے ہیں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

نایک رام: جب تمھیں کوئی ڈر نہیں ہے تو بہ‌اں کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے؟ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ دیکھنا میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔ یہ تم لے لو۔ جوکھم کا معاملہ ہے۔ میرے لیے یہ لکڑی کافی ہے۔

یہ کہہ کر نایک رام نے ایک دو نلی پستول کمر سے نکال کر ونے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ ونے پستول لیے ہوئے آگے بڑھے۔ جب شاہی محل کے نزدیک پہنچے تو اتنی بھیر دیکھی کہ ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا اور محل سے ایک گولی کے فاصلہ پر تو انھیں مجبور ہو کر رک جانا پڑا۔ سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ محل کے سامنے ایک برقی لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی صاف روشنی میں ہلتا، مچلتا، رکتا، ٹھٹھکتا ہوا لوگوں کا ہجوم اس طرح محل کی طرف جارہا تھا گویا اسے نگل جائے گا۔ محل کے سامنے اس ہجوم کو روکنے کے لیے وردی پوش سپاہیوں کی ایک قطار سنگین چڑھائے ہوئے خاموش کھڑی تھی اور اونچے چبوترہ پر کھڑی ہوئی صوفیہ کچھ کہہ رہی تھی مگر اس شور وغل میں اس کی آواز کچھ سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوی کی مورت ہے۔ جو صرف اشاروں سے کچھ کہہ رہی ہے۔

دفعتاً صوفیہ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیہ نے اونچی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ”میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ

یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔ ورنہ سپاہیوں کو مجبور ہو کر گولیاں چلانی پڑیں گی۔ ایک لمحہ میں یہ میدان صاف ہونا چاہیے۔''

بیر پال سنگھ نے آ کر کہا: ''رعایا اس قسم کی بدعتیں اب نہیں برداشت کرسکتی۔''

صوفیہ: اگر لوگ دیکھ بھال کر راستہ میں چلیں تو ایسے واقعے کیوں ہوں؟

بیر پال سنگھ: موٹر والوں کے لیے بھی کوئی قانون ہے یا نہیں؟

صوفیہ: ان کے لیے قانون بنانا تمھارے اختیار میں نہیں ہے۔

بیر پال سنگھ: ہم قانون بنا نہیں سکتے مگر اپنی جانوں کی حفاظت تو کر سکتے ہیں۔

صوفیہ: تم بغاوت پر آمادہ ہو اور تم خود اس کے برے نتائج کے ذمہ دار ہوگے۔

بیر پال سنگھ: ہم باغی نہیں ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمارا ایک بھائی کسی موٹر کے نیچے دب جائے۔ چاہے وہ موٹر مہارانا ہی کا کیوں نہ ہو اور ہم منہ نہ کھولیں۔

صوفیہ: وہ محض اتفاق تھا۔

بیر پال سنگھ: احتیاط اس اتفاقی حادثہ کو ٹال سکتی تھی۔ اب ہم اس وقت تک یہاں سے نہ جائیں گے۔ جب تک ہم سے وعدہ نہ کیا جائے گا کہ آئندہ ایسے ناگوار واقعات کے لیے مجرم کو مناسب سزار دی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

صوفیہ: اتفاقیہ باتوں کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ......

صوفیہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کسی نے ایک پتھر اس کی طرف پھینکا جو اس کے سر میں اتنے زور سے لگا کہ وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگر ونے فوراً کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر عوام کو سمجھاتے تو شاید فساد نہ ہوتا اور لوگ چپ چاپ اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ صوفیہ کا زخمی ہوجانا عوام کا غصہ فرو کرنے کے لیے کافی تھا مگر جو پتھر صوفیہ کے سر میں لگا۔ وہی کئی گنا زور کے ساتھ ونے کے سینہ پر دل پر لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جامہ سے باہر ہو گیا۔ مجمع کو زبردستی ہٹاتا آدمیوں کو دھکے دیتا کچلتا ہوا صوفیہ کی بغل میں جا پہنچا۔ پستول کمر سے نکالی اور بیر پال سنگھ پر گولی چلا دی۔ پھر کیا تھا۔ سپاہیوں کو گویا حکم مل گیا۔ انھوں نے بندوقیں سر کرنی شروع کر دیں۔ کہرام مچ گیا لیکن پھر بھی لوگ کئی منٹ تک وہیں کھڑے گولیوں کا جواب اینٹ پتھر سے دیتے رہے۔ دوچار بندوقیں ادھر سے بھی چلیں۔ بیر پال سنگھ بال بال بچ گیا اور

ونے کے نزدیک ہونے کے سبب انھیں پہچان کر بولا: آپ بھی انھیں میں ہیں۔

ونے: قاتل!

بیر پال سنگھ: پرماتما ہم سے روٹھ گیا ہے۔

ونے: تمھیں ایک عورت پہ ہاتھ اُٹھاتے شرم نہیں آتی؟

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ونے سنگھ ہیں۔ یہ کہاں سے آگئے؟ یہ بھی ادھر مل گئے۔ انھیں نے تو پستول چھوڑی ہے۔

''بنا ہوا تھا۔ گھر کا بھیدی لنکا داہ۔''

''شاید شرط پر چھوڑے گئے ہیں''

''دولت کی ہوس سر پر سوار ہے۔''

''مار دو ایک پتھر۔ سر پھٹ جائے۔ یہ بھی ہمارا دشمن ہے۔'

''دغاباز ہے۔''

'اتنا بڑا آدمی اور تھوڑے سے روپوں کے لیے ایمان بیچ بیٹھا۔''

بندوقوں کی باڑھ کے سامنے نہتے لوگ کب تک ٹھہرتے۔ جب اپنی طرف کئی آدمی لگاتار گرے تو بھگدڑ پڑگئی۔ کوئی ادھر بھاگا۔ کوئی ادھر۔ مگر بیر پال سنگھ اور اس کے ساتھی پانچوں سوار جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ محل کے پیچھے کی طرف سے ونے سنگھ کے سر پر جاپہنچے۔ تاریکی میں کسی کی نگاہ ان پر نہ پڑی ونے نے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سنی تو چونکے۔ پستول چلائی مگر وہ خالی تھی۔

بیر پال سنگھ نے طنز سے کہا: آپ تو رعایا کے دوست بنتے تھے۔

ونے: تم جیسے قاتلوں کی مدد کرنا میرا قاعدہ نہیں۔

بیر پال: مگر ہم اس سے اچھے ہیں جو حکام سے مل کر رعایا کی گردن پر چھری چلائے۔

ونے سنگھ غضبناک ہو کر باز کی طرح جھپٹے کہ اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لیں۔ مگر بیر پال کے ایک ساتھی نے جھپٹ کر ونے سنگھ کو نیچے گرادیا اور دوسرا ساتھی تلوار لے کر ان کی طرف لپکا ہی تھا کہ صوفیہ جو اب تک بے ہوش سی زمین پر پڑی ہوئی تھی چیخ مار کر اٹھی اور ونے سنگھ سے لپٹ گئی۔ تلوار اپنے نشانہ پر نہ پہنچ کر صوفیہ کے ماتھے پر پڑی۔ اتنے میں نایک رام لاٹھی لیے ہوئے آپہنچا اور لاٹھی چلانے لگا۔ دو

باغی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بیر پال سنگھ اب تک ششدر اور ساکت کھڑا تھا۔ نہ اسے معلوم تھا کہ صوفیہ کو پتھر کس نے مارا۔ نہ اس نے اپنے ساتھیوں ہی کو ونے پر حملہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے مگر اس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا مگر اب اپنے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر وہ بے لاگ نہ رہ سکا۔ اس نے بندوق کا کندا تان کر اتنی زور سے نایک رام کے سر پر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور ایک لمحہ میں اس کے تینوں ساتھی اپنے زخمی ساتھیوں کو لے کر بھاگ نکلے۔ ونے سنگھ سنبھل کر اٹھے تو دیکھا کہ بغل میں نایک رام خون سے شرابور بے ہوش پڑا ہے اور صوفیہ کا کہیں پتا نہیں۔ اسے کون لے گیا۔ کیوں لے گیا۔ کیسے لے گیا۔ ان باتوں کی انھیں مطلق خبر نہ تھی۔ میدان میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ دو چار لاشیں البتہ ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں۔

مسٹر کلارک کہاں تھے؟ طوفان اٹھا اور گیا۔ آگ لگی اور بجھی مگران کا کہیں پتہ تک نہیں وہ شراب کے نشہ میں مخمور۔ دین دنیا سے بے خبر۔ اپنی خواب گاہ میں پڑے ہوئے تھے۔ باغیوں کا شور سن کر صوفیہ محل سے نکل آئی تھی۔ مسٹر کلارک کو اس لیے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے آنے سے عوام کے قتل کیے جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے پر امن ذرائع سے امن قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اسی کا یہ انجام تھا۔ وہ پہلے ہی سے ہوشیار ہو جاتی تو شاید یہ حالت اتنی نازک نہ ہونے پاتی۔

ونے نے نایک رام کو دیکھا۔ نبض کا پتہ نہ تھا آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ فکر رنج اور پشیمانی سے دل اتنا بیقرار ہوا کہ وہ رو پڑے۔ فکر تھی ماں کی کہ ان کے درشن بھی نہ کرنے پایا۔ غم تھا صوفیہ کا کہ نہ جانے اسے کون لے گیا۔ پشیمانی تھی اپنے غصہ پر کہ میں ہی اس بغاوت اور قتل کا سبب ہوں۔

آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مگر ونے کے قلبی آسمان پر چھائی ہوئی غم کی گھٹا اس سے کہیں زیادہ کالی اور گھنگھور تھی۔

(29)

مسٹر ولیم کلارک اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح شراب کے شائق ضرور تھے۔ مگر

اس کے عادی نہ تھے وہ ہندوستانیوں کی طرح پی کر بدمست ہونا نہ چاہتے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہونا جانتے تھے۔ مگر اس کو قابوں سے باہر نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن آج صوفیہ نے دیدہ و دانستہ ان کو معمول سے زیادہ پلادی تھی۔ حوصلہ دلاتی جاتی تھی۔'' واہ اتنی ہی۔ ایک گلاس اور تو لو۔ اچھا یہ میری خاطر سے۔ واہ ابھی تم نے میرا جام صحت تو پیا ہی نہیں۔'' صوفیہ نے ونے سے کل ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر ان کی باتیں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی۔ ونے نے آج یہ نئے بہانے کیوں ڈھونڈ نکالے؟ میں نے ان کے لیے مذہب کی بھی پرواہ نہیں کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب میرے پاس اور کون سی تدبیر ہے؟ کیا محبت کا دیوتا اتنا سنگدل ہے۔ کیا وہ بڑی سے بڑی بھینٹ پا کر بھی راضی نہیں ہوتا؟ ماں کی ناراضگی کا اتنا خوف انھیں کبھی نہ تھا۔ کچھ نہیں اب ان کی محبت گھٹ گئی ہے۔ مردوں کا دل ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ اپنی ناقابلیت کا تذکرہ ان کے منہ سے کتنا غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو اتنے پروپکاری، اتنے تیاگی، اتنے سچے، اتنے فرض شناس ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں تمھارے قابل نہیں ہوں۔ ہائے وہ کیا جانتے ہیں کہ میں ان سے کتنی گہری عقیدت رکھتی ہوں۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے قدم چھو سکوں۔ کتنا پاک دل ہے۔ کتنا اونچا خیال۔ کتنا روحانی ایثار! نہیں۔ وہ مجھ سے دور رہنے ہی کے لیے یہ حیلہ کر رہے ہیں۔ انھیں خوف ہے کہ میں ان کے پیروں کی زنجیر بن جاؤں گی۔ انھیں فرض کے راستہ سے ہٹا دوں گی۔ ان کو معیار سے الگ کر دوں گی۔ میں ان کے اس خوف کو کیسے رفع کروں؟

دن بھر انھیں خیالات میں غرق رہنے کے بعد شام کو وہ اتنی مضطرب ہوئی کہ اس نے رات ہی کو ونے سے پھر ملنے کا قصد کیا۔ اس نے کلارک کو شراب پلا کر اسی لیے بے ہوش کر دیا تھا کہ اس کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ جیل کے حکام سے اسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ اس وقفہ کو ونے سے منت وسماجت کرنے میں ان کی سوئی ہوئی محبت کو جگانے میں ان کے شکوک کو رفع کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی کوشش اسی کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ مسٹر کلارک موقع پر پہنچ سکتے تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ

ہونے پاتا۔ کم از کم صوفیہ کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ کلارک صاحب اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس کی حفاظت کرتے۔ صوفیہ نے اس سے دغا کرکے اپنا ہی ستیاناس مار لیا۔ اب وہ نہ جانے کہاں اور کس حالت میں تھی۔ عموما لوگوں کا خیال تھا کہ باغیوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش کو زیورات کے طمع سے اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف ونے سنگھ اس بات سے متفق نہ تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صوفیہ ابھی زندہ ہے۔ باغیوں نے ضمانت کے طور پر اس کو اپنے یہاں قید کر رکھا ہے کہ انھیں صلح کی شرائط طے کرنے میں انھیں آسانی ہو۔ صوفیہ ریاست کو دبا دینے کے لیے ان کے ہاتھوں میں ایک آلہ کی طرح تھی۔

اس سانحہ سے ریاست میں تہلکہ مچ گیا۔ حکام آپ سے ڈرتے تھے اور رعایا اپنے لیے۔ اگر ریاست کے ملازموں ہی تک معاملہ رہتا تو زیادہ تشویش کی بات نہ تھی۔ ریاست خون کا بدلہ خون سے لے کر مطمئن ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک کی جگہ چار کو قتل کر ڈالتی۔ مگر صوفیہ کے درمیان میں پڑ جانے سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا تھا۔ وہ اب ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ خود ریاست پر کوئی زوال نہ آجائے۔ اس لیے ملزموں کی گرفتاری میں غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی سے کام لیا جا رہا تھا۔ ذرا سا شبہ ہونے پر بھی لوگوں کو ماخوذ کر لیا جاتا تھا اور انھیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ گواہ اور ثبوت کی کوئی پوچھ نہ تھی۔ ان ملزموں کا مواخذہ کرنے کے لیے ایک علیحدہ عدالت قائم کر دی گئی تھی۔ وہاں انصاف کرنے کے لیے (؟) رعایا کے چنے چنے دشمنوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ عدالت کسی کو چھوڑنا نہ جانتی تھی۔ کسی ملزم کو سزائے موت دینے کے لیے ایک سپاہی کی شہادت کافی تھی۔ سردار نیل کنٹھ بلا کھائے پیئے صبح شام تک ملزموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہزہائی نس مہاراجہ صاحب خود ہی شملہ، دہلی اور اودے پور ایک کیے ہوئے تھے۔ پولیس کے اہلکاروں کے نام روزانہ تاکیدیں بھیجی جاتی تھیں۔ اور ادھر شملہ سے بھی تاکیدوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تاکیدوں کے بعد دھمکیاں آنے لگیں۔ اسی مناسبت سے یہاں رعایا کے ساتھ بھی حکام کی سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ مسٹر کلارک کو یقین تھا کہ اس معاملہ میں ریاست کا ہاتھ بھی ضرور تھا۔ اگر ریاست نے پیشتر ہی سے باغیوں

کا رہنا ناممکن کر دیا ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے حکام بھی ان کے سامنے جاتے ہوئے کانپتے تھے۔ وہ دورہ پر نکلتے تو ایک اور انگریزی رسالہ ساتھ لے لیتے۔ علاقہ کے علاقے اجڑوا دیتے۔ گاؤں تباہ کر دیتے یہاں تک کہ عورتوں پر بھی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ریاست اور کلارک ان تمام بداعمالیوں میں ونے بھی دل وجان سے شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ان پر دیوانگی سی طاری تھی۔ خدمت و ایثار کے خیالات ان کے دل سے یک قلم محو ہوگئے تھے۔ صوفیہ اور اس کے دشمنوں کا سراغ لگانے کی کوشش بس یہی ایک کام ان کے لیے رہ گیا تھا۔ مجھے دنیا کیا کہتی ہے۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ماتا جی کا کیا حال ہوا۔ ان باتوں کی طرف اب ان کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ اب تو وہ ریاست کے دست راست بنے ہوئے تھے۔ حکام انھیں وقتاً فوقتاً اور بھی اشتعال دیتے رہتے تھے۔ باغیوں کے دبانے میں کوئی پولیس کا اہلکار یا ریاست کا نوکر اتنا بے انس بے انصاف اور بے پرواہ نہ بن سکتا تھا۔ ان کی وفاداری کی کوئی حد نہ تھی یا یوں کہیے کہ اس وقت وہ ریاست کے ایک خاص رکن بنے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ سردار نیل کنٹھ بھی ان سے دبتے تھے۔ مہارانا صاحب کو ان پر اتنا اعتبار تھا کہ ان کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ان کے آنے جانے میں کوئی روک نہ تھی اور مسٹر کلارک سے تو ان کی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں ایک ہی بنگلہ میں رہتے تھے اور درپردہ سردار صاحب کی جگہ پر ونے کی تقرری کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔

تقریباً ایک سال تک تمام ریاست میں یہی حال رہا جب جسونت نگر باغیوں سے پاک و صاف ہو گیا یعنی وہاں کوئی جوان شخص باقی نہ رہ گیا تو ونے خود ہی صوفیہ کے پتہ لگانے پر آمادہ ہوا۔ ان کی مدد کے لیے خفیہ پولیس کے کئی تجربہ کار اہلکار تعینات کیے گیے تھے۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نایک رام ابھی تک کمزور تھے۔ ان کے بچنے کی کوئی امید ہی باقی نہ رہی تھی۔ مگر زندگی باقی تھی بچ گئے۔ انھوں نے ونے کو جانے پر آمادہ دیکھا تو ہمراہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جا کر بولے۔''بھیا۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہاں اکیلا نہ رہوں گا۔''

ونے: میں کہیں پردیس تھوڑا جاتا ہوں۔ ساتویں روز یہاں آیا کروں گا۔ تم سے ملاقات

ہو جائے گی۔
سردار نیل کنٹھ وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے: ابھی تم جانے کے قابل نہیں ہو۔
نایک رام: سردار صاحب آپ بھی انھیں کی سی کہتے ہیں ان کے ساتھ نہ رہوں گا تو رانی جی کو کون سا منھ دکھاؤں گا۔
ونے: تم یہاں زیادہ آرام سے رہ سکوگے۔ تمھارے ہی بھلے کے لیے کہتا ہوں۔
نایک رام: سردار صاحب۔ اب آپ ہی بھیا کو سمجھایئے۔ آدمی ایک گھڑی کی نہیں چلاتا۔ ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے۔ پھر مورچہ لینا ہے بیر پال سنگھ سے جس کا لوہا میں بھی مانتا ہوں۔ میری کئی لاٹھیاں اس نے ایسی روک لیں کہ ایک بھی پڑ جاتی تو کام تمام ہو جاتا۔ پکا پھینکیت ہے۔ کیا میری جان تمھاری جان سے زیادہ پیاری ہے۔
نیل کنٹھ: ہاں بیرپال ہے تو ایک ہی شیطان، نہ جانے کب کدھر سے کتنے آدمیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ اس کے گوینڈے ساری ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں۔
نایک رام: تو ایسے جوکھم میں کیسے ان کا ساتھ چھوڑ دوں؟مالک کی چاکری میں جان بھی نکل جائے تو کیا غم ہے۔ اور یہ زندگی ہے کس لیے؟
ونے: بھئی بات یہ ہے کہ میں اپنے لیے کسی غیر کی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا۔
نایک رام: ہاں جب آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ہاں غیر تو ہوں ہی۔ غیر نہ ہوتا تو رانی جی کے اشارہ پر یہاں کیسے دوڑتا آتا۔ جیل میں جا کر کیسے باہر نکال لاتا اور سال بھر تک کھاٹ کیوں سیتا۔ سردار صاحب ہجور ہی اب نیائے کیجیے۔ میں غیر ہوں؟ جس کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں وہی غیر سمجھتا ہے۔
نیل کنٹھ: ونے سنگھ یہ آپ کا انیائے ہے۔ آپ انھیں غیر کیوں کہتے ہیں؟ اپنے خیر خواہوں کو غیر کہنے سے انھیں رنج پہنچتا ہے۔
نایک رام: بس سردار صاحب۔ ہجور نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی پولیس کے آدمی غیر نہیں اور میں غیر ہوں۔
ونے: اگر غیر کہنے سے تمھیں رنج ہوتا ہے تو میں یہ لفظ واپس لیتا ہوں۔ میں نے غیر صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمھاری نسبت مجھے گھر والوں کو جواب دینا پڑے گا۔ پولیس والوں کے لیے تو کوئی مجھ سے جواب نہ طلب کرے گا۔

نایک رام: سردار صاحب اب آپ ہی اس کا جواب دیجیے یہ میں کیسے کہوں کہ مجھے کچھ ہوگیا۔ تو کنور صاحب کچھ پوچھ تاچھ نہ کریں گے۔ ان کا بھیجا ہوا آیا ہی ہوں۔ بھیا کو جواب دہی تو ضرور کرنی پڑے گی۔

نیل کنٹھ: یہ مانا کہ تم ان کے بھیجے ہوئے آئے ہو مگر تم اتنے نادان نہیں ہو کہ تمھارے نفع نقصان کی ذمہ داری ونے سنگھ کے سر ہو۔ تم اپنا بھلا برا آپ سمجھ سکتے ہو۔ کیا کنور صاحب اتنا بھی نہ سمجھیں گے؟

نایک رام: اب کہیے دھرما اوتار۔ اب تو مجھے لے چلنا پڑے گا۔ سردار صاحب نے میری ڈگری کر دی۔ میں کوئی نابالگ (نابالغ) نہیں ہوں کہ سرکار کے سامنے آپ کو جواب دینا پڑے۔

بالآخر ونے سنگھ نے نایک رام کو ساتھ لے جانا منظور کر لیا۔ اور دو تین دن کے بعد دس آدمیوں کی ایک جماعت بھیس بدل کر، سب طرح تیار ہو کر، سراغرساں کتوں کو ساتھ لیے آمد و رفت کے ناقابل پہاڑی راستوں میں داخل ہوئی۔ پہاڑوں سے آگ نکل رہی تھی۔ اکثر کوسوں تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملتا۔ راستے پتھریلے، درختوں کا پتہ نہیں۔ دوپہر کو لوگ غاروں میں آرام کرتے تھے۔ رات کو بستی سے لگے کسی چوپال یا مندر میں سو رہتے۔ دو دو آدمی ایک ساتھ رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار سب آدمیوں کو ایک ہی جگہ پر جمع ہونا پڑتا دوسرے روز کا دستور العمل طے کر کے لوگ پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔ نایک رام اور ونے سنگھ کی ایک جوڑی تھی۔ نایک رام ابھی تک چلنے پھرنے میں کمزور تھا۔ پہاڑوں کی چڑھائی میں تھک کر بیٹھ جاتا۔ خوراک کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ کمزور اتنا ہوگیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لیکن ونے سنگھ پر جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ دیہاتیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مختلف مزاج اور رتبہ کے لوگوں سے واقف تھا۔ جس گاؤں میں پہنچتا دھوم مچ جاتی کہ کاشی سے پنڈا جی آئے ہیں۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نائی، کہار آپہنچتے۔ دودھ، گھی، پھل، پھول، سبزی، ترکاری وغیرہ کی افراط ہوجاتی۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورت بے دھڑک پنڈا جی کے پاس آتے۔ اور انھیں حسب مقدور دکشنا دیتے۔ پنڈا جی باتوں باتوں میں ان سے گاؤں کا سارا حال دریافت کر لیتے۔ ونے

سنگھ کو اب معلوم ہوا کہ نایک رام ساتھ نہ ہوتے تو مجھے کتنی دقتیں پیش آتیں۔ وہ خود کم سن، متین اور شرمیلے آدمی تھے۔ ان میں وہ تحکمانہ انداز نہ تھا جو عوام پر اپنا رعب جما لیتا ہے۔ نہ ان میں وہ شیریں کلامی تھی جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے۔ ایسی حالت میں نایک رام کا ساتھ ہونا ان کے لیے خدائی مدد سے کم نہ تھا۔

راستہ میں کبھی کبھی خونخوار درندوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر نایک رام سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ ایک روز چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ دور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ دھوپ کی شدت سے ایک ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ کوئی کنواں یا تالاب بھی نظر نہ آتا تھا۔ دفعتاً ایک اونچا ٹیکرا دکھائی دیا۔ نایک رام اس پر چڑھ گیا کہ شاید اوپر سے کوئی گاؤں یا کنواں نظر آئے۔ اس نے چوٹی پر پہنچ کر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو دور پر ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ ںیں ایک لکڑی اور پیٹھ پر ایک تھیلی تھی۔ کوئی بغیر وردی کا سپاہی معلوم پڑتا تھا۔ نایک رام اسے پہچان گئے۔ یہ ونے سنگھ کے ساتھ ایک رضار کار تھا۔ اسے اشار سے بلایا اور ٹیلے سے اتر کر اس کے پاس گئے۔ اس قومی رضا کار کا نام اندردت تھا۔

اندردت نے پوچھا: تم یہاں کیسے آپھنسے جی؟ تمھارے کنور کہاں ہیں؟

نایک رام: پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی گاؤں بھی ہے کہیں دانہ پانی مل سکتا ہے؟

اندردت: جس کے رام دھن اسے کون کمی۔ کیا راج دربار نے بھوجن کی رسد نہیں لگائی۔ تیلی سے بیاہ کر کے تیل کا رونا۔

نایک رام: کیا کروں بھائی۔ برا پھنس گیا ہوں۔ نہ رہتے بنتا ہے نہ جاتے۔

اندردت: ان کے ساتھ تم بھی اپنی مٹی خراب کر رہے ہو۔ کہاں ہیں آج کل؟

نایک رام: کیا کروگے؟

اندروت: کچھ نہیں ذرا ملنا چاہتا تھا۔

نایک رام: ہیں تو وہ بھی یہیں۔ بھینٹ ہو جائے گی۔ تھیلی میں کچھ ہے؟ اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں ونے سنگھ کے پاس پہنچے۔ ونے نے اندروت کو دیکھا تو غصہ سے بولا۔ ''اندردت تم کہاں؟ گھر کیوں نہیں گئے؟

اندردت: آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی آپ سے کتنی باتیں کرنی ہیں ۔پہلے یہ

بتایئے کہ آپ نے یہ چولا کیوں بدلا؟
نایک رام: پہلے تم اپنی تھیلی میں سے کچھ نکالو۔ پھر باتیں ہوں گی۔
ونے سنگھ اپنی کایا پلٹ کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔
بولے: ''اس لیے کہ مجھے اپنی بھول معلوم ہو گئی۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ رعایا بڑی متحمل اورامن پسند ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ کمینہ اور پاجی ہے۔ اس کو جوں ہی اپنی طاقت کا کچھ احساس ہو جاتا ہے وہ اسے برے طریقہ پر استعمال کرنے لگتی ہے۔ جو آدمی طاقت کے پیدا ہوتے ہی پاگل ہو جائے اس کا کمزور اور پامال رہنا ہی اچھا ہے۔ گذشتہ بغاوت کا ہونا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے۔ ایسی حالت میں میں نے جو کچھ کیا اورکر رہا ہو ں وہ بالکل قرین انصاف اور قرین مصلحت ہے۔
اندردت: کیا آپ کی رائے میں رعایا کو چاہیے کہ خواہ اس پر کتنے ہی مظالم کیے جائیں پر وہ زبان نہ ہلائے؟
ونے: ہاں موجودہ حالت میں اس کا یہی فرض ہے۔
اندردت: اس کے رہنماؤں کو بھی یہی معیار اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے؟
ونے: بے شک۔
اندردت: تو جب آپ نے رعایا کو بغاوت پر آمادہ دیکھا تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر تحمل اور امن کا وعظ کیو ں نہیں دیا؟
ونے: بالکل فضول تھا۔ اس وقت کوئی میری نہ سنتا۔
اندردت: اگر نہ سنتا تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ دونوں صفوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر پہلے آپ خود ہی گولی کا نشانہ بن جاتے؟
ونے: میں اپنی زندگی کو اتنی ہیچ نہیں سمجھتا۔
اندردت: جو زندگی قومی خدمت کے لیے وقف ہو چکی اس کے لیے اس سے بہتر اور کون موت ہو سکتی تھی؟
ونے: آگ میں کودنے کا نام خدمت نہیں ہے۔ اس پر تشدد کرنا ہی اس کی خدمت کرنا ہے۔
اندردت: اگر یہ خدمت نہیں ہے تو غریب رعایا کو اپنے نفس پر قربان کر دینا بھی

خدمت نہیں ہے۔ بہت ممکن تھا کہ صوفیہ نے اپنے دلائل سے بیر پال سنگھ کو لاجواب کر دیا ہوتا۔ مگر آپ نے مغلوب النفس ہو کر پستول کا وار کیا اور اس لیے اس کشت وخون کا سارا الزام آپ ہی کے گردن پر ہے۔ اور جلد یا دیر آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں رعایا کو آپ کے نام سے کتنی نفرت ہے؟ اگر کوئی شخص آپ کو یہاں دیکھ کر پہچان جائے تو اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ آپ کے اوپر تیر چلائے۔ آپ نے یہاں کی رعایا کے ساتھ، اپنے رفیقوں کے ساتھ، اپنی قوم کے ساتھ اور سب سے زیادہ اپنی قابل تعظیم ماں کے ساتھ جو دغا کی ہے۔ اس کا الزام کبھی آپ کے سر سے دور نہ ہوگا۔ شاید رانی جی آپ کو دیکھیں تو اپنے ہاتھوں سے آپ کی گردن پر تلوار پھیر دیں۔ آپ کی زندگی سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ انسان کا کتنا اخلاقی زوال ہو سکتا ہے۔

ونے نے کسی قدرم نرم لہجہ میں کہا۔''اندردت۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے خود غرضی سے حکام کی مدد کی تو تم میرے ساتھ سخت نا انصافی کر رہے ہو۔ رعایا کا ساتھ دینے میں جتنی آسانی سے نیک نامی مل سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ آسانی سے حکام کا ساتھ دینے میں بدنام ہو جانا یقینی ہے۔ یہ میں جانتا تھا لیکن خادم کافرض نیک نامی اور بدنامی کا لحاظ کرنا نہیں ہے۔ اس کا فرض سچائی کے راستہ پر چلنا ہے۔ میں نے قومی خدمت کا عہد کیاہے اور ایشور نہ کرے کہ میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔ جب میرے خدمتی جذبہ میں خودغرضی کا شائبہ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں رعایا کی نامناسب روش دیکھ کر بھی اس کی حمایت کروں۔ میرا عہد میری عقل کا خون نہیں کر سکتا۔

اندردت: کم از کم اتنا تو آپ مانتے ہی ہیں کہ اپنے فائدہ کے لیے عوام کو نقصان نہ پہنچانا چاہیے۔

ونے: تم مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔ میں عوام کے لیے سچائی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ سچائی مجھ کو ملک وقوم دونوں سے زیادہ عزیز ہے۔ جب تک میں سمجھتا تھا کہ رعایا حق بجانب ہے، میں اس کی حفاظت کرتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے حق سے انحراف کیا ہے تو میں نے بھی اس سے اپنا منہ موڑ لیا۔ مجھے ریاست کے حکام

سے کوئی دلی عناد نہیں ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں کہ حکام کو راہ حق پر دیکھ کر بھی خواہ مخواہ ان سے دشمنی کروں اور نہ مجھ سے یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا کو بغاوت اور سرکشی پر آمادہ دیکھ کر بھی اس کی مدد کروں۔ اگر کوئی شخص مس صوفیہ کے موٹر کے نیچے دب گیا۔ تو یہ ایک اتفاقی بات تھی۔ صوفیہ نے جان بوجھ کر تو اس پر سے اپنا موٹر چلا نہیں دیا۔ ایسی حالت میں رعایا کا یوں برانگیختہ ہو جانا اس امر کا بین ثبوت تھا کہ وہ حکام کو بزور اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ آپ صوفیہ کے تعلق سے میرے اطوار پر حملہ کر کے صرف میرے ساتھ بے انصافی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ خود اپنے کو بھی ذلیل کر رہے ہیں۔

اندردت: یہ ہزاروں آدمی بلا کسی قصور کے کیوں قتل ہوئے؟ کیا یہ بھی رعایا کا ہی قصور تھا؟

ونے: اگر آپ حکام کی مشکلات سے ذرا بھی واقف ہوتے تو ہرگز یہ سوال نہ کرتے۔ میں اس کے لیے آپ کو معاف کرتا ہوں۔ ایک سال قبل جب حکام سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ شاید کہ میں بھی ایسا ہی خیال کرتا۔ لیکن اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ انھیں ایسے مواقع پر انصاف سے کام لینے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ذی اختیار ہوتے ہی انسان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے انسان فطرتاً انصاف پسند ہوتا ہے۔ اسے کسی کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ اتنا ہی رنج ہوتا ہے جتنا کسی خادم قوم کو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خادم قوم کسی غیر کو مورد الزام قرار دے کر اپنے کو خوش کر لیتا ہے۔ یہیں اس کا فرض تمام ہوجاتا ہے۔ حکام کو یہ موقع نہیں ملتا۔ وہ خود اپنے رویہ کی صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ آپ کو خبر نہیں کہ حکام نے ملزموں کو ڈھونڈ نکالنے میں کتنی دقتیں اٹھائیں۔ رعایا ملزموں کو چھپا لیتی تھی اور کسی سیاسی اصول کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے ملزموں کے ساتھ بے گناہوں کا ماخوذ ہو جانا ممکن ہی تھا۔ پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس بغاوت نے ریاست کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ انگریزی سرکار کو شک ہے کہ دربار ہی کی وجہ سے یہ ساری سازش ہوئی۔ اب دربار کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اس الزام سے بری کرے اور جب تک مس صوفیہ کا سراغ نہیں مل جاتا۔ ریاست کی حالت نہایت نازک اور تشویشناک ہے۔

ہندوستانی ہونے کے سبب میرا فرض ہے کہ ریاست کے چہرہ سے اس داغ کو مٹادوں۔ خواہ اس کے لیے مجھے کتنی ہی ذلت، کتنی ہی بدنامی، کتنی ہی سخت کلامی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خادم قوم کی حالت کوئی مستقل صورت نہیں رکھتی۔ گرد وپیش کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ میں ریاست کا جانی دشمن تھا۔ آج اس کا جان نثار خادم ہوں اور اس کے لیے مجھے ذرا بھی ندامت نہیں ہے۔

اندردت: ایشور نے آپ کو بحث کے لیے عقل دی ہے اور اس سے آپ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کی کوئی تاویل رعایا کے دل سے یہ خیال دور نہیں کر سکتی کہ آپ نے اس کے ساتھ دغا کی اور اس دغا کی جو سزا آپ کو صوفیہ کے ہاتھوں ملے گی اس سے آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

ونے نے اس طرح جھپٹ کر اندردت کا ہاتھ پکڑلیا گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو اور بولے تمھیں صوفیہ کا پتہ معلوم ہے؟

اندردت: نہیں۔

ونے: جھوٹ بولتے ہو۔

اندردت: ہوسکتا ہے۔

ونے: تمھیں بتانا پڑے گا۔

اندردت: آپ کو اب مجھ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رہا۔ آپ کا یا دربار کا مقصد پورا کرنے کے لیے میں دوسروں کی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ آپ نے ایک مرتبہ دغا کی ہے اور پھر کر سکتے ہیں۔

نایک رام: بتادیں گے۔ آپ کیوں اتنے گھبرائے جاتے ہیں۔ اتنا تو بتا ہی دو بھیا اندردت کہ میم صاحب کسل (خیرت) سے ہیں نا؟

اندردت: ہاں اچھی طرح ہیں اور خوش ہیں۔ کم سے کم ونے سنگھ کے لیے کبھی بے چین نہیں ہوتیں۔ سچ پوچھو تو انھیں اب ان کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔

ونے: اندردت ہم اور تم بچپن کے دوست ہیں۔ تمھیں ضرورت ہو تو میں اپنی جان تک دے دوں مگر تم اتنی ذرا سی بات بتلانے سے انکار کر رہے ہو۔ یہی دوستی ہے؟

اندردت: دوستی کے پیچھے دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالوں۔
ونے: میں ماتا کے چرنوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اسے مخفی رکھوں گا۔ میں صرف ایک مرتبہ صوفیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔
اندردت: کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔
ونے: اندر میں تمام عمر تمھارا احسان مانوں گا۔
ندردت: جی نہیں بلی بخشے مرغا بانڑا ہی اچھا۔
ونے: مجھ سے جو قسم چاہے لے لو۔
اندردت: جس بات کے بتلانے کا مجھے اختیار نہیں ہے اسے بتلانے کے لیے آپ مجھ سے ناحق اصرار کر رہے ہیں۔
ونے: تم سنگدل ہو۔
اندردت: میں اس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے جتنا چاہے کوس لیجیے۔ پر صوفیہ کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے ۔
نایک رام: ہاں بھیا بس یہی ٹیک چلی جائے۔ مردوں کا یہی کام ہے۔ دو ٹوک کہہ دیا کہ جانتے ہیں پر بتلائیں گے نہیں۔ چاہے کسی کو بھلا لگے چاہے برا۔
اندردت: اب تو قلعی کھل گئی نا؟ کیوں کنور صاحب مہاراج اب تو بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کرو گے ؟
ونے: اندردت، جلے پر نمک نہ چھڑکو۔ جو بات پوچھتا ہوں بتلا دو ورنہ میری جان کو رونا پڑے گا۔ تمھاری جتنی خوشامد کر رہا ہوں اتنی آج تک کسی کی نہیں کی تھی مگر تمھارے اوپر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔
اندرت: میں ایک بار کہہ چکا کہ مجھے جس بات کے بتلانے کا اختیار نہیں وہ کسی طرح نہ بتلاؤں گا۔ بس اس بارے میں تمھارا اصرار بے فائدہ ہے۔ یہ لو میں اپنی راہ جاتا ہوں۔ تمھیں جہاں جانا ہو جاؤ۔
نایک رام: سیٹھ جی بھاگو مت مس صاحبہ کا پتہ بتائے بنا نہ جانے پاؤ گے۔
اندردت: کیا زبردستی پوچھو گے؟
نایک رام: ہاں زبردستی پوچھوں گا۔ براہمن ہو کر تم سے بھیک مانگ رہا ہوں اور تم

انکار کرتے ہو۔ اسی پر دھرماتما اور سیوک بنتے ہو۔ یہ سمجھ لو۔ براہمن بھیک لیے بنا دروازے سے نہیں جاتا۔ نہیں پاتا تو دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر لے کر ہی اٹھتا ہے۔

اندردت: مجھ سے یہ پنڈئی چالیں نہ چلو سمجھے۔ ایسے بھیک دینے والے کوئی اور ہوں گے۔

نایک رام: کیوں باپ دادوں کا نام ڈباتے ہو بھیا؟ کہتا ہوں یہ بھیک دیے بنا اب تمھارا گلا نہیں چھوٹ سکتا۔

یہ کہتے ہوئے نایک رام فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اندردت کے دونوں پیر پکڑ لیے ان پر اپنا سر رکھ دیا اور بولے۔ ''اب تمھارا جو دھرم ہو وہ کرو۔ میں مورکھ ہوں، گنوار ہوں پر براہمن ہوں۔ تم سامرتھی آدمی ہو جیسا مناسب سمجھو کرو۔''

اندردت اب بھی نہ پسیجے۔ انھوں نے اپنے پیروں کو چھڑا کر چلے جانے کی کوشش کی۔ مگر ان کے چہرہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑے پس و پیش میں پڑے ہوئے ہیں اوراس عاجزانہ التماس کا لحاظ نہ کرنے پر نہایت شرمندہ ہیں۔ وہ طاقتور شخص تھے۔ رضا کاروں میں کوئی ان کا سا ڈیل ڈول والا نوجوان نہ تھا۔ نایک رام ابھی کمزور تھے۔ قریب تھا کہ اندردت اپنے پیروں کو چھڑا کر نکل جائیں کہ نایک رام نے ونے سے کہا۔ ''بھیا کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ پکڑ لو ان کے پاؤں۔ پھر دیکھوں یہ کیسے نہیں بتاتے۔''

ونے سنگھ کسی ذاتی غرض کے لیے بھی کسی کی خوشامد کرنا برا سمجھتے تھے پھر پاؤں پر گرنے کی تو بات ہی کیا۔ کسی سادھو مہاتما کے سامنے عاجزی کرنے سے انھیں عار نہ تھا۔ بشرطیکہ اس سے دلی عقیدت ہو۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لیے انھوں نے سر جھکانا سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر جب انھوں نے نایک رام کو اندردت کے پیروں پر گرتے دیکھا تو خودداری کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا۔ سوچا کہ جب میری خاطر نایک رام براہمن ہو کر یہ ذلت برداشت کر رہاہے تو میرا دور ہی کھڑے ہوئے شان دکھلانا مناسب نہیں۔ اگرچہ ابھی ذرا پہلے اندردت سے انھوں نے سخت کلامی سے گفتگو کی تھی۔ اور ان کی خوشامد کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مگر صوفیہ کا حال بھی اس کے سوا اور کسی تدبیر سے معلوم

ہونا غیرممکن تھا۔ انھوں نے اپنی خودداری کو بھی صوفیہ پر قربان کر دیا۔ ''میرے پاس یہی ایسی ایک چیز تھی جسے میں نے ابھی تک تیرے ہاتھ سے نہ دیا تھا۔ آج اسے بھی تیرے حوالہ کرتا ہوں۔ آتما اب بھی سر نہ جھکانا چاہتی تھی پر کمر جھک گئی۔ اور ایک لمحہ میں ان کے ہاتھ اندردت کے پیروں پر جا پہنچے۔ اندردت نے فوراً پیر کھینچ لیے اور ونے کو اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''ونے یہ کیا غضب کر رہے ہو؟''

ونے کی حالت اس نوکر کی سی تھی جسے اس کے مالک نے تھوک کر چاٹنے کا حکم دیا ہو۔ انھیں اپنی اس ذلت پر رونا آگیا۔

نایک رام نے اندردت سے کہا۔ ''بھیا مجھے بھکاری سمجھ کر دھتکار سکتے تھے۔ مگر اب بتاؤ۔''

اندردت نے مخمصہ میں پڑ کر کہا۔ ''ونے کیوں مجھے اتنا نادم کر رہے ہو۔ میں زبان دے چکا ہوں کہ میں کسی سے یہ بھید نہ بتاؤں گا۔''

نایک رام: تم سے کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔ جو اپنا دھرم سمجھو وہ کرو تم آپ بدھیمان ہو۔

اندردت نے جھنجھلا کر کہا۔ ''زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض باولی ہوتی ہے پر آج معلوم ہوا کہ وہ اندھی بھی ہوتی ہے۔ ونے تم مفت ہی اپنی آتما پر ظلم کر رہے ہو۔ بھلے آدمی کیا خودداری کو بھی گھول کر پی گئے؟ تمھارا فرض تھا کہ جان دے کر بھی آتما کی حفاظت کرتے۔ اب تمھیں معلوم ہوا ہوگا کہ خود غرضی انسان کو کتنا ذلیل کر دیتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ایک سال قبل ساری دنیا مل کر بھی تمھارا سر نہ جھکا سکتی تھی۔ آج تمھارا یہ اخلاقی تنزل ہو رہا ہے! اب اٹھو مجھے گنہگار نہ کرو۔

ونے کو اتنا غصہ آیا کہ اس کے پیروں کو کھینچ لوں اور سینہ پر چڑھ بیٹھوں۔ ظالم اس حالت میں تیشہ زنی سے باز نہیں آتا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مغموم ہو کر بولے۔ ''اندردت تم مجھے جتنا ذلیل سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ مگر صوفیہ کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میری خودداری، میری دانائی، میری زندگی، میرا فرض سب کچھ محبت کی آگ میں بھسم ہو چکا۔ اگر تمھیں اب بھی مجھ پر ترس نہ آئے تو میری کمر سے پستول نکال کر میرا کام تمام کردو۔''

یہ کہتے ہوئے ونے سنگھ آب دیدہ ہوگئے۔ اندردت نے انھیں اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ ترحمانہ انداز سے بولے۔ ''ونے معاف کرو۔ اگرچہ تم نے قوم کی بدخواہی کی ہے پر میں جانتا ہوں کہ تم نے وہی کیا جو شاید تمھاری جیسی حالت میں میں یا اور کوئی شخص بھی کرتا۔ مجھے تمھاری تحقیر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تم نے اگر محبت کے لیے خودداری کو فنا کر دیا تو میں بھی دوستی اور شرافت کے لیے اپنے وعدہ سے مکر جاؤں گا۔ جو تم چاہتے ہو وہ میں بتلادوں گا۔ مگر اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ مس صوفیہ کی نگاہوں سے تم گر گئے ہو۔ اسے اب تمھارے نام سے نفرت ہے۔ اس سے مل کر تمھیں رنج ہوگا۔''

نایک رام: بھیا تم اپنی سی کردو۔ مس صاحب کو منانا ونانا ان کا کام ہے۔ عاسک (عاشق) لوگ بڑے چلتے پرزے ہوتے ہیں۔ چھنٹے ہوئے سہدے۔ دیکھنے ہی کو سیدھے ہوتے ہیں۔ معسوک (معشوق) کو چٹکی بجاتے اپنا کر لیتے ہیں۔ جرا آنکھوں میں پانی بھر کر دیکھا اور وہ پانی ہوا۔

اندردت: مس صوفیہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔ لیکن اب ان کا سا دل کہاں سے لاؤں؟ ہاں ایک بات بتلادو۔ یہ جانے بغیر میں کچھ بھی نہ بتلا سکوں گا۔

ونے: پوچھو۔

اندردت: تمھیں وہاں اکیلے جانا پڑے گا۔ وعدہ کرو کہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی تمھارے ساتھ نہ ہوگا۔

ونے: اس سے تم بے فکر رہو۔

اندردت: اگر تم پولیس کے ساتھ گیے تو صوفیہ کی لاش کے سوا اور کچھ نہ پاؤگے۔

ونے: میں ایسی حماقت ہی کیوں کروں گا۔

اندردت: یہ سمجھ لو کہ میں صوفیہ کا پتہ بتلا کر ان لوگوں کی جانیں تمھارے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں۔ جن کی کھوج میں تم نے کھانا پینا حرام کررکھا ہے۔

نایک رام: بھیا چاہے اپنی جان نکل جائے ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی۔ لیکن یہ بھی بتا دو کہ وہاں ہم لوگوں کی جان کا جوکھم تو نہیں ہے؟

اندردت: (ونے سے) اگر وہ لوگ تم سے دشمنی برتنا چاہتے۔ تو اب تک تم لوگ زندہ

نہ ہوتے۔ ریاست کی ساری سکت بھی تمھیں بچا نہ سکتی۔ انھیں تمھاری ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے بس یہ سمجھ لو کہ تمھاری جان ان کی مٹھی میں ہے۔ رعایا کے ساتھ اتنی برائی کرنے پر اگر تم ابھی زندہ ہو تو صرف مس صوفیہ کی بدولت۔ اگر مس صوفیہ تم سے ملاقات کرنا چاہتیں تواس سے زیادہ آسان کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو اب تمھارے نام سے چڑتی ہیں۔ اگر اب بھی تمھیں ان سے ملنے کی خواہش ہو تو میرے ساتھ آؤ۔

ونے سنگھ کو اپنی قلبی تالیف کر دینے والی قوت پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی انھیں ذرا بھی فکر نہ تھی کہ صوفیہ مجھ سے بات چیت نہ کرے گی۔ ہاں فکر اس بات کی تھی کہ میں نے صوفیہ ہی کے لیے حکام کی جو مدد کی اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ صوفیہ کو یہ طرز عمل پسند نہیں ہے تو میں یہ طریقہ اختیار ہی کیوں کرتا؟ مجھے رعایا سے کوئی عداوت تو تھی نہیں۔ صوفیہ پر بھی تو اس کی کچھ ذمہ داری ہے۔ وہ میرے مزاج سے واقف ہے تو کیا ایک خط بھیج کر مجھے اپنے حالات سے آگاہ نہ کر سکتی تھی؟ جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اسے اب مجھ سے برہم ہونے کا کیا حق ہے؟

یہ سوچتے ہوئے وہ اندردت کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ بھوک پیاس سب جاتی رہی۔

(30)

چلتے چلتے شام ہوگئی۔ کوہستان کی شام میدان کی راتوں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ہر سو اشخاص چلے جا رہے تھے لیکن ابھی منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ پہاڑیوں کے سائے لمبے ہوگئے۔ سورج ڈوبنے کے پہلے ہی دن ختم ہو گیا۔ راستہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ دونوں آدمی بار بار اندردت سے پوچھتے۔ اب کتنی دور ہے مگر یہی جواب ملتا کہ چلے آؤ اب پہنچے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ونے نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ اندردت! اگر تم ہمارے خون کے پیاسے ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟ اس طرح کڑھا کڑھا کر کیوں مارتے ہو؟ اندردت نے اس کا بھی یہی جواب دیا کہ چلے آؤ۔

اب دور نہیں ہے۔ ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ راستہ خطرناک ہے۔

ونے کو اب بار بار پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ اندردت کے ساتھ کیوں آیا؟ کیوں نہ پہلے اس کے ہاتھوں صوفیہ کو ایک خط بھیج دیا؟ جواب ملنے پر جب صوفیہ کی تحریر پہچان لیتا تو بے خوف ہو کر اس طرف آتا۔ صوفیہ اتنی سنگ دل تو ہے نہیں کہ خط کا جواب ہی نہ دیتی۔ یہ عجلت کرنے میں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اندردت کی نیت درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان تفکرات کی وجہ سے اس کا راستہ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لوگ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ راستہ بیہڑا اور ناہموار ہوتا جاتا تھا۔ کبھی ٹیلوں پر چڑھنا پڑتا، کبھی اتنا نیچے اترنا پڑتا کہ معلوم ہوتا کہ تحت الثریٰ کو جا رہے ہیں۔ کبھی دائیں بائیں گہرے غاروں کے درمیان میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی مل جاتی۔ آنکھیں بالکل کام نہ دیتی تھیں۔ صرف انکل کا سہارا تھا جو دراصل چشم باطن ہے۔ ونے پستول چڑھائے ہوئے تھے۔ دل میں عہد کر لیا تھا کہ ذرا بھی شک ہوا تو اندردت پر پہلا وار کروں گا۔

دفعتاً اندردت رک گئے اور بولے۔ ''لیجیے آگئے پس آپ لوگ یہیں ٹھہریئے۔ میں جا کر ان لوگوں کو اطلاع دے دوں۔''

ونے نے متحیر ہو کر کہا۔ '' یہاں گھر تو کوئی نظر نہیں آتا بس سامنے ایک درخت ہے۔''

اندردت: باغیوں کے لیے ایسے ہی پوشیدہ مقامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ملک الموت کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں۔

ونے: بھئی یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ کیوں نہ یہیں سے آواز دو یا چلو میں بھی جاتا ہوں۔

اندردت: یہاں سے تو شاید سنکھ کی آواز بھی نہ پہنچے اور دوسروں کو لے چلنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ گھر میرا نہیں ہے اور دوسروں کے گھر میں میں آپ کو کیوں کر لے جا سکتا ہوں؟ ان غریبوں کے پاس یہاں کوئی فوج یا قلعہ نہیں ہے۔ صرف راستہ کی پیچیدگی ان کی حفاظت کرتی ہے۔ مجھے دیر نہ لگے گی۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا اور کئی قدم چل کر اسی درخت کے نیچے غائب ہوگیا۔

ونے سنگھ کچھ دیر تک تو اندیشہ میں پڑے ہوئے اس کی راہ دیکھتے رہے۔ پھر نایک رام سے بولے۔ ''اس ظالم نے تو برا پھنسایا۔ یہاں اس سنسان مقام پر لا کھڑا کر دیا کہ بے موت ہی مر جائیں۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔''

نایک رام: تمھیں اندیسہ کس بات کا ہے؟ عاسک لوگ تو جان ہتھیلی پر لیے ہی رہتے ہیں۔ مرے تو ہم کہ سوکھے ہی پر رہے۔

ونے: میں اس کی نیت کو تاڑ گیا تھا۔

نایک رام: تو پھر کیوں بنا کان پونچھ ہلائے چلے آئے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبو دیا۔ کیا عسک (عشق) میں بدھی گھن چکر ہو جاتی ہے؟

ونے: آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ ابھی تک کسی کا پتہ نہیں ہے۔ یہاں سے بھاگنا بھی چاہیں تو کہاں جائیں؟ اس نے ضرور دغا کی زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔

نایک رام: عاسک ہو کر مرنے سے ڈرتے ہو؟ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ آج ہی سہی۔ ڈر کیا؟ جب اکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا غم؟ مارے اس کا جتنا جی چاہے۔

ونے: کہیں سچ مچ صوفیہ آجائے۔

نایک رام: پھر کیا کہنے؟ لپک کر ٹانگ لینا۔ مزہ تو جب آئے کہ تم ہائے ہائے کر کے رونے لگو اور وہ آنچل سے تمھارے آنسو پونچھے۔

ونے: بھئی دیکھنا۔ میں اسے دیکھ کر رو پڑوں تو ہنسنا مت۔ اسے دیکھتے ہی اتنی زور سے پکڑوں گا کہ چھڑا نہ سکے۔

نایک رام: یہ میرا انگوچھا لے لو۔ جھٹ پٹ اس کے پاؤں باندھ دینا۔

ونے: تم ہنسی اڑا رہے ہو اور میرا دل دھڑک رہا ہے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ آہا میں سمجھ گیا۔ میں ادھر سے ایک بار گیا ہوں۔ ہم جسونت نگر کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔ اندردت ہم کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے اتنا چکر دے کر لایا ہے۔

نایک رام: جسونت نگر یہیں ہو تو ہمیں کیا؟ ہم یہاں چلائیں تو کون سنے گا؟

ونے: کیا سچ مچ اس نے دھوکا دیا کیا؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہاں سے کسی طرف کو چل دوں۔ اگر صوفیہ نے سخت باتیں کہنا شروع کیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ جس کے لیے اتنے ادھرم اور پاپ کیے اس کی بیدردی کیسے سہی جائے گی؟ ایسی ہی باتوں

سے دنیا سے جی کھٹا ہو جاتا ہے جس کے لیے چور بنے وہی پکارے چور۔
نایک رام: عورتوں کا یہی حال ہے۔
ونے: جو سنا کرتا تھا وہ آنکھوں کے آگے آیا۔
نایک رام: میں یہ انگوچا بچھا دیتا ہوں۔ پتھر ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ آرام سے لیٹو۔ مس صاحبہ آئیں تو ہر اچھا، نہیں تو تڑکے یہاں سے چل دیں گے۔ کہیں نہ کہیں راہ مل ہی جائے گی۔ میں یہ پستول لیے بیٹھا ہوں۔ کوئی کھٹکا ہوا تو دیکھا جائے گا۔ میرا تو اب یہاں سے جی بھر گیا۔ نہ جانے وہ کون دن ہوگا کہ پھر گھر کے درشن ہوں گے۔
ونے: میرا تو گھر سے ناتا ہی ٹوٹ گیا۔ صوفیہ کے ساتھ جاؤں گا تو گھسنے ہی نہ پاؤں گا۔ صوفیہ نہ ملی تو جاؤں گا ہی نہیں یہیں۔ دھونی رماؤں گا۔
نایک رام: بھیا تمھارے سامنے بولنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے پر ساتھ رہتے رہتے ڈھیٹھ ہوگیا ہوں۔ مجھے تو مس صاحب ایسی کوئی بڑی اپسرا نہیں معلوم ہوتیں۔ یہاں تو بھگوان کی دیا سے روز ہی ایسی ایسی صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ مس صاحبہ ان کے آگے پانی بھریں۔ مکھڑا دیکھو تو جیسے ہیرا دمک رہا ہو اور ان کے لیے تم راج پاٹ چھوڑنے پر تیار ہو۔ سچ کہتا ہوں۔ رانی جی کو بڑا دکھ ہوگا۔ ماں کا دل دکھانا مہا پاپ ہے۔ کچھ حال بھی تو نہیں ملا۔ نہ جانے چل بسیں کہ ہیں۔
ونے: پنڈا جی۔ میں صوفیہ کے روپ کا اپاسک (پرستار) نہیں ہوں۔ میں خود نہیں جانتا کہ اس میں وہ کون سی بات ہے جو مجھے اتنا کھینچ رہی ہے میں اس کے لیے راج پاٹ تو کیا اپنا دھرم تک چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر میں تمام دنیا کا مالک ہوتا تو اسے بھی صوفیہ کی بھینٹ دیتا۔ اگر آج مجھے معلوم ہوجائے کہ صوفیہ اس دنیا میں نہیں ہے تو تم مجھے جیتا نہ پاؤگے۔ اس سے ملنے کی امید ہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اس کے چرنوں پر جان نچھاور کردینا ہی میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔
درخت کی طرف لالٹین کی روشنی نظر آئی۔ دو شخص آرہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی ار دوسرے کے ہاتھ میں جاجم۔ ونے نے دونوں کو پہچان لیا۔ ایک تو بیر پال سنگھ تھا اور دوسرا اس کا ساتھی۔ بیر پال نے سامنے آکر لالٹین رکھ دی اور ونے کو پرنام کر کے دونوں چپ چاپ جاجم بچھانے لگے۔ جاجم بچھا کر بیر پال بولا:

''آیئے۔ بیٹھ جایئے۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ مس صاحب ابھی آرہی ہیں۔''

امید اور ناامیدی کے مخالف حالات میں پڑ کر ونے کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ انھیں شرم آرہی تھی کہ جن آدمیوں کو میں نے حکام کی مدد سے تباہ کر دینے کی کوشش کی بالآخر انھیں کے دروازہ کا مجھے گدا ہونا پڑا۔ مزہ تو جب آتا کہ یہ سب ہتھکڑیاں پہنے ہوئے میرے سامنے آتے اور میں ان کو معاف کر دیتا۔ واقعی فتح کا سہرا تو انھیں کے سر رہا۔ آہ! جنھیں میں بدمعاش اور قاتل سمجھا تھا وہی آج میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

جب وہ جاجم پر جابیٹھے اور نیک رام ہوشیار ہو کر ٹہلنے لگے تو بیرپال نے کہا۔'' کنور صاحب میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آج آپ کو اپنے سامنے عدالت کی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھ کر اپنے دروازہ پر بیٹھا دیکھ رہا ہوں ورنہ ان بدنصیبوں کے ساتھ میری گردن پر بھی چھری چل جاتی جنھوں نے مار کھا کر رونے کے سوا اور کوئی قصور نہیں کیا تھا۔''

ونے: بیر پال سنگھ ان باتوں کی چرچا کر کے مجھے نادم نہ کرو۔ اگر ان کا کچھ کفارہ ہوسکتا ہے تو میں کرنے کو تیا رہوں۔

بیرپال: سچے دل سے؟

ونے: ہاں اگر مس صوفیہ کی تم نے حفاظت کی ہے۔

بیرپال: انھیں تو آپ ابھی خود دیکھیں گے۔

ونے: تو میں بھی تمھیں معاف کرا دینے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

بیرپال: آپ جانتے ہیں۔ میں مس صاحب کو کیوں لایا؟ اسی لیے کہ ہم انھیں کی خدمت اور سفارش سے اپنے بچاؤ کی امید رکھتے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہم مس صاحب کے ذریعہ اپنی جانوں کی امان پانے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر بدقسمتی سے انھیں ہمارے قیاس کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہرا زخم لگا تھا جس کے بھرنے میں پورے نو مہینے لگ گئے۔ اپنے منہ سے کیا کہیں، پر جتنی دلی لگن کے ساتھ ہم نے ان کی تیمارداری کی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ یہی سمجھ لیجیے کہ مجھے چھ مہینے تک گھر سے نکلنے کا موقعہ نہ ملا۔ اتنے دنوں تک جسونت نگر میں رعایا اورانصاف دونوں کا خون ہوتا رہا۔ روز روز کی

خبریں سنتا تھا اور اپنا ماتھا ٹھونک کر رہ جاتا تھا۔ مس صاحب کو اپنی حفاظت کے لیے لایا تھا۔ ان کے پیچھے سارا علاقہ تباہ ہو گیا۔ خیر جو کچھ ایشور کو منظور تھا ہوا۔ اب میری آپ سے یہی التجا ہے کہ میرے اوپر رحم کی نگاہ ہونی چاہیے۔ آپ کو پرماتما نے اس قابل بنایا ہے۔ آپ کے ایک اشارہ سے ہم لوگوں کی جان بچ جائے گی۔

ونے نے کھلے دل سے کہا کہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ دربار تمھارا قصور معاف کردے گا۔ ہاں تم کو بھی یہ عہد کرنا پڑے گا کہ اب سے ریاست کے ساتھ تم کسی قسم کی عداوت نہ رکھوگے۔

بیرپال: میں یہ عہد کرنے کو تیار ہوں۔ کنور صاحب سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بالکل مجبور بنا دیا۔ یہ آپ ہی کا تشدد ہے جس نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا۔ جن جن آدمیوں پر ہمیں بھروسہ تھا وہ سب دغا دے گئے۔ دوست دشمن میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے یا حکام کا اعتماد پانے کے لیے ہماری آستین کا سانپ ہو گیا۔ وہی میں ہوں کہ آج چوہے کی طرح بل میں چھپا ہوا ہوں۔ ہرلمحہ یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں پولیس نہ آجائے۔

ونے: مس صوفیہ کبھی مجھے یاد کرتی ہیں؟

بیرپال: مس صاحب کو آپ سے جتنی محبت ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ (اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرکے) ان کے وار سے آپ کو مس صاحب نے ہی بچایا تھا اور مس صاحب ہی کی خاطر سے آپ اتنے دنوں تک ہمارے ہاتھوں سے بچے رہے۔ ہمیں آپ سے ملنے کا موقع نہ تھا پر ہماری بندوقوں کو تھا۔ مس صاحب آپ کو یاد کر کے گھنٹوں رویا کرتی تھیں۔ پر اب ان کا دل آپ سے ایسا پھٹ گیا ہے کہ آپ کا کوئی نام بھی لے لیتا ہے تو چڑجاتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ مجھے ایشور نے اپنا مذہب ترک کرنے کی سزا دی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اب بھی انھیں آپ کی ذات سے گہری عقیدت ہے۔ محبت کی طرح روٹھنا بھی گہرے تعلقات کے سبب ہوا کرتا ہے۔ آپ ان کی جانب سے ناامید نہ ہوں۔ آپ راجہ ہیں۔ آپ کے لیے سب کچھ زیباہے۔ مذہب کی بندش تو چھوٹے آدمیوں کے لیے ہے۔

دفعتاً اسی درخت کی طرف دوسری لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ ایک بڑھیا لوٹا لیے

ہوئے آرہی تھی۔ اس کے پیچھے صوفیہ تھی۔ ہاتھ میں ایک تھالی لیے ہوئے جس میں ایک گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ وہی صوفیہ تھی۔ وہی حسن کا منور کا مجسمہ۔ البتہ نورحسن کی کمی نے اسے ایک ناقابل بیان مفابیز اور روحانی نمود دے رکھی تھی۔ گویا اس کا وجود عناصر سے نہیں بلکہ پاکیزہ نور کے ذرات سے ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہی ونے کے دل میں ایسا حوصلہ پیدا ہوا کہ دوڑ کر اس کے قدموں پر گر پڑوں۔ حسن پر شکوہ فریفتہ نہیں کرتا بلکہ فتح کر لیتا ہے۔

بڑھیا نے لوٹا رکھ دیا اور لالٹین لیے چلی گئی۔ بیر پال سنگھ اور اس کا ساتھی بھی وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ نایک رام بھی انھیں کے ساتھ ہو لیے۔ اب وہ بے خوف تھے۔

ونے نے کہا۔ صوفیہ۔ آج میری زندگی کا مبارک دن ہے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا۔
صوفیہ: میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ آپ کے درشن ہوئے۔ آپ کا درشن بدا تھا ورنہ مرنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

ونے کو اپنے شکوک محض موہوم سے معلوم ہونے لگے۔ اندردت اور بیرپال نے مجھے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ملاقات محبت کو بیدار کردیتی ہے۔ دلی امنگ کے بہاؤ میں ان کی معصوم عقل کسی پھولوں کی مالا کی طرح بہتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اس فقرہ میں کتنا بڑا طنز تھا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

صوفیہ نے تھال میں سے دہی اور چاول نکال کر ونے کی پیشانی پر ٹکا لگایا۔ اورمسکراکر بولی: ''اب آرتی کروں گی۔''

ونے نے متاثر ہو کر کہا: پیاری یہ کیا ڈھکوسلا کر رہی ہو؟ تم بھی ان رسمیات کے جال میں پھنس گئیں؟

صوفیہ: واہ۔ آپ کی خاطر تواضع کیسے نہ کروں۔ آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔ مجھے ان ڈاکوؤں اور قاتلوں کے پنجہ سے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا خیر مقدم کیسے نہ کروں؟ میرے لیے آپ نے ریاست میں اندھیر مچادیا۔ سینکڑوں بے گناہوں کا خون کر دیا۔ کتنے ہی گھر بے چراغ کر دیے۔ ماؤں کو بیٹوں کے سوگ کا مزہ چکھا دیا۔ سہاگ والیوں کو بیوگی کی گود میں بیٹھا دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے ضمیر کا اپنے

اصولوں کا اپنے زندگی کے معیار کا ستیاناس کر دیا۔ اتنی نیک نامیاں پیدا کرنے پر بھی میں آپ کی مناسب تعظیم نہ کروں؟ میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں۔ اب آپ ایک حقیر خادم نہیں بلکہ ریاست کا داہنا ہاتھ ہیں۔ راجے مہاراجے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ میں آپ کی عزت کیسے نہ کروں؟

اب ونے کی آنکھیں کھلیں۔ طنز کا ایک ایک لفظ دل میں تیر کی طرح لگا۔ بولے ''صوفیہ میں تمھارا وہی شیدائی اور قوم کا وہی خادم ہوں۔ تم اس طرح میری تضحیک کر کے میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ ممکن ہے کہ سہو کے سبب میری ذات سے دوسروں کو ایذا پہنچی ہو مگر میرا اصلی مقصد محض تمھاری حفاظت کرنا تھا۔''

صوفیہ نے بگڑ کر کہا۔ ''بالکل جھوٹ ہے۔ غلط ہے متہم کرنا ہے۔ یہ سب میری خاطر نہیں اپنی خاطر تھا۔ اس کا مقصد محض ان کمینہ خود سری کو آسودہ کرنا تھا۔ جو تمھارے دل میں خدمت کا سوانگ بھرے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے تمھاری حکومت پسندی پر اپنے کو قربان نہیں کیا تھا۔ بلکہ تمھاری خدمت ہمدردی اور حب الوطنی پر۔ میں نے اس لیے تمھیں اپنا معبود بنایا تھا کہ تمھاری زندگی کا معیار بلند تھا۔ تم میں عیسیٰ کا رحم، بدھ کا تیاگ، لوتھر کی سچائی، ان اوصاف کا شائبہ نظر آتا تھا کیا غریبوں کو ستانے والے بیدرد۔ خود غرض حکام کی دنیا میں کمی تھی؟ تمھاری معیار پرستی نے مجھے تمھارے قدموں پر جھکایا۔ جب میں ساری خلقت کو نفس پرستی میں مبتلا دیکھ کر دنیا سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس وقت تمھاری بے نفسی نے مجھے اپنا شیدا بنایا۔ لیکن اتفاقات دنیوی کے ایک ہی پلٹے نے تمھاری اصلی حالت ظاہر کر دی۔ میرا سراغ لگانے کے لیے تم نے برائی بھلائی کا خیال بھی ترک کر دیا۔ جو شخص اپنی ذاتی غرض کے لیے اس قدر زیادتی کر سکتا ہے وہ برا سے برا کام بھی کر سکتا ہے۔ تم اپنے معیار سے اسی وقت گر گئے جب تم نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے غیر اشتدادی ذرائع کی بہ نسبت جبر وتشدد سے کام لینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ شیطان نے پہلی مرتبہ تم پر وار کیا اور تم پھر نہ سنبھلے۔ برابر گرتے ہی چلے گئے۔ ٹھوکر کھاتے کھاتے اب تم اتنا گر گئے ہو کہ تم میں شرافت تمیز اور مردانگی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ تمھیں دیکھ کر میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔ میری محبت کی بنیاد عقیدت تھی۔ وہ بنیاد اب جڑ سے ہل گئی۔ تم نے

میری زندگی تباہ کر دی۔ آہ مجھے جتنا مغالطہ ہوا اتنا کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ جس شخص کے لیے اپنے والدین سے منحرف ہوئی۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ جس پر اپنے دیرینہ اصولوں کو قربان کردیا۔ سچ کے لیے ذلت رسوائی بدنامی سب باتیں برداشت کیں وہ اتنا خود غرض، اتنا نفس پرست، اتنا کم فہم نکلا۔ کوئی دوسری عورت تمھارے ان اوصاف؟ پر فریفتہ ہوسکتی ہے۔ محبت کے معاملہ میں عورتیں معیار کا لحاظ نہیں کرتیں۔ لیکن میری تعلیم میری صحبت میرا مطالعہ اور سب سے زیادہ میرے طبعی میلان نے مجھے ان باتوں کی قدر کرنا نہیں سکھلایا۔ اگر آج تم ریاست کے ہاتھوں ظلم ذلت اور سزا سے تکلیف پا کر میرے سامنے آتے تو میں تمھاری بلائیں لیتی۔ تمھارے پیروں کی خاک اپنے ماتھے پر لگاتی اور اپنے نصیبوں کو سراہتی لیکن مجھے اس چیز سے نفرت ہے جسے لوگ کامیاب زندگی کہتے ہیں۔ کامیاب زندگی مترادف ہے۔ خوشامد ظلم اور دغا کی۔ میں جن مہاتماؤں کو دنیا میں برترین خیال کرتی ہوں۔ ان کی زندگیاں کامیاب نہ تھیں۔ دنیاوی [نقطہ] خیال سے وہ لوگ معمولی آدمیوں سے بھی گئے گزرے تھے۔ جنھوں نے تکلیفیں اٹھائیں جو جلا وطن ہوئے۔ پتھروں سے مارے گئے، کہے گئے اور بالآخر دنیا نے ان کو بلا ایک بوند آنسو گرائے بھی اپنے یہاں سے رخصت کر دیا۔ بہشت کو بھیج دیا۔ تم پولیس کی ایک جماعت لے کر مجھے کھوجنے نکلے۔ اس کا مقصد یہی کہ رعایا پر رعب قائم کیا جائے۔ میری رائے میں جس ریاست کا وجود ہی ظلم پر مبنی ہو اس کا نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ خیر اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ تمھیں اپنی یہ عزت و شوکت مبارک ہو۔ میں تو اپنے اسی حال میں خوش ہوں۔ جن کے ساتھ ہوں وہ دردمند ہیں جو کسی بیکس کی حمایت میں اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں تم سے کہیں زیادہ خدمت وایثار کے جذبات موجود ہیں۔

ونے آزردہ خاطر ہوکر بولے۔ صوفیہ ایشور کے لیے میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو۔ اگر میں منصب و وقار کا خواہشمند ہوتا تو آج میری حالت ایسی قابل رحم نہ ہوتی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے قرین انصاف معلوم ہوا۔ میں حتی الامکان ایک لمحہ کے لیے بھی حق سے منحرت نہیں ہوا۔

•صوفیہ: یہی تو افسوس ہے کہ تمھیں وہ بات کیوں قرین انصاف معلوم ہوئی جو خلاف

انصاف تھی۔ اس سے تمھارے دلی میلان کا پتہ چلتا ہے۔ تم فطرتاً خود غرض واقع ہوئے۔ انسانوں کو سبھی چیزیں یکساں عزیز نہیں ہوتیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو نام کے لیے دولت کو ٹھیکروں کی طرح لٹا تے ہیں۔ وہ اپنے کو بے غرض نہیں کہہ سکتے۔ خود غرضی کا بلند معیاری سے کیا تعلق؟ جس کے ارادے اتنے کمزور ہیں اس کی کم از کم میں ذرا بھی عزت نہیں کر سکتی اور عزت کے بغیر محبت محض بدنامی کا سبب ہوتی ہے۔

ونے ان لوگوں میں نہ تھے جن پر مخالف، حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے دل پر مایوسی جلد ہی قبضہ کر لیتی تھی۔ بے قرار ہو کر بولے۔ صوفی مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اسے حق سمجھ کر یا حالات کے گردوپیش سے مجبور ہو کر کیا ہے۔

صوفیہ: دنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں۔ وہ سب سہواً یا ضرورتاً ہوتے ہیں کوئی تیسرا سبب میں نے آج تک نہیں سنا۔

ونے: صوفیہ اگر میں جانتا کہ میری طرف سے تمھارا دل اتنا سخت ہو گیا ہے تو تمھیں منہ نہ دکھاتا۔

صوفیہ: میں تمھارے منہ دیکھنے کی بہت شائق نہ تھی۔

ونے: یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر مان لو کہ میں نے مظالم ہی کیے تو کیا مجھے تمھارے ہاتھوں یہ سزا ملنی چاہیے؟ یہ خوف مجھے ماتاجی سے تھا تم سے نہ تھا۔ آہ صوفی! اس محبت کا یوں خاتمہ نہ ہونے دو۔ یوں میری زندگی کو برباد نہ کرو۔ اسی محبت کے تعلق سے جو تم کو کبھی میرے ساتھ تھی۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ تکلیف میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ تمھیں یقین نہ آئے گا کیونکہ اس وقت تمھارا دل میری طرف سے پتھر ہوگیا ہے، لیکن یہ صدمہ میرے لیے مہلک ثابت ہوگا اور اگر موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے تو اس زندگی میں بھی یہی صدمہ میرے دل کو تڑپاتا رہے گا۔ صوفیہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بھالے کے نوک کو سینہ پر لے سکتا ہوں۔ مگر تمھاری یہ روکھی نظر، تمھارا یہ بیدردانہ برتاؤ واقعی سوہان روح ہے۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ تم مجھے زہر دے دو۔ میں اس پیالہ کو آنکھیں بند کر کے یوں پی جاؤں گا۔ جیسے کوئی بھگت چرنا مرت پیتا ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہ زندگی جسے تمھاری نذر کر چکا تھا تمھارے

ہی کام آگئی۔

یہ عشقیہ الفاظ شاید اور کسی وقت ونے کے منہ سے نہ نکلتے۔ شاید انھیں پھر یاد کرکے ان کو حیرت ہوتی کہ یہ الفاظ میرے منھ سے کیوں نکلے۔ مگر اس وقت خیالات کے جوش نے انھیں زیادہ لسان بنا دیا تھا۔ صوفیہ بے اعتنائی کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر بیدردانہ لہجہ میں بولی۔ ''ونے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے دل میں ابھی جو کچھ تمھاری عزت باقی ہے اسے بھی پامال نہ کرو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ الفاظ تمھارے دل سے نہیں نکل رہے بلکہ تم سوچ رہے ہو کہ کیوں کر اس سے اپنی توہین کا بدلہ لوں۔ مجھے تعجب ہوگا اگر صبح ہوتے ہوتے یہ مقام خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے بھر نہ جائے۔ یہاں کے رہنے والے حراست میں لے نہ لیے جائیں اور انھیں بالآخر سزائے موت نہ دی جائے۔ میری سزا کے لیے تم نے کوئی اور ہی طریقہ سوچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں خیال کر سکتی کہ وہ کیا ہے لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھے بدنام کر کے یا میرے چال چلن کو برا بتلا کر تم مجھ سے جسمانی خواہ روحانی تکلیف پہنچا سکوگے تو تمھیں ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو مگر میں اس کو دل سے نہیں نکال سکی۔ کوئی ایسا جادو کوئی ایسا معجزہ نہیں ہے جو تمھیں پھر میری نگاہوں میں قابل احترام بنا دے جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں۔ اس کے لیے میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے ان باتوں سے دکھ نہیں ہو رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میرے دل پر آرے کا کام کر رہا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھوں کہ تمھیں دل سے نکال کر میں پھر کسی دوسری صورت کو اس میں جگہ دوں گی حالانکہ تمھارے دل میں ایسا خیال ہو تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہیں یہی میری محبت کا اول اور آخر دور ہے۔ اب یہ زندگی اس سے بہتر کاموں میں صرف ہوگی۔ کون جانے ایشور نے مجھے راہ حق سے منحرف ہونے کی تمھارے ہی ہاتھوں سزا دلائی ہو۔ تمھارے لیے میں نے وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا۔ مکر، فریب، چالاکی، تریا چرتر ایک سے بھی عار نہیں کیا۔ کیونکہ میری معصوم نگاہوں میں تم ایک بے لوث اور پاک روحانی وجود تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسٹر کلارک کے ساتھ آنے میں مجھے کتنی روحانی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم میری زندگی کے لیے مشعل ہدایت کا کام

دوگے۔ میری زندگی کو سدھاروگے۔ کامیاب بناؤ گے۔ آخر مجھ میں کون سا ایسا وصف ہے جس پر تم مفتون ہو؟ اگر حسن کے طالب ہو تو حسن کی دنیا میں کمی نہیں۔ تمھیں مجھ سے کہیں زیادہ حسین عورتیں مل سکتی ہیں۔ اگر میری باتیں تمھیں میٹھی معلوم ہوتی ہیں تو تمھیں مجھ سے کہیں زیادہ شیریں کلام عورتیں مل سکتی ہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جلد یا دیر میں تمھیں اپنی پسند اور طبعیت کے موافق کوئی حسینہ مل ہی جائے گی، جس کے ساتھ تم اپنی ثروت و شوکت کا لطف اٹھا سکو گے کیونکہ خادم قوم بننے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ میرا دل تو بھول کر بھی عشق کے لیے دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ میں اب پھر یہ روگ نہ پالوں گی۔ تم نے مجھے تارک الدنیا بنا دیا۔ میری نفسانی خواہشات کا خاتمہ کر دیا۔ مذہبی کتب کے دائمی مطالعہ سے جو راستہ نہ ملا۔ اسے مایوسی نے دکھلا دیا۔ اس کے لیے تمھاری ممنون ہوں۔ مذہب اور راستی کی خدمت سے کون سا موتی ہاتھ لگا؟ لامذہبی۔ اب لا مذہبی کی خدمت نہ کروں گی۔ جانتے ہو کیا کروں گی؟ ان گناہ گاروں سے خون کا انتقام لوں گی جنھوں نے رعایا کی گردنوں پر چھریاں پھیری ہیں۔ ایک ایک کو دوزخ کی آگ میں جھونک دوں گی۔ جبھی میرے دل کو تسکین ہوگی۔ جو لوگ آج بے گناہوں کا خون بہا کر عزت اور نیک نامی بھوگ رہے ہیں، انھیں دوزخ کے آتشکدہ میں جلاؤں گی اور جب تک ظالموں کی اس جماعت کو تباہ نہ کردوں گی۔ چین نہ لوں گی خواہ اس کام میں مجھے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ خواہ ریاست میں انقلاب کیوں نہ رونما ہو جائے۔ خواہ ریاست کا نشان ہی کیوں نہ مٹ جائے۔ میرے دل میں یہ خونیں ارادہ تمھیں نے پیدا کیا ہے اور اس کا الزام تمھاری ہی گردن پر ہے۔ عیسٰی کا عفو و رحم، بدھ کا استقلال اور تزکیہ نفس، کرشن کی محبت اور بے تعلقی کی غیرفانی شہرت بھی اب میرے اس خون کی پیاس کو نہیں بجھا سکتی۔ برسوں کا غور وخوض مطالعہ اور خیال تمھاری بداعمالیوں کے ہاتھوں رائگاں ہو گیا۔ بس اب جاؤ میں جو کچھ کروں گی، وہ تم سے کہہ چکی۔ تمھاری جو مرضی ہو وہ تم بھی کرو۔ میں آج سے باغیوں کے گروہ میں شامل ہوتی ہوں۔ تم خفیہ پولیس کے دامن میں پناہ لو۔ جاؤ ایشور پھر ہم کو نہ ملائے۔

یہ کہہ کر صوفیہ نے طشت اٹھا لیا اور چلی گئی جیسے امید دل سے نکل جائے۔ ونے

نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو درد بھری صدا سے کم دلسوز نہ تھی اور زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی بدنصیب بیوہ اپنے پیارے شوہر کی لاش اٹھ جانے کے بعد ایک سرد آہ بھر کر بیٹھ جائے۔

تینوں آدمی جو دور کھڑے تھے آکر ونے کے پاس کھڑے ہوگئے۔ نایک رام نے کہا۔ ''بھیا آج تو کھوب کھوب باتیں ہوئیں۔ تم نے بھی پکڑ پایا تو اتنے دنوں کی کسر نکال لی۔ آگئی پنجہ میں نا؟ وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ عاسک لوگ بڑے چکمہ باج ہوتے ہیں۔ پہلے تو خوب آرتی اتاری۔ دہی چاول کا ٹیکہ لگایا میم ہیں تو کیا۔ ہم لوگوں کی رسمیں جانتی ہے۔ کب چلنا طے ہوا؟ جلد چلو میرا بھی گھر بسے۔''

ونے کی آنکھیں اشک آلود تھیں مگر اس جملہ پر ہنس پڑے۔ بولے ''بس اب دیر نہیں ہے۔ گھر کو خط لکھ دو تیاری کریں۔''

نایک رام: بھیا آنند تو تب آئے گا جب دونوں باراتیں ساتھ ہی نکلیں۔

ونے: ہاں جی ساتھ ہی نکلیں گی۔ پہلے تمھاری پیچھے میری۔

نایک رام: ٹھاکرو اب سواری کا بندوبست کرو جس میں ہم لوگ کل سویرے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جائیں۔ یہاں پالکی تو مل جائے گی نا؟''

بیر پال: سب انتظام ہو جائے گا اب بھوجن کر کے آرام کیجیے۔ دیر ہو گئی۔

ونے: یہاں سے جسونت نگر کتنی دور ہے؟

بیر پال: یہ پوچھ کر کیا کیجیے گا؟

ونے: مجھے اسی وقت وہاں پہنچنا چاہیے۔

بیر پال: (متفکر ہو کر) آپ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں راستہ خراب ہے۔

ونے: کوئی ہرج نہیں چلا جاؤں گا۔

نایک رام: بھیا مس صاحب ابھی رہیں گی نا؟ رات کو کیسے چلو گے؟

ونے: تمھیں تو خبط سا ہوگیا ہے۔ مس صاحب میری کون ہوتی ہیں اور میرے ساتھ کیوں جانے لگیں؟ اگر آج میں مر جاؤں تو شاید ان سے زیادہ خوشی اور کسی کو نہ ہوگی۔ تمھیں تھکاوٹ معلوم ہوتی ہو تو آرام کرو مگر میں تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے کانٹوں بھری راہ بھی یہاں کی پھولوں والی سیج سے زیادہ آرام دہ ہوگی۔ آپ

لوگوں میں سے کوئی راستہ دکھلا سکتا ہے؟
بیر پال: چلنے کو تو میں خود حاضر ہوں۔ لیکن راستہ نہایت خطرناک ہے۔
ونے: کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اسی وقت پہنچا دیجیے اور ہو سکے تو آنکھوں پر پٹی باندھ دیجیے۔ مجھے اب اپنے اوپر ذرا بھی اعتبار نہیں رہا۔
بیر پال: بھوجن تو کر لیجیے اتنی خاطر تو کیجیے۔
ونے: اگر مہمان نوازی کرنی ہو تو مجھے گولی مار دیجیے۔ اس سے بڑھ کر آپ میری خاطر نہیں کر سکتے۔ میں نے آپ کے ساتھ کتنی برائی کی ہے۔ اگر آپ نے اس کا سوال حصہ بھی میرے ساتھ کیا ہوتا تو مجھے کسی ترغیب کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں شیطان ہوں۔ قاتل ہوں۔ زمین میرے بوجھ سے جس قدر ہلکی ہو جائے اتنا ہی اچھا۔
نایک رام: معلوم ہوتا ہے مس صاحب سچ مچ پھرنٹ ہو گئیں مگر کہے دیتا ہوں کہ وہ دو ہی چار دن میں تمھارے پیچھے پیچھے دوڑتی پھریں گی۔ عاسک کی ہائے بری ہوتی ہے۔
بیر پال: کنور صاحب میرا اتنا کہنا مانیے کہ ابھی نہ جائیے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں مس صاحب آپ کے یوں چلے جانے سے گھبرا نہ جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل سورج نکلنے تک آپ جسونت نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت کچھ بھوجن کر لیجیے۔
ونے: میرے لیے اب یہاں کا پانی بھی حرام ہے۔ اگر تمھیں نہیں چلنا ہے تو نہ سہی۔ مجھے تم سے اتنی خاطر کرنے کا حق نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔

بیر پال مجبور ہو کر ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ نایک رام کا بھوک سے برا حال تھا۔ مگر کیا کرتے۔ ونے کو جاتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر سہ اشخاص روانہ ہو گئے۔

نصف گھنٹہ تک تینوں آدمی چپ چاپ چلتے رہے۔ ونے کو صوفیہ کی اور سب باتیں تو یاد نہ تھیں مگر ان کی نیت پر اس نے حملے کیے تھے اور ان کے بارے میں جو نفرت بھری پیشن گوئی کی تھی اس کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ صوفیہ مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہے۔ وقتی حالات پر ذرا بھی توجہ دینا نہیں چاہتی۔ دل کی اتفاقیہ تحریک کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

دفعتاً انھوں نے بیرپال سے پوچھا۔ ''تمھاری رائے میں میں جوش میں آکر یہ

بے انصافی کر بیٹھا یا جیسا مس صوفیہ کہتی ہیں میں فطرتاً کمینہ ہوں۔
بیر پال: کنور صاحب مس صوفیہ کی اس وقت کی باتوں کا ذرا بھی برا نہ مانیے۔ جس طرح جوش میں آپ کے حواس بجا نہیں رہ سکے۔ ویسے ہی وہ بھی جوش میں واہیات بک گئی ہوں گی۔ جب آپ نے سیوا اور پرو پکار کے لیے راج کو چھوڑ دیا تو کسی کا منہ ہے کہ آپ کو خود غرض کہہ سکے۔
ونے: نہ جانے اس نے اتنی سخت کلامی کہاں سے سیکھ لی؟ آدمی بھکاری کو بھی جواب دے تو نرمی سے۔ اس نے تو مجھے دھتکارا جیسے کتے کو۔
نایک رام: کسی انگریز کو بیاہے گی اور کیا۔ یہاں کالے آدمیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔ مرغی کا انڈا کہاں ملے گا؟''
ونے: تم بالکل بے وقوف ہو۔ تمھیں مرغی کے انڈے ہی کی پڑی ہے۔
نایک رام: ایک بات کہتا تھا۔ تمھارے ساتھ وہ آزادی کہاں؟ لے جا کر رانی بنا دو گے۔ پردہ میں بٹھا دو گے۔ گھوڑی پر سوار کرا کر بے کار کے لیے تو نہ جاؤ گے؟ کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹمٹم پر تو نہ بٹھاؤ گے؟ ٹوپی اتار کر ہُرّے ہُرّے تو نہ کرو گے؟
ونے: پھر وہی حماقت کی باتیں۔ ارے پونگا مہاراج صوفیہ کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ ہمارے مذہب سے جتنی وہ واقف ہے اتنا کوئی پنڈت بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمارے یہاں کی دیویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسے تو کسی راجہ کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔ نہ جانے عیسائی گھرانے میں کیوں پیدا ہوئی؟ مجھ سے منہ پھیر کر وہ اب کسی کو منہ نہیں لگاسکتی۔ اس کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی آنکھوں کا۔ وہ اب شادی نہیں کرے گی۔
بیر پال: آپ بہت سچ کہتے ہیں۔ واقعی وہ دیوی ہیں۔
ونے: سچ کہنا کبھی میرا تذکرہ بھی کرتی تھیں؟
بیر پال: اس کے سوا تو انھیں اور کوئی بات ہی نہ تھی۔ زخم گہرا تھا بے ہوش پڑی رہتی تھیں مگر چونک کر آپ کو پکار اٹھتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ونے کو بلا دو انھیں دیکھ کر مروں گی۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن تک آپ ہی کی رٹ لگی رہتی۔ جب کسی کو دیکھتیں یہی پوچھتیں۔ ونے آئے؟ کہاں ہیں؟ میرے سامنے لانا۔ ان کے چرن کہاں ہیں؟ ہم

لوگ ان کی حالت دیکھ دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ جراح نے ایسی چیر پھاڑ کی کہ آپ سے کیا کہوں۔ یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی سوکھ جاتی تھیں۔ لیکن ہم جیوں ہی کہہ دیتے کہ آج ونے سنگھ کے آنے کی خبر ہے۔ تو بس فوراً دل مضبوط کر کے مرہم پٹی کر لیتی تھیں۔ جراح سے کہتی تھیں۔ جلدی کرو۔ وہ آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو آجائیں۔ بس یہ سمجھیے کہ آپ کے نام نے انھیں موت کے منہ سے نکال لیا۔

ونے سنگھ نے درناک لہجہ میں کہا۔ بس کرو۔ اب اور کچھ نہ کہو۔ یہ دکھ بھری کہانی نہیں سنی جاتی۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بیر پال: ایک روز اسی حالت میں آپ کے پاس جانے کو تیار ہو گئیں۔ رو رو کر کہنے لگیں۔ انھیں لوگوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں انھیں چھڑانے جا رہی ہوں۔

ونے: رہنے دو بیر پال! ورنہ دل پھٹ جائے گا۔ اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مجھے ذرا کہیں لٹا دو۔ نہ جانے کیوں دل ڈوبا جاتا ہے۔ آہ مجھ جیسے بدنصیب کے لیے یہی مناسب سزا ہے۔ دیوتاؤں سے میرا سکھ نہ دیکھا گیا۔ ان سے کسی کا کبھی بھلا نہیں ہوا۔ چلے چلو۔ نہ لیٹوں گ مجھ اسی وقت جسونت نگر پہنچنا ہے۔

پھر لوگ چپ چاپ چلنے لگے۔ ونے اتن تیزی سے چل رہے تھے گویا دوڑ رہے ہیں۔ دکھتے ہوئے اعضا میں عجیب پھرتی آگئی تھی۔ بے چارے نایک رام دوڑتے دوڑتے ہانپ رہے تھے۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ ہوا میں جاں بخش تازگی آگئی تھی۔ کم سن حسینہ شب پوری جوانی پر پہنچ گئی تھی۔ جب اس کی شوخی دلکشی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جب اس کی جادو بھری طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ نایک رام تو کئی بار اونگھ کر گرتے گرتے بچ گئے۔ ونے کو آرام کرنے کی خواہش ہونے لگی کہ بیر پال بولے۔ لیجیے جسونت نگر پہنچ گئے۔

ونے: ارے اتنی جلد! ابھی تو چلتے ہوئے کل چار ہی گھنٹے ہوئے ہوں گے۔

بیر پال: آج سیدھے آئے۔

ونے: آؤ۔ آج یہاں کے حکام سے تمھاری صفائی کرا دوں۔

بیر پال: آپ سے صفائی ہوگئی تو اب کسی کا غم نہیں ہے۔ اب مجھے یہیں سے رخصت

کیجیے۔
ونے: ایک روز اکیلے تو میرے مہمان ہو جایئے۔
بیر پال: ایشور نے چاہا تو جلد ہی آپ کے درشن ہوں گے۔ مجھ پر نظر عنایت رکھئے گا۔
ونے: صوفیہ سے میرا کچھ ذکر نہ کیجیے گا۔
بیر پال: جب تک وہ خود نہ چھیڑ یں گی میں نہ کروں گا۔
ونے: میری یہ گھبراہٹ یہ دیوانگی اس کا ذکر تو بھول کر بھی نہ کیجیے گا۔ میں نہ جانے کیا کیا بک رہا ہوں۔ اپنی زبان اور خیالات پر مجھے ذرا بھی قابو نہیں رہا۔ بے جان سا ہو رہا ہوں۔ آپ ان سے اتنا کہہ دیجیے گا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے۔ اس کا وعدہ کیجیے۔
بیر پال: اگر وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں گی تو میں کچھ نہ کہوں گا۔
ونے: میری خاطر سے اتنا ضرور کہہ دیجیے گا کہ آپ کا ذرا بھی ذکر نہ کرتے تھے۔
بیر پال: جھوٹ تو نہ بولوں گا۔
ونے: جیسی تمھاری مرضی۔

(31)

بھیرو کے گھر سے نکل کر سورداس اپنی جھونپڑی میں آکر سوچنے لگا۔ کیا کروں کہ دفعتاً دیاگر آگئے اور بولے۔ سورداس آج تولوگ تمھارے اوپر بہت گرم ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں اسے گھمنڈ ہو گیا ہے۔ تم اس مایاجال میں کیو ں پڑے ہو؟ کیوں نہیں میرے ساتھ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلتے؟
سورداس: یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ چلو تو میں بھی نکل پڑوں۔
دیاگر: ہاں۔ چلو تب تک میں بھی مندر کا کچھ ٹھکانا کر لوں۔ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو میرے پیچھے یہاں دیا بتی کر دے۔ بھوگ لگانا تو دور رہا۔
سورداس: تمھیں مندر سے کبھی چھٹی نہ ملے گی۔
دیا گر: بھائی یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ مندر کو یوں ہی بلا حفاظت چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر نہ

جانے کب لوٹوں تب تک تو یہاں گھاس جم جائے گی۔
سورداس: تو جب تم آپ ہی ابھی اس مایا جال میں پھنسے ہوئے ہو تو مجھے کیوں کر چھڑا سکو گے۔
دیا گر: نہیں جلد ہی چلوں گا۔ ذرا پوجا کے لیے پھول لیتا آؤں۔

دیاگر چلے گئے تو سورداس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ سنسار کی بھی کیا لیلا ہے کہ ہوم کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ میں تو نیکی کرنے گیا تھا اور اس کا یہ پھل ملا۔ محلّہ والوں کو یقین آگیا۔ بری باتوں پر لوگوں کو کتنی جلد یقین آجاتا ہے۔ مگر نیکی بدی کبھی چھپی نہیں رہتی۔ کبھی نہ کبھی تو اصلی بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ ہارجیت تو زندگانی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کبھی ہاروں گا۔ اس کی چنتا ہی کیا؟ ابھی کل بڑے بڑے لوگوں سے جیتا تھا۔ آج جیت میں بھی ہار گیا۔ یہ تو کھیل میں ہوا ہی کرتا ہے اب بے چاری سبھاگی کہاں جائے گی؟ محلّہ والے تو اب اسے یہاں رہنے نہ دیں گے اور رہے گی کس کے سہارے پر؟ کوئی اپنا تو ہو۔ میکے میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت اکیلی کہیں رہ بھی نہیں سکتی۔ زمانہ ایسا برا آگیا ہے اس کی آبرو کیسے بچے گی؟ بھیرو کو کتنا چاہتی ہے۔ سمجھتی تھی کہ میں اسے مارنے گیا ہوں۔ اسے ہوشیار رہنے کے لیے کتنا زور دے رہی تھی۔ وہ تو اتنا پریم کرتی ہے اور بھیرو کا کبھی منہ ہی نہیں سیدھا ہوتا۔ ابھاگنی ہے اور کیا۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس کے چرن دھو دھو کر پیتا۔ پر بھیرو کو جب دیکھو اس پر تلوار ہی کھینچے رہتا ہے۔ میں کہیں چلاگیاتواس کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ رہے گا۔ محلّہ والے اس کی چھیچھا لیدر ہوتے دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ کہیں نہ کہیں ڈوب مرے گی۔ کہاں تک صبر کرے گی۔ اس آنکھوں والے اندھے بھیرو کو تھوڑا بھی خیال نہیں ہے کہ میں اسے نکال دوں گا تو کہاں جائے گی۔ کل کو مسلمان یا کرستان ہوجائے گی۔ تو سارے نگر میں ہل چل مچ جائے گی۔ پر ابھی اس کے آدمی کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہے۔ کہیں بھرتی والوں کے ہاتھ پڑگئی تو پتہ بھی نہ لگے گا کہ کہاں گئی۔ سبھی لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہوا سڑک کی طرف چلا تھا کہ سبھاگی آکر بولی۔ سورداس میں کہاں رہوں گی؟

سورداس نے ظاہری بے رخی سے کہا۔ میں کیاجانوں کہا رہے گی۔ ابھی تو ہی تو

بھیرو سے کہہ رہی تھی کہ لاٹھی لے کر جاؤ۔ تو کیا یہ سمجھتی تھی کہ میں بھیرو کو مارنے آیا ہو ں؟

سبھا گی: ہاں سورداس۔ جھوٹ کیو ں بولوں۔ مجھے وہ کھٹکا تو ہوا تھا۔

سورداس: جب تیری سمجھ میں میں اتنا برا ہو ں۔ تو پھر مجھ سے کیو ں بولتی ہے؟ اگر وہ لاٹھی لے کر آتا اور مجھے مارنے لگتا تو تو تماشا دیکھتی اور ہنستی کیوں؟ تجھ سے تو بھیرو ہی اچھا کہ لاٹھی پاٹھی لے کر نہیں آیا۔ جب تو نے مجھ سے بیر ٹھان رکھا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ بیر ٹھانوں؟

سبھا گی: (روتی ہوئی) سورداس تم بھی ایسا کہو گے تو یہا ں کون ہے جس کی آڑ میں میں چھن بھر بیٹھوں گی؟ اس نے ابھی مارا ہے مگر پیٹ نہیں بھرا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ جا کر تھانے میں لکھائے دیتا ہو ں۔ میرے کپڑے لتے سب باہر پھینک دیے ہیں۔ اس جھونپڑی کے سوا اب میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

سورداس: مجھے بھی اپنے ساتھ محلہ سے نکلوائے گی کیا؟

سبھا گی: تم جہاں جاؤ گے میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔

سورداس: تب تو تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائک نہ رکھے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ اندھا اسے بھگا کر لے گیا۔

سبھا گی: تم تو بدنامی سے بچ جاؤ گے لیکن میری آبرو کیسے بچے گی؟ ہے کوئی محلہ میں میں ایسا جو کسی کی آبرو جاتے دیکھے تو اس کی بانہہ پکڑ لے؟ یہاں تو ایک ٹکڑا روٹی بھی مانگوں تو نہ ملے۔ تمھارے سوا اب میرا کوئی نہیں ہے۔ پہلے میں تمھیں آدمی سمجھتی تھی۔ اب دیوتا سمجھتی ہوں۔ چاہے تو رہنے دو نہیں تو کہہ دو کہیں منہ میں کالکھ لگا کر ڈوب مروں۔

سورداس نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ سبھا گی تو آپ سمجھ دار ہے۔ جیسا جی میں آئے کر۔ مجھے تیرا کھلانا پہنانا بھاری نہیں ہے۔ ابھی سہر میں اتنا مان ہے کہ جس کے درواجے پر کھڑا ہو وہ ناہیں نہ کرے گا۔ لیکن میرا من کہتا ہے کہ تیرے یہاں رہنے سے ہمارا کلیان نہ ہوگا۔ ہم دونوں ہی بدنام ہوجائیں گے۔ میں تجھے اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ لیکن اندھا سنسار تو کسی کی نیت نہیں دیکھتا۔ ابھی تو نے دیکھا، لوگ کیسی

کیسی باتیں کرتے رہے۔ پہلے بھی گالی اٹھ چکی ہے۔ جب تک توکھلم کھلا میرے گھر میں رہے گی۔ تب تو انرتھ ہی ہو جائے گا۔ لوگ گردن کاٹنے پر اوتارو ہوجائیں گے۔ بتا کیا کروں؟

سبھاگی: جو چاہے کرو پر میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔

سورداس: یہی تیری مرجی (مرضی) ہے تو یہی سہی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں چلاجاؤں۔ نہ آنکھوں دیکھوں گا نہ پیڑ ہوگی لیکن تیری بپت دیکھ کراب جانے کا من نہیں ہوتا۔ آ۔ پڑی رہ۔ جیسی کچھ سر پر آئے گی دیکھی جائے گی۔ تجھے منجھدھا رمیں چھوڑ دینے سے بدنام ہونا اچھا ہے۔

یہ کہہ کر سورداس بھیک مانگنے چلا گیا۔ سبھاگی جھونپڑی میں آبیٹھی۔ دیکھا تو اس مختصر گھر کی مختصر گرہستی ادھر ادھر پھیلی پڑی تھی۔ کہیں لوٹیا اوندھی پڑی تھی۔ کہیں گھڑے لڑھکے ہوئے تھے۔ مہینوں سے اندر صفائی نہ ہوئی تھی۔ زمین پرمنوں گرد جمی ہوئی تھی۔ پھوس کے چھپر میں مکڑیوں نے جالے لگا لیے تھے۔ ایک چڑیا کا گھونسلا بھی بن گیا تھا۔ سبھاگی تمام دن جھونپڑے کی صفائی کرتی رہی۔ شام کووہی گھر جو ''بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا'' والی کہاوت کو مجسم دکھلا رہا تھا صاف ستھرا لپا پتا نظر آتا تھا کہ اسے دیکھ کر رہنے کے لیے دیوتاؤں کا بھی جی للچائے۔ بھیرو تواپنی دوکان پر چلا گیا تھا۔ سبھاگی گھر جا کر اپنی گٹھری اٹھا لائی۔ سورداس شام کو واپس آیا توسبھاگی نے تھورا سا چرن اسے جل پان (ناشتہ) کرنے کو دیا۔ لوٹیا میں پانی لاکر رکھ دیا اور اسے آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ سورداس کو اپنی زندگی میں کبھی ایسا سکھ نہ ملا تھا۔ گرہستی کے سکھ کا اسے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا۔ دن بھر سڑک کے کنارے لو اور لپٹ میں جلنے کے بعد یہ سکھ اس کو بیکنٹھ سا سکھ معلوم ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا ہوگئی۔ سوچنے لگا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ کاش یہ میری عورت ہوتی تو زندگی کتنے مزہ سے کٹتی۔ اب تو بھیرو نے اسے گھر سے نکال ہی دیا۔ میں رکھ لوں تو اس میں کون سی برائی ہے؟ اس سے کہوں کیسے۔ نہ جانے اپنے دل میں کیاخیال کرے۔ میں اندھا ہوں توکیا آدمی نہیں ہوں۔ برا تو نہ مانے گی؟ مجھ سے اسے محبت نہ ہوتی تو میری اتنی سیوا کیوں کرتی؟

کل انسانوں کو بلکہ کل جانداروں کو محبت کی خواہش ہوتی ہے۔ نفس پرست لوگوں کے لیے یہ نفس پرستی کا ذریعہ ہے اور سادگی پسندوں کے لیے قلبی تسکین کا۔

سبھاگی نے سورداس کی پوٹلی کھولی تو اس میں گیہوں کا آٹا نکلا۔ تھوڑے سے چاول کچھ چنے اور تین آنے کے پیسے۔ سبھاگی بنئے کے یہاں سے دال لائی اور روٹیاں بنا کر سورداس کو کھانے کے لیے بلایا۔

سورداس: مٹھوا کہاں ہے؟

سبھاگی: کیا جانوں کہیں کھیلتا ہوگا۔ دن میں ایک بار پانی پینے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر چلا گیا۔

سورداس: تجھ سے شرماتا ہوگا۔ دیکھ میں اسے بلائے لاتا ہوں۔

یہ کہہ کر سورداس باہر جا کر مٹھوا کو پکارنے لگا۔ مٹھوا اور دن جب جی چاہتا تھا گھر میں جا کر دانہ نکال لاتا اور بھنوا کر چبا تا۔ آج سارا دن بھوکوں مرا۔ اس وقت مندر میں پرشاد کے لالچ سے بیٹھا ہوا تھا۔ آواز سنتے ہی دوڑا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔ سبھاگی نے سورداس کے سامنے چاول اور روٹیاں رکھ دیں اور مٹھوا کے سامنے صرف چاول۔ آٹا بہت کم تھا۔ صرف دو روٹیاں بن سکی تھیں۔

سورداس: نے کہا۔ مٹھوا اور روٹی لو گے؟

مٹھوا: مجھے تو روٹی ملی ہی نہیں۔

سورداس: تو مجھ سے لے لو۔ میں چاول ہی کھالوں گا۔

یہ کہہ کر سورداس نے دونوں روٹیاں مٹھوا کو دے دیں۔ سبھاگی خفا ہو کر مٹھوا سے بولی۔ دن بھر سانڈ کی طرح پھرتے ہو۔ کہیں مجوری کیو ں نہیں کرتے؟ اسی چکی گھر میں کام کرو تو پانچ چھ آنے روز ملیں۔

سورداس: ابھی وہ کام کرنے کے لایک ہے؟ اسی عمر میں مجوری کرنے لگے گا تو کلیجہ ٹوٹ جائے گا۔

سبھاگی: مجوروں کے لڑکوں کا کلیجہ اتنا نرم نہیں ہوتا۔ سبھی تو کام کرنے جاتے ہیں، کسی کا کلیجہ نہیں ٹوٹتا۔

سورداس: جب اس کا جی چاہے گا آپ کام کرے گا۔

سبھاگی: جیسے بنا ہاتھ پیر ہلائے کھانے کو مل جائے اس کی بلا کام کرے۔
سورداس: اونھ مجھے کون کسی رن دھن کا سوچ ہے۔ مانگ کر لاتا ہوں کھاتا ہوں۔ جب پورکھ نہ چلے گا تب دیکھی جائے گی۔ اس کی چنتا (فکر) ابھی سے کیو ں کروں؟
سبھاگی: میں اسے کام پر بھیجوں گی۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتا۔ یہ مٹ مردی ہے کہ اندھا مانگے اور آنکھ والے مسٹنڈے بیٹھے کھائیں۔ سنتے ہو مٹھوا کل سے کام کرنا پڑے گا۔
مٹھوا: تیرے کہنے سے نہ جاؤں گا۔ دادا کہیں تو جاؤں گا۔
سبھاگی: موسل کی طرح گھومنا اچھا لگتا ہے۔ اتنا نہیں سوجھتا کہ اندھا آدمی تو مانگ کر لاتا ہے اور میں چین سے کھاتا ہوں۔ جنم بھر لڑکے ہی بنے رہو گے۔
مٹھوا: تجھ سے کیا مطلب؟ میرا جی چاہے گا جاؤں گا۔ نہ جی چاہے گا نہ جاؤں گا۔

اسی طرح دونوں میں دیر تک حجت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مٹھوا جھلا کر چوکے پر سے اٹھ گیا۔ سورداس نے بہت منایا پر وہ کھانے نہ بیٹھا۔ آخر سورداس بھی آدھا ہی پیٹ کھا کر اٹھ گیا۔

جب وہ لیٹا تو خانہ داری کی ایک دوسری تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہاں نہ وہ سکون تھا، نہ وہ آرام، نہ وہ خوشی کی امنگ پہلے ہی روز یہ جھگڑا شروع ہوا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ تو آگے کون جانے کیا ہوگا۔ اسے سبھاگی کی وہ سخت پسندی نامناسب معلوم ہوتی تھی۔ جب تک میں کمانے کو تیار ہوں۔ لڑکے پر کیوں گرہستی کا بوجھ ڈالوں؟ جب میں مرجاؤں گا تو اس کے سر پر جیسی پڑے گی ویسی جھیلے گا۔

وہ ننھا سا پودا جو ایک حقیر تمنا کی صورت میں شام کے وقت اس کے دل میں اگا تھا۔ اس آگ کی لپٹ سے جل گیا۔ جل کر خاکستر ہوگیا۔

سبھاگی کو نئی فکر سوار ہوئی۔ مٹھوا کو کام پر کسے لگاؤں؟ میں کچھ اس کی لونڈی نہیں ہوں کہ اس کی تھالی دھوؤں۔ اس کا کھانا پکاؤں اور وہ مٹر گشت کرے۔ مجھے بھی کوئی بیٹھا کر نہ کھلائے گا۔ میں کھاؤں ہی کیو ں؟ جب سب کام کریں گے تو یہ کیوں چھیلا بنا گھومے گا۔

صبح جب وہ جھونپڑی سے گھڑا لے کر پانی بھرنے نکلی تو گھیسو کی ماں نے دیکھ کر سینہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولی۔ کیو ں ری آج رات تو یہیں رہی تھی کیا؟

سبھاگی نے کہا۔ ہاں رہی تو پھر......

جمنی: اپنا گھر نہیں تھا؟

سبھاگی: اب لات کھانے کا بوتہ نہیں ہے۔

جمنی : توتودو چار سرکٹا کر تب چین لے گی! اس اندھے کی بھی مت ماری گئی ہے کہ جان بوجھ کر سانپ کے منہ میں انگلی دیتا ہے۔ بھیرو گلا کاٹ لینے والا آدمی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلی جا گھر کو!

سبھاگی: اس گھر میں تو اب پاؤں نہ رکھوں گی چاہے کوئی مارڈالے۔ سورداس میں اتنی دیا توہے کہ ڈوبتے ہوئے کی بانہہ پکڑلی۔ اور دوسرا یہاں کون ہے؟

جمنی: جس گھر میں کوئی مہر یا(عورت)نہیں وہاں تیرا رہنا اچھا نہیں۔

سُبھاگی: جانتی ہوں پرکس کے گھرجاؤں؟تمھارے گھرآؤں۔ رہنے دوگی؟جوکچھ کرنے کو کہوگی کروں گی۔ گوبرپاتھوں گی۔ بھینسوں کو گھاس چارادوں گی۔پانی ڈالوں گی۔ تمھاراآٹا پیسوں گی۔ رکھوگی؟

جمنی: نابابا۔ یہاں کون بیٹھے بٹھائے رار(جھگڑا) مول لے۔ اپنا کھلاؤں بھی اُس پر بدوبھی بنوں۔

سُبھاگی: تو روج گالی مار کھایا کروں؟

جمنی: اپنا مرد ہے مارتا ہی ہے تو کیا گھرچھوڑ کر کوئی نکل جاتا ہے؟

سُبھاگی: کیوں بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہو جمنا۔ مل گیا ہے بیل۔ جس کل چاہتی ہو بیٹھاتی ہو۔ رات دن ڈنڈا لیے سرپرسوار رہتا تودیکھتی کہ کیسے گھرمیں رہتیں۔ ابھی اس دن دودھ میں پانی ملانے کے لیے مارنے اُٹھا تھا۔ تو چادرلے کرمیکے بھاگی جاتی تھیں۔ دوسروں کو اُپدیس کرناسہل ہے۔ جب اپنے سرپڑتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں۔

یہ کہتی ہوئی سبھاگی کنوئیں پر پانی بھرنے چلی گئی۔ یہاں بھی اس نے نکتہ چینوں کو ایسا ہی اکھڑ جواب دیا۔ پانی لا کربرتن دھوئے۔ چوکا لگایااور سورداس کو سڑک پر پہنچانے چلی گئی۔ اب تک وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا اکیلے ہی جایاکرتاتھا مگر سبھاگی سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اندھا آدمی کہیں گرپڑے تو۔ لڑکے ہی دق کرتے ہیں۔ میں بیٹھی ہی تو ہوں۔ اس سے پھر کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ یہ رائے قائم کر لی گئی کہ سورداس نے اسے

اپنے گھر ڈال لیا۔ اب قیل وقال یا طعن تشنیع کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ ہاں سورداس سب کی نگاہوں میں سبک ہو گیا۔ لوگ کہتے۔ روپے نہ لوٹا دیتا تو کیا کرتا؟ ڈرتا ہوگا کہ سبھاگی ایک دن بھیرو سے کہہ ہی دے گی۔ میں پہلے ہی سے کیوں نہ ہوشیار ہو جاؤں۔ مگر سبھاگی کیوں اپنے گھر سے روپے اڑا لے گئی؟ واہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بھیرو اسے روپے پیسے نہیں دیتا۔ مالکن تو بڑھیا ہے۔ سوچا ہوگا کہ روپے اڑا لوں۔ میرے پاس کچھ پونجی تو ہو ہی جائے گی۔ اپنے پاس کہاں رکھتی۔ سورداس کو بھلا آدمی سمجھ کر اس کے پاس رکھ آئی ہوگی یا کون جانے دونوں میں پہلے ہی سے سانٹھ گانٹھ رہی ہو۔ سورداس نے روپے اٹھوا لیے ہوں پھر لوٹا آیا ہو کہ اس طرح میرا بھرم بنا رہے گا۔ اندھے پیٹ کے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ انھیں بڑی دور کی سوجھتی ہے۔

اس طرح کئی دنوں تک گدّے بازیاں ہوا کیں مگر لوگوں کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ کسی معاملہ پر عرصہ تک رائے زنی کرتے رہیں نہ انھیں اتنی فرصت ہوتی ہے کہ ان باتوں میں سر کھپائیں۔ نہ اتنی عقل ہی کہ ان گتھیوں کو سلجھائیں۔ انسان فطرتاً عملی ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ چھان بین کی سکت کہاں؟ سبھاگی سے بولنے چالنے اس کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے میں کسی کو اعتراض نہ رہا۔ نہ کوئی اس سے کچھ پوچھتا۔ اور نہ اس پر آوازے کستا۔ ہاں سورداس کی عزت میں فرق آ گیا۔ پہلے محلّہ بھر میں اس کی دھاک تھی۔ لوگوں کو اس پر اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ اعتبار تھا۔ اس کا نام ادب کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اب اس کا شمار بھی عام آدمیوں میں ہونے لگا۔ کوئی خصوصیت نہ رہی۔

لیکن بھیرو کے دل میں یہ کانٹا ہمیشہ کھٹکا کرتا تھا۔ وہ کسی طرح اس جیتی جاگتی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ دوکان پر بہت کم جاتا۔ افسروں سے شکایت بھی ہوئی کہ یہ ٹھیکے دار دوکان نہیں کھولتا۔ تاڑی پینے والوں کو مایوس ہو کر واپس جانا پڑتا ہے۔ محکمہ آبکاری کے ملازموں نے بھیرو کو نکال دینے کی دھمکی بھی دی مگر اس نے کہا کہ مجھے دوکان کی پرواہ نہیں ہے۔ آپ جسے چاہیں رکھ لیں لیکن وہاں کوئی دوسرا پاسی نہ ملا اور افسروں نے ایک دوکان ٹوٹ جانے کے خیال سے کوئی سختی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سورداس ہی سے نہیں بلکہ سارے محلّہ سے عداوت ہوگئی۔ اس

کے خیال میں محلہ والوں کا یہ فرض تھا اس کی حمایت پر کمر بستہ ہوجاتے۔ اور سورداس کو کوئی ایسی سزا دیتے کہ وہ تمام عمر یاد رکھتا۔ ''ایسے محلہ میں کوئی کیا رہے جہاں انصاف اور بے انصافی دونوں ایک ہی بھاؤ بکیں۔ برے کام کرنے والوں سے کوئی بولتا ہی نہیں۔ سورداس اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ چڑیل آنکھوں میں کاجل لگائے پھرا کرتی ہے۔ کوئی ان دونوں کے منہ میں کالکھ نہیں لگاتا۔ ایسے گاؤں میں تو آگ لگادینی چاہیے۔'' مگر کسی وجہ سے اس کی عملی قوت سست پڑ گئی تھی۔ وہ راستہ میں سبھاگی کو دیکھ لیتا تو کترا کر نکل جاتا۔ سورداس کو دیکھتا تو ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ وار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ اب کبھی مندر میں بھجن گانے نہ جاتا۔ میلوں تماشوں سے بھی اسے نفرت ہوگئی۔ نشہ کا چسکا خود بخود چھوٹ گیا۔ توہین سے پیدا ہونے والا تیز درد دل میں برابر رہتا۔ اس نے سوچا تھا کہ سبھاگی منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائے گی۔ میرے کلنک کا داغ مٹ جائے گا۔ مگر وہ ابھی تک وہاں اس کی چھاتی پر مونگ ہی نہیں دل رہی تھی بلکہ اسی شخص کے ساتھ عیش کررہی تھی جو اس کا خاص مخالف تھا۔ سب سے زیادہ رنج اسے اس بات کا تھا کہ محلہ کے لوگ ان دونوں کے ساتھ پہلا ہی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ نہ کوئی انھیں ڈانٹتا تھا نہ پھٹکارتا تھا۔ اسے اپنی ذلت سامنے بیٹھی منہ چڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب اسے گالی گلوج سے تسکین نہ ہوسکتی تھی۔ وہ اس فکر میں تھا کہ ان دونوں کا کام تمام کردوں۔ اس طرح ماروں کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ پانی کی بوند بھی نہ ملے لیکن اکیلا آدمی کیا کرسکتا ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتا پر کہیں سے مدد ملنے کی امید نظر نہ آتی۔ محلہ میں ایسے جیوٹ کا کوئی آدمی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ اندھے نے چتاری کے راجہ صاحب کو بہت بدنام کیا تھا۔ کارخانہ والے صاحب کو بھی بدنام کرتا پھرتا تھا۔ بس انھیں لوگوں سے چل کر فریاد کروں۔ اندھے سے دل میں تو دونوں خار کھائے بیٹھے ہی ہوں گے۔ چھوٹے آدمی کے منہ لگنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کرچپ رہ گئے ہوں گے میں جو سامنے کھڑا ہو جاؤں تو میری آڑ سے وہ ضرور نشانہ ماریں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ وہاں تک پہنچنا مشکل ہے لیکن جو کہیں میری پہنچ ہوگئی اور انھوں نے میری سن لی تو پھر ان بچہ کی ایسی خبر لیں گے کہ سارا اندھا پن نکل جائے گا۔ (اندھے پن کے سوا وہاں اور رکھا

ہی کیا تھا!)

کئی دن تک وہ اسی حیض بیض میں پڑا رہا کہ ان لوگوں کے پاس کیسے پہنچوں۔ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہیں الٹا مجھی کو مار بیٹھیں۔ نکلوا دیں تو اور بھی بھد ہو۔ آخر ایک دن وہ دل مضبوط کر کے راجہ صاحب کے پاس گیا اور سائیں کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ سائیس نے دیکھا تو کرخت لہجہ میں بولا۔ کون ہو؟ یہا ں کیا اچکوں کی طرح جھانک رہے ہو؟

بھیرو نے نہایت عاجزی سے کہا۔ بھیا ڈانٹومت۔ گریب دکھی آدمی ہو ں۔

سائیس: گریب دکھی ہو تو کسی سیٹھ ساہوکار کے گھر جاتے۔ یہاں کیا رکھا ہے۔

بھیرو: گریب ہوں پر بھینک منگا نہیں ہوں۔ اجت آبرو سبھی کی ہوتی ہے۔ تمھاری ہی برادری میں کوئی کسی کی بہو بیٹی لے کر نکل جائے تو کیا اسے پنچایت یوں ہی چھوڑ دے گی؟ کچھ نہ کچھ دنڈ تو دے ہی گی۔ پنچایت نہ دے گی تو عدالت کچہری سے تو کچھ ہوگا۔

سائس ذات کا چمار تھا جہاں اس قسم کے ناگوار واقعے روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے برادری کو نشہ پانی کا سامان ملتا رہتا ہے۔ اس کے گھر میں روز یہی چرچا رہتی تھی اور ان باتوں سے اسے جتنی دلچسپی تھی اتنی اور کسی بات سے نہ ہوسکتی تھی۔ آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کون بھائی ہو؟

بھیرو: پاسی ہوں یہیں پانڈے پور میں رہتا ہوں۔

وہ سائیس کے پاس جا بیٹھا اور دونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں گویا کوئی وہاں کان لگائے ان کی باتیں سن رہا ہو۔ بھیرو نے اپنی پوری داستان سنائی اور کمر سے ایک روپیہ نکال کر سائیس کے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ بھائی کوئی ایسی جگت نکالو کہ راجہ صاحب کے کانوں میں یہ بات پڑ جائے پھر تو میں اپنا سب حال آپ ہی کہہ لوں گا۔ تمھاری دیا سے بولنے چالنے میں ایسا بدھو نہیں ہوں۔ دروگا سے تو کبھی ڈرا ہی نہیں۔

سائیس کو نقرئی سکہ کے درشن نصیب ہوئے تو مگن ہوگیا۔ آج سیر ے سیر ے اچھی بوہنی ہوئی بولا۔ ''میں راجہ صاحب سے تمھاری اطلاع کرائے دیتاہوں۔ بلاویں تو چلے جانا۔ راجہ صاحب کو گھمنڈ تو چھو ہی نہیں گیا۔ مگر دیکھنا بہت دیر نہ لگانا نہیں تو مالک

چڑھ جائیں گے بس جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ ڈالنا۔ بڑے آدمیوں کی بات چیت کرنے کی چھٹی نہیں رہتی۔ میری طرح تھورے ہی ہیں کہ دن بھر بیٹھے ہوئے گپیں لڑایا کریں۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راجہ صاحب اس وقت حجامت بنوا رہے تھے جو ان کا روزانہ معمول تھا۔ سائیس نے پہنچ کر سلام کیا۔

راجہ: کیا کہتے ہو؟ میرے پاس طلب کے لیے مت آیا کرو۔

سائس: نہیں ہجور طلب کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ جو سورداس پانڈے پور میں رہتا ہے۔

راجہ: اچھا وہ بدمعاش اندھا ۔

سائیس: ہاں ہجور وہ ایک عورت کو نکال لے گیا ہے۔

راجہ: اچھا اسے تو لوگ کہتے تھے کہ بڑا بھلا آدمی ہے۔ اب یہ سوانگ رچنے لگا۔

سائیس: ہاں ہجور۔ اس عورت کا آدمی پھریاد کرنے آیا ہے حکم ہو تو بلاؤں۔

راجہ صاحب نے سر ہلا کر منظوری دے دی اور ایک لمحہ میں بھیرو دبکتا ہوا سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔

راجہ: تمھاری عورت ہے؟

بھیرو: ہاں ہجور ابھی کچھ دن پہلے تو میری ہی تھی۔

راجہ: پہلے سے کچھ آمد و رفت تھی؟

بھیرو: ہوگی سرکار۔ مجھے معلوم نہیں۔

راجہ: لے کر کہاں چلا گیا؟

بھیرو: کہیں گیا نہیں سرکار۔ اپنے گھر میں ہے۔

راجہ: بڑا ڈھیٹ ہے۔ محلہ والے کچھ نہیں بولتے؟

بھیرو: کوئی نہیں بولتا ہجور۔

راجہ: عورت کو مارتے بہت ہو؟

بھیرو: سرکار عورت سے بھول چوک ہوتی ہے۔ تو کون نہیں مارتا؟

راجہ: بہت مارتے ہو کہ کم؟

بھیرو: ہجور گسا میں یہ بچار کہاں رہتا ہے؟

راجہ : کیسی عورت ہے؟ خوب صورت؟
بھیرو: ہاں ہجور۔ دیکھنے سننے میں بری نہیں ہے۔
راجہ: سمجھ میں نہیں آتا کہ خوب صورت عورت نے اندھے کو کیوں پسند کیا۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ تم نے دال میں نمک زیادہ ہو جانے پر عورت کو مار کر نکال دیا ہو اور اندھے نے اسے رکھ لیا ہو؟
بھیرو: سرکار۔ عورت میرے روپے چرا کر سورداس کو دے آئی۔ سیرے سورداس روپے لوٹا گیا۔ میں نے چکمہ دے کر پوچھا تو اس نے چور کو بھی بتا دیا۔ اس بات پر مارتا نہ تو کیا کرتا؟
راجہ: اور کچھ ہو پر اندھا ہے دل کا صاف۔
بھیرو: ہجور نیت کا اچھا نہیں۔
اگرچہ مہیند کمار سنگھ بہت منصف مزاج تھے اور اپنے برے خیالوں کو ظاہر کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے جیسا کہ شہرت پسند انسان کو عموما اپنی زبان پر پورا قابو ہوتا ہے۔ مگر وہ سورداس سے اتنے جلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں اتنی روحانی تکلیفیں انھیں ملی تھیں کہ وہ اس وقت اپنے خیالات کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ بولے ''اجی اس نے یہاں مجھے اتنا بدنام کیا کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہوگیا۔ کلارک صاحب نے اسے ذرا منہ کیا لگا لیا کہ وہ سر چڑھ گیا۔ یوں میں کسی غریب کو ستانا نہیں چاہتا مگر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بھلے آدمیوں کے بال نوچے۔ اجلاس تو میرا ہی ہے۔ تم اس پر دعوی کر دو۔ گواہ تو مل جائیں گے نا؟
بھیرو: ہجور سارا محلہ جانتا ہے۔
راجہ: سب کو پیش کرو۔ یہاں لوگ اس کے مرید ہوگئے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ کوئی دیوتا ہے۔ میں اس کی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ اتنے دنوں کے بعد یہ موقع میرے ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اگر اب تک کسی سے نیچا دیکھا تو اسی اندھے سے۔ اس پر نہ پولیس کا زور تھا، نہ عدالت کا۔ اس کی بیکسی اور کمزوری اس کی زرہ بکتر بنی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ اس کے لیے گہرا گڑھا ہوگا جس میں سے وہ نکل نہ سکے گا۔ مجھے اس کی جانب سے اندیشہ تھا۔ مگر ایک بار جہاں پردہ کھلا کہ میں بے فکر ہو جاؤں گا۔ زہر کے دانت ٹوٹ

جانے پر سانپ سے کون ڈرتا ہے؟ ہو سکے تو جلد ہی یہ مقدمہ دائر کردو۔

کسی بڑے آدمی کو روتے دیکھ کر ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اسے ذی اقتدار سمجھ کر ہم تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہے۔ ہم اسے عام انسانی کمزوریوں سے بالاخیال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے ایک حیرت کی چیز بن جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کھاتا ہوگا۔ نہ جانے کیا پڑھتا ہوگا۔ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ اس کے دل میں ہمیشہ اونچے اونچے خیالات آتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف تواس کا دھیان ہی نہ جاتاہوگا۔ اسی حیرت کی پاکیزہ شکل ہی احترام ہے۔

بھیرو کو راجہ صاحب کے سامنے جاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمیں جیسے انسان ہیں۔ گویااسے آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ ذرا بے دھڑک ہو کر بولا۔ ''بجور ہے تو اندھا پر بڑا گھمنڈی ہے۔ اپنے آگے تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ محلّہ والے جرا سورداس سورداس کہہ دیتے ہیں تو بس پھول اٹھتاہے۔ سمجھتاہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوں میں ہی ہو ں۔ بجور اس کی ایسی سجا (سزا) کر دیں۔ کہ چکی پیستے پیستے دن جائیں۔ تب اس کی عقل ٹھکانے ہوگی۔'' راجہ صاحب نے تیور بدلے۔ دیکھا کہ یہ گنوار اب زیادہ بہکنے لگا۔ بولے۔ اچھا اب جاؤ۔

بھیرو دل میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے راجہ صاحب کو اپنی مٹھی میں کرلیا۔ اگر اسے چلے جانے کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ایک لمحہ میں اس کا ہجور آپ میں بدل جاتا۔ شام تک اس کی باتوں کا سلسلہ نہ ختم ہوتا۔ وہ نہ جانے کتنی جھوٹی باتیں گڑھتا۔ غیبت کا انسان کی زبان کی پر کبھی اتنا قابونہیں چلتا جتنا بڑے لوگوں کے سامنے۔ نہ جانے کیوں ہم ان کی نظر نوازش کے اتنے متمنی ہوتے ہیں؟ ہم ایسے لوگوں پر بھی جن سے ہمیں ذرا بھی رنجش نہیں حملے کرنے لگتے ہیں۔ کوئی غرض نہ رکھتے ہوئے ہم ان کی نگاہوں میں رسوخ پانا چاہتے ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ہمارے دل میں ایک بے اختیارانہ تحریک ہوتی ہے۔ ہماری زبان اس وقت قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔

بھیرو یہاں سے کچھ نادم ہو کر نکلا۔ مگر اسے اب اس بات میں شبہ نہ تھا کہ میری مرضی پوری ہوگئی۔ گھر جا کر اس نے بجرنگی سے کہا۔ تمھیں گواہی دینی پڑے گی۔

نکل نہ جانا۔
بجرنگی: کیسی گواہی؟
بھیرو: یہی میرے معاملے کی۔ اس اندھے کی ہیکڑی اب نہیں دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں تک صبر کیے بیٹھا رہا کہ اب بھی وہ سبھاگی کو نکال دے۔ اس کا جہاں جی چاہے چلی جائے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جائے۔ پر دیکھتا ہوں۔ تودن دن اس کی پینگ بڑھتی جاتی ہے۔ اندھا چھیلا بنا جاتاہے۔ مہینوں بدن پر پانی نہیں پڑتا تھا۔ اب نت نہاتاہے۔ وہ پانی لاتی ہے۔ اس کی دھوتی چھانٹتی ہے۔ اس کے سر میں تیل لگاتی ہے۔ یہ اندھیر نہیں دیکھاجاتا۔
بجرنگی: اندھیر تو ہے ہی۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ سورداس کو اتنا چھچھورا نہ سمجھتا تھا۔ پر میں کہیں گواہی ساکھی کرنے نہ جاؤں گا۔
جمنی: کیوں کچہری میں کوئی تمھارے کان کاٹ لے گا؟
بجرنگی: اپنا من ہے نہیں جاتے۔
جمنی: اچھا تمھارا من ہے۔ بھیرو۔ تم گواہی لکھادو میں چل کرگواہی دوں گی۔ سانچ کو آنچ کیا؟
بجرنگی: (ہنس کر) تو کچہری جائے گی؟
جمنی: کیاکروں گی؟ جب مردوں کی وہاں جاتے چوڑیاں میلی ہوتی ہیں۔ توعورتیں ہی جائیں گی۔ کسی طرح اس کمین کے منہ میں کالکھ تو لگے۔
بجرنگی: بھیرو بات یہ ہے کہ سورداس نے برائی جرور کی پر تم بھی تو بری راہ پر ہی چلتے تھے۔ کوئی اپنے گھر کے آدمی کو اتنی بیدردی سے نہیں مارتا۔ پھرتم نے مارا ہی نہیں مار کر نکال بھی دیا۔ جب گائے کے پگھا نہ رہے لی تو وہ دوسروں کے کھیت میں جرور ہی جائے گی۔ اس میں اس کا کیا دوکھ؟
جمنی: تم انھیں بکنے دو بھیرو۔ میں تمھاری گواہی دوں گی۔
بجرنگی: توسوچتی ہوگی۔ یہ دھمکی دینے سے میں کچہری جاؤں گا۔ لو میں اتنا بدھو نہیں ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سورداس لاکھ برا ہو۔ مگراب بھی ہم سبھو ں سے اچھا ہے۔ روپیو ں کی تھیلی لوٹا دینا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔

جمنی: بس چپ رہو۔ میں تمھیں کھوب جانتی ہو ں۔ تم بھی جا کر چار گال ہنس بول آتے ہو نا۔ کیا اتنی یاری بھی نہ نباہوگے؟ سہاگی کو سجا ہوگئی تو تمھیں بھی تو نجر (نظر) لڑانے کے لیے کوئی نہ رہے گا۔

بجرنگی یہ سن کر تلملا اٹھا (جمنی اسے راہ پر لانا جانتی تھی) بولا۔ منہ میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

جمنی: تو پھر گواہی دینے کیوں کور دبتی ہے؟

بجرنگی: لکھا دو بھیرو میرا نام۔ یہ چڑیل مجھے جینے نہ دے گی۔ میں اگرہارتا ہوں تو اسی سے۔ میری پیٹھ میں اگردھول لگاتی ہے تو یہی۔ نہیں تویہاں کبھی کسی سے دب کر نہیں چلے۔ جاؤ لکھا دو۔

بھیرو یہاں سے ٹھاکر دین کے پاس گیا اور وہی بات کہی۔

ٹھاکر دین نے کہا۔ ''ہاں ہاں میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ میرا نام سب سے پہلے لکھا دو۔ اندھے کو دیکھ کر میری تو اب آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ جرور (ضرور) کوئی جادو جانتا ہے۔ نہیں تو کیا سہاگی اس کے پیچھے یوں دوڑی دوڑی پھرتی۔''

بھیرو: چکی پیسیں گے تو بچہ کو معلوم ہو گا۔

ٹھاکر دین: نا بھیا۔ اس کا اکبال بھاری ہے وہ کبھی چکی نہ پسے گا۔ وہاں سے بھی بے لاگ لوٹ آئے گا۔ ہاں گواہی دینا میرا دھرم ہے۔ وہ میں جرور کروں گا۔ جو آدمی جادو سے دوسروں کو ان بھل کرے اس کی گردن کاٹ لینی چاہیے۔ نہ جانے بھگوان کیوں سنسار میں چوروں اور پاپیوں کو جنم دیتے ہیں۔ یہی سمجھ لو کہ جب سے میری چوری ہوئی کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ روج وہی چنتا بنی رہتی ہے۔ یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں پھر نہ وہی نوبت آجائے۔ تم تو ایک حساب سے مجے (مزہ) میں رہے کہ روپے سب مل گئے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔

بھیرو: تو تمھاری گواہی پکی رہی۔

ٹھاکر دین: ہاں ایک بار نہیں سو بار پکی۔ ارے میرا بس چلتا تو میں اسے زمین کھودکر گاڑدیتا۔ یوں مجھ سے سیدھا کوئی نہیں ہے۔ لیکن بدمعاشوں کے حق میں مجھ سے ٹیڑھا

بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کو ڈنڈ دلانے کے لیے میں جھوٹی گواہی بھی دینے کو تیار ہوں۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس اندھے کو کیا ہوگیا ہے۔ کہاں تو دھرم کرم کا اتنا بچار اور کہاں یہ برا کام۔

بھیرو یہاں سے جگدھر کے پاس گیا جو ابھی خانچہ فروخت کر کے واپس آیا تھا اور دھوتی لیے نہانے جا رہا تھا۔

بھیرو: تم بھی میرے گواہ ہو نہ؟

جگدھر: تم حک ناحک (حق ناحق) بیچارے سورداس پر مالہ چلا رہے ہو۔ سورداس بے گناہ ہے۔

بھیرو: کسم کھاؤ گے۔

جگدھر: ہاں جو کسم کہو کھا جاؤں۔ تم نے سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ سورداس نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ نہیں تو اب تک وہ نہ جانے کس گھاٹ لگی ہوتی۔ جوان عورت ہے۔ سندر ہے۔ اس کے سینکڑوں گاہک ہیں۔ سورداس نے تو اس کے ساتھ نیکی کی کہ کہیں بھٹکنے نہ دیا۔ اگر تم پھر اسے گھر میں لا کر رکھنا چاہو ں اور وہ اسے نہ آنے دے۔ تم سے لڑنے پر تیار ہو جائے تب میں کہوں گا کہ اس کا کسور ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے اسے سبھاگی کو سمجھاتے سنا ہے۔ وہ آتی نہیں تو بیچارہ کیا کرے؟

بھیرو سمجھ گیا کہ لوٹا جل سے آسودہ ہونے والا دیوتا نہیں۔ اسے کچھ بھینٹ دینی پڑے گی۔ اس کے لالچی سبھاؤ سے وہ واقف تھا۔ بولا۔ ''بھائی مالہ اِجّت کا ہے۔ ایسی اڑن گھاٹیاں نہ بتاؤ۔ پڑوسی کا حک بہت ہوتا ہے۔ پر میں تم سے باہر نہیں ہوں۔ جو کچھ دس بیس کہو۔ حاجر ہے پر گواہی تمھیں دینی پڑے گی۔''

جگدھر: بھیرو۔ میں بہت نیچ ہوں۔ لیکن اتنا نہیں کہ جان بوجھ کر کسی بھلے مانس کو بے کسور پھنساؤں۔

بھیرو نے بگڑ کر کہا۔ ''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ہی نام کھدائی (خدائی) لکھ گئی ہے۔ جس بات کو سارا گاؤں کہے گا اسے ایک تم نہ کہو گے تو کیا بگڑ جائے گا؟ ٹڈی کے روکے آندھی نہیں رک سکتی۔

جگدھر: تو بھائی اسے پیس کر پی جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں اسے بچا لوں گا۔ ہاں میں اسے پینے میں تمھاری مدد نہ کروں گا۔

بھیرو تو ادھر گیا ادھر وہی خود غرض۔ لالچی۔ حاسد بدمزاج جگدھر اس کے گواہوں کو پھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے سورداس سے اتنی عقیدت نہیں تھی جتنا بھیرو سے حسد۔ بھیرو اگر کسی نیک کام میں بھی اس سے مدد مانگتا تو بھی وہ اتنی ہی سرگرمی سے اس کی مخالفت کرتا۔

اس نے بجرنگی کے پاس جا کر کہا۔ ''کیوں بجرنگی تم بھی بھیرو کی گواہی کر رہے ہو؟''

بجرنگی: ہاں جاتا تو ہوں۔

جگدھر: تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے؟

بجرنگی: کیسی باتیں کرتے ہو؟ روج ہی دیکھتا ہوں۔ کوئی بات چھپی تھوڑے ہی ہے۔

جگدھر: کیا دیکھتے ہو۔ یہی نہ کہ سبھاگی سورداس کے جھونپڑے میں رہی ہے؟ اگر کوئی ایک اناتھ (بے کس) عورت کا پالن کرے تو کوئی برائی ہے؟ اندھے آدمی کے جیوٹ کی سرا ہنا تو نہ کروگے کہ جو کام کسی سے نہ ہوسکا وہ اس نے کر دکھایا۔ الٹا اس سے اور بیر کرتے ہو۔ جانتے ہو۔ سورداس اسے گھر سے نکال دے گا تو اس کی کیا گت ہوگی؟ محلہ کی آبرو تیلی گھر کے مجوروں کے ہاتھ بکے گی۔ دیکھ لینا۔ میرا کہنا مانو۔ گواہی ساکھی کے پھیر میں نہ پڑو۔ بھلائی کے بدلے برائی ہو جائے گی۔ بھیرو تو سبھاگی سے اس لیے جل رہا ہے کہ اس نے اس کے چرائے ہوئے روپے سورداس کو کیوں لوٹا دیے۔ بس ساری جلن اسی کی ہے۔ ہم بناجانے بوجھے کیوں کسی کی برائی کریں۔ ہاں گواہی دینے ہی جاتے ہو تو پہلے کھوب پتہ لگالو کہ دونوں کیسے رہتے ہیں۔

بجرنگی: (جمنی کی طرف اشارہ کر کے) اسی سے پوچھو۔ یہی سب کے من کی جانتی ہے۔ اسی نے مجھے مجبور کیا ہے۔

جمنی: ہاں کیا تو ہے۔ کیا اب بھی دل کانپ رہا ہے؟

جگدھر: عدالت میں جا کرگواہی دینا کیا تم نے ہنسی سمجھ لی ہے؟ گنگا جلی اٹھانی پڑتی ہے۔ تلسی دل لینا پڑتا ہے۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی سے تو بال بچے

والے لوگ ڈرتے ہیں کہ اور کچھ۔
جمنی: سچ کہو۔ یہ سب کسمیں بھی کھانی پڑتی ہیں؟
جگدھر: بنا کسم کھائے تو گواہی لگتی ہی نہیں۔
جمنی: تو بھیا۔ باج آئی ایسی گواہی سے کان پکڑتی ہوں۔ چولھے مین جائے سورداس اور بھاڑ میں جائے بھیرو۔ کوئی برے دن کام نہ آئے گا۔ تم رہنے دو۔
بجرنگی: سورداس کو لڑکپن سے دیکھ رہیں ہیں ایسی عادت تو اس میں نہیں تھی۔
جگدھر: نہ تھی نہ ہے اورنہ ہوگی۔ اس کی برائی نہیں کرتا پر اسے لاکھ روپے بھی دو تو برائی میں ہاتھ نہ ڈالے گا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گیاہوا دھن پاکرچپکے سے رکھ لیتا۔ کسی کو کانوں کان کھبر نہ ہوتی۔ نہیں توجاکرسب روپے دے آیا اس کی سچائی تو اتنے ہی سے ہو جاتی ہے۔
بجرنگی کو چھوڑکرجگدھرنے ٹھاکردین کو گھیرا۔ وہ پوجا کرکے کھاناکھانے جا رہا تھا۔ جگدھر کی آواز سن کر بولا۔ بیٹھو' بھوجن کرکے آ ناہوں۔
جگدھر: میری بات سن لو توکھانے بیٹھو۔ کھاناکہیں بھاگا نہیں جاتا۔ تم بھی بھیرو کی گواہی دینے جا رہے ہو؟
ٹھاکر دین: ہاں جاتاہوں۔ بھیرو نے نہ کہا ہوتا توآپ ہی جاتا۔ مجھ سے یہ رنیت (برا کام) نہیں دیکھاجاتا۔ جمانادوسراہے۔ نہیں نوابی ہوتی توایسے آدمی کا سر کاٹ لیا جاتا۔ کسی کی بہو بیٹی کو نکال لے جانا کوئی ہنسی ٹھٹھاہے؟
جگدھر: جاناپڑتاہے۔ دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے تم بھی انترجامی (عالم الغیب) ہوگئے ہو۔ پوچھتاہوں۔ کس بات کی گواہی دوگے؟
ٹھاکر دین: کوئی لکی چھپی بات ہے۔ سار دیس توجانتا ہے۔
جگدھر: سورداس بڑا گبرو جوان ہے اسی سے سندری کا من اس پرلوٹ پوٹ ہوگیاہوگا۔ یا اس کے گھر میں روپے پیسے گہنے جیور کے ڈھیرلگے ہوئے ہیں۔ اسی سے عورت لالچ میں پڑگئی ہوگی۔ بھگوان کودیکھا نہیں پر اکل سے تو پہچاناہے۔ آہ کیادیکھ کرسبھاگی نے بھیرو کو چھوڑدیااورسورداس کے گھر پڑ گئی؟
ٹھاکر دین: کوئی کسی کے من کی بات کیا جانے اور عورت کے من کی بات تو بھگوان بھی

نہیں جانتے۔ اس سے دیوتا لوگ تک تراہ تراہ کرتے ہیں (پناہ مانگتے ہیں)۔
جگدھر: اچھا توجاؤ پر کہے دیتا ہوں کہ اس کا پھل بھوگنا پڑے گا۔ کسی گریب پر جھوٹا اپرادھ لگانے سے بڑا دوسرا پاپ نہیں ہوتا۔
ٹھاکر دین: جھوٹا اپرادھ ہے؟
جگدھر: جھوٹا ہے۔ سراسر جھوٹا۔ رتی بھر بھی سچ نہیں۔ بے بس کی وہ ہائے پڑے گی کہ عمر بھر یاد کروگے۔ جو آدمی اپنا گیا ہوا دھن پا کر لوٹا دے۔ وہ اتنا نیچ نہیں ہوسکتا۔
ٹھاکردین: (ہنس کر) یہی تواندھے کی چالاکی ہے کیسی دور کی سوجھی ہے کہ جو سنے چکر میں آجائے۔
جگدھر: میں نے جتا دیا۔ آگے تم جانو تمھارا کام جانے۔ رکھو گے سبھاگی کو اپنے گھر میں؟ میں اسے سورداس کے گھر سے لوائے لاتا ہوں۔ اگر پھر کبھی سورداس کو اس سے باتیں کرتے دیکھنا توجو چاہنا وہ کرنا۔ بولو۔ رکھو گے؟
ٹھاکر دین: میں کیوں رکھنے لگا؟
جگدھر: تو اگرمہادیو جی نے سنسار بھر کا بس (زہر) ماتھے چڑھا لیا تو کیابراکیا؟ جس کے لیے کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ اسے سورداس نے اپنے گھرمیں جگہ دی۔ اس نیکی کی اسے یہ سجا ملنی چاہیے؟ یہی نیائے ہے؟ اگر تم لوگوں نے دباؤ میں پڑ کر سورداس نے سبھاگی کو گھر سے نکال دیا اور اس کی آبرو بگڑی تواس کاپاپ تمھارے سر بھی پڑے گا۔ یہ کھوب یاد رکھنا۔
ٹھاکر دین شکی اور ڈرپوک تھا۔ پس وپیش میں پڑ گیا۔ جگدھر نے یہ بات تاڑلی۔ اسی ڈھنگ کی دوچار باتیں اورکیں۔ آخر ٹھاکردین گواہی دینے سے انکار کرنے لگا۔ جگدھر کا حسد کسی سادھو کی نصیحت کا کام کر گیا۔ شام ہوتے ہوتے بھیرو کو معلوم ہوگیاکہ محلّہ میں کوئی گواہ نہ ملے گا۔ دانت پیس کررہ گیا۔ چراغ جل رہے تھے۔ بازار کی اور دوکانیں بند ہورہی تھیں۔ تاڑی کی دوکان کھلنے کا وقت قریب آرہا تھا۔ گاہک جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بڑھیا گزک کے لیے مٹر کی دال موٹ اورچرپھری پکوڑیاں بنا رہی تھی۔ اوربھیرو دروازہ پر بیٹھا ہوا جگدھر کو محلّہ والوں کو اور ساری دنیا کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ سب کے سب نامردے ہیں۔ آنکھ کے اندھے۔ جبھی تو یہ دردساہورہی ہے۔ کہتے

ہیں سوکھا کیوں پڑتا ہے۔ پلیگ کیوں آتی ہے۔ ہیضہ کیوں پھیلتا ہے؟ جہاں ایسے ایسے بے ایمان۔ پاپی دشٹ بسیں گے۔ وہاں اور ہوگا ہی کیا؟ بھگوان اس دیس کو گارت کیوں نہیں کردیتے۔ یہی اچرج (تعجب) ہے۔کھیر جندگانی ہے تو ہم اور جگدھر اسی جگہ رہتے ہیں۔ دیکھی جائے گی۔

غصہ کے جوش میں اپنی نیکیاں بہت یاد آتی ہیں۔ بھیرو ان احسانات کا بیان کرنے لگا۔ جو اس نے جگدھر پر کیے تھے۔ اِس کی گھر والی مر رہی تھی۔ کسی نے بتا دیا کہ تاجی تاڑی پئے تو بچ جائے۔ منہ اندھیرے پیڑ پر چڑھتا تھا۔ اور تاجی تاڑی اتار کر اسے پلاتا تھا۔ کوئی پانچ روپے بھی دیتا تو اتنے تڑکے پیڑ پر نہ چڑھتا۔ مٹکوں تاڑی پلادی ہوگی۔ تمباکو پینا ہوتا ہے تو یہیں آتا ہے۔ روپے پیسے کا کام لگتا ہے تو میں ہی کام آتا ہوں۔ اور میرے ساتھ یہ گھات! جمانا ہی ایسا ہے۔

جگدھر کا گھر ملا ہوا تھا۔ یہ سب سن رہا تھا اور منہ نہ کھولتا تھا۔ وہ سامنے سے وار کرنے میں نہیں۔ پیچھے سے وار کرنے میں طاق تھا۔

اتنے میں مِل کا ایک مستری نیم آستین پہنے کوئلے کی بھبھوت لگائے اور کوئلہ ہی کا سا رنگ ،ہاتھ میں ہتھوڑا لیے چمرودھا جوتہ ڈالے آکر بولا۔ چلتے ہو دوکان پر کہ اسی جھنجھٹ میں پڑے رہو گے؟ دیر ہو رہی ہے۔ ابھی صاحب کے بنگلہ پرجانا ہے۔

بھیرو: اجی جاؤ۔ تمھیں دوکان کی پڑی ہوئی ہے یہاں ایسا جی جل رہا ہے کہ گاؤں میں آگ لگا دوں۔

مستری: کیا ہے کیا؟ کس بات پر بگڑ رہے ہو؟ میں بھی توسنوں۔ بھیرو نے مختصراً ساری داستان سنا دی اور گاؤں والوں کی بزدلی اور کمینہ پن کا دکھڑا رونے لگا۔

مستری: گاؤں والوں کو مارو گولی۔ تمھیں کتنے گواہ چاہیے۔ جتنے گواہ کہو دے دوں۔ ایک ،دو، دس، بیس بھلے آدمی پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ آج ہی ٹھیک ٹھاک کیے دیتا ہوں۔ بس سبھوں کو بھر پیٹ پلا دینا۔

بھیرو کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا۔ تاڑی کی کون بات ہے۔دوکان تمھاری ہے۔ جتنی چاہو پیو پر جرا معتبر گواہ دلانا۔

مستری: اجی کہو تو بابو لوگوں کو حاجر کردوں بس ایسی پلا دینا کہ سب یہیں سے گرتے

پڑتے گھر پہنچیں۔
بھیرو: اجی کہو تو اتنی پلادوں کہ دو چار لاشیں اٹھ جائیں۔
یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں دوکان پر پہنچے۔ وہاں بیس پچیس آدمی جو اسی کارخانہ کے ملازم تھے۔ بڑے شوق سے بھیرو کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھیرونے تو پہنچتے ہی تاڑی ناپنی شروع کی اور ادھر مستری نے گواہوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔
ایک: موقع اچھا ہے۔ اندھے کے گھر سے نکل کر جائے گی کہاں؟ بھیرو اب اسے نہ رکھے گا۔
دوسرا: آخر ہمارے دل بہلاؤ کا بھی تو کوئی سامان ہونا چاہیے۔
تیسرا: بھگوان نے آپ ہی بھیج دیا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

ادھر یہ مشورے ہو رہے تھے۔ ادھر سبھاگی سورداس سے کہہ رہی تھی۔ ''تمھارے اوپر دعویٰ ہو رہا ہے۔'' سورداس نے گھبرا کر پوچھا۔''کیسا دعویٰ؟''
سبھاگی: مجھے بھگا لانے کا۔ گواہ ٹھیک کیے جا رہے ہیں۔ گاؤں کا تو کوئی آدمی نہیں ملا۔ لیکن تپلی گھر کے بہت سے مجورے تیار ہیں۔ مجھ سے ابھی جگدھر کہہ رہے تھے کہ پہلے گاؤں کے سب آدمی گواہی دینے جارہے تھے۔
سورداس: پھر رک کیسے گئے؟
سبھاگی: جگدھر نے سب کو سمجھا بجھا کر روک لیا۔
سورداس: جگدھر بڑا بھلا مانس ہے۔ مجھ پر بڑی مہربانی کرتا رہتا ہے۔
سبھاگی: تو اب کیا ہوگا؟
سورداس: دعویٰ کرنے دو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تو یہی کہہ دنیا کہ میں بھیرو کے ساتھ نہ رہوں گی۔ کوئی وجہ پوچھے تو صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے بہت مارتا ہے۔
سبھاگی: مگر اس میں تمھاری کتنی بدنامی ہوگی۔
سورداس: بدنامی کی چنتا نہیں۔ جب تک وہ تجھے رکھنے کو راجی نہ ہوگا تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔
سبھاگی: وہ راجی بھی ہوگا تو اس کے گھر نہ جاؤں گی۔ وہ دل کا بڑا کھوٹا آدمی ہے۔ اس کی کسر ضرور نکالے گا۔ تمھارے گھر سے بھی چلی جاؤں گی۔

سورداس: میرے گھر سے کیوں چلی جائے گی؟ میں تو تجھے نہیں نکالتا۔
سبھاگی: میرے کارن تمھاری کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ محلّہ والوں کا تو مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ کسی کو تمھارے اوپر سبھا (شبہ) نہ ہوگا۔ اور ہوگا بھی تو چھن بھر میں دور ہو جائے گا۔ لیکن یہ پتلی گھر کے اوجڈ مجورے تمھیں کیا جانیں۔ بھیرو کے یہاں سب کے سب تاڑی پیتے ہیں۔ وہ انھیں ملا کر تمھاری آبرو بگاڑ دے گا۔ میں یہاں نہ رہوں گی تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا جائے گا۔ بس کا گانٹھ تو میں ہی ہوں۔
سورداس: جائے گی کہاں؟
سبھاگی: جہاں اس کے منہ میں کالکھ لگا سکوں۔ جہاں اس کی چھاتی پر مونگ دل سکوں۔
سورداس: اس کے منہ میں کالکھ لگے گی تو میرے منہ میں پہلے ہی نہ لگ جائے گی۔ تو میری بہن ہی تو ہے۔
سبھاگی: نہیں میں تمھاری کوئی نہیں ہوں۔ مجھے بہن بیٹی نہ بناؤ۔
سورداس: میں کہے دیتا ہوں کہ اس گھر سے نہ جانا۔
سبھاگی: میں اب تمھارے ساتھ رہ کر تمھیں بدنام نہ کروں گی۔
سورداس : مجھے بدنامی قبول ہے۔ لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ تو کہاں جائے گی۔ تب تک میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔

بھیرو نے رات تو کسی طرح کاٹی۔ علی الصباح کچہری دوڑا۔ وہاں ابھی دروازے بند تھے۔ مہتر جھاڑو لگا رہے تھے۔ پس وہ ایک درخت کے نیچے دھیان لگا کر بیٹھ گیا۔ نو بجے سے عملے بستے بغل میں دبائے ہوئے آنے لگے اور بھیرو دوڑ دوڑ کر انھیں سلام کرنے لگا۔ گیارہ بجے راجہ صاحب اجلاس پر تشریف لائے۔ اور بھیرو نے محرر سے لکھا کر اپنا استغاثہ دائر کر دیا۔ شام کو گھر واپس آیا تو بھرنے لگا۔ اب دیکھتا ہوں۔ کون مائی کا لال ان کی مدد کرتا ہے۔ دونوں کے منہ میں کالکھ لگوا کر یہاں سے نکال نہ دیا تو اپنے باپ کا نہیں۔

پانچویں دن سورداس اور سبھاگی کے نام سمن آگیا۔ تاریخ پڑ گئی۔ جیوں جیوں پیشی کا دن نزدیک آتا جاتا تھا سبھاگی کے ہوش اڑے جاتے تھے۔ وہ بار بار سورداس سے

الجھتی۔ تمھیں یہ سب کرا رہے ہو۔ اپنی مٹی خراب کر رہے ہو اور اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہے ہو۔ مجھے چلا جانے دیا ہوتا تو کوئی تم سے کیوں بیر ٹھانتا۔ وہاں بھری کچہری میں جانا سب کے سامنے کھڑی ہونا مجھے زہر ہی سا لگ رہا ہے۔ میں اس کا منہ نہ دیکھوں گی چاہے عدالت مجھے مار ہی ڈالے۔

آخری پیشی کی مقررہ تاریخ آگئی۔ محلّہ میں اس مقدمہ کی اتنی دھوم تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے کام بند کر دیے اور عدالت میں جا پہنچے۔ مل کے مزدور سینکڑوں کی تعداد میں گئے۔ شہر میں سورداس کو کتنے ہی لوگ جان گئے تھے۔ ان کی رائے میں سورداس بے گناہ تھا۔ ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے کی غرض سے عدالت میں گئے۔ پربھوسیوک پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رانی اندو اور اندردت بھی مقدمہ پیش ہوتے ہوتے آپہنچے۔ عدالت میں یوں ہی کیا کم بھیڑ رہتی ہے اور پھر وہاں عورت کا آنا تو منڈوے میں دلہن کا آنا ہے۔ عدالت میں ایک بازار سا لگا ہوا تھا۔ اجلاس پر دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو چتاری کے راجہ صاحب تھے دوسرے ایک مسلمان جنھوں نے یورپ کی جنگ عظیم میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں سعی بلیغ کی تھی۔ بھیرو کی طرف سے ایک وکیل بھی تھا۔

بھیرو کا بیان ہوا۔ گواہوں کا بیان ہوا۔ پھر وکیل نے دعوی کی تائید میں ان سے اپنی مرضی کے موافق سوالات کیے۔ زاں بعد سورداس کا بیان ہوا۔ اس نے کہاں میرے ساتھ ادھر کچھ دنوں سے بھیرو کی گھر والی رہتی ہے۔ میں کسی کو کیا کھلاؤں پلاؤں گا۔ کھلانے پلانے والا بھگوان ہے۔ وہ میرے گھر میں رہتی ہے۔ اگر بھیرو اسے رکھنا چاہے اور وہ رہے تو آج ہی چلی جائے۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اسے اپنے یہاں رکھا ہے۔ نہیں تو نہ جانے کہاں ہوتی۔

بھیرو کے وکیل نے مسکرا کر کہا۔ سورداس تم بڑے فیاض معلوم ہوتے ہو۔ لیکن نوجوان اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ اکثر ایسی فیاضیاں کی جاتی ہیں۔

سورداس: اسی سے نہ یہ معاملہ چلا ہے۔ میں نے کوئی برائی نہیں کی۔ ہاں دنیا جو چاہے سمجھے۔ میں تو بھگوان کو جانتا ہوں۔ وہی سب کی کھری کھوٹی کا پرکھنے والا ہے۔ اگر بھیرو اسے اپنے گھر نہ رکھے گا اور نہ سرکار ہی کوئی ایسی جگہ بتا دے گی۔ جہاں یہ عورت اجت آبرو کے ساتھ رہ سکے تو میں اسے اپنے گھر سے نکلنے نہ دوں گا۔ وہ نکلنا

بھی چاہے گی تو نہ جانے دوں گا۔ اس نے تو جب سے اس مکدمے کی کھبر سنی ہے یہی کہا کرتی ہے کہ مجھے جانے دو پر میں اسے جانے نہیں دیتا۔

وکیل: صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اسے رکھ لیا ہے؟

سورداس: ہاں رکھ لیا ہے جیسے بھائی اپنی بہن کو رکھ لیتا ہے۔ یا باپ اپنی بیٹی کو رکھ لیتا ہے۔ اگر سرکار نے جبرجستی میرے گھر سے نکال دیا تو اس کی آبرو کی جواب دہی اسی کے سر ہوگی۔

سبھاگی کا بیان ہوا۔ بھیرو مجھے بیکسور مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ میں اس کے ساتھ نہ رہوں گی۔ سورداس بھلا آدمی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ رہتی ہوں۔ بھیرو یہ نہیں دیکھ سکتا۔ سورداس کے گھر سے مجھے نکالنا چاہتا ہے۔

وکیل: تو پہلے بھی سورداس کے گھر آتی جاتی تھی؟

سبھاگی: جبھی اپنے گھر مار کھاتی تھی تبھی جان بچا کر اس کے گھر بھاگ جاتی تھی۔ وہ میرے آڑے آجاتا تھا۔ میرے کارن اس کے گھر میں آگ لگی۔ اس پر مار پڑی اس کی کون کون سی درگت نہیں ہوئی۔ عدالت کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔

راجہ: بھیرو تم اپنی عورت رکھو گے؟

بھیرو: ہاں سرکار رکھوں گا۔

راجہ: مارو گے تو نہیں۔

بھیرو: بری چال نہ چلے گی تو کیوں ماروں گا؟

راجہ: سبھاگی تو اپنے آدمی کے ہمراہ کیوں نہیں جاتی؟ وہ کہتا ہے نہ ماروں گا۔

سبھاگی: اس پر مجھے بسواس نہیں ہے۔ آج ہی مار مار کر بے حال کر دے گا۔

وکیل: حضور معاملہ صاف۔ اب مزید ثبوت کی ضرورت نہیں ہے سورداس پر جرم ثابت ہوگیا۔

عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ سورداس پر دو سو روپیہ جرمانہ اور جرمانہ نہ ادا کرنے پر چھ ماہ کی قید سخت۔ سبھاگی پر سو روپیہ جرمانہ اور جرمانہ نہ دے سکنے پر تین ماہ کی قید سخت۔ روپے وصول ہوں تو بھیرو کو دیے جائیں۔

تماشائیوں میں اس فیصلہ پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ایک: مجھے تو سورداس بے قصور معلوم ہوتا ہے۔
دوسرا: سب راجہ صاحب کی کرامات ہے۔ سورداس نے زمین کے بارہ میں انھیں بدنام کیا تھا نا؟ یہ اسی کی کسر نکالی گئی ہے۔ یہ ہمارے معزز اور نیک نام لیڈروں کے کارنامے ہیں۔
تیسرا: عورت تو چربانک (سوخ) نہیں معلوم ہوتی۔
چوتھا: بھری عدالت میں باتیں کرتی ہے۔ چربانک نہیں تو اور کیا ہے؟
پانچواں: وہ تو یہی کہتی ہے کہ میں بھیرو کے پاس نہ رہوں گی۔
سورداس: میری اپیل پنچوں سے ہوگی۔ ایک آدمی کے کہنے سے میں گنہگار نہیں ہوسکتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ حاکم نے سجا دے دی۔ سجا کاٹ لوں گا پر پنچوں کا فیصلہ بھی سن لینا چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے تماشائیوں کی طرف رخ کیا اور دردناک لہجہ میں بولا۔ دہائی ہو پنچو آپ اتنے آدمی جمع ہیں۔ آپ لوگوں نے بھیرو اور اس کے گواہوں کے بیان سنے۔ میرا اور سبھاگی کا بیان سنا۔ حاکم کا فیصلہ بھی سن لیا۔ اب آپ لوگوں سے میری بنتی (مؤدبانہ) عرض ہے کہ کیا آپ بھی مجھے اپرادھی (مجرم) سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو بسواس ہوگیا کہ میں نے سبھاگی کو بہکایا اور اسے اپنی عورت بنا کر رکھے ہوئے ہوں؟ اگر آپ کو بسواس ہو گیا ہے تو میں اسی میدان میں سر جھکا کر بیٹھتا ہوں۔ آپ سب لوگ مجھے پانچ پانچ لات ماریں۔ اگر میں لات کھاتے کھاتے مر بھی جاؤں تو مجھے دکھ نہ ہوگا۔ ایسے پاپی کا یہی ڈنڈ ہے۔ کید سے کیا ہوگا؟ اور اگر آپ کی سمجھ میں میں بے کسور ہوں تو پکار کر کہہ دیجئے کہ ہم تجھے بیکسور سمجھتے ہیں۔ پھر میں کڑی سے کڑی کید بھی ہنس کر کاٹ دوں گا۔

عدالت کے کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ راجہ صاحب، وکیل، عملے، تماشائی لوگ سب کے سب متحیر ہوگئے۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ سپاہی درجنوں تھے مگر بت بنے کھڑے تھے۔ معاملہ نے ایک عجیب صورت اختیار کرلی تھی۔ جس کی عدالت کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ دشمن نے ایسا چھپا ہوا وار کیا تھا کہ مخالف فوج کا تجویز شدہ پروگرام القط ہوگیا تھا۔

سب سے پہلے راجہ صاحب سنبھلے، حکم دیا، اسے باہر لے جاؤ۔ سپاہیوں نے دونوں ملزموں کو گھیر لیا اور عدالت کے باہر لے چلے۔ ہزاروں تماشائی پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔

کچھ دور چل کر سورداس زمین پر بیٹھ گیا۔ اور بولا میں پنچوں کا حکم سن کر تبھی آگے بڑھوں گا!

عدالت کے باہر عدالت کی توہین کا خوف نہ تھا۔ کئی ہزار لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ تم بے قصور ہو۔ ہم سب تمھیں بے قسور سمجھتے ہیں۔

اندردت: عدالت بے ایمان ہے۔

کئی ہزار آدمیوں نے مکرر کہا۔ ہاں عدالت بے ایمان ہے۔

اندردت: عدالت نہیں ہے۔ غریبوں کی قربان گاہ ہے!

کئی ہزار گلوں سے ایک گونج پیدا ہوئی۔ امیروں کے ہاتھ میں ظلم کا آلہ ہے۔

سپاہیوں نے دیکھا کہ ہر لمحہ بھیڑ بڑھتی جاتی ہے اور لوگ مشتعل ہوتے جاتے ہیں۔ تو انھوں نے لپک کر بگھی والے کو پکڑا اور ہر دو ملزمین کو اس میں بٹھا کر روانہ ہوگئے۔ لوگوں نے کچھ دور تک تو گاڑی کا پیچھا کیا۔ اس کے بعد اپنے گھروں کو واپس ہوگئے۔

ادھر بھیرو اپنے گواہوں کے ساتھ گھر چلا تو راستہ میں عدالت کے اردلی نے گھیرا۔ اسے دو روپے نکال کر دیے۔ دوکان میں پہنچتے ہی مٹکے کھل گئے اور تاڑی کا دور چلنے لگا۔ بڑھیا پکوڑیاں اور پکانے لگی۔

ایک بولا: بھیرو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تم بھی بیٹھو۔ پیو اور پلاؤ ہم تم بر بر کر پیئیں۔

دوسرا: آج اتنی پیوں گا کہ چاہے یہیں ڈھیر ہو جاؤں۔ بھیرو یہ کلھڑ بھر بھر کیا دیتے ہو۔ ہانڈی ہی بڑھا دو۔

بھیرو: اجی مٹکے میں منہ ڈال دو۔ ہانڈی کلھڑ کی کیا بساط ہے! آج مدعی کا سر نیچا ہوا ہے۔

تیسرا: دونوں حراست میں پڑے رو رہے ہوں گے۔ مگر بھئی سورداس کو سجا ہوگئی تو کیا وہ ہے بے کسور۔

بھیرو: آگئے تم بھی اس کے دھوکے میں۔ اسی سوانگ کی تو وہ روٹی کھاتا ہے۔ دیکھو بات کی بات میں کیسا ہجاروں آدمیوں کا من پھیر دیا۔

چوتھا: اسے کسی دیوتا کا اشت ہے۔

بھیرو: اشت تو تب۔ جب جانیں کہ جیل سے نکل آئے۔

پہلا : میں بر کر کہتا ہوں۔ وہ کل جرور جیل سے نکل آئے گا۔

دوسرا: بڑھیا۔ پکوڑیاں لا۔

تیسرا: ابے بہت نہ پی نہیں تو مر جائے گا۔ ہے کوئی گھر میں رونے والا؟

چوتھا: کچھ گانا ہو۔ اتارو ڈھول مجیرا۔

سب نے ڈھول مجیرا سنبھالا اور کھڑے ہو کر گانے لگے۔

''چھتیسی کیا نینا جھمکاوے۔''

تھوڑی دیر میں ایک بڈھا مستری اٹھ کر ناچنے لگا۔ بڑھیاسے اب نہ رہا گیا۔ اس نے بھی گھونگٹ نکال لیا اور ناچنے لگی۔ نیچ ذاتوں میں گانا اور ناچنا عادت میں داخل ہے۔ سیکھنے کی ضرورت نہیں بڈھا اور بڑھیا دونوں فحش طریقہ پر کمر ہلا کر تھرکنے لگے۔ ان کے اعضاء کی لچک تعجب انگیز تھی۔

بھیرو: محلّہ والے سمجھتے تھے کہ مجھے گواہ ہی نہ ملیں گے۔

ایک: سب گیدڑ ہیں گیدڑ

بھیرو: چلو۔ ذرا سبھوں کے منہ میں کالکھ لگا آئیں۔

سب کے سب چلا اٹھے ہاں ہاں ناچ ہوتا چلے۔

ایک لمحہ میں جلوس چلا۔ سب کے سب ناچتے گاتے ڈھول بجاتے انا پ سناپ بکتے۔ ہو حق کرتے لڑکھڑاتے ہوئے روانہ ہوئے۔ پہلے بجرنگی کا گھر ملا۔ یہاں سب رک گئے اور سب نے یوں گایا:۔

''گوالن کی گیا ہرانی تب دودھ میں ڈالا پانی۔''

رات زیادہ جا چکی تھی۔ بجرنگی کے دروازے بند تھے۔ لوگ یہاں سے ٹھاکردین کے دروازہ پر گئے۔ پھر سب نے گایا۔

''تمولن کے نینا رسیلے یاروں سے نجر ملاوے۔''

ٹھاکردین کھانا کھا رہا تھا مگر خوف کے مارے باہر نہ نکلا۔ جلوس آگے بڑھا۔ تو سورداس کی جھونپڑی ملی۔ بھیرو بولا۔ بس یہیں ٹھہر جاؤ۔

''ڈھول ڈھیلی پڑ گئی۔''

''سینکو سینکو۔ جھونپڑے میں سے پھوس لے لو۔''

ایک آدمی نے تھوڑا سا پھوس نکالا۔ دوسرے اور زیادہ نکالا۔ تیسرے نے ایک بوجھ کھینچ لیا۔ پھر کیا تھا نشہ کی سنگ مشہور ہے۔ ایک نے جلتا ہوا پھوس جھونپڑی میں ڈال دیا اور بولا ''ہولی ہے ہولی ہے'' کئی آدمیوں نے کہا۔ ہولی ہے ہولی ہے!

بھیرو: یارو یہ تم لوگو ں نے برا کیا۔ بھاگ چلو نہیں تو دھر لیے جاؤ گے۔

خوف نشہ میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سب کے سب رفو چکر ہوگئے۔ ادھر آگ زیادہ تیز ہوئی تو محلہ کے لوگ دوڑ پڑے لیکن پھوس کی آگ کس کے بس کی تھی۔ جھونپڑا جل رہا تھا اور لوگ کھڑے ہوئے رنج اور غصہ سے یوں باتیں کر رہے تھے:۔

ٹھاکردین: میں تو بھوجن پر بیٹھا تبھی سبوں کو آتے دیکھا۔

بجرنگی: ایسا جی چاہتا ہے جاکر بھیرو کو مارتے مارتے بے دم کردوں۔

جگدھر: جب تک ایک دفعہ اچھی طرح مار نہ کھاجائے گا۔ اس کے سر سے بھوت نہ اترے گا۔

بجرنگی: ہاں اب یہی ہوگا گھسوا۔ جرا لاٹھی تو نکال لا۔ آج دوچار کھون ہو جائیں گے۔ تبھی یہ آگ بجھے گی۔

جمنی: تمھیں کیا پڑی ہے۔ چل کر لیٹو۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھل آپ بھگوان سے پاوے گا۔

بجرنگی: بھگوان چاہے پھل دیں یا نہ دیں پر میں اب تو نہیں مانتا۔ جیسے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔

جگدھر: آگ لگنے کی بات ہے ہی۔ ایسے پاپی کا تو سرکاٹ لینا بھی پاپ نہیں ہے۔

ٹھاکردین: جگدھر آگ پر تیل چھڑکنا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو بھیرو سے بیر ہے تو آپ جا کر اسے کیوں نہیں للکارتے؟ دوسروں کو کیوں اکساتے ہو؟ یہی چاہتے ہو کہ یہ دونوں لڑیں مریں اور میں تماسا دیکھوں۔ ہو بڑے نیچ۔

جگدھر: اگر کوئی بات کہنا اکسانا ہے تو لو چپ رہوں گا۔

ٹھاکر دین: ہاں چپ رہنا ہی اچھا ہے۔ تم بھی جا کر سوؤ۔ بجرنگی! بھگوان آپ پاپی کو ڈنڈ دیں گے۔ انھوں نے تو راون جیسے پرتاپی راجہ کو نہ چھوڑا۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟ یہ اندھیران سے بھی نہ دیکھا جائے گا۔

بجرنگی: مارے گھمنڈ کے پاگل سا ہوگیا۔ چلو جگدھر جرا ان سبوں سے دو دو باتیں کر لیں۔

جگدھر: نا بھیا۔ مجھے ساتھ نہ لے جاؤ کون جانے وہاں مارپیٹ ہو جائے تو سارا الجام میرے سر جائے کہ اسی نے لڑا دیا۔ تو آپ جھگڑے سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اتنے میں مٹھوا دوڑا ہوا آیا۔ بجرنگی نے پوچھا کہاں سویا تھا رے؟

مٹھو: پنڈا جی کے دلان میں تو۔ ارے یہ تو میری جھونپڑی جل رہی ہے! کس نے آگ لگائی؟

ٹھاکر دین: اتنی دیر میں جاگے ہو۔ سن نہیں رہے ہو۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔

مٹھو: بھیرو نے لگائی ہے کیا؟ اچھا بچا سمجھوں گا۔

جب لوگ اپنے گھر لوٹ گئے تو مٹھو آہستہ آہستہ بھیرو کی دوکان کی طرف گیا۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جاڑے کی رات۔ پتا تک نہ کھڑکتا تھا۔ دوکان کے دروازہ پر اوپلے جل رہے تھے۔ تاڑی خانوں میں آگ کبھی نہیں بجھتی۔ پارسی مجاور بھی اتنی خبر داری سے آگ کی حفاظت نہ کرتا ہوگا۔ مٹھو نے ایک جلتا ہوا اوپلا اٹھایا اور دوکان کے چھپر پر پھینک دیا۔ چھپر میں آگ لگ گئی تو مٹھوا بگ ٹٹ بھاگا اور پنڈا جی کے دلان میں منہ ڈھانپ کر سو رہا گویا اسے کچھ خبر نہیں۔ ذرا دیر میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ سارا محلّہ روشن ہوگیا۔ چڑیاں درختوں پر سے اڑ اڑ کر بھاگنے لگیں۔ پیڑوں کی ڈالیاں ہلنے لگیں۔ تالاب کا پانی سنہرا ہوگیا۔ اور بانسوں کی گانٹھیں زور زور سے جھٹکنے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک لنکا داہ کا تماشا ہوتا رہا مگر وہاں اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑھیا ناچتے ناچتے تھک گئی تھی۔ اور کون تھا جو اس وقت آگ بجھانے جاتا؟ آگ نے بلا کسی روک ٹوک کے اپنا کام ختم کیا۔ مٹکے ٹوٹ گئے۔ تاڑی بہہ گئی۔ جب ذرا آگ ٹھنڈی ہوئی۔ تو کئی کتوں نے جا کر اپنا ڈیرا جمایا۔

علی الصباح بھیرو اٹھا تو دوکان سامنے نظر آئی۔ دوکان اور اس کے گھر کے درمیان دو فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر کوئی درخت نہ ہونے کے سبب دوکان صاف نظر آتی تھی۔ اس کو تعجب ہوا کہ دوکان کہاں گئی۔ ذرا اور آگے بڑھا تو راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دوڑا۔ دوکان میں تاڑی کے علاوہ بکری کے روپے بھی تھے۔ ڈھول مجیرا بھی وہیں رکھا تھا۔ ہر چیز جل کر خاک ہوگئی۔ محلّہ والے ادھر تالاب میں منہ ہاتھ دھونے جایا کرتے تھے۔ سب آپہنچے دوکان سڑک پر تھی۔ راہ گیر بھی کھڑے ہوگئے۔ میلہ لگ گیا۔

بھیرو نے رو کر کہا میں تو مٹی میں مل گیا۔

ٹھاکردین: بھگوان کی لیلا ہے۔ ادھر وہ تماسا دکھایا۔ ادھر یہ تماسا دکھایا۔ دھنیہ ہو مہاراج۔

بجرنگی: کسی مستری کی سرارت ہوگی۔ کیوں بھیرو کسی سے عداوت تو نہ تھی؟

بھیرو: عداوت تو سارے محلّہ سے ہے۔ کس سے نہیں ہے؟ میں جانتا ہوں۔ جس کی یہ بدماسی ہے۔ بندھوا نہ دیا تو کہنا۔ ابھی ایک کو لیا ہے اب دوسرے کی باری ہے۔

جگدھر دور ہی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ نزدیک نہ آیا کہ کہیں بھیرو کچھ کہہ نہ بیٹھے تو بات بڑھ جائے۔ ایسی دلی مسرت اسے اپنی زندگی میں کبھی نہ نصیب ہوئی تھی۔

اتنے میں مل کے کئی مزدور آگئے۔ کالا مستری بولا۔ بھائی کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گا کہ اندھے کو کسی کا اِشت ہے۔

ٹھاکردین: اِشت کیوں نہیں ہے۔ میں برابر یہی کہتا آتاہوں اس سے جس نے بیر ٹھانا اس نے نیچا دیکھا۔

بھیرو: اس کے اِشت کو میں جانتا ہوں۔ جرا تھانہ دار آجائیں تو بتادوں کون اشت ہے۔

بجرنگی: جل کر بولا۔ اپنی بیر کیسی سوجھ رہی ہے۔ کیا وہ جھونپڑا نہ تھا جس میں پہلے آگ لگی۔ اینٹ کا جواب پتھر ملتا ہی ہے۔ جو کسی کے لیے گڑھا کھودے گا اس کے لیے کنواں تیار ہے۔ کیا اس جھونپڑے میں آگ لگاتے وقت سمجھے تھے کہ سورداس کا کوئی ہے ہی نہیں؟

بھیرو: اس کے جھونپڑے میں میں نے آگ لگائی؟
بجرنگی: اور کس نے لگائی؟
بھیرو: جھوٹے ہو۔
ٹھاکردین: کیوں سینہ جوری کرتے ہو؟ تم نے لگائی یا تمھارے کسی یار نے لگائی۔ ایک ہی بات ہے۔ بھگوان نے اس کا بدلہ چکا دیا تو روتے کیوں ہو؟
بھیرو: سب کسی سے سمجھوں گا۔
ٹھاکردین: یہاں کوئی تیرا دبیل نہیں ہے۔

بھیرو ہونٹ چباتا ہوا چلا گیا۔ انسانی فطرت کتنی پیچیدہ ہے۔ ہم دوسروں کا نقصان کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتے مگر دوسروں کے ہاتھوں ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمارا خون ابلنے لگتا ہے۔

(32)

سورداس کے مقدمہ کا فیصلہ سننے کے بعد اندردت چلے تو راستے میں پربھوسیوک سے ملاقات ہوگئی۔ باتیں ہونے لگیں۔
اندردت: تمھارا کیا حال ہے؟ سورداس بے قصور ہے یا نہیں؟
پربھوسیوک: بالکل بے قصور۔ میں تو آج اس کی پاک نفسی کا قائل ہوگیا۔ فیصلہ سنانے کے وقت تک مجھے یقین تھا کہ اندھے نے ضرور اس عورت کو بہکایا ہے مگر اس کے آخری الفاظ نے جادو کا سا کام کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کے متعلق ایک نظم لکھوں۔
اندرت: صرف نظم لکھ ڈالنے سے کام نہ چلے گا۔ راجہ صاحب کو زک دینی ہوگی۔ انھیں اس بات سے مطمئن نہ ہونے دینا چاہیے کہ میں نے اندھے سے چکی پسوائی۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اندھا روپے کہاں سے لائے گا۔ دونوں پر تین سو روپیہ جرمانہ ہوا ہے۔ ہمیں کسی طرح جرمانہ آج ہی ادا کردینا چاہیے۔ سورداس جیل سے نکلے تو سارے شہر میں اس کا جلوس نکالنا چاہیے۔ اس کے لیے دو سو کی اور ضرورت ہے۔ کل پانچ سو ہوں تو کام چل جائے گا۔ بولو۔ کیا دیتے ہو؟
پربھوسیوک: جو مناسب سمجھو۔ لکھ لو۔

اندردت: تم پچاس روپے بغیر کسی دقّت کے دے سکتے ہو۔
پربھوسیوک: اور تم نے اپنے نام کتنا لکھا ہے؟
اندردت: میری حیثیت دس روپے سے زیادہ دینے کی نہیں ہے۔ رانی جانھوی سے سو روپے لے لوں گا۔ کنور صاحب زیادہ نہیں تو دس دیں گے ہی۔ جو کچھ بھی کمی رہ جائے گی وہ دوسروں سے مانگ کر پوری کرلی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی سب روپے خود ہی دے دیں کسی سے کچھ مانگنا ہی نہ پڑے۔
پربھوسیوک: سورداس کے محلّہ والوں سے بھی کچھ مل جائے گا۔
اندردت: اسے سارا شہر جانتا ہے۔ اس کے نام پر دو چار ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ مگر میں اس چھوٹی سی رقم کے لیے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آگے بڑھے کہ دفعتاً اندو اپنی فٹن پر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اندردت کو دیکھ کر رک گئی اور بولی۔ تم کب لوٹے؟ میرے یہاں نہیں آئے۔
اندرت: آپ آسمان پر ہیں۔ میں زمین پر ہوں۔ کیا باتیں ہوں؟
اندو: آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

اندردت فٹن پر جا بیٹھا پربھوسیوک نے جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور چپکے سے اندردت کے ہاتھ میں رکھ کر کلب کو چل دیے۔
اندر: اپنے دوستوں سے بھی کہنا۔
پربھوسیوک: نہیں بھئی میں اس کام کا نہیں ہوں۔ مجھے مانگنا نہیں آتا۔ کوئی دیتا بھی ہوگا تو میری صورت دیکھ کر مٹھی بند کرے گا۔
اندردت: (اندو سے) آج یہاں خوب تماشا ہوا۔
اندو: مجھے تو ناٹک کا سا لطف۔ سورداس کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟
اندر: مجھے تو وہ سادہ سچا اور صاف دل معلوم ہوتا ہے۔
اندو: بس بس یہی میرا بھی خیال ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ فیصلہ سناتے وقت تک میں اسے قصوروار سمجھتی تھی۔ مگر اس کی اپیل نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کردی۔ میں اب تک اسے مکار، فریبی رنگا ہوا سیار سمجھتی تھی۔

میں اسے مزہ چکھانا چاہتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں نے اس کا چال چلن سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ اپنی دھن کا پکا نڈر بے لوث اور سچا آدمی ہے۔ کسی سے دبنا نہیں جانتا۔

اندردت: تو اس ہمدردی کا کچھ عملی اظہار بھی کیجیے گا۔ ہم لوگ آپس میں چندہ کر کے جرمانہ ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ بھی اس کار خیر میں مدد دیں گی؟

اندو نے مسکرا کر کہا۔ میں زبانی ہمدردی کا اظہار ہی کافی سمجھتی ہوں۔

اندردت: آپ ایسا کریں گی تو میرا یہ خیال پختہ ہو جائے گا کہ ہمارے رئیسوں میں اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ ہمارے رؤسا ہر ایک جا اور بجا کام میں حکام کی مدد کرتے رہتے ہیں، اسی لیے عوام کاان پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہ انھیں اپنا دوست نہیں دشمن سمجھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا شمار بھی انھیں رؤسا میں ہو کم از کم میں نے آپ کو اب تک ان رؤسا سے الگ سمجھا ہے۔

اندو نے متانت سے کہا۔ اندردت میں ایسا کیوں کر رہی ہوں اس کا سبب تمھیں معلوم ہے۔ راجہ صاحب سنیں گے تو انھیں کتنا رنج ہوگا۔ میں ان سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتی۔

اندردت: راجہ صاحب سے اس بارے میں مجھ سے ابھی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے خیالات بھی ہمارے خیالات کے مشابہہ ہوں گے۔ انھوں نے اس وقت قانونی فیصلہ کیا ہے۔ سچا فیصلہ تو ان کے دل نے کیا ہوگا۔ شاید ان کی طرح عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو انھوں نے کیا۔ لیکن وہ میرے دل کا فیصلہ نہیں بلکہ صرف قانون کا فیصلہ ہوتا۔ مجھے ان سے اتنی بے تکلفی نہیں ہے ورنہ ان سے بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لیتا۔ ان کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اندو: ممکن ہے۔ راجہ صاحب کے متعلق تمھارا قیاس درست ہو میں آج ان سے دریافت کروں گی۔

اندردت: دریافت کیجیے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہ کھلیں گے۔

اندو: تمھیں اندیشہ ہے اور مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ ہمارے دلی جذبات مشابہہ حالتوں میں مشابہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے آپ کو انتظار کی تکلیف نہیں دینا

چاہتی۔ یہ لیجیے یہ میرا ناچیز ہدیہ ہے۔

یہ کہہ کر اندو نے ایک ساورن نکال کر اندردت کو دے دیا۔

اندردت: اسے لیتے ہوئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔

اندو: کس بات کا؟

اندردت: کہ کہیں راجہ صاحب کے خیالات کچھ اور ہی ہوں۔

اندو نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا۔ ''اس کی کچھ پرواہ نہیں۔''

اندردت: ہاں آپ نے اس وقت رانیوں سی بات کہی۔ یہ ساورن سورداس کی اخلاقی فتح کا نشان ہے۔ آپ کا دلی شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ ابھی بہت چکر لگانا ہے جرمانے کے علاوہ اور جو کچھ مل جائے۔ اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔

اندردت اتر کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اندو نے جیب سے دوسرا ساورن نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ یہ لو۔ شاید اس سے تمھارے چکر میں کچھ کمی ہو جائے۔

اندردت نے ساورن جیب میں رکھا اور خوش خوش روانہ ہوئے لیکن اندو کچھ متفکر سی ہوگئی۔ اسے خیال آیا کہ کہیں راجہ صاحب واقعی سورداس کو قصوروار سمجھتے ہوں تو مجھے ضرور آڑے ہاتھوں لیں گے۔ خیر ہوگا۔ میں اتنا دبنا بھی نہیں چاہتی۔ میرا کام ہے اچھے کاموں میں ان سے دبنا۔ اگر وہ بدنیتی سے رعایا پر ظلم کرنے لگیں تو مجھے ان سے اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ برے کاموں میں دبنا تو انسان کے درجہ سے گرجانا ہے۔ میں پہلے انسان ہوں اور پیچھے بیوی۔ ماں، بہن یا بیٹی۔

اندو انھی خیالات میں محو تھی کہ مسٹر جان سیوک معہ مسز سیوک کے مل گئے۔ جان سیوک نے ٹوپ اتارا مسز سیوک بولیں۔ ہم لوگ تو آپ ہی کی طرف جا رہے تھے۔ ادھر کئی روز سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جی لگا ہوا تھا۔ اچھا ہوا راستہ ہی میں مل گئیں۔

اندو: جی نہیں میں راستہ میں نہیں ملی۔ یہ دیکھئے جاتی ہوں۔ آپ جہاں جاتے ہوں وہاں جائیے۔

جان سیوک: میں تو ہمیشہ (Compromise) (سمجھوتہ) پسند کرتا ہوں یہ آگے پارک ہے۔ آج بینڈ بھی ہوگا۔ بس وہیں جا بیٹھیں۔

اندو: یہ آپ کے (COMPROMISE) غیر جانبدارانہ نہیں ہے لیکن خیر۔

پارک میں تینوں آدمی اترے اور کرسیوں پر جا بیٹھے۔ اندو نے پوچھا صوفیہ کا کوئی خط آیا تھا؟

مسز سیوک: میں نے تو سمجھ لیا کہ وہ مر گئی مسٹر کلارک جیسا آدمی اسے نہ ملے گا۔ جب تک یہاں رہی حیلہ حوالہ کرتی رہی۔ وہاں جا کر باغیوں سے مل بیٹھی۔ نہ جانے اس کی تقدیر میں کیا ہے۔ کلارک سے رشتہ نہ قائم ہونے کا غم مجھے ہمیشہ رلاتا رہے گا۔

جان سیوک: میں تم سے ہزار بار کہہ چکا وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ وہ زن دشوئی کی زندگی کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ وہ معیار پسند ہے اور معیار پسند ہمیشہ خوشی کے خواب ہی دیکھا کرتا ہے۔ اسے خوشی ملتی نہیں۔ اگر وہ شادی کرے گی بھی تو کنور ونے سنگھ سے۔

مسز سیوک: تم میرے سامنے کنور ونے سنگھ کا نام نہ لیا کرو۔ معاف کیجیے رانی اندو مجھے ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی پسند نہیں۔

جان سیوک: ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی کبھی ہو ہی جاتی ہیں۔

مسٹر سیوک: میں تم سے کہے دیتی ہوں اور رانی اندو آپ گواہ رہیے گا کہ صوفیہ کی شادی کبھی ونے سنگھ سے نہ ہوگی۔

جان سیوک: آپ کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے رانی اندو؟ دل کی بات کہیے گا۔

اندو: میں خیال کرتی ہوں کہ لیڈی سیوک کا قیاس صحیح ہے۔ ونے کو صوفیہ سے کتنی ہی محبت ہو مگر وہ ماتا جی کی اتنی دل شکنی نہ کریں گے۔ ماتا جی جیسی دکھی عورت آج دنیا میں نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انھیں زندگی میں اب کوئی امید ہی نہیں رہی۔ گم سم رہتی ہے۔ اگر کسی نے بھول کر بھی ونے کا تذکرہ چھیڑ دیا تو غصہ سے ان کے تیوروں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے ونے کی تصویر الگ کرادی ہے۔ ان کے کمرہ کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ نہ کبھی آپ اس میں جاتی ہے نہ اور کسی کو جانے دیتی ہے اور مس صوفیہ کا نام لینا تو انھیں چٹکی کاٹ لینے کے برابر ہے۔ پتا جی کو بھی اب رضا کاروں کی جماعت سے کوئی محبت نہیں رہی۔ قومی کاموں سے انھیں کچھ نفرت سی ہوگئی ہے۔ آہا۔ آج بہت اچھی ساعت سے گھر سے چلی تھی وہ ڈاکٹر گنگولی چلے آرہے ہیں۔

کہیے ڈاکٹر صاحب عملہ سے کب لوٹے۔
گنگولی: سردی پڑنے لگی۔ اب وہاں سے سب کوئی کا کوچ ہوگیا۔ ہم تو ابھی آپ کے ماتا جی کے پاس گیا تھا۔ کنور ونے سنگھ کے حال پر ان کو بڑا دکھ ہے۔
جان سیوک: اب کے تو آپ نے کونسل میں دھوم مچا دی۔
گنگولی: اگر وہاں کی تقریر کرنا، سوالات کرنا، بحث کرنا کام ہے تو آپ ہمارا جتنی بڑائی کرنا چاہتا ہے کریں۔ پر میں تو اسے کام نہیں سمجھتا۔ یہ تو پانی پینا ہے۔ کام اس کو کہنا چاہیے جس سے دیس اور جاتی کا اپکار ہو۔ ایسا تو ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہمارا تو اب وہاں جی نہیں لگتا ہے۔ پہلے توسب آدمی ایک نہیں ہوتا اور کبھی ہو بھی گیا تو گورنمنٹ ہمارا تجویز خارج کر دیتا ہے۔ ہمارا محنت کھراب ہو جاتا ہے۔ یہ تو لڑکوں کا کھیل ہے۔ ہم کو نئے قانون سے بڑا امید تھا۔ پر تین چار سال کام کر کے دیکھ لیا کہ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم جہاں تب تھا وہیں اب بھی ہے۔ ملٹری کا کھرچ بڑھتا جاتا ہے۔ اس پر کوئی عذر کرے تو سرکار بولتا ہے۔ آپ کو ایسا بات نہیں کہنا چاہیے۔ بجٹ بنانے لگتا ہے۔ تو ہر ایک (Item) (مد) میں دو چار لاکھ جیادہ لکھ دیتا ہے۔ ہم کونسل میں جب بہت زور دیتا ہے تو ہمارا بات رکھنے کے لیے وہی پھالتو روپیہ نکال دیتا ہے۔ ممبر کھوسی سے پھول جاتا ہے۔ ہم جیت گیا ہم جیت گیا۔ پوچھو تم کیا جیت گیا؟ تم کیا جیتے گا؟ تمھارے پاس جیتنے کا سادھن (ذریعہ) ہی نہیں ہے۔ تم کیسے جیت سکتا ہے؟ کبھی ہمارے بہت بل دینے پر کفایت کیا جاتا ہے تو ہمارے ہی بھائیوں کا نکسان ہوتا ہے۔ جیسے اب کی ہم نے پولیس کی مد میں پانچ لاکھ کاٹ دیا۔ مگر یہ کمی بڑے بڑے حاکموں کے بھتے یا طلب میں نہیں کیا۔ بچارہ چوکی دار۔ کانسٹیبل، تھانہ دار کا طلب گھٹائے۔ جگہ توڑے گا۔ اس سے اب کپھایت کا بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس سے ہمارے ہی بھائیوں کا گردن کٹتا ہے۔ سارا کونسل جو دیتا رہا کہ بنگال کے باڑھ کے ستائے ہوئے آدمیوں کی مدد کو بیس لاکھ مجور کیا جائے۔ سارا کونسل کہتا رہا کہ کلارک کا اودے پور سے بدلی کر دیا جائے۔ پر سرکار نے نہیں مانا۔ کونسل کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک پتی تک نہیں توڑ سکتا۔ جو آدمی کونسل کو بنا سکتا ہے وہی اس کو بگاڑ سکتا ہے۔ بھگوان جلاتا ہے تو بھگوان ہی مارتا ہے۔ کونسل کو سرکار بناتا ہے اور وہ سرکار کی

مٹھی میں ہے۔ جب دیس کے لوگ کونسل بنادیں گے تب اس سے دیس کا کلیان (بھلا) ہوگا۔ یہ سب جانتا ہے پر کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔ مرنا بھی مرنا ہے اور کھاٹ پر پڑے رہنا بھی مرنا ہے۔ لیکن ایک حالت میں کوئی امید نہیں رہتا۔ دوسری حالت میں کچھ امید رہتا ہے۔ بس اتنا ہی پھرک ہے اور کچھ نہیں۔

اندو نے چھیڑ کر پوچھا۔ جب آپ جانتے ہیں کہ وہاں جانابے فائدہ ہے تو کیوں جاتے ہیں؟ کیا آپ باہر رہ کر کچھ کرنہیں سکتے؟

گنگولی: (ہنس کر) وہی بات تو ہے۔ اندورانی ہم کھاٹ پر پڑا ہے۔ ہل نہیں سکتا۔ بات نہیں کر سکتا۔ کھا نہیں سکتا۔ لیکن بابا جمراج کو دیکھ کر ہم تو اٹھ بھاگے گا۔ روئے گا کہ مہاراج کچھ دن اور رہنے دو۔ ہمارا جندگانی کونسل میں بیت گیا۔ اب ہم کو کوئی دوسرا رستہ نہیں دکھائی دیتا۔

اندو: میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھوں۔ کم سے کم یہ تو امید ہوگی کہ شاید آگے والی زندگی اس سے اچھی ہو۔

گنگولی: (ہنس کر) ہم کو کوئی کہہ دے کہ مر کرتم پھر اسی دیس میں آئے گا۔ اور پھر کونسل میں جا سکے گا تو ہم جمراج سے بولے گا۔ بابا جلدی کر! پر ایسا تو کہتا نہیں۔

جان سیوک: میرا ارادہ ہے کہ نئے چناؤ میں ایوان تجارت کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں۔

گنگولی: آپ کس پارٹی میں رہے گا؟

جان سیوک: میری تو نہ کوئی پارٹی ہے اور نہ ہوگی۔ میں اسی ارادہ اور مقصد سے جاؤں گا کہ ملکی تجارت کی حفاظت کر سکوں۔ میں کوشش کروں گا کہ غیر ملکی اشیاء پر بھاری ٹیکس عاید کیا جائے۔ اس طریقہ پر کام کیے بغیر ہماری تجارت کو کبھی فروغ نہ ہوگا۔

گنگولی: انگلینڈ کو کیا کرے گا؟

جان سیوک: اس کے ساتھ بھی غیر ملکوں کا سا برتاؤ ہونا چاہیے۔ میں تجارتی غلامی کا سخت مخالف ہو ں۔

گنگولی: (گھڑی دیکھ کر) بہت اچھا بات ہے۔ آپ کھڑا ہو۔ ابھی ہم کو یہاں سے اکیلا جانا پڑتا ہے۔ تب دو آدمی ساتھ ساتھ جائے گا۔ اچھا اب جاتا ہے۔ کئی لوگوں

سے ملنا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی کے بعد جان سیوک نے بھی گھر کی راہ لی۔

اندو مکان پر پہنچی تو راجہ صاحب بولے۔ تم کہاں رہ گئیں؟

اندو: راستہ میں ڈاکٹر گنگولی اور مسٹر جان سیوک مل گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔

مہیندر: گنگولی کو ساتھ کیوں نہ لائیں؟

اندو: جلدی میں تھے۔ آج تو اس اندھے نے کمال کردیا۔

مہیندر: ایک ہی مکار ہے۔ جو اس کے مزاج سے واقف نہ ہوگا ضرور دھوکے میں آگیا ہوگا۔ اپنی بے گنا ہی کا اعلان کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ دھیان ہی میں نہیں آسکتا۔ اسے معجزہ کہنا چاہیے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہے۔ ان پڑھ ہو کر بھی آج اس نے کتنے ہی پڑھے لکھے لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ یہاں لوگ اس کا جرمانہ ادا کرنے کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ سنا ہے جلوس بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر میرا تو یقین واثق ہے کہ اس نے اس عورت کو بہکایا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ سخت سزا کیوں نہ دی۔

اندو: تو آپ نے چندہ بھی نہ دیا ہوگا؟

مہیندر: کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ چندہ کیسے دیتا؟ اپنے منہ میں آپ طمانچہ مارتا؟

اندو: لیکن میں نے تو دیا ہے مجھے......

مہیندر: اگر تم نے دیا ہے تو برا کیا ہے۔

اندو: مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ......

مہیندر: فضول باتیں نہ بناؤ۔ اپنا نام پوشیدہ رکھنے کو تو کہہ دیا ہے؟

اندو: نہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔

مہیندر: تو تم سے زیادہ بیوقوف آدمی دنیا میں نہ ہوگا۔ تم نے اندردت کو روپے دیے ہوں گے۔ اندردت یوں تو بہت ہی منکسرالمزاج اور غریب دوست نوجوان ہے اور میں اس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس موقع پر دوسروں سے چندہ وصول کرنے کے لیے وہ تمھارا نام تمثیلاً پیش کرتا پھرے گا۔ ذرا دل میں سوچو۔ لوگ کیا سمجھیں

گے؟ افسوس! اگر میں اس وقت دیوار سے سر نہیں ٹکرا لیتا تو سمجھ لو کہ بڑے ضبط سے کام لے رہا ہوں۔ تمھارے ہاتھوں مجھے ہمیشہ ذلت ہی ملی ہے اور تمھارا یہ کام تو میرے ماتھے پر کلنک کا وہ نشان ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔

یہ کہہ کر مہیندر کمار کرسی پر لیٹ گئے اور چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ انھوں نے دیوار سے سر ٹکرانے میں چاہے انتہائی ضبط سے ضرور کام لیا ہو یا نہ لیا ہو مگر اندو نے اپنے دلی جذبات کے دبانے میں انتہائی ضبط سے کام لیا جی میں آتا تھا۔ کہہ دوں کہ میں آپ کی غلام نہیں ہوں۔ مجھے یہ بات ممکن ہی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی ایسا انسان بھی ہوسکتا ہے جس کے دل پر ایسی دردناک اپیل کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ اس نے چاہا کہ کمرہ سے چلی جاؤں اور بیدرد قسمت کو جس نے میرے سکون میں خلل ڈالنے کا اجارہ سا لے لیا ہے۔ پیروں تلے کچل ڈالوں اور دکھادوں کہ ضبط وتحمل سے قسمت کے سخت ترین حملوں کی مدافعت کی جا سکتی ہے۔ لیکن جوں ہی وہ دروازہ کی طرف چلی۔ مہیندر کمار پھر تن کر بیٹھ گئے اور بولے۔ جاتی کہاں ہو؟ کیا میری صورت سے نفرت ہوگئی؟ میں تم سے بہت صفائی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اتنی خودرائی سے کیوں کام کرتی ہو؟ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ جن باتوں کا تعلق مجھ سے ہو وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ کی جایا کریں۔ ہاں اپنے ذاتی معاملوں میں تم خود مختار ہو۔ مگر تمھارے اوپر میری منت وسماجت کا کوئی اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا تم نے قسم کھالی ہے کہ مجھے بدنام کر کے میری عزت کو خاک میں ملا کر میرے وقار کو پیروں سے کچل کر جبھی دم لوگی؟

اندو نے گڑ گڑا کر کہا۔ ایشور کے لیے اس وقت مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کیجیے۔ مجھ سے غلطی ہوئی یا نہیں۔ اس پر میں کچھ بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں مانے لیتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور ضرور ہوئی۔ میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اب بھی آپ کی طبیعت نہ آسودہ ہوئی ہو تو لیجیے بیٹھی جاتی ہوں آپ جتنی دیر تک اور جو کچھ جی چاہے کہیں۔ میں سر نہ اٹھاؤں گی۔

مگر غصہ نہایت بیدرد ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا ایک ایک لفظ نشانہ پر بیٹھتا ہے یا نہیں۔ وہ خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی طاقت لامحدود ہے۔ ایسا

کوئی مہلک سے مہلک ہتھیار نہیں ہے جس سے بڑھ کر مہلک ہتھیار اس کے اسلحہ خانہ میں نہ ہوں۔ لیکن خاموشی وہ منتر ہے جس کے آگے اس کی تمام طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ناقابل فتح ہے۔

مہیندر کمار چڑ کر بولے اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بکواس کا روگ ہوگیا ہے اور کبھی کبھی اس کا دورہ ہو جایا کرتا ہے!

اندو: یہ آپ خود کہتے ہیں۔

اندو سے غلطی ہوئی کہ وہ اپنی بات نبھا نہ سکی۔ غصہ کو ایک تازیانہ اور ملا۔ مہیندر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ یہ میں نہیں کہتا۔ تم کہتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ میں تم سے تحقیق کرنے کے لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم کیوں بار بار وہی کام کرتی ہو جن سے میری بدنامی اور تضحیک ہو۔ میری عزت و آبرو خاک میں مل جائے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں؟ میں جانتا ہوں۔ تم ضد سے ایسا نہیں کرتیں۔ میں یہاں تک کہہ سکتاہوں کہ تم میری مرضی کے مطابق چلنے کی کوشش بھی کرتی ہو لیکن پھر بھی جو سہو ہو جاتاہے اس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ اگلے جنم میں ہم اور تم ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یا تقدیر نے میری تمام آرزوؤں اور حوصلوں کی برباد کرنے کے لیے تمھیں میرے دامن سے وابستہ کر دیا ہو؟ میں اکثر اسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں۔ پر بھید نہیں کھلتا۔

اندو: مجھے علم غیب جاننے کا دعوی تو نہیں۔ ہاں اگر آپ کی مرضی ہو تو میں جاکراندردت کو تاکید کردوں کہ میرا نام نہ ظاہر ہونے پائے۔

مہیندر: کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو! تمھیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ یہ چندہ کس نیت سے جمع کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد ہے میرے انصاف کی تحقیر کرنا۔ میری نیک نامی کی جڑ کھودنا۔ اگر میں اپنے ملازم کو سخت سست کہوں اور تم اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرو تو میں اس کے سوا اورکیا سمجھ سکتا ہوں کہ تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ چندہ تو خیر ہوگا ہی۔ مجھے اس کے روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ جب تمھارے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے تو دوسروں کا کیا کہنا۔ لیکن میں جلوس کبھی نہ نکلنے دوں گا۔ میں اسے اپنے حکم سے بند کر دوں گا۔ اور اگر لوگوں کو زیادہ آمادہ دیکھوں گا تو فوج امداد لینے میں بھی دریغ نہ کروں

گا۔

اندو: آپ جو چاہیں کریں ۔ مجھ سے یہ سب باتیں کیوں کہتے ہیں؟

مہیندر: تم سے اس لیے کہتا ہو ں کہ تم بھی اس اندھے کے عقدت مندوں میں سے ہو۔ کون کہہ سکتاہے کہ تم نے اس سے گرو منتر لینے کا ارادہ نہیں کر لیا ہے؟ آخر رید اس بھگت کے چیلے اونچی ذاتوں میں بھی تو ہیں۔

اندو: میں گرومنتر کو نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی اور شاید کبھی وہ منتر نہ لوں گی۔ مگر ہاں آپ چاہے جتنا برا سمجھیں مگر بدقسمتی سے مجھے پورا یقین ہوگیا ہے کہ سورداس بے قصور ہے۔ اگر یہی اس سے عقیدت کرنا ہے تو میں ضرور عقیدت مندہوں۔

مہیندر: تم کل جلوس میں نہ جاؤ گی؟

اندو: جانا تو چاہتی تھی۔ پر اب آپ کی خاطر سے نہ جاؤں گی۔ اپنے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتے نہیں دیکھ سکتی۔

مہیندر: اچھی بات ہے۔ اس کے لیے میں تمھارا بے حد ممنون ہوں۔

اندو اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئی۔ وہ بہت آزردہ خاطرہو رہی تھی۔ وہ دیر تک راجہ صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر آپ ہی بولی۔ بھگوان یہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ یا تو تم ان کے دل کو زیادہ فراخ بناؤ یا مجھے دنیا سے اٹھا لو۔ اندردت اس وقت نہ جانے کہاں ہوگا۔ کیوں نہ اس کے پاس رقعہ بھیج دوں کہ خبردار۔ میرا نام ظاہر نہ ہونے پاوے؟ میں نے ان سے ناحق کہہ دیا کہ چندہ دیا۔ کیا جانتی تھی کہ یہ گل کھلے گا۔

اس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ نوکر اندر آکر کھڑا ہوگیا۔ اندو نے رقعہ لکھا۔ ڈیر اندر۔ میرے چندہ کوکسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ مجھے رنج ہوگا۔ مجھے بہت مجبور ہو کر یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں۔

پھر یہ رقعہ نوکر کو دے کر بولی۔ اندردت بابو کا مکان جانتا ہے؟

نوکر: ہوئی تو کہوں سہر سے ماں نا؟ پوچھ لیبے۔

اندو: شہر میں تو شاید عمر بھر ان کے گھر کا پتہ نہ لگے۔

نوکر: اب چِٹھی تو دیں پتا تو ہم لگا وب۔ لگی نا کا کہی۔

اندو: تانگہ لے لینا۔ کام جلدی کا ہے۔
نوکر: ہمار گوڑ تانگہ سے کم تھوڑے ہیں۔ کا ہم کو نوتانگا سسُر سے کم چلت ہے؟
اندو: بازار چوک سے ہوتے ہوئے میرے گھر تک جانا بیں بسوے وہ تمھیں میرے گھر ہی پر ملیں گے۔ اندردت کو دیکھا ہے۔ پہچانتا ہے نا؟
نوکر: جہہ کا ایک بیر دیکھ لیئی وہی کا جلم بھر نہ بھولی۔ اندر بابو کا تو سیکرن بیر دیکھا ہے۔
اندو: کسی کو یہ خط مت دکھانا۔
نوکر: کو ۆ دیکھی کسس؟ پہلے وہکی آنکھی نہ پھوڑ ڈارب۔

اندو نے رقعہ دیا۔ نوکر لے کر چلا گیا وہ پھر لیٹ گئی اور وہیں باتیں سوچنے لگی۔ میری یہ ذلت انھیں کے سبب ہو رہی ہے۔ اندر اپنے دل میں کیا سوچے گا؟ یہی نہ کہ راجہ صاحب نے اسے ڈانٹا ہوگا۔ گویا میں لونڈی ہوں۔ جب چاہتے ہیں ڈانٹ بتا دیتے ہیں۔ مجھے کوئی کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ انھیں اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ میں ان کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہوں۔ کتنی ذلت ہے۔

یہ سوچتے وہ تیزی سے اٹھی۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ لونڈی آکر کھڑی ہوئی۔ اندو بولی۔ دیکھ بھیکا چلا تو نہیں گیا۔ میں نے اسے ایک رقعہ دیا ہے جاکر مانگ لا۔ اب نہ بھیجوں گی۔ چلا گیا ہو تو کسی کو سائکل پر دوڑا دینا۔ چوک کی طرف مل جائے گا۔

لونڈی چلی گئی اور ذرا دیر میں بھیکا کو لیے ہوئے آپہنچی۔ بھیکا بولا جوچھن بھر اور نہ جات تو ہم گھر ماں نا ملت۔
اندو: کام تو تم نے جرمانہ کا کیا ہے کہ اتنا ضروری خطہ اور تم گھر میں پڑے ہے۔ لیکن اس وقت یہی اچھا ہوا۔ وہ رقعہ اب نہ جائے گا۔ مجھے دو۔

ان سے رقعہ لے کر چاک کر ڈالا۔ پھر آج کا روزنامہ کھول کر دیکھنے لگی۔ پہلی ہی سرخی تھی ''شاستری جی کی معرکتہ الآرا تقریر''۔ اندو نے اخبار کو نیچے ڈال دیا۔ اور کہنے لگی۔ یہ مہاشے تو شیطان سے زیادہ مشہور ہو گئے۔ جہاں دیکھو شاستری جی! ایسے آدمیوں کی قابلیت کی خواہ کتنی تعریف کی جائے مگراس کی توقیر نہیں کی جاسکتی۔ شاستری کا نام آتے ہی مجھے ان کی یاد آجاتی ہے جو آدمی ذرا ذرا سے اختلافات پر بھی سر ہو

جائے۔ دال میں ذرا سا نمک زیادہ ہو جانے پر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ جسے دوسروں کے دلی جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہ ہو جسے ذرا بھی خیال نہ ہو کہ میری باتوں سے کسی کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے! ہوسکتا ہے کہ کل کو کہنے لگیں۔ اپنے پتا سے ملنے نہ جاؤ گویا میں ان کے ہاتھوں بک گئی ہوں۔

دوسرے روز علی الصباح اس نے گاڑی تیار کرائی اور دوشالا اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ مہیندر کمار باغ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ ان کا ہر روز کا معلوم تھا۔ اندو کو جاتے دیکھا تو پوچھا۔ اتنے سویرے کہاں؟ اندو نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جاتی ہوں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔ اندردت سے روپے واپس لینے۔

مہیندر: اندو سچ کہتا ہوں تم مجھے پاگل بنا دوگی۔

اندو: آپ مجھے کٹھ پتلیوں کی طرح نچانا چاہتے ہیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر یکا یک اندردت سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اندو ان کی طرف لپک کر چلی اور پھاٹک پر پہنچ کر بولی۔ اندردت۔ سچ کہنا تم نے کسی سے میرے چندے کا ذکر تو نہیں کیا؟

اندر سہم سا گیا جیسے کوئی شخص دوکاندار کو پیسے کی جگہ روپے دے آئے۔ بولا۔ ''آپ نے مجھے منع تو نہیں کیا تھا ؟''

اندو: تم جھوٹے ہو۔ میں نے منع کیا تھا۔

اندردت: اندو رانی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے منع نہیں کیا تھا۔ ہاں مجھے خود ہی عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔ اتنی غلطی ضرور میری ہے۔

اندو: (آہستہ سے) تم مہیندر سے اتنا کہہ سکتے ہو کہ میں نے ان کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا؟ مجھ پر تمھاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں روحانی عذاب میں مبتلا ہوں۔

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اندردت موقع تاڑ گیا بولا۔ ہاں کہہ دوں گا۔ آپ کی خاطر سے۔

ایک لمحہ میں اندر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا اندو گھر چلی گئی۔

مہیندر کمار نے پوچھا۔ کہیے مہاشے۔ اس وقت آپ نے کیسے تکلیف کی؟

اندرت: مجھے تو تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اگرچہ خلاف قاعدہ ہے مگر میری آپ سے التجا ہے کہ سورداس اور سبھاگی کا جرمانہ آپ اسی وقت مجھ سے

لے لیں اور ان دونوں کی رہائی کا حکم دے دیں۔ کچہری ابھی دیر میں کھلے گی۔ میں اسے آپ کی خاص عنایت سمجھوں گا۔

مہیندر کمار: ہاں خلاف قاعدہ تو ہے لیکن تمھارا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ روپے منیم کو دے دو۔ میں رہائی کا حکم لکھے دیتا ہوں۔ کتنے روپے جمع کیے؟

اندردت: بس شام کو خاص خاص آدمیوں کے پاس گیا تھا۔ کوئی پانچ سو روپے ہو گئے۔

مہیندر کمار: تب تو تم اس فن میں ماہر ہو۔ اندو رانی کا نام دیکھ کر نہ دینے والوں نے بھیج دیے ہوں گے۔

اندرت: میں اندو رانی کے نام کی اس سے زیادہ عزت کرتاہوں۔ اگر ان کا نام دکھاتا تو پانچ سو روپے نہ لاتا۔ پانچ ہزار لاتا۔

مہیندر کمار: اگر یہ سچ ہے تو تم نے میری آبرو رکھ لی۔

اندرت: مجھے آپ سے ایک التجا اور کرنی ہے۔ کچھ لوگ سورداس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سو لوگ جمع ہوجائیں۔ میں آپ سے اجازت چاہتاہوں۔

مہیندر کمار: جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بدامنی واقع ہونے کا احتمال ہے۔

اندردت: میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پتا تک نہ ہلے گا۔

مہیندر کمار: یہ غیر ممکن ہے۔

اندردت: میں اس کی ضمانت دے سکتاہوں۔

مہیندرکمار: یہ نہیں ہو سکتا۔

اندردت سمجھ گیا کہ راجہ صاحب سے اب زیادہ اصرار کرنا بے فائدہ ہے۔ جا کر منیم کو روپے دیے اور تانگہ کی طرف چلا۔ دفعتاً راجہ صاحب نے پوچھا۔ جلوس تو نہ نکلے گا نہ؟

اندردت: نکلے گا۔ میں روکنا چاہوں تو بھی رک نہیں سکتا۔

اندردت وہاں سے اپنے دوستوں کو خبر دینے چلے۔ جلوس کا انتظام کرنے میں گھنٹوں کی دیر ہوگئی۔ ادھر ان کے جاتے ہی راجہ صاحب نے جیل کے داروغہ کو ٹیلیفون

کر دیا کہ سورداس اور سبھاگی چھوڑ دیے جائیں اور انھیں بند گاڑی میں بیٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا جائے۔ جب اندردت سواری باجے وغیرہ لیے ہوئے جیل پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنجرا خالی ہے۔ چڑیاں اڑ گئیں۔ وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ انھیں پاؤں پانڈو پور کو چلے۔ دیکھا تو سورداس ایک نیم کے نیچے راکھ کے ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک طرف سبھاگی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اندردت کو دیکھتے ہی جگدھر اور دیگر کئی اشخاص ادھر ادھر سے آکر جمع ہوگئے۔

اندردت: سورداس تم نے بڑی جلدی کی وہاں لوگ تمھارا جلوس نکالنے کی تیاریاں کیے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے بازی مار لی۔ اب بتاؤ ان روپیوں کا کیا کیا جائے جو جلوس کے لیے جمع کیے گیے تھے؟

سورداس: اچھا ہی ہوا کہ میں یہاں چپکے سے آگیا۔ نہیں تو سہر بھر میں گھومنا پڑتا۔ جلوس بڑے بڑے آدمیوں کا نکلتا ہے کہ اندھے بھکاریوں کا؟ آپ لوگوں نے جریبانہ دے کر چھڑا دیا یہی کون کم پن کیا۔

اندردت: اچھا بتاؤ یہ روپے کیا کیے جائیں۔ تمھیں دے دوں؟

سورداس: کتنے روپے ہوں گے؟

اندردت: کوئی تین سو ہوں گے۔

سورداس: بہت ہیں۔ اتنے میں بھیرو کی دوکان مجے میں بن جائے گی۔

جگدھر کو برا معلوم ہوا۔ بولا پہلے اپنے جھونپڑے کی تو پھکر کرو۔

سورداس: میں اسی پیڑ کے نیچے پڑا رہا کروں گا یا پنڈاجی کے دالان میں۔

جگدھر: جس کی دوکان جلی ہے وہ بنوائے گا۔ تمھیں کیا چنتا ہے؟

سورداس: جلی تو ہے میرے کارن۔

جگدھر: تمھارا گھر بھی تو جلا ہے۔

سورداس: یہ بھی بنے گا مگر پیچھے سے دوکان نہ بنی تو بھیرو کو کتنا گھاٹا ہوگا۔ میری بھیک تو ایک دن بھی بند نہ ہوگی۔

جگدھر: بہت سراہنے سے بھی آدمی کا من بگڑ جاتا ہے۔ تمھاری بھل منسی کا لوگ بکھان کرنے لگے تو اب تم سوچتے ہوگے کہ ایسا کام کروں جس میں اور بڑائی ہو۔ اس طرح

دوسروں کی تالی پر ناچنا نہ چاہیے۔

اندردت: سورداس تم ان لوگوں کو بکنے دو۔ تم گیانی ہو۔ یہ روپے تمھارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ جو جی میں آوے کرنا۔

اندردت چلا گیا تو سبھا گی نے سورداس سے کہا۔ اس کی دوکان بنوانے کا نام نہ لینا۔

سورداس: میرے گھر سے پہلے اس کی دوکان بنے گی۔ یہ بدنامی سر پر کون لے کہ سورداس نے بھیرو کا گھر جلادیا؟ میرے من میں یہ بات سما گئی ہے کہ ہمیں میں سے کسی نے اس کی دوکان جلائی۔

سبھا گی: اس سے کتنے ہی دبو پر وہ تمھارا دشمن ہی بنا رہے گا۔ کتے کی پونچھ کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

سورداس: تم دونوں پھر ایک ہو جاؤ گے تب تجھ سے پوچھوں گا۔

سبھا گی: بھگوان مار ڈالیں پر اس کا منہ نہ دکھاویں۔

سورداس: میں کہے دیتا ہوں تو ایک دن بھیرو کے گھر کی دیبی بنے گی۔ سورداس روپے لیے ہوئے بھیرو کے گھر کی طرف چلا۔ بھیرو رپٹ کرنے کو جانا تو چاہتا تھا پر ڈر تھا کہ کہیں سورداس کے جھونپڑے کی بھی بات چلی تو کیا جواب دوں گا۔ بار بار ارادہ کر کے رک جاتا تھا۔ اتنے میں سورداس کو سامنے آتے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ تعجب سے بولا۔ ارے کیا جربیانہ دے آیا کیا؟

بڑھیا بولی بیٹا۔ اسے جرور کسی دیوتا کا اِشت ہے نہیں تو وہاں سے کیسے بھاگ آتا ؟

سورداس نے بڑھ کر کہا بھیرو میں ایشور کو ساکھی دے کر کہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تمھاری دوکان کس نے جلائی۔ تم مجھے چاہے جتنا نیچ سمجھو پر میری جانکاری میں یہ بات کبھی نہ ہونے پاتی۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی میرے ہتو (خیرخواہ) کا کام ہے۔

بھیرو: پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم چھوٹ کیسے آئے؟ مجھے تو یہی بڑا اَچرج ہے۔

سورداس: بھگوان کی اچھا۔ سہر کے کچھ دھرماتما لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے میرا

جریانہ بھی دے دیا۔ اور کوئی تین سو روپے جو بچ رہے ہیں مجھے دیے گئے ہیں۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ روپے لے کر اپنی دوکان بنواؤ، جس میں تمھارا ہرج نہ ہو۔ میں سب روپے لے آیا ہوں۔

بھیرو ششدر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی آدمی آسمان سے موتیوں کی بارش ہوتی ہوئی دیکھے۔ اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ ان کو لوں یا نہیں۔ ان میں کوئی بھید تو نہیں ہے۔ ان میں کوئی زہریلا کیڑا تو نہیں چھپا ہے۔ کہیں ان کے لینے سے مجھ پر کوئی آفت تو نہ آئے گی؟ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اندھا سچ مچ مجھے روپے دینے کو لایا ہے یا مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ ذرا اس کا دل ٹٹولنا چاہیے۔ بولا تم اپنے روپے رکھو۔ یہاں کوئی روپیوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ پیاسوں مرتے بھی ہوں تو دشمن کے ہاتھ سے پانی نہ پئیں۔

سورداس: بھیرو تمھاری دشمنی کیسی؟ میں تو کسی کو اپنا دشمن نہیں دیکھتا۔ چار دن کی جندگانی کے لیے کیا کسی سے دشمنی کی جائے! تم نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ تمھاری جگہ میں ہوتا اور سمجھتا کہ تم میری گھر والی کو بہکائے لیے جاتے ہو تو میں بھی یہی کرتا جو تم نے کیا۔ اپنی آبرو کس کو پیاری نہیں ہوئی؟ جسے اپنی آبرو پیاری نہ ہو اس کی گنتی آدمیوں میں نہیں۔ جانوروں میں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمھارے ہی لیے یہ روپے لیے ہیں نہیں تو میرے لیے تو پیڑ چھانہہ بہت تھی۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی تمھیں میرے اوپر سُبھا ہو رہا ہے پر کبھی نہ کبھی تمھارا من میری طرف سے ساپھ ہو جائے گا۔ یہ روپے لو اور بھگوان کا نام لے کر دوکان بنوانے میں ہاتھ لگا دو۔ کم پڑیں گے تو جس بھگوان نے اتنی سہائیتا دی ہے وہی بھگوان اور بھی سہائیتا دیں گے۔

بھیرو کو ان الفاظ میں ہمدردی اور شرافت کی جھلک دکھائی دی۔ سچائی اعتبار کو پیدا کر دیتی ہے۔ نرم ہو کر بولا۔ آؤ بیٹھو۔ چلم پیئو۔ کچھ باتیں ہوں تو سمجھ میں آئے۔ تمھارے من کا بھید نہیں کھلتا۔ دشمن کے ساتھ تو کوئی بھلائی نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ کیوں اتنی مہربانی کرتے ہو؟

سورداس: تم نے میرے ساتھ کون سی دشمنی کی؟ تم نے وہی کیا جو تمھارا دھرم تھا۔ میں

رات بھر حوالات میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ میں نے تو تمھارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تو مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کر رہے ہو۔ یہی تمھارا دھرم ہے ۔ عورت کے پیچھے تو کھون ہوجاتا ہے۔ تم نے نالس ہی کردی تو کون برا کام کیا۔ بس اب تم سے میری یہی بنتی ہے کہ جس طرح کل بھری عدالت میں پنچوں نے مجھے بے کسور کہہ دیا۔ اسی طرح تم بھی میری طریھ سے اپنا من صاپھ کرلو۔ میری اس سے بھی ادھک (زیادہ) درگت ہو اگر میں نے تمھارے ساتھ کوئی گھات کیا ہو۔ ہاں مجھ سے ایک ہی بات نہیں ہوسکتی۔ میں سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال نہیں سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی آڑ نہ رہے گی تو نہ جانے اس کی کیا دسا ہو۔ میرے یہاں رہے گی۔ تو کون جانے کبھی تمھیں اسے رکھ لو۔

بھیرو کا کدورت بھرا دل اس باطنی صفائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آج پہلی مرتبہ اسے سورداس کی نیک نیتی کا یقین ہوگیا۔ سوچا اگر اس کا دل صاپھ نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتا؟ میرا کوئی ڈر تو اسے ہے ہی نہیں۔ میں جو کچھ کرسکتا تھا کر چکا۔ اس کے ساتھ سارا سہر ہے۔ سبوں نے جریانہ ادا کر دیا۔ اوپر کئی سو روپے دے گیے۔ محلہ میں بھی اس کی دھاک پھر بیٹھ گئی۔ چاہے تو بات کی بات میں مجھے بگاڑ سکتا ہے۔ نیت ساپھ نہیں ہوتی تو اب سبھاگی کے ساتھ آرام سے رہتا۔ اندھا ہے۔ اپاہج ہے۔ بھیکھ مانگتا ہے۔ پر اس کی کتنی مرجاد ہے۔ بڑے بڑے آدمی اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں کتنا کمینہ نیچ آدمی ہوں کہ پیسے کے لیے رات دن دگا پھریب کرتا رہتا ہوں۔ کون سا پاپ ہے جو میں نے نہیں کیا اس بیچارے کا گھر جلایا۔ ایک بار نہیں دوبار اس کے روپے اٹھا لے گیا۔ یہ میرے ساتھ نیکی ہی کرتا چلا آتا ہے۔ سبھاگی کے بارے میں مجھے سک ہی سک تھا۔ اگر کچھ نیت بدہوتی تو اس کا ہاتھ کس نے پکڑا تھا۔ سبھاگی کو کھلے کھجانے رکھ لیتا۔ اب تو عدالت کچہری کا بھی ڈر نہیں رہا۔ یہ سوچتا ہوا وہ سورداس کے پاس آکر بولا۔ سورداس اب تک میں نے تمھارے ساتھ جو کچھ بھلائی برائی کی اسے ماپھ کرو۔ آج سے اگر تمھارے ساتھ کوئی برائی کروں تو بھگوان مجھ سے سمجھیں۔ یہ روپے مجھے مت دو۔ میرے پاس روپے ہیں دوکان بنوا لوں گا۔ سبھاگی پر اب مجھے کوئی سک نہیں رہا۔ میں بھگوان کو بیچ میں ڈال کر کہتا ہوں کہ اب میں کبھی

اسے کوئی کڑی بات تک نہ کہوں گا۔ میں اب تک دھوکے میں پڑا ہوا تھا۔ سبھاگی کو میرے یہاں آنے پر راجی کردو۔ وہ تمھاری بات کو ناہیں نہ کرے گی۔

سورداس: راجی ہی ہے بس اسے یہی ڈر ہے کہ تم پھر مارنے پیٹنے لگو گے۔

بھیرو: نہیں سورداس اب میں اسے بھی پہچان گیا۔ میں اس کے لائک نہیں تھا۔ اس کا بیاہ تو کسی دھرماتما آدمی سے ہونا چاہیے تھا۔ (آہستہ) آج تم سے کہتا ہوں پہلی بار بھی میں نے ہی تمھارے گھر میں آگ لگائی تھی اور تمھارے روپے چرائے تھے۔

سورداس: ان باتوں کو بھول جاؤ بھیرو مجھے سب معلوم ہے۔ دنیا میں کون ہے جو کہے کہ میں گنگا جل ہوں۔ جب بڑے بڑے سادھو سنیاسی مایا موہ میں پھنسے ہوئے ہیں تو ہماری تمھاری کیا بات ہے۔ ہماری بڑی بھول یہی ہے کہ کھیل کھیل کی طرح نہیں کھیلتے۔ کھیل میں دھاندلی کر کے کوئی جیت ہی جائے تو کیا ہاتھ آئے گا۔ کھیلنا تو اس طرح چاہیے کہ نگاہ جیت پر رہے پر ہار سے گھبرائے نہیں۔ ایمان کو نہ چھوڑے۔ جیت کر اتنا نہ اترائے کہ اب کبھی ہار ہوگی ہی نہیں۔ یہ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ ہی ہے۔ ہاں ایک صلاح کی بات کہتا ہوں۔ تم تاڑی کی دوکان چھوڑ کر کوئی دوسرا روجگار کیوں نہیں کرتے؟

بھیرو: جو کہو وہ کروں۔ وہ روجگار ہے کھراب۔ رات دن جواری۔ چور، بدماس آدمیوں ہی کا ساتھ رہتا ہے۔ انھیں کی باتیں سنو۔ انھیں کے ڈھنگ سیکھو۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اسی روجگار نے مجھے چوپٹ کیا۔ بتاؤ کیا کروں؟

سورداس: لکڑی کا روجگار کیوں نہیں کر لیتے؟ برا نہیں ہے۔ آج کل یہاں پردیسی بہت آئیں گے بکری بھی اچھی ہوگی۔ جہاں تاڑی کی دوکان تھی وہیں ایک باڑا بنوا دو اور ان روپیوں سے لکڑی کا کام کرنا سُرو کر دو۔

بھیرو: بہت اچھی بات ہے۔ مگر یہ روپے اپنے ہی پاس رکھو۔ میرے من کا کیا ٹھکانا۔ روپے پا کر کوئی اور برائی نہ کر بیٹھوں۔ میرے جیسے آدمی کو تو کبھی آدھے پیٹ کے سوا بھوجن نہ ملنا چاہیے۔ پیسے ہاتھ میں آئے اور سنک سوار ہوئی۔

سورداس: میرے گھر نہ دوار، رکھوں گا کہاں؟

بھیرو: اس سے تم اپنا گھر بنوالو۔

سورداس: تمھیں لکڑی کی دوکان سے پُھا ہو تو بنوا دینا۔

بھیرو: سبھاگی کو سمجھا دو۔

سورداس: سمجھادوں گا۔

سورداس چلا گیا۔ بھیرو گھر میں گیا تو بڑھیا بولی۔ تجھے میل کرنے آیا تھا نا؟

بھیرو: ہاں کیوں نہ میل کرے گا۔ میں بڑا لاٹ ہوں نا۔ بڑھاپے میں تجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ آدمی نہیں سادھو ہے۔

(33)

فیکٹری (کارخانہ) قریب قرب تیار ہوگئی تھی۔ اب مشینیں گڑنے لگیں ۔ پہلے تو مزدور مستری وغیرہ عموماً مل کے برآمدوں ہی میں رہتے تھے۔ وہیں پیڑوں کے نیچے کھانا پکاتے اور سوتے تھے۔ لیکن جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ تو محلّہ میں مکان لے لے کر رہنے لگے۔ پانڈے پور چھوٹی سی بستی تو تھی ہی۔ وہاں اتنے مکانات کہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلّہ والے کرایہ کی لالچ سے پردیسیوں کو اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرانے لگے۔ کوئی پردہ کی دیوار کھنچوا لیتا تھا۔ کوئی خود جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے لگتا اور مکان کرایہ داروں کو دے دیتا۔ بھیرو نے لکڑی کی دوکان کھول رکھی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہنے لگا۔ اور اپنا رہائشی مکان کرایہ پر اٹھا دیا۔ ٹھاکر دین نے اپنی دوکان کے سامنے ایک ٹٹی لگا کر گزر کرنا شروع کیا۔ اس کے گھر میں ایک ورسیر آ جمے۔ جگدھر سب سے زیادہ لالچی تھا۔ اس نے سارا مکان اٹھا دیا اور اب ایک پھوس کے چھپر میں نباہ کرنے لگا۔ نایک رام کے برآمدہ میں تو روز ایک بارات ٹھہرتی تھی۔ لالچ نے لوگوں کو یہاں تک گھیرا کہ بجرنگی نے بھی مکان کا ایک حصہ اٹھا دیا۔ ہاں سورداس نے کسی کو نہیں ٹھہرایا۔ وہ اپنے نئے مکان میں جو رانی اندو کے مخفی عطیہ سے بنا تھا سبھاگی کے ساتھ رہتا تھا۔ سبھاگی ابھی تک بھیرو کے ساتھ رہنے میں راضی نہ ہوئی تھی۔ ہاں بھیرو کی آمد ورفت اب سورداس کے گھر میں زیادہ تر رہتی تھی۔

کارخانہ میں ابھی مشینیں نہ گڑی تھیں۔ مگر اس کی وسعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ سورداس کی بقیہ پانچ بیگھے زمین بھی اسی قاعدہ کے مطابق مل کے تصرف میں

آ گئی۔ سورداس نے سنا تو ہاتھ مل کر رہ گیا۔ پچھتانے لگا کہ جان صاحب ہی سے کیوں نہ سودا کر لیا۔ پانچ ہزار دیتے تھے۔ اب بہت ملیں تو دو چار سو مل جائیں گے۔ اب کسی قسم کی تحریک کرنا اسے بے فائدہ معلوم ہوتا تھا۔ جب پہلے ہی کچھ نہ کرسکا تو اب کیا کر لوں گا۔ پہلے ہی یہ اندیشہ تھا وہ درست نہ نکلا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سوردا س ایک درخت کے نیچے بیٹھا جھپکیاں لے رہا تھا کہ تحصیل کے ایک چپراسی نے آکر اسے پکارا اور ایک سرکاری پروانہ دیا۔ سورداس سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو زمین ہی کا کچھ جھگڑا ہے۔ پروانہ لیے ہوئے مل میں آیا کہ کسی بابو سے پڑھوائے۔ مگر کچہری کی خوشخط تحریر مل کے بابوؤں سے کیا پڑھی جاتی۔ کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔ مجبوراً واپس آرہا تھا کہ پربھو سیوک نے دیکھ لیا۔ فوراً اپنے کمرہ میں بلالیا اور پروانہ کو دیکھا۔ لکھا ہوا تھا۔ اپنی زمین کے معاوضہ کے ایک ہزار روپے تحصیل میں آکر لے جاؤ۔

سورداس: کل ایک ہزار ہے؟

پربھوسیوک: ہاں اتنا ہی تو لکھا ہے۔

سورداس: تو میں روپے لینے نہ جاؤں گا۔ صاحب نے پانچ ہزار دینے کو کہے تھے۔ اس کے ایک ہی ہجار ہے۔ گھوس میں سو پچاس روپے اور اٹھ جائیں گے۔ سرکار کا کھجانا کھالی ہے۔ بھر جائے گا۔

پربھوسیوک: روپے نہ لوگے تو ضبط ہو جائیں گے۔ یہاں توسرکار اسی تاک میں رہتی ہے کہ کسی طرح رعایا کا دھن اڑا لے۔ کچھ ٹیکس کے بہانے سے کچھ روزگار کے بہانے سے کچھ کسی بہانے سے ہضم کر لیتی ہے۔

سورداس: گریبوں کی چیج لیتی ہے تو باجار بھاؤ سے دام نہ دینا چاہیے؟ ایک تو جبرجستی دھرتی لے لی اس پر من مانا دام دے دیا۔ یہ کوئی نیائے نہیں ہے۔

پربھو سیوک: سرکار یہاں نیائے کرنے نہیں آئی ہے بھائی۔ راج کرنے آئی ہے۔ نیائے کرنے سے اسے کچھ ملتا ہے؟ کوئی وقت وہ تھا جب نیائے کو راج کی بنیاد سمجھاجاتا تھا۔ اب وہ وقت نہیں ہے۔ اب تجارت کا راج ہے اور جو اس راج کو منظور نہ کرے اس کے لیے ستاروں کا نشانہ مارنے والی توپیں ہیں۔ تم کیا کر سکتے ہو؟

دیوانی مقدمہ دائر کروگے؟ وہاں بھی سرکار ہی کے نوکر چاکر انصاف کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

سورداس: میں کچھ نہ لوں گا۔ جب راجہ ہی ادھرم کرنے لگا تو پرجا کہاں تک جان بچاتی پھرے گی؟

پربھو سیوک: اس سے فائدہ کیا؟ ایک ہزار ملتے ہیں لے لو۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی۔

یکا یک اندردت آپہنچے اور بولے۔ پربھو آج ڈیرا کوچ ہے راجپوتانہ جا رہا ہوں۔

پربھو سیوک: فضول جاتے ہو۔ ایک تو ایسی سخت گوئی دوسرے وہاں کی حالت اب بہت نازک ہو رہی ہے۔ ناحق کہیں پھنس پھنسا جاؤگے۔

اندردت: میں ایک بار ونے سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے مزاج اخلاق اور اصول میں اتنا تغیر بلکہ انقلاب کیسے واقع ہوگیا۔

پربھو سیوک: ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ طمع میں پڑنے والا آدمی تو نہیں ہے۔ میں تو اس کا دل وجان سے معتقد ہوں۔ اگر وہ منحرف ہوئے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ مذہب و راستی کا دنیا سے فقدان ہو گیا۔

اندردت: یہ نہ کہو پربھو انسانی فطرت ایک معمّہ ہے ۔ اس کا جاننا نہایت دشوار ہے۔ مجھے تو ونے کی کایا پلٹ پر اتنا غصہ آتا ہے کہ پاؤں تو گولی مار دوں۔ ہاں اطمینان تو اس بات کا ہے کہ ان کے نکل جانے کا اس جماعت پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ تمھیں تو معلوم ہے۔ ہم لوگوں نے بنگال میں مصیبت زدوں کو قرار واقعی مدد دینے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ کئی کئی دنوں تک تو ہم لوگوں کو ایک دانہ تک میسر نہ ہوتا تھا۔

سورداس: بھیا کون لوگ اس طرح گریبوں کا پالن کرتے ہیں؟

اندردت: ارے سورداس تم یہاں گوشہ میں کھڑے ہو میں نے تو تمھیں دیکھا ہی نہیں۔ کہو سب خیرت ہے نا؟

سورداس: سب بھگوان کی دیا ہے۔ تم ابھی کن آدمیوں کی بات کر رہے تھے؟

اندردت: اپنے ہی ساتھیوں کی۔ کنور بھرت سنگھ نے کچھ نوجوانوں کو جمع کر کے ایک ٹولی بنا دی ہے اور اس کے خرچ کے لیے تھوڑی سی زمین بھی دان کردی ہے۔ آج

کل ہم لوگ کوئی سو آدمی ہیں۔ دیش کی حتی المقدور خدمت کرنا ہی ہم لوگوں کا خاص فرض ہے۔ اس وقت ہم میں سے کچھ لوگ تو راجپوتانہ کو گئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ پنجاب کو۔ جہاں سرکاری فوج نے رعایا پر گولیاں چلا دی ہیں۔

سورداس: بھیا یہ تو بڑے پن کا کام ہے۔ ایسے مہاتما لوگوں کے تو درسن کرنا چاہیے۔ تو بھیا تم لوگ چندے بھی اگاتے ہوگے؟

اندردت: ہاں جس کی مرضی ہوتی ہے چندہ بھی دے دیتا ہے لیکن ہم لوگ خود نہیں مانگتے پھرتے۔

سورداس: میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں تو آپ مجھے رکھیں گے؟ یہاں پڑے پڑے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ آپ کے ساتھ رہوں گا تو آدمی ہو جاؤں گا۔

اندردت نے پربھوسیوک سے انگریزی میں کہا۔ کتنا بھولا آدمی ہے۔ خدمت اور ایثار کا مجسم نمونہ ہونے پر بھی غرور چھو تک نہیں گیا۔ اپنے نیک کاموں کی کچھ قدر ہی نہیں سمجھتا ۔ اپکار اب اس کے لیے کوئی اختیاری فعل نہیں رہا۔ وہ اس کی عادت ہی میں داخل ہوگیا ہے۔

سورداس نے پھر کہا۔ اور کچھ تو نہ کر سکوں گا۔ ان پڑھ گنوار ٹھہرا، پر جس کے سرہانے بیٹھا دیجیے گا پنکھا جھلتا رہوں گا۔ پیٹھ پر جو کچھ لاد دیجیے گا لیے پھروں گا۔

اندردت : تم معمولاً جو کچھ کرتے ہو وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جسے ہم لوگ کبھی کبھی خاص موقعوں پر کرتے ہیں۔ دشمن کے ساتھ نیکی کرنا مریضوں کی تیمارداری سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ اچھا ہے۔

سورداس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ جیسے کسی شاعر نے کسی سخن فہم سے داد پائی ہو۔ بولا: بھیا ہماری کیا بات چلاتے ہو؟ جو آدمی پیٹ پالنے کے لیے بھیک مانگے گا۔ وہ پن دھرم کیا کرے گا؟ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر آپ کا حکم ہو تو مجھے ماوجہ (معاوضہ) کے جو روپے ملے ہیں انھیں آپ کی سنگت کے بھینٹ کروں؟

اندردت: کیسے روپے۔

پربھوسیوک: اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ پاپا نے راجہ مہیندر

کمار کی مدد سے اس کی جو زمین لے لی تھی اس کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ اسے دیا گیا ہے۔ یہ مل اسی لوٹ کے مال پر بن رہی ہے۔

اندر دت: تم نے اپنے پاپا کو منع نہیں کیا؟

پربھوسیوک: قسم خدا کی میں اور صوفی دونوں ہی نے پاپا کو بہت روکا پر تم ان کی عادت جانتے ہی ہو۔ کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے تو کسی کی نہیں سنتے۔

اندردت: میں تو اپنے باپ سے لڑ جاتا مل بنتی یا بھاڑ میں جاتی ایسی حالت میں تمھارا کم از کم یہ فرض تھا کہ مل سے بالکل علیحدہ رہتے۔ باپ کا حکم ماننا بیٹے کا فرض ہے۔ یہ میں جانتا ہوں لیکن جب باپ بے انصافی کرنے لگے تو بیٹا اس کی تقلید کرنے کے لیے مجبور نہیں۔ تمھاری نظموں کے تو ایک ایک لفظ سے اخلاقی جوہر ٹپکتا ہے۔ ایسی پرواز کرتے ہو کہ ہریش چندر اور حسین بھی مات ہو جائیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری ساری طاقت نظموں کی بندش ہی میں صرف ہو جاتی ہے۔ عمل کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ واقعی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے کلام کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بس زبان ہی کے شیر ہو۔ سورداس ہم لوگ تم جیسے غریبوں سے چندہ نہیں لیتے۔ ہمارے داتا امیر لوگ ہیں۔

سورداس: بھیا تم نہ لوگے تو کوئی چور لے جائے گا۔ میرے پاس روپوں کا کام ہی کیا ہے؟ تمھاری دیا سے پیٹ بھر اناج مل ہی جاتاہے۔ رہنے کو جھونپڑی بن ہی گئی ہے۔ اور کیا چاہیے؟ کسی اچھے کام میں لگ جانا اس سے کہیں اچھا ہے کہ چور اٹھا لے جائیں۔ میرے اوپر اتنی دیا کرو۔

اندردت: اگر دینا ہی چاہتے ہو۔ تو کوئی کنواں کھدوا دو۔ بہت دنوں تک تمھارا نام رہے گا۔

سورداس: بھیا مجھے نام کی بھوک نہیں ہے۔ بہانے مت کرو۔ یہ روپے لے کر اپنی سنگت میں دے دو۔ میرے سر سے بوجھ ٹل جائے گا۔

پربھوسیوک: (انگریزی میں) دوست اس کے روپے لے لو ورنہ اسے چین نہ آئے گا۔ اس فیاضی کو فرشتوں کی فیاضی کہنا اس کی تحقیر کرنا ہے۔ میرا تو تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔ ایسے ایسے لوگ بھی دنیا میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے بھرے

ہوئے تھال میں سے ایک نوالہ اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ تو دوسرے روز اخباروں میں اپنا نام دیکھنے کو دوڑتے ہیں۔ اڈیٹر اگر اس خبر کو جلی حروف میں نہ شائع کرے تو اسے گولی مار دیں۔ یہ داقعی مقدس ہستی ہے!

اندردت: سورداس اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو میں روپے لے لوں گا مگر اِس شرط پر کہ تمھیں جب کبھی کوئی ضرورت ہو ہمیں فورا مطلع کرو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی ہی تمھاری کُٹی ایک تیرتھ کا مقام ہو جائے گی اور لوگ تمھارے درشن کو آیا کریں گے۔

سورداس: تو میں آج روپے لاؤں گا۔

اندددت: اکیلے نہ جانا ورنہ کچہری کے کتے تمھیں بہت دق کریں گے۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔

سورداس: اب ایک بنتی (عرض) آپ سے بھی ہے۔ صاحب آپ تِلی گھر کے مجوروں کے لیے گھر کیوں نہیں بنوا دیتے۔ ساری بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور روز اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے محلہ میں کسی نے عورتوں کو نہیں چھیڑا تھا۔ نہ کبھی اتنے دھڑلے سے جوا ہوا۔ نہ سرابیوں کا ایسا ہلڑ رہا۔ جب تک مجور لوگ یہاں کام پر نہیں آجاتے۔ عورتیں گھروں سے پانی بھرنے نہیں نکلتیں۔ رات کو اتنا سور ہوتا ہے کہ نیند نہیں آتی کسی کو سمجھاؤ تو لڑنے پر اتارو (آمادہ) ہو جاتا ہے۔

یہ کہہ کر سورداس چپ چاپ ہوگیا اور سوچنے لگا کہ میں نے بات کو بہت بڑھا کر تو نہیں کہا۔ اندردت نے پربھوسیوک کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ تو اچھی بات نہیں۔ اپنے پاپا سے کہو۔ اس کا جلد بندوبست کریں۔ نہ جانے تمھارے وہ اصول کیا ہوگئے؟ بیٹھے بٹھائے یہ ساری برائیاں دیکھ رہے ہو اور کچھ کرتے دھرتے نہیں۔

پربھوسیوک: مجھے تو ایک دم اس کام سے نفرت ہے۔ میں نہ اسے پسند کرتا ہو ں۔ نہ اس کے قابل ہوں۔ میری زندگی کا مسرت انگیز بہشت تو یہی ہے کہ کسی پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ کے کنارہ پر چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر پڑا رہوں۔ نہ دنیا کی فکر ہو نہ عاقبت کی۔ نہ اپنے نام کو کوئی رونے والا ہو نہ ہنسنے والا۔ یہی میری زندگی کی معراج

ہے ۔ مگر اس معراج پر پہنچنے کے لیے جس باقاعدگی اور کوشش کی ضرورت ہے اس سے محروم ہوں خیر سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرف میرا دھیا ہی نہیں گیا۔ میرا تو یہاں آنا نہ آنا دونوں برابر ہیں۔ صرف پاپا کے لحاظ سے چلا آتا ہوں۔ وقت کا زیادہ حصہ یہی سوچنے میں صرف کرتا ہوں کہ اس قید سے کیوں کر نجات ملے۔ آج ہی پاپا سے کہوں گا۔

اندرت: ہاں آج ہی کہنا تمھیں تامل ہو تو میں کہہ دوں۔

پربھوسیوک: نہیں جی اس میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ اس سے تو میرا رنگ اور جم جائے گا۔ پاپا کو خیال ہوگا کہ اب اس کا جی لگنے لگا۔ کچھ اس نے کہا تو۔ ان کا تو مجھ سے یہی رونا ہے کہ میں کسی بات میں بولتا ہی نہیں۔

اندردت یہاں سے چلے تو سورداس بہت دور تک ان کے ساتھ اسی خدمت جماعت کی باتیں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ جب اندردت نے بہت اصرار کیا تو لوٹا۔ اندردت وہیں سڑک پر کھڑا ہوا اس نحیف عاجز انسان کو ہوا کے جھونکوں سے لڑکھڑاتے اور درختوں کے سایہ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ شاید یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ یہ انسان ہے یا فرشتہ!

(34)

پربھو سیوک نے گھر آتے ہی مکانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جان سیوک یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ اب اس نے کارخانہ کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ بولے: ہاں مکانوں کا بننا بہت ضروری ہے۔ انجینئر سے کہو ایک نقشہ بنائیں۔ میں انتظامی کمیٹی کے سامنے اس تجویز کو پیش کروں گا۔ قلیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ مکانات بنوانے کی ضرورت نہیں۔ لمبی لمبی بارکیں بنوادی جائیں تاکہ ایک ایک کمرہ میں دس بارہ مزدور رہ سکیں۔

پربھوسیوک: لیکن بہت سے قلی ایسے بھی تو ہوں گے جو بال بچوں کے ساتھ رہنا چاہیں گے۔

مسز سیوک: قلیوں کے بال بچوں کو وہاں جگہ دی جائے گی تو ایک شہر آباد ہو جائے گا۔ تمھیں ان سے کام لینا ہے کہ انھیں آباد کرنا ہے ۔ جیسے فوج کے سپاہی رہتے ہیں

اسی طرح قلی لوگ بھی رہیں گے۔ ایک چھوٹا سا چرچ ضرور ہونا چاہیے۔ پادری کے لیے ایک مکان کا ہونا بھی ضروری ہے۔

ایشور سیوک: خدا تجھے سلامت رکھے بیٹی۔ تیری یہ رائے مجھے بہت پسند آئی۔ قلیوں کے لیے روحانی غذا جسمانی غذا سے کم ضروری نہیں۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپاؤ کتنی عمدہ تجویز ہے۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ وہ دن کب آئے گا۔ جب قلیوں کے دل مسیح کے کلام پاک سے آسودہ ہو جائیں گے۔

جان سیوک: لیکن تو خیال کیجیے کہ میں اس مذہبی تحریک کی تجویز کو کمیٹی کے سامنے کیوں کر رکھ سکوں گا؟ اس کا مختار کل تو نہیں ہوں۔ دیگر ممبران کمیٹی نے مخالفت کی تو اس کا کیا جواب دوں گا۔ میرے سوا کمیٹی میں اور کوئی عیسائی نہیں ہے۔ میں اس تجویز کو کمیٹی کے روبرو ہرگز نہ رکھوں گا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس تجویز میں کتنی مذہبی جانبداری ہے۔

مسز سیوک: جب کوئی مذہبی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو تم خواہ مخواہ اس میں اعتراض کرتے ہو۔ ہندو قلی تو جلد ہی کسی درخت کے نیچے دو چار اینٹ پتھر رکھ کر انھیں پوجنا شروع کر دیں گے۔ مسلمان لوگ بھی کھلے میدان میں نماز پڑھ لیں گے۔ تو پھر چرچ سے کسی کو کیا خصومت ہو سکتی ہے۔

ایشور سیوک: خداوند یسوع مجھ پر اپنی برکتوں کی بارش کر! بائبل مقدس کی بشارتیں تو ہر شخص کے لیے راحت بخش ہیں۔ ان کی اشاعت میں کسی کو کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اور اگر کچھ اعتراض ہو بھی تو تم اس دلیل سے اسے رد کرسکتے ہیں۔ بادشاہ کا مذہب بھی مذہبوں کا بادشاہ ہے۔ آخر سرکار نے مذہبی اشاعت کا محکمہ کھولا ہے تو کون اعتراض کرتا ہے اور کرے بھی تو کون اسے سنتا ہے؟ میں آج ہی اس معاملہ کو چرچ میں پیش کروں گا اور حکام کو مجبور کروں گا کہ وہ کمپنی پر دباؤ ڈالیں۔ مگر یہ تمھارا کام ہے میرا نہیں۔ تمھیں خود ان باتوں کا خیال ہونا چاہیے۔ نہ ہوئے مسٹر کلارک اس وقت؟

مسز سیوک: وہ ہوتے تو پھر کوئی دقت ہی نہ ہوتی۔

جان سیوک: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس تجویز کو کیسے پیش کروں گا۔ اگر کمپنی کوئی مندر یا مسجد بنوانے کی تجویز کرتی تو میں بھی چرچ کی تعمیر پر زور دیتا ۔ لیکن

جب تک اور لوگ پیش قدمی نہ کریں میں کچھ نہیں کرسکتا اور نہ کرنا مناسب ہی سمجھتا ہوں۔

ایشور سیوک : ہم اداروں کے پیچھے پیچھے کیوں چلیں؟ ہمارے ہاتھوں میں چراغ ہے۔ کندھے پر لاٹھی ہے۔ کمر میں تلوار ہے۔ پیروں میں طاقت ہے۔ ہم کیوں نہ آگے چلیں؟ کیوں دوسروں کا منہ تاکیں؟

مسٹر جان سیوک نے اپنے والد سے زیادہ بحث مباحثہ فضول سمجھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آدھی رات تک پر بھوسیوک کے ساتھ بیٹھے ہوئے مختلف طریقوں پر نقشے بناتے اور بگاڑتے رہے ۔ کدھر کی زمین لی جائے کتنی زمین کافی ہوگی۔ کتنا صرفہ ہوگا۔ کتنے مکان بنیں گے۔ پربھوسیوک ''ہاں ہاں'' کرتا جاتا تھا۔ ان باتوں میں جی نہ لگتا تھا۔ کبھی اخبار دیکھنے لگتا۔ کبھی کوئی کتاب الٹنے پلٹنے لگتا۔ کبھی اٹھ کر برآمدہ میں چلا جاتا۔ لیکن انہماک باریک بیں نہیں ہوتا۔ مقرر اپنی تقریر کے جوش میں یہ کب دیکھتا ہے کہ سامعین میں کتنوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ پربھوسیوک کو اس وقت ایک نیا عنوان سوجھا تھا اور اس پر نظم لکھنے کے لیے وہ بیتاب ہو رہا تھا۔ نئی نئی تشبیہیں نئی نئی بندشیں کسی چشمہ پر بہہ کر آنے والے پھولوں کی طرح اس کے دماغ میں دوڑتی چلی آرہی تھیں۔ وہ ان کو جمع کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بار آکر ایک اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔ بارہ بجے تک وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ نہ بیٹھتے بنتا تھا۔ نہ اٹھتے یہاں تک کہ اسے جھپکیاں آنے لگیں۔ جان سیوک نے بھی اب آرام کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن جب پربھو سیوک پلنگ پر گیا تو نیند روٹھ چکی تھی۔ کچھ دیر تک تو اس نے اسے منانے کی کوشش کی پھر لیمپ کے سامنے بیٹھ کر اسی عنوان پر نظم لکھنے لگا۔ ایک لمحہ بعد وہ کسی دوسری ہی دنیا میں تھا۔ وہ دیہاتیوں کی طرح صرافہ میں پہنچ کر اس کی چمک دمک پر فریفتہ نہ ہو جاتا تھا۔ اگر اس دنیا کی ہر چیز مزیّن معطر ،دلکش، اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مگر کتنی ہی چیزوں کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ ان پر صرف سنہرا پرت چڑھا ہوا ہے۔ اصل میں وہ یا تو پرانی ہے یا مصنوعی۔ ہاں جب اسے واقعی نیا جواہر مل جاتا تھا تو اس کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ صناع اپنی صنعت کا بہترین نقاد ہو تا ہے۔ پربھو سیوک کے تخیل نے کبھی اتنی

بلند پروازی نہ دکھائی تھی۔ ایک ایک شعر لکھ کر وہ اسے گا گا کر پڑھتا اور جھومتا۔ جب نظم ختم ہوگئی تو وہ سوچنے لگا دیکھوں شعرائے وقت اسے کتنا پسند کرتے ہیں۔ اڈیٹروں کی تعریف کی تو کوئی وقعت نہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سخن فہم ہوں۔ کسی نئے ناآشنا شاعر کی بڑھیا سے بڑھیا نظم قبول نہ کریں گے۔ مگر پرانے شعرا کی سڑی گلی، گھٹیا اور بھرتی والی نظمیں بھی منظور کر لیں گے۔ شعراء کا یہ حال کہ وہ سخن فہم ہوتے ہوئے بھی کنجوس ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے موٹے تک بندوں کی چاہے تعریف کردیں مگر جسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کنور صاحب تو ضرور بھڑک جائیں گے۔ کاش ونے سنگھ یہاں ہوتے تو میری قلم چوم لیتے۔ کل کنور صاحب سے کہوں گا کہ میرے کلام کا مجموعہ شائع کر دیجیے۔ زمانہ حال کے نئے طرز والے شعراء میں تو کسی کو مجھ سے مقابلہ کرنے گا دعوی ہو ہی نہیں سکتا اور پرانے طرز کے شعراء سے میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ میرے اوران کے تخیل کے دائرے جدا جدا ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی دلکشی ہے۔ عروض کی کوئی غلطی نہیں۔ کھوجنے پر کوئی نقص نہ ملے گا۔ لیکن مضمون آفرینی کا نام ہی نہیں۔ اصلیت کا کہیں پتہ نہیں۔ وہی پرانی زمینیں ہیں، وہی پامال مضامین خیالات کی تازگی عموما نظر نہیں آتی۔ دس بیس اشعار پڑھنے پر کہیں ایک بات ملتی ہے۔ یہاں تک کہ تشبیہیں بھی وہی پرانی جو پرانے شاعروں نے باندھ رکھی ہیں۔ میری زبان اتنی شستہ نہ ہو لیکن بھرتی کے لیے تو میں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ ایسا لکھنے سے فائدہ کیا؟

صبح وہ منہ ہاتھ دھو کر اور نظم کو جیب میں رکھ کر بلا ناشتہ کیے ہوئے گھر سے چلا۔ تو جان سیوک نے پوچھا۔ کیا ناشتہ نہ کروگے۔ اتنے سویرے کہاں جاتے ہو؟

پربھوسیوک نے بے رخی سے جواب دیا۔ ذرا کنور صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔

جان سیوک: تو ان سے کل کی تجویز کے متعلق گفتگو کرنا۔ اگر وہ متفق ہوجائیں تو پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہو۔

مسز سیوک: وہی چرچ کے بارے میں نا؟

جان سیوک: اجی نہیں۔ تمھیں اپنے چرچ ہی کی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے تجویز کیا ہے کہ پانڈے پور کی بستی خالی کرالی جائے اوروہیں قلیوں کے مکانات تعمیر کرائے جائیں۔

اس سے بہتر وہاں کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی ۔
پربھوسیوک: رات کو تو آپ نے اس بستی کے لینے کا تذکرہ نہ کیا تھا۔
جان سیوک: نہیں۔ آؤ ذرا یہ نقشہ دیکھو بستی کے باہر کی طرف کافی زمین نہیں ہے۔ ایک طرف سرکاری پاگل خانہ ہے۔ دوسری طرف رائے صاحب کا باغ۔ تیسری طرف ہماری مل۔ بستی کے سوا اور جگہ ہی کہاں ہے؟ اور پھر بستی ہی کون سی بڑی، مشکل سے پندرہ بیس یا زیادہ سے زیادہ تیس گھر ہوں گے۔ ان کا معاوضہ دے کر زمین لینے کی کیوں نہ کوشش کی جائے؟
پربھوسیوک: اگر بستی کو اجاڑ کر مزدوروں کے لیے مکانات بنوانے ہیں تو رہنے دیجیے۔ کسی نہ کسی طرح گزر تو ہو ہی رہا ہے۔
جان سیوک: اگر ایسی بستیوں کی حفاظت کا خیال کیا گیا ہوتا تو آج یہاں ایک بنگلہ بھی نظر نہ آتا۔ یہ بنگلے اس میں نہیں بنے ہیں۔
پربھوسیوک: مجھے ایسے بنگلے سے جھونپڑا ہی پسند ہے۔ جس کے لیے کئی غریبوں کے گھر گرانے پڑیں۔ میں کنور صاحب سے اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ آپ خود کہیے گا۔
جان سیوک: یہ تمھاری پست ہمتی ہے میں اسے قناعت اور رحم کہہ کر تمھیں دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ تم زندگی کی آسائشیں تو چاہتے ہو۔ ہم نے تمھیں عملی طریقہ پر کبھی دولت و اقتدار سے متنفر ہوتے نہیں دیکھا تم اچھے سے اچھا مکان، اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا کپڑا چاہتے ہو لیکن بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی چاہتے ہو کہ تمھارے منھ میں کوئی شہد اور شربت ٹھکا دے۔
پربھو سیوک: رسم ورواج سے مجبور ہو کر انسان کو اکثر اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑتا ہے۔
جان سیوک: جب آسائشوں کے لیے تم رسم ورواج سے مجبور ہوجاتے ہو تو آسائشوں کے وسائل کے لیے کیوں انھیں باتوں سے مجبور نہیں ہوتے؟ تم دل اور زبان سے موجودہ طرز معاشرت کی کتنی ہی برائی کیوں نہ کرو۔ مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔ تم اس بارے میں لکچر دو۔ نظمیں لکھو مضامین تیار کرو۔ میں خوش ہو کر نہیں پڑھوں گا اور تمھاری تعریف کروں گا۔ لیکن عملی دائرہ میں آکر ان خیالات کو اسی طرح بھول جاؤ

جیسے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر موٹر پر سیر کرتے وقت تم قناعت ایثار اور نفس کشی کے اصولوں کو بھول جاتے ہو۔

پربھو سیوک اور کتنے ہی آسائش پسندوں کی طرح اصولاً جمہوریت کے قائل تھے۔ جن حالات میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ جن طریقوں سے ان کے دماغی اور روحانی تربیت ہوئی تھی ان سے آزاد ہو جانے کے لیے جس اخلاقی جرات کی جس طاقت کی ضروت ہے اس سے وہ محروم تھے۔ وہ خیالی دائرہ میں ایثار کے جذبات کوجگہ دے کر خوش ہوتے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔ انھیں شاید کبھی سوجھا ہی نہ تھا کہ ان جذبات کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ وہ باقاعدگی کے اتنے پابند نہ تھے کہ اپنی آسائیشوں کو ان جذبات پر قربان کر دیتے۔ جمہوریت ان کے لیے تفریح کا ایک مسئلہ تھا اور بس۔ آج تک کبھی کسی نے ان کے طرز عمل کی تنقید نہ کی تھی کسی نے انھیں طنز کا نشانہ نہ بنایا تھا۔ اور دوستوں پر اپنی آزاد خیالی کی دھاک جمانے کے لیے ان کے ویسے خیالات ہی کافی تھے۔ کنور بھرت سنگھ کے ترک تعلق اور ایثار کا ان پر اثر نہ ہوتا تھا کہ وہ ان کو زیادہ انونچے درجے کا انسان سمجھتے تھے۔ اشرفیوں کی تھیلی مخمل کی ہو یا کھدّر کی زیادہ فرق نہیں۔ والد کی زبان سے یہ طنز سن کر ایسا تلملا اٹھے۔ گویا تازیانہ لگایا گیاہو۔ آگ چاہے پھوس کو نہ جلا سکے۔ آہنی کیل چاہے مٹی میں نہ سما سکے۔ کانچ چاہے پتھر کی چوٹ سے نہ ٹوٹ سکے۔ طنز شاید ہی کبھی دل کو محرک کرنے اس میں چبھنے اور اسے چوٹ پہنچانے میں ناکامیاب ہوتا ہو۔ خصوصا جب وہ اس آدمی کی زبان سے نکلے جو ہماری زندگی کو بنایا بگاڑ سکتا ہو۔ پربھوسیوک کو گویا کالی ناگن نے ڈس لیا جس کے کاٹے کو لہر بھی نہیں آتی۔ ان کی سوئی ہوئی غیرت جاگ اٹھی۔ انھیں اپنی پستی کا علم ہوا۔ کنور صاحب کے یہاں جانے کو تیار تھے۔ گاڑی تیار کرائی تھی۔ مگر وہاں نہ گئے۔ آکر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اتنے دنوں تک مغالطہ میں پڑا رہا بلکہ اس خیال سے کہ والد کو میرا رہنا شاق گزرتا ہے۔'' ان باتوں کے سننے پر اب میرے لیے ڈوب مرنے کی بات ہوگی۔ اگر میں ان پر اپنی زندگی کا بار ڈالوں۔ مجھے خود اپنی معاش کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ انھیں کیا معلوم نہیں تھا کہ میں رسم ورواج سے مجبور ہو کر ہی اس عیش پسندی میں پڑا ہوا ہوں؟

ایسی حالت میں مجھے ان کا طعنہ دینا سراسر بے انصافی ہے۔ اتنے دنوں تک نقلی زندگی بسر کرنے کے بعد اب میرے لیے یکایک اپنا طرز معاشرت تبدیل کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میرے دل میں ایسے خیالات پیدا ہوئے۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے میں کم از کم اوروں کی طرح خودغرض اور لالچی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں بے فائدہ اس قدر افسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ان سے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ انھیں شاید میرے چلے جانے سے رنج بھی نہ ہوا ہوگا۔ انھیں خوب معلوم ہوگیا ہے۔ میری ذات سے ان کی دولت پرستی آسودہ نہیں ہوسکتی۔ آج یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ بس یہی ٹھیک ہے چل کر کنور صاحب سے کہتا ہوں کہ مجھے بھی رضاکاروں میں شامل کر لیجیے۔ کچھ دنوں تک اس زندگی کا لطف بھی حاصل کروں۔ دیکھوں مجھ میں اور بھی کسی کام کی قابلیت ہے یا صرف نظم ہی لکھ سکتا ہوں۔ اب کوہستانی چوٹیوں کی سیر کروں گا۔ دیہاتوں میں گھوموں گا۔ قدرتی مناظر کو دیکھوں گا۔ روز نیا دانہ، نیا پانی، نئی تفریح، نئے منظر اس سے زیادہ مسرت خیز اور کون زندگی ہوسکتی ہے؟ تکلیف بھی ہوگی۔ دھوپ ہے، بارش ہے، سردی ہے، خوف ناک جانور ہیں۔ مگر تکلیفوں سے تو میں کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ الجھن تو مجھے خانہ داری کے جھنجھٹوں سے ہوتی ہے۔ یہاں کتنی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ روٹیوں کے لیے دوسروں کی غلامی اپنی خواہش کو دوسروں کا محتاج بنا دیا! نوکر اپنے آقا کو دیکھ کر کیسا دبک جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر کتنا انکسار کتنا خوف چھا جاتا ہے۔ میں اپنی آزادی کی اب سے زیادہ قدر کرنا سیکھوں گا۔''

دوپہر کو جب گھر کے سب لوگ پنکھوں کے نیچے آرام سے سوئے تو پھر پربھوسیوک نے چپکے نکل کر کنور صاحب کے گھر کا راستہ لیا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ کپڑے اتاردوں اور صرف ایک کرتہ پہن کر چلا جاؤں۔ مگر ایسے پھٹے جاموں گھر سے کبھی نہ نکلا تھا۔ کپڑے بدل ڈالنے کے لیے شاید خیالات بدل ڈالنے سے زیادہ اخلاقی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس نے صرف اپنی نظموں کے بیاض لے لی اور چل کھڑا ہوا۔ اسے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ ذرا بھی پشیمانی نہ تھی۔ ایسا خوش تھا جیسے قید سے چھوٹا ہو۔ '' آپ لوگوں کو اپنی دولت مبارک ہو۔ پاپا نے مجھے بالکل بے غیرت، بے حس اور آرام پسند سمجھ رکھا ہے۔ جبھی تو ذرا سی بات پر ابل پڑے۔ اب انھیں معلوم ہو

جائے گا کہ میں بالکل مردہ نہیں ہوں۔

کنور صاحب دوپہر کو سونے کے عادی نہ تھے۔ فرش پر لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ پربھوسیوک جا کر بیٹھ گئے۔ کنور صاحب نے کچھ نہ پوچھا کیسے آئے کیوں اداس ہو۔ نصف گھنٹہ تک بیٹھے رہنے کے بعد بھی پربھوسیوک کو ان سے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ۔ کوئی تمہید نہ سوجھتی تھی۔ کنور صاحب آج گم سم کیوں ہیں ؟ کیا میری صورت سے تاڑ تو نہیں گئے کہ کچھ حاجت لے کر آیا ہے؟ یوں تو مجھے دیکھتے ہی خوش ہو جاتے تھے۔ دوڑ کر سینہ سے لگا تے تھے۔ آج مخاطب ہی نہیں ہوتے۔ دوسروں کا منہ تاکنے کی یہ سزا ہے۔ میں بھی گھر سے چلا تو ٹھیک دوپہر کو جب چڑیاں تک گھونسلوں سے نہیں نکلتیں۔ آنا تھا تو شام کو آتا۔ اس جلتی ہوئی دھوپ میں کوئی غرض کا باؤلا ہی گھر سے نکل سکتا ہے۔ خیر یہ پہلا تجربہ ہے۔ وہ مایوس ہو کر چلنے کے لیے اٹھے کہ بھرت سنگھ بولے۔ کیو ں کیوں جلدی کیا ہے؟ کیا اس لیے کہ میں نے باتیں نہیں کیں؟ باتوں کی کمی نہیں ہے۔ اتنی باتیں تم سے کرنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شروع کیوں کر کروں۔ تمھاری رائے میں ونے سنگھ نے ریاست کا پلہ پکڑنے میں غلطی کی؟

پربھوسیوک نے پس وپیش میں پڑ کر کہا۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے۔

کنور: صاحب اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے برا کیا۔ اس کی ماں کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ تو اتنی برہم ہیں کہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے جو روش اختیار کی ہے اس پر شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شاید ان حالتوں میں میں بھی یہی کرتا۔ صوفیہ سے اسے محبت نہ ہوتی تو بھی اس موقع پر رعایا نے جو بغاوت کی وہ اس کے جمہوریت کے اصولوں کو متزلزل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر جب یہ مسلمہ ہے کہ صوفیہ کی محبت اس کی رگ رگ میں سرائت کر گئی ہے تو اس کا طرز عمل صرف قابل عفو نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔ وہ مذہب تو محض جماعتی ہے جس کی مدد سے اپنی برادری کے باہر شادی کرنا ممنوع ہو کیونکہ اس سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مذہب اور معرفت دونوں مترادف ہیں اوراس نقطہ خیال سے دنیا

میں صرف ایک مذہب ہے۔ ہندو، مسلمان ، عیسائی، یہودی ، بدھ، یہ مذہب نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف اغراض والی گروہ بندیاں ہیں جن سے نقصان کے سوا آج تک کسی کو کچھ نہیں پہنچا۔ اگر ونے اتنا خوش نصیب ہو کہ صوفیہ سے رشتۂ عقد قائم کر سکے۔ تو کم از کم مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔

پربھوسیوک: مگر آپ جانتے ہیں اس معاملہ میں رانی صاحبہ جس قدر سخت ہیں اتنا ہی میری ماما بھی ہیں۔

کنور: اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہ دونوں انمول جواہر مذہب کے ہاتھوں مٹی میں مل جائیں گے۔

پربھوسیوک: میں تو خود ان جھگڑوں سے اتنا تنگ آگیا ہوں کہ میں نے گھر سے الگ ہو جانے کا مصمم قصد کر لیا ہے۔ گھر کی مذہبی آب وہوا معاشرتی قیود سے میری روح کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گھر سے نکل جانے کے سوا اب مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے تجارت سے پیشتر ہی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور اب اتنے دنوں کے تجربہ کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہی ہو گئی ہے۔

کنور: لیکن تجارت تو کئی تہذیب کا سب سے بڑا جزو ہے۔ تمھیں اس سے کیوں اس قدر نفرت ہے؟

پربھو سیوک: اس لیے کہ تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جتنی خود غرضی اور مردم آزاری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا انہماک ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اور زندگی کی کشمکش میں اس سے زیادہ نہیں پڑنا چاہتا جتنا میرے فن کی تکمیل اور اس میں واقفیت کا رنگ لانے کے لیے کافی ہو۔ شعراء بالعموم تنہائی پسند ہی ہوا کیے ہیں مگر اس سے ان کی شاعری میں کوئی نقصان نہیں آنے پایا۔ ممکن تھا کہ وہ زندگی کا وسیع اور کافی تجربہ حاصل کر کے اپنے کلام کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے لیکن اس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زندگی کی کشمکش میں پڑ جانے سے ان کے تخیل میں کمی واقع ہو جاتی۔ ہومر اندھا تھا۔ سور بھی اندھا تھا۔ ملٹن بھی اندھا تھا۔ مگر یہ سبھی آسمان کے روشن ستارے ہیں۔ والمیک تلسی جیسے شہرہ آفاق شعرا دنیا سے الگ کٹیوں میں بسنے والے لوگ تھے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی

سے ان کے کلام میں نقص آ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ میرے خیالات کیسے ہوں گے۔ مگر اس وقت دولت پرستی سے بیزار ہو رہا ہوں۔

کنور: تم تو اتنے بیزار کبھی نہ تھے۔ آخر بات کیا ہے؟

پربھو سیوک نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ اب تک عملی زندگی کے رموز سے واقف نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ واقعی حالت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ تجارت کچھ نہیں ہے۔ اگر مردم آزاری نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک انسانوں کو جانور سمجھنا اوران سے اسی طریقہ پر برتاؤ کرنا اس کا اصل اصول ہے۔ جو یہ نہیں کر سکتا وہ کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا۔ کارخانہ ابھی بن کر تیار نہیں ہوا اور توسیع اراضی کی ضرورت پیدا ہوگئی۔ مستری اور کاریگروں کے لیے بستی میں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھنے لگی تو وہاں گور بھی نہ ہوسکے گا۔ اس لیے پاپا کی رائے ہے کہ اسی قانونی دفعہ کے مطابق پانڈے پور پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ راجہ مہیندر کمار کی پاپا سے دوستی ہے۔ اور موجودہ حاکم ضلع مسٹر سینا پت رئیسوں سے اتنا ہی ربط ضبط رکھتے ہیں۔ جتنا مسٹر کلارک ان سے دور رہتے تھے۔ پاپا کی تجویز بلا کسی دقت کے منظور ہو جائے گی۔ اور محلہ والے جبراً نکال دیے جائیں گے۔ مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں اسے روک نہیں سکتا مگر اتنا تو کرسکتا ہوں کہ اس سے بالکل الگ رہوں۔

کنور: تمھارے خیال میں کمپنی کو نفع ہوگا؟

پربھوسیوک: میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی سال ۲۵ فی صدی نفع ہوگا۔

کنور: تو کیا تم نے کارخانہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا؟

پربھوسیوک: ہاں پورا فیصلہ کر لیا۔

کنو: تمھارے پاپا کام سنبھال سکیں گے؟

پربھوسیوک: پاپا تو اس قسم کے نصف درجن کارخانوں کو سنبھال سکتے ہیں۔ ان میں عجیب قابلیت ہے۔ زمین کی تجویز بہت جلد انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوگی۔ میری آپ سے یہ خاص التجا ہے کہ آپ اسے منظور نہ ہونے دیں۔

کنور: (مسکرا کر) بڈھا آدمی اتنی آسانی سے نئی تعلیم نہیں حاصل کرسکتا۔ بوڑھا طوطا رام رام کہنا نہیں سیکھتا۔ مجھے تو اس میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا کہ بستی والوں کو معاوضہ

دے کر زمین لے لی جاوے۔ ہاں معاوضہ مناسب ہونا چاہیے۔ جب تم کارخانہ سے الگ ہی ہو رہے ہو تو تمھیں ان جھگڑوں سے کیا واسطہ؟ یہ تو دنیا کے دھندے ہیں ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

پربھو سیوک: تو آپ اس تجویز کی مخالفت نہ کریں گے؟

کنور: میں کسی ایسی تجویز کی مخالفت نہ کروں گا جس سے کارخانہ کا نقصان ہو۔ کارخانہ سے میری غرض کا تعلق ہے ۔ میں اس کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ ہاں تمھارا وہاں سے نکل آنا میری سیوا سمتی کے لیے مبارک فال ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ سمتی کے منیجر ڈاکٹر گنگولی ہیں مگر کچھ تو سن رسیدہ ہونے کے سبب اور کچھ کونسل کے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم اس بار کو اپنے کندھوں پر لو۔ سمتی کی کشتی اس وقت منجھدار میں ہے۔ ونے کی روش نے اسے اس خوفناک حالت میں ڈال دیا ہے۔ تمھیں ایشور نے علم عقل حوصلہ سب کچھ دیا ہے۔ تم چاہو تو سمتی کو بچا سکتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگے۔

پربھوسیوک کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ وہ اپنے کو اس عزت کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ بولے میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ مجھ جیسا ناتجربہ کار اور سست آدمی سمتی کو ترقی نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کی نوازش ہے کہ مجھے اس قابل خیال کرتے ہیں۔ میرے لیے توصف ہی کافی ہے۔

کنور صاحب نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تم جیسے آدمیوں کو صف میں رکھوں تو افسر کہاں سے لاؤں؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں ڈاکٹر گنگولی کے ساتھ رہ کر تم اس کام میں ہوشیار ہو جاؤگے۔ شریف لوگ ہمیشہ اپنی قابلیت کی بے قدری کرتے ہیں۔ پر میں تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔ تم میں عجیب برقی قوت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی تم سمجھتے ہو۔ عربی گھوڑا ہل میں نہیں چل سکتا۔ اس کے لیے تو میدان ہی چاہیے۔ تمھاری آزاد روح کارخانہ میں تنگ ہوتی جارہی تھی۔ دنیا کے وسیع میدان میں نکل کر اس کے پر لگ جائیں گے۔ میں نے ونے کو اس عہدہ کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔ مگر اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے اب اس پر اعتماد نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جماعت

کو ایسی عمدہ حالت میں چھوڑ جاؤں کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے اپنا کام کرتی رہے۔ ایسا نہ ہوا تو میں اطمیان سے مر بھی نہ سکوں گا۔ تمھارے اوپر مجھے بھروسہ ہے کیونکہ تم بے غرض ہو۔ پربھوسیوک میں نے اپنی زندگی کا بہت بُرا استعمال کیا ہے۔ اب پیچھے پھر کر اس پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی جز ایسا نہیں دکھائی دیتا جس پر میں فخر کر سکوں۔ ایک ریگستان ہے جہاں سبزی کا نشان نہیں اس جماعت پر میری زندگی بھر کی بداعمالیوں کا بار لدا ہوا ہے۔ یہی میرے کفارہ کا ذریعہ اور میری نجات کا وسیلہ ہے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا یہ خدمتی گروہ دنیا میں کچھ دکھائے۔ اس میں خدمت کا جوش، قربانی کی لگن ہو، قومی عزت کا گھمنڈ ہو، جب میں ایسے لوگوں کو ملک پر قربان ہوتے دیکھتاہوں جن کے پاس جان کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو مجھے اپنے اوپر رونا آتا ہے کہ میں نے سب کچھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کیا میرے لیے اس سے زیادہ مہلک اور کوئی صدمہ نہیں ہے کہ یہ جماعت اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ میں اس کے لیے اپنا سب کچھ ارپن کرنے کو تیار ہوں میں نے دس لاکھ روپے اس کھاتہ میں جمع کر دیے ہیں۔ اور ارادہ ہے کہ اس پر ایک لاکھ سالانہ کا اضافہ کرتا رہوں گا۔ کم از کم پانچ سو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں دس سال بھی اور زندہ رہا تو شاید میری یہ مراد پوری ہو جاوے۔ اندردت میں اور سب اوصاف تو ہیں مگر وہ متحمل مزاج نہیں ہے۔ اس وجہ سے مرا دل اس پر نہیں جمتا۔ میں تم سے باصرار......

ڈاکٹر گنگولی آپہنچے اور پربھو سیوک کو دیکھ کر بولے۔ اچھا تم یہاں کنور صاحب کو منتر دے رہا ہے۔ تمھارا پاپا مہیندر کمار کو پٹی پڑھا رہا ہے۔ پر میں نے تو صاپھ صاپھ کہہ دیا کہ ایسا بات نہیں ہوسکتا۔ تمھارا میل ہے۔ اس کا پھائدہ نکسان تم کو اور تمھارے حصہ داروں کو ہوگا۔ گریبوں کو کیوں ان کے گھر سے نکالتا ہے۔ پر میری کوئی نہیں سنتا۔ ہم کڑوابات کہتا ہے نا۔ وہ کاہے کو اچھا لگے گا۔ ہم کونسل میں اس پر سوال کرے گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ لوگ اپنے پھائدہ کے لیے دوسروں پر انیائے کریں۔ سہر کا رئیس لوگ ہم سے ناراج ہو جائے گا۔ ہم کو پرواہ نہیں ہے۔ ہم تو وہاں وہی کرے گا جو ہمارا آتما کہے گا۔ تم کو دوسرے کسم کا آدمی چاہیے تو بابا ہم سے استیپھا (استعفاء) لے لو۔ پر ہم پانڈے پور کو اجڑنے نہ دے گا۔

کنور: یہ بے چارے تو خود ہی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں۔ آج اسی بات پر باپ بیٹے میں بدمزگی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ گھر سے چلے آئے ہیں اور کارخانہ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔

گنگولی: اچھا ایسا بات ہے۔ بہت اچھا ہوا۔ ایسا بچاروان (عقلمند) لوگ میل کا کام نہیں کر سکتا۔ ایسا لوگ میل میں جائے گا تو ہم لوگ کہاں سے آدمی لائے گا؟ پربھوسیوک : ہم بوڑھا ہوگیا۔ کل مرجائے گا۔ تم ہمارا کام کیوں نہیں سنبھالتا؟ ہمارا والنٹیر لوگ تمھارا رسپکٹ کرتا ہے تم ہمیں اس بوجھ سے ہلکا کر سکتا ہے۔ بڈھا آدمی اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ جوش تو اس کے بس کا بات نہیں۔ ہم تم کو اب نہ چھوڑے گا۔ کونسل میں اتنا کام ہے کہ ہم کو اس کام کے لیے پھرصت ہی نہیں ملتا۔ ہم کونسل میں نہ گیا ہوتا تو اودے پور میں یہ سب کچھ نہیں ہونے پاتا ہم جا کر سب کو شانت کردیتا۔ تم اتنا ودیا پڑھ کر اس کو دھن کمانے میں لگائے گا۔ چھی چھی!

پربھو سیوک: میں تو خادموں میں بھرتی ہونے کے لیے گھر سے چلا ہی آیاہوں پر میں سمتی کا افسر ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ عہدہ تو آپ ہی کے لیے موزوں ہے۔ مجھے سپاہیوں ہی میں رہنے دیجیے۔ میں اسی کو اپنے لیے عزت کی بات سمجھوں گا۔

گنگولی: (ہنس کر) ہاہاکام تو ناکابل لوگ ہی کرتاہے۔ کابل آدمی نہیں کرتا۔ وہ بس باتیں کرتاہے۔ کابل آدمی کا مطلب ہے۔ باتونی آدمی کھالی بات بات۔ جو جتنا ہی بات کرتا ہے اتنا ہی کابل ہوتاہے۔ وہ کام کا ڈھنگ بتادے گا۔ کہاں کون بھول ہو گیا۔ یہ بتادے گا پر کام نہیں کر سکتا۔ ہم ایسا کابل آدمی نہیں چاہتا۔ ہمارے یہاں باتیں کرنے کا کام نہیں ہے۔ ہم تو ایسا آدمی چاہتاہے۔ جو موٹا کھائے۔ موٹا پہنے، گلی گلی اور نگر دوڑے۔ گریبوں کا اپکار کرے۔ مصیبت میں ان کا مدد کرے۔ تو کب سے آئے گا؟

پربھوسیوک: میں تو ابھی سے حاضر ہوں۔

گنگولی: (مسکراکر) تو پہلا لڑائی تم کو اپنے پاپا سے لڑنا پڑے گا۔

پربھوسیوک: میرا خیال ہے کہ پاپا خود ہی اس بات کو ترک کر دیں گے۔

گنگولی: نہیں نہیں۔ وہ کبھی اپنا بات نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو اس سے لڑائی کرنا پڑے

گا۔ تم کو اس سے لڑنا پڑے گا۔ ہماری سمتی نیائے کو سب سے اوپر مانتا ہے۔ نیائے ہم کو ماں باپ سے، دھن دولت سے، نام اور جس (نیک نامی) سے، سب سے بڑھ کر پیارا ہے۔ ہم اور سب کچھ چھوڑے دے گا پر نیائے کو نہ چھوڑے گا۔ یہی ہمارا برت (عہد) ہے۔ تم کو کھوب سوچ بچار کر تب یہاں آنا ہوگا۔

پربھو سیوک: میں نے خوب سوچ بچار کر لیا ہے۔

گنگولی: نہیں نہیں جلدی نہیں ہے۔ کھوب سوچ بچار لو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوگا کہ ایک بار آکر تم پھر بھاگ جائے۔

پربھوسیوک: اب موت ہی مجھے اس جماعت سے جدا کرسکتی ہے۔

گنگولی: مسٹر جان سیوک تم سے کہے گا۔ ہم نیائے انیائے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ تم ہمارا بیٹا ہے۔ ہمارا حکم ماننا تمھارا دھرم ہے تو تم کیا جواب دے گا؟ (ہنس کر) میرا باپ ایسا کہتا تو میں تو اس سے کبھی نہ کہہ سکتا کہ ہم تمھارا بات نہ مانے گا۔ وہ ہم سے بولا تم بیرسٹر ہوجائے۔ ہم انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے بیرسٹر ہو کر آگیا۔ کئی سال تک کچہری جاکر پیپر (کاغذ) پڑھا کرتا تھا۔ جب فادر (باپ) کا ڈیتھ (وفات) ہوگیا تو ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ باپ کے سامنے ہم کو یہ کہنے کا ہمت نہیں ہوا کہ ہم کانون نہیں پڑے گا۔

پربھوسیوک: باپ کی عزت کرنا دوسری بات ہے۔ اور اصول پر کاربند ہونا دوسری بات۔ اگر آپ کے فادر کہتے کہ جاکر کسی کے گھر میں آگ لگا دو تو آپ آگ لگا دیتے؟

گنگولی: نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہم کبھی آگ نہ لگاتا۔ چاہے ہمارا باپ ہمیں کو کیوں نہ جلا دیتا۔ لیکن باپ ایسا حکم دے بھی تو نہیں سکتا۔

دفعتاً رانی جانھوی وارد ہوئیں۔ غم اور غصہ کی تصویر۔ بھویں تنی ہوئیں ماتھے پر شکن ۔ گویا نہا کر پوجا کرنے کے لیے جاتے وقت کتے نے چھولیا ہو۔ گنگولی کو دیکھ کر بولیں۔ آپ کی طبیعت کونسل سے نہیں تھکتی۔ میں تو زندگی سے تھک گئی۔ جو چاہتی ہوں وہ نہیں ہوتا۔ جو نہیں چاہتی وہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! سب کچھ سہا جاتا ہے۔ پر بیٹے کا برا برتاؤ نہیں سہا جاتا۔ خاص کر ایسے بیٹے کا جس کے بنانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی گئی ہو۔ نالایق جسونت نگر کے ہنگامہ میں مرگیا ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔

کنور صاحب اورزیادہ نہ سن سکے۔ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ رانی نے اسی لہجہ میں کہا۔ یہ میرا دکھ کیا سمجھیں گے۔ ان کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔ نفس پرستی کے سامنے انھوں نے کبھی معیار کی پرواہ نہیں کی۔ دیگر رووٴسا کی طرح تن پروری میں مشغول رہے۔ میں نے تو ونے کے لیے سخت ریاضت کی ہے۔ اسے ساتھ لے کر مہینوں پہاڑوں میں پیدل چلی ہوں۔ صرف اس لیے کہ بچپن ہی سے اسے مشکلات کا عادی بناؤں اس کی ایک ایک بات اس کے ایک ایک کام کو غور سے دیکھتی رہی ہوں کہ اس میں برائیاں نہ آجائیں۔ اگر وہ کبھی نوکر پر بگڑا ہے تو اسے فوراً سمجھایاہے۔ کبھی سچائی سے منہ موڑتے دیکھا ہے تو فوراً تنبیہ کی ہے۔ یہ میرے درد دکھ کا حال کیا جانیں گے!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ کی نگاہ پربھوسیوک پر پڑگئی جو گوشہ میں کھڑا کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ ان کی زبان بند ہوگئی۔ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔ صوفیہ کے متعلق جو جو سخت باتیں دل میں تھیں وہ دل ہی میں رہ گئیں۔ صرف گنگولی سے اتنا کہا کہ جاتے وقت مجھ سے مل لیجیے گا اور چلی گئیں۔

(35)

ونے سنگھ آبادی میں داخل ہوئے تو سویرا ہوگیا تھا۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ انھیں دیکھ کر بولی۔ بیٹا! گریب ہوں۔ بن پڑے تو کچھ دے دو۔ دھرم ہوگا۔

نایک رام: سبیرے سبیرے رام نام نہیں لیتی۔ بھیک مانگنے چل کھڑی ہوئی ہے۔ تجھے تو جیسے رات کو نیند ہی نہیں آئی۔ مانگنے کو تو دن بھر ہے۔

بڑھیا: بیٹا دکھیاہوں۔

نایک رام: یہاں سکھیا کون ہے؟ رات بھر بھوکوں مرے معسوک کی گھرکیاں کھائیں۔پیر تو سیدھے پڑتے نہیں۔ تمھیں پیسے کہاں سے دے دیں؟

بڑھیا: بیٹا دھوپ میں مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ سر میں چکرآجاتاہے۔ نئی نئی بپت ہے بھیا۔ بھگوان اس ادھم پاپی ونے سنگھ کا برا کرے۔ اسی کے کارن بڑھاپے میں یہ دن

دیکھنا پڑا۔ نہیں تو بیٹا دوکان کرتا تھا۔ گھر میں رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ کون سا سکھ نہیں تھا؟ تم پردیسی ہو۔ نہ جانتے ہوگے۔ یہیں دنگا ہوگیا تھا۔ میرا لڑکا دوکان سے ہلا تک نہیں پر اس نگوڑے ونے سنگھ نے گواہی دے دی کہ یہ بھی دنگے میں ملا ہوا تھا۔ پولیس ہمارے اوپر بہت دنوں سے دانت لگائے تھی۔ کوئی داؤں نہ پاتی تھی۔ یہ گواہی پاتے ہی دوڑ آگئی۔ لڑکا پکڑ لیا گیا۔ اسے تین سال کی سجا ہوگئی۔ ایک ہجار جریانہ ہوا۔ گھر کی بیس ہزار کی گرہستی تہس نہس ہوگئی۔ گھر میں بہو ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اسی طرح مانگ جانچ کر انھیں پالتی پوستی ہوں۔ نہ جانے اس کلمنہے نے کب کا بیر نکالا۔

ونے نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کو دیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ ایسی روحانی تکلیف انھیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

بڑھیا نے روپیہ دیکھا تو چونک پڑی۔ سمجھی شاید بھول سے دے دیا ہے۔ بولی بیٹا یہ تو روپیہ ہے۔

ونے سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں لے جاؤ میں نے بھول سے نہیں دیا ہے۔ بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دونوں آدمی اور آگے بڑھے تو راستہ میں ایک کنواں ملا۔ اس پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ ایک چھوٹا سا مندر بھی بنا ہوا تھا۔ نایک رام نے سوچا۔ یہیں ہاتھ منہ دھو لیں۔ دونوں آدمی کنوئیں پر گئے تو دیکھا کہ ایک پنڈت جی پیپل کے نیچے بیٹھے پاٹ کر رہے ہیں۔ جب وہ پاٹ کر چکے تو ونے نے پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ سردار نیل کنٹھ آج کل کہاں ہیں؟

پنڈت جی نے سخت لہجہ میں کہا۔ ہم نہیں جانتے۔

ونے: پولیس کے انسپکٹر تو ہوں گے؟

پنڈت: کہہ دیا، میں نہیں جانتا۔

ونے: مسٹر کلارک تو دورہ پر ہوں گے؟

پنڈت: میں کچھ نہیں جانتا۔

نایک رام: پوجا پاٹ میں دیس دنیا کی سدھ ہی نہیں۔

پنڈت: ہاں جب تک منو کامنا (دلی خواہش) نہ پوری ہوجائے تب تک مجھے کسی سے

کچھ سروکار نہیں۔ سیرے سیرے تم نے ملیچھوں کا نام سنا دیا۔ نہ جانے دن کیسے کٹے گا؟

نایک رام : وہ کون سی منوکامنا ہے؟

پنڈت: اپنے اپمان (توہین) کا بدلہ

نایک رام: کس سے؟

پنڈت: اس کا نام نہ لوں گا۔ کسی بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ کاسی سے گریبوں کی سہایتا (مدد) کرنے آیا تھا۔ سینکڑوں گھر اجاڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔اسی کے لیے یہ انشٹھان (پوجا) کر رہا ہوں۔ یہاں آدھا سہر میرا ججمان تھا۔ سیٹھ ساہوکار میرا آدر (عزت) کرتے تھے۔ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ ہاں برائی یہ تھی کہ ناجم کو سلام کرنے نہ جاتا تھا۔ عملوں کی کوئی برائی دیکھتا تو ان کے منہ پر کہہ دیتا۔ اسی سے سب عملے مجھ سے جلتے تھے۔ پچھلے دنوں جب یہاں دنگا ہوا۔ تو سبوں نے اسی بنارس کے گنڈے سے مجھ پر بغاوت کا اپرادھ لگوادیا۔ سجا ہوگئی۔ بینت پڑ گئے۔ جریبانہ ہوگیا۔ آبرو مٹی میں مل گئی۔ اب نگر میں کوئی درواجے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ نراس ہو کر دیوی کی شرن آیا ہوں۔ پورشچرن کا پاٹ کر رہا ہوں۔ جس دن سنوں گا کہ اس ہتیارے پر دیوی نے کوپ کیا۔ اسی دن میری تپسیا پوری ہوجائے گی۔ براہمن ہوں۔ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کون سا ہتھیا رہے؟

ونے کسی شراب خانے سے نکلتے ہوئے پکڑے جاتے تو بھی اتنے شرمندہ نہ ہوتے۔ انھیں اب اس براہمن کی صورت یاد آئی۔ یاد آیا کہ میں نے ہی پولیس کی ترغیب سے اسے پکڑا دیا تھا۔جیب سے پانچ روپے نکالے اورپنڈت جی سے بولے۔ یہ لیجیے میری طرف سے بھی اس بدمعاش کے لیے پورشچرن کا جاپ کر دیجیے گا۔ اس نے مجھے بھی تباہ کر دیاہے۔ میں بھی اس کے خون کا پیاس ہورہاہوں۔

پنڈت: مہاراج آپ کا بھلا ہوگا۔ بیری کے دیہہ (جسم) میں کیڑے نہ پڑجائیں گے تو کہیے گا کہ کوئی کہتا تھا۔ کتوں کی موت مرے گا۔ یہاں سارا نگر اس کا دشمن ہے۔ اب تک اس لیے اس کی جان بچی کہ پولس اس کو گھیرے رہتی ہے۔ مگر کب تک؟ جس دن اکیلا گھر سے نکلا۔ اسی دن دیوی کا اس پرکوپ (قہر) گرا۔ ہے وہ اسی راج میں

کہیں باہر نہیں گیا ہے اور نہ اب بچ کر جا ہی سکتا ہے۔ کال اس کے سر پر کھیل رہا ہے۔ اتنے دکھیوں کی ہائے کیا اکارتھ جائے گی؟

جب یہاں سے اور آگے چلے تو ونے نے کہا۔ پنڈا جی۔ اب جلد ایک موٹر طے کرلو۔ مجھے خوف ہورہا ہے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اپنی جان کا اتنا خوف مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اگر ایسے ہی دو ایک نظارے اور سامنے آئے تو شاید میں خودکشی کرلوں۔ آہ میں کتنا گر گیا ہوں۔ اور اب تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میں نے خدمت کا عہد کیا تھا۔ گھر سے دوسروں کی بھلائی کرنے چلا تھا۔ خوب بھلائی کی۔ شاید یہ لوگ مجھے تمام عمر نہ بھولیں گے۔

نایک رام: بھیا بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ اب اس کا پچھتاوا نہ کرو۔

ونے: نایک رام۔ یہ بھول چوک نہیں۔ ایشور کا قانون ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایشور پاک عہد کرنے والوں کا سخت امتحان لیا کرتے ہیں۔ خادم قوم کا درجہ ان امتحانات میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں ملتا۔ میں امتحان میں فیل ہوگیا۔ بری طرح فیل ہوگیا!

نایک رام نے سوچا تھا کہ ذرا جیل کے داروغہ صاحب سے خیر و عافیت کا حال دریافت کرتے چلیں۔ لیکن موقع نہ دیکھا تو فوراً موٹر سروس کے دفتر میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ دربار نے سب موٹوروں کو ایک ہفتہ کے لیے روک لیا ہے۔

مسٹر کلارک کے کئی دوست باہر سے شکار کھیلنے کو آئے ہوئے تھے۔ اب کیا ہو؟ نایک رام کو گھوڑے پر سوار ہونا نہ آتا تھا اور ونے کو یہ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تو سوار ہو کر چلے اور وہ پیدل۔

نایک رام: بھیا۔ تم سوار ہو جاؤ۔ میری کون؟ ابھی موقع پڑجائے تو دس کوس چل سکتا ہوں۔

ونے: تو میں ایسا کون مرا جاتا ہوں۔ اب رات کی تھکاوٹ دور ہوگئی۔

دونوں آدمیوں نے کچھ ناشتہ کیا۔ اوراودے پور کو روانہ ہوئے۔ آج ونے نے جتنی باتیں کیں اتنی شاید اورکبھی نہ کی تھیں اور وہ بھی نایک رام جیسے لٹھ گنوار سے۔ صوفیہ کی کڑی باتیں اب انھیں بالکل واجبی معلوم ہوتی تھیں۔ بولے۔ پنڈا جی۔ سمجھ لو کہ اگر

دربار نے ان سب قیدیوں کو چھوڑ نہ دیا جو میرے میری شہادت سے سزا یاب ہوئے ہیں۔ تو میں اپنا منہ کسی کو نہ دکھلاؤں گا۔ میرے لیے یہی ایک امید باقی رہ گئی ہے۔ تم گھر جاکر ماتا جی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی غلطی پر کتنا ملول کتنا نادم تھا۔

نایک رام: بھیا تم گھر نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا۔ اب تو جہاں تم ہو وہیں میں بھی ہوں۔ جو کچھ بیتے گی دونوں ہی پر بیتے گی۔

ونے: بس تمھاری یہی بات بری معلوم ہوتی ہے۔ تمھارا اور میرا کون سا ساتھ ہے؟ میں پاپی ہوں۔ مجھے اپنے پاپوں کا پراشچت کرنا ہے۔ تمھارے ماتھے پر کوئی کلنک نہیں ہے۔ تم اپنی زندگی کیوں برباد کروگے؟ میں نے اب تک صوفیہ کو نہیں پہچانا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کتنی فراخ دل ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں شکایت صرف اس بات کی ہے کہ اس نے مجھے اپنا نہ سمجھا۔ وہ اگر سمجھتی کہ یہ میرے ہیں تو میری ایک ایک بات کیوں پکڑتی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر کیوں جاسوسوں کی طرح کڑی نگاہ ڈالتی؟ وہ یہ جانتی ہے کہ میں ٹھکرادوں گی تو یہ جان پر کھیل جائیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس نے میرے ساتھ اتنی بیدردی کیوں کی؟ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ انسان سے خطائیں ہوتی ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنا سمجھ کر ہی اس نے مجھے یہ سخت سزا دیا ہو۔ دوسروں کی برائیوں کی ہمیں پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنوں ہی کو بری راہ چلتے دیکھ کر سزادی جاتی ہے۔ مگر بیگانوں کو سزا دیتے وقت اس کا تو خیال رکھنا چاہیے کہ یگانگت کا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ یہ سوچ کر مجھے ایسا معلوم ہوتاہے کہ اس کادل مجھ سے ہمیشہ کے لیے پھر گیا۔

نایک رام: عیسائن ہے نا؟ کسی انگریز کو گانٹھے گی۔

ونے: تم بالکل بے ہودہ ہو۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میں کہتاہوں وہ اب عمر بھر کنواری رہے گی۔ تم اسے کیا جانو؟ بات سمجھو نہ بوجھو۔ جھٹ کہہ اٹھے کہ کسی انگریز کو گانٹھے گی۔ میں اسے کچھ کچھ جانتا ہوں۔ میرے لیے اس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کیا کیا نہیں سہا؟ جب اس کی محبت یاد آتی ہے تو دل و جگر میں ایسا درد ہوتا ہے کہ کہیں پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دینے کو جی چاہتا ہے۔ اب وہ ناقابل فتح ہے۔ اس نے اپنی محبت کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اس جنم میں نہ جانے کون سی تپسیاں کی تھی جس کا اچھا پھل اتنے دنوں تک میں نے بھوگا۔ اب کوئی دیوتا بن کر بھی اس کے سامنے آئے

تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ جنم سے عیسائن بھلے ہی ہو مگر عادات و اطوار سے وہ آریہ استری ہے۔ میں نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ بھی ڈوبا، اسے بھی لے ڈوبا۔ اب تم دیکھنا کہ ریاست کو کیسا وہ ناکوں چنے چبواتی ہے۔ اس کی زبان میں وہ طاقت ہے کہ آن کی آن میں ریاست کا نام و نشان مٹا سکتی ہے۔

نایک رام: ہاں ہے تو ایسی ہی آفت کا پرکالہ۔

ونے: پھر وہی حماقت! میں تم سے کتنی ہی بار کہہ چکا کہ میرے سامنے اس کا نام عزت سے لیا کرو۔ میں اس کے متعلق کسی کی زبان سے ایک بھی نامناسب لفظ نہیں سن سکتا۔ وہ اگر مجھے برچھیوں سے چھیدے تو اس کے لیے میرے دل میں نفرت کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ محبت میں انتقام نہیں ہوتا۔ محبت تو بے حد عفو، بیحد فیاضی بیحد تحمل سے معمور ہوتی ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے دوپہر تک نصف منزل طے کی۔ دوپہر کو آرام کرنے لگے تو ایسے سوئے کہ شام ہوگئی۔ رات کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔ سرائے موجود تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ ہاں نایک رام کو آج زندگی میں پہلی دفعہ بھنگ نہ ملی اور وہ بہت بے چین رہے۔ ایک تولہ بھنگ کے لیے ایک سے دس روپے تک دینے کو تیار تھے۔ مگر آج نصیبوں میں فاقہ ہی لکھا تھا۔ ہر طرح مجبور ہو کر وہ سر پکڑے ہوئے کنوئیں کی جگت پر آبیٹھے۔ گویا گھر سے کسی آدمی کو کریا کرم کر کے آئے ہوں۔

ونے نے کہا ایسی عادت کیوں ڈالتے ہو کہ بھنگ کے بغیر ایک روز بھی رہنا مشکل ہو؟ چھوڑو اسے بھلے آدمی۔ مفت جان دیتے ہو۔

نایک رام: بھیا۔ اس جنم میں تو چھوٹتی نہیں۔ آگے کی رام جانے۔ یہاں تو مرتے وقت بھی ایک گولا سرہانے رکھ لیں گے۔ وصیت کر جائیں گے کہ ایک سیر بھنگ ہماری چتا میں ڈال دینا۔ کوئی پانی دینے والا تو ہے نہیں۔ پر جو کبھی بھگوان نے وہ دن دکھایا تو لڑکوں سے کہہ جاؤں گا کہ پنڈے کے ساتھ بھنگ کا پنڈا بھی ضرور دینا۔ اس کا مجا وہی جانتا ہے جو اسے پیتا ہے۔

نایک رام کو آج کھانا اچھا نہ معلوم ہوا۔ نیند نہ آئی۔ بدن ٹوٹتا رہا۔ غصہ میں سرائے والے کو خوب گالیاں دیں۔ مارنے دوڑے۔ بنئے کو ڈانٹا کہ صاف شکر کیوں

نہیں دی۔ حلوائی سے الجھ پڑے کہ مٹھائیاں کیوں خراب دیں؟ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ چل کر سیدھے سردار صاحب سے کہتا ہوں۔ بچا دوکان نہ لٹوالوں تو کہنا۔ جانتے ہو میرا نام ہے نایک رام! یہاں تیل کی بو سے گھن ہے۔ حلوائی پیروں پڑنے لگا پر انھوں نے ایک نہ سنی۔ یہاں تک کہ دھمکا کر اس سے پچیس روپے اینٹھ لیے۔ لیکن چلتے وقت ونے نے روپے واپس کرادیے۔ ہاں حلوائی کو تاکیدکر دی کہ ایسی خراب مٹھائیاں نہ بنایا کرے۔ اور تیل کی چیز کے گھی کے دام نہ کیا کرے۔

دوسرے روز دونوں آدمی دس بجتے بجتے اودے پور پہنچ گئے۔ پہلاآدمی جو انھیں نظر پڑا وہ خود سردار صاحب تھے۔ وہ ٹمٹم پر بیٹھے ہوئے دربار سے آرہے تھے۔ ونے کو دیکھتے ہی گھوڑا روک دیا اور پوچھا آپ کہاں؟

ونے نے کہا یہیں تو آرہا تھا۔

سردار: کوئی موٹر نہ ملا؟ ہاں نہ ملا ہوگا۔ تو ٹیلی فون کیوں نہ کردیا؟ یہاں سے سواری بھیج دی جاتی۔ فضول ہی اتنی تکلیف اٹھائی۔

ونے: مجھے پاپیادہ چلنے کا محاورہ ہے۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ میں آج آپ سے ملنا چاہتاہوں اور تنہائی میں۔ آپ کب مل سکیں گے؟

سردار: آپ کے لیے وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے چلے آیئے گا بلکہ وہیں ٹھہریے گا بھی۔

ونے: اچھی بات ہے۔

سردار صاحب نے گھوڑے کو چابک لگائی اور روانہ ہوگئے۔ یہ نہ ہو سکا کہ ونے کو بھی بٹھالیتے کیونکہ ان کے ساتھ نایک رام کو بھی بٹھانا پڑتا۔ ونے سنگھ نے ایک تانگا لیا اور ذرا دیر میں سردار صاحب کے مکان پر جاپہنچے۔

سردار صاحب نے دریافت کیا۔ ادھر کئی روز سے آپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ آپ کے ساتھ کے اور لوگ کہاں ہیں؟ کچھ مسز کلارک کا پتہ چلا؟

ونے: ساتھ کے آدمی تو پیچھے ہیں۔ لیکن مسز کلارک کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ساری محنت رائیگاں ہوئی۔ بیرپال سنگھ کا تو میں نے پتہ لگالیا بلکہ اس کا گھر بھی دیکھ آیا پر مسز کلارک کا سراغ نہیں ملا۔

سردار صاحب نے تعجب سے کہا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو جو اطلاع ملی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے مسز کلارک کی ملاقات ہوئی اور اب مجھے آپ سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ دیکھئے میں وہ خط آپ کو دکھلاتا ہوں۔

یہ کہہ کر سردار صاحب میز کے پاس گئے اور ایک موٹے بادامی کاغذ پر لکھا ہوا خط اٹھا لائے۔ لاکر ونے کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ونے نے دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ ان کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنی بات کس طرح بنائیں۔ یہ سمجھ میں نہ آیا۔ نایک رام بھی فرش پر بیٹھے تھے سمجھ گئے کہ یہ پریشان ہیں۔ وہ خود جھوٹ بولنے اور باتیں بنانے میں کافی مشاق تھا۔ بولا۔ کنور صاحب ذرا مجھے دیجیے کس کا خط ہے؟

ونے: اندروت کا۔

نایک رام: اوہو۔ اس پاگل کا خط ہے ! وہی لونڈا نا جو سیوا سمتی میں آکر گایا کرتا تھا؟ اس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ سرکار پگلا ہے۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا ہے۔

سردار: نہیں کسی پاگل لونڈے کی تحریر ایسی نہیں ہوسکتی۔ بڑا ہوشیار ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کے خطوط ادھر کئی روز سے میرے پاس برابر آرہے ہیں۔ کبھی مجھے دھمکاتا ہے۔ کبھی اپدیش دیتا ہے۔ لیکن جو کچھ کہتا ہے مہذب پیرایہ میں۔ ایک لفظ بھی اہانت آمیز نہیں ہوتا۔ اگر یہ وہی اندردت ہے جسے آپ جانتے ہیں تو اور بھی تعجب ہے۔ ممکن ہے اس کے نام سے کوئی دوسرا ہی آدمی خط لکھتا ہو۔ یہ کوئی معمولی تعلیم یافتہ شخص نہیں معلوم ہوتا۔

ونے سنگھ تو ایسے سٹ پٹائے جیسے کوئی نوکر مالک کا صندوق کھولتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ میں نے کیوں جھوٹ کہا؟ مجھے چھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن اندردت کا اس خط سے کیا مقصد ہے؟ کیا مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے؟

نایک رام: کوئی دوسرا ہی آدمی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے حاکموں کو کنور صاحب سے بھڑکاویں۔ کیوں بھیا؟ سمتی میں کوئی اچھا پڑھا لکھا آدمی تھا؟

ونے: سبھی پڑھے لکھے تھے۔ ان میں جاہل ایک بھی نہیں۔ اندروت بھی اعلیٰ درجہ کا تعلیم

یافتہ شخص ہے پر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے دل میں میری جانب سے اتنی کدورت ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے سردار صاحب کو منفعل نگاہوں سے دیکھا۔ جھوٹ کی شکل ہر لمحہ زیادہ خوفناک اور اس کی تاریکی اور بھی زیادہ گھنی ہوتی جاتی تھی۔

ونے نے شرماتے ہوئے کہا: سردار صاحب معاف فرمایئے گا کہ میں آپ سے جھوٹ کہہ رہا تھا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ بلاشک میری ملاقات مسز کلارک سے ہوئی۔ میں اس واقعہ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے ان سے اس بات کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں بہت آرام سے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بے حد اصرار پر بھی وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔

سردار صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ سیاسی معاملات میں وعدہ کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اب مجھے آپ سے واقعی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اگر اس خط سے مجھے ساری باتوں کی خبر نہ مل گئی ہوتی تو آپ نے تو مجھے مغالطہ دینے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آج کل اس کے متعلق گورنمنٹ سے کتنی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ یوں کہیے کہ مسز کلارک کے بخیریت واپس آجانے پر ہی ہماری جملہ کارگزاریوں کا انحصار ہے۔ خیر یہ کیا بات ہے؟ مسز کلارک آئیں کیوں نہیں؟ کیا بدمعاشوں نے انھیں آنے نہ دیا؟

ونے: بیر پال سنگھ تو بڑی خوشی سے انھیں بھیجنا چاہتا تھا۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتا ہے لیکن وہ خود ہی آنے پر تیار نہ ہوئیں۔

سردار: مسٹر کلارک سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ونے: ہوسکتا ہے۔ جس روز بغاوت ہوئی تھی۔ مسٹر کلارک نشہ میں بے ہوش پڑے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چڑھ گئی ہو۔ ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ان سے ملاقات ہوجانے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہم نے جسونت نگر کے باشندوں پر تشدد کرنے میں بہت سی نامنصفانہ باتوں سے کام لیا۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ باغیوں نے مسز کلارک کو یا تو قید کر رکھا ہے یا قتل کر ڈالا ہے۔ اسی خوف کی بنا پرہم نے جبر و تشدد سے کام لیا۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا۔ مگر دو باتوں میں سے ایک بھی سچ نہ نکلی۔ مسز کلارک زندہ

ہیں اور خوش ہیں۔ وہ وہاں سے خود ہی نہیں آنا چاہتیں۔ جسونت نگر کے لوگ بلا وجہ ہمارے عتاب کے مورد ہوئے۔ میں آپ سے باصرار التجا کرتا ہوں کہ ان غریبوں پر رحم ہونا چاہیے۔ سینکڑوں بے گناہوں کا خون ہورہا ہے۔

سردار صاحب دیدہ و دانستہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا کرچکنے پر انھیں اپنی غلطی کو تسلیم کرلینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انصاف کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا بے انصافی کی تلافی کرنا۔ صوفیہ کے گم ہوجانے سے انھیں صرف گورنمنٹ کی کج نگاہی کا خوف تھا۔ مگر صوفیہ کا پتہ مل جاتا تو تمام ملک کے سامنے اپنی نااہلیت اورناانصافی کا اعلان کرنا تھا۔ مسٹر کلارک کو خوش کرکے گورنمنٹ کو خوش کیا جاسکتا تھا۔ مگر رعایا کا منہ اتنی آسانی سے بند نہ کیا جاسکتا تھا۔

سردار صاحب نے تامل سے کہا۔ یہ تو میں مان سکتا ہوں کہ مسز کلارک صحیح و سالم ہیں لیکن آپ تو کیا اگر کوئی فرشتہ بھی آکر کہے کہ وہ وہاں خوش ہیں۔ اور لوٹنا نہیں چاہتیں تو بھی میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہ بچوں کی سی بات ہے۔ کسی کو اپنے گھر سے اتنی نفرت نہیں ہوتی کہ وہ دشمنوں کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ باغیوں نے مسز کلارک کو یہ کہنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ وہ مسز کلارک کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ہم تمام قیدیوں کو آزاد نہ کردیں یہ ان کی چالاکی ہے اور میں اسے باور نہیں کرسکتا۔ مسز کلارک کو سخت سے سخت اذیتیں دی جارہی ہیں اور انھوں نے اذیتوں سے نجات پانے کے لیے آپ سے یہ سفارش کی ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔

ونے: میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوسکتا۔ مسز کلارک کافی خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ دکھتا ہوا دل کبھی اتنا مطمئن نہیں ہوسکتا۔

سردار: یہ آپ کی آنکھوں کا نقص ہے۔ اگرمسز کلارک خود آکر مجھ سے کہیں کہ میں بڑے آرام سے ہوں تو بھی مجھے یقین نہ آئے گا۔ آپ نہیں جانتے یہ لوگ کن حکمتوں سے آزادی پر جان دینے والے لوگوں پر بھی اپنا رعب جما لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے پنجہ سے چھٹکارا پاجانے پر بھی قیدی انھیں کی سی کہتاہے۔ اورانھیں کی سی کرتاہے۔ میں ایک زمانہ میں پولیس کا ملازم تھا۔ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے کتنے ہی سیاسی مقدمات میں بڑے بڑے ریاضت کشوں سے ایسے ایسے جرائم کا اقبال کرا دیا جن

کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بیر پال سنگھ اس معاملہ میں ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔

ونے: سردار صاحب اگر ذرا دیر کے لیے مجھے یہ یقین بھی ہوجائے کہ مسز کلارک نے دباؤ میں پڑ کر مجھ سے یہ باتیں کہی ہیں تو بھی اب ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے یہ معلوم ہورہا ہے کہ ہمیں اتنی بیدردی سے تشدد نہ کرنا چاہیے تھا۔اب ملزموں کے ساتھ کچھ رعایت ضرور ہونی چاہیے؟

سردار: سیاسی معاملات میں رعایت کرنا اپنی ہار مان لینا ہے۔ اگر میں یہ بھی مان لوں کہ مسز کلارک وہاں آرام سے ہیں اور آزاد ہیں اور ہم نے جسونت نگر کے لوگوں پر واقعی بڑا ظلم کیا ہے۔ پھر بھی میں رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ رعایت کرنا اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں رعایت کا انجام کیا ہوگا۔ باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ ان کے دلوں سے ریاست کا خوف جاتا رہے گا۔ اورجب خوف نہ رہا تو سلطنت بھی نہیں رہ سکتی ۔ خوف کو آپ نکال دیجیے اور سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ پھر ارجن کی بہاردی اور یدھشٹر کا انصاف بھی اسے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ سو دو سو بے گناہوں کا جیل میں رہنا سلطنت کے نہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ مگر میں ان باغیوں کو بے گناہ کیوں کرتسلیم کر لوں؟ کئی ہزار آدمیوں کا مسلح ہو کر جمع ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہاں لوگ بغاوت کرنے ہی کے خیال سے جمع ہوئے تھے۔

ونے سنگھ : لیکن جو لوگ اس میں شامل نہ تھے وہ تو بے قصور ہیں؟

سردار: ہر گز نہیں؟ ان کا فرض تھا کہ حکام کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیتے ایک چور کسی کے گھر پر نقب زنی ہوتے دیکھ کر آپ گھر والوں کو جگانے کی کوشش نہ کریں تو وہ خود چور کی اعانت کر رہا ہے۔ اکثر حالتوں میں اغماض جرم سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ونے: کم از کم اتنا تو کیجیے کہ جو لوگ میری شہادت پر قید کیے گئے ہیں انھیں رہا کر دیجیے۔

سردار: ناممکن ہے۔

ونے: میں طرز حکومت کے تعلق سے نہیں بلکہ رحم اور شرافت کی بنا پر آپ سے یہ التجا

کرتا ہوں۔

سردار: کہہ دیا بھائی جان! کہ یہ ناممکن ہے آپ اس کے انجام پر غور نہیں کر رہے ہیں۔

سردار: میں کھلی ہوئی بغاوت سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں صرف قومی خادموں سے، رعایا کے ہوا خواہوں سے۔ اور ان سے یہاں کی رعایا کا جی بھر گیا ہے۔ مدت گزر جائے گی اس کے قبل کے رعایاکو قومی خادموں کا پھر اعتبار ہو۔

ونے: اگر اسی نیت سے آپ نے میرے ہاتھوں رعایا کو تباہ وبرباد کرایا تو آپ نے میرے ساتھ واقعی دغا کیا۔ لیکن میں آپ کو متنبہ کیے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو آپ ریاست میں ایسا انقلاب برپا کریں گے جو ریاست کی جڑ ہلا دے گا۔ میں یہاں سے مسٹر کلارک کے پاس جاتا ہوں۔ ان سے بھی یہی التجا کروں گا اور اگر وہ بھی نہ سنیں گے تو مہارنا کی خدمت میں یہی تجویز پیش کروں گا۔ اگر انھوں نے بھی نہ سنا تو پھر اس ریاست کا مجھ سے بڑااور کوئی دشمن نہ ہوگا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ اٹھ کھڑے ہوئے اور نایک رام کو ہمراہ لیے مسٹر کلارک کے بنگلے پر جا پہنچے وہ آج ہی اپنے شکاری احباب کو رخصت کر کے واپس آئے تھے۔ اور اس وقت آرام کر رہے ہیں۔ ونے باغ میں ٹہلنے لگے۔ جب نصف گھنٹہ تک صاحب نے نہ بلایا تو اٹھے اور سیدھے مسٹر کلارک کے کمرہ میں چلے گئے وہ انھیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور بولے۔ آیئے آیئے آپ ہی کی یاد کر رہا تھا کہئے کیا خبر ہے؟ صوفیہ کا پتہ تو آپ لگا ہی آئے ہوں گے؟

ونے: جی ہاں لگا آیا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ نے مسٹر کلارک سے بھی وہی داستان کہی جو انھوں نے سردار صاحب سے کہی تھی اور ان سے بھی وہی اصرار آمیز التجا کی۔

کلارک: مس صوفیہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟

ونے: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہاں انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔

کلارک: تو پھر آپ نے نئی کھوج کیا کی؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے آنے سے اس معاملہ پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یہ دیکھیے صوفیہ کا خط ہے۔ آج ہی آیا ہے۔

اسے آپ کو دکھا تو نہیں سکتا مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت میرے سامنے آجائے تو اسے پستول کا نشانہ بنانے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کروں گا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب پرستی مکر اور دغا کا دوسرا نام ہے۔ اس کی مذہبیت نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ شاید کبھی کسی نے اتنا بڑا دھوا نہ کھایا ہوگا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مذہبیت سے خلوص پیدا ہوتا ہے مگر یہ میرا وہم تھا۔ میں اس کی مذہبیت پر دیوانہ ہوگیا۔ میں انگلینڈ کی رنگیلی عورتوں کی طرف سے مایوس ہوگیا تھا۔ صوفیہ کی سادگی اور مذہبیت دیکھ کر میں نے سمجھا کہ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اپنی سوسائیٹی کی بے قدری کر کے میں اس کے پاس آنے جانے لگا۔ اور بالآخر شادی کے لیے کہا۔ صوفیہ نے منظور تو کر لیا مگر کچھ دنوں تک شادی کو ملتوی رکھنا چاہا۔ میں کیا جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ راضی ہو گیا۔ اسی حالت میں وہ میرے ساتھ یہاں آئی بلکہ یوں کہیے کہ وہی مجھے یہاں لائی۔ دنیا سمجھتی ہے وہ میری بیوی تھی۔ اوہ ہرگز نہیں ہماری منگنی بھی نہ ہوئی تھی۔ اب جا کر بھید کھلا کہ وہ تو بولشویکوں کی ایجنٹ ہے اس کے ایک ایک لفظ سے اس کے فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ محبت کا سوانگ بھر کر وہ انگریزوں کے باطنی خیالات سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اس کا یہ مقصد پورا ہوگیا۔ مجھ سے جو کام نکل سکتا تھا وہ نکال کر اس نے مجھے دھکا دیا۔ ونے سنگھ تم نہیں اندازہ کر سکتے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا تھا؟ اس بے مثال حسن کی تہ میں یہ زبردست دغا! مجھے دھمکایا ہے کہ اتنے دنوں میں انگریزی معاشرت کا مجھے جو کچھ تجربہ ہوا ہے اسے میں ہندوستانیوں کے تفنن طبع کے لیے بے کم وکاست شائع کردوں گی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اسے میں خود ہی کیوں نہ ظاہر کردوں۔ انگریز قوم ہندوستان کو لامحدود زمانہ تک اپنی وسیع سلطنت کو جزو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ کنزرویٹو ہو یا لبرل۔ ریڈیکل ہو یا لیبر۔ نیشنلسٹ ہو یا سوسلشٹ۔ اس ایک بات پر سبھی متفق ہیں۔ صوفیہ سے پہلے ہی میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ریڈیکل اور لیبر کے لیڈروں کے دھوکے میں نہ آو۔ کنزرویٹو جماعت میں خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں۔ مگر وہ بے خوف ہے۔ وہ کڑوے سچ سے نہیں ڈرتا۔ ریڈیکل اور لیبر اپنے پاک و صاف اصولوں کی تائید کرنے میں ایسی امید افزا باتیں کہہ ڈالتے ہیں جن پر عمل کرنے کی جرأت ان میں نہیں ہے۔ اختیار ترک کی چیز نہیں ہے۔ دنیا

کی تاریخ صرف اسی ایک لفظ ''اختیار پسندی'' پر ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت اب بھی وہی ہے جو آغاز دنیا کے وقت تھی۔ انگریز قوم ترک کے لیے یا بلند اصولوں پر قربان ہوجانے کے لیے کبھی مشہور نہیں رہی۔ ہم سب کے سب (میں لیبر ہوں) سلطنت پسند واقع ہوئے ہیں۔ فرق صرف اس طرز عمل میں ہے جسے مختلف جماعتیں اس قوم پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اختیار کرتی ہیں۔ کوئی سختی سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ کوئی ہمدردی سے۔ کوئی چکنی چپڑی باتوں سے کام نکال کر۔ بس اصل میں کوئی مقررہ طرز حکومت نہیں ہے بلکہ صرف مقصد ہے اور وہ یہ کہ کیوں کر ہمارے اختیار و اقتدار میں روز افزوں ترقی ہوتی رہے۔ یہی وہ مخفی راز ہے جسے ظاہر کردینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ اگر یہ خط مجھے نہ ملتا تو میری آنکھوں پر پردہ ہی پڑا رہتا اور میں صوفیہ کے لیے کیا کچھ نہ کر ڈالتا۔ مگر اس خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ بلکہ آپ سے بھی اصرار کرتا ہوں کہ اس بالشویک تحریک کو نیست و نابود کردینے میں ریاست کی مدد کیجیے۔ صوفیہ جیسی ذہین مستعد اور دھن کی پکی عورت کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ تحریک کتنی خطرناک ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ کرلینا مشکل نہیں ہے۔

ونے یہاں سے بھی مایوس ہوکر باہر نکلے تو سوچنے لگے کہ اب مہارانا صاحب کے پاس جانا بے فائدہ ہے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ جب دیوان اور ایجنٹ کچھ نہیں کرسکتے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ لیکن جی نہ مانا تو تانگہ والے کو شاہی محل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

نایک رام: کیا گٹ پٹ کرتا رہا؟ آیا راہ پر؟

ونے: یہی راہ پر آجاتا تو مہارانا صاحب کے پاس کیوں چلتے؟

نایک رام: ہجارو و ہجار مانگتا ہو تو دے کیوں نہیں دیتے؟ افسر چھوٹے ہوں یا بڑے سبھی لالچی ہوتے ہیں۔

ونے: کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں میں اگر یہ برائیاں ہوتیں تو اس ملک سے کب کے چلے گئے ہوتے۔ یوں انگریز بھی رشوت لیتے ہیں۔ دیوتا نہیں ہیں۔ پہلے پہلے جو انگریز یہاں آئے تھے وہ تو پورے ڈاکو تھے مگر اپنی سلطنت کا نقصان کر

کے یہ لوگ کبھی اپنا فائدہ نہیں سوچتے رشوت لیں گے تو اسی حالت میں جب سلطنت کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔
نایک رام خاموش ہوگئے تانگہ شاہی محل کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں کئی سڑکیں، کئی مدرسے، کئی شفاخانے ملے۔ ان سب کے نام انگریزی تھے۔ یہاں تک کہ ایک پارک ملا۔ وہ بھی کسی انگریز ایجنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی شہر نہیں بلکہ انگریزوں کی بستی ہے۔ جب تانگہ محل کے سامنے پہنچا تو ونے سنگھ اتر پڑے اور مہارانا صاحب کے پرائیوٹ سیکریٹری کے پاس گئے۔ وہ ایک انگریز تھا۔ ونے سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ مہاراجہ صاحب تو ابھی پوجا پر ہے۔ گیارہ بجے بیٹھا تھا۔ چار بجے اٹھے گا۔ کیا آپ لوگ اتنی دیر تک پوجا کیا کرتا ہے؟
ونے: ہمارے یہاں ایسے ایسے پوجا کرنے والے ہیں جو کئی کئی دنوں تک مراقبہ میں غرق رہتے ہیں۔ پوجا کا وہ حصہ جس میں پرماتما سے یادیگر دیوتاؤں سے اپنی بھلائی کی استدعا کی جاتی ہے جلد ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن وہ حصہ جس میں مراقبہ کے ذریعہ روح کو پاک بنایا جاتا ہے بہت بڑا ہوتا ہے۔
سیکریٹری: ہم جس راجہ کے ساتھ پہلے تھا۔ سبیرے سے دو بجے تک پوجا کرتا تھا۔ تب کھانا کھاتا تھا اور چار بجے سوتا تھا۔ پھر نو بجے پوجا پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور دو بجے رات کو اٹھتا تھا۔ وہ سورج ڈوبنے کے وقت آدھ گھنٹے کے لیے باہر نکلتا تھا۔ مگر اتنی لمبی پوجا تو میرے خیال میں بالکل غیر قدرتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ نہ تو عبادت ہے اور نہ دل کی صفائی کا کام بلکہ ایک قسم کا بیکاری ہے۔

ونے اس وقت اتنا پریشان ہو رہے تھے کہ انھوں نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا۔ سوچنے لگے۔ ''اگر راجہ صاحب نے بھی صاف جواب دیا تو میرے لیے کیا کرنا مناسب ہوگا؟ ابھی اتنے بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ کہیں صوفیہ نے خفیہ قتل کا کھیل شروع کر دیا تو وہ خون بھی میری گردن پر ہوگا۔'' اس خیال سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آرام کرسی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ یوں وہ روزانہ سندھیا کرتے تھے پر آج پہلی بار ایشور سے رحم کی پرارتھنا کی۔ رات بھر کے جاگے۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی۔ ایک جھپکی آگئی۔ جب آنکھیں

کھلیں تو چار بج چکے تھے۔ سیکریٹری سے پوچھا۔ اب تو ہزہائنس پوجا پر سے اٹھ گئے ہوں گے۔

سیکریٹری: آپ نے تو ایک لمبی نیند لے لی۔

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کے ذریعہ کہا : کنور ونے سنگھ ہزہائینس سے ملنا چاہتے ہیں۔

ایک لمحہ میں جواب ملا: آنے دو۔

ونے سنگھ مہاراجہ کے دیوان خاص میں پہنچے۔ وہاں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف دیواروں پر دیوتاؤ ں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ قالین کے فرش پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ مہاراجہ صاحب مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جسم پر صرف ایک ریشمی چادر تھی اور گلے میں ایک تلسی کی مالا۔ چہرہ پر فقر و غنا کا رنگ نمودار تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی بولے: آؤ جی۔ بہت دن لگادیے مسٹر کلارک کی میم کا کچھ پتہ چلا؟

ونے: جی ہاں۔ بیرپال سنگھ کے گھر میں ہے۔ اوربڑے آرام سے۔ دراصل ابھی مسٹر کلارک سے اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ صرف منگنی ہوئی ہے۔ ان کے پاس آنے پر راضی نہیں ہوتی ہے۔ کہتی ہے میں یہیں بڑے آرام سے ہوں اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتاہے۔

مہاراجہ: ہری ہری۔ یہ تم نے تو عجیب بات سنائی۔ ان کے پاس آتی ہیں نہیں! سمجھ گیا۔ ان سب نے بسی کرن دیا ہوگا۔ شیو شیو۔ ان کے پاس آتی ہی نہیں؟

ونے: اب خیال فرمایئے کہ وہ تو زندہ ہے اور آ رام سے۔ اور یہاں ہم لوگ نے کتنے ہی بے گناہوں کو جیل میں ڈال دیا۔ کتنے ہی گھروں کو برباد کردیا اور کتنے ہی کو جسمانی سزائیں دیں۔

مہاراجہ: شیو شیو۔ بڑا انرتھ (ظلم) ہوا۔

ونے: غلطی سے ہم لوگوں نے غریبوں پر کیسے کیسے ظلم کیے کہ ان کی یادہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مہاراج بہت ٹھیک فرماتے ہیں کہ بڑا انرتھ ہوا۔ جیوں ہی یہ بات لوگوں کو معلوم ہوجائے گی تو رعایا میں بڑا واویلا مچ جائے گا۔ اس لیے اب یہی مناسب ہے کہ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قیدیوں کو رہا کردیں۔

مہاراجہ: ہری ہری ۔ یہ کیسے ہوگا بیٹا۔ راجاؤں سے بھی کہیں غلطیاں ہوتی ہیں۔ ؟ شیوشیو۔ راجہ تو ایشور کا اوتار ہے۔ ہری ہری۔ وہ ایک بار جو کردیتا ہے اسے پھر نہیں مٹا سکتا۔ شیو شیو۔ راجہ کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔ وہ نہیں مٹ سکتا۔ شیو شیو۔

ونے: اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں جو نیک نامی و عزت ہے وہ ناانصافی و ظلم کو عرصہ تک قائم رکھنے میں نہیں ہے۔ راجاؤ ں کے لیے عفو ہی زیبا ہے ۔ قیدیوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے۔ جرمانہ کے روپے لوٹا دیے جائیں اور جنھیں جسمانی سزائیں دی گئی ہیں انھیں انعام دے کر خوش کیا جائے۔ اس سے آپ کا بڑا نام ہوگا۔ لوگ آپ کی تعریف کریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔

مہاراجہ: شیو شیو۔ بیٹا تم راج نیت (سیاست) کی باتیں نہیں جانتے۔ یہاں ایک قیدی بھی چھورا گیا اور ریاست پر ایک بلا نازل ہوئی۔ سرکار کہے گی کہ میم کو نہ جانے کس نیت سے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید اس پر فریفتہ ہے۔ جبھی تو پہلے سزا کا سوانگ رچ کر اب باغیوں کو چھوڑے دیتا ہے۔ شیو شیو۔ ریاست خاک میں مل جائے گی۔ پاتال (تحت الثر ی) کو چلی جائے گی۔ کوئی نہ پوچھے گا کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔ کہیں بھی اس پر خیال نہ ہوگا۔ ہری ہری۔ ہماری حالت معمولی مجرموں سے بھی گئی گذری ہے۔ انھیں تو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ عدالت میں ان پر کوئی قانونی دفعہ عاید کی جاتی ہے اور اسی دفعہ کے مطابق انھیں سزا دی جاتی ہے۔ ہم سے کون صفائی لیتا ہے ؟ ہمارے لیے کون سی عدالت ہے؟ ہری ہری۔ ہمارے لیے نہ کوئی قانون ہے۔ نہ کوئی دفعہ جو جرم چاہا لگا دیا جو سزا چاہی دے دی۔ نہ کہیں اپیل ہے نہ نگرانی۔ راجے عیاش مشہور ہی ہیں۔ ان پر یہ الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے کہا جائے گا کہ تم نے کلارک کی نہایت حسین میم کو اپنے رنواس میں چھپا لیا اور جھوٹ موٹ اڑا دیا کہ وہ گم ہوگئی۔ ہری ہری۔ شیو شیو۔ سنتاہوں بڑی خوب صورت ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پری ہے بیٹا۔ اس حالت میں مجھے کلنک نہ لگاؤ۔ ضعیفی کی عمر بھی ہمیں ایسے برے الزامات سے نہیں بچا سکتی۔ یہ مشہور ہی ہے کہ راجا لوگ کشتوں وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں اس لیے تمام عمر قوی و مضبوط بنے رہتے ہیں۔ شیو شیو! یہ راج نہیں ہے۔ اپنے اعمال کی سزا ہے۔ نکٹا جیا برے احوال! شیو شیو! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سو پچاس بے

گناہوں کا جیل میں پڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہاں بھی تو کھانا کپڑا ملتا ہی ہے۔ اب تو جیل خانوں کی حالت بہت اچھی ہے نئے نئے کرتے دیے جاتے ہیں۔ خوراک بھی عمدہ دی جاتی ہے۔ ہاں تمھاری خاطر اتنا کرسکتا ہوں کہ جن گھرانو ں کا کوئی سر پرست نہ رہ گیا ہو یا جو جرمانوں کے سبب سے مفلس و نادار ہو گئے ہوں انھیں پوشیدہ طور سے کچھ مدد دی جائے۔ ہری ہری ! تم ابھی کلارک کے پاس تو نہیں گئے تھے؟

ونے: گیا تھا۔ وہیں سے تو آرہا ہوں۔

مہاراجا: (گھبرا کر) ان سے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میم صاحب بڑے آرام سے ہیں اور آنے پر راضی نہیں ہیں؟

ونے: یہ بھی کہہ دیا۔ چھپانے کی کوئی بات نہ تھی۔ کسی طرح انھیں صبر تو ہو۔

مہاراجہ: (زانو پر ہاتھ ٹیک کر) چوپٹ کر دیا۔ ہری ہری! بالکل چوپٹ کر دیا شیو شیو! آگ تو لگادی۔ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟ شیو شیو! کلارک کہے گا کہ قیدی قید میں بھی آرام سے ہے تو اس میں کچھ راز ضرور ہے۔ ضرور ہی کہے گا۔ ایسا کہنا قدرتی بات بھی ہے میرے دن برے آگئے ۔ شیو شیو! میں اس اعتراض کا کیا جواب دوں گا؟ بھگوان تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ اسی کو کہتے ہیں لڑکپن کی عقل ۔ وہاں نہ جانے کون سی خوشخبری سنانے کو دوڑے تھے۔ پہلے رعایا کو بھڑکایا۔ ریاست میں آگ لگا دی۔ اب یہ دوسری چوٹ کی ۔ نادان۔ تجھے کلارک سے کہنا چاہیے تھا کہ وہاں میم کو طرح طرح کی اذیتیں دی جارہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اوہ۔ شیو شیو!

دفعتاً پرائیوٹ سیکریٹری نے ٹیلی فون میں کہا: مسٹر کلارک آرہے ہیں۔

مہاراجہ نے کھڑے ہوکر کہا: آگیا ملک الموت۔ آگیا۔ کوئی ہے؟ کوٹ پتلون لاؤ۔ تم جاؤ ونے، چلے جاؤ۔ ریاست سے چلے جاؤ۔ پھر مجھے منہ نہ دکھانا۔ جلدی پگڑی لاؤ یہاں سے اوگالدان ہٹا دو۔

ونے کو آج راجہ سے نفرت ہوگئی۔ سوچا اتنی اخلاقی گراوٹ۔ اتنی بزدلی یوں راج کرنے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ وہ باہر نکلے تو نایک رام نے پوچھا۔ کیسی چھنی؟

ونے: ان کی تو مارے دہشت کے آپ ہی جان نکلی جاتی ہے۔ ایسا ڈرتے ہیں گویا مسٹر کلارک کوئی شیر ہیں اور انھیں آتے ہی آتے نگل جائیں گے۔ مجھ سے تو اس حالت میں ایک دن بھی نہ رہا جاتا۔

نایک رام: بھیا میری تو اب صلاح ہے کہ گھر لوٹ چلو۔ اس جنجال میں کب تک جان کھپاؤ گے؟

ونے نے آبدیدہ ہو کر کہا: پنڈا جی کون منہ لے کر گھر جاؤں؟ میں اب گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ ماتا جی میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ آیا تھا قوم کی خدمت کرنے جاتا ہوں سینکڑوں خاندانوں کو تباہ کرکے۔ میرے لیے تو اب ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ میں سمجھ گیا نایک رام۔ مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔ میرے ہاتھوں کسی کی بھلائی نہ ہوگی۔ میں زہر بونے ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ میں سانپ ہوں جو کاٹنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ جس کم بخت کو علاقہ کا علاقہ گالیاں دے رہا ہو جس کی بربادی کے لیے پوجا پاٹ کیے جارہے ہوں اسے دنیا پر بوجھ کی طرح رہنے کا کیا حق ہے؟ آج مجھ پر کتنے بیکسوں کا صبر پڑ رہا ہے۔ میری وجہ سے جتنا آنسو بہا ہے اس میں میں ڈوب سکتا ہوں۔ مجھے زندگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ جتنا ہی جیوں گا اتنا ہی اپنے اوپر گناہوں کا بار چڑھاؤں گا۔ اس وقت اگر یکا یک میری موت ہوجائے تو سمجھوں کہ ایشور نے مجھے بچالیا۔

اس طرح رنج و پشیمانی میں ڈوبے ہوئے ونے اس مکان میں پہنچے جو ریاست کی جانب سے انھیں قیام کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی نوکر چاکر دوڑے۔ کوئی پانی کھینچنے لگا کوئی جھاڑو دینے لگا۔ کوئی برتن دھونے لگا۔ ونے تانگہ سے اتر کر سیدھے دیوان خانہ میں گئے۔ اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میز پر ایک بند لفافہ ملا۔ ونے کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ رانی جاہنوی کا خط تھا۔ لفافہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ کوئی ماں پردیس میں پڑے ہوئے اپنے چار بیٹے کا تار پاکر اتنی غمگین نہ ہوتی ہوگی۔ لفافہ ہاتھ میں لیے ہوئے سوچنے لگے۔ اس میں میری ملامت کے سوا اور کیا ہوگا؟ اندردت نے جو کچھ زبانی کہا ہے ۔وہی بات زیادہ سخت الفاظ میں یہاں دہرائی گئی ہوگی۔ لفافہ جیوں کا تیوں رکھ دیا اور سوچنے لگے۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ کیوں نہ بازار میں کھڑے

ہو کر عوام کو مطلع کردوں کہ دربار تمھارے ساتھ بے انصافی کر رہا ہے؟ لیکن اس وقت غمزدہ عوام کو مدد کی ضرورت ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے؟ والد صاحب کو لکھوں کہ آپ اس وقت مجھے جتنے روپے بھیج سکیں بھیج دیجیے؟ روپے آجائیں تو یہاں یتیموں کو تقسیم کردوں۔ نہیں۔ سب سے پہلے وائسرائے سے ملوں اور یہاں کی واقعی حالت ان سے بیان کروں۔ ممکن ہے کہ وہ دربار پر دباؤ ڈال کر قیدیوں کو آزاد کرادیں۔ بس یہی ٹھیک ہے اب مجھے سب کام چھوڑ کر وائسرائے سے ملنا چاہیے۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن رانی جی کے خط کی یاد سر پر ٹپکتی برہنہ شمشیر کی طرح انھیں مضطرب کر رہی تھی۔ آخر ان سے ضبط نہ ہوسکا۔ خط کھول کر پڑھنے لگے:

ونے آج سے کئی ماہ قبل میں تمھاری ماں ہونے پر فخر کرتی تھی۔ مگر آج تمھیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ تم کیا تھے کیا ہوگئے! اور اگر یہی حالت رہی تو ابھی اور نہ جانے کیا ہوجاؤ گے؟ اگر میں جانتی کہ تم اسی طرح مجھے خفیف کروگے تو آج تم اس دنیا میں نہ ہوتے۔ بیدرد! اس لیے تو نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا؟ اس لیے میں نے تجھے اپنے دل کا خون پلا پلا کر پالا پوسا تھا؟ مصور جب کوئی تصویر بناتے بناتے دیکھتا ہے کہ اس سے میرے دلی جذبات کا انکشاف نہیں ہوتا تو وہ فوراً اسے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح میں تجھے بھی مٹادینا چاہتی ہوں۔ میں نے ہی تمھیں بنایا ہے۔ میں نے ہی تمھیں یہ جسم دیا ہے۔ روح کہیں سے آئی ہے پر جسم میرا ہی ہے۔ میں اسے تم سے واپس مانگتی ہوں۔ اگر تم میں اب بھی کچھ خودداری ہے تو میری امانت مجھے واپس کردو تمھیں زندہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتاہے جس کانٹے سے دل میں کسک ہورہی ہے اسے نکال سکوں تو کیوں نہ نکال ڈالوں، کیا تم میری یہ آخری خواہش پوری کروگے؟ یا دیگر خواہشات کی طرح اسے بھی خاک میں ملا دوگے؟ میں تمھیں اب بھی اتنا بے غیرت نہیں سمجھتی ورنہ میں خود آتی اور تمھارے دل سے وہ چیز نکال لیتی جس نے تمھاری طبیعت کو برائی کی طرف مائل کر دیا ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے، وہ خودداری ہے۔ اگر تمھارے جیسے میرے سو لڑکے ہوتے تو میں ان سبھوں کو اس کے تحفظ کے لیے

قربان کردیتی! تم سمجھتے ہوگے میں غصہ سے پاگل ہوگئی ہوں۔ یہ غصہ نہیں ہے۔ اپنی دلی تکلیف کا رونا ہے جس ماں کے قلم سے ایسے بیدردانہ الفاظ نکلیں اس کے غم مایوسی اور ندامت کا اندازہ تم جیسا کمزور انسان نہیں کرسکتا۔ اب میں اور کچھ نہ لکھوں گی تمھیں سمجھانا بے سود ہے۔ جب عمر بھر کی تعلیم رائیگاں گئی تو ایک خط کی تعلیم کا کیا اثر ہوگا۔ اب صرف دو تمنائیں ہیں۔ ایشور سے تو یہ کہ تم جیسی نالائق اولاد ساتویں دشمن کو بھی نہ دے اورتم سے یہ کہ اپنی زندگی کے اس برے کھیل کو ختم کرو۔

ونے یہ خط پڑھ کر روئے نہیں۔ ناراض نہیں ہوئے مغموم بھی نہیں ہوئے۔ ان کی آنکھیں غرور سے چمک اٹھیں۔ چہرہ پر جوش کی سرخی نمودار ہوگئی جیسے کسی شاعر کی زبان سے اپنے آباو اجداد کے بہادرانہ کارنامے سن کر کسی منچلے راجپوت کا چہرہ تمتما اٹھے ماتا! تمھیں دھنیہ ہے! بہشت میں بیٹھی ہوئی بہادر راجپوتنیوں کی روحیں تمھاری معیار پسندی پر فخر کرتی ہوں گی۔ میں اب تک تمھاری لاثانی شجاعت سے واقف نہ تھا۔ تم نے بھارت کی قابل عورتوں کا سر اونچا کردیا۔ دیوی! میں خود اپنے کوتمھارا بیٹا کہتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ ہاں میں تمھارا بیٹا کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمھارے فیصلے کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اگر میرے قالب میں سو جانیں ہوتیں تو ان سبوں کو تمھاری خودداری کے تحفظ کے لیے قربان کردیتا۔ ابھی اتنا بے عزت نہیں ہوا ہوں۔ لیکن یوں نہیں۔ میں تمھیں اتنا اطمینان دلانا چاہتاہوں کہ تمھارا بیٹا جینا نہیں جانتا پر مرنا جانتا ہے ۔ اب دیر کیوں، زندگی میں جو کچھ نہ کرنا تھا وہ سب کر چکا۔ اس کے ختم کردینے کا اس سے بہتر اورکون موقع ہوگا۔ یہ سر صرف ایک بار تمھارے قدموں پر تڑپے گا ممکن ہے کہ آخر وقت تمھارا پاک اشیرواد پاجاؤں۔ شاید تمھاری زبان سے یہ پاک الفاظ ادا ہو جائیں کہ تم سے ایسی ہی امید تھی۔ تو نے جینا نہ جانا پر مرنا جانتا ہے۔ اگر مرتے وقت بھی تمھارے منہ سے ''پیارے بیٹے'' یہ دو الفاظ سن سکا تو میری روح مطمئن ہوجائے گی اور دوزخ میں بھی سکھ چین سے رہ سکے گی۔ کاش ایشور نے پر دیے ہوتے تواڑ کر تمھارے پاس پہنچ جاتا۔

ونے نے باہر کی طرف دیکھا۔ سورج کسی غیرت کے مارے انسان کی طرح اپنا اترا ہوا چہرہ پہاڑوں کی آڑ میں چھپاچکا تھا۔ نایک رام چار زانو بیٹھے ہوئے بھنگ

گھونٹ رہے تھے۔ یہ کام وہ خدمتگاروں سے نہیں لیتے تھے کہتے ''یہ بھی ایک بدّیا ہے۔ کوئی ہلدی دھنیا تو ہے نہیں کہ جو چاہے پیس دے۔ اس میں بدھی کھرچ کرنا پڑتی ہے۔ تب جاکر بوٹی بنتی ہے۔'' کل ناغہ بھی ہوگیا تھا محو ہو کر بھنگ پیتے اور رامائن کی دو چار چوپائیاں جو یاد تھیں لے سے گاتے جاتے تھے۔ اتنے میں ونے نے بلایا۔

نایک رام: کیا ہے بھیا؟ آج مجادار بوٹی بن رہی ہے۔ تم نے کبھی کا ہے کو پی ہوگی۔ آج تھوڑی سی لے لینا۔ ساری تھکاوٹ بھاگ جائے گی۔

ونے: اچھا۔ اس وقت بوٹی رہنے دو۔ ماتا جی کا خط آیا ہے ۔ گھر چلنا ہے۔ ایک تانگہ ٹھیک کر لو۔

نایک رام: بھیا تمھارے تو سب کام جلدی کے ہوتے ہیں۔ گھر چلنا تو کل آرام سے چلیں گے بوٹی چھان کر رسوئی بناتا ہوں۔ تم نے بہت کاشمیری رسوئیوں کا بنا ہوا بھوجن کھایا ہے۔ آج جرا میرے ہاتھ کے بھی بھوجن کاسواد لو۔

ونے: اب گھر پہنچ کر ہی تمھارے ہاتھ کے بھوجن کا سواد لوں گا۔

نایک رام: ماتا جی نے بلایا ہوگا؟

ونے: ہاں بہت جلد۔

نایک رام: اچھا۔ بوٹی تو تیار ہوجائے۔ گاڑی تو نو بجے رات کو جاتی ہے۔

ونے: نو بجنے میں دیر نہیں ہے۔ سات تو بج ہی گئے ہوں گے۔

نایک رام: جب تک اسباب بندھواؤ۔ میں جلدی سے چھانے لیتاہوں تقدیر میں اتنا سکھ بھی نہیں لکھا ہے کہ بے پھکر ہو کر بوٹی تو چھانتا۔

ونے: اسباب کچھ نہیں جائے گا۔ میں گھر سے کوئی اسباب لے کر نہیں آیا تھا۔ یہاں سے چلتے وقت گھر کی کنجی سردار صاحب کو دے دینی ہوگی۔

نایک رام: اور یہ سارا اسباب؟

ونے: کہہ دیا کہ میں کچھ نہ لے جاؤں گا۔

نایک رام: بھیا تم کچھ نہ لو۔ پر میں تو یہ دو سالا اور یہ صندوق جرور لوں گا۔ جدھر سے دوسالا اوڑھ کر نکل جاؤں گا دیکھنے والے لوٹ جائے گی۔

ونے: ایسی مہلک چیز لے کر کیا کروگے جسے دیکھ کر ہی ستھراؤ پڑجائے؟ یہاں کی کوئی

چیز نہ چھونا۔ جاؤ۔
نایک رام بھاگ کو کوستے ہوئے گھر سے نکلے تو گھنٹہ بھر تک گاڑی کا کرایہ طے کرتے رہے۔ آخر جب یہ پیچیدہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوا تو ایک کو جبراً پکڑ لائے تانگہ والا بھنبھناتا ہوا آیا۔ ''سب حاکم ہی حاکم تو ہیں۔ مدا جنور کے پیٹ کو بھی تو کچھ ملنا چاہیے۔ کوئی مائی کا لال یہ نہیں سوچتا کہ دن بھر تو بیگار میں مرے گا۔ کیا آپ کھائے گا۔ کیا جنور کو کھلائے گا۔ کیا بال بچوں کو دے گا، اس پر نرکھ نامہ لکھ کر گلی گلی لٹکا دیا۔ بس تانگہ والے ہی سب کو لوٹے کھاتے ہیں اور تو جتنے عملے ملاجم ہیں سب دودھ کے دھوئے ہوئے ہیں۔ بکچہ ڈھولے، بھیک مانگ کھائے پر تانگہ کبھی نہ چلائے۔
جیوں ہی تانگہ دروازہ پر آیا ونے جاکر بیٹھ گئے لیکن نایک رام اپنی ادھ گھٹی بوٹی کیوں کر چھوڑتے؟ جلدی جلدی رگڑی۔ چھان کر پی۔ تمباکو کھائی۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر پگڑی باندھی۔ لوگوں سے رام رام کہی اور دوشالہ کو گرسنہ نگاہوں سے تاکتے ہوئے باہر نکلے۔ تانگہ چلا۔ سردار صاحب کا گھر راستہ ہی میں تھا۔ وہاں جاکر نایک رام نے کنجی ان کے دربان کے حوالہ کی اور آٹھ بجتے بجتے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ نایک رام نے سوچا کہ راہ میں تو کچھ کھانے کو ملے ہی گا نہیں اور گاڑی پر کھانا کھائیں گے کیسے، دوڑ کر پوڑیاں لیں۔ پانی لائے اور کھانے بیٹھ گئے۔ ونے نے کہا ابھی میرا جی نہیں چاہتا وہ کھڑے گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل دیکھ رہے تھے کہ یہ گاڑی اجمیر کب پہنچے گی۔ اور دلی میں کون سی گاڑی ملے گی۔ یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا روتی پیٹتی ہوئی چلی آرہی ہے اور دو تین آدمی اسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ ونے سنگھ کے سامنے ہی آکر بیٹھ گئی۔ ونے نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کا لڑکا جسونت نگر کی جیل کا داروغہ تھا۔ اسے دن دہاڑے کسی نے قتل کر ڈالا۔ ابھی خبر ملی ہے اور یہ بیچاری غمزدہ ماں یہاں سے جسونت نگر جا رہی ہے۔ موٹر والے کرایا زیادہ مانگتے تھے۔ اس لیے ریل گاڑی سے جاتی ہے۔ راستہ میں اتر کر بیل گاڑی کر لے گی۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ بیچاری کو بیٹے کا منہ بھی دیکھنا بدا نہ تھا۔
ونے سنگھ کو بہت رنج ہوا۔ ''داروغہ بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ قیدیوں پر بڑی مہربانی کرتا تھا۔ اس سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ انھیں معاً شبہ ہوا کہ یہ بھی بیر

پال سنگھ کی جماعت کی مجرمانہ کارروائی ہے۔ صوفیہ نے خالی دھمکی نہ دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اس نے خفیہ قتل کے ذرائع جمع کر لیے ہیں۔ ایشور میری بداعمالیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ ان قتل کی وارداتوں کا عذاب بھی میری ہی گردن پر ہے۔ صوفیہ کی گردن پر نہیں۔ صوفیہ جیسی رحیم عقیل فرض شناس عورت نے میری ہی کمزوریوں سے متاثر ہوکر یہ خونریزی کا وطیرہ اختیار کیا ہے۔ ایشور کیا ابھی میری تکالیف اپنی انتہائی حد کو نہیں پہنچ گئیں؟ میں پھر صوفیہ کے پاس جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر مؤدبانہ عرض کروں گا۔ دیوی میں اپنے کیے کی سزا پاچکا۔ اب یہ کارروائیاں بند کردو۔ ورنہ یہیں تمھارے سامنے جان دے دوں گا۔ لیکن صوفیہ کو پاؤں کہاں؟ کون مجھے اس قلعہ کے دشوار گزار راستہ پر لے جائے گا؟

جب گاڑی آئی تو ونے نے بڑھیا کو اپنے ہی پاس بٹھلایا۔ نایک رام دوسرے خانہ میں بیٹھے کیونکہ ونے کی موجودگی میں انھیں مسافروں سے آزادانہ گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔آج پولیس کے سپاہی ہر اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دربار نے مسافروں کی حفاظت کے لیے یہ خاص انتظام کیا تھا۔ کسی اسٹیشن پر مسافر سوار ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ باغیوں نے کئی جاگیرداروں کو لوٹ لیا تھا۔

پانچویں اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور پر گاڑی اچانک رک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہ تھا۔ لائن کے نیچے کئی آدمیوں کی بات چیت سنائی دی۔ پھر کسی نے ونے کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ ونے نے پہلے تو آنے والے کو روکنا چاہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کی جمہوریت خود غرضی کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ یہ بھی شک ہوا کہ ڈاکو نہ ہوں۔ لیکن قریب جاکر دیکھا تو کسی عورت کے ہاتھ تھے۔ الگ ہٹ گئے اور ایک لمحہ میں ایک عورت گاڑی پر چڑھ آئی۔ ونے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ وہ مس صوفیہ تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی پھر چلنے لگی۔

صوفیہ نے گاڑی میں آتے ہی ونے کو دیکھا۔ چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ جی میں آیا۔ گاڑی سے اتر جاؤں۔ مگر گاڑی چل چکی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ ساکت کھڑی رہی ونے کے سامنے اس کی آنکھیں نہ اٹھتی تھیں۔ پھر اس بڑھیا کے پاس بیٹھ گئی اورکھڑکی کی طرف تاکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بت بنے بیٹھے رہے۔ کسی کو بات کرنے کی

جرأت نہ ہوتی تھی۔

بڑھیا نے صوفیہ سے پوچھا۔ کہاں جاؤ گی بیٹی؟

صوفیہ : بڑی دور جانا ہے

بڑھیا: یہاں کہاں سے آرہی ہو؟

صوفیہ: یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں ہے۔ وہیں سے آتی ہوں۔

بڑھیا: تم نے گاڑی کھڑی کرادی تھی کیا؟

صوفیہ: اسٹیشنوں پر آج کل ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ اسی لیے درمیان میں گاڑی رکوالی۔

بڑھیا: تمھارے ساتھ اورکوئی نہیں ہے کیا؟ اکیلے کیسے جاؤ گی؟

صوفیہ: آدمی نہ ہو تو ایشور تو ہے۔

بڑھیا: ایشور ہیں کہ نہیں۔ کون جانے؟ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ سنسار کا کرتا دھرتا کوئی نہیں ہے تبھی تو دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ خون ہوتے ہیں۔ کل میرے بیٹے کو ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ (روکر) گئو تھا گئو۔ کبھی مجھے جواب نہیں دیا۔ جیل کے قیدی اس کو دعائیں دیا کرتے تھے۔ کسی بھلے مانس کو نہیں ستایا۔ اس پر یہ آفت آئی تو کیسے کہوں کہ کوئی ایشور ہے۔

صوفیہ: کیا جسونت نگر کے جیلر آپ کے بیٹے تھے؟

بڑھیا: ہاں بیٹی۔ وہی ایک لڑکا تھا سو بھگوان نے ہر لیا۔ یہ کہہ کر بڑھیا سسکنے لگی۔ صوفیہ کا چہرہ کسی مرتے ہوئے مریض کے چہرہ کی طرح بے رونق ہوگیا۔ ذرا دیر تک وہ ضبط کیے ہوئے کھڑی رہی پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا کمینہ انتقام ٹھوس شکل میں اس کے سامنے تھا۔

صوفیہ آدھ گھنٹہ تک منہ چھپائے روتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آگیا جہاں بڑھیا اترنا چاہتی تھی۔ جب وہ اترنے لگی تو ونے نے اس کا اسباب اتارا اور اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔

ابھی ونے گاڑی میں بیٹھے بھی نہ تھے کہ صوفیہ نیچے جاکر بڑھیا کے سامنے کھڑی ہوگئی اور بولی: ماتا تمھارے بیٹے کا خون کرنے والی میں ہوں۔ جو سزا چاہو دو۔ تمھارے سامنے کھڑی ہوں۔

بڑھیا نے حیرت سے کہا: کیا تو ہی وہ ڈائن ہے جس نے دربار سے لڑنے کے لیے ڈاکوؤں کو جمع کیا ہے ؟ نہیں تو نہیں ہوسکتی! تو تو مجھے رحم و مہربانی کی مورت سی نظر آتی ہے۔

صوفیہ: ہاں ماتا۔ میں ہی وہ ڈائن ہوں۔

بڑھیا: جیسا تو نے کیا ویسا تیرے آگے آئے گا۔ میں تجھے اورکیا کہوں؟ میری طرح تیرے دن بھی روتے ہی کٹیں۔

انجن نے سیٹی دی۔ صوفیہ بے حس سی کھڑی تھی۔ وہاں سے ہلی تک نہیں۔ گاڑی چلی۔ صوفیہ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دفعتاً ونے گاڑی سے کود پڑے۔ صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اورآپ بھی بڑی مشکل سے گاڑی میں چڑھے۔ ایک لمحہ کی دیر ہوتی تو وہیں رہ جاتے۔

صوفیہ نے مغموم لہجہ میں کہا: ونے تم میرے کہنے کا یقین کرو یا نہ کرو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے بیر پال کو ایک آدمی کے قتل کی بھی صلاح نہیں دی۔ میں اس کی قاتلانہ رغبت کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کرتی رہی۔ مگروہ گروہ اس وقت بدلہ لینے کی دھن میں دیوانہ ہورہا ہے۔ کسی نے میری نہ سنی ۔ یہی سبب ہے کہ میں اب یہاں سے جارہی ہوں۔ میں نے اس رات کو ایک جنون کی سی حالت میں تم سے نہ جانے کیا کیا باتیں کہیں۔ لیکن ایشور جانتا ہے کہ اس کا مجھے کتنا رنج وافسوس ہے ۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے معلوم ہورہا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کو مارنے اور دوسروں کے ہاتھوں مارے جانے کے لیے ہم سخت مصیبت کے وقت ہی آمادہ ہوسکتے ہیں۔ یہ حالت ہمیشہ نہیں قائم رہ سکتی۔ انسان فطرتاً امن پسند ہوتاہے۔ پھر جب سرکاری تشدد نے کمزور رعایا کو انتقام لینے پر آمادہ کردیا تو کیا طاقتور سرکار اس سے بھی زیادہ تشدد کرنے پر آمادہ نہ ہوجائے گی؟ لیکن میں تم سے ایسی باتیں کر رہی ہوں۔ گویا تم گھر ہی کے آدمی ہو۔ میں بھول گئی تھی کہ تم سرکاری ہواخواہوں میں ہو۔ مگر اتنی مہربانی کرنا کہ مجھے پولیس کے حوالہ نہ کردینا۔ پولیس سے بچنے ہی کے لیے میں نے راستہ میں گاڑی ٹھہراکر سوار ہونے کا بندوبست کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بھی تم میری ہی تلاش میں ہو۔

ونے سنگھ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ ملامت آمیز لہجہ میں بولے صوفیہ تمھیں اختیار ہے کہ مجھے چاہے جتنا کمینہ اور ذلیل سمجھو۔ مگر ایک دن آئے گا۔ جب تمھیں ان باتوں پر پچھتانا پڑے گا اور تم سمجھوگی کہ تم نے مجھ پر کتنی زیادتی کی ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا گھر سے یہاں آنے کے قبل میرے گرفتار ہونے کی خبر پاکر تم نے بھی وہی وطیرہ اختیار نہ کیا تھا؟ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دوسروں کو برباد کیا اور تم اپنے ہی کو برباد کرنے کے لیے تیار ہوگئیں۔ میں نے تمھارے طرز عمل کو قابل عفو سمجھا۔ وہ مصیبت کے وقت کا طرز عمل تھا۔ تم نے میرے طرز عمل کو معافی کے ناقابل سمجھا اور سخت سے سخت چوٹ جو تم پہنچا سکتی تھیں اسے پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن بات ایک ہی ہے مجھے پولیس کی مدد کرتے دیکھ کر تمھیں اتنا تعجب و افسوس نہ ہوا ہوگا جتنا مجھ کو تمھیں مسٹر کلارک کے ساتھ دیکھ کر ہوا۔ اس وقت بھی تم وہی انتقامی وطیرہ اختیار کر رہی ہو یا کم از کم تم مجھ سے ایسا کہہ چکی ہو۔ اتنے پر بھی تمھیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔ تمھاری جھڑکیاں سن کر مجھے جتنا روحانی کوفت ہوئی اور ہو رہی ہے وہی میرے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ اس میں تم نے اس وقت اور اضافہ کردیا کبھی تم اپنی اس بیدردی پر خون کے آنسو بہاؤ گی۔ خیر

یہ کہتے کہتے ونے کا گلا بھر آیا۔ پھر وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

صوفیہ نے آنکھوں سے اپنی دلی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: آؤ اب ہمارا تمھارا میل ہوجائے۔ میری ان باتوں کو بھول جاؤ۔

ونے نے آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا: میں کچھ کہتا ہوں، اگر طبعیت آسودہ نہ ہوئی تو اور جو چاہے کہہ ڈالو۔ جب برے دن آتے ہیں تو کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ تمھارے یہاں سے آکر میں نے قیدیوں کو آزاد کرانے کے لیے حکام سے مسٹر کلارک سے یہاں تک کہ مہارانا صاحب سے بھی جتنی منت سماجت کی وہ میرا دل ہی جانتا ہے مگر کسی نے میری بات تک نہ سنی۔ ہر طرف سے مایوس ہی ہونا پڑا۔

صوفیہ: یہ تو میں جانتی تھی۔ اس وقت کہاں جارہے ہو؟

ونے: جہنم کو

صوفیہ: مجھے بھی لیتے چلو۔

ونے: تمھارے لیے بہشت ہے

ایک لمحہ بعد پھر بولے: گھر جارہا ہوں۔ ماں جی نے بلایا ہے۔ مجھے دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔

صوفیہ: اندردت تو کہتے تھے تم سے بہت ناراض ہیں۔

ونے نے جیب سے رانی صاحبہ کا خط نکال کر صوفیہ کو دے دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ تو مجھ سے اتنا کھنچ رہی ہے اور میں خواہ مخواہ اس کی طرف دوڑا جاتاہوں۔ دفعتاً صوفیہ نے خط کو چاک کر کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور فرط محبت سے بے قرار ہو کر بولی: ''میں تمھیں نہ جانے دوں گی۔ ایشور جانتا ہے۔ میں تمھیں نہ جانے دوں گی۔ تمھارے عوض میں خود ہی رانی جی کے پاس جاؤں گی اور ان سے کہوں گی۔ تمھاری خطاوار میں ہوں'' یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ بول نہ سکی۔ ونے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور زاروقطار رونے لگی۔ آواز ہلکی ہوئی تو پھر بولی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ نہ جاؤں گا۔ تم نہیں جاسکتے۔ مذہباً اورانصافاً نہیں جاسکتے۔ بولو وعدہ کرتے ہو،

ان اشک آلود آنکھوں میں کتنی نرمی، کتنی التجا، کتنی عاجزی، کتنی ضد تھی۔

ونے نے کہا: نہیں صوفیہ۔ مجھے جانے دو۔ تم ماتا جی کو خوب جانتی ہو۔ میں نہ جاؤ گا۔ تو وہ اپنے دل میں مجھے بے عزت، بے حیا، بزدل سمجھیں گی۔ اوراس مجنونانہ حالت میں وہ نا جانے کیا کربیٹھیں۔

صوفیہ: نہیں ونے مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ للہ رحم کرو میں رانی جی کے پاس جاکر رؤوں گی ان کے پیروں پڑوں گی اوران کے دل میں تمھاری طرف سے جو کدورت ہے اسے اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالوں گی۔ مجھے دعویٰ ہے کہ میں ان کی ماتا والے جذبات متحرک کردوں گی۔ میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ ان کا دل دیا کا بھنڈار ہے۔ جس وقت میں ان کے قدموں پر سر رکھ کر کہوں گی۔ اماں تمھارا بیٹا میرا مالک ہے۔ میری خاطر اسے معاف کردو۔'' اس وقت وہ مجھے پیروں سے ٹھکرائیں گی نہیں۔ وہاں سے جھلائی ہوئی اٹھ کر چلی جائیں گی لیکن ایک لمحہ بعد مجھے بلائیں گی اور محبت سے گلے لگائیں گی۔ میں ان سے تمھاری جان کی امان مانگوں گی۔ پھر تمھیں بھی مانگ لوں

گی۔ ماں کا دل کبھی اتنا سخت نہیں ہوسکتا۔ وہ اس خط کو لکھ کر شاید اس وقت پچھتا رہی ہوں گی۔ منا رہی ہوں گی کہ خط نہ پہنچے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔

ایسے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ ونے کے کانوں نے کبھی نہ سنے تھے۔انھیں اپنی زندگی بامعنی معلوم ہونے لگی۔ آہ صوفیہ اب بھی مجھے چاہتی ہے۔ اس نے مجھے معاف کردیا۔ وہ زندگی جو پہلے ریگستان کی طرح بے آب غیر آباد اور سنسان تھی اب وحش وطیور، چشموں اور نہروں بیل بوٹوں اور پودوں سے معمور ہو کر ایک دلکشی کا مرقع بن گئی۔ خوشی کے دروازے کھل گئے تھے اور اس کے اندر سے میٹھے گیتوں کی تان برقی لیمپوں کی روشنی۔ ہوائے معطر کی خوشبو باہر نکل نکل کر دل کو جبراً اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ ونے سنگھ کو اس منظر دلفریب نے بالکل وارفتہ بنا دیا۔ اصل میں زندگی کا سکھ زندگی کا دکھ ہے۔ ترک تعلق اور دلی کلفت زندگی کے لیے قابل قدر جواہر ہیں۔ ہماری پاک خواہش، ہماری بے لوث خدمات، ہمارے نیک ارادے سبھی ہماری کشت غم کی پیدوار ہیں۔

ونے نے نوش کھاتے ہوئے کہا: صوفیہ، ماتا جی کے پاس ایک بار مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ پھر صاف طور پر نہ کہیں گی کہ ......

صوفیہ نے ونے کی گردن میں ہاتھوں کو حمائل کرتے ہوئے کہا۔نہیں نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔تم تنہا اپنی حفاظت نہیں کرسکتے۔ تم میں ہمت ہے خودداری ہے مروت ہے سب کچھ ہے پر صبر نہیں۔ پہلے میں اپنے لیے تمھیں ضروری سمجھتی تھی۔ اب تمھارے لیے اپنے کو ضروری سمجھتی ہوں۔ ونے زمین کی طرف کیوں تاکتے ہو؟ میری طرف دیکھو۔ میں نے تمھیں جو سخت الفاظ کہے اس پر نادم ہوں۔ خدا گواہ ہے سچے دل سے نادم ہو۔ ان باتوں کو بھول جاؤ۔ محبت میں جتنی معیار پسندی ہو تی ہے اتنا ہی عفو بھی ہوتا ہے۔ بولو۔ وعدہ کرو اگر تم مجھ سے گلا چھڑا کر چلے جاؤ گے تو پھر...... تمھیں صوفیہ نہ ملے گی۔

ونے نے محبت کے جوش میں آکر کہا تمھاری مرضی ہے تو نہ جاؤں گا۔

صوفیہ: تو ہم اگلے اسٹیشن پر اتر پڑیں گے۔

ونے: نہیں پہلے بنارس چلیں۔تم ماتا جی کے پاس جانا۔ اگر وہ مجھے معاف کردیں گی۔

صوفیہ: ونے ابھی بنارس نہ چلو۔ ذرا دل کو سکون ہونے دو۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہونے دو۔ پھر رانی جی کا تم پر کیا اختیار ہے؟ تم میرے ہو۔ ان سبھی قاعدوں کے مطابق جنھیں خدا اور انسان نے بنایا ہے۔ تم میرے ہو۔ میں رعایت نہیں اپنا حق چاہتی ہوں۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اتر پڑیں گے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟

ونے نے لجاتے ہوئے کہا: گزر بسر کیسے ہوگا، میرے پاس جو کچھ ہے وہ نایک رام کے پاس ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں ہے۔ اگر اسے خبر ہوگئی تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔

صوفیہ: اس کی کیا پرواہ؟ نایک رام کو جانے دو محبت جنگلوں میں بھی سکھی رہ سکتی ہے۔

اندھیری رات میں گاڑی کوہ و بیابان کو چیرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ باہر دوڑتی ہوئی کوہستانی قطاروں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ونے تاروں کی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ صوفیہ دیکھ رہی تھی کہ آس پاس کوئی گاؤں ہے یا نہیں۔

اتنے میں اسٹیشن نظر آیا۔ صوفیہ نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور دونوں چپکے سے اتر پڑے جیسے چڑیوں کا جوڑا گھونسلے سے دانہ کی کھوج میں اڑجائے۔ انھیں اس کی فکر نہیں کہ آگے صیاد بھی ہے۔ شکاری چڑیاں بھی ہیں اور کسان کی غلیل بھی ہے۔ اس وقت تو دونوں اپنے خیالات میں مگن ہیں۔ دانہ سے لہراتے ہوئے کھیتوں کی بہار دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہاں تک پہنچنا بھی ان کے نصیبوں میں ہے ۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

مسٹر جان سیوک نے طاہر علی کی محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر کھالوں پر کچھ کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اب ان کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوگیا تھا جس سے مل کے مزدوروں پر ان کا رعب تھا اور ورسیر نیز ادنیٰ درجہ کے کلرک بھی ان کا کافی لحاظ کرتے تھے، لیکن آمدنی میں ترقی ہونے کے ساتھ ہی ان کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ جب یہاں ان کے مساوی درجہ کے لوگ تھے تو وہ پھٹے پرانے جوتوں پر ہی سیر کر لیا کرتے۔ کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔ اب مل کے ملازموں کے سامنے انھیں زیادہ شان سے رہنا پڑتا تھا اور کوئی موٹا کام اپنے ہاتھ سے کرتے شرم معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے انھوں نے مجبوراً ایک بڑھیا خادمہ رکھ لی تھی۔ پان الائچی وغیرہ کا خرچ پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اس پر کئی دوستوں کی دعوت بھی کرنی پڑتی تھی تنہا رہنے والے سے کوئی دعوتوں کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ جانتا ہے کہ اس طرح دعوت پھیکی ہوگی۔ لیکن عیال دار لوگوں کے لیے تو کوئی مفر نہیں۔ کسی نے کہا۔ خاں صاحب آج ذرا زردہ پکوایئے۔ روٹی دال کھاتے کھاتے زبان موٹی پڑ گئی۔ اس کے جواب میں طاہر علی کو کہنا ہی پڑتا۔ ہاں ہاں لیجیے۔ آج ہی پکواتا ہوں۔ گھر میں ایک عورت ہوتی تو اس کی بیماری کا حیلہ کر کے ٹالنے کی کوشش کرتے۔ مگر یہاں تو گھر میں ایک کیا بلکہ تین تین عورتیں تھیں۔ پھر اس کے علاوہ طاہر علی دل کے چھوٹے نہ تھے۔ انھیں کھلانے پلانے کا شوق تھا اور دوستوں کی خاطرداری میں ان کو خاص لطف آتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ شرافت کے نباہ میں ان کی حلیہ بگڑی جاتی تھی۔ بازار میں تو اب ان کا ڈمری کا اعتبار نہ تھا۔ وہ نادہندمشہور ہوگئے تھے۔ پس وہاں تو انھیں کوئی چیز بھی ادھار نہ ملتی۔ دوستوں سے دست گردوں سے قرض لے کر کام چلایا کرتے بازار والوں نے ناامید ہو کر تقاضا کرنا چھوڑ دیا۔ سمجھ گئے کہ اس کے پاس ہے ہی نہیں، دے گا کہاں سے؟ تحریری قرض جان دار اور غیر فانی ہوتا ہے۔ زبانی قرض بے جان اور فانی۔ ایک عربی گھوڑا ہے جو ایڑ نہیں برداشت کر سکتا۔ یا تو سوار کا خاتمہ کر دے گا یا اپنا۔ دوسرا لدو ٹٹو ہے جسے اس کے پیر نہیں بلکہ کوڑے چلاتے ہیں کوڑا لوٹا یا سوار کا ہاتھ رکا اور ٹٹو بیٹھا، پھر نہیں

اٹھ سکتا۔

لیکن اگر صرف دوستوں کی خاطر مدارات ہی تک بات ہوتی تو شاید طاہر علی کسی طرح کھینچ تان کر چول بٹھانے میں کامیاب ہوتے۔ مصیبت یہ تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی ماہر علی ان دنوں مرادآباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں داخل ہوگئے تھے۔ تنخواہ پاتے ہی اس کا نصف حصہ آنکھیں بند کر کے مرادآباد بھیج دینا پڑتا تھا۔ طاہر علی خرچ سے ڈرتے تھے۔ مگر ان کی دونوں ماؤں نے طعنے دے دے کر انھیں گھر میں رہنا مشکل کر دیا تھا۔ دونوں ہی کی یہ دلی تمنا تھی کہ ماہر علی پولیس میں ملازم ہو کر داروغہ بنے۔ بیچارے طاہر علی مہینوں تک حکام کے بنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہاں جا وہاں جا۔ انھیں ڈالی دے۔ انھیں نذرانہ پیش کر۔ ان کی سفارش لا ان کی چٹھی منگا۔ بالآخر مسٹر جان سیوک کی سفارش کام کر گئی۔ یہ سب مرحلے تو طے ہو گئے۔ آخری مرحلہ ڈاکٹری معائنہ تھا۔ یہاں سفارش اور خوشامد کا گزر نہ تھا بتیس روپے سول سرجن کے لیے سولہ روپے اسسٹنٹ سرجن اور آٹھ روپے کلرک اور چپراسیوں کے لیے کل چھپن روپے کی میزان تھی۔ یہ رقم کہاں سے آئے چاروں طرف سے مایوس ہو کر طاہر علی کلثوم کے پاس آئے اور بولے تمھارے پاس کوئی زیور ہو تو دے دو۔ میں بہت جلد چھڑا دوں گا۔ اس نے تنگ کے صندوقچہ ان کے سامنے پٹک دیا اور کہا۔ یہاں زیوروں کی ہوس نہیں ہے سب آس پوری ہو چکی۔ روٹی دال ملتی جائے۔ یہی غنیمت ہے۔ تمھارے گہنے تمھارے آگے ہیں۔ جو جی چاہے کرو۔ طاہر علی کچھ دیر تک تو شرم سے سر نہ اٹھا سکے۔ پھر صندوقچہ کی طرف دیکھا۔ ایسی ایک بھی چیز نہ تھی جس سے اس کی چوتھائی رقم بھی مل سکتی۔ ہاں تمام زیورات سے کام چل سکتا تھا۔ شرماتے ہوئے کل چیزیں نکال کر رومال میں باندھیں اور باہر آکر اس فکر میں بیٹھے ہی تھے کہ انھیں کیوں کر لے جاؤں کہ اتنے میں خادمہ آئی۔ طاہر علی کو سوجھی کہ کیوں نہ اس کے معرفت روپے منگواؤں۔ ماما ئیں ان کاموں میں مشاق ہوتی ہیں۔ خیر چپکے سے بلا کر اس سے یہ بات کہی۔ بڑھیا نے کہا۔ میاں یہ کون سی بڑی بات ہے چیز تو رکھنی ہے کون کسی سے خیرات مانگتے ہیں۔ میں روپے لادوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ خادمہ گہنوں کی پوٹلیا لے کر چلی تو زینب نے دیکھا۔ بلا کر بولیں۔ تو کہاں لیے لیے

پھرے گی؟ میں روپے منگوائے دیتی ہوں۔ ان کا ایک دوست مہاجنی کا کام کرتا ہے ماما نے پوٹلی اسے دے دی۔ دو گھنٹہ بعد اپنے پاس سے چھپن روپے نکال کر دیے۔ اس طرح یہ مشکل مسئلہ حل ہوا۔ ماہر علی مراد آباد گئے اور جب سے وہیں تعلیم پا رہے تھے۔ تنخواہ کا نصف حصہ وہاں چلے جانے کے بعد بقیہ نصف حصہ میں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا پڑتا کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی۔ ادھر ماہر علی نصف ہی پر قناعت نہ کرتے۔ کبھی لکھتے کہ کپڑوں کے لیے روپے بھیجیے کبھی ٹینس کھیلنے کے لیے سو کی فرمائش کرتے۔ طاہر علی کو کمیشن کے روپوں سے بھی کچھ نہ کچھ وہاں بھیج دینا پڑتا تھا۔

ایک روز تمام رات فاقہ کرنے کے بعدعلی الصباح زینب نے آکر کہا۔ آج روپوں کی کچھ فکر کی یا آج بھی روزہ رہے گا؟

طاہر علی نے چڑھ کر کہا۔ میں کہاں سے لاؤں؟ تمھارے سامنے ہی کمیشن کے روپے مرادآباد نہیں بھیج دیے تھے، بار بار لکھتا ہوں کہ کفایت سے خرچ کرو۔ میں بہت تنگ ہوں۔ لیکن وہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہاں ہر ایک لڑکا گھر سے سینکڑوں روپے منگواتا ہے اور بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کفایت کرنا میرے امکان میں نہیں۔ جب ادھر کا یہ حال ہے تو روپے کہاں سے لاؤں؟ دوستوں میں بھی ایسا نہیں بچا جس سے کچھ مانگ سکوں۔

زینب: سنتی ہو رقیہ ان کی باتیں؟ لڑکے کو خرچ کیا دے رہے ہیں گویا میرے اوپر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ مجھے کیا تم اسے خرچ بھیجو یا بلاؤ۔ اس کے وہاں پڑھنے سے یہاں پیٹ تھوڑا ہی بھر جائے گا۔ تمھارا بھائی ہے پڑھاؤ یا نہ پڑھاؤ۔ مجھ پر کیا احسان؟

طاہر علی: تو تمھیں بتاؤ روپے کہاں سے لاؤں؟

زینب: مردوں کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں تمھارے ابا جان دس ہی روپے پاتے تھے کہ زیادہ؟ بیس تو مرنے کے کچھ دن پہلے ہوگئے تھے۔ آخر کنبہ کی پرورش کرتے تھے کہ نہیں؟ کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی۔ موٹا مہین دن میں دو بار ضرور میسر ہوجاتا تھا۔ تمھاری تعلیم ہوئی، شادی ہوئی، کپڑے وغیرہ بھی آتے تھے۔ اللہ کے فضل سے بساط کے مطابق گہنے بھی بنتے تھے۔ وہ تو مجھ سے کبھی نہ پوچھتے تھے کہاں سے روپے لاؤں؟ آخر

کہیں سے لاتے ہی تو تھے۔

طاہر علی: پولیس کے محکمہ میں ہر طرح کی گنجائش ہوتی ہے یہاں کیا ہے؟ گنی بوٹیاں نپا شوربا۔

زینب: میں تمھاری جگہ ہوتی تو دکھا دیتی کہ اسی نوکری میں کیسے سونا برستا ہے۔ سینکڑوں چمار ہیں۔ کیا کہو تو ایک ایک گٹھا لکڑی کا نہ لائیں، سبھوں کے یہاں چھان چھپر پر ترکاریاں لگی ہوں گی۔ کیوں نہیں توڑوا منگاتے؟ کھالوں کی قیمت میں بھی کمی بیشی کرنے کا تمھیں اختیار ہے۔ کوئی یہاں بیٹھا دیکھ نہیں رہا ہے۔ دس کے پونے دس لکھ دو تو کیا ہرج ہو؟ روپیوں کی رسیدوں پر انگوٹھے کا نشان ہی نہ بنواتے ہو۔ نشان پکارنے جاتا ہے کہ میں دس ہوں یا پونے دس؟ پھر اب تمھارا اعتبار جم گیا۔ صاحب کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر اس اعتبار سے کچھ اپنا فائدہ بھی تو ہو کہ ساری عمر دوسروں کا پیٹ بھرتے رہوگے؟ اس وقت بھی تمھاری تحویل میں سینکڑوں روپے ہوں گے۔ جتنی ضرورت سمجھو اس وقت نکال لو۔ جب ہاتھ میں روپے آئیں تو رکھ دینا۔ روزانہ آمدنی خرچ کا میزان ہی بننا چاہیے نا؟ یہ کون سی بڑی بات ہے آج کھال کا دام نہ دیا۔ کل دیا۔ اس میں کیا تردد ہے۔ چمار کہیں فریاد کرنے نہ جائے گا۔ سبھی ایسا کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کا کام چلتا ہے۔ ایمان درست رکھنا ہو تو انسان کو چاہیے کہ فقیر ہو جائے۔

رقیہ: بہن ایمان ہے کہاں؟ دنیا کا کام تو اسی طرح چلتا ہے۔

طاہر علی: بھئی جو لوگ کرتے ہیں وہ جانیں۔ میری تو ان ہتھکنڈوں سے روح فنا ہوتی ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ آخر خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ جیسی بھی اس کی مرضی ہو۔ زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

زینب: واہ رے مردوئے۔ قربان جاؤں تیرے ایمان پر۔ تیرا ایمان سلامت رہے چاہے گھر والے بھوکوں مر جائیں۔ تمھاری منشاء یہی ہے کہ سب منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ فکر تو آدمی کو اپنے بیوی بچوں کی ہوتی ہے۔ ان کے لیے بازار موجود ہی ہے۔ فاقہ تو ہمارے لیے ہے۔ ان کا فاقہ تو محض نمائش ہے۔

طاہر علی نے اس الزام بیجا پر مغموم ہو کر کہا۔ کیوں جلاتی ہو امی جان؟ خدا

گواہ ہے جو بچہ کے لیے دھیلے کی بھی کوئی چیز لی ہو۔ میری نیت تو کبھی ایسی نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ یوں تمھاری طبیعت ہے جو چاہے سمجھو۔

رقیہ: دونوں بچے رات بھر تڑپتے رہے۔ ''اماں روٹی !'' پوچھو اماں کیا آپ روٹی بن جائے۔ تمھارے بچے اورنہیں تو ورسیر کے گھر چلے جاتے ہیں۔وہاں سے کچھ کھا پی آتے ہیں ۔ یہاں تو میری جان ہی کھاتے ہیں ۔

زینب: اپنے بال بچوں کو کھلانے نہ کھلانے کا تمھیں اختیار ہے ۔ کوئی تمھارا حساب لینے والا تو ہے نہیں۔ خواہ زردہ کھلاؤ خواہ بھوکا رکھو۔ ہمارے بچوں کو تو گھر کی روکھی سوکھی روٹیوں کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ یہاں کوئی ولی نہیں ہے جو فاقوں سے زندہ رہے۔ جا کر کچھ انتظام کرو۔

طاہر علی باہر آ کر بڑی دیر تک متفکر کھڑے رہے۔ آج پہلی مرتبہ انھوں نے امانت کے روپیوں کو ہاتھ لگانے کی جرأت کی۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی کھڑا تو نہیں ہے۔ پھر بہت آہستگی کے ساتھ آہنی صندوق کو کھولا۔ یوں دن میں سینکڑوں بار وہی صندوق کھولتے اور بند کرتے تھے مگر اس وقت ان کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر انھوں نے روپے نکال لیے۔ پھر صندوق کو بند کر دیا۔ روپے لا کر زینب کے سامنے پھینک دیے اور بغیر کچھ کہے باہر چلے گئے۔ اپنے دل کو یوں سمجھایا۔ ''اگر خدا کو منظور ہوتا کہ میرا ایمان سلامت رہے تو کیوں اتنے آدمیوں کا بوجھ میرے سر پر ڈالتا۔ یہ بوجھ سر پر رکھا تھا تو اس کے اٹھانے کی طاقت بھی تو دینی چاہیے تھی۔ میں خود فاقے کر سکتا ہو ں پر دوسروں کو تو مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر اس مجبوری کی حال میں خدا مجھے سزا کے قابل سمجھے تو وہ منصف ہی نہیں ہے۔'' اس دلیل سے انھیں کچھ تسکین ہوئی لیکن مسٹر جان سیوک تو اس دلیل سے مان جانے والے آدمی نہ تھے۔ طاہر علی سوچنے لگے کون چمار سب سے موٹا ہے جسے آج روپے نہ دوں تو چین چڑ نہ کرے نہیں موٹے آدمی کے روپے روکنا مناسب نہیں کیونکہ وہ نڈر ہوتے ہیں۔ جو سب سے غریب سب سے سیدھا ہو اسی کے روپے روکنا چاہیے۔ اس میں کوئی خوف نہیں ہے۔ چپکے سے بلا کر انگوٹھے کا نشان بنوالوں گا۔ اس کی ہمت ہی نہ پڑے گی کہ کسی سے کہے۔ اس دن سے انھیں جب ضرورت پڑتی تحویل سے روپے نکال لیتے اور پھر رکھ

دیتے۔ رفتہ رفتہ روپوں کو پورا کر دینے کا خیال کم ہونے لگا۔ تحویل کے روپوں میں کمی واقع ہونے لگی دل مضبوط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چھٹا مہینہ گزرتے گزرتے وہ تحویل کے پورے ڈیڑھ سو روپ صرف کر چکے تھے۔

اب طاہر علی کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ چماروں سے خوشامد آمیز باتیں کریں کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہیے تھے کہ تحویل میں ان روپوں کا پتہ نہ چلے۔ لیکن بہی کھاتہ میں ردوبدل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے یہ بات نہ کہتے۔ بس خدا سے یہی دعا کرتے کہ ماہر علی آجائیں۔ انھیں سو روپے ماہوار ملیں گے دو ماہ میں ادا کردوں گا۔ اتنے دن صاحب حساب کی جانچ نہ کریں تو پھر بیڑا پار ہے۔

انھوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب کچھ ہی ہو مگر اور روپے نہ نکالوں گا۔ لیکن ساتویں مہینہ پھر پچیس روپے نکالنے پڑے۔ اب ماہر علی کا سال بھی پورا ہونے کو تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کی اور کسر تھی۔ سوچا آخر مجھے اسی کی بدولت یہ زیرباری ہو رہی ہے۔ جیوں ہی آیا میں نے گھر اسے سونپا۔ کہہ دوں گا۔ ''بھائی! اتنے دنوں تک میں نے سنبھالا جو کچھ بن پڑا تمھاری تعلیم میں صرف کیا۔ تمھیں بر سر روزگار کر دیا۔ اب کچھ دنوں کے لیے مجھے اس فکر سے نجات دو۔'' اس کے آنے تک یہ پردہ ڈھکا رہ جائے تو پھر دم جھاڑ کر نکل بھاگوں گا۔

پہلے وہ ایسی ہی کوئی ضرورت پڑنے پر صاحب کے یہاں جاتے تھے۔ اب دن میں ایک بار ان سے ضرور ہی ملتے۔ ملاقاتوں سے ان کے شک کو دبا ہوا رکھنا چاہتے تھے۔ جس چیز سے ٹکر لینے کا خوف ہوتا ہے اس سے ہم اور بھی زیادہ چمٹ جاتے ہیں۔ کلثوم ان سے بار بار پوچھتی کہ آج کل تم اتنے روپے کہا پا جاتے ہو؟ سمجھاتی۔ ''دیکھو نیت خراب نہ کرنا تکلیف اور تنگی سے صبر کرنا اتنا برا نہیں ہے جتنا خدا کے سامنے گنہگار بننا۔'' لیکن طاہر علی ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے بہلا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح کو طاہر علی نماز سے فارغ ہو کر دفتر میں آئے تو دیکھا کہ ایک چمار کھڑا رو رہا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ بولا۔ ''کیا بتاؤں کھاں صاحب رات گھر

والی گجر گئی۔ اب اس کا کریا کرم کرنا ہے۔ میرا جو کچھ حساب ہو دے دیجیے۔ دوڑا ہوا آیا ہوں۔ کپھن کے لیے بھی روپیہ پیشہ نہیں ہے۔'' طاہر علی کی تحویل میں روپے کم تھے۔ کل اسٹیشن سے مال روانہ کیا تھا محصول ادا کرنے میں روپے خرچ ہو گئے تھے۔ آج صاحب کے سامنے حساب پیش کر کے روپیہ لانے والے تھے۔ انھیں اس چمار کو کئی کھالوں کی قیمت دینی تھی۔ کوئی بہانہ نہ کر سکے۔ کچھ روپے لا کر اسے دیے۔

چمار نے کہا ۔ ہجور اتنے میں تو کپھن بھی پورا نہ ہوگا۔ مرنے والی اب پھر سے تو آئے گی نہیں۔ اس کا کریا کرم تو دل کھول کر کردوں۔ میرے جتنے روپے آتے ہیں۔ سب دے دیجئے یہاں تو جب تک دس بوتل دارو نہ ہوتی۔ لہاس(لاش) درواجے سے نہ اٹھے گی۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت روپے نہیں ہیں۔ پھر لے جانا۔

چمار: واہ کھاں صاحب واہ۔ انگوٹھے کا نسان کرائے تو مہینوں ہوگئے۔ اب کہتے ہو پھر لے جانا۔ اس بھکت دوگے تو کیا میرے مرنے پر دوگے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ اپنی طرپھ سے کچھ مدد کرے۔ الٹے میرے ہی روپے باقی رکھتے ہو۔

طاہر علی کچھ روپے اورلائے۔ چمار نے سب روپے زمین پر پٹک دیے۔ اور بولا۔ آپ تھوک سے چوہیا جلاتے ہیں! میں آپ سے ادھارنہیں مانگتا خیرات نہیں مانگتا۔ اپنے روپے مانگتا ہوں اور یہ کٹوسی کر رہے ہیں مانوں گھر سے دے رہے ہوں۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

چمار تھا تو سیدھا مگر اسے کچھ شبہ ہوگیا۔ وہ گرم ہو پڑا اتفاقاً اسی وقت مسٹر جان سیوک بھی آپہنچے۔ وہ آج بہت جھلائے ہوئے تھے۔ پربھوسیوک کی کجروی نے انھیں بے قابو کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ جھگڑا دیکھا تو تیز لہجہ میں بولے اس کے روپے کیوں نہیں دے دیتے ؟ میں نے آپ سے تاکید کر دی تھی کہ سب آدمیوں کا حساب روز مرہ صاف کر دیا کیجیے۔ آپ کیوں باقی رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی تحویل میں روپے نہیں ہیں؟

طاہر علی روپے لانے چلے تو کچھ ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ صاحب کو فوراً شک ہوگیا۔ انھوں نے رجسٹر اٹھا لیا اور حساب دیکھنے لگے۔ حساب صاف تھا۔ اس چمار

کے روپے ادا ہو چکے تھے۔ اس کے انگوٹھے کا نشان موجود تھا۔ پھر یہ بقایا کیسا؟ اتنے میں اور کئی چمار آگئے۔ اس چمار کو روپے لے جاتے دیکھا تو سمجھے آج حساب صاف کیا جا رہا ہے۔ بولے۔ سرکار ہمارا بھی مل جائے۔ صاحب نے رجسٹر کو زمین پر پٹک دیا اور جھڑک کر بولے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ جب ان سے رسید لی گئی تو ان کے روپے کیوں نہیں دیے گئے؟

طاہر علی سے اور کچھ نہ بن پڑا۔ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور رونے لگے۔ نقب میں بیٹھ کر آنکھیں دکھانے کے لیے بڑے مشاق آدمی کی ضرورت ہے۔

چماروں نے موقع کو تاڑ کر کہا۔ سرکار ہمارا پچھلا کچھ نہیں ہے۔ ہم تو آج کے روپوں کے لیے کہتے ہیں۔ جرا دیر ہوئی مال رکھ گئے تھے۔ کھاں صاحب اس بھکت (وقت) نماج پڑھتے تھے۔

صاحب نے پھر رجسٹر اٹھا کر دیکھا تو انھیں کسی کسی نام کے سامنے ایک ہلکا سا x کا نشان دکھائی دیا۔ سمجھ گئے حضرت نے یہی روپے اڑائے ہیں۔ ایک چمار سے جو بازار سے سگریٹ پیتا ہوا آرہا تھا۔ پوچھا۔ تیرا نام کیا ہے؟

چمار: چتکو۔

صاحب: تیرے کتنے روپے باقی ہیں؟

کئی چماروں نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھایا کہ کہہ دے کچھ نہیں۔ چتکو نہ سمجھا اور بولا۔ سترہ روپے پہلے کے تھے نو آج کے۔

صاحب نے اپنی نوٹ بک پر اس کا نا درج کرلیا۔ طاہر علی کو کچھ بھی نہ کہا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ جہاں قانون کی رو سے اسے سزا مل سکتی تھی۔ وہاں سخت سست کہنے کی کیا ضرورت؟ سب رجسٹروں کو اٹھوا کر گاڑی میں رکھا۔ دفتر میں قفل بند کیا۔ آہنی سیف میں ڈبل لاک لگائے۔ کنجیاں جیب میں رکھیں اور فٹن پر سوار ہوگئے۔ طاہر علی کو اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ کچھ منت سماجت کریں۔ زبان ہی بند ہوگئی ساکت کھڑے رہ گئے۔ چماروں کے چودھری نے تشفی دی۔ آپ کیوں ڈرتے ہو کھاں صاحب آپ کا بال توبانکا ہونے نہ پائے گا۔ ہم کہہ دیں گے اپنے روپئے بھر پائے ہیں۔ کیوں رے چتکو۔ نرا گنوار ہی ہے۔ اسارہ بھی نہیں سمجھتا؟

چنکو نے نادم ہو کر کہا۔ چودھری بھگوان جانیں جو میں جرا بھی اسارہ پاجاتا تو روپے کا نام ہی نہ لیتا۔
چودھری: اپنا بیان بدل دینا۔ کہہ دینا مجھے جبانی یاد نہیں تھا۔ چنکو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا بیان بدلنا سانپ کے منہ میں انگلی دینا تھا۔ طاہر علی کی ان باتوں سے ذرا بھی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ پچھتا رہے تھے اس لیے نہیں کہ میں نے روپے کیوں خرچ کیے بلکہ اس لیے کہ ناموں کے سامنے کے نشانات کیوں قائم کیے۔ الگ کسی کاغذ پر نوٹ کر لیتا تو آج کیوں یہ نوبت آتی۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ صاحب معاف کرنے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ سوجھ ہی نہ پڑتا تھا کہ کیا کریں ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
چودھری بولا۔ کھاں صاحب اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ صاحب بڑا جلاد آدمی ہے۔ جلدی روپے جٹایئے۔ آپ کو یاد ہے کل کتنے روپے نکلتے ہوں گے؟
طاہر علی: روپیوں کی فکر نہیں ہے جی یہاں تو داغ لگ جانے کا افسوس ہے۔ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے ورنہ پہلے ہی سے تیار نہ ہوجاتا۔ جانتے ہو کہ یہاں کارخانہ کا ایک نہ ایک آدمی قرض مانگنے کو سر پر سوار رہتا ہے۔ کس کس سے حیلہ کروں؟ اور پھر مروت میں حیلہ کرنے سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ روپے نکال کر دیتا ہوں۔ یہ اسی شرافت کی سزا ہے۔ ڈیڑھ سو سے کم نہ نکلیں گے بلکہ چاہے دوسو ہو گئے ہوں۔
چودھری: بھلا سرکاری رقم اس طرح کھرچ کی جاتی ہے۔ آپ نے کھرچ کی یا کسی کو اودھار دے دی۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ لوگ روپے دے دیں گے؟
طاہر علی: ایسا کھرا تو ایک بھی نہیں۔ کوئی کہے گا۔ تنخواہ ملنے پر دوں گا۔ کوئی کچھ بہانہ کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔
چودھری: گھر میں تو روپے ہوں گے؟
طاہر علی: ہونے کو کیا دو چار سو روپے نہ ہوں گے۔ مگر جانتے ہو کہ عورتوں کا روپیہ جان کے ساتھ رہتا ہے۔ خدا کو جو منظور ہے وہ ہوگا۔
یہ کہہ کر طاہر علی اپنے دو چار دوستوں کی طرف چلے کہ شاید یہ حال سن کر

لوگ میری کچھ مدد کریں۔ مگر کہیں نہ جا کر ایک درخت کے نیچے نماز پڑھنے لگے۔ کسی سے مدد کی امید نہ تھی۔

ادھر چودھری نے چماروں سے کہا۔ بھائیو ہمارے منسی جی اس وقت تنگ ہیں۔سب لوگ تھوڑی تھوری مدد کرو تو ان کی جان بچ جائے۔ صاحب اپنے روپے ہی تو لیں گے کہ کسی کی جان لیں گے بس سمجھ لو کہ ایک دن نسہ نہ کیا۔

چودھری تو چماروں سے روپے وصول کر کے جمع کرنے لگا۔ طاہر علی کے دوستوں نے یہ حال سنا تو چپکے ہی دبک رہے کہ کہیں طاہر علی کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ ہاں جب تیسرے پہر کو داروغہ نے آ کرتحقیقات کرنی شروع کی۔ اور طاہر علی کو حراست میں لے لیا تو یار لوگ بھی تماشہ دیکھنے آپہنچے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ کلثوم نے جا کر زینب سے کہا۔ لیجیے اب تو آپ کے ارمان نکلا۔

زینب نے کہا تم مجھ سے کیا بگڑتی ہو بیگم۔ ارمان نکلے ہوں گے تو تمھارے نہ نکلے ہوں گے تو تمھارے۔ میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ جا کر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالو۔گلچھرے تم نے اڑائے ہوں گے۔ یہاں تو روٹی دال کے سوا اور کسی کا کچھ نہیں جانتے۔

کلثوم کے پاس تو کفن کو کوڑی بھی نہ تھی۔ زینب کے پاس سو روپے تھے مگر اس نے دل جلانا ہی کافی سمجھا۔ کلثوم کو اس وقت طاہر علی سے ہمدردی نہ تھی۔ اسے ان پر غصہ آرہا تھا۔ جس طرح کسی کو اپنے بچہ کو چاقو سے انگلی کاٹتے ہوئے دیکھ کر غصہ آئے۔

شام ہو رہی تھی۔ طاہر علی کے لیے داروغہ نے ایک یکہ منگوایا۔ اس پر چار کانسٹبل انھیں لے کر سوار ہوئے۔ داروغہ جانتا تھا کہ یہ ماہر علی کے بھائی ہیں۔ کچھ لحاظ کرتا تھا۔ چلتے وقت بولا کہ اگر آپ کو گھر میں کسی سے کچھ کہنا ہو تو آپ جا سکتے ہیں۔ عورتیں گھبرا رہی ہوں گی۔ انھیں ذرا تسکین دیتے آیئے۔ مگر طاہر علی نے کہا مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ وہ کلثوم کو اپنی صورت نہ دکھانا چاہتے تھے۔ جسے انھوں نے دیدہ و دانستہ تباہ کر دیا تھا۔ اور اب بے یارومددگار چھوڑے جا رہے تھے۔ کلثوم دروازہ پر کھڑی تھی۔ اس کا غصہ ہر لمحہ رنج کی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ یہاں

تک کہ جب یکہ چلاتو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ بچے ابا ابا کہتے یکہ کے پیچھے دوڑے۔ داروغہ نے انھیں ایک ایک چونی مٹھائی کھانے کو دے کر بہلا دیا۔ طاہر علی تو ادھر حراست میں گئے ادھر گھڑی رات جاتے جاتے چماروں کا چودھری روپے لے کر مسٹر سیوک کے پا س پہنچا۔ صاحب بولے۔ یہ روپے تم ان کے گھروالوں کو دے دو تو ان کا گزر ہو جائے۔ معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

چودھری: ہجور آدمی سے کھتا ہو ہی جاتی ہے۔ اتنے دنوں تک آپ کی چاکری کی۔ سرکار کو اس پر کچھ دیا کرنی چاہیے۔ بڑا بھاری کرمہ (کنبہ) ہے مالک بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔

جان سیوک: میں یہ سب جانتا ہو ں۔ بے شک ان کا خرچ بہت تھا۔ اسی لیے میں نے مال پر کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے مجبور ہو کر کیا ہے۔ لیکن زہر کسی نیت سے کھایا جائے وہ زہر ہی کا کام کرے گا۔ کبھی امرت نہیں ہوسکتا۔ دغا بازی زہر سے کم مہلک نہیں ہوتی۔ تم یہ روپے لے جا کر ان کے گھر والوں کو دے دو۔ مجھے خان صاحب سے کوئی کینہ نہیں ہے مگر اپنے اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ گناہ کو معاف کرنا گناہ ہے۔

چودھری یہاں سے مایوں ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن مقدمہ پیش ہوا۔ طاہر علی مجرم ثابت ہوئے۔ وہ اپنی صفائی نہ دے سکے۔ انھیں چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔

جب طاہر علی کانسٹبلوں کے ساتھ جیل کی طرف جا رہے تھے تو انھیں ماہر علی تانگہ پر سوار آتا ہوا نظر پڑا۔ ان کا دل بے اختیار اڈ آیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سمجھے کہ ماہر مجھ سے ملنے کو دوڑا ہوا چلا آرہا ہے۔ شاید آج ہی آیا ہے۔ اور آتے ہی آتے یہ خبر سن کر بے قرار ہوگیا ہے۔ جب تانگہ قریب آیا تو چیخ مار کر رو پڑے۔ ماہر علی نے ایک بار انھیں دیکھا لیکن نہ سلام کیا نہ تانگہ روکا۔ نہ پھر ا س طرف دیکھا۔ اپنا منہ پھیر لیا گویا دیکھا ہی نہیں۔ تانگہ طاہر علی کی بغل سے نکل گیا۔ طاہر علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ایک بار پھر چیخ کر روئے وہ خوشی کا نعرہ تھا اور یہ غم کی فریاد۔ وہ آنسو کے قطرے تھے اور یہ خون کے!

لیکن ایک ہی لمحہ میں ان کے دل کو تسکین ہوگئی ماہر نے مجھے دیکھا ہی نہ

ہوگا۔ اس کی نگاہ میری طرف اٹھی ضرور تھی مگر شاید وہ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ ایسا ہوتا بھی تو ہے کہ جب ہم کسی خیال میں محو ہوتے ہیں تو نہ سامنے کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور نہ قریب کی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے اچھا ہی ہوا کہ اس نے مجھے نہ دیکھا ورنہ ادھر مجھے ندامت ہوتی ادھر اسے رنج ہوتا۔

ادھر ماہر علی مکان پر پہنچے تو چھوٹے بھائی آکر لپٹ گئے۔ طاہر علی کے دونوں بچے بھی دوڑے آئے اور ''ماہر چچا آئے'' کہہ کر اچھلنے کودنے لگے۔ کلثوم بھی روتی ہوئی نکل آئی۔ سلام بندگی کے بعد ماہر اپنی ماں کے پاس گئے اس نے انھیں سینہ سے لگا لیا۔

ماہر: تمھارا خط نہ گیا ہوتا ابھی میں تھوڑا ہی آتا۔ امتحان کے بعد ہی تو وہاں لطف آتا ہے۔ کبھی میچ، کبھی دعوت، کبھی سیر، کبھی مشاعرہ، بھائی صاحب کو یہ کیا حماقت سوجھی۔

زینب: بیگم صاحبہ کی فرمائشیں کیسے پوری ہوتیں۔ زیور چاہیے۔ زردہ چاہیے۔ زری چاہیے۔ کہاں سے آتا؟ اس پر کہتی ہیں کہ تمھیں لوگوں نے انھیں غارت کر دیا۔ پوچھو، روٹی دال میں ایسا کون چھپن ٹکے کا خرچ تھا مہینوں سر میں تیل ڈالنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اپنے پاس سے پیسے نکالو تو پان کھاؤ اس پر اتنے طعنے!

ماہر: میں نے تو اسٹیشن سے آتے ہوئے انھیں جیل جاتے دیکھا میں تو شرم کے مارے ان سے کچھ نہ بولا۔ سلام تک نہ کیا۔ آخر لوگ یہی نہ کہتے کہ ان کا بھائی قید خانہ جا رہا ہے۔ منہ پھیر کر چلا آیا۔ بھیا رو پڑے، میرا دل بھی مسوس اٹھا۔ جی چاہتا تھا ان کے گلے سے لپٹ جاؤں لیکن شرم دامن گیر ہوئی۔ تھانہ دار کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ اس کا شمار حکام میں ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال نہ کروں گا۔ تو بدنام ہو جاؤں گا۔

زینب: چھ ماہ کی سزا ہوئی ہے۔

ماہر: جرم تو سنگین تھا مگر شاید حاکم نے رحم کیا۔

زینب: تمھارے ابا کا لحاظ کیا ہوگا ورنہ تین سال سے کم کے لیے نہ جاتے۔

ماہر: خاندان میں داغ لگا دیا۔ بزرگوں کی آبرو خاک میں ملا دی۔

زینب: خدا نہ کرے کہ کوئی مرد عورت کا کلمہ پڑھے۔

اتنے میں ماما ناشتہ کے لیے مٹھائیاں لائی۔ ماہر علی نے ایک مٹھائی طاہر کو دی اور ایک جابر کو۔ ان دونوں نے جا کر صابرا اور نسیمہ کو دکھائی۔ وہ دونوں بھی دوڑے زینب نے کہا۔ ''جاؤ کھیلتے کیوں نہیں؟ کیا سر پر ڈٹ گئے۔ نہ جانے کہاں کے مربھوکے چھوکرے ہیں۔ ان سبوں کے مارے کوئی چیز منہ میں ڈالنی مشکل ہے۔ بلا کی طرح سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ رات دن کھاتے ہی رہتے ہیں پھر بھی ان کا جی نہیں بھرتا۔

رقیہ: چھچھوری ماں کے بچے اور ہوں گے کیسے؟

ماہر نے ایک ایک مٹھائی ان دونوں کو بھی دی پھر بولے۔ اب گزر بسر کی کیا صورت ہوگی؟ بھابی کے پاس تو روپے ہوں گے نا؟

زینب: ہوں گے کیوں نہیں۔ انھیں روپیوں کے لیے تو شوہر کو جیل بھیجا۔ دیکھتی ہوں کیا انتظام کرتی ہیں۔ یہاں کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پوچھنے جائے۔

ماہر: مجھے ابھی نہ جانے کتنے دنوں میں جگہ ملے۔ مہینہ بھر لگ جائے۔ دو مہینے لگ جائیں۔ جب تک مجھے تنگ مت کرنا۔

زینب: تم اس کا غم نہ کرو بیٹا۔ وہ اپنا سنبھالے۔ ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔ وہ زردہ کھا کر سوئیں گی تو ہمیں بھی روکھی روٹیاں میسر ہو جائیں گی۔ جب شام ہوگئی تو زینب نے ماما سے کہا۔ جا کر بیگم صاحبہ سے پوچھو کچھ سودا سلف آئے گا یا آج ماتم منایا جائے گا؟ ماما نے واپس آ کر کہا۔ وہ تو بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جسے بھوک ہو وہ کھائے مجھے نہیں کھانا ہے۔

زینب: دیکھا یہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی کہ صاف جواب ملے گا۔ جانتی ہے کہ لڑکا پردیس سے آیا ہے مگر پیسے نہ نکلیں گے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے بازار سے کھانا منگوا لے گی۔ دوسرے کھائیں یا مریں اس کی بلا سے خیر انھیں ان کے میٹھے نوالے مبارک ہوں۔ ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔

کلثوم نے جب سے سنا تھا کہ طاہر علی کو چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔ جبھی سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ماما پیغام لائی۔ تو وہ سن کر جل اٹھی بولی ان سے کہہ دو کہ پکائیں کھائیں۔ یہاں بھوک نہیں ہے۔ بچوں پر ترس آئے تو دو لقمے

انھیں بھی دے دیں۔

ماما نے ان ہی فقرات کا خلاصہ کہا تھا جس سے یہ گڑ بڑ ہوئی۔

رات کو نو بج گئے۔ کلثوم دیکھ رہی تھی کہ چولھا گرم ہے۔ مصالحہ جات کی خوشبو آرہی تھی۔ بگھار کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب بڑی دیر تک کوئی اس کے بچوں کو بلانے نہ آیا تو ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔ دنیا میں کوئی میرا نہیں ہے۔ دونوں بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ انھیں کے پائینتے وہ بھی پڑی رہی۔ یا اللہ! یہ دو دو بچّے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ گھر کے آدمیوں کا یہ حال۔ یہ ناؤ کیسے پار لگے گی۔

ماہر علی: دسترخوان پر بیٹھے تو ماما سے پوچھا۔ بھابھی نے بھی کچھ بازار سے منگوایا ہے یا نہیں؟

زینب: ماما سے منگوائیں گی تو پردہ ہی فاش ہوجائے گا۔ خدا کے فضل سے صابر سیانا ہوا ہے۔ گپ چپ کے سودے وہی لاتا ہے۔ اور ایسا گھاگھ ہے کہ لاکھ پھسلانے پر بھی منہ نہیں کھولتا۔

ماہر علی: پوچھ لینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ کھاپی کر سوئیں اور وہ بیچاری روزہ سے رہ جائیں۔

زینب: ایسی انیلی نہیں ہیں۔ وہ ہم جیسوں کو چرالائیں۔ ہاں پوچھنا میرا فرض ہے پوچھ لوں گی۔

رقیہ: سالن اور روٹی کس جلتے کھائیں گی۔ انھیں تو زردہ اور شیر مال چاہیے۔

دوسرے روز دونوں بچّے سویرے ہی باورچی خانہ میں گئے تو زینب نے ایسی کڑی نگاہوں سے دیکھا کہ بس روتے ہی لوٹ آئے۔ اب کلثوم سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ جھلاکر اٹھی اور باورچی خانہ میں جاکر ماما سے بولی۔ تو نے بچّوں کو کھانا کیوں نہیں دیا ری؟ کیا اتنی جلد کایا پلٹ ہوگئی؟ اسی گھر کے پیچھے ہم مٹی میں مل گئے اور آج میرے بچّے بھوکوں کے مارے تڑپیں۔ کسی کو ترس نہ آئے۔

ماما نے کہا۔ تو آپ مجھ سے کیا بگڑتی ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں؟ جیسا حکم پاتی ہوں ویسا کرتی ہوں۔

زینب: اپنے کمرے سے بولی۔ تم مٹی میں مل گئیں تو یہاں کس نے گھر بھر لیا؟ کل تک کچھ ناتا نبھاجاتا وہ بھی تم نے توڑ دیا۔ بنئے کے یہاں سے اودھار جنس آئی۔ جب کہیں منہ دانہ گیا۔ سو کوس سے لڑکا آیا۔ تم نے بات تک نہ پوچھی۔ تمھاری نیکی کوئی کہاں تک بیان کرے۔

آج سے کلثوم کو روٹیوں کے لالے پڑگئے۔ ماہر علی کبھی دونوں بھائیوں کو لے کر نانبائی کی دوکان سے کھانا کھاآتے۔ کبھی کسی دوست آشنا کے مہمان ہو جاتے۔ زینب اور رقیہ کے لیے ماما چپکے چپکے اپنے گھر سے کھانا بنالاتی۔ گھر میں چولھانہ جلتا۔ اورصابر علےٰ الصباح گھر سے نکل جاتے اور کوئی، کچھ دے دیتا تو کھالیتے۔ زینب اور رقیہ کی صورت سے ایسا ڈر تے تھے جیسے چوہا بلی سے۔ ماہرکے پاس بھی نہ جاتے۔ بچّے دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ اب وہ پیار کے بھوکے نہیں رحم کے بھوکے تھے۔ رہی کلثوم سو اس کے لیے تو غم ہی کافی تھا۔ وہ سینا پرونا جانتی تھی۔ چاہتی تو سلائی کرکے اپنا گزارہ کرلیتی پر جلن کے مارے کچھ نہ کرتی تھی۔ وہ ماہرکے منہ میں کالکھ لگانا چاہتی تھی کہ دنیا میری حالت دیکھے اور ان پر تھوکے۔ اسے اب طاہر علی پر بھی غصہّ آتا تھا۔ تم اسی قابل تھے کہ جیل میں پڑے پڑے چکی پیسو۔ اب آنکھیں کھلیں گی۔ تم کو دنیا کے ہنسنے کی فکرتھی۔ اب دنیا کسی پر نہیں ہنستی۔ لوگ مزے سے بیٹھے لقمے اُڑاتے اورمیٹھی نیند سوتے ہیں۔ کسی کو بھی تو نہیں دیکھتی کہ جھوٹوں ہی ذرا ان خود غرضوں کی فضیحت کرے کسی کو غرض ہی کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنسے لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ایسے کو تاہ اندیش حیا داروں کی یہی سزاہے۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز سبھاگی کلثوم کے یہاں ساگ بھاجی لے کر آئی۔ وہ اب سبزی فروشی کا کام کرتی تھی۔ کلثوم کی صورت دیکھی تو بولی۔ بہو جی۔ تم تو پہچانی ہی نہیں جاتیں۔ کیا کڑھ کڑھ کر جان دے دوگی؟ بپت تو پڑگئی ہے۔ کُڑھنے سے کیا ہوگا؟ مسل ہے آندھی آئے بیٹھ گنوائے۔ تم نہ رہوگی تو بچّوں کوکون پالے گا؟ دنیا کتنی جلد اندھی ہو جاتی ہے۔ بچارے کھاں صاحب انھیں لوگوں کے لیے مرتے تھے۔ اب کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ گھر گھر یہی چر چا ہورہی ہے کہ ان لوگوں کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ بھگوان کو کیا منہ دکھا ئیں گے۔

کلثوم: اب تو بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہوگیا۔

سہاگی: بہو کوئی منہ پر بھلے نہ کہے پر سب تھڑی تھڑی کرتے ہیں۔ بچارے ننھے ننھے لڑکے مارے مارے پھرتے ہیں۔ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ کل تو چودھری نے ماہر میاں کو کھوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

کلثوم کو ان باتوں سے بڑی تسکین ہوئی۔ دنیا ان لوگوں کو تھوکتی تو ہے۔ ان کی برائی تو کرتی ہے۔ ان بے حیاؤں کو لاج ہی نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ بولی۔ کس بات پر؟

سہاگی: کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ باہر سے چودھری نے پکارا۔ سہاگی نے جاکر پوچھا۔ کیا کہتے ہو؟

چودھری: بہو.جی سے کچھ کہنا ہے۔ جرا پردے کی اُوٹ میں کھڑی ہوجائیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زینب اور رقیہ کسی ولی کے مزار پر شیرینی چڑھانے گئی ہوئی تھی۔ کلثوم پردہ کی آڑ میں آکر کھڑی ہوگئی۔

چودھری: بہو.جی کئی دن سے آنا چاہتا تھا۔ مگر موکا ہی نہ ملتا تھا۔ جب آتا تو ماہر میاں کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتا تھا۔ کل ماہر میاں مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے بھیاّ کی مدد کے لیے جو روپے جمع کئے تھے وہ مجھے دے دو۔ بھابھی نے مانگے ہیں۔ میں نے کہا کہ جب تک بہو.جی سے خود نہ پوچھ لوں گا آپ کو نہ دوں گا۔ اس پر بہت بگڑے۔ کچی پکی منہ سے نکالنے لگے۔ سمجھ لوں گا۔ بڑے گھر بھجوا دوں گا۔ میں نے کہا۔ جائیے۔ سمجھ لیجئے گا۔ تو اب آپ کا حکم کیا ہے؟ وے سب روپے ابھی تک میرے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کو دے دوں نا؟ مجھے تو آج معلوم ہوا کہ وہ سب آپ کے ساتھ دگا کر گئے۔

کلثوم نے کہا: خدا تمھیں اس نیکی کا ثواب دے گا۔ مگر یہ روپے جس کے ہوں انھیں واپس کردو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

چودھری: کوئی نہ لوٹائے گا۔

کلثوم : تو تمھیں اپنے پاس رکھو۔

چودھری: آپ لیتی کیوں نہیں؟ ہم کوئی احسان تھورے جتاتے ہیں۔ کھاں صاحب کی

بدولت بہت کچھ کمایا کھایا ہے۔ دوسرا منسی ہوتا تو ہجاروں روپے بخر لے لیتا۔ یہ انھیں کی بخر سمجھی جائے۔

چودھری نے بہت اصرار کیا مگر کلثوم نے روپے نہ لیے۔ وہ ماہر علی کو دکھانا چاہتی تھی کہ جن روپوں پر تم کتوں کی طرح لپکے تھے۔ انھیں روپوں کو میں نے پیر سے ٹھکرادیا۔ میں لاکھ گئی گزری ہوں پھر بھی مجھ میں غیرت باقی ہے۔ تم مرد ہو کر بے حیائی پر کمرے باندھے ہوئے ہو۔

چودھری یہاں سے چلا تو سبھاگی سے بولا۔ یہی بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ چاہے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں۔ مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پساریں گی۔ ایسا نہ ہوتا تو چھوٹے بڑے میں پھرک ہی کیا رہتا۔ دھن سے بڑائی نہیں ہوتی۔ دہرم سے ہوتی ہے۔

ان روپوں کو لوٹا کر کلثوم کا سر غرور سے اُونچا ہوگیا۔ آج اسے پہلی مرتبہ طاہر علی پر ناز ہوا۔ یہ عزّت ہے کہ پیٹھ پیچھے دنیا برائی کرتی ہے۔ اس بے عزتی سے تو مر جانا ہی اچھا کہ چھوٹے چھوٹے آدمی منہ پر فضیحت کریں۔ کوئی لاکھ ان کے احسان کو مٹائے پر دنیا تو انصاف کرتی ہے۔ روز ہی تو عملے سزا پاتے رہتے ہیں۔ کوئی تو ان کے بال بچّوں کی بات نہیں پوچھتا بلکہ الٹے اور لوگ طعنے دیتے ہیں۔ آج ان کی نیک نامی نے میرا سر اُونچا کر دیا۔

سبھاگی نے کہا: بہو جی۔ بہت عورتیں دیکھیں پر تم جیسی دھیرج والی برلی ہی کوئی ہوگی۔ بھگوان تمھارا سنکٹھ ہریں۔

جانے لگی تو اس نے کئی امرود بچوں کے لیے رکھ دیے۔ کلثوم نے کہا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔
سبھاگی مسکرا کر چلی گئی۔

(37)

پربھوسیوک نہایت مستعد آدمی تھے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کی بدولت سیواسمتی میں جان سی پڑگئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ جو لوگ کاہل اور

بے پرواہ سے ہورہے تھے۔ وہ پھر نئے جوش سے کام کرنے لگے۔ پربھو سیوک کی شرافت اور نیک دلی سب کو فریفتہ کر لیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اب ان میں وہ مستعدی نظر آتی تھی جس کی انھیں خود امید نہ تھی۔ سیوا سمتی کے عموماً سبھی لوگ قابل اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ جاہل سپاہیوں کی فوج نہ تھی جو افسر کے حکم کو حکم خدا مانتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ فوج تھی جو افسر کے حکم پر غور کرتی ہے۔ اسے ہر پہلو سے جانچتی ہے اور جب تک اس کے جواز کی قائل نہ ہوجائے اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ پربھوسیوک نے بڑی ہوشیاری سے اس مشکل کام کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

اب تک اس جماعت کا کام صرف سوشل تھا۔ میلوں تماشاؤں میں جانے والوں کی مدد کرنا۔ باڑھ کے مارے ہوئے کو بچانا۔ مصیبت زدہ عوام کی تکلیف رفع کرنا یہی ان کے خاص کام تھے۔ پربھوسیوک نے سمتی کے دائرہ عمل کو وسیع کردیا۔ اسے سیاسی شکل دے دی۔ اگر چہ انھوں نے کوئی نئی تجویز نہیں پیش کی۔ کسی تبدیلی کا تذکرہ تک نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے اثر سے نئی باتوں کا آغاز ہونے لگا۔

پربھو سیوک نہایت خلیق آدمی تھے مگر کسی کو غریبوں پر ظلم کرتے دیکھ کر ان کا اخلاق تشدّد آمیز ہوجاتا تھا۔ کسی سپاہی کو گھسیاروں کی گھاس چھینتے دیکھ کر وہ فوراً گھسیاروں کی طرف سے لڑنے پر آمادہ ہوجاتے تھے۔ آفتاب ارضی و سماوی سے عوام کی حفاظت کرنا انھیں بے سود سا معلوم ہوتا تھا۔ زبردستوں کے ظلم ہی پر ان کی خاص نگاہ رہتی تھی۔ رشوت خور اہلکاروں پر، ظالم زمینداروں پر، خود غرض حکّام پر، وہ ہمیشہ تاک لگائے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں اس جماعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کا دفتر کمزوروں اور مصیبت زدوں کی جائے پناہ بن گیا۔ پربھوسیوک کمزوروں کو مقابلہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ جب تک عوام خود ہی اپنی حفاظت کرنا نہ سیکھیں گے۔ ایشور بھی انھیں ظلم سے نجات نہیں دے سکتا۔

ہمیں سب سے پہلے اپنی خودداری کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ہم بزدل اور ڈرپوک ہوگئے ہیں۔ ذلّت اور نقصان چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں ۔ ایسے آدمیوں کو تو بہشت میں بھی آرام نہیں مل سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم بے خوف اور جری بنیں۔

مصائب کا مقابلہ کریں۔ مرنا سیکھیں۔ جب تک ہمیں مرنا نہ آئے گا۔ جینا بھی نہ آئے گا۔ پربھوسیوک کے لیے مظلوموں کی حفاظت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن جانا اس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ وہ کسی مریض کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھلے یا قحط زدوں کو غلّہ اور روپیہ تقسیم کرتا پھرے۔ اس کے رفیقوں کو بھی اس قسم کی مردانہ خدمت کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ کچھ لوگ تو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عوام میں بدامنی پیدا کرنا بھی والنیٹروں کا خاص فرض ہے۔ اندردت اس غول کا سرغنہ تھا اور اسے نرم رکھنے کے لیے پربھوسیوک کو نہایت ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا تھا۔

لیکن جیوں جیوں یہ جماعت مشہور اور ہردل عزیز ہوتی گئی۔ اس پر حکّام کا شبہ بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا۔ اب کنور صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں سرکار اس جماعت کا تشدّد سے خاتمہ نہ کردے۔ کچھ دنوں میں یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ حکّام میں کنور صاحب کی ریاست کو ضبط کرنے کا چرچا ہورہا ہے۔ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے۔ مگر یہ افواہ سن کر ان کی طبعیت بھی ڈانوا ڈول ہوگئی۔ وہ ثروت سے حظ نہ اٹھانا چاہتے تھے مگر ثروت کی خواہش کو ترک نہ کر سکتے تھے۔ ان کو دوسروں کی بھلائی کرنے میں اس سے کہیں زیادہ خوشی ملتی تھی جتنی کہ نفس پرستی میں۔ بھلائی کرنے میں عزّت تھی وہ عزّت ہی نہ رہی تو جینے میں کیا مزہ رہا۔ وہ پربھوسیوک کو بار بار سمجھاتے۔ بھئی ذرا سوچ سمجھ کر کام کرو۔ حکّام سے بچ کر چلو۔ ایسے کام ہی کیوں کرو۔ جن سے حکّام کو تم پر شبہ ہو؟ تمھارے لیے رفاہِ عام کا میدان کیا کم ہے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑو؟ لیکن پربھوسیوک ان کے مشورہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دھمکاتے تھے کہ استعفےٰ دے دوں گا۔ ہمیں حکّام کی کیا پرواہ؟ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہم سے کچھ نہیں پوچھتے۔ پھر ہمیں کیوں ان کا رخ دیکھ کر کام کریں؟ ہم اپنے مجوزہ راستہ سے منحرف نہ ہوں گے۔ حکّام کا جو جی چاہے کریں۔ خود داری کے احساس کو مٹا کر ہستی کو زندہ بھی رکھا تو کیا۔ ان کا رخ دیکھ کر کام کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں۔ مقدمہ بازی کریں۔ ایک دوسرے کا برا چیتیں اور پڑے پڑے سوئیں۔ ہمارے اور ان کے اغراض میں اختلاف ہے جس سے ہمارا فائدہ ہے۔ اس سے ان کا نقصان ہے۔اور ایسی حالت میں‌ان کا بدگمان ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اگر ہم لوگ اس طرح

ڈرتے رہیں گے تو پھر ہمارا عدم و وجود برا بر ہے۔

ایک روز دونوں آدمیوں میں بحث کی نوبت آگئی۔ بندوبست کے حکام نے کسی صوبہ میں آراضی کا محصول اپنے حسب دلخواہ بڑھ دیا تھا۔ کاؤنسلوں اخباروں اور سیاسی جلسوں میں اس اضافہ کی مخالفت کی جارہی تھی۔ مگر حکام متعلقہ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ پر بھوسیوک کی رائے تھی کہ ہمیں جا کر اسامیوں سے کہنا چاہیے کہ سال بھر تک زمین کو پرتی پڑی رہنے دیں۔ کنور صاحب کہتے تھے کہ یہ تو کھلم کھلا حاکموں سے بیر مول لینا ہے۔

پربھوسیوک: اگر آپ ڈررہے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس جماعت کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ دو کشتیوں پر بیٹھ کر دریا کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھے رئیسوں پر پہلے بھی اعتبار نہ تھا اور اب تو بالکل ہی مایوس ہوگیا ہوں۔

کنور: تم میرا شمار رئیسوں میں کیوں کرتے ہو۔ جب تمھیں خوب معلوم ہے کہ مجھے ریاست کی پرواہ نہیں ہے؟ لیکن کوئی کام روپیہ کے بغیر تو نہیں چل سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ دیگر قومی انجمنوں کی طرح اس انجمن کو بھی روپیہ کی کمی کے سبب ہم ٹوٹتا ہوا دیکھیں۔

پربھوسیوک: میں بڑی سے بڑی جائداد کو بھی اصول پر قربان کر دینے سے دریغ نہ کروں گا۔

کنور: میں بھی نہ کرتا اگر جائداد میری ہوتی۔ لیکن جائداد میرے ورثاء کی ہے۔ اور مجھے کوئی مجاز نہیں ہے کہ میں بلا ان کی مرضی جائداد کو تلف کردوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اعمال کا خمیازہ میرے ورثاء کو اٹھانا پڑے۔

پربھوسیوک: یہ روساء کی پرانی دلیل ہے۔ وہ اپنی ثروت پسندی کو اسی پردہ کی آڑ میں چھپایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو خوف ہے کہ ہمارے کاموں سے آپ کی جائداد کو نقصان پہنچے گا۔ تو بہتر ہے کہ آپ اس انجمن سے قطع تعلق کرلیں۔

کنور صاحب نے متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ پربھو۔ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ اس تحریک کی بنیاد ابھی کتنی کمزور ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ حکام کی تیز نگاہی کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ میرا اور تمھارا مقصد ایک ہی ہے۔ میں بھی وہی چاہتا ہوں

جو تم چاہتے ہو۔ لیکن میں سن رسیدہ ہوں۔ آہستہ چلنا چاہتا ہوں۔ اور تم جوان ہو۔ دوڑنا چاہتے ہو۔ میں حکام کی مہر بانیوں کا متمنی نہیں ہوں۔ میں بہت پہلے تجویز کر چکا ہوں کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھ ہے۔ اپنے بہبود کے لیے جو کچھ کریں گے ہمیں کریں گے۔ دوسروں سے ہمدردی یا مدد کی اُمید رکھنا فضول ہے۔ لیکن کم از کم ہماری قومی تحریکات کو زندہ تو رہنا ہی چاہیے۔ میں اس تحریک کو حکام کی بدگمانیوں کا شکار بنا کر اس کا فاتحہ پڑھنا نہیں چاہتا۔

پربھوسیوک نے کچھ جواب نہ دیا۔ بات بڑھ جانے کا خوف تھا۔ البتہ دل میں طے کر لیا کہ اگر کنور صاحب نے زیادہ مداخلت کی تو ان کو اس جماعت سے علیحدہ کردوں گا۔ روپیہ کا سوال اتنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے لیے تحریک کی بیخ کنی کردی جائے۔ اندردت نے بھی یہی صلاح دی تھی۔ کنور صاحب کو الگ کردینا چاہیے۔ ہم دوائیں تقسیم کرنے اور قحط زدہ علاقوں میں مویشیوں کا چارہ ڈھونڈنے کے نہیں ہیں۔ ہے وہ بھی ہمارا کام۔ اس سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن میں اسے اتنا وزن دار نہیں سمجھتا۔ یہ انہدام کا زمانہ ہے۔ تعمیر کا زمانہ بعد کو آئے گا۔ طاعون قحط اور سیلاب سے دنیا کبھی ویران نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔

شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب کتنے ہی اہم معاملات میں یہ دونوں آدمی کنورصاحب سے رائے تک نہ لیتے۔ بیٹھ کر آپس ہی میں طے کر لیتے۔ ہر طرف سے مظالم کی خبریں ہر وقت دفتر سے آتی رہتی تھیں۔ کہیں کہیں تو لوگ اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہوجاتے۔ اس سے اس امر کا یقین ہوتا جاتا تھا کہ سمیتی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اسے کسی مستقل سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں کافی حوصلہ اور جوش ہو تو کبھی روپیوں کا کال نہیں پڑ سکتا۔ جیوں جیوں یہ بات ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ کنور صاحب کی ماتحتی ممبروں کو کھلتی تھی۔

پربھوسیوک کا کلام ان دنوں انقلابی جذبات سے مملوہوتا تھا۔ قومیت۔ جدوجہد۔ کشمکش کا جذبہ ہر شعر سے مترشح ہوتا تھا۔ اس نے کشتی کے عنوان سے ایک نظم لکھی جسے بحر شاعری کا ایک گوہر نایاب کہنا بیجانہ ہوگا۔ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے

تھے۔ پہلے ہی بند میں مسافر نے پوچھا تھا۔ کیوں مانجھی۔ کشتی ڈوبے گی یا پار لگے گی۔ مانجھی نے جواب دیا۔ مسافر کشتی ڈوبے گی کیونکہ تمھارے دل کو یہ اندیشہ اسی سبب سے ہوا ہے۔ کوئی ایسا جلسہ یا مجمع نہ تھا جہاں پر یہ نظم نہ پڑھی گئی ہو۔ ادبی دنیا میں ہل چل سی مچ گئی۔

خدمتی جماعت پر پربھوسیوک کا اقتدار دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ عموماً ممبروں کو اب ان سے عقیدت ہوگئی تھی۔ سبھی دل وجان سے ان کے اشاروں پر چلنے کو تیار تھے۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قومیت کے نشہ میں چور، نہ دولت کی پرواہ، نہ گھر بار کی فکر، روکھا سوکھا کھانے والے، موٹا جھوٹا پہننے والے، زمین پر سو کر رات کاٹ دیتے تھے۔ گھر کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کسی درخت کے نیچے پڑ رہتے۔ کبھی کسی جھونپڑے میں۔ ہاں ان کے دل میں اعلیٰ اور پاک حب الوطنی کے جذبات امڑ رہے تھے۔

تمام ملک میں اس انجمن کے حسن انتظام کی دھوم تھی۔ پر بھوسیوک ملک کے معزز اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے۔ اتنی کم عمری یہ ناموری! لوگوں کو تعجب ہوتا تھا جگہ جگہ سے قومی مجلسوں نے انھیں بلانا شروع کیا۔ جہاں جاتے لوگ ان کی تقریر سن کر از خود رفتہ ہوجاتے تھے۔

پونا میں قومی سبھا کا جلسہ تھا۔ پربھوسیوک کو نوید ملا۔ انھوں نے فوراً اندردت کو اپنا کام سپرد کیا اور جنوبی علاقہ جات میں سفر کرنے کا ارادہ کر کے روانہ ہوگئے۔ پونا میں ان کے استقبال کی خوب خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ یہ شہر قومی کارکنوں کا ایک مرکزی مقام بھی تھا۔ ان کا افسر بڑے جیوٹ کا آدمی تھا جس نے برلن میں انجینئری کی ڈگری حاصل کی تھی اور تین سال کے لیے اس جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا تمام شہر میں بڑا رسوخ تھا۔ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو لیے ہوئے اسٹیشن پر کھڑا ہوا تھا۔ پربھوسیوک کا دل اس دھوم دھام کو دیکھ کر خوش ہوگیا۔ ان کے دل نے کہا۔ یہ میری سرکردگی کا اثر ہے۔ یہ لگن، یہ بے خوفی، یہ بیداری ان میں کہاں تھی؟ میں نے ہی انھیں پیدا کیا تھا۔ اب امید ہوتی ہے کہ زندہ رہا تو کچھ نہ کچھ کر دکھاؤں گا۔

آہ غرور!

شام کے وقت بڑے پنڈال میں جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو کئی ہزار سامعین کو اپنی طرف عقیدت مندانہ نگاہوں سے تاکتے ہوئے دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ گیلری میں یوروپین لیڈیاں بھی موجود تھیں۔ صوبہ کے گورنر بھی تشریف لائے تھے۔ جس کی تحریر میں یہ معجزہ ہے اس کی تقریر میں کیا کچھ جادو ہوگا۔ سب یہی دیکھنا چاہتے تھے۔

پربھو سیوک کا لکچر شروع ہوا۔ کسی سے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ قانون سیاست کی فلسفیانہ تشریح کر نے لگے۔ وہ قانون کیا ہے۔ اس کی ضرورت کیوں ہے۔ اس کی پابندی کا کیا طریقہ ہے۔ کن حالتوں میں اس کی خلاف بندی کرنا چاہیے۔ اس میں کیا بھلائی برائی ہے؟ انھوں نے نہایت قابلیت اور بے خوفی سے ان سوالوں کی توضیح کی۔ ایسے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو اگر کوئی شخص سلیس اور دل کش بنا سکتا تھا تو وہ پربھوسیوک تھے۔ گوسیاست بھی دنیا کی ان مخصوص چیزوں میں ہے جو توضیح و تشریح کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کی تشریح اس کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ پربھوسیوک نے پر دہ اٹھادیا۔ فوجوں کے پرے نظروں سے غائب ہوگئے۔ عدالتوں کے شاندار محل زمین دوز ہوگیے۔ ثروت و اقتدار کے نشانات مٹنے لگے۔ سامنے روشن وار جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ قانون کا نہ ہونا ہی بہترین قانون ہے۔ لیکن جوں ہی ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ہمارا ملک بلاقانون کا ہے۔ مجبوری اور پابندی میں بعدالمشر قین ہے۔ اسی وقت سامنے سے پستول دغنے کی آواز آئی۔ اور گولی پربھوسیوک کے کان کے پاس سے نکل کر پیچھے دیوار میں جالگی۔ رات کا وقت تھا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ وار کیا۔ شک ہوا کہ کسی یوروپین کی شرارت ہے۔ لوگ گیلریوں کی طرف دوڑے۔ معاً پربھوسیوک نے بلند آواز میں کہا۔ میں اس شخص کو معاف کرتاہوں جس نے مجھ پر وار کیا ہے۔ اس کا جی چاہے تو وہ پھر مجھے نشانہ بنا سکتا ہے۔ میری جانب سے کسی کو بدلہ لینے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اپنے خیالات کی اشاعت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ زیادتیوں کے انتقام کے لیے نہیں۔

ایک سمت سے آواز آئی۔ یہ قانون کی ضرورت کا روشن ثبوت ہے۔

جلسہ برخاست ہوگیا۔ یورپین اصحاب عقب کے دروازہ سے نکل گئے۔ باہر

مسلّح پولیس آ پہنچی تھی۔

دوسرے روز شام کو پربھوسیوک کے نام ایک تار آیا کہ خدمتی انجمن کی انتظامیہ کمیٹی آپ کے لیکچر کو نا پسند کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اسے واپس لیں ورنہ یہ کمیٹی آپ کے لیکچروں کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

پربھوسیوک نے تار کے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اسے پیروں سے کچلتے ہوئے آپ ہی آپ بولے۔ مکّار۔ بزدل۔ رنگاسیار۔ قومیت کا دم بھرتا ہے۔ قوم کی خدمت کرے گا۔ایک تقریر سے کایا پلٹ کردی۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ قومی خدمت کو بچّوں کا کھیل سمجھ رکھاہے۔ یہ بچّوں کا کھیل نہیں ہے۔ سانپ سے کھیلنا ہے۔ شیر سے پنجہ لینا ہے اگر اپنی جان اور دولت اتنی پیاری ہے تو یہ سوانگ کیوں بھرتے ہو؟ جاؤ تم جیسے قوم پرستوں کے بغیر ملک کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

انھوں نے اسی وقت تار کا جواب دیا۔ میں انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت ہونا اپنے لیے ذلت آمیز سمجھتا ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ کے بعد دوسرا خط آیا۔ اس پر سرکاری مہر تھی۔ لکھا تھا: مائی ڈیرسیوک۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کل آپ کی تقریر سن کر مجھے کتنا حظ اور نفع حاصل ہوا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھیے کہ سیاست کی ایسی عالمانہ اور باریک تشریح میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ قواعد نے میری زبان بند کر رکھی ہے مگر میں آپ کے جذبات کی خیالات کی عزت کرتا ہوں۔ اور خدا سے دست بہ دعاہوں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم سیاست کا راز سمجھیں اور اس کے اعلیٰ ترین اصولوں پر کاربند ہوسکیں۔ صرف ایک ہی ایسا شخص ہے جسے آپ کی صاف گوئی شاق ہے اور مجھے افسوس وشرم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص یوروپین ہے۔ میں یوروپین جماعت کی طرف سے اس وحشیانہ اور بزدلانا حملہ پر اپنے رنج و نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کل یوروپین جماعت کو آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر میں اس شیطان کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوا (اس کا کل سے پتہ نہیں ہے۔) تو آپ کو اس کی اطلاع دینے میں مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہ ہوگا۔ آپ کا ایف ولسن۔

پربھو سیوک نے اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اسے اپنے صندوق میں رکھ دیا۔ کوئی اور وہاں ہوتا تو ضرور ہی اسے پڑھ کر سناتے۔ وہ گھمنڈ میں آکر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ یہ ہے زندہ قوموں کی فیاضی۔ فراخدلی اور قدردانی؟ انھوں نے آزادی کا لطف اُٹھایا ہے۔ آزادای کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اور آزادی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ جس کی ساری زندگی دوسروں کی خوشامد کرنے اور دوسروں کا منہ تاکنے میں گزری ہو وہ آزادی کی اہمیت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ مرنے کے دن سر پر آجاتے ہیں تو ہم کتنے خدا پرست بن جاتے ہیں۔ بھرت سنگھ بھی اسی طرف گئے ہوتے۔ اب تک رام نام کی مالا پھیرتے ہوتے۔ وہ تو ونے سنگھ نے اس طرف گھمادیا۔ یہ انھیں کا اثر تھا۔ ونے اس وقت تمھاری ضرورت ہے۔ بڑی ضرورت ہے۔ تم کہاں ہو؟ آکر دیکھو تمھاری اس کشت کا کیا حال ہے۔ اس کے محافظ ہی اسے اُجاڑ رہے ہیں۔

(38)

صوفیہ اور ونے ساری رات تو اسٹیشن پر پڑے رہے۔ سویرے قریب کے گاؤں میں گئے جو بھیلوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ صوفیہ کو یہ مقام بہت پسند آیا۔ گاؤں کے سر پر پہاڑ کا سایہ تھا۔ اور پیروں کے نیچے ایک پہاڑی چشمہ بیٹھا راگ گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بھیلوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے جن پر بیل بوئی تھی پریوں کے کھلونوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ جب تک یہ نہ طے ہو جائے کہ کیا کرنا ہے کہاں جانا ہے کہاں رہنا ہے اس وقت تک انھوں نے اسی گاؤں میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک جھونپڑے میں جگہ بھی آسانی سے مل گئی۔ بھیلوں کی مہمان نوازی مشہور ہے اور یہ دونوں بھوک، پیاس، گرمی، سردی برداشت کرنے کے عادی تھے۔ جو کچھ موٹا جھوٹا میسرّ ہوا کھا لیا۔ چائے اور مکھن مربےّ اور میووں کا چسکا نہ تھا۔ صاف اور سادہ غذا ان کی خوراک تھی۔ وہاں ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس جھونپڑے میں صرف ایک بھیلنی رہتی تھی۔ اس کا لڑکا کہیں فوج میں ملازم تھا۔ بڑھیاں ان لوگوں کی خدمت خوشی سے کرتی۔ یہاں انھوں نے مشہور کیا کہ ہم دلّی کے رہنے والے ہیں۔ تبدیلی آب و

ہوا کی غرض سے آئے ہیں۔ گاؤں کے باشندے ان کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے۔

مگر اتنی خلوت اور آزادی کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔ دونوں نہ جانے کیوں خائف رہتے تھے۔ ان میں ناچاقی نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں مضطرب تھے، دونوں بے قرار، دونوں بیتاب، مگر اخلاقی پابندیوں کا خیال انھیں باہم ملنے نہ دیتا تھا۔ عمیق مذہبی مطالعہ نہ صوفیہ کو فرقہ بندیوں کی تنگی سے آزاد کردیا تھا۔ اس کے دل میں اب کسی سے نفرت یا مخالفت نہ تھی۔ جس بے اطمینانی نے مہینوں تک اس کے مذہبی اصولوں کا دبا رکھا تھا۔ وہ مفقود ہوگئی تھی۔ اب کل جاندار اس کے لیے اپنے ہی تھے۔ اگرچہ ونے کے خیالات اتنے وسیع نہ تھے۔ دنیا کی محبت ان کی نگاہ میں ایک فلسفیانہ بحث سے زیادہ قیمتی تھی۔ مگر صوفیہ کی وسیع الخیالی کے سامنے اس کے موروثی احساسات منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ واقعی دونوں کا روحانی ارتباط ہو چکا تھا اور مادی ارتباط میں بھی کوئی ٹھوس رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں جدا رہتے تھے۔ تنہائی میں ساتھ ساتھ کبھی نہ بیٹھتے تھے۔ انھیں اب اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔ تقریر کا دور ختم ہو چکا تھا۔ تحریر کا دور آگیا تھا۔ تقریر سے زبان نہیں کٹتی تحریر سے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔

لیکن تحریر سے ہاتھ چاہے کٹ جائیں پھر بھی اس کے بغیر کوئی بات پختہ نہیں ہوتی۔ ذرا سا اختلاف۔ ذراسی بے احتیاطی سے سمجھوتہ مسترد ہو سکتا ہے۔ اس لیے دونوں ہی اس غیر یقینی حالت کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ کیسے کریں۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کون اس تذکرے کو چھیڑے؟ شاید باتوں میں کوئی اعتراض پیدا ہوجائے۔ صوفیہ کے لیے تو ونے کی قربت کافی تھی۔ وہ انھیں ہر وقت آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ ان کے رنج اور خوشی میں شریک ہوتی تھی۔ انھیں اپنا سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتی تھی۔ ونے ہر روز آس پاس کے دیہاتوں میں گھومنے چلے جاتے تھے۔ کوئی عورت ان سے اپنے پردیسی لڑکے یا شوہر کے نام خط لکھاتی کہیں وہ مریضوں کو دوا دیتے کہیں انھیں آپس کے جھگڑوں میں پنچ بننا پڑتا۔ صبح کے گئے پھر رات گزرے لوٹتے۔ یہ ان کا روز مرّہ کا دستور تھا۔ صوفیہ چراغ جلائے ان کی راہ دیکھا کرتی۔ جب وہ آجاتے تو ان کے ہاتھ پیر دھلوا کر کھانا کھلواتی۔ دن بھر کی باتیں اشتیاق سے

سنتی اور پھر دونوں اپنی اپنی کوٹھریوں میں سونے چلے جاتے۔ وہاں ونے کو اپنا گھاس کا بچھونا ملتا۔ سرہانے پانی کی ہانڈی رکھی ہوتی۔ صوفیہ اتنے ہی سے مطمئن تھی۔اگر اسے یقین ہوجاتا کہ میری ساری زندگی اسی طرح کٹ جائے گی۔ تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی۔ یہی اس کی زندگی کا خواب شیریں تھا۔ لیکن ونے اتنے صابر اور بے نیاز نہ تھے۔ ان کو محض روحانی ارتباط سے تسکین نہ ملتی تھی۔ صوفیہ کا بے مثال حسن، اس کی شیریں کلامی، اس کے جسم کا سڈول پن، ان کے عشقیہ تخیل کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ انھوں نے نامناسب حالات میں پڑ کر ایک بار اسے کھو دیا تھا۔ وہ اب دوبارہ اس امتحان میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ جب اس کا امکان تھا ان کے دل کو کبھی سکون نہ مل سکتا تھا۔

یہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے پتہ پر اپنے نام کے خطوط، اخبارات، رسالے اور کتابیں وغیرہ منگا لیا کرتے تھے۔ ان سے دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ بھیلوں سے انھیں کچھ محبت سی بھی ہوگئی تھی۔ یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانے کی انھیں خواہش نہ ہوتی تھی۔ دونوں کو خوف تھا کہ اس محفوظ مقام سے نکل کر ہمارا نہ جانے کیا حال ہو۔ نہ جانے ہم کس بھنور میں جا پھنسیں اس گوشہ عافیت کو دونوں ہی غنیمت سمجھتے تھے۔ صوفیہ پر یقین نہ تھا۔ وہ اپنی مقناطیسی قوت سے بے خبر تھے۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ صوفیہ ونے کو ناشتہ کراکے انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک کتاب دیکھ رہی تھی۔ کبھی اہم مقامات پر پنسل سے انگوٹھے کا نشان لگاتی۔ کبھی سوالیہ نشان لگاتی اور کہیں کہیں خط بھی کھینچ دیتی۔ ونے کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ محویت سرد مہری کی علامت تو نہیں ہے۔مطالعہ میں ایسی محو ہے کہ دوسری طرف دیکھتی بھی نہیں۔ انھوں نے کپڑے پہنے۔ وہ باہر جانا چاہتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ سرمائی پارچے موجود نہ تھے۔ کمبل کافی نہ تھا۔ آلس میں ہو کر انگیٹھی کے پاس آئے اور ماچی پر بیٹھ گئے۔ صوفیہ کی نگاہیں کتاب کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ونے کی للچائی ہوئی نظر موقع پاکر آزادی سے اس کے حسن خدا داد کا جلوہ دیکھنے لگی۔ دفعتاً صوفیہ نے سر اٹھایا تو ونے کو اپنی طرف مخمور نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کرلیں اور کہا۔ آج تو بڑی سردی ہے۔ کہاں جاؤ گے؟ بیٹھو تمھیں اس

کتاب کے چند ابواب سناؤں۔ نہائیت عمدہ کتاب ہے۔ یہ کہہ کر اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ بھیلنی غائب تھی۔ شاید لکڑیاں چننے چلی گئی تھی۔ اب دس بجے کے پہلے نہ آئے گی۔ صوفیہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

ونے نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا۔ نہیں صوفی آج کہیں نہ جاؤں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب بند کر کے رکھ دو۔ تمھارے ساتھ رہ کر بھی تم سے باتیں کرنے کو ترستا رہتا ہوں۔

یہ کہہ کر انھوں نے صوفیہ کے ہاتھوں سے کتاب چھین لینے کی کوشش کی۔ صوفیہ کتاب کو مضبوط سے پکڑ کر بولی۔ ٹھہرو۔ کیا کرتے ہو؟ اب یہی شرارت مجھے بھلی نہیں لگتی۔ بیٹھو۔ اس فرانسیسی فلاسفر کے خیالات سناؤں۔ دیکھو اس نے مذہبی تفسیر میں کتنی وسیع النظری سے کام لیا ہے۔

ونے: نہیں آج دس منٹ کے لیے تم اس فلا سفر سے چھٹی مانگ لو اور میری وہ باتیں سن لو جو کسی پنجرے میں پڑی ہوئی چڑیا کی طرح باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ آخر میرے اس بن باس کی کوئی مدّت ہے یا ہمیشہ مسرّت کے خواب ہی دیکھتا رہوں گا۔

صوفیہ: اس فلاسفر کے خیالات اس جواب سے کہیں دلچسپ ہیں جو میں تمھیں دے سکتی ہوں۔ مجھے ان پر کئی شکوک ہیں۔ ممکن ہے۔ تبادلہ خیالات سے وہ رفع ہو جائیں۔

ونے: نہیں۔ یہ کتاب بند کرکے رکھ دو۔ آج میں تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن کر حاضر ہوا ہوں۔ آج تم سے وعدہ لیے بغیر تمھارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ کیا اب بھی میرا امتحان لے رہی ہو؟

صوفیہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور متانت سے کہا۔ میں نے تو اپنے کو تمھارے قدموں پر ڈال دیا۔ اب اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

ونے: اگر میں دیوتا ہوتا تو تمھاری محبت آمیز پرستش سے قانع ہو جاتا۔ لیکن میں بھی توخواہشات کا تابع کمزور انسان ہوں۔ میں نے جو کچھ پایا ہے اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں اور چاہتا ہوں۔ سب چاہتا ہوں۔ کیا اب بھی تم میرا مطلب نہیں سمجھیں؟

میں چڑیا کو اپنی منڈیر پر بیٹھی دیکھ کر آسودہ نہیں۔ میں اسے اپنے پنجڑے میں جاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اور بھی زیادہ صاف الفاظ میں کہوں؟ میں پھول کا رس چاہتا ہوں۔ صرف پھول کی خوشبو سے میرا جی نہیں بھرتا۔

صوفیہ: ونے مجھے ابھی مجبور نہ کرو۔ میں بالکل تمھاری ہی ہوں۔ میں اس وقت یہ بات جتنی صداقت اور خلوص سے کہہ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ کسی مندر یا کلیسا میں یا کسی ہون کنڈ کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔ جس وقت میں نے تمھاری توہین کی تھی اس وقت بھی تمھاری تھی۔ لیکن معاف کرنا۔ میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کروں گی۔ جس سے تمھاری سبکی، تمھاری ذلت یا تمھاری برائی ہو۔ میری یہ احتیاط اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے لیے ہے۔ روحانی اتصال کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مگر جسمانی اتصال کے لیے عزیز واقارب کی منظوری اور سوسائٹی کے قواعد کی پابندی لازمی ہے۔ ورنہ یہ اتصال شرمناک ہوجاتا ہے۔ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ اگر میرے باعث تم پر تمھارے ماں باپ بالخصوص تمھاری ماں کی ناخوشی ہو اور میرے ساتھ تمھیں بھی ننگ خاندان سمجھنے لگیں۔ میں قیاس بھی نہیں کرسکتی کہ اس کجروی کے لیے رانی جی تمھیں اور خصوصاً مجھے کیا سزا دیں گی۔ وہ ستی ہیں، دیوی ہیں۔ ان کا غصہ نہ جانے کیا غضب ڈھائے۔ میں ان کی نگاہ میں کتنی ذلیل ہوں۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ اور تمھیں بھی انھوں نے انتہائی سزادے دی جو ان کے امکان میں تھی۔ ایسی حالت میں جب انھیں معلوم ہوگا کہ میرے اور تمھارے درمیان صرف محبّت کا رشتہ نہیں۔ عقد کا رشتہ قائم ہوگیا ہے تو عجب نہیں کہ وہ غصہ سے مغلوب ہو کر خودکشی کرلیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت تم ان ساری پریشانیوں کے لیے تیار ہو جاؤ مگر میں مادی تعلق اتنا اہم نہیں سمجھتی۔

ونے نے اُداس ہو کر کہا۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ میری ساری عمر خوشی کا خواب دیکھتے ہی تمام ہو جائے۔

صوفیہ: نہیں ونے۔ میں اتنی نا امید نہیں ہوں۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ کبھی نہ کبھی رانی جی سے تمھارا اور اپنا قصور معاف کرا لوں گی۔ اور پھر ان کی دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کی متحد زندگی کا آغاز ہوگا۔ رانی جی کی خوشی اور نا خوشی دونوں انتہا پذیر ہوتی ہیں۔ ایک انتہا کا اندازہ ہم کر چکے۔ خدا نے چاہا تو دوسری انتہا کا بھی جلد ہی اندازہ

ہوجائے گا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں کہ اب اس معاملہ کا ذکر پھر نہ کرنا ورنہ مجھے کوئی دوسرا دامن تلاش کرنا پڑے گا۔

ونے نے آہستہ سے کہا۔ وہ دن جبھی آئے گا جب یا تو اماں جی نہ ہوں گی۔ یا میں نہ رہوں گا۔

پھر انھوں نے کمبل اوڑھا۔ ہاتھ میں لکڑی لی اور باہر چلے گئے جیسے کوئی کسان مہاجن کی ڈانٹ سن کر اس کے گھر سے باہر نکلے۔

پھر بدستور سابق دن گزرنے لگے۔ ونے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے۔ حتی الامکان گھر سے باہر ہی گھوما کرتے۔ آتے بھی تو کھانا کھا کر چلے جاتے۔ کہیں جانا ہوتا تو ندی کے کنارہ پر جا بیٹھتے اور گھنٹوں نظارہ آب سے دل بہلاتے رہتے۔ کبھی کاغذ کی ناویں بنا کر اس میں چھوڑتے اور ان کے پیچھے پیچھے وہاں تک جاتے جہاں کہ وہ غرقاب ہو جاتیں۔ انھیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ صوفیہ کو اب بھی مجھ پر یقین نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مگر میری اخلاقی طاقت پر اسے شک ہے۔

ایک روز وہ ندی کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بڑھیا بھیلنی پانی بھرنے کو آئی۔ انھیں وہاں بیٹھے دیکھ کر اس نے گھڑا رکھ دیا اور بولی۔ کیوں مالک تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ گھر میں مالکن گھبراتی نہ ہوگی؟ میں انھیں بہت روتے دیکھا کرتی ہوں۔ کیا بات ہے کہ کبھی تم دونوں کو بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے نہیں دیکھتی؟

ونے نے کہا: کیا کروں ماتا۔ انھیں یہی بیماری ہے کہ مجھ سے روٹھی رہتی ہیں - یہ بیماری انھیں برسوں سے ہوگئی ہے۔

بھیلنی: تو بیٹا۔ اس کا اوپائے میں کردوں گی۔ ایسی جڑی دے دوں کہ تمھارے بنا انھیں چھن بھر بھی چین نہ آئے۔

ونے نے کہا: کیا ایسی جڑی بھی ہوتی ہے۔

بڑھیانے واقفیت کے لہجہ میں کہا۔ بیٹا جڑیاں تو ایسی ایسی ہوتی ہیں کہ چاہے آگ باندھ لو۔ پانی باندھ لو۔ مردے کو جلادو۔ مدعی کو گھر بیٹھے مار ڈالو۔ ہاں جاننا چاہیے۔ تمھارا بھیل بڑاگنی تھا۔ راجوں کے دربار میں آیاجایا کرتا تھا۔ اسی نے مجھے دو چار بوٹیاں بتا دی تھی۔ بیٹا۔ ایک ایک بوٹی ایک ایک لاکھ کو سستی ہے۔

ونے: تو میرے پاس اتنے روپے کہاں ہیں؟

بھیلنی: نہیں بیٹا۔ تم سے میں کیا لوں گی۔ تم تو لسناتھ پوری کے نواسی ہو۔ تمھارے درسن پا گئی۔ یہی میرے لیے بہت ہے۔ وہاں جاکر میرے لیے تھوڑا سا گنگا جل بھیج دینا۔ بڑھیا تر جائے گی۔ تم نے مجھ سے پہلے نہ کہا نہیں تو میں وہی جڑی بوٹی تمھیں دے دی ہوتی۔ تم دونوں کی ان بن دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

شام کے وقت جب صوفیہ بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ بھیلنی نے ایک جڑی لا کر ونے سنگھ کو دی اور بولی۔ بیٹا۔ بڑے جتن سے رکھنا۔ لاکھ روپے ہوگے تب بھی نہ ملے گی۔ اب تو بِدّیا ہی اٹھ گئی۔ اس کو اپنے لہو میں پندرہ روج بھگو کر سکھاؤ۔ تب اس میں سے ایک ایک رتی کاٹ کر مالکن کو دھونی دو۔ پندرہ دن کے پیچھے جو بچ رہے وہ ان کے جوڑے میں باندھ دو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو تم آپ ان سے اوبنے لگوگے۔ وہ پر چھائیں کی طرح تمھارے پیچھے لگی رہیں گی۔ یہ کہہ کر اس نے ونے کے کان میں ایک منتر بتایا جو کئی مہمل الفاظ کا مجموعہ تھا اور کہا کہ جڑی کو لہو میں ڈباتے وقت یہ منتر پانچ بار پڑھ کر جڑی پر پھونک دینا۔

ونے سنگھ توہم پرست نہ تھے۔ منتر پر ان کا ذرا بھی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن سنی سنائی باتوں سے انھیں یہ معلوم تھا کہ نیچی ذاتوں میں اس قسم کے جادو ٹونے کا بڑا رواج ہے اور کبھی کبھی اس سے حیرت انگیز نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ خود عمل میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر کچھ نتیجہ ہوتا ہے تو وہ جہلاء کی دماغی کمزوری کے سبب۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر جو عموماً شکی ہوتے ہیں۔ جو ایشور کی ہستی کو بھی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان باتوں کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ تو بھی انھوں نے عمل کا تہیہ کر لیا۔ انھیں کسی نتیجہ کی امید نہ تھی۔ وہ صرف امتحاناً ایسا کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اگر کہیں واقعی اس جڑی میں کوئی معجزہ ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ اس کے خیال ہی سے ان کا دل بے حد مسرور ہو گیا۔ صوفیہ میری ہو جائے گی۔ اس وقت اس کی محبت میں کچھ اور ہی بات ہوگی۔

جوں ہی منگل کا دن آیا ۔ وہ ندی پر گئے۔ اور چاقو سے اپنی ایک انگلی میں زخم کر کے جڑی کو خون سے تر کیا۔ پھر اسے ایک بلند چٹان پر پتھروں سے ڈھک کر

رکھ آئے۔ پندرہ دن تک متواتر یہی عمل کر تے رہے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے ۔برتنوں میں پانی جم جاتا تھا لیکن ونے روز مرہ نہانے جاتے۔ صوفیہ نے ان میں اتنی پابندی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کہتی تھی کہ اتنے سویرے نہ نہاؤ کہیں سردی نہ لگ جائے۔ جنگلی لوگ بھی دن بھر آگ جلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر منہ نہیں نکالا جاتا۔ ذرا دھوپ پھیلنے پر غسل کیا کرو اس پر ونے مسکرا کر کہہ دیتے کہ بیمار پڑوں گا تو کم از کم میرے پاس بیٹھو گی تو۔ ان کی کئی انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں مگر وہ زخموں کو چھپائے رہتے تھے۔

ان دنوں ونے کی نگاہ صوفیہ کی ایک ایک بات ایک ایک چال پر لگی رہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میرے عمل کا کچھ اثر ہو رہا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی ظاہر نتیجہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ آخر پندرھویں روز انھیں صوفیہ کے برتاؤ میں کچھ خفیف سا فرق نظر آیا۔ شاید کسی اور وقت ان کا خیال بھی اس طرف نہ جاتا۔ مگر آج کل تو ان کی نگاہ بہت باریک بین ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر سے باہر جانے لگے تو صوفیہ نادانستہ طریقہ پر نکل آئی اورکئی فرلانگ تک ان سے باتیں کرتی ہوئی چلی گئی۔ جب ونے نے بہت اصرار کیا تو لوٹی۔ ونے نے سمجھا کہ یہ اسی عمل کا اثر ہے۔

آج سے دھونی دینے کا کام شروع ہونا تھا۔ ونے بہت متفکر تھے۔ یہ عمل کیوں کر پورا ہوگا۔ تنہا صوفیہ کے کمرہ میں جانا تہذیب، شرافت اور انسانیت کے خلاف ہے۔ کہیں صوفیہ جاگ پڑی اور مجھے دیکھ لیا تو مجھ کو کتنا کمینہ سمجھے گی۔ شاید ہمیشہ کے لیے مجھ سے متنفر ہو جائے۔ وہ نہ بھی جاگے تو بھی یہ کون سا اخلاق ہے کہ کوئی مرد کسی نوجوان عورت کے کمرہ میں جائے۔ نہ جانے وہ کس حالت میں لیٹی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بال کھلے ہوں۔ کپڑا ہٹ گیا ہو۔ اس وقت میرے دل میں کیا کیا برے خیالات پیدا ہوں گے ۔ میں اخلاقی نقطہ خیال سے کس درجہ گرجاؤں گا۔

تمام دن وہ انھیں پریشان کن خیالات میں محو رہے لیکن شام ہوتے ہی وہ کمہار کے یہاں سے ایک کچا پیالہ لائے اور اسے حفاظت سے رکھ دیا۔ انسانی فطرت میں ایک عجیب بات ہے کہ اکثر ہم ایسے کام کر ڈالتے ہیں جن کے کرنے کی ہمیں خواہش نہیں ہوتی ۔ کوئی پوشیدہ ترغیب ہم کو اپنی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کرتی ہے۔

آدھی رات ہوئی تو ونے پیالے میں آگ اور ہاتھ میں وہی خون بھگو کر سکھائی ہوئی جڑی لے کر صوفیہ کی کوٹھری کے دروازہ پر پہنچے۔ کمبل کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے میں کواڑ کہاں؟ کمبل کے پاس کھڑے ہو کر انھوں نے کان لگا کر سنا۔ صوفیہ میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتے پسینہ سے شرابور اندر داخل ہوئے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صوفیہ خواب میں مدہوش لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے دماغ میں نازک خیالی بس رہی ہو۔ ونے کے دل پر رعبُ سا چھا گیا۔ کئی منٹ تک مسحور سے کھڑے رہے مگر اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ گویا کسی دیوی کے مندر میں ہوں، ذی حس دلوں میں حسن خداداد کا نظارہ پرستش کے جذبات کو متحرک کر دیتا ہے اور خواہشات نفسانی کو مسکن۔ ونے کچھ دیر تک صوفیہ کو عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئے۔ پیالہ میں جڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا اور اسے صوفیہ کے سرہانے کی طرف کھسکا دیا۔ ایک لمحہ میں جڑی کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک گیا۔ عود اور عنبر میں یہ خوشبو کہاں؟ دھوئیں میں کچھ ایسا جوش افزا اثر تھا کہ ونے کا دل بے قرار ہوگیا۔ جوں ہی دھواں بند ہوا، ونے نے پیالے سے جڑی کی راکھ نکال لی۔ بھیلنی کی ہدایت کے مطابق اسے صوفیہ پر چھڑک دیا اور باہر نکل گئے۔ لیکن اپنی کوٹھری میں جا کر وہ گھنٹوں بیٹھے پچھتاتے رہے۔ انھوں نے بار بار اپنے اخلاقی حسّیات کو بیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنے اس فعل کو دغا بازی اور عصمت دری کہہ کر دل میں نفرت پیدا کرنی چاہیے۔ سوتے وقت قصد کر لیا کہ بس آج ہی سے اس عمل کا خاتمہ ہے۔
دوسرے روز وہ دن بھر غمگین اداس اور پریشان رہے۔ جوں جوں رات نزدیک آتی جاتی تھی انھیں اندیشہ ہوتا جاتا تھا کہ کہیں میں پھر اسی عمل کو نہ کروں۔ وہ دو تین بھیلوں کو بلالائے اور انھیں اپنے پاس سلایا۔ انھوں نے کھانا بھی دیر سے کھایا کہ بستر پر جاتے ہی نیند آجائے۔ جب کھانا کھا کر اٹھے تو صوفیہ آکر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ رات کو ان کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ آج کے اخبارات میں پربھو سیوک کی پونا والی تقریر شائع ہوئی تھی۔ صوفیہ نے اسے بلند لہجہ میں پڑھا۔ اس کا سر غرور سے اونچا ہوگیا۔ بولی دیکھو کتنا عشرت پسند شخص تھا جسے ہمیشہ عمدہ کپڑوں اور عمدہ سامانوں کی دھن لگی رہتی تھی۔ اس

کی کتنی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس سے کبھی کچھ نہ ہوگا۔ تن پروری ہی میں اس کی زندگی بسر ہوگی۔ انسانی دل کے بھید سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کے اس پریم اور تیاگ پر تعجب ہوتا ہے۔

ونے: جب پربھوسیوک اس جماعت کے مہتمم ہوگئے۔ تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر گنگولی تو اسے تقسیم کرنے والوں کی جماعت بنا کر چھوڑتے۔ پتا جی پر میرا یقین نہیں ہے اور اندردت بالکل اجڈ ہے۔ پربھوسیوک سے زیادہ قابل شخص نہ مل سکتا تھا۔ وہ یہاں ہوتے تو بلائیں لیتا۔ یہ خدائی مدد ہے اور اب مجھے امید ہوتی ہے کہ ہماری کوشش بے کار نہ جائے گی۔

بھیلوں کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صوفیہ چلنے کو اٹھی تو اس نے ونے کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جس میں محبت کے سوا اور بھی کچھ تھا۔ ایک تو خواہش جھلک رہی تھی۔ ایک کشش تھی جس نے ونے کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ جب وہ چلی گئی تو انھوں نے ایک کتاب اٹھالی، اور پڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں عمل کا وقت قریب آتا تھا اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جبراً انھیں دھکیل رہا ہے۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ صوفیہ سو گئی ہوگی تو وہ آہستہ سے اٹھے۔ پیالہ میں آگ لی اور چلے۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ خائف تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ پیالہ کو پٹک دوں لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی انھوں نے صوفیہ کی کوٹھری میں قدم رکھا۔ آج انھوں نے اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ سر نیچا کیے ہوئے دھونی سلگائی اور راکھ چھڑک کر چلے آئے۔ پہلی بار انھوں نے صوفیہ کی چاند سی صورت دیکھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایشور اب لاج تمھارے ہاتھ میں ہے۔ اس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ تیزی سے اپنی کوٹھری میں آئے۔ چراغ بجھا دیا اور چارپائی پر گر پڑے۔ گھنٹوں دل دھڑکتا رہا!

اس طرح پانچ روز تک ونے نے بڑی دقت سے اس کام کو کیا اور اتنے ہی دنوں میں انھیں صوفیہ پر اس کا اثر صاف نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ پانچویں دن وہ دوپہر تک ان کے ساتھ بھیلوں کے جھونپڑوں کی سیر کرتی رہی۔ اس کی آنکھو ں میں متانت کی جگہ اب اشتیاق انگیز شوخی نمودار تھی۔ اور لبو ں پر شیریں تبسم تھا۔ آج رات کو کھانے

کے بعد وہ ان کے کے ساتھ بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اس نے اپنا سر ونے کی گود میں رکھ دیا۔ اور ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ''سچ بتاؤ ونے ایک بات تم سے پوچھوں۔ بتاؤ گے نا؟ سچ بتانا۔ تم یہ تو نہیں چاہتے کہ یہ بلا سر سے ٹل جائے؟ میں کہے دیتی ہوں کہ جیتے جی نہ ٹلوں گی۔ تم بھی مجھ سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ کسی طرح نہ جانے دوں گی۔ جہاں جاؤگے میں بھی چلوں گی۔ تمھارے گلے کا ہار بنی رہوں گی۔ یہ کہتے کہتے اس نے ونے کے ہاتھ چھوڑ دیے اور ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔''

ونے کو ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر اکھڑ گئے ہیں اور میں لہروں میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب خوف سے ان کا دل کانپ اٹھا گویا انھوں نے کھیل میں شیرنی کو جگا دیا ہو۔ انھوں نے نامعلوم طریقہ پر خود کو صوفیہ کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور بولے۔ صوفیہ!

صوفیہ چونک پڑی گویا خواب میں تھی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اگلے جنم سے اس کے قبل سے ابتدا ہی سے تمھاری ہوں۔ کچھ خواب سے یاد آتا ہے کہ ہم اور تم کسی ندی کے کنارے ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ سچ!

ونے نے خائف ہو کر کہا۔ ''تمھارا جی کیسا ہے؟''

صوفیہ: مجھے کچھ ہوا تھوڑا ہی ہے۔ میں تو اپنے اگلے جنم کی بات یاد کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ تم مجھے جھونپڑے میں تنہا چھوڑ کر اپنی کشتی پر کہیں پردیس چلے گئے تھے۔ اور میں روز ندی کے کنارے بیٹھ کر تمھاری راہ دیکھتی رہتی تھی۔ پر تم آتے نہ تھے۔

ونے: صوفیہ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ تمھارا جی اچھا نہیں ہے۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ اب سو جاؤ۔

صوفیہ: ''میرا تو آج یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا تمھیں نیند آرہی ہے۔ تو سوؤ میں بیٹھی ہوں۔ جب سو جاؤ گے میں چلی جاؤں گی۔'' ایک لمحہ بعد پھر بولی۔ ''مجھے نہ جانے کیوں خوف ہو رہا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤگے۔ سچ بتاؤ کیا تم

مجھے چھوڑ جاؤ گے؟''

ونے: صوفی اب ہم روز ابد تک جدا نہ ہوں گے۔

صوفیہ: تم اتنے بیدرد نہیں ہو۔ میں رانی جی سے نہ ڈروں گی۔ صاف صاف کہہ دوں گی کہ ونے میرے ہیں۔

ونے کی حالت اس بھوکے ہوئے آدمی کی سی تھی۔ جس کے آگے پروسی ہوئی تھالی رکھی ہو۔ بھوک سے طبیعت بے چین ہو۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہوں۔ بھوک سے آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو مگر تھالی میں ہاتھ نہ ڈال سکتا ہو۔ اس لیے پہلے کسی دیوتا کا بھوگ لگانا ہے۔ انھیں اب اس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ صوفیہ کی بے قراری ان کے عمل کا نتیجہ ہے۔ انھیں تعجب ہوتا تھا کہ اس جڑی میں ایسی کون سی تاثیر ہے۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھے دکھی تھے اور سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ آتما سے نہیں پر ماتما سے نہیں۔ صوفی سے! جب صوفیہ کو معلوم ہو جائے گا۔ کبھی نہ کبھی تو یہ نشہ اترے ہی گا۔ اس وقت وہ مجھ سے اس کا سبب پوچھے گی اور میں چھپا نہ سکوں گا۔ اس وقت وہ مجھے کیا کہے گی۔

آخر جب انگیٹھی کی آگ ٹھنڈی ہوگئی اور صوفیہ کو سردی معلوم ہونے لگی تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ عمل کا وقت بھی آپہنچا۔ لیکن آج ونے کو عمل کرنے کی جرأت نہ ہوی۔ انھیں جڑی کا امتحان ہی لینا تھا وہ ہوگیا اور انھیں ایسے عمل پر ہمیشہ کے لیے اعتقاد ہوگیا۔

صوفیہ کو چارپائی پر لیٹتے ہی ایسا وہم ہوا کہ رانی صاحبہ سامنے کھڑی ہوئی تاک رہی ہیں۔ اس نے کمبل سے سر کو باہر کر کے دیکھا اور اپنی دماغی کمزوریوں پر جھنجھلا کر وہ سوچنے لگی۔ آج کل مجھے کیا ہوگیا ہے؟ مجھے کیوں طرح طرح کے اندیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں روز ناگوار واقعات کا خوف دل پر طاری رہتا ہے؟ جیسے مجھ میں تمیز ہی نہیں باقی رہی۔ ونے آج کل کیوں مجھ سے کھنچے ہوئے ہیں؟ شاید وہ ڈر رہے ہیں کہ رانی جی کہیں انھیں بددعا نہ دے دیں یا خودکشی نہ کر لیں۔ ان کی باتوں میں پہلا سا جوش ہے اور نہ پہلی سی محبت۔ رانی میری زندگی کو تباہ وبرباد کئے دیتی ہیں۔

انھیں خیالاتِ پریشان کے ہوتے ہوئے وہ سوگئی تو دیکھتی کیا ہیں کہ واقعی رانی جی میرے سامنے کھڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ ونے میرا ہے، وہ میرا بچہ ہے اسے میں نے پیدا کیا ہے۔ پالا پوسا ہے تو کیوں اسے میرے ہاتھوں چھینے لیتی ہے؟ اگر تونے اس کو مجھ سے چھینا، میرے خاندان کو داغ لگایا تو میں تم دونوں کو اس تلوار سے قتل کردوں گی۔

صوفیہ تلوار کی چمک سے گھبرا گئی۔ چلا اٹھی۔ نیند ٹوٹ گئی۔ اس کا سارا بدن تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل مضبوط کر کے اٹھی اور ونے کی کوٹھری میں جاکر ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ ونے کی آنکھیں لگ ہی رہی تھیں۔ انھوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

صوفیہ: ونے ونے جاگو! میں ڈر رہی ہوں۔

ونے: فوراً چارپائی سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پوچھا کیا ہے صوفیہ؟

صوفیہ: رانی جی کو ابھی ابھی میں نے اپنے کمرہ میں دیکھا۔ ابھی وہیں کھڑی ہیں۔

ونے: صوفیہ اطمینان رکھوتم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

صوفیہ: تم ان باتوں کو نہیں جانتے۔ ونے! ہر شخص کے دو قالب ہوتے ہیں۔ ایک کثیف دوسرا لطیف۔ دونوں مشابہہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ وہ معمولی حالتوں میں نظرنہیں آتا۔ مگر مراقبہ یا خواب کی حالت میں کثیف جسم کا عوض بن جاتا ہے۔ رانی جی کا لطیف جسم یہاں ضرور ہے۔

دونوں نے بیٹھ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صوفیہ کو اب ونے کے بغیر ایک لمحہ بھی چین نہ آتا۔ اسے صرف دماغی بے چینی نہ تھی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لیے بھی بے چین رہتی جن باتوں کے محض خیال سے اسے نفرت ہوتی تھی۔ جن باتوں کی فقط یاد سے اس کے چہرہ پر شرم کی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ وہی باتیں اب ہر وقت اس کے دل میں موجود رہتیں۔ اسے اپنی اس دلی کثافت پر تعجب ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ عیش وعشرت کے تصور میں محو ہو کر اس دائرہ میں قدم رکھتی جو تاہّل ہی کے لیے مخصوص ہے تو رانی جی کی وہی غضب ناک مورت اس کے روبرو آکر کھڑی ہو جاتی اور وہ چونک کر کمرہ سے نکل بھاگتی اس طرح اس نے دس بارہ یوم گزارے۔ شمشیر

برہنہ کے نیچے کھڑے ہوئے مجرم کی حالت بھی اتنی بری نہ ہوتی ہوگی۔

ایک روز وہ گھبرائی ہوئی ونے کے پاس آئی اور بولی ونے میں بنارس جاؤں گی۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں۔ رانی جی یہاں مجھے چین نہ لینے دیں گی۔ اگر یہاں رہی تو شاید مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مجھ پر ضرور کوئی نہ کوئی عمل کیا گیا ہے۔ میں اتنی پریشان حال کبھی نہ تھی۔ مجھے خود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں وہ نہیں رہی۔ کوئی اور ہی ہوگئی ہوں۔ میں جا کر رانی جی کے پیر پڑوں گی۔ ان سے اپنی خطا معاف کرواؤں گی اور انھیں کی اجازت سے تمھیں حاصل کروں گی۔ ان کی مرضی کے بغیر میں تمھیں نہیں پا سکتی۔ اور جبراً لے لوں تو خیریت سے نہ گزرے گی۔ ونے مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ میں تمھارے لیے اتنی اکتانے والی چیز ہو جاؤں گی۔ میرا دل اتنا کمزور اتنا گرویدہ کبھی نہ تھا۔

ونے نے متردّد ہو کر کہا۔ صوفیہ۔ مجھے امید ہے کہ چند روز میں تمھارے دل کو قرار ہو جائے گا۔

صوفیہ: نہیں ونے ہر گز نہیں۔ رانی جی نے تمھیں نیک اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ موقوفہ شے سے مستفید ہونا مضرت رساں ہوا کرتا ہے۔ میں ان سے بھیک مانگوں گی۔

ونے: تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیہ: نہیں نہیں خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ میں تمھیں رانی جی کے سامنے نہ لے جاؤں گی۔ مجھے تنہا جانے دو۔

ونے: اس حالت میں میں تمھیں تنہا کبھی نہ جانے دوں گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمھیں وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔

صوفیہ: وعدہ کرو کہ بلا میری اجازت رانی جی کے پاس نہ جاؤ گے۔

ونے: ہاں صوفیہ یہ منظور ہے۔ وعدہ کرتا ہوں۔

صوفیہ: پھر بھی دل نہیں مانتا۔ ڈر لگتا ہے کہ وہاں تم جوش میں آکر کہیں رانی جی کے پاس نہ چلے جاؤ۔ تم یہیں کیوں نہیں رہتے؟ میں تمھیں روز مرّہ خط لکھا کروں گی۔ اور جلد سے جلد واپس آجاؤں گی۔

ونے نے اسے تسکین دینے کے لیے تنہا جانے کی اجازت دے دی۔ مگر ان کا محبت میں ڈوبا ہوا دل یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ صوفیہ اس اضطراب کی حالت میں اتنا طویل سفر تنہا کرے۔ سوچا اس کی نگاہ بچا کر گاڑی کے کسی دوسرے کمرہ میں بیٹھ جاؤں گا۔ انھیں واپسی کی بہت کم امید تھی بھیلوں نے سنا تو انواع واقسام کے تحفے لے کر انھیں رخصت کرنے کو آموجود ہوئے۔ ہرنوں کی کھالیں۔ شیروں کے ناخون اور نہ جانے کن کن جڑی بوٹیوں کا انبار لگ گیا۔ ایک بھیل نے اپنی بھاری کمان نذر کی۔ صوفیہ اور ونے دونوں ہی کو اس مقام سے رغبت ہو گئی تھی۔ وہاں کے باشندوں کی سیدھی سادی اور سچی زندگی انھیں ایسی پسند آگئی تھی کہ چھوڑ کر جاتے ہوئے دلی رنج ہوتا تھا۔ بھیل لوگ کھڑے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جلد آنا ہمیں بھول نہ جانا۔ بڑھیا بھیلنی تو انھیں کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔ سب کے سب اسٹیشن تک انھیں پہنچانے آئے۔ لیکن جب گاڑی کے آجانے پر ونے سے جدا ہونے کا وقت آیا تو صوفیہ ان کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ ونے چاہتے تھے کہ نکل جائیں اور کسی دوسری گاڑی میں بیٹھیں مگر ان کو چھوڑتی ہی نہ تھی گویا کہ وہ آخری ملاقات تھی۔ جب انجن نے سیٹی دی تو وہ دلی صدمہ سے بے قرار ہو کر بولی۔ ونے مجھ سے اتنے دنوں تک کیسے رہا جائے گا؟ رو رو کر مرجاؤں گی۔ ایشور میں کیا کروں؟

ونے: صوفیہ۔ گھبراؤ نہیں میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیہ: نہیں نہیں۔ خدا کے لیے میں اکیلی ہی جاؤں گی۔

ونے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی چل دی۔ ذرا دیر بعد صوفیہ نے کہا۔ تم نہ آتے تو میں شاید گھر تک نہ پہنچتی، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جان نکلی جا رہی ہے۔ سچ بتانا! تم نے مجھ پر جادو تو نہیں کر دیا میں اتنی بے صبر کیوں ہوں۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا۔ کیا جانے صوفی میں نے ایک عمل تو کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جادو تھا یا کچھ اور۔

صوفیہ: سچ؟

ونے: ہاں بالکل سچ؟ میں تمھاری سرد مہری سے خائف ہوگیا تھا کہ مبادا تم پھر میرا امتحان لو۔

صوفیہ نے ونے کی گردن میں ہاتھ ڈال دی اور بولی۔ تم بڑے چھلیا ہو۔ اپنا جادو اتار لو۔ مجھے تڑپا رہے ہو؟

ونے: کیا کہوں اتارنا نہیں سیکھا یہی تو غلطی ہوئی۔

صوفیہ: تو مجھے بھی وہی منتر کیوں نہیں سکھا دیتے؟ نہ میں اتار سکوں گی۔ نہ تم اتار سکوگے۔ (ایک لمحہ بعد) لیکن نہیں میں تمھیں دیوانہ بنا دوں گی۔ دو میں سے ایک کو تو ہوش رہنا ہی چاہیے۔ دونوں بے ہوش ہو جائیں گے تو برا ہوگا۔ اچھا بتاؤ۔ کون سا عمل کیا ہے؟

ونے نے اپنی جیب سے اس جڑی کو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ بس اس کی دھونی دیتا تھا۔

صوفیہ: جب میں سوجاتی تھی؟

ونے: (زیادہ شرمندہ ہوکر) ہاں۔ صوفیہ جبھی۔

صوفیہ: تم بڑے گستاخ ہو۔ اچھا وہ جڑی مجھے دے دو۔ تمھاری محبت کم ہوتے دیکھوں گی تو میں بھی وہی عمل کروں گی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے جڑی لے کر رکھ لی۔ ذرا دیر بعداس نے پوچھا یہ تو بتاؤ کہ وہاں تم رہو گے کہاں؟ میں تمھیں رانی کے پاس نہ جانے دوں گی۔

ونے: اب میرا کوئی دوست نہیں رہا ۔ سبھی مجھ سے بدظن ہو رہے ہوں گے۔ نایک رام کے گھر چلاجاؤں گا۔ تم وہیں آکر مجھ سے مل لیا کرنا۔ وہ تو اپنے گھر پہنچ ہی گیا ہوگا۔

صوفیہ: کہیں جا کر نہ کہہ دے۔

ونے: نہیں وہ احمق ہو مگر دغا باز نہیں ہے۔

صوفیہ: اچھی بات ہے۔ دیکھیں رانی صاحبہ سے مراد ملتی ہے یا موت۔

(39)

تیسرے روز سفر ختم ہوگیا۔ شام ہو چکی تھی۔ صوفیہ اور ونے دونوں ڈرتے ہوئے گاڑی سے اترے کہ کہیں کسی شناس سے ملاقات نہ ہوجائے۔ صوفیہ نے

سیوا بھون (ونے کے گھر) جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ رانی صاحبہ نہ جانے کس طرح پیش آئیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ ناحق یہاں آئی نہ جانے کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے۔ اب اس کی اپنی دیہاتی زندگی کی یاد آنے لگی۔ کتنا سکون تھا کتنی سادی زندگی تھی۔ نہ کوئی حال تھا نہ کوئی رکاوٹ تھی۔ نہ کسی سے حسد تھا۔ نہ کینہ۔ ونے سنگھ اسے تسکین دیتے ہوئے بولے۔ دل مضبوط رکھنا ذرا بھی نہ ڈرنا۔ سچی باتیں کہہ دینا۔ بالکل سچی ذرا بھی مبالغہ نہ ہو۔ ذرا بھی خوشامد نہ ہو۔ التجا اور سوال کا ایک کلمہ بھی زبان سے نہ نکالنا۔ میں باتوں کو گھٹا بڑھا کر اپنی جان کی حفاظت نہیں کرنا چاہتا۔ میں انصاف اور خالص التجا چاہتا ہوں۔ اگر وہ تم سے نامہذبانہ سلوک کریں، سخت الفاظ کا استعمال کریں تو پھر تم ذرا بھی نہ ٹھہرنا۔ علی الصباح آکر مجھ سے ایک ایک بات کہہ دینا یا کہو تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں۔

صوفیہ انھیں ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ ونے تو پانڈے پور کی طرف چلے اور وہ سیلوا بھون کی طرف چلی۔ تانگہ والے نے کہا۔ مس صاحب آپ کہیں چلی گئی تھیں کیا؟ بہت دنوں بعد دکھلائی دیں۔

صوفیہ کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ بولی تم نے مجھے کب دیکھا؟ میں تو اس شہر میں پہلی ہی بار آئی ہوں۔

تانگہ والے نے کہا آپ ہی جیسی ایک مس صاحب یہاں سیوک صاحب کی بیٹی بھی تھیں۔ میں نے سمجھا آپ ہی ہوں گی۔

صوفیہ: میں عیسائی نہیں ہوں۔

جب وہ سیوا بھون کے سامنے پہنچی تو تانگہ سے اتر پڑی وہ رانی صاحبہ کے ملنے سے پہلے اپنے آنے کی کانوں کان خبر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ ہاتھ میں اپنا بیگ لیے ہوئے ڈیوڑھی پر گئی اور دربان سے بولی۔ جا رانی سے کہو کہ مس صوفیہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

دربان اسے پہچانتا ہی تھا۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا اور بولا۔ حضور اندر چلیں۔ اطلاع کیا کرنی ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ کے درشن ہوئے۔

صوفیہ: میں بہت اچھی طرح کھڑی ہوں۔ تم جا کر اطلاع تو کر دو۔

دربان: سرکار ان کا مجاج تو آپ جانتی ہی ہیں۔ بگڑ اٹھیں گی کہ ساتھ کیوں نہ لایا۔ اطلاع کیوں دینے آیا؟

صوفیہ: میری خاطر سے دو چار باتیں سن لینا۔

دربان اندر گیا تو صوفیہ کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پتا ہل رہا ہو۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رانی صاحبہ غصہ میں بھری وہیں سے بگڑتی ہوئی نہ آئیں یا کہلا دیں کہ چلی جا میں نہیں ملنا چاہتی۔ ایک مرتبہ ان سے ملے بغیر تو میں جانے کی نہیں۔ چاہے وہ ہزار بار دھتکار دیں۔

ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رانی جی شال اوڑھے ہوئے دروازہ پر آگئیں اور اس سے لپٹ کر گلے ملیں جیسے کوئی سسرال سے آئی ہوئی بیٹی کو گلے لگا لے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوں کی بارش ہونے لگی۔ روندھے ہوئے گلے سے بولیں۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو گئیں بیٹی۔ اندر کیوں نہ چلی آئیں؟ میں تو روز ہی تمھاری راہ دیکھتی رہتی تھی۔ تم سے ملنے کو جی تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اُمید ہو رہی تھی کہ تم آرہی ہو۔ پر تم آتی نہ تھیں۔ کئی بار یوں ہی اسٹیشن تک گئی کہ شاید تمھیں دیکھ سکوں۔ ایشور سے روز دعائیں کرتی تھی کہ ایک بار تم سے ملاقات ہو۔ چلو اندر چلو۔ میں نے تمھارے ساتھ جو سخت کلامی کی تھی اسے بھول جاؤ۔ (دربان سے) یہ بیگ اٹھا لے۔ مہری سے کہہ دے کہ مس صوفیہ کا پرانا کمرہ صاف کردے۔ بیٹی تمھارے کمرہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ دل بھر آتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرہ میں آئیں اور اسے اپنی بغل میں مسند پر بیٹھا کر بولیں۔ آج میری مراد پوری ہو گئی۔ تم سے ملنے کو دل بہت بے چین رہتا تھا۔

صوفیہ کا متفکردل اس بے لوث محبت کے اظہار سے بے قرار ہوگیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ مجھے بھی آپ کے درشن کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے اپنی خطائیں معاف کرانے آئی ہوں۔

رانی: بیٹی تم دیوی ہو۔ میری عقل پر پردہ پڑگیا تھا۔ میں نے تمھیں پہچانا نہ تھا۔ مجھے سب معلوم ہے بیٹی۔ سب سن چکی ہوں۔ تمھارا دل اتنا پاک و صاف ہے۔ یہ مجھے

معلوم نہ تھا۔ آہ اگر میں پہلے سے جانتی!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جب طبیعت ٹھہری تو پھر بولیں۔ اگر پہلے سے جان گئی ہوتی تو آج اس گھر کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔ آہ میں نے ونے کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ تمھیں نہ معلوم ہوگا۔ بیٹی جب تم نے...... (سوچ کر) ویر پال سنگھ ہی نام تھا نا؟ ہاں جب تم نے اس کے گھر پر رات کے وقت ونے کو ملامت کی تو وہ نادم ہوکر ریاست کے حکام کے پاس قیدیوں پر رحم کرنے کے لیے دوڑتا رہا۔ وہ دن دن بھر بھوکا پیاسا پڑا رہتا۔ رات رات بھر رویا کرتا۔ کبھی دیوان کے پاس جاتا۔ کبھی ایجنٹ کے پاس۔ کبھی پولیس افسر اعلے کے پاس کبھی خود مہاراجہ صاحب کے پاس۔ سب سے التجائیں کر کے ہار گیا۔ کسی نے نہ سنی۔ قیدیوں کی حالت پر کسی کو ترس نہ آیا۔ بے چارہ ونے مایوس ہوکر اپنے ڈیرے پر آیا۔ وہاں وہ نہ جانے کس سوچ میں بیٹھا تھا کہ میرا خط اسے ملا۔ صوفی وہ خط نہیں تھا۔ زہر کا پیالہ تھا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں اسے پلا یا۔ تیز خنجر تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں اس کی گردن پر پھیرا۔ میں نے لکھا تھا تم اس قابل نہیں ہو کہ میں تمھیں اپنا بیٹا سمجھوں۔ تم مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ اور بھی نہ جانے کتنی سخت باتیں لکھی تھیں۔ یاد کرتی ہوں تو چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ یہ خط پاتے ہی بلا کسی سے کچھ کہے ہوئے نایک رام کے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہوگیا۔ کئی اسٹیشنوں تک نایک رام اس کے ساتھ آئے۔ پھر پنڈا جی کو نیند آگئی اور جب ان کے آنکھیں کھلیں۔ ونے کا کہیں گاڑی میں پتہ نہ تھا۔ انھوں نے ساری گاڑی میں ڈھونڈ مارا۔ پھر اودے پور تک گئے۔ راستہ میں ایک ایک اسٹیشن پر اتر کر دریافت کیا۔ مگر سب بے سود۔ بیٹی یہ اس دکھیا کی رام کہانی ہے۔ میں ہتیارنی ہوں۔ مجھ سے زیادہ ابھاگنی دنیا میں کون ہوگی؟ نہ جانے ونے کا کیا حال ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ وہ بڑا غیرت مند ہے بیٹی۔ بات کا بڑا دھنی۔ میری باتیں اس کے دل میں لگ گئیں۔ میرے پیارے بیٹے نے کبھی آرام نہ پایا۔ اس کی ساری زندگی تپسیا ہی میں گزری۔

یہ کہہ کر رانی پھر رونے لگیں۔ صوفیہ بھی رو رہی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات میں کتنا فرق تھا۔ ماں کے آنسو فکر و غم کے تھے اور صوفیہ کے آنسو مسرّت و جوش

کے۔

ایک لمحہ کے بعد رانی جی نے پوچھا۔ کیوں بیٹی تم نے اسے جیل میں دیکھا تھا، بہت دبلا ہوگیا تھا؟

صوفیہ: جی ہاں۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔

رانی: اس نے سمجھا کہ باغیوں نے نہ جانے تمھارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو۔ بس اسی بات پر اسے ضد ہوئی۔ آرام سے بیٹھو بیٹی۔ اب یہی تمھارا گھر ہے۔ اب میرے لیے تمھیں ونے کی جگہ پر ہو۔ اب یہ بتاؤ تم اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ اندرت تو کہتا تھا کہ تم ونے کو لعنت و ملامت کرنے کے تین ہی چار روز بعد وہاں سے چلی آئی تھیں۔ اتنے دن کہاں رہیں؟ سال بھر سے زیادہ تو ہوگیا ہوگا۔

صوفیہ کا دل فرطِ مسرّت سے اچھل رہا تھا۔ جی میں تو آیا کہ اسی وقت سارا ماجرا بیان کروں اور ماں کی آتشِ غم کو بجھادوں۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کا مذہبی جذبہ پھر نہ متحرک ہوجائے۔ ونے کی طرف سے تو اب وہ بے فکر ہوگئی تھی۔ اب اسے صرف اپنی ہی فکر تھی۔ دیوتا کو نہ پاکر ہم پتھر پوجتے ہیں۔ دیوتا مل جائے تو پتھر کون پوجے؟ بولی۔ کہاں تھی؟ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مایوس ہوکر یہاں چلی آئی ہوں۔

رانی: تم ناحق اتنے دنوں تک تکلیف اٹھاتی رہیں۔ تمھارا کیا یہ گھر نہ تھا۔ برانہ ماننا بیٹی۔ تم نے ونے کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اتنی ہی جتنی میں نے۔ تمھاری بات اسے اور بھی زیادہ لگی۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا تھا ہمارے ہی فائدہ کے لیے کیا تھا۔ میں تو اپنے چہیتے کے ساتھ اتنی بے رحمی کبھی نہ کر سکتی۔ اب تم خود اپنی بھول پر پچھتا رہی ہوگی۔ ہم دونوں ہی ابھاگنی ہیں۔آہ بیچارے ونے کو کہیں سکھ نہ ملا۔ تمھارا دل بہت سخت ہے۔ سوچو۔ اگر تمھیں خبر ملتی کہ ونے کو ڈاکوؤں نے پکڑ کر قتل کر ڈالا ہے۔ تو تمھاری کیا حالت ہو جاتی۔ شاید تم بھی اتنی ہی بے رحم ہو جاتیں۔ یہ انسانی خاصہ ہے مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں آپ ہی ہر وقت پچھتایا کرتی ہوں، اب تو اس کام کو سنبھالنا ہے جو اسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ تم نے اس کے لیے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذلت، بدنامی، سختی سبھی اٹھائیں۔ اب اس کا کام سنبھالو۔ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھو۔ تمھیں کیا خبر ہوگی۔ کچھ دنوں تک پربھوسیوک

اس سیوا سمتی کے نایک رہے۔ کام کرنے والا ہو تو ایسا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے سارا ملک چھان ڈالا۔ اور پورے پانچ سو والنٹیر جمع کر لیے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاخیں قائم کردیں۔ بہت سا روپیہ بھی جمع کر لیا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ونے نے جس تحریک پر اپنی زندگی قربان کردی وہ پھل پھول رہی ہے۔ مگر ایشور کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ پربھوسیوک اور کنور صاحب میں آن بن ہوگئی۔ پربھوسیوک اسے ٹھیک اسی راستہ پر لے جارہا تھا جس پر ونے لے جانا چاہتا تھا۔ کنور صاحب اور ان کے خاص دوست ڈاکٹر گنگولی اسے دوسرے ہی راستہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ آخر پربھوسیوک نے استعفا دے دیا۔ جبھی سے سمیتی ڈنواڈول ہورہی ہے۔ نہ جانے بچتی ہے یا جاتی ہے۔ کنور صاحب میں ایک عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ اب حکام سے خائف رہنے لگے ہیں۔ افواہ تھی کہ سرکار ان کی کل جائداد ضبط کرنے والی ہے۔ حکام کی بدگمانیاں رفع کرنے کے لیے انھیں نے پربھو کے مجوزہ پروگرام سے اپنا اختلاف شائع کرا دیا۔ یہی باہمی ناچاقی کا خاص سبب تھا۔ ابھی دوماہ نہیں گزرے۔لیکن شیرازہ بکھر گیا۔ سینکڑوں رضاکار مایوس ہو کر اپنے کام دھندوں میں لگ گئے۔ مشکل سے دو سو والینٹر اور ہوں گے۔ چلو بیٹی۔ تمھارا کمرہ اب صاف ہوگیا ہوگا۔ تمھارے کھانے کا بندوبست کر کے پھر اطمینان سے باتیں کروں۔ (مہاجن سے) انھیں پہچانتی ہے نہ؟ پہلے یہ میری مہمان تھیں۔ اب یہ میری بہو ہیں۔ جا ان کے لیے دو چار نئی چیزیں تیار کرلایا۔ آہ۔ آج ونے ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے اس کے گلے لگا دیتی۔ بیاہ رچاتی۔ شاستروں میں اس کی اجازت ہے۔

صوفیہ کی زبرست خواہش ہوئی کہ راز کو افشا کردوں۔ بات لبوں تک آئی۔ اور رک گئی۔ اسی وقت دفعتاً شور اٹھا کہ لال صاحب آگئے۔ لال صاحب آگئے۔ بھیاّ ونے سنگھ آگئے۔ نوکر چاکر ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ لونڈیاں باندیاں کام چھوڑ چھوڑ کر بھاگیں۔ ایک لمحہ میں ونے نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا گویا یقین کر رہی تھیں کہ میرا ہی ونے ہے یا کہ اور، پھر رانی صاحب اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔ بہت دنوں میں آئے بیٹا۔ آؤ چھاتی سے لگا لوں۔ لیکن ونے نے فوراً ان کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کو آنسوؤں کی کثرت سے نہ کچھ سوجھتا تھا۔

اور نہ محبت کے بے انتہا جوش کے سبب کوئی بات منہ سے نکلتی تھی۔ وہ جھکی ہوئیں ونے کا سر پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بھگتی اور مامتا کا کیسا قابل دید نظارہ تھا!

لیکن ونے کو رانی کی باتیں بھولی نہ تھیں۔ ماں کو دیکھ کر اس کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ ان کے قدموں پر جان دے دوں۔ ایک مجنونانہ خیال تھا۔ جان دے دینے کے لیے وہیں ماں کے قدموں پر زندگی کا خاتمہ کر دینے کے لیے۔ یہ دکھلا دینے کے لیے کہ اگر چہ میں نے قصور کیا ہے مگر بالکل بے غیرت نہیں ہوں۔ جینا نہیں جانتا لیکن مرنا جانتا ہوں۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی سامنے ہی دیوار پر تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر تلوار کو اُتا لایا اور اسے یک دم کھینچ کر بولا۔ ماں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کا بیٹا کہلاؤں لیکن آپ کے آخری حکم کی تعمیل میں اپنی ساری غلطیوں کا پراسچت (کفارہ) کئے دیتا ہوں۔ مجھے آشیر واد دیجیے۔

صوفیہ چیخ مار کر ونے سے لپٹ گئی۔ رانی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی۔ ونے ایشور گواہ ہے کہ میں نے تمھیں کب کا معاف کر چکی۔ تلوار چھوڑ دو۔ صوفیہ تو ان کے ہاتھوں سے تلوار چھین لے۔ میری مدد کر!

ونے کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ گردن پر تلوار پھیر لینا کتنا آسان ہے۔ صوفیہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑلی۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ ونے مجھ پر رحم کرو۔

اس کی نگاہ میں اتنا درد اتنا انکسار تھا کہ ونے کا دل پسیج گیا۔ ان کی میٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ صوفیہ نے تلوار لے کر کھونٹی پر لٹکا دی۔

اتنے میں کنور بھرت سنگھ آکر کھڑے ہوگئے اور ونے کو سینہ سے لگاتے ہوئے بولے۔ تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ موچھیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اتنے دبلے کیوں ہو؟ بیمار تھے کیا؟

ونے: جی نہیں۔ بیمار تو نہیں تھا۔ ایسا دبلا بھی نہیں ہوں۔ اب ماں کے ہاتھوں کا پکوان کھا کر موٹا ہو جاؤں گا۔

کنور: تم دور کیوں کھڑی ہو صوفیہ۔ آؤ تمھیں بھی پیار کر لوں۔ روز ہی تمھاری یاد آتی

تھی۔ ونے بڑا خوش نصیب ہے کہ اس نے تم جیسی استری پائی۔ دنیا میں تو ملتی نہیں۔ بہشت کی میں نہیں جانتا۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ تم دونوں ایک ہی روز آئے۔ بیٹی میں تم سے ونے کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے انھیں جو ملامت کی تھی اسے سن کر بے چارہ نایک رام عورتوں سے اتنا ڈر گیا ہے کہ طے کی کرائی شادی سے انکار کر گیا۔ عمر بھر عورت کے لیے ترستا رہا۔ پر اب تو نام بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ یہ ذات بے وفا ہوتی ہے۔ بھیا ونے سنگھ نے جس کے لیے بدنامی سہی۔ جان پر کھیلے۔ وہی ان سے آنکھیں پھیر لے! کان پکڑے۔ اب تو مرجاؤں گا پر بیاہ نہ کروں گا۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ ونے! صوفیہ یہ ہاتھ لو تو مجھے اطمینان ہوجائے کہ تمھارے دل صاف ہوگئے۔ جاھنوی۔ چلو۔ ہم لوگ باہر چلیں۔ انھیں ایک دوسرے کو منانے دو۔ انھیں کتنی ہی شکایتیں کرنی ہوگی۔ دونوں باتیں کرنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہوں گے۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔

جب تخلیہ ہوگیا تو صوفیہ نے پوچھا۔ تم اتنی جلد کیسے آگئے۔

ونے نے شرماتے ہوئے کہا۔ صوفیہ مجھے وہاں منہ چھپا کر بیٹھے ہوئے شرم آتی تھی۔ جان کے خوف سے چھپ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ ماتاجی کی جو مرضی ہو وہی سہی۔ نایک رام کہتا رہا کہ پہلے مس صاحب کو آجانے دو پر مجھ سے نہ رہا گیا۔

صوفیہ: ان کا دل تمھاری طرف سے صاف ہوگیا ہے۔

ونے: تمھیں تو کچھ نہیں کہا؟

صوفیہ: مجھ سے تو ایسا لپٹ کر گلے ملیں کہ میں متحیر ہوگئی۔ یہ انھیں سخت الفاظ کا اثر ہے جو میں نے تم سے کہے تھے۔ ماں خود چاہے بیٹے کو جتنا ڈانٹے۔ مگر اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص اسے کڑی نگاہوں سے بھی دیکھے۔ میری بے انصافی نے ان کے منصفانہ جذبہ کو بیدار کردیا۔

ونے: ہم لوگ بڑی اچھی ساعت میں چلے تھے۔

صوفیہ: ہاں ونے۔ ابھی تک تو خیر یت سے گزری۔ آگے کی ایشور جانے۔

ونے: ہم اپنا دکھ کا حصہ بھگت چکے۔

صوفیہ نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔

لیکن صوفیہ کو اپنے دل کے آئینہ میں کسی آنے والی ناگہانی مصیبت کا عکس نظر آرہا تھا۔ وہ اسے ظاہر نہ کر سکتی تھی مگر وہ ملول تھی۔ ممکن ہے کہ آبائی مذہب کو ترک کردینے کا غم اس کا سبب ہو یا وہ اسے ایسی بارش خیال کر رہی ہو جو اپنی کثرت سے آیندہ ہونے والی بارش کی قلت کی خبر دیتی ہے۔ معلوم نہیں جو بات ہو۔ مگر صوفیہ رات کو کھانا کھاکر سوئی تو اس کا دل کسی بوجھ سے دبا ہوا تھا۔

(40)

مل کے تیار ہونے میں اب بہت تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ باہر سے تمباکو کی گاڑیاں لدی چلی آتی تھیں۔ کسانوں کو تمباکو کی کاشت کے لیے تقاوی تقسیم کی جارہی تھی۔ گورنر سے مل کے افتتاحی رسم ادا کرنے کی استدعاء کی گئی تھی اور انھوں نے منظور بھی کر لیا تھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی تھی اس لیے تعمیری کام کو اس دن ختم کر دینے کے لیے بڑی مستعدی سے کام کیا جارہا تھا۔ اس وقت کوئی کام باقی نہ رہنا چاہیے مزہ تو جب آئے کہ دعوت میں اسی مل کا بنا ہوا سگار بھی رکھا جاوے۔ مسٹر جان سیوک صبح سے شام تک انھیں تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی دونی اجرت دے کر کام کرایا جارہا تھا۔ مل کے قریب پختہ مکانات تیار ہوچکے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اور پاس کے کھیتوں میں مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف ایک میل تک جھونپڑیوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔ یہاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دوکان داروں نے بھی اپنے اپنے چھپر ڈال لیے تھے۔ پان مٹھائی، اناج، گڑ، گھی، ساگ، ترکاری اور منشی اشیاء کی دوکانیں کھل آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بازار ہے۔ مل کے پردیسی مزدور جنھیں نہ برادری کا خوف تھا نہ رشتہ داروں کا لحاظ۔ دن بھر تو مل میں کام کرتے تھے اور رات کو تاڑی شراب وغیرہ پیتے تھے۔ جو آرزو ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر بد چلن عورتیں بھی آہی پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی ایک چھوٹا موٹا چکلہ آباد ہوگیا تھا۔ پانڈے پور کا پرانا بازار سرد ہوتا جاتا تھا۔ مٹھو، گھیسو۔ وڈیادھر تینوں اکثر اس طرف سیر کو آتے اور جوا کھیلتے۔ گھیسو تو دودھ پینے کے بہانے آتا۔ ویادھرنوکری تلاش کرنے کے بہانے آتا اور مٹھو صرف ان دونوں کا ساتھ دینے کے

لیے آتا۔ کوئی چاٹ کھارہا ہے۔ کوئی تمبولی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے۔ کوئی پیشہ ور عورتوں سے مذاق کر رہا ہے۔ فحش مذاق حیا سوز نظر بازیاں حیوانی طور وطریق۔ ان سب کا ایک نہ رکنے والا بہاؤ سا جاری رہتا تھا۔ پانڈے پورمیں یہ دلچسپیاں کہاں؟ لڑکوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تاڑی کی دوکان کے سامنے کھڑے ہوں۔ کہیں گھر کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ نوجوانوں کی مجال نہ تھی کہ کسی عورت کو چھیڑیں۔ کہیں میرے گھر جاکر کہہ نہ دے۔ سبھی ایک دوسرے سے رشتہ رکھتے تھے۔ یہاں وہ رکاوٹیں کہاں؟ ہر شخص آزاد تھا۔ اسے نہ کسی کا خوف تھا نہ لحاظ ٗوئی کسی پر ہنسنے والا نہ تھا۔ تینوں کو منع کیا جاتا تھا وہاں نہ جایا کرو۔ اور جاؤ بھی تو اپنا کام کرکے چلے آیا کرو۔ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کون کسی کی سنتا تھا؟ سب سے بری حالت بجرنگی کی تھی۔ گھیسو روز ہی روپیہ بارہ آنے اڑا لیا کرتا اور پوچھنے پر بگڑ کر کہتا کیا میں چور ہوں؟

ایک روز بجرنگی نے سورداس سے کہا۔ سورداس لڑکے برباد ہوئے جاتے ہیں۔ جب دیکھوں چکلے ہی میں ڈٹے رہتے ہیں۔ گھیسومیں چوری کی بان کبھی نہ تھی۔ اب ایسا ہتھ لپا ہوگیا ہے کہ سوجتن سے پیسے رکھ دو ۔ کھوج کر نکا ل لیتا ہے۔

جگدھر سورداس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ باتیں سن کر بولا۔ میری بھی وہی دسا ہے بھائی۔ ودیا دھر کو کتنا پڑھایا لکھایا مڈل تک کھینچ کھانچ کر لے گیا۔ آپ بھوکا رہتا تھا۔ گھر کے لوگ کپڑوں کو ترستے تھے پر اس کے لیے تو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ آس تھی کہ چار پیسے کمائے گا، میرا بڑھاپا کٹ جائے گا، گھر بار سنبھالے گا۔ برادری میں مرجاؤبڑھائے گا۔ سو وہ اب روز وہاں جاکر جوا کھیلتا ہے۔ مجھ سے بہانہ کرتا ہے کہ وہاں ایک بابو کے پاس کام سیکھنے جاتا ہوں۔ سنتا ہوں کسی عورت سے اس کی آشنائی ہوگئی ہے ابھی تیلی گھر کے کئی مجور اسے کھوجتے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔ اسے پاجائیں تو مارپیٹ کریں وہ بھی اسی عورت کے آشنا ہیں۔ میں نے ہاتھ پیر جوڑ کر ان کو بدا کیا۔ یہ کارکھانا کیا کھلا ہماری تباہی آگئی۔ فائدہ ضرور ہے۔ چار پیسے کی آمدنی ہے۔ پہلے ایک ہی کھونچہ نہ بکتا تھا۔ اب تین تین بک جاتے ہیں لیکن ایسا سونا کس کام کا جس سے کان پھٹیں؟

بجرنگی: جی جوا ہی کھیلتا تب تک گنیمت تھی ہمارا گھیسو تو آوارہ ہوگیا ہے دیکھتے نہیں

ہو صورت کیسی بگڑ گئی ہے۔ کیسی دیہہ نکل آئی تھی ! مجھے پوری آسا تھی کہ اب کی دنگل مارے گا۔ اکھاڑے کا کوئی پٹھا اس کا جوڑ کا نہیں ہے مگر جب سے چکلے کی چاٹ پڑ گئی ہے دن بدن گھلا جاتا ہے۔دادا کو تم نے دیکھا تھا؟ دس پانچ کوس کے گرد میں کوئی کوئی ان سے ہاتھ ملا سکتا تھا۔ چٹکی سے سپاری توڑ دیتے تھے۔ میں نے بھی جوانی میں کتنے ہی دنگل مارے۔تم نے تو دیکھا ہی تھا۔ اس پنجابی کو کیسا مارا کہ پانچ سو روپے انعام پائے اور اکھاڑوں میں دور دور تک نام ہوگیا۔ کبھی کسی مائی کے لال نے میری پیٹھ میں دھول نہیں لگائی۔ تو بات کیا تھی؟ لنگوٹ کے سچے تھے۔ مونچھیں نکل آئی تھیں تب تک کسی استری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ بیاہ بھی ہوگیا تب بھی محنت کسرت کی دھن میں استری کا دھیان ہی نہ کرتے تھے۔ اسی کے بل پر بھی دعویٰ ہے کہ دس پانچ کا سامنا ہوجائے تو چھکے چھڑا دوں۔ پر اس لونڈے نے ڈونگا ڈبا دیا ۔ گھورے استاد کہتے تھے کہ اس میں تو دم ہی نہیں ہے۔ جہاں دو پکڑی ہوئیں کہ بھینسے کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔

سورداس: میں اندھا آدمی لونڈوں کے یہ چرتر کیا جانوں پر سبھاگی کہتی تھی کہ مٹھو کے ڈھنگ بھی اچھے نہیں ہیں۔ جب سے ٹیسن پر کلی ہوگیا ہے روپیہ آٹھ آنے روز کماتا ہے مداکسم لے لو جو گھر میں ایک پیسہ بھی دیتا ہو۔ بھوجن میرے ماتھے ہے جو کچھ پاتا ہے نشہ پانی میں اڑا دیتا ہے ۔

جگدھر: تم بھی جھوٹ موٹ لاج ڈھو رہے ہو۔ نکال کیوں نہیں دیتے گھر سے؟ اپنے سر پڑے گی تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اپنا لڑکا ہو تو ایک بات ہے۔ بھائی بھتیجے کس کے ہوتے ہیں؟

سورداس: پالا تو لڑکے ہی کی طرح ہے۔ دل نہیں مانتا۔

جگدھر: اپنا بنانے سے تھوڑے ہی اپنا ہوجائے گا۔

ٹھاکر دین بھی آ گیا تھا: جگدھر کی بات سن کر بولا بھگوان نے کیا تمھارے کرم میں کانٹے ہی بونا لکھا ہے؟ کسی کا بھی بھلا نہیں دیکھ سکتے۔

سورداس: اس کے من میں جو آئے کرے، پر میرے لیے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ میں آپ کھا کر سوؤں اور اس کی بات نہ پوچھوں۔

ٹھاکر دین: کوئی بات کہنے کے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ سننے والے کو اچھی لگے گی یا بری۔ جس لڑکے کو بچپنے سے پالا اور اس طرح کہ کوئی اپنے بیٹے کو بھی نہ پالتا اسے اب کیسے چھوڑ دے؟

جمنی: اب کے کل جگی لڑکے جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہے ابھی دودھ کے دانت نہیں اکھڑے سبھاگی نے گھیسو کو گود میں کھلایا ہے۔ سو آج وہ اسی سے دل لگی کرتا ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ اٹھ گیا۔ یہ تو کہو سبھاگی کی کاٹھی اچھی ہے نہیں بال بچے ہوئے ہوتے تو گھیسو سے جیٹھے ہوتے۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر تینوں لونڈے نایک رام کے دلان میں بیٹھے ہوئے منصوبے باندھ رہے تھے گھیسو نے کہا، سبھاگی مارے ڈالتی ہو۔ دیکھ کر یہی جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لو۔ سر پر ساگ کی ٹوکری رکھ کر بل کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ سو جان لے لیتی ہے بڑی کاپھر ہے۔

ودیا دھر: تم تو ہوگھامڑ پڑھے لکھے تو ہو نہیں۔ بات سمجھو۔ معشوق کبھی اپنے منہ سے تھوڑا ہی کہتا ہے کہ میں راجی ہوں۔ اس کی آنکھوں سے تاڑ جانا چاہیے۔ جتنی ہی بگڑے اتنی ہی دل سے راجی سمجھو۔ کچھ پڑھے ہوتے تو جانتے عورتیں کیسے نکھرے کرتی ہیں۔

مٹھو: پہلے سبھاگی مجھ سے بھی اسی طرح بگڑتی تھی کسی طرح ہتھے ہی نہ چڑھے بات ہی نہ سنے۔ پر میں نے ایک دن ہمت کر کے کلائی پکڑ لی اور کہا۔ اب نہ چھوڑوں گا چاہے مار ہی ڈالو۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی تیرے ہی ہاتھوں مروں گا تو سیدھے نرک جاؤں گا۔ وہ تو بگڑ کر گالیاں دینے لگی پھر کہنے لگی چھوڑدو کہیں کوئی دیکھ لے تو غضب ہوجائے۔ میں تیری بوا لگتی ہوں پر میں نے ایک نہ سنی۔ بس پھر کیا تھا اسی دن سے آگئی چنگل میں۔

مٹھو اپنی عشقیہ فتوحات کی فرضی داستانیں گڑھنے میں بڑا ہوشیا تھا جاہل ہونے پر بھی گپ مارنے میں اس نے ودیادھر کو مات کر دیا تھا۔ اپنی گڑھنتوں میں کچھ ایسا رنگ بھرتا تھا کہ دوستوں کو ان گپوڑوں پر یقین آجاتا تھا۔

گھیسو بولا: کیا کروں میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی ڈرتا ہوں کہیں شور نہ مچادے تو

آفت آجائے۔ تمھاری ہمت کیسے پڑگئی تھی۔

ودیا دھر: تمھارا سر۔ جاہل جپٹ تو ہو مشوق اپنے عاشق کو آزماتا ہے کہ اس میں کچھ جیوٹ بھی ہے یا یوں ہی چھیلا بنا پھرتا ہے۔ عورت اسی کو پیار کرتی جو دلاور ہو نڈر ہو آگ میں کود پڑے۔

گھیسو: تم تیار ہو۔

ودیادھر: ہاں آج ہی۔

مٹھوا: مگر دیکھ لینا دادا دوار پر نیم کے نیچے سوتے ہیں۔

گھیسو: اس کا کیا ڈر؟ ایک دھکا لگا دوں گا۔ دور جا کر گرے گا۔

تینوں مشورہ کرتے اس سازش کے داؤں پیچ سوچتے قلی بازار کی طرف چلے گئے۔ وہاں تینوں نے شراب پی دس گیارہ بجے رات تک بیٹھے گانا باجا سنتے رہے۔ شراب خانوں میں نغمہ سے نا آشنا کانوں کے لیے گانے کی کمی کبھی نہیں رہتی۔ تینوں بدمست ہو کر لوٹے تو گھیسو بولا۔ صلاح پکی ہے نا؟ آج وارا نیارا ہوجائے چِت پڑے یا پٹ۔

آدھی رات گزر چکی تھی چوکیدا پہرہ دے کر جا چکا تھا۔ گھیسو اور ودیادھر سورداس کے دروازہ پر گئے۔

گھیسو: تم آگے چلو میں یہیں کھڑا ہوں۔

ودیا دھر: نہیں تم جاؤ تم گنوار آدمی ہو یہاں کوئی دیکھ لے گا تو بات بھی نہ بنا سکوگے۔

نشہ نے گھیسو کو آپے سے باہر کررکھا تھا کچھ یہ دکھانا بھی منظور تھا کہ تم لوگ مجھے جتنا احمق سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ وہ جھونپڑی میں گھس ہی پڑا اور جا کر سبھا گی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سبھاگی چونک کر اٹھ بیٹھی اور زور سے بولی ۔کون ہے ؟ چل ہٹ!

گھیسو: چپ چپ میں ہوں۔

سبھاگی: چور چور چور!

سورداس جاگا وہ اٹھ کر جھونپڑی میں جانا چاہتا تھا کہ کسی نے اسے پکڑ لیا۔

اس نے ڈانٹ کر پوچھا کون ہے؟ جب کچھ جواب نہ ملا تو اس نے بھی اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلایا۔ ''چور چور!'' محلہ والے یہ آوازے سنتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل پڑے بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں گیا کہاں؟ سبھاگی بولی میں پکڑے ہوئے ہوں۔ لوگوں نے جا کر پوچھا تو اندر سبھاگی گھیسو کو پکڑے ہوئے ہے اور باہر سورداس ودیا دھر کو۔ مٹھوا نایک رام کے دروازہ پر کھڑا تھا یہ شوروغل سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک لمحہ میں سارا محلہ ٹوٹ پڑا۔ چور کے پکڑنے کو شاید ہی کوئی نکلے مگر پکڑے ہوئے چور پر زور آزمائی کے لیے سبھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں آکر دیکھتے ہیں تو نہ چور نہ چور کا بھائی بلکہ اپنے ہی محلہ کے لونڈے ہیں۔

ایک عورت: یہ زمانے کی خوبی ہے کہ گاؤں گھر کا بچار بھی اٹھ گیا کسی کی آبرو بچے گی؟

ٹھاکر دین ایسے لونڈوں کا سر کاٹ لینا چاہیے۔

نایک رام: چپ رہو ٹھاکردین یہ غصہ کرنے کی بات نہیں رونے کی بات ہے۔

جگدھر، بجرنگی، جمنی سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ بجرنگی کو تو ایسا غصہ آرہا تھا کہ گھیسو کا گلا دبا دے۔ یہ بھیڑ اور ہلچل دیکھ کر کئی کانسٹیبل بھی آپہنچے۔ اچھا شکار پھنسا مٹھیاں گرم ہوں گی فورا دونوں نوجوانوں کی کلائیاں پکڑ لیں جمنی نے رو کر کہا یہ لونڈے منہ میں کالکھ لگانے والے ہیں اچھا ہوگا چھ چھ مہینے کی سزا کاٹ آئیں گے تب ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی کہ بیٹا بد راہ مت چلو پر کون سنتا ہے اب جا کر چکی پیسو اس سے اچھا تھا کہ بانجھ ہی رہتی۔

نایک رام: اچھا اب اپنے اپنے گھر جاتے جاؤ جمعدار لونڈے ہیں چھوڑدو۔ آؤ چلیں۔

جمعدار: ایسا نہ کہو پنڈا جی کوتوال صاحب کو معلوم ہوجائے گا تو سمجھیں گے کہ ان سبھوں نے کچھ لے کر چھوڑ دیا ہوگا۔

نایک رام: کیا کہتے ہو سورداس اب یہ لوگ جائیں نا؟

ٹھاکر دین: ہاں اور کیا لڑکوں سے بھول چوک ہوہی جاتی ہے۔ کام تو برا کیا پر اب جانے دو جو ہوا سو ہوا۔

سورداس: میں کون ہوتا ہوں کہ جانے دوں ؟ جانے دیں کوتوال ڈپٹی حاکم لوگ۔
بجرنگی: سورداس بھگوان جانتا ہے جان کا ڈر نہ ہوتا تو اس دُشت کو کچا ہی چبا جاتا۔
سورداس: اب تو حاکم لوگوں کے ہاتھ میں ہے چھوڑیں چاہے ڈنڈ دیں ۔
بجرنگی: تم کچھ نہ کروگے تو کچھ نہ ہوگا جمعداروں کو ہم منالیں گے۔
سورداس: تو بھیا صاف صاف بات یہ ہے کہ میں بنا سرکار میں رپٹ کیے نہ مانوں گا۔ چاہے سارا محلّہ میرا دشمن ہوجائے۔
بجرنگی: کیا یہی ہوگا سورداس؟ گاؤں گھر ٹولے محلے کا لحاظ نہ کروگے؟ لڑکوں سے بھول توہوہی گئی۔ اب ان کی زندگانی خراب کرکے کیا ملے گا؟
جگدھر: سبھاگی ہی کہاں کی دیوی ہے جب سے بھیرو نے چھوڑدیا سارا محلّہ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہے۔ بنا پہلے کسی سانٹھ گانٹھ کے کوئی کسی کے گھر میں نہیں گھستا۔
سورداس: تو یہ سب مجھ سے کیا کہتے ہوں بھائی؟ سبھاگی دیوی ہو چاہے ہرجائی وہ جانے اس کا کام جانے۔ میں نے اپنے گھرمیں چوروں کو پکڑا ہے۔ اس کی تھانے میں رپٹ ضرور کروں گا۔ تھانہ والے نہ سنیں گے تو حاکم سے کہوں گا۔ لڑکے، لڑکوں کی راہ رہیں تو لڑکے ہیں۔ شہدوں کی راہ چلیں تو شہدے ہیں ۔ بدماشوں کے اور کیا سینگ پونچھ ہوتی ہے؟
بجرنگی: سور کہے دیتا ہوں خون ہوجائے گا۔
سورداس: تو کیا ہوجائے گا؟ کون میرے نام کو کوئی رونے والا بیٹھا ہواہے؟
نایک رام نے جواب دیا بھائی سورداس مانے گا نہیں چاہے لاکھ کہو۔ میں بھی تو کہہ چکا۔ کہو اور ہاتھ پیر پڑوں پر ہونا اونا کچھ نہیں۔ گھیسو اور ودیا کی تو بات ہی کیا۔ مٹھوا بھی ہوتا تو سورداس اس کو کبھی نہ چھوڑتا۔ ہٹھی آدمی ہے ۔
جگدھر: ایسا کہاں کا دھنا سیٹھ ہے کہ اپنے من ہی کی کرے گا تم چلو ذرا ڈانٹ کر کہو تو۔

نایک رام لوٹ کر سورداس سے بولے: سور کبھی کبھی گاؤں گھر کے ساتھ ملاہجا بھی کرنا پڑتا ہے لڑکوں کی زندگانی برباد کر کے تم کیا پاؤگے؟
سورداس: پنڈا جی تم بھی اوروں کی سی کہنے لگے۔ دنیا میں کہیں نیاے ہے کہ نہیں؟

کیا عورت کی آبرو کچھ ہوتی ہی نہیں؟ سبھاگی غریب ہے ابلا ہے مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتی ہے اس لیے جو کوئی چاہے اس کی آبرو بگاڑ دے؟ جو چاہے اسے ہر جائی سمجھ لے؟

سارا محلّہ ایک ہوگیا: یہاں تک کہ دونوں کانسٹیبل بھی محلّہ والوں کی سی کہنے لگے۔ ایک بولا عورت کھلہ (خود) ہرجائی ہے۔

دوسرا: محلّہ کے آدمی چاہیں تو کھون بچالیں یہ کون سا بڑا جرم ہے ۔

پہلا: شہادت ہی نہ ملے گی تو جرم کیا ثابت ہوگا۔

سورداس: شہادت تو جب نہ ملے گی جب میں مرجاؤں گا کیا کہا وہ ہرجائی ہے؟

کانسٹیبل: ہرجائی تو ہے ہی ایک بار نہیں سو بار اسے بازار میں ترکاری بیچتے اور ہنستے دیکھا ہے۔

سورداس: تو بازار میں ترکاری بیچنا اور ہنسنا ہرجائیوں کا کام ہے؟

کانسٹیبل: ارے تو جاؤگے تو تھانہ ہی تک نا؟ وہاں بھی تو ہمیں سے رپٹ کروگے۔

نایک رام: اچھی بات ہے اسے رپٹ کرنے دو میں دیکھ لوں گا داروغہ جی کوئی غیر آدمی نہیں ہیں۔

سورداس: ہاں داروغہ جی کے جو جی میں آئے کریں دوس پاپ ان کے ساتھ ہے۔

نایک رام: کہتا ہوں محلّہ میں نہ رہنے پاؤگے۔

سورداس: جب تک جیتا ہوں تب تک رہوں گا مرنے کے بعد دیکھی جائے گی۔

کوئی سورداس کو سمجھاتا تو کوئی دھمکاتا تھا: وہاں وہی لوگ رہ گئے تھے جو اس معاملہ کو دبا دینا چاہتے تھے جو لوگ اسے بڑھانا چاہتے تھے وہ بجرنگی اور نایک رام کے خوف سے کچھ کہہ نہ سکنے کے سبب اپنے گھر کو چلے گئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں سے بیر مول لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی ۔ پر سورداس اپنی بات پر ایسا اڑا تھا کہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آخر یہی طے ہوا کہ اسے تھانہ میں جا کر رپٹ لکھوانے دو۔ ہم لوگ تھانہ دار ہی کو راضی کرلیں گے۔ دس بیس روپے سے غم کھائیں گے ۔

نایک رام: ارے وہی لالہ تھانہ دار ہیں نا؟ انھیں تو میں چٹکی بجاتے بجاتے گانٹھ لوں گا۔ میری پرانی جان پہچان ہے۔

جگدھر: پنڈا جی میرے پاس تو روپے بھی نہیں ہیں۔ میری جان کیسے بچے گی؟
نایک رام: میں بھی پردیس سے لوٹا ہوں ہاتھ کھالی ہے جا کر کہیں روپے کی فکر کرو۔
جگدھر: میں سورداس کو اپنا ہوّا سمجھتا تھا۔ جب کبھی کام پڑا ہے اس کی مدد کی ہے۔ اسی کے پیچھے بھیرو سے میری دشمنی ہوگئی اور تب بھی یہ میرا نہ ہوا !
نایک رام: یہ کسی کا نہیں ہے اور سب کا ہے۔ جا کر دیکھو، جہاں سے ہوسکے پچیس روپے تو لے ہی آؤ۔
جگدھر: بھیا روپے کس سے مانگنے جاؤں؟ کون پتیائے گا۔
نایک رام: ارے ودیا کی اماں سے کوئی گہنا ہی مانگ لو، اس وقت تو بچیں پھر چھڑا دینا۔
جگدھر: (بہانے کرنے لگا) وہ چھلا تک نہ دے گی۔ میں مر بھی جاؤں تو کفن کے لیے روپے نہ نکالے گی۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔

نایک رام کو اس پر ترس آگیا روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔

سورداس بڑے سویرے تھانہ کی طرف چلا تو بجرنگی نے کہا۔ سورداس تمھارے سر پر موت کھیل رہی ہے، جاؤ۔

جمنی سورداس کے پیروں سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔ سورداس تم ہمارے بیری ہوجاؤگے یہ کبھی آس نہ تھی۔

بجرنگی نے کہا نیچ ہے اور کیا ہم اس کو پالتے ہی چلے آتے ہیں۔ بھوکوں کبھی نہیں سونے دیا۔ بیماری اوماری میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کبھی دودھ مانگنے آیا کھالی ہاتھ نہیں جانے دیا اس نیکی کا یہ بدلہ ! سچ کہا ہے کہ اندھوں میں(مروت) نہیں ہوتی ایک پاسن کے پیچھے۔

نایک رام پہلے ہی لپک کر تھانے جا پہنچے اور تھانہ دار کو سارا ماجرا سنا کر کہا پچاس کا ڈول ہے کم نہ جیادہ۔ رپٹ ہی نہ لکھیے۔

داروغہ نے کہا پنڈا جی جب تم درمیان میں ہو تو سوپچاس کی کوئی بات نہیں لیکن اندھے کو معلوم ہوجائے گا کہ رپٹ نہیں لکھی گئی تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے پاس جا پہنچے گا ۔ پھر میری جان آفت میں پڑ جائے گی۔ نہایت روکھا افسر ہے پولیس کا تو

جانی دشمن ہی سمجھوں۔ اندھا یوں ماننے والا آدمی نہیں ہے جب اس نے چتاری کے راجہ صاحب کے ناکوں چنے چبوادیے تو دوسروں کی کیا گنتی ہے؟ بس یہی ہو سکتا ہے کہ جب میں تحقیقات کے لیے آؤں تو آپ لوگ کسی کو شہادت نہ دینے دیں۔ عدم ثبوت میں معاملہ خارج ہو جائے گا۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ شہادت کے لیے کسی کو مجبور نہ کروں گا اور گواہوں کے بیانات میں بھی کچھ کانٹ چھانٹ کر دوں گا۔

دوسرے روز شام کے وقت داروغہ جی تحقیقات کرنے گیے۔ محلّہ کے سب لوگ جمع ہوئے مگر جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے رات کو کسی کی ''چور چور'' کی آواز نہیں سنی۔ میں نے کسی کو سورداس کے دروازہ پر نہیں دیکھا۔ میں تو گھر میں دروازہ بند کیے پڑا سوتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھاکردین نے بھی صاف کہا۔ صاحب میں کچھ نہیں جانتا۔

داروغہ نے سورداس پر بگڑ کر کہا۔ جھوٹی رپٹ کرتا ہے۔ بدمعاش!

سورداس: رپٹ جھوٹی نہیں ہے۔ سچی ہے۔

داروغہ: تیرے کہنے سے سچی مان لوں۔ کوئی گواہ بھی ہے؟

سورداس نے محلّہ والوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یارو سچی بات کہنے سے مت ڈرو۔ میل مروت اسے نہیں کہتے کہ کسی عورت کی آبرو بگاڑ دی جائے اور لوگ اس پر پردہ ڈال دیں۔ کسی کے گھر میں چوری ہوجائے اور لوگ چھپالیں۔ اگر یہی حال رہا تو سمجھ لو کہ کسی کی آبرو نہ بچے گی۔ بھگوان نے سبھی کو بہو بیٹیاں دی ہیں کچھ ان کا بھی کھیال کرو۔ عورت کی آبرو کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے سر کٹ جاتے ہیں۔ لہو کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ میں اور کسی سے نہیں پوچھتا۔ ٹھاکردین تمھیں بھگوان کا ڈر ہے۔ پہلے تمھیں آئے تھے۔ تم نے یہاں کیا دیکھا؟ کیا میں اور سبھاگی دونوں گھیسو اور بدیا دھر کا ہاتھ نہیں پکڑے ہوئے تھے؟ دیکھو منہ دیکھی نہیں۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ جو کچھ دیکھا ہے سچ سچ کہہ دو۔

ٹھاکردین دھرم سے ڈرتا تھا۔ یہ باتیں سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ بولا چوری ڈاکے کی بات تو میں کچھ نہیں جانتا۔ یہی پہلے بھی کہہ چکا۔ بات بدلنی نہیں آتی۔ ہاں جب میں آیا تو تم اور سبھاگی دونوں لڑکوں کو پکڑے چلا رہے تھے۔

سورداس: میں ان دونوں کو ان کے گھر سے تو نہیں پکڑ لایا تھا؟

ٹھاکردین: یہ بھگوان جانیں۔ ہاں چور چور کی آواج میرے کان میں پڑی تھی۔

سورداس: اچھا اب میں تم سے پوچھتا ہوں جمعدار۔ تم آئے تھے نا:؟ بولو یہاں۔ جماؤ تھا کہ نہیں۔

کانسٹبل نے ٹھاکردین کو بدلتے دیکھ تو ڈرا کہ اندھا دو چار آدمیوں کو اور لائے گا تو ہم جھوٹے بنیں گے۔ بولا: ہاں جماؤ کیوں نہیں تھا۔

سورداس: گھیسو کو سبھاگی پکڑے ہوئے تھی کہ نہیں؟ بدّیا دھر کو میں پکڑے ہوئے تھا کہ نہیں؟

کانسٹبل: چوری ہوتے ہم نے نہیں دیکھی۔

سورداس: ہم ان دونوں لڑکوں کو پکڑے ہوئے تھے کہ نہیں؟

کانسٹبل: ہاں پکڑے ہوئے تھے پر چوری ہوتے نہیں دیکھی۔

سورداس: داروگا جی۔ ابھی گواہی ملی کہ اور دوں؟ یہاں ننگے لچے نہیں بستے۔ بھلے مانسوں ہی کی بستی ہے۔ کہئیے بجرنگی سے کہلادوں ۔ کہیے کھد گھیسو سے کہلادوں۔ کوئی جھوٹی بات نہیں کہے گا۔ مروت مروت کی جگہ ہے۔ محبت محبت کی جگہ ہے۔ مروت اور محبت کے پیچھے کوئی اپنا پرلوک بگاڑے گا۔

بجرنگی نے دیکھا۔ اب لڑکے کی جان نہیں بچتی تو اپنا ایمان کیوں بگاڑیں۔ داروغہ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ داروگا جی سورداس جو بات کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ جس نے جیسی کرنی کی ہے ویسی بھوگے۔ ہم کیوں اپنا پرلوگ بگاڑیں؟ لڑکا ایسا نالائق نہ ہوتا تو آج کیوں منہ میں کالکھ لگتی؟ جب اس کا چلن ہی بگڑ گیا تو میں کہاں تک بچاؤں گا؟ ڈنڈ بھوگے گا تو آپ آنکھیں کھلیں گی۔

ہوا بدل گئی۔ ایک لمحہ میں شہادتوں کا تانتا بندھ گیا۔ دونوں ملزم حراست میں لے لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور تین تین مہینے کی سزا ہوگئی۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں سورداس کے معتقد تھے۔ نایک رام کا یہ کام تھا کہ سب سے سورداس کے گن کا بکھان کیا کرے۔ اب یہ تینوں اس کے دشمن ہوگئے۔ دوبار پہلے بھی وہ اپنے محلّہ سے بیر لے چکا تھا۔ مگر ان دونوں موقعوں پر کسی کو اس کی ذات سے اتنا صدمہ نہ پہنچتا تھا۔

اب کے تو اس نے بڑا زبردست قصور کیا تھا۔ جمنی جب سورداس کو دیکھتی تو سو کام چھوڑ کر اسے کوستی۔ سبھاگی کو گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ یہاں تک ہوا کہ مٹھوا نے بھی ساتھ چھوڑدیا۔ اب وہ رات کو بھی اسٹیشن ہی پر رہ جاتا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ نایک رام تو اتنے برہم تھے کہ سورداس کے دروازہ کا راستہ ہی چھوڑدیا چکر کھاکر آتے جاتے ۔ بس اس کے ساتھیوں میں لے دے کے ایک بھیرو رہ گیا۔ ہاں کبھی کبھی دوسروں کی نظر بچاکر ٹھاکردین بھی خیرت کا حال پوچھ جاتا۔ اور تو اور ودیادھر بھی اس سے کنارہ کرنے لگے کہ کہیں لوگ اس کا دوست سمجھ کر مجھے دان دچھنا دینا بند نہ کردیں۔ سچائی کے دوست کم ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی تعداد سے کہیں کم۔

(41)

پربھوسیوک نے تین سال تک امریکہ میں رہ کر اور ہزاروں روپے خرچ کر کے جو تجربہ اور ہنر حاصل کیا تھا وہ مسٹر جان سیوک نے ان کی صحبت سے اتنے ہی مہینوں میں حاصل کر لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں پربھو سیوک کی طرح وہ صرف بتلائے ہوئے راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے پر قانع نہ تھے۔ ان کی نگاہ آگے پیچھے دائیں بائیں بھی رہتی تھی۔ ماہرین میں ایک تنگدلی ہوتی ہے۔ جو ان کی نگاہوں کو محدود رکھتی ہے وہ کسی مسئلہ پر آزاد ہوکر وسیع نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ ضابطہ اصول اور روایات ان کی نگاہوں کو پھیلنے نہیں دیتیں۔ طبیب ہر مرض کی دوا کتابوں میں تلاش کرتا ہے وہ صرف تشخیص کا بندہ ہے اور علامات کا غلام۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کتنے ہی مرضوں کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ عقل سلیم اگر تفصیلات پر قادر نہیں تو تعصبات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر مجموعی حیثیت سے غور کرسکتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتی۔ یہی باعث ہے کہ دفتر وزارت میں بیٹھا ہوا فوجی وزیر سپہ سالار پر حکومت کرتاہے۔ پربھوسیوک کی علیحدگی سے مسٹر جان سیوک ذرا بھی برداشتہ خاطر نہیں ہوئے۔ وہ دوگنے حوصلے سے کام کرنے لگے۔ کاروباری شخص تھے۔ جتنی آسانی سے دفتر میں بیٹھ کر بہی کھاتہ لکھ سکتے تھے۔ اتنی ہی آسانی سے موقع پڑنے پر وہ انجن کے

پہیوں کو بھی چلا سکتے تھے۔ پہلے کبھی کبھی سرسری نگاہوں سے مل کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اب باقاعدگی کے ساتھ اوقات معینہ پر جاتے ۔ اکثر دن کا کھانا وہیں کھاتے اور شام کو گھر جاتے۔ کبھی کبھی رات کے نو دس بج جاتے۔ وہ پربھوسیوک کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں نے تمھارے ہی بھروسہ پر یہ کام نہیں شروع کیا۔ کوّے کے نہ بولنے پر بھی سویرا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ ان کی زرپرستی اولاد کی محبت پر مبنی نہ تھی۔ وہ ان کی زندگی کا خاص جز اور ان کے چشمۂ حیات کا اصلی منبع تھی۔ دنیا کی اور سبھی باتیں ضمنی تھیں۔

مزدوروں اور کاریگروں کے لیے مکانات تعمیر کرانے کا مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا۔ اگرچہ مجسٹریٹ ضلع سے انھوں نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا مگر چتاری کے راجہ صاحب کی طرف سے انھیں بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ صاحب ایک بار عوام کی مرضی کے خلاف چل کر اس قدر بدنام ہوچکے تھے کہ اس سے کہیں زیادہ اہم فتح کی امید بھی انھیں ایسی فضیحت کے لیے تیار نہ کرسکتی تھی۔ مل بڑے زوروں پر چل رہی تھی مگر مزدوروں کے مکانات کا نہ ہونا اس کی ترقی میں رکاٹ ڈال رہا تھا۔ جان سیوک اسی ادھیڑ بن میں پڑے رہتے تھے۔

اتفاقاً وقتی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہوا کہ یہ مشکل مسئلہ بھی کسی خاص کوشش کے بغیر ہی حل ہوگیا۔ پربھوسیوک کی علیٰحدگی نے وہ کام کر دکھایا جو شاید ان کی رفاقت سے نہ ہوسکتا۔

جب سے صوفیہ اور ونے آگئے تھے۔ سمتی خوب ترقی کر رہی تھی۔ اس کا سیاسی رفتار روز بروز تیز ہوجاتی تھی۔ کنور صاحب نے جتنی آسانی سے پہلی مرتبہ حکام کے شکوک رفع کردیے تھے اتنی آسانی سے اب کے نہ کرسکے۔ اب مسئلہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہوگیا تھا۔ پربھوسیوک کو استعفا دینے کے لیے مجبور کرنا مشکل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے۔ حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے آزاد، بے لوث اور دور اندیش۔ ان کی زندگی اتنی سادہ اور صاف تھی کہ لوگ انھیں تارک الدنیا کہا کرتے تھے۔ انھیں عیش و عشرت کے لیے کسی بڑی جائداد کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔ مگرظاہرا طریقہ پر وہ حکام کے مورد عتاب بننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ قومی کام کے لیے اپنا سب کچھ دے سکتے تھے۔ مگر اس طرح کہ امانت کی باگ ڈور ان کے

ہاتھوں میں رہے۔ ان میں اس قربانی کی ہمت نہ تھی۔ جو بالکل بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ ہم آڑ میں رہ کر اس سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوسکتے ہیں جتنا کہ سامنے آکر ونے کی اور ہی رائے تھی۔وہ کہتا تھا کہ ہم جائداد کے لیے اپنے ضمیر کی آزادی کا خون کیوں کریں۔ ہم جائداد کے مالک بن کر رہیں گے اس کے غلام بن کر نہیں۔ اگر دولت پرستی سے نجات پا سکے تو اس ریاضت کا نتیجہ کیا ہوا۔ کنور صاحب اس کا یہ جواب دیتے کہ ہم جائداد کے مالک نہیں بلکہ محافظ ہیں۔ یہ جائداد آئندہ نسلوں کی امانت ہے۔ ہمیں کیا اختیار ہے کہ ہم ان نسلوں سے وہ آرام چھین لیں جو انھیں وارثتاً ملنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اتنے معار پسند نہ ہوں یا انھیں وقتی حالات کے تبدیل ہو جانے سے نفس کشی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں وہ فطرتی اوصاف نہ ہوں جن کے سامنے جائداد کوئی چیز نہیں ایسے ہی دلائل سے وہ ونے کی تشفی کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اپنی زندگی بھر وہ دولت و ثروت سے آرام وعزت حاصل کرنے کے بعد وہ ترک اور استغناء کا واقعی مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ اولاد کے لیے جائداد نہ چاہتے تھے جائداد کے لیے اولاد چاہتے تھے۔ جائداد کے مقابلہ میں اولاد کی حیثیت ثانوی تھی۔ انھیں حکام کی خوشامد سے نفرت تھی۔ وہ حکام کے ہاں میں ہاں ملانا معیوب سمجھتے تھے۔ مگر حکام کی نظروں میں مشتبہ ہوجانا اس حد تک کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہو جائیں انھیں محض حماقت معلوم ہوتی تھی۔ کنور صاحب کے ہاتھوں میں ونے کو راہ راست پر لانے کی ایک ہی تدبیر تھی وہ یہ کہ صوفیہ سے اس کی شادی ہو جائے۔ اس طرح زنجیروں میں جکڑ کر وہ اس کے اٹھتے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب جو تاخیر تھی وہ صوفیہ کی طرف سے۔ صوفیہ کو اب بھی اندیشہ تھا کہ اگرچہ رانی صاحبہ اس وقت مجھ پر خصوصاً مہربان ہیں مگر انھیں دل سے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ اس کا یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد بھی نہ تھا رانی بھی صوفیہ سے محبت کر سکتی تھیں اور کرتی تھیں وہ اس کی عزت کرتی تھیں مگر وہ اپنی بہو میں ترک تعلق واستغناء غور وخوض کی بہ نسبت حیا سادگی اور خاندانی شرافت کا ہونا زیادہ ضروری خیال کرتی تھیں۔ وہ چھوڑنے والی بہو نہیں بلکہ لپٹنے والی بہو چاہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے دلی خیالات کو بھول کر بھی

زبان پر نہ لاتی تھیں۔ نہیں بلکہ وہ ایسے خیالات کو اپنے دل میں آنے ہی نہ دینا چاہتی تھیں وہ اسے احسان فراموشی سمجھتی تھیں۔

کنور صاحب کئی روز تک اسی فکر میں مبتلا رہے ۔ مسٹر جان سیوک سے گفتگو کیے بغیر شادی کس طرح طے ہوتی؟ آخر ایک دن اپنی مرضی کے خلاف ہونے پر بھی وہ مجبوراً ان کے پاس گئے۔ شام ہوگئی تھی۔ مسٹر سیوک ابھی ابھی مل سے واپس آئے تھے اور مزدوروں کے مکانات کی تجویز کو سامنے رکھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی اٹھے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملائے۔

کنور صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے آپ ونے اور صوفیہ کی شادی کے متعلق کیا تجویز کرتے ہیں؟ آپ میرے دوست اور صوفیہ کے والد ہیں اور دونوں ہی رشتوں کے سبب مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق ہے کہ اب اس کام میں دیر نہ کیجیے۔

جان سیوک: دوستی کے تعلق سے آپ مجھ سے چاہے جو خدمت لے سکتے ہیں لیکن (متانت سے)صوفیہ کا والد ہونے کے تعلق سے مجھے کچھ تجویز کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس نے مجھے اس حق سے محروم کر دیا ہے۔ ورنہ اسے یہاں آئے اتنے دن ہوگئے کیا ایک مرتبہ بھی یہاں تک نہ آتی؟ اس نے ہم سے یہ حق چھین لیا ہے۔ اتنے ہی میں مسز سیوک بھی آگئیں اور شوہر کی باتیں سن کر بولیں۔ میں تو مرجاؤں گی پر اس کی صورت نہ دیکھوں گی۔ ہمارا اس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

کنور: آپ لوگ صوفیہ کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں جب سے وہ یہاں آئی ہے ایک روز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اس کا سبب فقط شرم ہے اور کچھ نہیں۔ شاید ڈرتی ہے کہ باہر نکلوں اور کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے تو اس سے کیا باتیں کروں گی۔ ذرا دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی جگہ ہوتا تو اس وقت دل میں کیسے خیالات ہوتے۔ اس بارے میں وہ قابل معافی ہے۔ میں تو اسے اپنی بدقسمتی سمجھوں گا۔ اگر آپ لوگ اس سے اس طرح بے تعلق ہوجائیں گے۔ اب شادی میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔

مسز سیوک: خدا وہ دن لائے۔ میرے لیے تو وہ مرگئی۔ میں اس کا فاتحہ پڑھ چکی اور اس کے نام کو جتنا رونا تھا روچکی۔

کنور: یہ زیادتی آپ لوگ میری ریاست کے ساتھ کر رہے ہیں۔ شادی ہی ایک ایسی تدبیر ہے جو ونے کی خودسری کو زائل کردے گی۔

جان سیوک: میری تو رائے ہے کہ آپ ریاست کو کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیجیے گورنمنٹ عالیہ آپ کی تجویز کو بخوشی منظور کر لے گی اور آپ کے متعلق اس کا سارا شبہ دور ہوجائے گا۔ اس وقت کنور ونے سنگھ کی سیاسی بدعوانیوں کا ریاست پر ذرا بھی اثر نہ پڑے گا اور اگرچہ اس وقت ان کو آپ کی یہ تجویز بری معلوم ہوگی۔ مگر کچھ روزبعد جب ان کے خیالات میں پختگی آجائے گی ۔ تو وہ آپ کے ممنون ہوں گے اور آپ کو اپنا سچا بہی خواہ خیال کریں گے۔ ہاں اتنی عرض اور ہے کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ اپنے کو خوب مضبوط بنالیں۔ اس وقت اگر آپ کی طرف سے ذرا بھی پس وپیش ہوا تو آپ کی ساری کوشش بے کار جائے گی۔ آپ گورنمنٹ کی بدگمانیوں کو رفع کرنے کی بجائے اور بھی بڑھا دیں گے۔

کنور: میں جائداد کی حفاظت کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ ونے کو کسی قسم کی مالی تکلیف نہ ہونے پاوے بس اپنے لیے میں اور کچھ نہیں چاہتا۔

جان سیوک: آپ ظاہرا تو کنور سنگھ کے لیے کوئی انتظام نہیں کرسکتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے وثیقہ میں سے جو مناسب سمجھیں انھیں بھی دے دیا کریں۔

کنور: اچھا مان لیجیے کہ ونے اسی راستہ پر بڑھتے ہی گئے تو؟

جان سیوک: تو انھیں ریاست پر کوئی اختیار نہ ہوگا۔

کنور: لیکن ان کی اولاد کو تو یہ اختیار رہے گا؟

جان سیوک: ضرور۔

کنور: گورنمنٹ صاف لفظوں میں اس شرط کو منظور کر لے گی؟

کنور : ایسا تو نہ ہوگا کہ ونے کے اعمال کا نتیجہ ان کی اولاد کو بھگتنا پڑے؟ سرکار ریاست کو ہمیشہ کے لیے ضبط کر لے؟ دو ایک مقامات پر ایسا ہوا ہے برار ہی کو لیجیے۔

جان سیوک: کوئی خاص بات پیدا ہوجائے تو نہیں کہہ سکتا لیکن سرکار کا یہ وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ برار کی بات جانے دیجیے وہ اتنا بڑا صوبہ ہے کہ کسی ریاست میں اس کا

شامل ہوجانا ملکی انتظامات میں مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔

کنور : تو میں کل ڈاکٹر گنگولی کو شملہ سے تار بھیج کر بلائے لیتا ہوں۔

جان سیوک: آپ چاہیں تو بلالیں میری رائے میں تو یہیں سے مسودہ بنا کر ان کے پاس بھیج دیا جائے یا کہیے تو میں خود چلا جاؤں اور ساری باتیں آپ کی مرضی کے موافق طے کر آؤں۔

کنور صاحب نے شکریہ اداکیا اور گھر چلے آئے۔ تمام رات وہ اسی حیص بیص میں پڑے رہے کہ ونے اور جانہوی سے اس تجویز کا تذکرہ کروں یا نہیں۔ ان کا جواب انھیں معلوم تھا ان سے ناپسندیدگی اور انکار کے سوا ہمدردی کی ذرا بھی امید نہیں۔ کہنے سے فائدہ کیا؟ ابھی تو ونے کو کچھ خوف بھی ہے، یہ حال سنے گا تو اور بھی دلیر ہو جائے گا۔ آخر کار انھوں نے یہی طے کیا کہ ابھی ابھی راز فاش کردینے سے کوئی نفع نہیں بلکہ خلل پڑے گا۔ کام پورا ہوجانے پر کہنے سننے کے لیے کافی وقت ملے گا۔

مسٹر جان سیوک پیروں تلے گھاس نہ اگنے دینا چاہتے تھے ۔ دوسرے ہی روز انھوں نے ایک بیرسٹر سے درخواست کا مسودہ تیار کرایا اور اسے کنور صاحب کو دکھلایا۔ اسی روز وہ کاغذ ڈاکٹر گنگولی کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور خود شملہ سے آئے۔ یہاں کنور صاحب سے مشورہ کیا اور دونوں اصحاب صوبہ کے گورنر کے پاس جا پہنچے گورنر کو اس میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست پر ایک کوڑی کا بھی قرض نہ تھا۔ سرکاری عمال نے ریاست کے حساب وغیرہ کی جانچ شروع کی اور ایک ماہ کے اندر ریاست پر سرکار کا قبضہ ہوگیا۔ کنور صاحب ندامت وپشیمانی کے سبب ان دنوں ونے سے بہت کم بولتے۔ گھر میں بہت کم جاتے۔ آنکھیں چراتے رہتے تھے کہ کہیں یہ گفتگو نہ چھڑ جائے جس روز تمام شرائط طے ہوگئیں کنور صاحب سے ضبط نہ ہوسکا۔ ونے سنگھ سے بولے ریاست پر سرکاری قبضہ ہوگیا۔

ونے نے چونک کر دریافت کیا۔ کیا ضبط ہوگئی؟

کنور: نہیں میں نے کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیا۔

یہ کہہ کر انھوں نے شرائط کا ذکر کیا اور انکسار کے ساتھ کہا۔ معاف کرنا میں نے تم سے اس بارہ میں صلاح نہیں کی۔

ونے: مجھے اس کا ذرا بھی غم نہیں ہے لیکن آپ نے فضول ہی اپنے کو گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ اب آپ کی حیثیت محض ایک وثیقہ خوار کی ہے۔ جس کا وثیقہ کسی وقت بھی بند کیا جاسکتا ہے۔

کنور: اس کا الزام تمھارے سر ہے۔

ونے: آپ نے یہ تجویز کرنے کے پیشتر ہی مجھ سے پوچھا ہوتا تو یہ نوبت نہ آنے پاتی میں تمام عمر ریاست سے دست بردار رہنے کا اقرار نامہ تحریر کر دیتا اور آپ اسے شائع کر کے حکام کو خوش رکھ سکتے تھے۔

کنور: (سوچ کر) اس حالت میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ میں پوشیدہ طور پر تمھاری مدد کر رہا ہوں اس شبہ کو مٹانے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا؟

ونے: تو میں اس گھر سے نکل جاتا اور آپ سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیتا۔ اب بھی اگر آپ اس انتظام کو مسترد کرسکیں تو بہتر ورنہ میں اپنے خیال سے نہیں، آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے گزر بسر کی کوئی صورت پیدا کرلوں گا۔

کنور صاحب آبدیدہ ہوکر بولے۔ ونے مجھ سے ایسی سخت باتیں نہ کرو۔ میں تمھاری ملامت کا نہیں تمھاری ہمدردی اور رحم کا مستحق ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ صرف سوشل خدمات سے ہماری نجات ہوسکتی ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم آزادی سے ان خدمات کو بھی انجام نہیں دے سکتے۔ کوئی تحریک جس سے ملک میں اپنی حالت کے احساس کی قابلیت پیدا ہو تو انسانیت اور قومیت کے جذبات کو پیدا کرے اشتباہ سے بچ نہیں سکتی۔ یہ سب جانتے ہوئے میں نے اس خدمتی دائرہ میں قدم رکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ تحریک جلد ہی موجودہ صورت اختیار کر لے گی اور اس کا یہ انجام ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں ظاہر نہ ہو کر بھی اس کا انتظام کرتا رہوں گا۔ یہ نہ جانتا تھا کہ اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کا بھی سب کچھ سواہا کر دینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں اس قدر ایثار کی ہمت نہیں ہے۔

ونے نے اس کا کچھ جواب نہ دیا انھیں اپنی یا صوفیہ کی کوئی فکر نہ تھی ہاں

اسے فکر تھی تحریک کو جاری رکھنے کی۔ اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ انھیں کبھی دان مانگنے کی ضرورت نہ پڑی تھی وہ یہ نہ جانتے تھے کہ عوام سے روپے کس طرح ملتے ہیں۔ کم از کم پانچ ہزار ماہوار کا صرفہ تھا۔ اتنا روپیہ فراہم کرنے کے لیے ایک علاحدہ جماعت کی ضرورت تھی اب انھیں معلوم ہوا کہ دولت اتنی حقیر شے نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہوار یا ساٹھ ہزار روپے سالانہ کے لیے بارہ لاکھ کے مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کچھ عقل کام نہ کرسکتی تھی جانہوی کے پاس کچھ ان کی پونجی تھی جسے وہ دینا چاہتی تھیں۔ اب تو اسے محفوظ رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ ونے کو مفلس نہیں بنانا چاہتی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ونے اور اندروت دونوں روپے کے لیے متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً صوفیہ نے آکر کہا میں ایک تدبیر بتلاؤں۔

اندردت: چندہ مانگنے چلیں؟

صوفیہ: کیوں نہ ایک ڈراما کھیلا جائے۔ ایکٹر موجود ہی ہیں۔ کچھ پردے تیار کر لیے جائیں۔ میں بھی تیاری میں مدد دوں گی۔

ونے: رائے تو صائب ہے مگر ڈراما کی ہیروئین تمھیں کو بننا پڑے گا۔

صوفیہ: ہیروئن کا پارٹ اندورانی لیں گی اور میں ان کی سکھی کا۔

اندردت: کون سا ناٹک کھیلا جائے؟ بھٹ جی کا درگاوتی ناٹک؟

ونے: مجھے تو پرساد کا اجات شاستر بہت پسند ہے۔

صوفیہ: مجھے کربلا بہت پسند آیا۔ اس میں رزم کا بھی شائبہ ہے اور سوگ کا بھی، دونوں کی نفیس آمیزش ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چٹھی رساں اندر آیا اور ایک مہر بند رجسٹرڈ لفافہ ونے کے ہاتھ میں دے کر چلا گیا لفافہ لندن سے آیا تھا۔ اور اس پر پربھوسیوک کے نام کی مہر تھی۔

ونے: اچھا بتاؤ اس میں کیا ہوگا؟

صوفیہ: روپے تو ہوں گے نہیں اور چاہے جو ہو وہ غریب روپے کہاں پائے گا۔ وہاں ہوٹل کا خرچ ہی بہ مشکل ادا کرتا ہوگا۔

ونے: اور میں کہتا ہوں کہ اس میں روپیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

اندردت: کبھی نہیں۔ کوئی نئی تصنیف ہوگی۔

ونے: تو رجسٹری کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اندردت: روپے ہوتے تو بیمہ نہ کرایا ہوتا۔

ونے: میں کہتا ہوں روپے ہیں۔ چاہے شرط بدلو۔

اندردت: میرے پاس کل پانچ روپے ہیں پانچ پانچ کی بازی ہے۔

ونے: یہ نہیں، اگر اس میں روپے ہوں تو میں تمھاری گردن پر سوار ہوکر کے اس سرے تک جاؤں گا۔ نہ ہوں گے تو تم میری گردن پر سوار ہونا۔ بولو

اندردت: اچھا منظور ہے۔ کھولو لفافہ۔

لفافہ کھولا گیا تو ایک چک نکلا پورے دس ہزار کا لندن بینک کے نام۔ ونے خوشی سے اچھل پڑے، بولے میں کہتا نہ تھا یہاں علم الغیب پڑھے ہوئے ہیں۔ آیے لائیے گردن۔

اندردت: ٹھہرو ٹھہرو گردن توڑ دوگے کیا؟ ذرا خط تو پڑھو کیا لکھا ہے کہاں ہے؟ کیا کر رہے ہیں؟ لگے سواری گا نٹھنے۔

ونے: جی نہیں یہ نہیں ہونے کا آپ کو سوراری دینی ہوگی گردن ٹوٹے یا رہے اس کا میں ذمہ دار نہیں۔ کچھ دبلے پتلے ہو نہیں خاصے دیو بنے ہوئے ہو۔

اندردت: بھئی آج منگل کے دن نظر نہ لگاؤ کل دو من ۳۵ سیر تو رہ گیا ہوں۔ راجپوتانہ جانے کے قبل تین من سے زیادہ تھا۔

ونے: خیر دیر نہ کیجیے۔ آیئے گردن جھکا کر کھڑے ہو جایئے۔

اندردت: صوفیہ میری حفاظت کرو۔ تمھیں نے پہلے کہا تھا کہ اس میں روپے نہ ہوں گے۔ وہی سن کر میں نے بھی کہہ دیا تھا۔

صوفیہ: میں تمھارے جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ تم جانو وہ جانیں۔ یہ کہہ کر اس نے خط پڑھنا شروع کیا:۔

پیارے بھائی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خط کس کو لکھ رہا ہوں کچھ خبر نہیں کہ آج کل منیجر کون ہے مگر سیوا سمتی سے مجھے اب بھی وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ اس کی

خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ میری خیریت کا حال جاننے کے لیے مشتاق ہوں گے۔ میں پونا ہی میں تھا کہ وہاں کے گونر نے مجھے ملنے کے لیے بلایا۔ ان سے دیر تک علم ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہی وہ ایک ہی ماہر فن ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ کم نکلیں گے۔ ونے (اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا) کے سوا میں نے اور کسی کو بھی اتنا سخن فہم نہیں پایا۔ کتنا جاندار اخلاق تھا۔ گونر صاحب کے اصرار سے میں یہاں آیا اور جب سے یہاں آیا ہوں میری تواضع تکریم برابر ہو رہی ہے۔ واقعی زندہ اقوام ہی ماہرین فن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ بڑے خلیق۔ فراخ دل اور ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے اس قوم سے اب عقیدت ہوگئی ہے اور مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں ہمارا نقصان کبھی نہیں ہو سکتا۔ کل یونیورسٹی کی جانب سے مجھے ایک سپاس نامہ دیا گیا تھا۔ خادمان ادب کا ایسا ہجوم میں نے کا ہے کو کبھی دیکھا تھا۔ عورتوں کا اخلاق اور احترام آمیز سلوک دیکھ کر میں دنگ ہوگیا۔ دودن پہلے انڈیا ہوٹش نے دعوت دی تھی۔ آج ادبی انجمن نے مدعو کیا ہے۔ کل لبرل ایسوی ایشن دعوت دے گا۔ پرسوں پارسی سماج کا نمبر ہے۔ اسی روز یونین کلب کی جانب سے پارٹی دی جاوے گی۔ مجھے خواب میں بھی امید نہ تھی کہ میں اتنی جلد بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔ میں شہرت اور عزت کی برائی کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ اس کے سوا اہل کمال کو اور کیا صلہ مل سکتا ہے؟ مجھے اب معلوم ہوا کہ میں کیا کرنے کے لیے دنیا میں آیا ہوں۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے اب تک وہم میں پڑا ہوا تھا۔ اب میری زندگی کا مشن ہوگا۔ مغرب و مشرق میں رشتہ اتحاد قائم کرنا اور اسے پائدار بنانا۔ باہمی اختلافات کو مٹانا اور دونوں میں یکسانیت کے جذبے کو پیدا کرنا۔ میں اسی بات کا عہد کروں گا۔ کسی زمانہ میں مشرق نے مغرب کو مذہب وایمان کا جو راستہ دکھلادیا تھا۔ اب وہ اسے اتحاد کا نغمہ سنائے گا۔ اتحاد کا راستہ دکھلائے گا۔ میرے کلام کے پہلے حصہ کو میکملن کمپنی جلدہی شائع کرے گی۔ خود گورنر صاحب اس کا دیباچہ لکھیں گے۔ اس مجموعہ کلام کے لیے کمپنی نے مجھے چالیس ہزار روپے دیے ہیں۔ تمنا تو یہی تھی کہ یہ ساری رقم اپنی پیاری سمتی کے نذر کرتا مگر ارادہ ہے کہ امریکہ کی سیر بھی کروں اس لیے اس وقت جو کچھ بھیجتا ہوں اسے قبول کیجیے۔ میں نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے اس لیے شکریہ کی امید نہیں رکھتا۔

البتہ اتنا عرض کردینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ کو خدمت کے معیارانہ اصولوں پر عمل کرنا چاہیے اور سیاسی معاملات سے الگ ہوکر انسانی اخوت کی اشاعت کو اپنا معیار بنانا چاہیے۔ میری تقریریں کی رپورٹ آپ کو یہاں کے اخبارات میں ملے گی آپ دیکھیں گے کہ میرے سیاسی خیالات میں کتنا فرق آگیا ہے میں اب ایک ملک کا نہیں بلکہ سب ملکوں کا ہوں اب ساری دنیا میرا ملک ہے۔ کل انسان میرے بھائی ہیں۔ اور جغرافیائی نیز قومی حدود کو مٹا دینا میری زندگی کا خاص مقصد ہے خدا سے دعاء کیجیے کہ امریکہ سے بخیریت واپس آجاؤں۔ آپ کا سچا بھائی۔ پربھو سیوک۔

صوفیہ نے خط میز پر رکھ دیا متانت سے بولی اس کے دونوں ہی مطلب ہوسکتے ہیں روحانی کمال یا زوال۔ میں تو زوال ہی سمجھتی ہوں۔

ونے: کیوں کمال کیوں نہیں؟

صوفیہ : اس لیے کہ پربھوسیوک آرائش و زیبائش کا دلدادہ ہے۔ وہ ایک بات پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جو شخص اپنی عزت ہونے پر اتنا پر امید ہو سکتا۔ وہ اپنی ذلت سے اتنا ہی ناامید ہو جائے گا۔

ونے: یہ کوئی بات نہیں شاید اسی طرح میں بھی مسرور ہوجاتا یہ تو بالکل قدرتی بات ہے یہاں ان کی کیا قدر ہوئی؟ مرتے دم تک گمنان بنے رہتے۔

اندروت: جب ہمارے کام کے نہیں رہے تو مشہور ہوا کریں۔ ایسے دنیا سے محبت کرنے والوں کے ہاتھوں نہ کسی کی بھلائی ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ جس میں اپنا پن نہیں اس میں پرایا پن کیا ہوگا؟

صوفیہ: یہی محبت ہمارے کئی شعراء کو لے ڈوبی اور انھیں بھی لے ڈوبے گی ان کا عدم وجود ہمارے لیے یکساں ہے بلکہ مجھے تو اب ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے میں ابھی جا کر اس خط کا جواب لکھتی ہوں۔

یہ کہتے ہوئے صوفیہ اس خط کو ہاتھ میں لیے اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

ونے نے کہا۔ کیا کروں؟ روپے واپس کردوں؟

اندردت: روپے کیو ں واپس کروگے انھوں نے کوئی شرط تو نہیں لکھی ہے محض دوستانہ صلاح دی ہے اور بہت عمدہ صلاح دی ہے۔ ہمارا بھی تو وہی مقصد ہے۔ فرق صرف

اتنا ہے کہ وہ مساوات کے بغیر ہی اخویت کی اشاعت کرنی چاہتے ہیں اور ہم اخوت کے لیے مساوات کا ہونا لازمی خیال کرتے ہیں۔

ونے: یہ کیوں نہیں کہتے کہ اخوت کا مساوات ہی پر دارومدار ہے۔

اندردت: شریمتی صوفیہ ان کی خوب خبر لیں گی۔

ونے: اچھا روپے رکھ لیتا ہوں پھر دیکھا جائے گا۔

اندردت: دوچار ایسے ہی دوست اور مل جائیں تو ہمارا کام چل نکلے۔

ونے: صوفیہ کے ڈراما کھیلنے کی صلاح کیسی ہے؟

ونے: تم میری جگہ ہوتے تو اسے اسٹیج پر لانا پسند کرتے؟

اندردت: پیشہ سمجھ کر تو نہیں لیکن رفاہ عام کے لیے اسٹیج پر لانے میں شاید مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

ونے: تو تم مجھ سے کہیں زیادہ فراخ دل ہو، میں تو یہ بات کسی حالت میں بھی پسند نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمھیں صوفیہ آج کل کچھ اداس سی معلوم ہوتی ہے؟ کل اس نے مجھ سے جو باتیں کیں وہ بہت مایوس کن تھیں۔ اس کو اندیشہ ہے کہ اسی کے سبب ریاست کا یہ حشر ہوا ہے۔ ماتا جی تو اس پر جان دیتی ہیں مگر وہ ان سے دور بھاگتی ہے۔ پھر وہی روحانی باتیں کرتی ہے جس کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تمھارے پیروں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی۔ میرے لیے صرف تمھاری محبت کی نظر کافی ہے۔ اور خدا جانے کیا کیا بک جاتی ہے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ گھنٹہ بھر بھی اسے نہ دیکھوں تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔

اتنے ہی میں موٹر کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ بعد اندو وہاں آ پہنچی۔

اندردت: آیئے اندو رانی آیئے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔

اندو: جھوٹے ہو۔ میری اس وقت ذرا بھی چرچا نہ تھی روپے کے تردد میں مبتلا ہو۔

اندروت: تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ لائی ہیں۔ لایئے واقعی ہم لوگ بہت متردد ہیں۔

اندو: مجھ سے مانگتے ہو؟ میرا حال جان کر بھی۔ ایک بار چندہ دے کر ہمیشہ کے لیے سیکھ گئی۔ (ونے سے) صوفیہ کہاں ہے؟ ماتا جی تو اب راضی ہیں نا؟

ونے: کسی کے دل کی بات کوئی کیا جانے؟

اندو: میں تو سمجھتی ہوں کہ ماتا جی بھی راضی ہو جائیں تو بھی تم صوفیہ کو نہ پا سکو گے۔ تمھیں ان باتوں سے رنج تو ضرور ہوگا مگر کسی صدمہ کے لیے پیشتر سے تیار رہنا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اسے ناگہانی طریقہ پر برداشت کرنا پڑے۔

ونے نے آنسو پی کر کہا۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اندو: صوفیہ کل مجھ سے ملنے گئی تھی اس کی باتوں نے اسے بھی رلایا اور مجھے بھی۔ وہ بڑی کشمکش میں پڑی ہوئی ہے نہ تمھیں مایوس کر چاہتی ہے اور نہ ماتا جی کو ناخوش کرنا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیوں اسے اب بھی شک ہے کہ ماتا جی اسے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف اس کا خیال ہے وہ خود اپنے دلی راز کو نہیں سمجھتی، وہ عورت نہیں ہے ایک خیالی وجود ہے۔ جذبات اور حسیات سے معمور تم اس سے لطف اندوز ہوسکتے ہو مگر اسے عملاً محسوس نہیں کر سکتے۔ اسے مجسم نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر اپنے عمیق ترین جذبات کو ادا نہیں کر سکتا زبان میں اتنی سکت ہی نہیں ہے۔ صوفیہ بھی وہی عمیق ترین جذبہ ہے۔

اندردت: اور آپ کی یہ ساری باتیں بھی شاعرانہ ہیں۔ صوفیہ نہ شاعرانہ خیال ہے نہ کوئی مخفی راز۔ وہ نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ نہ حور ہے نہ پری۔ جیسی اور عورتیں ہوتی ہیں ویسی ہی ایک عورت وہ بھی ہے۔ وہی اس کے جذبات ہیں اور وہی اس کے خیالات۔ آپ لوگوں نے کبھی شادی کی کوئی تیاری کی۔ کوئی بھی ایسی بات کی جس سے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ یہ شادی کر دینا چاہتے ہیں؟ تو جب آپ لوگ خود ہی بے غرض بنے ہوئے ہیں تو اسے کیا غرض ہے کہ خواہ مخواہ شادی کا تذکرہ کرتی پھرے۔ میں تو اکھڑ آدمی ہوں اسے ونے سے لاکھ محبت ہو، مگر وہ اپنے منہ سے تو شادی کی بات نہ کہے گی۔ آپ لوگ وہی چاہتے ہیں جو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔اس لیے اس نے بھی حیاداری کی راہ سے یہ تدبیر نکالی ہے۔ آپ لوگ تیاریاں کیجیے پھر اس کی طرف سے اعتراض ہو تو البتہ اس سے شکایت ہو سکتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ آپ لوگ خود ہی پس وپیش کر رہے ہیں تو وہ بھی ان دلیلوں سے اپنی عزت قائم رکھنا چاہتی ہے۔

اندو: ایسا کہیں بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ وہ اس مکان میں بھی نہ رہے گی۔

اتنے میں صوفیہ اس خط کو لیے ہوئے آتی نظر پڑی جو اس نے پربھوسیوک کو لکھا تھا۔ اندو نے بات پلٹ دی اور کہا تم لوگوں کو تو ابھی خبر نہ ہوگی اور مسٹر سیوک کو پانڈے پور مل گیا۔

صوفیہ نے اندو سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔ پاپا اس گاؤں کو لے کر کیا کریں گے؟

اندو: ابھی تمھیں معلوم ہی نہیں؟ وہ محلّہ کھدوا کر پھینک دیا جائے گا۔ اور وہاں مل کے مزدوروں کے لیے مکانات بنائے جائیں گے۔

اندردت: راجہ صاحب نے منظور کر لیا؟ اتنی جلدی بھول گئے۔ اب کے شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اندو: سرکار کا حکم تھا کیسے نہ منظور کرتے؟

اندردت: صاحب نے بڑی دوڑ لگائی سرکار پر بھی منتر چلادیا۔

اندو: کیوں اتنی بڑی ریاست پر سرکار کا قبضہ نہیں کرادیا؟ ایک باغی راجہ کو مجھول نہیں بنا دیا؟ ایک انقلابی تحریک کی بیخ کنی کر دی؟ سرکار پر اتنے احسانات کر کے اسے یوں ہی جانے دیتے ۔ کاروباری شخص نہ ہوئے کوئی راجہ نواب ہوئے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کمپنی نے پچیس فی صدی نفع دے کر اور کثیرالتعداد ممبرں کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔

ونے: تو راجہ صاحب کو استعفیٰ دے دینا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی ذمہ داری سر پر لینے سے تو یہی بہتر ہوتا۔

اندو: کچھ سوچ سمجھ کر تو منظور کیا ہوگا۔ سنا کہ پانڈے پور کے لوگ اپنے مکانات چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

اندردت: نہ ہونا چاہیے۔

صوفیہ: ذرا چل کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کہیں مجھے پاپا نظر آ گئے تو؟ نہیں میں نہ جاؤں گی۔ تمھیں لوگ جاؤ۔

تینوں آدمی پانڈے پور کو روانہ ہوئے۔

(42)

عدالت نے اگر دونوں لڑکوں کو سخت سزا دی تو عوام نے بھی سورداس کو اس سے کم سخت سزا نہیں دی۔ اس پر ہر طرف سے تھڑی تھڑی ہونے لگی۔ محلہ والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ آس پاس کے گاؤں والے بھی دوچار کھری کھوٹی سنا جاتے تھے۔ مانگتا تو ہے بھیک۔ پر اپنے کو کتنا لگاتا ہے۔ ذرا چار بھلے مانسوں نے منہ لگالیا تو گھمنڈ کے مارے دھرتی پر پاؤں ہی نہیں دھرتا۔ سورداس کو شرم کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ بجرنگی اور جگدھر کا غصہ فرو ہوگیا۔ بجرنگی نے سوچا کہ اب کیا ماروں پیٹوں۔ اس کے منہ میں تو یوں ہی کالکھ لگ گئی۔ جگدھر کی تنہا اتنی ہمت کہاں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ سبھاگی بھیرو کے گھر جانے پر رضا مند ہوگئی۔ اسے معلوم ہوگیا کہ بلا کسی آڑ کے میں ان جھونکوں سے بچ نہیں سکتی۔ سورداس کی آڑ صرف ٹٹی کی آڑ تھی۔

ایک روز سورداس بیٹھا دنیا کی ہٹ دھرمی اور بے انصافی کا دکھڑا رورہا تھا کہ سبھاگی بولی۔ بھیا تمھارے اوپر میرے کارن چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑ رہی ہے بجرنگی اور جگدھر دونو ں مارنے پر اتارو ہیں۔ نہ ہو تو مجھے بھی اب میرے گھر پہنچا دو۔ یہی نہ ہوگا۔ مارے پیٹے گا، کیا کروں گی۔ سہ لوں گی۔ اس بے آبروئی سے تو بچوں گی۔

بھیرو تو پہلے ہی سے منہ پھیلائے ہوئے تھا۔ بہت خوش ہوا، آکر سبھاگی کو بڑے آمد سے لے گیا۔ سبھاگی جا کر بڑھیا کے پیروں پر گر پڑی اور خوب روئی۔ بڑھیا نے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ بے چاری اب آنکھوں سے بھی معذور ہوگئی تھی۔ بھیرو جب کہیں چلا جاتا تو دوکان پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہتا لوگ اندھرے میں لکڑیاں اٹھا لے جاتے تھے۔ کھانا تو خیر کسی طرح پکا لیتی تھی مگر اس لوٹ گھسوٹ کا نقصان نہ سہا جاتا تھا۔ سبھاگ گھر کی دیکھ بھال تو کرے گی۔ رہا بھیرو سو اس کے دل میں اب دغا وفریب کا نام بھی نہ تھا۔ اسے سورداس سے اتنی عقیدت ہوگئی تھی کہ شاید کسی دیوتا سے بھی نہ ہوگی۔ اب وہ اپنی پچھلی باتوں پر پچھتاتا اور کھلے دل سے سورداس کی سراہنا

کرتا تھا۔

اتنے دنوں تک سورداس کو گھر بار کی فکر سے نجات تھی۔ پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں۔ برتن دھل جاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو لگ جاتی تھی۔ اب پھر وہی پرانی مصیبت سر پر سوار ہوئی۔ مٹھوا اب اسٹیشن پر ہی رہتا تھا۔ گھیسو اور ودیادھر کی سزا سے اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے کان پکڑے کہ اب کبھی جوا اور چرس کے قریب نہ جاؤں گا۔ بازار سے چربن لے کر چباتا اور اسٹیشن کے برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔ کون روز تین چار میل چلے؟ ذرا بھی فکر نہ تھی کہ سورداس کی کیسی کٹتی ہے۔ اب میرے ہاتھ پیر ہوئے، کچھ میرا فرض بھی اس کے متعلق ہے یا نہیں۔ آخر کس دن کے لیے اس نے مجھے اپنے لڑکے کی طرح پالا پوسا تھا؟ سورداس کئی مرتبہ خود اسٹیشن پر گیا اور اس سے کہا کہ شام کو گھر چلا آیا کر۔ کیا اب بھی بھیک مانگوں؟ مگر اس کی بلا سنے۔ ایک مرتبہ اس نے صاف کہہ دیا کہ یہاں میرا گزر تو ہوتا ہی نہیں۔ تمھارے لیے کہاں سے لاؤں؟ میرے لیے تم نے کون سی بڑی تپسیا کی تھی؟ ایک ٹکڑا روٹی دیتے تھے۔ کتے کو نہ دیا مجھی کو دیا۔ تم سے میں کہنے گیا تھا کہ مجھے کھلاؤ پلاؤ؟ چھوڑ کیوں نہ دیا؟ کیا جن لڑکوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ سب مر ہی جاتے ہیں؟ جیسے تم ایک ٹکڑا دے دیتے تھے ویسے بہت ٹکڑے مل جاتے۔ ان باتوں سے سورداس اس قدر دل شکستہ ہوگیا کہ پھر اس نے گھر آنے کو نہ کہا۔

ادھر صوفیہ کئی بار سورداس سے مل چکی تھی وہ اور تو کہیں نہ جاتی مگر وقت نکال کر سورداس سے ملنے ضرور جاتی۔ ایسے موقع سے پہنچتی کہ سیوک صاحب سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ وہ جب آتی تو سورداس کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور لاتی۔ اس نے اندردت سے اس کا سارا حال سنا تھا۔ اس کا عدالت میں عوام سے اپیل کرنا، چندہ کے روپے خود نہ لے کر دوسرے کو دے دینا۔ زمین کا معاوضہ جو سرکار سے ملا تھا اسے خیرات کردینا۔ اس وقت سے اس کو سورداس سے اور بھی زیادہ عقیدت ہوگئی تھی۔ جہلاء کا مذہبی شوق اینٹ پتھر کی پرستش سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور شرفاء کا اولیائے کرام کی خدمت سے۔ انھیں ہر مجذوب اگلے جنم کا کوئی رشی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس کی گالیاں سنتے ہیں۔ اس کے جوٹھے برتن دھوتے ہیں یہاں

تک کہ اس کے گرد آلود پیروں کو دھوکر پی جاتے ہیں۔انھیں اس کے قالب میں کوئی مقدس ترین روح بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صوفیہ کو سورداس سے کچھ ایسی ہی عقیدت ہوگئی تھی۔ ایک بار وہ اس کے لیے سنترے اور سیب لے گئی۔ سورداس گھر لایا مگر اس نے خود نہ کھایا۔ مٹھوا کی یاد آئی وہ اس کی بدکلامی کو بھول گیا۔ سویرے پھلوں کو لے کر اسٹیشن گیا اور اسے دے آیا۔ ایک بار صوفیہ کے ساتھ اندو بھی آئی تھی۔ سردی کے دن تھے سورداس کھڑا کانپ رہا تھا۔ اندو نے وہ کمبل جسے وہ اپنے پیروں پرڈالے ہوئے تھی سورداس کو دے دیا۔ سورداس کو وہ کمبل ایسا اچھا معلوم ہوا کہ اسے خود نہ اوڑھ سکا۔ میں بوڑھا بھکاری یہ کمبل اوڑھ کر کہاں جاؤں گا؟ کون بھیک دے گا؟ رات کو زمین پر پڑوں۔ دن بھر سڑک کے کنارے کھڑا رہوں۔ مجھے یہ کمبل لے کر کیا کرنا ہے۔ جا کر مٹھوا کودے آیا۔ ادھر تو اب بھی اتنی محبت تھی۔ ادھر مٹھوا اتنا خود غرض تھا کہ کھانے کو بھی نہ پوچھتا۔ سورداس سمجھتا کہ لڑکا ہے یہی اس کے کھانے پہنے کے دن ہیں۔ میری خبر نہیں لیتا نہ سہی خود تو آرام سے کھاتا پہنتا ہے۔ اپنا ہے تو کبھی تو کام آئے گا۔

پھاگن کا مہینہ تھا اور شام کا وقت ایک عورت گھاس بیچ کر جا رہی تھی مزدوروں نے ابھی ابھی کام سے فراغت پائی تھی۔ دن بھر چپ چاپ چرخیوں کے سامنے کھڑے اکتا گئے تھے تفریح کے لیے بے قرار تھے۔ گھسیاری کو دیکھتے ہی اس پر گندی کبیروں کی بوچھار شروع کر دی۔ سورداس کو یہ بات بری لگی بولا۔ یاروکیوں اپنی جبان کھراب کرتے ہو؟ وہ بچاری تو اپنی راہ چلی جاتی ہے۔ اور تم لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ وہ بھی تو کسی کی بہو بیٹی ہوگی۔

ایک مزدور نے کہا۔ بھیک مانگو بھیک۔ جو تمھارے کرم میں بدا ہے۔ ہم گاتے ہیں تو تمھاری نانی کیوں مرتی ہے؟

سورداس: گانے کو تھوڑے ہی کوئی منع کرتا ہے۔

مزدور: تو ہم کیا لاٹھی چلاتے ہیں؟

سورداس: تو اس عورت کو چھیڑتے کیوں ہو؟

مزدور: تو تمھیں کیوں برا لگتا ہے؟ تمھاری بہن ہے کہ بیٹی؟

سورداس: بیٹی بھی ہے۔ بہن بھی ہے۔ ہماری ہوئی تو، کسی دوسرے بھائی کی ہوئی تو۔

اس کے منہ سے جملہ کا آخری لفظ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک مزدور نے چپکے سے جا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ بیچارہ بے خبر کھڑا تھا۔ اتنی زور سے منہ کے بل گرا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ منہ میں بڑی چوٹ آئی۔ ہونٹ کٹ گئے۔ غشی سی آگئی پندرہ بیس منٹ تک وہیں بے ہوش پڑا رہا۔ کوئی مزدور پاس بھی نہ آیا۔ سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اتفاقاً نایک رام اسی وقت شہر سے آرہے تھے۔ سورداس کو سڑک پر پڑا دیکھا تو چکرائے کہ ماجرا کیا ہے۔ کسی نے مارا پیٹا تو نہیں؟ بجرنگی کے سوا اور کس میں اتنا دم ہے۔ برا کیا۔ کتنا ہی ہو اپنے ایمان کا سچا ہے۔ انھیں رحم آگیا قریب جا کر ہلایا تو سورداس کو ہوش آیا۔ اس نے اٹھ کر نایک رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا۔

نایک رام نے پوچھا۔ کسی نے مارا ہے کیا سور؟ منہ سے لہو بہہ رہا ہے۔

سورداس: نہیں بھیا ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔

نایک رام: چھپاؤ مت بجرنگی یا جگدھر نے ما؛ ہو تو بتا دو۔ دونوں کو سال سال بھر کے لیے بھجوا نہ دوں تو براہمن نہیں۔

سورداس: نہیں بھیا کسی نے نہیں مارا؟ جھوٹ کیسے لگادوں؟

نایک رام: مل والوں میں سے تو کسی نے نہیں مارا؟ یہ سب بہت راہ چلتے آدمیوں کو چھیڑا کرتے ہیں۔ کہتا ہوں لٹوادوں گا۔ ان جھونپڑوں میں آگ نہ لگا دوں تو کہنا۔ بتاؤ کس نے یہ کام کیا۔ تم تو آج تک کبھی ٹھوکر کھا کر نہیں گرے۔ ساری دیہہ لہو میں لت پت ہوگئی ہے۔

سورداس نے کسی کا نام نہ بتلایا۔ جانتا تھا کہ نایک رام غصہ میں آجائے گا۔ تو مرنے مارنے کو نہ ڈولے گا۔ گھر پہنچا تو سارا محلہ دوڑ پڑا ہائے ہائے کس مدعی نے بیچارے اندھے کو مارا؟ دیکھو تو منہ کتنا سوج گیا ہے۔ لوگوں نے سورداس کو بستر پر لٹا دیا۔ بھیرو دوڑا۔ بجرنگی نے آگ جلائی۔ افیون اور تیل کی مالش ہونے لگی سبھی کے دل اس کی طرف سے نرم پڑ گئے تنہا جگدھر خوش تھَ۔ جمنی سے بولا۔ بھگوان نے ہمارا بدلا لیا ہے۔ ہم صبر کر گئے پر بھگوان تو نیائے کرنے والے ہیں۔

جمنی چڑھ کر بولی چپ بھی رہو۔ آئے ہو بڑے نیائی کی پونچھ بن کے۔ بپت میں بیری پر بھی نہیں ہنسنا چاہیے۔ وہ ہمار بیری نہیں ہے۔ سچی بات کے پیچھے جان دے دے گا۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا۔ آج ہم میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو دیکھو کہ رات کی رات بیٹھا رہتا ہے کہ نہیں۔ ایسے آدمی سے کیا بیر۔

جگدھر شرمندہ ہوگیا۔

پندرہ روز تک سورداس گھر سے نکلنے کے قابل نہ ہوا۔ کئی دن تک منہ سے خون آتا رہا۔ سبھاگی دن بھر اس کے پاس بیٹھی رہتی اوربھیرو رات کو اس کے پاس سوتا۔ جمنی بڑے سویرے گرم دودھ لے کر آتی اور اسے اپنے ہاتھوں سے پلا جاتی۔ بجرنگی بازار سے دوائیں لاتا ہاں اگر کوئی اسے دیکھنے نہ آیا تو وہ مٹھوا تھا۔ اس کے پاس تین مرتبہ آدمی گیا مگر اس کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ تیمارداری کے لیے نہیں تو کم از کم اس کی خیروعافیت کا حال ہی دریافت کرنے کے لیے آتا۔ ڈرتا تھا کہ جاؤں گا تو لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔ اسے اب روپے کا چسکا لگ گیا تھا۔ سورداس کے منہ سے بھی اتنا نکل ہی گیا۔ دنیا اپنے مطلب کی ہے۔ باپ ننھا سا چھوڑ کر مر گیا تو اپنے لڑکے کی طرح پروستی کی۔ آپ لڑکوری کی طرح بن گیا۔ اس کی نیند سوتا تھا اس کی نیند جاگتا تھا۔ آج چار پیسے کمانے لگا تو بات نہیں پوچھتا۔ کھیر ہمارے بھی بھگوان ہیں۔ جہاں رہے سکھی رہے۔ اس کی قسمت اس کے ساتھ میری نیت میرے ساتھ اسے میری کلک نہ ہو۔ مجھے تو اس کی کلک ہے، میں کیسے بھول جاؤں؟ میں نے لڑکے کی طرح اسے پالا ہے۔

ادھر تو سورداس بستر علالت پر پڑا ہوا تھا ادھر پانڈے پور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ایک روز علی الصباح راجہ مہیندر کمار۔ مسٹر جان سیوک افسر تخمینہ پولیس کے چند سپاہی اورایک داروغہ پانڈے پور آپہنچے راجہ صاحب نے محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ سرکار کو ایک خاص سرکاری کام کے لیے اس محلہ کی ضرورت ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر یہ زمین حاصل کر لی جائے۔ لاٹ صاحب کا حکم آگیا ہے۔ افسر تخمینہ صاحب اسی کام کے لیے تعینات کیے گئے ہیں۔ کل سے ان کا اجلاس یہیں ہوا کرے گا۔ وہی سب مکانوں کی قیمت کا تخمینہ کریں گے اور

اسی کے مطابق تم لوگوں کو معاوضہ مل جائے گا۔ تمھیں جو کچھ عرض معروض کرنا ہو انھیں سے کرنا۔ آج سے تین ماہ کے اندر تمھیں اپنے مکان خالی کر دینے پڑیں گے۔ معاوضہ بعد کو ملتا رہے گا۔ جو شخص اتنے دنوں کے اندر مکان خالی نہ کرے گا اس کے معاوضہ کے روپے ضبط کر لیے جاویں گے۔ اور وہ جبراً گھر سے نکال دیا جاوے گا۔ اگر کوئی روک ٹوک کرے گا تو پولیس اس کا چالان کر دے گی۔ اسے سزا ہوگی۔ سرکار تم لوگوں کو بلا وجہ تکلیف نہیں دے رہی ہے۔ اس کو اس زمین کی سخت ضرورت ہے۔ میں صرف سرکاری حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

گاؤں والوں کو پہلے ہی سے اس کی کچھ خبر مل چکی تھی۔ لیکن اس خیال سے دل کو تسکین دے رہے تھے کہ کون جانے خبر ٹھیک ہے یا نہیں۔ جیوں جیوں دیر ہوتی تھی ان کی کاہل الوجود طبیعتیں بے فکر ہو جاتی ہیں۔ کسی کو امید تھی کہ حکام سے کہہ سن کر اپنا گھر بچالوں گا۔ کوئی کچھ دے دلا کر اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا تھا۔ کوئی عذر داری کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھا۔ کوئی یہ سوچ کر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ پہلے سے کیوں اپنی جان ہلکان کریں جب سر پر پڑے گی دیکھی جائے گی۔ اس پر بھی آج جب لوگوں نے یکا یک یہ حکم سنا تو گویا ان پر بجلی سی گر پڑی سب کے سب دست بستہ راجہ صاحب کے سامنے کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے۔ سرکار یہاں رہتے ہماری پیڑھیاں بیت گئیں ۔ اب سرکار ہم کو نکال دے گی تو کہاں جائیں گے؟ سرکار جیسے ہمیں نکالتی ہے ویسے کہیں کوئی ٹھکانہ بھی بتا دے۔

راجہ صاحب بولے۔ مجھے خود اس بات کا سخت افسوس ہے اور میں نے تمھاری طرف سے سرکار کی خدمت میں عذر بھی کیا تھا مگر سرکار کہتی ہے کہ اس زمین کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تمھارے ساتھ سچی ہمدردی ہے مگر مجبور ہوں۔ کچھ کر نہیں سکتا، سرکار کا حکم ہے، ماننا ہی پڑے گا۔

اس کا جواب دینے کی کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو کہنیوں سے دھکے دیتے تھے کہ آگے بڑھ کر پوچھو۔ معاوضہ کس حساب سے ملے گا مگر کسی کے قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ نایک رام یوں تو بہت ہی چلتے ہوئے آدمی تھے مگر اس موقع پر وہ بھی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ راجہ صاحب سے کچھ کہنا سننا

فضول سمجھ کر افسر تخمینہ سے تخمینہ کی شرح میں کچھ بیشی کرا لینے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ کچھ دے دلا کر ان سے کام نکالنا زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا۔اس مصیبت میں سبوں کو سورداس کی یاد آتی تھی وہ ہوتا تو ضرور ہماری طرف سے کچھ کہتا سنتا۔ اتنا گردہ اور کسی کا نہیں ہوسکتا۔ کئی آدمی دوڑے ہوئے سورداس کے پاس گئے۔ اور اس سے یہ سارا حال کہا۔

سورداس نے کہا۔ اور سب لوگ تو موجود ہیں میں چل کر کیا کر لوں گا۔ نایک رام کیوں سامنے نہیں آتے؟ یوں تو بہت گرجتے ہیں۔ اب کیو ں منہ نہیں کھلتا؟ محلّہ ہی میں رعب دکھانے کو ہیں؟

ٹھاکر دین: سب کی دیکھ لی گئی۔ سب کے منہ میں دہی جما ہوا ہے۔ حاکموں سے بولنے کو ہمت چاہیے۔ اکل چاہیے۔

شیو سیوک بنیا نے کہا۔ میرے تو ان کے سامنے کھڑے ہوتے پیر تھر تھر کانپتے ہیں۔ نہ جانے کوئی کیسے حاکموں سے بات کرتا ہے؟ مجھے تو جرا ڈانٹ دیں تو دم ہی نکل جائے۔

جھینگر تیلی بولا۔ حاکموں کا بڑا رعب ہوتا ہے ان کے سامنے تو اکل ہی حفت ہو جاتی ہے۔

سورداس: مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جاتا، چلنا بھی چاہوں تو کیسے چلوں؟

سورداس یوں لاٹھی کے سہارے گھر سے باہر آنے جانے لگا تھا۔ پر اس وقت یکایک اسے کچھ مان کرنے کی خواہش ہوئی کہنے سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا۔

ٹھاکر دین: یہ کون کٹھن کام ہے ہم لوگ تمھیں اٹھالے چلیں گے۔

سورداس: بھائی سب لوگ کروگے اپنے اپنے من ہی کی۔ مجھے کیوں نکو بناتے ہو؟ جو سب کی گت ہوگی وہی میری بھی ہوگی۔ بھگوان کی جو مرجی ہے وہ ہوگی۔

ٹھاکر دین نے بہت منت کی پر سورداس جانے کو راضی نہ ہوا۔ ٹھاکردین کو بھی غصہ آگیا۔ بے لاگ بات کہتے تھے بولے جبھی بات ہے مت جاؤ۔کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاں مرگا نہ ہوگا وہاں سیرا ہی نہ ہوگا؟ چار آدمی سراہنے لگے۔ تو اب مجاج ہی

نہیں ملتے۔ سچ کہا ہے۔ کوّا دھونے سے بگلا نہیں ہوتا۔

آٹھ بجتے بجتے حاکم لوگ رخصت ہوگئے اب لوگ نایک رام کے گھر آکر پنچایت کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔

جمنی: تم لوگ یوں ہی بکواس کرتے رہوگے اور کسی کا کیا کچھ نہ ہوگا سورداس کے پاس جا کر کیوں نہیں صلاح کرتے؟ دیکھوں کیا کہتا ہے؟

بجرنگی: تو جاتی کیوں نہیں۔ مجھی کو ایسی کیا گرج پڑی ہوئی ہے؟

جمنی: تو پھر چل کر اپنے اپنے گھر بیٹھو۔ بکواس سے کیا ہونا ہے؟

بھیرو: بجرنگی یہ ہیکڑی دکھانے کا اوسر نہیں ہے۔ سورداس کے پاس سب مل کر چلو وہ کوئی نہ کوئی راہ جرور نکالے گا۔

ٹھاکر دین: میں تو اب کبھی اس کے دوار پر نہ جاؤں گا۔ اتنا کہہ سن کر ہار گیا پر نہ اٹھا۔ اپنے کو کچھ لگانے لگا ہے۔

جگدھر: سورداس کیا کوئی دیوتا ہے؟ حاکم کا حکم پلٹ دے گا۔

ٹھاکر دین: میں تو گود میں اٹھا لانے کو تیار تھا۔

بجرنگی: سیکھی ہے سیکھی اور کوئی کیوں نہیں آئے۔ گیا کیوں نہیں حاکموں کے سامنے؟ ایسا مرتھوڑے ہی رہا ہے۔

جمنی: کیسے جاتا؟ وہ تو حاکموں سے بُرا بنے۔ یہاں تم لوگ اپنے اپنے من کی کرنے لگو تو اس کی بھد ہو۔

بھیرو: ٹھیک تو کہتی ہو۔ مدعی ست تو گواہ چست ہوگا؟ پہلے چل کر پوچھو اس کی صلاح کیا ہے؟ اگر ماننے لایک ہو تو مانو نہ ماننے لایک ہو تو نہ مانو۔ ہاں ایک بات جو طے ہو جائے اس پر ٹکنکا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ کہا تو کچھ اور۔ اور پیچھے سے نکل بھاگے۔ سردار تو بھرم میں پڑا رہے کہ آدمی پیچھے ہیں اور آدمی اپنے اپنے گھر کی راہ لیں۔

بجرنگی: چلو پنڈا جی۔ پوچھ ہی دیکھیں۔

نایک رام: وہ کہے گا کہ بڑے صاحب کے پاس چلو، وہاں سنائی نہ ہو تو پراگ راج لاٹ صاحب کے پاس چلو۔ ہے اتنا بوتہ؟

جگدھر: بھیا کی بات مہراج۔ یہاں تو کسی کا منہ نہیں کھلا لاٹ صاحب کے پاس کون جاتا ہے؟

جمنی: ایک بار چلے کیوں نہیں جاتے؟ دیکھو تو کیا صلاح دیتا ہے۔

نایک رام: میں تیار ہوں چلو۔

جگدھر: تو کیا ہمیں کو بڑی گرج پڑی ہے؟

بجرنگی: جو سب کی گت ہوگی وہی ہماری بھی ہوگی۔

گھنٹہ بھر تک پنچایت ہوئی پر سورداس کے پاس تک کوئی نہ گیا۔ ساجھے کی سوئی ٹھیلے پر لدتی ہے۔ تو چل میں آتا ہوں بس یہی ہوتا رہا، لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ شام کے وقت بھیرو سورداس کے پاس گیا سورداس نے پوچھا آج کیا ہوا؟

بھیرو: ہوا کیا گھنٹہ بھر تک بکواس ہوئی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

سورداس: کچھ طے نہ ہوا کہ کیا کیا جائے۔

بھیرو: نکالے جائیں گے۔ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کیوں سورداس کوئی نہ سنے گا؟

سورداس: سننے والا بھی تو وہی ہے جو نکالنے والا ہے تیسرا ہوتا تب نہ سنتا۔

بھیرو: میری مرن ہے۔ ہجاروں من لکڑی ہے کہاں ڈھو کر لے جاؤں گا؟ کہاں اتنی دھرتی ملے گی کہ پھر ٹال لگاؤں گا؟

سورداس: سبھی کی مرن ہے۔ بجرنگی ہی کو اتنی دھرتی کہاں ملی جاتی ہے کہ پندرہ بیس جانور ہیں۔ اورآپ بھی رہے؟ ملے گی بھی تو اتنا کرایہ دینا پڑے گا کہ دیوالہ نکل جائے گا۔ دیکھو مٹھوا آج بھی نہیں آیا مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو چھن بھر بھی نہ رکوں۔ کتے کی طرح دوڑوں۔ چاہے وہ میری بات بھی نہ پوچھے۔ جن کے لیے اپنی جندگانی کھراب کی کہ وہ بھی گاڑھے سمے پر منہ پھیر لیتے ہیں۔

بھیرو: اچھا تم تو بتاؤ کہ تم کیا کروگے؟ تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟

سورداس: میری کیا پوچھتے ہو؟ جمین تھی وہ نکل گئی۔ جھونپڑی کے بہت ملیں گے تو دو چار روپے مل جائیں گے۔ ملے تو کیا اور نہ ملے تو کیا جب تک کوئی نہ بولے گا پڑا رہوں گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر نکال دے گا تو باہر جا بیٹھوں گا۔ وہاں سے اٹھا دے گا پھر آبیٹھوں گا۔ جہاں جنم لیا ہے وہیں مروں گا۔ اپنا جھونپڑا جیتے جی نہ چھوڑا جائے گا۔

مرنے پر جو چاہے لے لے۔ باپ دادوں کی جمین کھودی اب اتنی نسانی رہ گئی ہے۔ اسے نہ چھوڑوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی مرجاؤں گا۔

بھیرو: سور اتنا دم تو یہاں کسی میں نہیں ہے۔

سورداس: اسی سے تو میں نے کسی سے کچھ کہا ہی نہیں۔ بھلا سوچو کتنا اندھیر ہے کہ ہم جو ستر پستوں سے یہاں آباد ہیں وہ تو نکال دیے جائیں۔ اور دوسرے یہاں آکر بس جائیں۔ یہ ہمارا گھر ہے کسی کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔ جبرجستی سے جو چاہے نکال دے۔ نیاے سے نہیں نکاسکتا۔ تمھارے ہاتھ میں بل ہے۔ تم ہمیں مار سکتے ہو۔ ہمارے ہاتھ میں بل ہوتا تو ہم بھی تمھیں مارتے۔ سرکار کے ہاتھ میں مارنے کا بل ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اور کوئی بل نہیں ہے تو مر جانے کا تو بل ہے۔

بھیرو نے جاکراور لوگوں سے یہ باتیں کہیں۔ جگدھر نے کہا۔ دیکھو یہ صلاح ہے۔ گھر تو جائے ہی گا۔ جان بھی جائے گی۔

ٹھاکر دین بولے: یہ سور ہی کا کیا ہوگا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ مر ہی جائے گا تو کیا۔ یہاں مر جائیں تو بال بچوں کو کس کے سر پر چھوڑیں؟

بجرنگی: مرنے کے لیے کلیجہ چاہیے جب ہم ہی مر گئے تو گھر لے کے کیا ہوگا۔

نایک رام: ایسے بہت مرنے والے دیکھے ہیں۔ گھر میں سے تو نکلا نہیں گیا۔ مرنے چلے ہیں۔

بھیرو: اس کی نہ چلاؤ پنڈا جی من میں آنے کی بات ہے۔

دوسرے دن افسر تخمینہ نے مل کر ایک کمرہ میں اجلاس کرنا شروع کیا ایک منشی محلّہ کے لوگوں کے نام، مکانات کی حیثیت، پختہ ہیں یا خام، پرانے ہیں یا نئے، لمبائی چوڑائی وغیرہ کی ایک فہرست تیار کرنے لگا۔ پٹواری اورمنشی گھر گھر گھومنے لگے۔ ان کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔ اس وقت سبھی لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ اس تثلیث کے ہاتھوں میں تھا۔ نایک رام کی بن آئی دلالی کرنے لگے۔ لوگوں سے کہتے کہ نکلنا تو پڑے ہی گا۔ اگر کچھ غم کھانے سے معاوضہ بڑھ جائے تو حرج ہی کیا۔ بیٹھے بٹھائے مٹھی گرم ہوتی تھی تو کیوں چھوڑتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مکانوں کی حیثیت کا انحصار اس چڑھاوے پر تھا جو اس تثلیث پر چڑھا یا جاتا تھا۔ نایک رام ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلتے

تھے۔ نام بھی کماتے تھے اور دولت بھی۔ بھیرو کا بڑا مکان اور سامنے کا بڑا میدان دونوں سمٹ گئے۔ ان کا رقبہ گھٹ گیا۔ تثلیث کی وہاں کچھ پوچھا نہ ہوئی۔ جگدھر کا چھوٹا سا مکان بڑا ہوگیا۔ تثلیث نے اس کی پوجا سے خوش ہو کر طنابیں ڈھیلی کر دیں۔ رقبہ بڑھ گیا۔ ٹھاکردین نے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی بہ نسبت شیوجی کو خوش کرنا زیادہ آسان سمجھا۔ وہاں ایک لوٹا پانی کے سوا کوئی اور خرچ نہ تھا۔ دونوں وقت پانی دینے لگے۔ مگر اس وقت تثلیث کا دور دورہ تھا۔ شیوجی کی ایک نہ چلی۔ تثلیث نے ان کے مختصر مگر پختہ مکان کو خام قرار دے دیا۔ بجرنگی دیوتاؤں کو خوش کرنا کیا جانے، انھیں ناراض ہی کر چکا تھا۔ مگر جمنی نے اپنی دانشمندی سے بگڑتا ہوا کام بنا لیا۔ منشی جی اس کی ایک بچھیا پر ریجھ گئے۔ اس پر دانت لگائے۔ بجرنگی اپنے مویشیوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تنک گیا۔ نایک رام نے کہا بجرنگی پچھتاؤگے۔ بجرنگی نے کہا کہ چاہے ایک کوڑی بھی معاوضہ نہ ملے پر بچھیا نہ دوں گا۔ آخر جمنی نے جو سودا کرنے میں بڑی ہوشیار تھی اسے تنہائی میں لے جا کر سمجھایا کہ اتنے جانوروں کے رہنے کا کہیں ٹھکانا بھی ہے؟ کہاں لیے لیے پھروگے؟ ایک بچھیا کے دینے سے سو روپے کا کام نکلتا ہے تو کیوں نہیں نکالتے؟ ایسی نہ جانے کتنی بچھیاں پیدا ہوں گی۔ دے کر سر سے بلا ٹالو۔ اس کے سمجھانے سے آخر بجرنگی بھی راضی ہوگیا۔

پندرہ روز تک تثلیث کی حکومت رہی۔ افسر تخمینہ صاحب بارہ بجے گھر سے تشریف لاتے۔ اپنے کمرہ میں دو چار سگار پھونکتے۔ اخبارات ملاحظہ فرماتے اور ایک دو بجے تک مکان واپس آجاتے جب نقشہ مرتب ہوگیا تو افسر صاحب اس کی جانچ کرنے لگے۔ باشنداگان دیہہ کو پھر طلب کیا گیا۔ تو افسر نے سب کے تخمینے پڑھ پڑھ کر سنائے۔ ایک سرے سے دھاندلی تھی۔ بھیرو نے کہا۔ ہجور چل کر ہمارا گھر دیکھ لیں وہ بڑا ہے کہ جگدھر کا ان کو تو ملیں چار سو اور مجھے ملیں تین سو اس حساب سے مجھے چھ سو ملنا چاہیے۔

ٹھاکر دین: بگڑے دل تھا ہی ان سے صاف صاف کہہ دیا صاحب تخمینہ کسی حساب سے تھوڑے ہی بنایا گیا ہے جس نے منہ میٹھا کر دیا اس کی چاندی ہوگئی جو بھگوان کے بھروسے بیٹھا رہا اس کی بدھیا بیٹھ گئی۔ اب بھی آپ موکے پر چل کر جانچ نہیں کرتے

کہ ٹھیک تخمینہ ہو جائے۔ گریبوں کے گلے ریت رہے ہیں۔

افسر نے بگڑ کر کہا۔ تمھارے گاؤں کا مکھیا تو تمھاری طرف سے رکھ لیا گیا تھا۔ اس کی صلاح سے تخمینہ کیا گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

ٹھاکر دین: اپنے کہلانے والے ہی تو اور لوٹتے ہیں۔

افسر: اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

سورداس کی جھونپڑی کا معاوضہ ایک روپیہ رکھا گیا تھا اور نایک رام کے گھر کے پورے تین ہزار! لوگوں نے کہا۔ یہ ہے گاؤں گھر والوں کا حال، یہ ہمارے سگے ہیں۔ بھائی کا گلا کاٹتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ یہ کہ ہمیں دھن کا لالچ نہیں۔ آخر ہے تو جات کا پنڈا ہی نہ۔ جاتریوں کو ٹھگنے والا۔ جبھی تو یہ حال ہے۔ جرا سا اکھتیار پا کے آنکھیں پھر گئیں۔ کہیں تھانہ دار ہوتے تو کسی کو گھر میں ہی نہ رہنے دیتے۔ اسی سے کہا گیا ہے کہ پرمیسر گنجے کو ناکھون نہ دے۔

مسٹر کلارک کے بعد مسٹر سینا پتی حاکم ضلع ہوئے تھے۔ سرکار کا روپیہ خرچ کرتے کانپتے تھے۔ پیسے کی جگہ دھیلے سے کام نکالتے تھے۔ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں بدنام نہ ہو جاؤں۔ ان میں وہ خود اعتباری نہ تھی جو انگریز افسروں میں ہوا کرتی ہے۔ انگریزوں پر جانبداری کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے خوف اور آزاد ہوتے ہیں۔ مسٹر سیناپتی کو شک ہوا کہ معاوضے بڑی نرمی سے لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے ان کا نصف ہی دینا کافی خیال کیا۔ اب یہ مسل صوبہ کی سرکار کے پاس منظوری کے لیے بھیجی گئی۔ وہاں پھر اس کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ اس طرح تین مہینے کی مدت گزر گئی تو مسٹر جان سیوک، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور داروغہ ماہر علی اور مزدوروں کو ساتھ لے کر محلّہ کو خالی کرانے کے لیے آدھمکے۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو ہم کو روپیہ ہی نہیں ملے۔ جان سیوک نے جواب دیا۔ ہمیں تمھارے روپوں سے کوئی مطلب نہیں۔ روپے جس سے ملیں اس سے لو ہمیں تو سرکار نے یکم مئی کو محلّہ گرا پانے کی منظوری دے دی ہے اور اگر کوئی کہہ دے کہ آج مئی کی پہلی تاریخ نہیں ہے تو ہم لوٹ جائیں گے۔ اب لوگوں میں بڑی ہل چل مچی۔ سرکار کی کیا نیت ہے، کیا معاوضہ ملے بغیر ہی ہمیں نکال دیا جائے گا۔ گھر کا گھر جائے اور معاوضہ بھی نہ ملے۔ یہ تو بے موت مرے۔ روپے

مل جاتے تو کہیں زمین لے کر مکان بنواتے، خالی ہاتھ کہاں جائیں؟ کیا گھر میں خزانہ رکھا ہوا ہے؟ ایک تو روپیہ کے چار آنے ملنے کا حکم ہوا۔ اس کا بھی یہ حال۔ نہ جانے سرکار کی نیت بدل گئی کہ درمیانی لوگ ہضم کئے جاتے ہیں۔

ماہر علی نے کہا۔ تم لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا ہو وہ حاکم ضلع سے جا کر کہو سنو۔ مکان آج خالی کرالیے جائیں گے۔

بجرنگی: مکان کیسے کھالی ہوں گے۔ کوئی راہجنی ہے؟ جس حاکم کا یہ حکم ہوا ہے اسی حاکم کا تو وہ بھی حکم ہے۔

ماہر علی: کہتا ہوں۔ سیدھے سے اپنے بورئے بقچے لادو اور چلتے پھرئے نظر آؤ۔ ناحق ہمیں غصہ کیوں دلاتے ہو؟ کہیں مسٹر ہنٹر کو جوش آگیا تو پھر تمھاری خیریت نہیں۔

نایک رام: داروغہ جی دوچار دن کی مہلت دے دیجیے۔ روپے تو ملیں گے ہی۔ یہ بیچارے کیا برا کہتے ہیں کہ بنا روپے سے کہاں بھٹکتے پھریں۔

مسٹر جان سیوک تو سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لے کر مل کی سیر کرنے چلے گئے تھے۔ وہاں چائے پانی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ماہر علی کی حکومت تھی۔ بولے۔ پنڈا جی ایسے چھمے دوسروں کو دینا۔ یہاں تمھیں بہت دنوں سے دیکھ رہے ہیں اور تمھاری رگ رگ پہچانتے ہیں۔ مکان آج اور آج ہی خالی ہوں گے۔

دفعتاً ایک طرف سے دو بچے کھیلتے ہوئے آگئے۔ دونوں ننگے پاؤ تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے مگر بشاش۔ ماہر علی کو دیکھتے ہی چچا چچا کہتے ہوئے ان کی طرف دوڑے۔ یہ دونوں صابر اور نسیمہ تھے۔ کلثوم نے اسی محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لیا تھا۔ گودام کا مکان جان سیوک نے خالی کرالیا تھا۔ بچاری اسی چھوٹے سے گھر میں پڑی ہوئی اپنی مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی۔ ماہر نے دونوں بچوں کو دیکھا تو کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں کیا کرنے آئے؟ دل میں بہت شرمائے کہ اب لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ ان کے بھتیجے ہیں اور اتنے پھٹے حالوں۔ یہ ان کی خبر بھی نہ لیتے۔

نایک رام نے دونوں بچوں کو دو دو پیسے دے کر کہا۔ جاؤ مٹھائی کھانا یہ تمھارے چچا نہیں ہیں۔

نسیمہ: ہوں۔ چچا تو ہیں۔ کیا میں پہچانتی نہیں؟

نایک رام: چچا ہوتے تو تجھے گود میں اٹھا لیتے۔ مٹھائیاں نہ منگادیتے۔ تو بھول رہی ہے۔

ماہر علی نے بگڑ کر کہا۔ پنڈا جی۔تمھیں ان فضول باتوں سے کیا مطلب؟ میرے بھتیجے ہوں یا نہ ہوں۔ تم سے واسطہ؟ تم کسی کی خانگی باتوں میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ بھاگو صابر نسیمہ بھاگ جانہیں تو سپاہی پکڑ لے گا۔

دونوں لڑکوں نے مشکوک نگاہوں سے ماہر علی کو دیکھا اور بھاگ گئے۔ راستہ میں نسیمہ نے کہا۔ چچا ہی جیسے تو ہیں۔ کیوں صابر۔ چچا ہی ہیں نہ؟

صابر: نہیں تو اور کون ہیں۔

صابر: جب ابا تھے۔تب ہم لوگوں کو پیار کرتے تھے۔ اب تو ابا نہیں ہے نا۔ تب تو ابا ہی سب کو کھلاتے تھے۔

نسیمہ: اماں کو تو اب ابا نہیں کھلاتے۔ وہ تو ہم لوگوں کو پہلے سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ پہلے کبھی پیسے نہ دیتی تھیں۔ اب تو پیسے بھی دیتی ہیں۔

صابر: وہ تو ہماری اماں ہیں نہ۔

لڑکے تو چلے گئے۔ ادھر داروغہ جی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ پھینک دو اسباب اور مکان فوراً خالی کرالو۔ یہ لوگ لات کے آدمی ہیں۔ بات سے نہ مانیں گے۔

دو کانسٹیبل حکم پاتے ہی بجرنگی کے گھر میں گھس گئے۔ اور برتن نکال کر پھینکنے لگے۔ بجرنگی باہر سرخ آنکھیں لیے کھرا ہونٹ چبارہا تھا۔ جمنی گھر میں ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی ہنڈیاں اُٹھاکر باہر لاتی۔ کبھی پھینکے ہوئے برتنوں کو سمیٹتی۔ منہ ایک لمحہ کے لیے بند نہ ہوتا تھا۔ مونڈی کاٹے کارکھانہ بنانے چلے ہیں۔ دنیا کو اجاڑ کر اپنا گھر بھریں گے۔ بھگوان بھی ایسے پاپیوں کا ناس نہیں کرتے۔ نہ جانے کہاں جا کر سو گئے ہیں۔ ہائے ہائے گھسوا کی جوڑی پٹک کر توڑ ڈالی۔

بجرنگی نے ٹوٹی ہوئی جوڑی اٹھاکر اور ایک سپاہی کے پاس لے جاکر کہا۔ جمعدار یہ جوڑی توڑ ڈالنے سے تمھیں کیا ملا؟ ثابت اُٹھا لے جاتے تو بھلا کسی کام تو آتی۔ گنیمت ہے کہ لال پگیا باندھے ہوئے ہونہیں تو آج ......

اس کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ دو سپاہیوں نے اُس پر ڈنڈے چلانے شروع کئے۔ بجرنگی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ لپک کر ایک سپاہی کی گردن ایک ہاتھ سے اور دوسرے سپاہی کی گردن دوسرے ہاتھ سے پکڑ لی اور اتنے زور سے دبائی کہ دونوں کی آنکھوں نکل آئیں۔ جمنی نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے تو روتی ہوئی بجرنگی کے پاس گئی اور بولی تمھیں بھگوان کی کسم ہے جو کسی سے لڑائی کرو۔ چھوڑو، چھوڑو کیوں اپنی جان سے بیر کر رہے ہو؟

بجرنگی : تو جا بیٹھ پھانسی پا جاؤں تو میکے چلی جانا۔ میں تو ان دونوں کی جان ہی لے کر چھوڑوں گا۔

جمنی: تمھیں گھیسو کی کسم تم میرا ہی مانس کھاؤ جو ان دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے چلے نہ جاؤ۔

بجرنگی نے دونوں سپاہیوں کو چھوڑ دیا مگر اس کے ہاتھ سے چھوٹنا تھا کہ وہ دوڑے ہوئے ماہر علی کے پاس پہنچے اور کئی اور سپاہیوں کو لیے ہوئے پھر آئے۔ مگر بجرنگی کو جمنی پہلے ہی سے ٹال لے گئی تھی۔ سپاہیوں کو شیر نہ ملا تو شیر کی ماں کو پیٹنے لگے۔ گھر کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ جو اپنے کام کی چیز نظر آئی اس پر ہاتھ بھی صاف کیا۔ یہی حال دوسرے گھروں کا بھی ہورہا تھا۔ چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی نے اندر سے گھر کا درواز ہ بند کر لیا۔ کوئی اپنے بال بچوں کو لے کر پچھواڑے سے نکل بھاگا۔ سپاہیوں کو مکان خالی کرانے کا حکم کیا ملا لوٹ مچانے کا حکم مل گیا۔ کسی کو اپنے برتن وغیرہ سمیٹنے کی مہلت بھی نہ دیتے تھے۔ نایک رام کے گھر پر بھی دھاوا ہوا۔ ماہر علی خود پانچ سپاہیوں کو لے کر گھسے۔ دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر میں جھاڑوں پھری ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی ہانڈی بھی نہ ملی۔ سپاہیوں کے حوصلے دل میں رہ گئے۔ سوچے ہوئے تھے کہ اس مکان میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماریں گے مگر مایوس اور شرمندہ ہو کر نکلنا پڑا۔ بات یہ تھی کہ نایک رام نے پہلے ہی اپنے گھر کی چیزیں نکال کر باہر کر دی تھیں۔

ادھر سپاہیوں نے مکانوں کے قفل توڑنے شروع کر دیے۔ کہیں کسی پر مار پڑتی تھی۔ کہیں کوئی اپنی چیزیں لیے بھاگا جاتا تھا۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ عجیب منظر تھا۔

گویا دن دہاڑے ڈاکہ پڑ رہا ہو۔ سب لوگ گھروں سے نکل کر یا نکالے جا کر سڑک پر جمع ہوتے جاتے ۔ ایسے موقعوں پر عموماً بدمعاشوں کا مجمع ہو ہی جاتا ہے۔ لوٹنے کی ترغیب تھی ہی۔ کسی کو باشندوں سے عداوت تھی۔ اور کسی کو پولیس سے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں بدامنی نہ پھیل جائے ۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ ماہر علی نے عوام کے تیور دیکھے تو فورا ایک کانسٹیبل کو پولیس کی چھاؤنی کی طرف دوڑایا اور چار بجتے بجتے مسلح پولیس کی ایک جماعت اور وہاں آپہنچی۔ کمک کے آتے ہی ماہر علی اور بھی دلیر ہوگئے۔ حکم دیا کہ مار مار کر سبوں کو بھگا دو۔ لوگ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ بھگا دو۔ جس کسی کو یہاں کھڑے دیکھو مارو، اب تک لوگ اپنے مال اسباب سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ مار بھی پڑتی تھی تو چپکے سے سہ لیتے تھے۔ گھر میں تنہا کئی کئی سپاہیوں سے کیسے بھڑتے؟ اب سب کے سب ایک مقام پر جمع ہوگئے۔ انھیں کچھ تو اپنی مجموعی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس پر نایک رام انھیں اکساتے جاتے تھے۔ یہاں آئیں تو مارے بغیر نہ چھوڑنا جب تک دو چار کے ہاتھ پاؤں نہ ٹوٹیں گے یہ سب نہ مانیں گے۔ بارود بھڑکنے والی ہی تھی کہ اتنے میں وہاں اندو کا موٹر آپہنچا اور اس میں سے ونے اندردت اور اندو اتر پڑے۔ دیکھا تو کئی ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا کچھ محلّہ کے باشندے تھے اور کچھ راہ گیر لوگ کچھ قریب گاؤں کے رہنے والے اور کچھ مل کے مزدور۔ کوئی صرف تماشہ دیکھنے آیا تھا کوئی ہمساؤں سے ہمدردی کا اظہار کرنے اور کوئی اس فساد سے حاسدانہ مسرت حاصل کرنے۔ ماہر علی اور اس کے کانسٹیبلان اس جوش کے ساتھ جو جو کمینہ آدمیوں کے دلوں میں ظلم کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو سڑک پر سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہجوم پیچھے ہٹنے کے عوض اور آگے ہی بڑھتا آتا تھا۔

ونے نے ماہر علی کے پاس جا کر کہا۔ داروغہ جی کیا ان آدمیوں کو ایک دن کی بھی مہلت نہیں مل سکتی؟

ماہر علی: مہلت تو تین مہینے کی تھی۔ اگر تین سال کی بھی ہو جائے تو بھی مکان خالی کرتے وقت یہی حالت ہوگی۔ یہ لوگ سیدھے سے کبھی نہ جائیں گے۔

ونے: کیا آپ اتنی عنایت کر سکتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے سپاہیوں کو روک دیں۔

جب تک کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہاں کی حال سے مطلع کر دوں؟
ماہر علی: صاحب تو یہیں ہیں۔مسٹر جان سیوک انھیں مل دکھانے لے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہاں سے کہاں چلے گئے اب تک نہیں لوٹے۔

دراصل صاحب کہیں گئے نہ تھے۔ جان سیوک کے ساتھ دفتر میں بیٹھے ہوئے مزہ سے شراب نوش کر رہے تھے۔ دونوں ہی آدمیوں نے واقعی حالات کا اندازہ کرنے کی غلطی کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم کو دیکھ کر ہی لوگ رعب میں آگئے ہوں گے۔ خوف کے مارے خود بخود بھاگ جائیں گے۔

صاحب کو خبر دینے کے لیے ونے سنگھ مل کی طرف تیزقدمی سے چلے تو راجہ صاحب کو موٹر پر آتے ہوئے دیکھا۔ ٹھٹھک گئے۔ سوچا کہ جب یہ آگئے ہیں تو صاحب کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ انھیں سے چل کر کہوں۔ لیکن ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کہیں عوام نے ان کی تحقیر کی تو میں کیا کروں گا۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے ہی ان لوگوں کو ترغیب دی ہے۔ وہ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ راجہ صاحب کی نگاہ اندو کے موٹر پر پڑی۔ جل اٹھے۔ اندردت اور ونے کو دیکھا۔ بخار سا چڑھ آیا۔ یہ لوگ یہاں رونق افروز ہیں۔ پھر کیو ں نہ فساد ہو؟ جہاں یہ بھلے مانس ہوں گے وہاں جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ یوں انھیں غصہ بہت کم آتا تھا مگر اس وقت ضبط نہ ہو سکا۔ ونے سے بولے۔ یہ سب آپ ہی کی کرامات معلوم ہوتی ہے۔

ونے نے نرم لہجہ میں آکر کہا۔ میں تو ابھی آیا ہوں۔ سپر نٹینڈنٹ کے پاس جا ہی رہا تھا کہ آپ آتے ہوئے دکھائی دیے۔
راجہ: خیر اب تو آپ ان کے رہنما ہیں۔ انھیں اپنے کسی جادو منتر سے ہٹائیے گا ورنہ مجھے کوئی دوسری تدبیر کرنی پڑے گی؟
ونے: ان لوگوں کو صرف اتنی شکایت ہے کہ ابھی ہمیں معاوضہ نہیں ملا۔ ہم کہاں جائیں؟ کیسے نئی زمین خریدیں؟ کیسے نئے مکان کا سامان لیں؟ اگر آپ تکلیف فرما کر ان لوگوں کو تسلی دے دیں تو خود بخود ہٹ جائیں گے۔
راجہ: یہ ان لوگوں کا بہانہ ہے۔ دراصل یہ لوگ فساد کرنا چاہتے ہیں۔

ونے: اگر انھیں معاوضہ دے دیا جائے تو شاید دوسری تدبیر نہ کرنی پڑے۔

راجہ: آپ چھ مہینے والا راستہ بتلا تے ہیں اور میں ایک ماہ والا چاہتا ہوں۔

ونے: اس راہ میں کانٹے ہیں۔

راجہ: اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ ہمیں کانٹے والی ہی راہ پسند ہے۔

ونے: اس وقت اس مجمع کی حالت خشک پوال کی سی ہے۔

راجہ: اگر پوال ہمارا راستہ روکتا ہے تو ہم اسے جلا دیں گے۔

سبھی لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ پھر بھی انسانوں کا مجمع کسی غائبانہ طاقت سے متاثر ہو کر راجہ صاحب کی طرف بڑھتا ہوا چلا آتا تھا۔ پولیس کے لوگ بھی ادھر ادھر سے آ کر موٹر کے پاس کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے چاروں طرف انسانوں کی ایک بھاری اور اتھاہ ندی لہریں مارنے لگی۔ گویا ایک ہی رو میں ان گنے گنائے آدمیوں کو نگل جائے گی۔ اس چھوٹے اور کمزور کنارہ کو بہا لے جائے گی۔

راجہ مہیندر کمار یہاں آگ کو مشتعل کرنے نہیں بلکہ فرو کرنے آئے تھے۔ ان کے پاس لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے بہت متردّد ہو رہے تھے۔ اخلاقی نقطہ خیال سے تو ان پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ جب صوبہ کی سرکار نے دباؤ ڈالا تو وہ کر ہی کیا سکتے تھے؟ اگر مستعفی ہو جاتے تو دوسرا شخص آ کر سرکاری حکم کی تعمیل کرتا۔ پانڈے پور والوں کے سر سے کسی حالت میں بھی یہ مصیبت نہ ٹل سکتی تھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اس امر کی کوشش کر رہے تھے کہ مکانات کے تخلیہ کے پیشتر لوگوں کو معاوضہ دے دیا جائے۔ بار بار یاد دہانی کرتے تھے۔ جیوں جیوں آخری تاریخ قریب آتی جاتی تھی ان کے شکوک میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ تو یہاں تک چاہتے تھے کہ باشندوں کو کچھ روپے پیشگی دے دیے جائیں کہ وہ پہلے ہی سے اپنا ٹھکانہ کر لیں۔ مگر کسی نامعلوم سبب سے روپیوں کی منظوری میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ مسٹر سینا پتی سے بار بار کہتے کہ آپ کی منظوری کی امید پر اپنے حکم سے روپے دلا دیں۔ مگر حاکم ضلع کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے کہ نہ جانے سرکار کا کیا ارادہ ہے۔ میں بلا اس کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتا۔ جب آج بھی منظوری نہ آئی تو راجہ صاحب نے تار دے

کر دریافت کیا اور دوپہر تک جواب کا انتظار کرتے رہتے۔ آخر جب اس مجمع کی اطلاع ملی تو گھبرا اٹھے۔ اسی وقت دوڑے ہوئے حاکم ضلع کے پاس گئے کہ ان سے کچھ صلاح کریں۔ انھیں امید تھی کہ وہ خود ہی موقع واردات پر جانے کو تیار ہوں گے۔ مگر وہاں جاکر دیکھا تو صاحب بہادر بیمار پڑے تھے۔ بیماری کیا تھی بیماری کا بہانہ تھا۔ بدنامی سے بچنے کی یہی تدبیر تھی۔ راجہ صاحب سے بولے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں جا سکتا۔ آپ جا کر فساد کے دفعہ کے لیے جو مناسب سمجھیں کریں۔

مہیند کمار اب بہت پریشان ہوئے۔ انھیں اپنی جان کسی طرح بچتی نہ نظر آتی تھی۔ اگر کہیں خونریزی کی نوبت آگئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ ساری مصیبت میرے ہی سر پر آئے گی۔ پہلے ہی سے لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہے۔ بے قصور مارا جا رہا ہوں۔ میری تقدیر کی کچھ ایسی گردش ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کے برعکس ہی کرتا ہوں گویا میرا اپنے اوپر کچھ قابو ہی نہیں رہا۔ اس زمین کے جھمیلے میں پڑنا ہی میرے لیے زہر ہوگیا۔ جبھی سے کچھ ایسا اتفاقات پیش آتے جاتے ہیں جو میری تمناؤں کو برباد کیے دیتے ہیں۔ نیک نامی، شہرت، نام، عزت کو کون روئے۔ منہ دکھانے ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر گھر گئے کہ چل کر اندو سے رائے لوں۔ دیکھوں کہ کیا کہتی ہے۔ مگر یہاں اندو نہ تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہیں گھومنے گئی ہیں۔

اس وقت راجہ صاحب کی حالت اس خسیس آدمی کی سی تھی جو اپنی آنکھوں سے اپنی دولت لٹتے ہوئے دیکھتا ہو۔ اور اس خوف سے کہ لوگوں پر میرے دولت مند ہونے کا بھید کھل جائے گا۔ کچھ بول نہ سکتا ہو۔ دفعتاً انھیں ایک بات سوجھی۔ کیوں نہ معاوضہ کے روپے اپنے ہی پاس سے دے دوں؟ روپے کہیں جاتے تو ہیں نہیں۔ جب منظوری آجائے گی واپس لے لوں گا۔ دوچار روز کا معاملہ ہے۔ میری بات رہ جائے گی۔ اور عوام کے دلوں پر اس کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ کل ستر ہزار ہی تو ہیں۔ اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ روپے آج ہی دے دیے جائیں۔ کچھ آج دے دوں۔ کچھ کل دے دوں۔ جب تک منظوری آہی جائے گی۔ جب لوگوں کو روپے ملنے لگیں گے۔

تو تسکین ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ نہ رہے گا کہ کہیں سرکار روپیوں کو ضبط نہ کرلے۔ افسوس کہ مجھے پہلے یہ بات نہ سوجھی۔ ورنہ معاملہ اتنا طول ہی کیوں کھینچتا۔ انھوں نے اسی وقت امپریئل بینک کے نام بیس ہزار روپیوں کا چک لکھا۔ دیر بہت ہوگئی تھی۔ اس لیے بینک کے منیجر کے نام ایک خط بھی لکھ دیا کہ روپے دینے میں تاخیر نہ کیجیے گا ورنہ بدامنی واقع ہو جانے کا امکان ہے۔ بینک سے آدمی روپے لے کر واپس آیا تو پانچ بج چکے تھے۔ راجہ صاحب فوراً موٹر پر سوار ہوکر پانڈے پور آپہنچے۔ آئے تو تھے ایسے نیک ارادے سے مگر وہاں ونے اور اندو کو دیکھ کر طیش آگیا۔ جی میں آیا لوگوں سے کہہ دوں کہ جن کے بوتہ پر اچھل رہے ہو انھیں سے روپے لو۔ اور ادھر سرکار کو لکھ دوں کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ پس ان کے روپے ضبط کرلیے جائیں اسی غصہ کی حالت میں انھوں نے ونے سے مذکورہ بالا باتیں کیں۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مجمع بڑھا ہوا چلا آرہا ہے۔ لوگوں کے چہرے غصہ سے بگڑے ہوئے ہیں۔ مسلح پولیس سنگین چڑھائے ہے اور ادھر ادھر سے دوچار پتھر بھی پھینکے جا رہے ہیں۔ تو ان کی وہی حالت ہوئی جو خوف میں نشہ کی ہوتی ہے۔ وہ فوراً اپنے موٹر پر کھڑے ہو گئے اور مجمع کو مخاطب کرکے بلند لہجہ میں بولے۔ دوستوں! ذرا صبر کرو۔ یوں فساد کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میں روپے لا یا ہوں۔ ابھی تم کو معاوضہ مل جائے گا۔ سرکار نے ابھی منظوری نہیں بھیجی ہے۔ مگر تمھاری خواہش ہو تو تم مجھ سے اپنے روپے لے سکتے ہو۔ اتنی سی بات کے لیے تمھاری یہ ہٹ بالکل بیجا اور نامناسب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں تمھارا قصور نہیں ہے۔ تم کسی کے ورغلانے ہی سے شرارت پر کمر بستہ ہوئے ہو۔ لیکن میں تمھیں اس بغاوت کی آگ میں نہ کودنے دوں گا جو تمھارے خیر خواہوں نے جلا رکھی ہے۔ یہ لو اپنے روپے سب لوگ باری باری سے آکر اپنے نام لکھاؤ۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ۔ روپے لو اور چپکے سے گھر چلے جاؤ۔

ایک آدمی نے کہا۔ گھر تو آپ نے چھین لیا۔

راجہ: روپیوں سے گھر ملنے میں دیر نہ لگے گی۔ ہم سے تمھاری جو کچھ مدد ہو سکے گی اسے اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس مجمع کو فوراً منتشر ہو جانا چاہیے ورنہ روپے ملنے میں دیر ہوگی۔

جو مجمع اڈے ہوئے بادلوں کی طرح گھنا اور خوف ناک ہو رہا تھا۔ وہ اس اعلان کو سنتے ہی روئی کے گالوں کی طرح پھٹ گیا۔ نہ جانے لوگ کہاں سما گئے۔ صرف وہی لوگ رہ گئے جنھیں روپے پانے تھے۔ وقتی دانش مندی سر پر آئی ہوئی مصیبت کو کتنی آسانی سے رفع کر سکتی ہے۔ اس کا یہ بین ثبوت تھا۔ ایک نامناسب لفظ ایک سخت فقرہ حالت کو نازک اور ناقابل اصلاح بنا دیتا۔

پٹواری نے ناموں کی فہرست پڑھنی شروع کی۔ راجہ صاحب اپنے ہاتھوں سے روپے تقسیم کرنے لگے۔ اسامی روپے لیتا تھا۔ انگوٹھے کا نشان بناتا تھا اور پھر دو سپاہی اس کے ساتھ کر دیے جاتے تھے کہ جا کر مکان خالی کرالیں۔

روپے پا کر لوٹتے ہوئے لوگ اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے:

ایک مسلمان: یہ راجہ بڑا موذی ہے۔ سرکار نے روپے بھیج دیے تھے پر دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ گرم نہ پڑتے تو صاف ہضم کر جاتا۔

دوسرا: سوچا ہوگا کہ مکان خالی کرالوں اور روپے سرکار کو واپس کر کے سرخرو بن جاؤں۔

ایک برہمن نے اس کی مخالفت کی۔ کیا بکتے ہو۔ بیچارے نے روپے اپنے پاس سے دیے ہیں۔

تیسرا: تم گوکھے ہو۔ یہ چالیں کیا جانو۔ جا کر پوتھی پڑھو اور پیسے ٹھگو۔

چوتھا: سبوں نے پہلے ہی صلاح کر لی ہوگی۔ آپس میں روپے بانٹ لیتے اور ہم لوگ ٹھاٹھ ہی پر رہ جاتے۔

ایک منشی جی بولے: اتنا بھی نہ کریں تو سرکار کیسے خوش ہو؟ انھیں چاہیے تھا کہ رعایا کی طرف سے سرکار سے لڑتے مگر آپ خود ہی خوشامدی ٹٹو بنے ہوئے ہیں۔ سرکار کا دباؤ تو محض حیلہ ہے۔

پانچواں: تو یہ سمجھ لو کہ اگر ہم لوگ نہ آجاتے تو بیچاروں کو کوڑی بھی نہ ملتی۔ گھر سے نکل جانے پر کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟ بیچارے مانگنے جاتے تو چپراسیوں سے مار کر نکلوا دیتے۔

عوام کی نظر میں ایک مرتبہ اعتبار کھو کر پھر اس کا قائم کرنا مشکل ہے۔ راجہ

صاحب کو عوام کے دربار سے یہ صلہ مل رہا تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ چار پانچ ہی اسامیوں کو روپے ملنے پائے تھے کہ اندھیرا ہو گیا۔ راجہ صاحب نے لیمپ کی روشنی میں نو بجے رات تک روپے تقسیم کیے اس وقت نایک رام نے کہا سرکار اب تو بہت دیر ہوئی۔ نہ ہو کل پر اٹھا رکھیے۔

راجہ صاحب بھی تھک گئے تھے۔ عوام کو بھی اب روپے ملنے میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آتی تھی۔ پس کام دوسرے روز کے لیے ملتوی کردیا گیا۔ مگر مسلح پولیس نے وہیں ڈیرا جمایا کہ کہیں پھر نہ لوگ جمع ہو جائیں۔

دوسرے روز دس بجے پھر راجہ صاحب تشریف لائے۔ ونے اور اندردت بھی کئی والنٹیروں کے ساتھ آپہنچے۔ فہرست کھولی گئی۔ سب سے پہلے سورداس کی طلبی ہوئی۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا آکر راجہ صاحب کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

راجہ صاحب نے اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا۔ تمھارے مکان کا معاوضہ صرف ایک روپیہ ہے۔ یہ لو اور مکان خالی کردو۔

سورداس: کیسا روپیہ؟

راجہ: ابھی تمھیں معلوم ہی نہیں؟ تمھارا مکان سرکار نے لے لیا ہے۔ یہ اس کا معاوضہ ہے۔

سورداس: میں نے تو اپنا مکان بیچنے کو کسی سے نہیں کہا۔

راجہ: اور لوگ بھی تو خالی کر رہے ہیں۔

سورداس: جو لوگ چھوڑنے پر راضی ہوں، انھیں دیجیے۔ میری جھونپڑی رہنے دیجیے۔ پڑا رہوں گا اور سرکار کا کلیان مناتا رہوں گا۔

راجہ: تمھاری مرضی کی بات نہیں ہے۔ سرکاری حکم ہے۔ سرکار کو اس زمین کی ضرورت ہے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اور مکانات تو گرا دیے جائیں اور تمھارا جھونپڑا بنا رہے؟

سورداس: سرکار کے پاس جمین کی کیا کمی ہے۔ سارا ملک پڑا ہوا ہے۔ ایک گریب آدمی کی جھونپڑی چھوڑ دینے سے اس کا کام تھوڑے ہی رک جائے گا۔

راجہ : فضول حجت کرتے ہو۔ یہ روپیہ لو۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ اور جا کر جھونپڑی سے اپنا سامان نکال لو۔

سورداس: سرکار جمین لے کر کیا کرے گی؟ یہاں کوئی مندر بنے گا؟کوئی تالاب کھدے گا؟ کوئی دھرمسالہ بنے گی؟ بتائیے!

راجہ: یہ میں کچھ نہیں جانتا۔

سورداس: جانتے کیوں نہیں؟ دنیا جانتی ہے بچہ بچہ جانتا ہے۔ تِلی گھر کے مجوروں کے لیے گھر بنیں گے۔ بنیں گے تو اس پر میرا کیا پھ"دہ ہوگا کہ گھر کو چھوڑ کر نکل جاؤں؟ جو کچھ پھائدہ ہوگا وہ صاحب کو ہوگا۔ پرجا کی بربادی ہی ہے۔ ایسے کام کے لیے میں اپنا جھونپڑا نہ چھوڑوں گا ہاں کوئی دھرم کا کام ہوتا تو سب سے پہلے میں اپنا جھونپڑا دے دیتا۔ اس طرح جبرجستی کرنے کا آپ کو اکھتیار ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے دیں۔ پھوس میں آگ لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پر یہ نیائے نہیں ہے۔ پرانے جمانے میں ایک راجہ اپنا گھر بنوانے لگا تو ایک بڑھیا کی جھونپڑی بیچ میں پڑ گئی۔ راجہ نے اسے بلا کر کہا کہ تو یہ جھونپڑی مجھے دے دے۔ جتنے روپے کہے تجھے دے دوں۔ جہاں کہہ تیرے لیے گھر بنوا دوں بڑھیا نے کہا۔ میرا جھونپڑا رہنے دیجئے۔جب دنیا دیکھے گی کہ آپ کے بگیچہ کے ایک کونے میں بڑھیا کی جھونپڑی ہے تو آپ کے دھرم اور نیائے کی بڑائی کرے گی۔ بگیچہ کی دیوار دس پانچ انچ ٹیڑھی ہو جائے گی پر اس سے آپ کا نام سدا کے لیے امر ہو جائے گا۔ راجہ نے بڑھیا کی جھونپڑی چھوڑ دی۔ سرکار کا دھرم پرجا کو پالنا ہے کہ اس کا گھر اجاڑنا اس کو تباہ کرنا؟

راجہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ میں تم سے دلیل کرنے نہیں آیا ہوں۔ سرکاری حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔

سورداس: ہجور میری مجال ہے کہ آپ سے دلیل کر سکوں مگر مجھے اجاڑیئے مت۔ باپ دادوں کی نسانی یہی جھونپڑی رہ گئی ہے۔ اسے بنی رہنے دیجیے۔

راجہ صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ایک ایک اسامی سے گھنٹوں بحث مباحثہ کرتے۔ انھوں نے دوسرے آدمی کو بلانے کا حکم دیا۔

اندردت نے دیکھا کہ سورداس اب بھی وہیں کھڑا ہے ہٹنے کا نام نہیں لیتاتو ڈرے کہ راجہ صاحب کہیں اسے سپاہیوں سے دھکے دے کر ہٹوا نہ دیں۔ آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گئے اور بولے سورداس ہے تو بے انصافی مگر کیا کروگے؟

جھونپڑی تو چھوڑنی ہی پڑے گی۔ جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ راجہ صاحب کی بدنامی کا خوف ہے ورنہ میں تم سے لینے کو نہ کہتا۔

کئی آدمیوں نے ان لوگوں کو گھیر لیا۔ ایسے مواقع پر لوگوں کا شوق بڑھا ہوتا ہے۔ کیا ہوا۔ کیا کہا۔ کیا جواب دیا؟ سبھی ان باتوں کے جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ سورداس نے اشک آلود آنکھوں سے دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھیا تم بھی کہتے ہو کہ روپیہ لے لو۔ مجھے تو اس پتلی گھر نے پیس ڈالا۔ باپ دادوں کی نسانی دس بگھے جمین تھی وہ پہلے ہی نکل گئی۔ اب یہ جھونپڑی بھی چھینی جا رہی ہے۔ سنسار اسی موہ مایا کا نام ہے۔ جب اس سے چھوٹ جاؤں گا تو جھونپڑی میں رہنے نہ آؤں گا لیکن جب تک جیتا ہوں اپنا گھر مجھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اپنا گھر ہے۔ نہیں دیتے۔ ہاں جبرجستی جو چاہے لے لے۔

اندردت: زبردستی کوئی نہیں کر رہا ہے۔ قانون کے مطابق ہی یہ مکانات خالی کرائے جارہے ہیں۔ سرکار کو اختیار ہے کہ وہ کسی سرکاری کام کے لیے جو مکان یازمین چاہے لے لے۔

سورداس: ہوگا کانون۔ میں تو ایک دھرم کانون جانتا ہوں۔ اس طرح جبرجستی کرنے کے لیے جوکانون چاہو بنا لو۔ یہاں کوئی سرکار کا ہاتھ پکڑنے والا تو ہے نہیں۔ اس کے صلاح کار بھی تو سیٹھ مہاجن ہی ہیں۔

اندر دت نے راجہ صاحب کے پاس جاکر کہا، آپ اندھے کا معاملہ آج ملتوی فرادیں تو اچھا ہو۔ گنوار آدمی بات نہیں سمجھتا۔ بس اپنی ہی گائے جا تا ہے۔

راجہ نے سور داس کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گنوار نہیں ہے چھٹا ہوا بدمعاش ہے، وہ ہمیں اور تمھیں دونوں کو ہی قانون پڑھا سکتا ہے۔ بھکاری ٹرا ہے۔ میں اس کا جھونپڑا گروائے دیتا ہوں۔

اس جملہ کے آخری الفاظ سورداس کے کانوں میں پڑگئے۔ بولا۔ جھوپڑا کیوں گروایئے گا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ مجھی کو گولی مروا دیجئے۔

یہ کہہ کر سورداس لاٹھی پٹکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ صاحب کو اس کی گستاخی پر غصہ آگیا۔ ثروت خود کو بڑی مشکل سے بھولتی ہے۔ خصوصاً جب دوسروں کے سامنے

اس کی تحقیر کی جائے۔ ماہر علی کو بلا کر کہا۔ اس کی جھونپڑی ابھی گرادو۔

داروغہ ماہر علی چلے۔ مسلح اور غیر مسلح پولیس اور مزدوروں کی ایک جماعت ان کے ساتھ چلی۔ گویا کسی قلعہ پر حملہ کرنے جارہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے عوام کا ایک مجمع بھی روانہ ہوا۔ راجہ نے ان آدمیوں کے تیور دیکھے تو ہوش اڑ گئے۔ فساد کا احتمال تھا، جھونپڑے کا مسمار کرنا اتنا آسان نہ معلوم ہوا جتنا کہ انھوں نے سمجھ رکھا تھا۔ پچھتائے کہ میں نے ناحق ماہر علی کو حکم دیا۔ جب محلہّ میدان ہوجاتا تو جھونپڑا خود بخود اجڑ جاتا۔ سورداس کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ تنہا اس میں پڑا رہتا، میں نے چیونٹی کو تلوار سے مارنے کی کوشش کی۔ ماہر علی غصہّ ور آدمی ہے اور ان آدمیوں کے رخ بھی بدلے ہوئے ہیں۔عوام غصہّ میں اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ موت پر ہنستے ہیں۔ کہیں ماہر علی جلد بازی کر بیٹھا تو ضرور فساد ہو جائے گا۔ اس کا سارا الزام میرے سر ہوگا۔ یہ اندھا خود تو ڈوبا ہی ہوا ہے، مجھے بھی ڈوبوئے دیتا ہے۔ بری طرح میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مگر اس وقت وہ حاکم کی حیثیت میں تھے۔ حکم کو واپس نہ لے سکتے تھے۔ سرکار کی آبرو میں بٹہّ لگنے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوف اپنی آبرو میں بٹہّ لگنے کا تھا۔ اب یہی تدبیر تھی کہ عوام کو جھونپڑے کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ابھی ابھی مل سے لوٹا تھا اور گھوڑے پر چڑھا ہوا سگار پی رہا تھا کہ راجہ صاحب نے جاکر اس سے کہا، ان لوگوں کو روکنا چاہیے۔

اس نے کہا۔ جانے دیجیے۔ کوئی ہرج نہیں۔ شکار ہوگا"

"بری خونریزی ہوگی"

ہم اس کے لیے تیار ہیں ۔

ونے کے چہرہ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ نہ آگے جاتے بنتا تھا نہ پیچھے۔ نہایت مغموم ہوکر بولے۔ اندو۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔

اندردت نے کہا۔ اس میں کیا شک ہے۔

عوام کو قابو میں رکھنا مشکل ہے۔

آپ جائیے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔"

تم اکیلے ہی رہ جاؤ گے۔

کوئی اندیشہ ہی نہیں"

تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ اب ہم یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے۔"

آپ جائیے آپ کو جومجبوری ہے۔ وہ مجھے نہیں ہے۔ مجھے اپنے کسی عزیز کی عزّت یا ذلت کا خوف نہیں۔"

ونے وہیں مضطرب اور ساکت کھڑے ہوئے تھے گویا کوئی عورت گھر سے نکال دی گئی ہو۔ اندروت انھیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھے تو مجمع اسی گلی کے موڑ پر رکا ہوا تھا۔ جو سورداس کے جھونپڑے کی طرف جاتی تھی۔ گلی کے دروازہ پر پانچ کانسٹیبل سنگینیں چڑھا کھڑے تھے۔ ایک قدم آگے بڑھنا سنگین کی نوک کو چھاتی پر لینا تھا۔ سنگینوں کی دیوار سامنے کھڑی تھی۔

اندروت نے ایک کنویں کی جگت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ بھائیو۔ سوچ لو تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیا اس جھونپڑی کے لیے پولیس سے لڑوگے؟ اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہاؤ گے؟ اس قیمت پر یہ جھونپڑی بہت مہنگی ہے۔ اگر اسے بچانا چاہتے ہو تو ان آدمیوں ہی سے منت کرو، جو اس وقت وردیاں پہنے سنگین چڑھائے موت کے فرشتے بنے ہوئے تمھارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اگر چہ ظاہرا وہ تمھارے دشمن ہیں مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا۔ جس کا دل تمھارے ساتھ نہ ہو۔ جو ایک بیکس اور کمزور اندھے کی جھونپڑی گرانے میں اپنی دلاوری سمجھتا ہو۔ ان میں سبھی بھلے آدمی ہیں جن کے بال بچے ہیں۔ جو قلیل تنخواہ پر تمھارے جان ومال کی حفاظت کرنے کے لیے گھر سے آئے ہیں۔

ایک آدمی: ہمارے جان ومال کی حفاظت کرتے ہیں یا سرکار کے رعب وداب کی؟

اندروت: ایک ہی بات ہے تمھارے جان ومال کی حفاظت کے لیے سرکار کے رعب و داب کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ انھیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ ایک مزدور کی اجرت سے بھی کم ہے......

ایک سوال: یکہ بگھی والوں سے پیسے نہیں لیتے؟

دوسرا سوال: چوریاں نہیں کراتے؟ جوا نہیں کھلاتے؟ گھوس نہیں کھاتے؟

اندروت: یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ تنخواہ جتنی ملنی چاہیے اتنی نہیں ملتی۔ یہ بھی ہماری اور تمھاری طرح انسان ہیں۔ ان میں بھی رحم اور عقل ہے۔ یہ بھی کمزوروں پر ہاتھ اٹھانا کمینہ پن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں مجبور ہو کر۔ انھیں سے کہو کہ اندھے پر ترس کھائیں اور اس کی جھونپڑی کو بچائیں۔ (کانسٹیبلوں سے) کیوں دوستوں تم سے اس رحم کی امید رکھیں؟ ان آدمیوں پر رحم کرو گے؟

اندروت نے ایک طرف عوام کے دلوں میں سپاہیوں کے لیے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف سپاہیوں کے دلی رحم کو متحرک کرنے کی۔ حوالدار سنگینوں کے عقب میں کھڑا تھا۔ بولا ہماری روزی بچا کر۔ اور جو چاہے وہ کیجیے ادھر سے نا جایئے۔

اندروت: تو روزی کے لیے اتنے لوگوں کی جانیں لے لو گے؟ یہ بیچارے بھی تو ایک بیکس کی مدد کرنے آئے ہیں۔ جو ایشور تمھیں یہاں رزق دیتا ہے۔ وہ کیا کسی دوسری جگہ تمھیں مارے گا؟ ارے یہ کون پتھر پھینکتا ہے؟ یاد رکھوں کہ تم لوگ انصاف کی حفاظت کرنے آئے ہو۔ بلوہ کرنے نہیں۔ ایسے بزدلانا حملوں سے اپنے کو قابلِ ملامت نہ بناؤ، مت ہاتھ اٹھاؤ اگر تمھارے اوپر گولیوں کی باڑھ بھی چلے......

اندروت کو زیادہ کہنے کا موقع نہ ملا۔ سپرنٹنڈنٹ نے گلی کے موڑ پر آدمیوں کا ہجوم دیکھا تو گھوڑا دوڑاتا ادھر چلا۔ اندروت کی آواز کانوں میں پڑی تو ڈانٹ کر بولا ہٹا دو اس کو۔ ان سب آدمیوں کو سبھی کو سامنے سے ہٹا دے۔ تم سب آدمی ابھی ہٹ جاؤ ورنہ ہم گولی مار دے گا۔"

مجمع ذرا نہ ہٹا۔

"ابھی ہٹ جاؤ نہیں تو ہم فائر کردے گا۔"

کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

سپرنٹینڈنٹ نے تیسری دفعہ آدمیوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔

مجمع ساکت اور بے حس کھڑا تھا۔

فائر کرنے کا حکم ہوا سپاہیوں نے بندوقیں ہاتھ میں لیں۔ اتنے میں راجہ صاحب بدحواس ہو کر ڈورتے ہوئے آئے اور بولے۔ مسٹر براؤن۔ خدا کے لیے مجھ پر

رحم کرو۔ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ باڑھ سر کی گئی۔ بندوقوں کی نالوں سے دھواں نکلا۔ دھائیں دھائیں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سنائی دیں اور کئی آدمی چکر کھا کر گر پڑے۔ مجمع کی طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ دوچار شاخیں گرپڑیں مگر درخت ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

پھر فائر کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے اب کے بہت منت کر کے کہا۔ مسٹر براؤن یہ گولیاں میرے دل کو چھیدے ڈالتی ہیں۔ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ دوسری باڑھ چلی۔ پھر کئی آدمی گر پڑے ۔ شاخیں گریں لیکن درخت بدستور کھڑا تھا۔

تیسری بار فائر کرنے کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر بھری ہوئی آوازمیں کہا مسٹر براؤن۔ اب میں بالکل تباہ ہوگیا۔ بندوقیں سر کی گئیں۔کئی آدمی گرے اور ان کے ساتھ اندردت بھی۔ گولی سینہ کے پار ہوگئی درخت کا تنہ گر گیا۔

مجمع میں بھگدر پڑگئی۔ لوگ گرتے پڑ۔تے ایک دوسرے کو کچلتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی کسی درخت کی آڑ میں چھپا، کوئی کسی گھر میں گھس گیا۔ کوئی سڑک کے کناروں کی کھائیوں میں جا بیٹھا مگر زیادہ تر لوگ وہاں سے ہٹ کر سڑک پر جا کر کھڑے ہوگیے۔

نایک رام نے ونے سنگھ سے کہا۔ بھیا کیا کھڑے ہو؟ اندردت کو گولی لگ گئی۔

ونے ابھی تک بے پروائی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ خبر پاتے ہی گولی سی لگ گئی۔ بے تحاشا دوڑے اور سنگینوں کے سامنے گلی کے دروازہ پر آکر کھڑے ہوگیے۔ انھیں دیکھتے ہی بھاگنے والے سنبھل گیے۔ جو چھپے بیٹھے تھے نکل پڑے جب ایسے ویسے لوگ مرنے کو تیار ہیں جن کے لیے دنیا میں آرام ہی آرام ہے تو ہم پھر کس گنتی میں ہیں۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ گرتی ہوئی دیوار پھر کھڑی ہوگئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے دانت پیس کر چوتھی بار فائر کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ کیا؟ کوئی سپاہی بندوق نہیں چلاتا۔ حولدار نے بندوق زمین پر پٹک دی۔ سپاہیوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں۔ حولدار بولا۔ حضور کو اختیار ہے جو چاہیں کریں مگر اب ہم لوگ گولی نہیں چلا سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ قصائی نہیں ہیں۔

براؤن: کورٹ مارشل ہوگا۔

حولدار: ہو جائے۔

براؤن : نمک حرام لوگ!

حولدار: اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لیے نہیں ان کی حفاظت کے لیے نوکری کی تھی۔

یہ کہہ کر سب کے سب پیچھے کی طرف پھر گیے اور سورداس کے جھونپڑے کی طرف چلے ان کے ساتھ ہی کئی ہزار آدمی جے جے کے نعرے بلند کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ونے ان کے آگے آگے تھے۔ راجہ صاحب اور مسٹر براؤن حواس باختہ سے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی بات وقوع پذیر ہو رہی تھی جو پولیس کی تاریخ میں ایک نئے زمانہ کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ جو روایات کے خلاف انسانی فطرت کے خلاف اور طرز حکومت کے خلاف تھی۔ سرکار کے وہ پرانے خادم جن میں سے کتنوں ہی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رعایا کو دبانے ہی میں بسر کیا تھا۔ یوں اکڑے ہوئے چلے جائیں۔ اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان دینے کو بھی تیار ہو جائیں! راجہ صاحب اب تک جواب دہی کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ اب یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھی پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ براؤن تو گھوڑے پر سوار آدمیوں کی ہنٹر مار مار کر بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور راجہ صاحب اُپنے لیے چھپنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔لیکن کسی نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سب کے سب فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے سیلابی روش سے سورداس کی جھونپڑی کی طرف دوڑے چلے جاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو جھونپڑے کے چاروں طرف سینکڑوں آدمی کھڑے تھے۔ ماہر علی اپنے آدمیوں کے ساتھ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے نئی مسلح پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس بھیڑ کو پار کر کے جھونپڑے کے پاس جائیں۔ سب کے آگے نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس مجمع کے وسط میں جھونپڑے کے دروازہ پر سورداس سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا گویا صبر، روحانی طاقت اور پرسکون جلال کی زندہ تصویر تھی۔

ونے کو دیکھتے ہی نایک رام آکر بولا۔ بھیا تم اب فکر مت کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گا۔ ادھر مہینوں سے سورداس سے میری ان بن تھی بول چال تک بند تھا پر آج

اس کا جیوٹ جگرا دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ ایک اندھے اپاہج میں اتنی ہمت، ہم لوگ دیکھنے ہی کو مٹی کا یہ بوجھ لادے ہوئے ہیں۔

ونے : اندردت کا مرنا غضب ہوگیا۔

نایک رام : بھیا دل نہ چھوٹا کرو۔ بھگوان کی یہی اِچھا تھی۔

ونے: کتنی بہادرانہ موت پائی ہے!

نایک رام : میں تو کھڑا دیکھتا ہی تھا۔ ماتھے پر سکن تک نہیں آئی۔

ونے: مجھے کیا معلوم تھا کہ آج یہ نوبت آئے گی ورنہ پہلے خود ہی جاتا۔ وہ اکیلے سمتی کا کام سنبھال سکتے تھے۔ میں نہیں سنبھال سکتا۔ کتنے ہنس مکھ تھے۔ دقتوں کو تو دھیان ہی میں نہ لاتے تھے ۔ آگ میں کودنے کو تیار رہتے تھے۔ خیریت یہی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔

نایک رام : گھر والے کتنا زوردیتے رہے پر انھوں نے ایک بار نہیں کر کے پھر ہاں نہ کی۔

ونے: ایک نوجوان عورت کی جان بچ گئی۔

نایک رام : کہاں کی بات بھیا۔ بیاہ ہوگیا ہوتا تووہ اس طرح بے دھڑک ہوکر گولیوں کے سامنے جاتے ہی نا۔ بیچارے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔

ونے : رو رو کر مر جائیں گے اور کیا۔

نایک رام: اتنا اچھا ہے کہ اور کئی بھائی ہیں اور گھر کے بوڑھے ہیں۔

ونے: دیکھو ان سپاہیوں کی کیا گت ہوتی ہے۔ کل تک فوج آجائے گی۔ ان غریبوں کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

نایک رام : کیا پھکر کروگے بھیا؟ ان کا کوٹ ماسل ہوگا۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟

ونے : یہی تو ان سے کہنا ہے بھاگیں نہیں ۔ جو کچھ کیا ہے اس کا پھل بھوگنے سے نہ ڈریں۔ جولدار کو پھانسی ہو جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے دونوں آدمی جھونپڑی کے پاس گیے تو حولدار بولا۔ کنور صاحب میرا تو کوٹ ماسل ہوگا ہی۔ میرے بال بچوں کی کھبر لیجیے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ ڈھاریں مار مار کر رونے لگا۔

بہت لوگ جمع ہوگیے اور کہنے لگے۔ کنور صاحب چندہ کھول دیجیے ۔ حولدار تم سچے سورما ہو۔ جو کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

ونے: حولدار ہم سے جو کچھ ہو سکے گا وہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ آج تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

حولدار: کنور صاحب مرنے جینے کی چنتا نہیں ہے۔ مرنا تو ایک دن ہوگا ہی۔ اپنے بھائیوں کی سیوا کرتے ہوئے مارے جانے سے بڑھ کر اور کون موت ہوگی؟ دھنیہ ہے آپ کو جو اپنا سکھ آنند چھوڑ کر ابھاگوں کی رچھا کر رہے ہو۔

ونے: تمھارے ساتھ کے جو لوگ نوکری چاہیں انھیں ہمارے یہاں جگہ مل سکتی ہے۔

حولدار: دیکھیے کون بچتا ہے اور کون مرتا؟

راجہ صاحب نے موقع پایا تو موٹر پر بیٹھ کر ہوا ہوگیے۔ مسٹر براؤن فوجی کمک کے بارے میں حاکم ضلع سے مشورہ کرنے چلے گئے۔ ماہر علی اور ان کے سپاہی وہیں جمے رہے۔ اندھیرا ہوگیا تھا۔ لوگ بھی ایک ایک کرکے جانے لگے۔ دفعتاً سورداس آکر بولا۔ کنور جی کہاں ہیں؟ دھرماوتار ہاتھ بھر دھرتی کے لیے کیوں اتنا جھنجھٹ کرتے ہو؟ میرے کارن(سبب) آج اتنے آدمیوں کی جان گئی۔ میں کیا جانتا تھا کہ رائی کا پربت ہو جائے گا۔ نہیں تو اپنے ہاتھ سے جھونپڑی میں آگ لگا دیتا اور منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاتا۔ مجھے کیا کرنا تھا۔ جہاں مانگتا وہیں پڑا رہتا۔ بھیا مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میری جھونپڑی کے پیچھے کتنے ہی گھر اجڑ جائیں۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کرنا۔

ونے: تمھاری جھونپڑی نہیں۔ ہمارا قومی مندر ہے۔ ہم اس پہ پھاوڑے چلتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

سورداس: پہلے میری دیہہ پر پھاوڑا چل چکے گا تب گھر پر پھاوڑا چلے گا۔

ونے: اور اگر آگ لگادیں۔؟

سورداس: تب تو میری چیتا بنی ہوئی ہے۔ بھیا میں تم سے اور سب بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اگر میرے کارن کسی ماں کی گود سونی ہوئی یا میری کوئی بہن بدھوا ہوئی تو میں اس جھونپڑی میں آگ لگا کر جل مروں گا۔

ونے نے نایک رام سے کہا' اب؟
نایک رام: بات کا تو دھنی ہے۔ جو کہے گا جرور کرے گا۔
ونے: تو پھر ابھی اسی طرح چلنے دو۔ دیکھو ادھر سے کل کیا گل کھلتا ہے۔ ان کا ارادہ دیکھ کر ہم لوگ بھی سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اب چلو۔ اپنے بہادروں کی مٹی ٹھکانے لگا دیں۔ یہ ہمارے قومی شہید ہیں۔ ان کا جنازہ دھوم سے نکلنا چاہیے۔

نو بجتے بجتے نو ارتھیاں نکلیں اور تین جنازے ۔ آگے آگے اندردت کی ارتھی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسروں کی۔ جنازے قبرستان کے طرف گیے۔ ارتھوں کے پیچھے کوئی دس ہزار آدمی ننگے سر ننگے پیر سر جھکائے چلے جاتے تھے۔ ہر قدم پر مجمع بڑھتا چلاجاتا تھا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑے چلے آتے تھے۔ لیکن کسی کے چہرہ پر سوگ یا غم کا نشان نہ تھا۔نہ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ نہ کسی کے منہ سے فریاد وفغاں کی آواز نکلتی تھی اس کے خلاف دلوں میں غرور تھا۔ اور آنکھوں میں قومیت کی پرجوش جھلک۔ اگر اس وقت راستہ میں توپیں لگا دی جاتیں‌تو بھی لوگوں کے قدم پیچھے نہ پڑتے۔ نہ کہیں ماتم کی آواز تھی نہ فتح کا نعرہ۔ عجیب خاموشی تھی۔ جذبہ جوش اور روانی سے معمور۔

راستہ میں راجہ مہیندر کمار کا محل ملا۔ راجہ صاحب چھت پر کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دروازہ پر مسلح سپاہیوں کا ایک گروہ سنگینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ جیوں ہی ارتھیاں ان کے دروازہ کے سامنے سے نکلیں کہ ایک عورت اندر سے نکل کر ہجوم میں شامل ہوگئی۔ یہ رانی اندو تھی۔ اس پر کسی کی نگاہ نہ پڑی اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی ایک مالا تھی جسے اس نے خود ہی گوندھا تھا۔ وہ اس ہار کو لیے ہوئے آگے بڑھی اور اندردت کی ارتھی کے پاس جا کر آنسوؤں کے ساتھ اسے ارتھی پر چڑھا دیا۔ ونے نے دیکھ لیا بولے۔'' اندو۔'' اندو نے ان کی طرف اشک آلودآنکھوں سے دیکھا اور کچھ نہ بولی۔ کچھ بول نہ سکی۔

اے گنگا ! ایسا شاندار منظر شاید ہی تمھاری آنکھوں نے کبھی دیکھا ہوگا۔ تم نے بڑے بڑے سورماؤں کو خاکستر ہوتے ہوئے دیکھا ہے جو شیروں کا منہ پھر سکتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست راجے مہاراجے تمھاری آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے جن کے نعروں سے دنیا تھراتی تھی بڑے بڑے جری لوگ یہاں چتا کی آگ میں جل گیے۔

کوئی نام ونمود کا بھوکا تھا، کوئی راج پاٹ کااور کوئی سیم وزر کا۔ کتنے گیانی، دھیانی، جوگی، پنڈت تمھارے دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلوں میں سما گیے۔ سچ کہنا۔ کبھی تمھارا دل اتنا مسرور ہوا تھا؟ کبھی تمھاری موجوں نے اس طرح سر اٹھایاتھا؟ اپنے لیے سبھی مرتے ہیں کوئی اس لوک کے لیے اور کوئی پر لوگ کے لیے۔ آج تمھاری گود میں وہ لوگ آرہے ہیں جو بے غرض تھے۔ جنھوں نے پاک اور خالص عدل کی حفاظت کے لیے اپنے کو قربان کر دیا ہے!

اور ایسا مسرت خیز ماتمی مجمع بھی کبھی تم نے دیکھاجس کا ایک ایک جزو اخویت، قومی محبت اور بہادرانہ عقیدت سے مملو ہو؟

تمام رات شعلے بلند ہوتے رہے گویا شہیدوں کی روحیں آتشیں تخت پر بیٹھی ہوئیں بہشت کو جار ہی تھیں!

نکلتے سورج کی سرخ کرنیں چتاؤں سے گلے لپٹ لپٹ کر ملنے لگیں۔ یہ سورج دیوتا کاآشرواد(دعاء) تھا۔

لوٹتے وقت صرف گنے گنائے لوگ رہ گیے تھے۔ عورتیں پر جوش گانے گاتی ہوئیں چلی آتی تھیں۔ رانی جانھوی آگے آگے تھیں ۔ اندو اور کئی دیگر عورات پیچھے پیچھے۔ ان کی بہادرانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی میٹھی تان صبح کی روشن شعاؤں پر ناچ رہی تھی۔جس طرح دل کے تاروں پر محبت رقص کرتی ہے۔

(43)

صوفیہ کے مذہبی خیالات، اس کی معاشرت، اس کی پرورش، اس کی مذہبی تعلیم۔یہ سبھی باتیں تھیں جن سے ایک ہندو عورت کو نفرت ہو سکتی تھی۔ مگر اتنے دنوں کے تجربہ نے رانی صاحبہ کے سارے شکوک دور کر دیے تھے۔ صوفیہ ابھی تک ہندو مذہب کے دائرہ میں باقاعدہ طریقہ پر داخل نہ ہوئی تھی۔ مگر اس کا اخلاق ہندو مذہب اور ہندو سوسائٹی کے موافق تھا۔ اس بارے میں اب رانی جانھوی کو ذرا بھی شک نہ تھا۔ انھیں اب اگر شک تھا تو صرف یہ کہ ازدواجی رشتہ کے قائم ہو جانے پر ونے کہیں اپنے مقصد کو بھول نہ جائے۔ اس تحریک میں رہنمائی کا بار اپنے اوپر لے کر

ونے نے اس شک کو بھی بے بنیاد ثابت کر دیا۔ رانی صاحبہ اب شادی کی تیاریوں میں مشغول ہوئیں کنور صاحب تو پہلے ہی راضی تھے۔ البتہ صوفیہ کے والدین کی رضامندی ضروری تھی۔ اندو کو کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ باقی اور رشتہ داروں کی رضامندی یا نارضامندی کی انھیں کوئی فکر ہی نہ تھی۔ پس رانی صاحبہ ایک روز مسٹر سیوک کے مکان پر گئیں کہ اس عقد کی بابت طے کرلیں۔ مسٹر سیوک تو خوش ہوئے مگر مسز سیوک کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ ان کی نگاہوں میں ایک یوروپین کی جتنی عزت تھی اتنی کسی ہندوستانی کی نہ ہو سکتی تھی۔ خواہ وہ کتنا ہی صاحب ثروت کیوں نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں معمولی سے معمولی یوروپین کی عزت یہاں کے بڑے سے بڑے راجہ سے زیادہ ہے۔ پربھوسیوک نے یوروپ کی راہ لی۔ اب گھر کو خط تک نہ لکھتے تھے۔ صوفیہ نے ادھر یہ راستہ اختیار کیا۔ زندگی کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ جانھوی کے اصرار پر ناخوش ہو کر بولیں۔ خوشی صوفیہ کی چاہیے جب وہ خوش ہے تو میری رائے ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی بات ہے۔ ماں ہوں اولاد کے لیے جب منہ سے نکلے گی تو دعا ہی نکلے گی۔ اس کی بدخواہی نہیں کر سکتی ۔ لیکن معاف کیجیے گا۔ میں شادی کی رسوم میں شامل نہ ہوسکوں گی۔ میں اپنے اوپر بڑا صبر کر رہی ہوں کہ صوفیہ کو بددعا نہیں دیتی ورنہ ایسی ننگ خاندان لڑکی کا تو مرجانا ہی اچھا ہے جو اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو جائے۔

رانی صاحبہ کو اور کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی تو گھر آکر انھوں نے عالم پنڈت کو بلا کر صوفیہ کی تبدیلی مذہب اور شادی کی ساعت مقرر کر لی۔

رانی جانھوی تو ان رسوم کو دھوم دھام سے ادا کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ادھر پانڈے پور والی تحریک روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ معاوضہ کے روپے تو اب کسی کے باقی نہ تھے۔ اگرچہ ابھی تک منظوری نہ آئی تھی۔ اور راجہ مہیندر کمار کو سبھی اسامیوں کو اپنے پاس سے روپے دینے پڑے تھے مگر ان خالی مکانات کو گرانے کے لیے مزدور نہ ملتے تھے۔ دوگنی سہ گنی اجرت دینے پر بھی کوئی مزدور کام کرنے نہ آتا تھا۔ حکام نے ضلع کے دیگر مقامات سے مزدور بلوئے مگر جب انھوں نے آکر یہاں کی حالت دیکھی تو راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعدہ حکام

نے سرکاری برقندازوں کو تحصیل کے چپراسیوں کو بڑا بڑا لالچ دے کر کام کرنے کے لیے تیار کیا مگر جب ان کے سامنے سینکڑوں نوجوان جن میں کتنے ہی اونچے گھرانوں کے تھے۔ آکر دست بستہ کھڑے ہوگیے اورملتجی ہوئے کہ بھائیوں ایشور کے لیے پھاوڑے نہ چلاؤ اور اگر چلانا ہی چاہتے ہو تو پہلے ہماری گردنوں پر چلاؤ۔ تو ان سب کی کایا پلٹ ہوگئی۔ دوسرے روز سے وہ لوگ پھر کام پر نہ آئے ۔ ونے اور ان کے رفیق والنٹیر لوگ آج کل اس ستیاگرہ کو بڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔

سورداس صبح سے شام تک جھونپڑے کے دروازہ پر بت بنا بیٹھا رہتا۔ حولدار اور اس کے سپاہیوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ موقع واردات کی حفاظت کے لیے دوسرے ضلع سے مسلح پولیس بلائی گئی تھی۔ وہ سپاہی سنگینیں چڑھائے چوبیسوں گھنٹے جھونپڑی کے سامنے والے میدان میں ٹہلتے رہتے۔شہر کے ہزار دوہزار آدمی آٹھوں پہر موجود رہتے۔ ایک جاتا تو دوسرا آتا۔ آنے جانے والوں کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا تھا۔ والنٹیروں کی جماعت بھی نایک رام کے خالی برآمدے میں موجود رہتی تھی کہ نہ جانے کب کیافساد ہو جائے۔ راجہ صاحب اور سپرنٹینڈنٹ پولیس دن میں دو مرتبہ ضرور آتے تھے۔ مگر کسی سبب سے جھونپڑے کو منہدم کرنے کا حکم نہ دیتے تھے۔ عوام کی طرف سے فساد کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا کہ پولیس کی جانب سے عدول حکمی کا۔ حولدار کے رویہ سے جملہ حکام کے دلوں میں خوف سما گیا تھا۔ صوبہ کی گورنمنٹ کو مقامی حالات کی رپورٹ ہر روز بھیجی جاتی تھی۔ گورنمنٹ نے بھی ڈھارس دی تھی کہ جلد ہی گورکھوں کی ایک رجمنٹ بھیجنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اب حکام کی امیدوں کا گورکھوں ہی پر انحصار تھا جن کی وفاداری کا انھیں پورا یقین تھا۔ ونے عموماً تمام دن یہیں رہا کرتے تھے۔ ان کے اور راجہ صاحب کے درمیان اب شمشیر برہنہ کا وقفہ تھا۔ وہ ونے کو دیکھتے تو نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ ان کی نگاہ میں ونے بانی تھا اور سورداس اس کے ہاتھوں کا کھلونا۔

رانی جانھوی جیوں جیوں شادی کی تیاریاں کرتی تھیں اور تاریخ قریب آتی جاتی تھی۔ صوفیہ کا دل ایک نامعلوم خوف ایک موہوم اندیشہ ایک نحوست آمیز فکر سے ہراساں ہو رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ شاید شادی کے بعد ازدواجی زندگی راحت خیز نہ ہو۔

ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خامیاں معلوم ہو جائیں اور پس ہماری زندگی تلخ ہو جائے۔ ونے کی نگاہ میں صوفیہ بے عیب بے خطا پاک صاف ہمہ صفت موصوف دیوی تھی۔ صوفیہ کو ونے پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے وسیع مذہبی مطالعہ نے اسے انسانوں کو جبلی خامیوں سے واقف کر دیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے مہاتماؤں رشیوں منیوں پنڈتوں اور جوگیوں کو جو اپنی سخت ریاضت سے اپنی نفسانی خواہشات کو مغلوب کر چکے تھے۔ دنیا کے چکنے مگر کائی سے ڈھکے ہوئے سطح پر پھسلتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر چہ نفس پر قابو رکھنے والے لوگ بڑی مشکلوں سے پھسلتے ہیں۔ مگر جب ایک بار پھسل گئے تو پھر کسی طرح نہیں سنبھل سکتے۔ اس کی دبی ہوئی خواہشات اس کی مقید آرزوئیں وحسن کی مغلوب تمنائیں بڑی تیزی سے مخالف سمت کو چلتی ہیں۔ زمین پر چلنے والا انسان گر کر پھر اٹھ سکتا ہے۔ مگر آسمان پر گھومنے والا آدمی گرے تو اسے کون روکے گا۔ اس کے لیے کوئی امید نہیں۔ اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، صوفیہ کو خوف تھا کہ کہیں مجھے بھی یہی تلخ تجربہ نہ ہو۔ کہیں میری بھی یہی حالت نہ ہو۔ کہیں مجھ میں کوئی ایسا عیب نکل آئے جو مجھے ونے کی نگاہوں میں گرادے۔ وہ میری بے قدری کرنے لگیں۔ یہ اندیشہ سب سے زبردست سب سے زیادہ مایوس کن تھا۔ آہ اس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ دنیا میں ایسے کتنے مرد عورت کے جوڑے ہیں کہ اگر انھیں دوبارہ انتخاب کی آزادی دے دی جائے تو وہ اپنے پہلے انتخاب پر قانع رہیں؟

صوفیہ برابر اسی قسم کے خیالات میں محو رہتی تھی۔ ونے بار بار اس کے پاس آتے، اس سے باتیں کرنا چاہتے۔ پانڈے پور والے معاملہ کے متعلق اس سے رائے لینا چاہتے مگر اس کی بے رخی دیکھ کر انھیں کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔

فکر مرض کی جڑ ہے۔ صوفیہ اس قدر متفکر رہتی کہ دن دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ کھانا بھی بہت کم کھاتی اور کبھی کچھ نہ کھاتی۔ دل میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ ونے سے اس بارے میں ایک لفظ کبھی نہ کہہ سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا انجام برا ہوگا۔ مایوسی کی حالت میں ونے نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ آخر اس کا نازک جسم اس دل کی جلن کو برداشت نہ کر سکا۔ پہلے سر میں درد رہنے لگا۔ اور پھر رفتہ رفتہ بخار کی نوبت آگئی۔

لیکن بستر علالت پر پڑتے ہی صوفیہ کو ونے سے ایک لمحہ بھی جدا ہونا ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ کمزور آدمی کو اپنی لاٹھی سے بھی بے انتہا محبت ہو جاتی ہے۔ بیماری کی حالت میں ہمارا دل محبت کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ صوفیہ جو کئی روز پہلے کمرہ میں ونے کے آتے گوشۂ تنہائی کی تلاش کرتی تھی کہ کہیں یہ عشقیہ گفتگو نہ کرنے لگیں۔ ان کی مشتاق نگاہوں سے ان کے شیریں تبسم سے ان کی دل لبھانے والی ہنسی سے تھر تھر کانپتی رہتی تھی۔ جس طرح کوئی بیمار لذیذ کھانوں کو سامنے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ میں بدپر ہیزی نہ کر بیٹھوں۔ اب منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہوئی ونے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ونے اب کہیں نہ جائیں۔ میرے ہی پاس بیٹھے رہیں۔ ونے بھی زیادہ تر اس کے پاس ہی رہتے۔ پانڈے پور کا کام اپنے رفیقوں پر چھوڑ کر صوفیہ کی تیمارداری میں مشغول ہوگئے۔ ان کے بیٹھے رہنے سے صوفیہ کے دل کو گونہ اطمینان رہتا۔ وہ اپنے کمزور ہاتھوں کو ونے کے زانوں پر رکھ دیتی اور معصوم تمناؤں کے ساتھ ان کے چہرہ کی طرف دیکھتی۔ ونے کو کہیں جاتے دیکھتی تو پریشان ہو جاتی اور التجا آمیز نگاہوں سے بیٹھنے کی استدعا کرتی۔

رانی جانہوی کے برتاؤ میں بھی اب ایک خاص فرق دکھائی دیتا تھا۔ صاف تو نہ کہہ سکتیں۔ مگر اشاروں سے ونے کو پانڈے پور کے ستیاگرہ میں شامل ہونے سے روکتیں۔ اندردت کی موت نے انھیں بہت خائف کردیا تھا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اس خونریزی کا آخری نظارہ اس سے بھی زیادہ خوفناک ہو کہ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شادی کے طے ہوتے ہی ونے سنگھ کا جوش بھی کم ہو چلا تھا۔ صوفیہ کے پاس بیٹھ کر اس سے تشفی آمیز گفتگو کرنا اور اس کی محبت بھری باتیں سننا انھیں اب بہت مرغوب تھا۔ صوفیہ کی التجاؤں نے ان کی محبت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ہم پہلے انسان ہیں اور پیچھے قومی خادم۔ حب الوطنی کے لیے ہم اپنے انسانی جذبات کو پامال نہیں کر سکتے یہ فطرف کے خلاف ہے۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم قومی مصیبت کے غم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنا غم جان گسل ہوتا ہے اور قومی غم یاس انگیز۔ اپنے غم پر ہم روتے ہیں۔ قومی غم پر متردد ہو جاتے ہیں۔

ایک روز علی الصباح ونے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لے کر لوٹے تھے۔ اچھے

ویدوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کا اعتقاد مغربی دواؤں پر زیادہ تھا کہ کنور صاحب نے انھیں بلا بھیجا۔ ونے ادھر مہینوں سے ان سے ملنے نہ گئے تھے۔ باہمی ناچاقی سی ہوگئی تھی۔ ونے نے صوفیہ کو دوا پلائی اور پھر کنور صاحب سے ملنے گئے۔ وہ اپنے کمرہ میں ٹہل رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر بولے۔ تم تو اب کبھی آتے ہی نہیں۔

ونے نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ فرصت نہیں ملتی۔ آپ نے کبھی یاد بھی تو نہیں کیا۔ میرے آنے سے شاید آپ کا وقت خراب ہوتا ہے۔

کنور صاحب نے اس طنز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ آج مجھے تم سے ایک تشویش انگیز امر میں مشورہ لینا ہے۔ اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلد فراغت نہ ہوگی۔

ونے: فرمایئے میں سن رہا ہوں۔

کنور صاحب نے بہت پس وپیش کے لہجہ میں کہا۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ تمھارا نام ریاست سے۔۔۔

یہ کہتے کہتے کنور صاحب روپڑے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو بولے میری تم سے عاجزانہ التجاء ہے کہ تم بالاعلان اس تحریک سے اپنا قطع تعلق کر لو اور اخباروں میں اس اعلان کو شائع کر دو۔ تم سے ایسی التجاء کرتے ہوئے مجھے کتنی ندامت اور پریشانی ہو رہی ہے۔ اس کا اندازہ تمھارے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔ مگر حالات وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں تم سے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ کسی کی خوشامد کرو۔ کسی کے سامنے سر جھکاؤ۔ نہیں مجھے خود اس سے نفرت تھی اور ہے۔ مگر اپنی جائداد بچانے کی غرض سے میری اس التجاء کو منظور کرو۔ میں نے سمجھا تھا کہ ریاست کو سرکار کے ہاتھ میں دے دینا کافی ہوگا۔ مگر حکام اسے کافی نہیں سمجھتے۔ ایسی حالت میں میرے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو تم خود اس تحریک سے علیحدہ ہو جاؤ۔ کم از کم اس میں نمایاں حصہ نہ لو یا میں ایک معاہدہ تحریر کرکے تمھیں ریاست سے محروم کردوں۔ آگے آنے والی اولاد کے لیے اس جائداد کا محفوظ رہنا نہایت ضروری ہے۔ تمھارے لیے پہلی صورت جتنی مشکل ہے اتنی ہی مشکل میرے لیے دوسری صورت ہے۔ تم اس بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟

ونے نے تمکنت سے جواب دیا۔ میں جائداد کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنانا

چاہتا۔ اگر جائداد ہماری ہے تو اس کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔ اگر غیر کی ہے اور آپ کا قبضہ محض مشروط ہے تو اسے میں اپنی جائداد نہیں سمجھتا۔ حقیقی عزت ووقار کے لیے جائداد کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے ایثار نفسی اورخدمت کافی ہیں۔

بھرت سنگھ: بیٹا میں اس وقت تمھارے سامنے جائداد پر اصولی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ اسے صرف عملی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حدتک جائداد ہماری حقیقی آزادی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ مگر اس کا روشن پہلو بھی تو ہے۔ فکر معاش سے نجات ملتی ہے اور وہ عزت وقار جس کے حصول کے لیے غیر معمولی ایثار و خدمت کی ضرورت ہے۔ یہاں بلا کسی مشقت کے خود بخود ہاتھ آجاتا ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس تحریک سے کوئی ظاہرا تعلق نہ رکھو یہاں پوشیدہ طور سے اس کی جتنی مدد کرنی چاہو کر سکتے ہو۔ بس اپنے کو قانونی گرفت سے بچائے رہو۔

ونے: یعنی کوئی اخبار بھی پڑھوں تو چھپ کر کواڑ بند کرکے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جس کام کے لیے پردہ کی ضرورت ہے خواہ اس کا مقصد کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ واقعی اہانت آمیز ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں میں اسے چوری کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ یہ شبہ اور خوف کی زندگی انسان کے بہترین اوصاف کو زائل کر دیتی ہے۔ میں قول وفعل کی اتنی آزادی ضرور سمجھتا ہوں جس سے ہماری خود داری قائم رہے۔ اس بارے میں میں اپنے خیالات کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔

کنور صاحب نے ونے کو اشک آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی التجاء کتنی عاجزی کتنا انتشار تھا۔ پھر بولے۔ میری خاطر سے اتنا مان جاؤ۔

ونے: آپ کے قدموں پر اپنے کو نثار کرسکتاہوں مگر اپنے ضمیر کی آزادی کا خون نہیں کر سکتا۔

ونے یہ کہہ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب نے پوچھا۔ تمھارے پاس روپے تو بالکل نہ ہوں گے؟

ونے: مجھے روپوں کی فکر نہیں۔

کنور: میری خاطر سے یہ لیتے جاؤ۔

انھوں نے نوٹوں کا ایک پلندہ ونے کی طرف بڑھا دیا۔ ونے انکار نہ کر سکے۔ کنور صاحب پر انھیں ترس آرہا تھا۔ جب وہ نوٹ لے کر کمرہ سے چلے گئے تو کنورصاحب رنج و مایوسی سے مضطرب ہو کر کرسی پر گر پڑے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں تاریک تھی۔

ونے کی حمیت نے انھیں ریاست چھوڑ نے پر آمادہ تو کر دیا۔ مگر ان کے سامنے اب ایک نیا سوال پیدا ہوگیا۔وہ کسب معاش کاسوال تھا۔ سمیتی کے بارہ میں تو کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اس کا بار ملک پر تھا۔ اس کے علاوہ کسی قومی کام کے لیے بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ انھیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ کوشش کی جائے تو اس کام کے لیے مستقل سرمایہ جمع ہوسکتا ہے۔ مگر معاش کے لیے کیا ہو؟ مشکل یہ تھی کہ کسب معاش سے مراد صرف ان ں روز مرّہ کی ضروریات پورا ہونا نہ تھا بلکہ خاندانی روایات کا قائم رکھنا بھی۔ اب تک اس مسئلہ کی اہمیت کا انھیں احساس نہ ہوا تھا۔ دل میں کسی بھی خواہش کے صرف پیدا ہونے کی دیر تھی کہ وہ پوری ہوجاتی تھی۔ اب نگاہوں کے سامنے یہ زبردست مسئلہ یک دم کھڑا ہوگیا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ممکن تھا کہ اب بھی کچھ دنوں تک والدین کی شفقت انھیں اس فکر سے آزاد رکھتی۔ مگر اس کمزور بنیاد پر زندگی کا محل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی حمیت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی اصول پروری اور معیار پسندی کا کفارہ اپنے والدین سے کریں۔کچھ نہیں۔ یہ بے حیائی ہے اور بزدلی۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ اپنی زندگی کا بار والدین پر ڈالوں۔ انھوں نے اس ملاقات کا تذکرہ اپنی ماں سے بھی نہ کیا۔ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے رہے۔ علاوہ بریں ان کا اپنی فکر اور بھی زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ مانا کہ صوفیہ میرے ساتھ زندگی کی بڑی سے بڑی مصیبت کو برداشت کرلے گی۔ مگر کیا یہ مناسب ہے کہ اسے محبت کے لیے یہ سخت سزادی جائے؟ اس کی محبت کو اس سخت آزمائش میں ڈالاجائے۔ وہ تمام دن انھیں تفکرات میں مبتلا رہے۔ یہ عقدہ انھیں ناقابل حل معلوم ہوتا تھا۔ ان کی تعلیم میں کسب معاش کے مسئلہ پر ذرا بھی دھیان نہ دیا گیا تھا۔ ابھی چند روز پیشتر ان کے لیے اس مسئلہ کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ خود سختیاں اٹھانے کے عادی تھے۔ ارادہ تھا کہ تمام عمر قومی خدمت کا کام انجام دوں گا

مگر صوفیہ کے سبب ان کے اس ارادہ میں فرق آ گیا تھا۔ جن چیزوں کی پہلے ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ اب نہایت ضروری معلوم ہوتی تھیں۔ محبت کو خصوصاً عیش و عشرت کا خیال پسند ہے۔ وہ تکلیف اور مفلسی کا جواب نہیں دیکھتی۔ ونے صوفیہ کو ایک رانی کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ اسے زندگی کی ان تمام نعمتوں سے معمور کر دینا چاہتا تھا جو شوق و تکلّف نے ایجاد کی ہیں۔ مگر حالات ایسی صورت اختیار کرتے جاتے جس سے وہ ساری تمنائیں برباد ہوئی جاتی تھیں۔ چاروں طرف سے مفلسی اور مصیبت ہی کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ اس پریشانی کی حالت میں وہ کبھی صوفیہ کے پاس جاتے اور کبھی اپنے کمرے میں جاتے۔ کچھ سم گم اُداس۔ پس ہمت۔ اُترا ہوا اور بے رونق چہرہ۔ گویا کوئی بڑی مسافت طے کر کے آئے ہوں ۔ پانڈے پور سے بڑی خوفناک اطلاعیں موصول ہو رہی تھیں۔ آج کمشنر آیا۔ آج گورکھوں کی رجمنٹ آ پہنچی۔ آج گورکھوں نے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کیا۔ دس رضا کار پکڑ لیے گئے۔ آج بیس پکڑے گئے۔ آج حکم دیا گیا ہے کہ سڑک سے سورداس کی جھونپڑی تک کانٹے دار تار لگا دیا جائے۔ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا۔ ونے یہ خبریں سنتے تھے اور کسی پر شکستہ پرندہ کی طرح ایک بار تڑپ کر رہ جاتے۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور صوفیہ کی صحت ٹھیک ہونے لگی۔ اس کے پیروں میں اتنی طاقت آ گئی کہ پیدل باغیچہ میں ٹہلنے چلی جاتی۔ کھانا اچھا معلوم ہونے لگا۔ چہرہ پر صحت کی سرخی نمودار ہوگئی۔ ونے کی عقیدتمندانہ تیمارداریوں نے اس پر پوری فتح حاصل کر لی تھی وہ اندیشے جو اس کے دل میں پہلے پیدا ہوتے تھے۔ دور ہو گئے تھے۔ محبت کے رشتہ کو عزیمت نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اپنے شکریہ کا اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو وقف کر کے کرنا چاہتی تھی۔ ونے سنگھ کو مغموم دیکھ کر کہتی۔ تم میرے لیے اتنے متفکر کیوں ہوتے ہو؟ میں تمھارے ساتھ سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ میں تمھاری دولت وثروت کی بھوکی نہیں ہوں جو تمھاری خدمت کرنے کا موقع نہ دے گی۔ جو تمھیں جوابات سے محروم بنا دے گی۔ اس سے مجھے تمھارا مفلس ہونا کہیں زیادہ پسند ہے۔ البتہ جیوں جیوں اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اسے خیال ہونے لگا کہ کہیں لوگ مجھے بدنام نہ کرتے ہوں کہ اسی کی وجہ سے ونے پانڈے پور نہیں

جاتے۔ اس ستیاگرہ کی لڑائی میں وہ حصہ نہیں لیتے جو ان کا فرض ہے۔ خود آگ لگا کر دور سے کھڑے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس خیال کے پیدا ہونے پر بھی اس کی خواہش نہ ہوتی کہ ونے وہاں جائیں۔

ایک روز اندو اسے دیکھنے آئی۔ بہت مغموم اور پریشان تھی۔ اب اپنے شوہر سے اس قدر بداعتقاد ہوگئی تھی کہ ادھر ہفتوں سے اس نے ان سے بات تک نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اب وہ کھلے الفاظ میں ان کی ہجو کرنے سے بھی نہ ہچکتی تھی۔ راجہ صاحب بھی اس سے نہ بولتے تھے۔ باتوں بات میں ونے سے بولی۔ انھیں تو حاکموں کی خوشامد نے چوپٹ کیا۔ پتا جی کو جائداد کی محبت نے چوپٹ کیا۔ کیا محبت تمھیں بھی چوپٹ کردے گی۔ کیوں صوفیہ تم انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی قید سے نہیں آزاد کرتیں؟ اگر ابھی سے ان کا یہ حال ہے تو شادی ہوجانے پر کیا ہوگا؛ جب تو یہ شاید دین و دنیا کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے۔ بھونرے کی طرح محبت کا رس پی کر بدمست رہیں گے۔

صوفیہ بہت خجل ہوئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کا یہ گمان درست نکلا کہ ونے کی بے پروائی کا سبب میں ہی سمجھی جا رہی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ونے اپنی جائداد بچانے کے خیال سے میری بیماری کا حیلہ کرکے اس لڑائی سے الگ رہنا چاہتے ہوں؟ یہ برا خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ اسے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ جیسے ہم کسی قابل نفرت شے سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنا ضروری تھا۔ لجاتی ہوئی بولی۔ میں نے تو کبھی منع نہیں کیا۔

اندو: منع کرنے کے بھی کئی ڈھنگ ہیں۔

صوفیہ: اچھا تو میں آپ کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ مجھے ان کے وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے اپنے اور ان کے دونوں ہی کے لیے فخر کی بات سمجھتی ہوں۔ اب میں ایشور کی رحم اور ان کی مہر بانی سے اچھی ہوگئی ہوں۔اور انھیں یقین دلاتی ہوں کہ ان کے وہاں جانے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی میں خود بھی دو چار روز میں جاؤں گی۔

اندونے ونے کی طرف دیکھ کر کہا۔ لو اب تو تمھارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں

رہی۔ تمھارے وہاں رہنے سے بس کام عمدہ طریقہ پر ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ حاکموں کو جلد ہی سمجھوتہ کر لیناپڑے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کی عزت کسی دوسرے آدمی کو ملے۔

جب اس تاکید کا بھی ونے پر کوئی اثر نہ ہوا تو صوفیہ کو یقین ہو گیا کہ اس علیٰحدگی کا سبب چاہے جائداد کا لالچ نہ ہو مگر محبت بھی نہیں ہے۔ جب انھیں معلوم ہے کہ ان کی علیٰحدگی سے بڑی بدنامی ہور ہی ہے تو یہ دیدہ و دانستہ کیوں مجھے نشانۂ ملامت بنا رہے ہیں؟ یہ تو اونگھتے کو ٹھلے کا بہاناہوگیا۔ رونے کو تھے ہی۔ آنکھوں میں کوئی چیز پڑگئی۔ میں ان کے پیر تھوڑا ہی پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ تو اب پانڈے پور کا نام تک نہیں لیتے گویا وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن کنایتاً ونے کو وہاں جانے کی ترغیب بھی دی مگر وہ پھر ٹال گئے۔ در اصل بات یہ تھی کہ اتنے دنوں تک علاحدہ رہنے کے بعد ونے اب وہاں جاتے ہوئے شرماتے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ وہاں جانے پر کہیں مجھ پر لوگ تالیا نہ بجائیں کہ خوف سے پیچھے بیٹھے رہے۔ وہ اب خود پشیمان ہورہے ہیں کہ میں کیوں اتنے دنوں تک منہ چھپائے رہا۔ میں نے کیوں اپنی ذاتی پریشانیوں کو اپنے فرض کے راستہ کا کانٹا بننے دیا؟ صوفیہ میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ میں اس کے نفع کے لیے بھی جو کام کرتاہوں اسے بھی وہ ایک بے رحم نقاّد کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ خود چاہے محبت سے مغلوب ہوکر اپنے فرض کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے مگر میں معیار سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتا۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ یہ میری کمزوری، میری بزدلی، میری کاہلی تھی، جس نے صوفیہ کی علالت کو میرے منہ چھپانے کا حیلہ بنا دیا ورنہ میری جگہ توسپاہیوں کی اولیں صف میں تھی۔ ونے چاہتے تھے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے کہ میں اپنی خفت کو مٹاسکوں۔ اس کالکھ کو دھو سکوں۔کہیں دوسرے صوبہ سے کسی خوفناک حادثہ کی خبر آجائے اور میں وہاں اپنی لاج رکھوں۔

صوفیہ کو اب ان کا ہر وقت ساتھ رہنا گوارا نہ تھا۔ ہم بیماری میں جس لاٹھی کے سہارے چلتے پھرتے ہیں۔ آرام ہوجانے پر اسے چھوتے تک نہیں۔ ماں بھی گو چاہتی ہے کہ بچہّ کچھ دیر جاکر کھیل آئے۔ صوفیہ کا دل اب بھی ونے کو آنکھوں سے اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ

ہوجاتا تھا۔ آنکھوں میں محبت کا سرور چھا جاتا تھا۔ مگر قوت امتیازی اسے فوراً اپنے فرض کی یاد دلادیتی تھی وہ سوچتی تھی کہ جب ونے پاس آئے۔ تو میں بے مروت بن جاؤں۔ بے اعتنائی سے پیش آؤں۔ بولوں نہیں۔ آپ چلے جائیں گے۔ مگر یہ صرف اس کی پاک خواہش تھی۔ وہ اتنی بیدرد۔ اتنی بے مروت نہ ہوسکتی تھی۔ خوف ہوا تھا کہ کہیں برا نہ مان جائیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اس کا دل ڈانوا ڈول ہے یا یہ اتنی خود غرض ہے کہ بیماری میں تو سراپا محبت بنی ہوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اب مجھ سے بولتے ہوئے بھی زبان دکھتی ہے۔ صوفیہ تیرا دل محبت چاہتا ہے۔ تیری عقل، نیک نامی اور شہرت اور ان دونوں میں برابر کشمکش جاری ہے۔

معرکہ کو شروع ہوئے دوماہ گزر گئے۔ معاملہ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتاجاتا تھا۔ والنیٹروں کی گرفتاری پر قانع نہ ہوکر گورکھوں نے اب انھیں جسمانی اذیت پہنچانی شروع کردی تھی۔ بے عزتی بھی کرتے تھے۔ اور اپنے وحشیانہ سلوک سے انھیں خائف بھی کردینا چاہتے تھے۔ مگر سورداس پر فائر کرنے کی یا اس کے جھونپڑے میں آگ لگانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انقلاب کا خوف تھا۔ بغاوت کا خوف نہ تھا۔ بڑی سے بڑی بغاوت بھی انھیں خائف نہ کرسکتی تھی۔ خوف تھا خونریزی کا۔ نہ جانے کتنے غریب مرجائیں۔ نہ جانے کتنا کہرام مچے۔ ایک بار پتھر کا دل بھی خونریزی سے کانپ اٹھتا ہے۔

سارے شہر میں کوچہ کوچہ، گھر گھر یہی چرچا تھی۔ شہر کیا ہزاروں آدمی روز وہاں پہنچ جاتے۔ صرف تماشا دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ ایک بار اس پھوس کی جھونپڑی کا اور اس کے اندھے رہنے والے کا درشن کرنے کے لیے، نیز موقع پڑنے پر اپنے سے جو کچھ ہو سکے وہ کر دکھانے کے لیے۔ والینٹروں کی گرفتاری سے ان کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ قربانی کی ہوا سی بہہ گئی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک شخص ڈونڈی پیٹتا ہوا نکلا۔ ونے نے نوکر کو بھیجا کہ کیا بات ہے۔ اس نے لوٹ کر کہا۔ سرکار کا حکم ہوا ہے کہ آج سے شہر کا کوئی آدمی پانڈے پور نہ جائے۔ سرکار اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

ونے نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ آج کوئی بڑا حملہ ہونے والا ہے۔

صوفیہ: معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ونے: شاید سرکار نے اس جنگ کو ختم کردینے کا تہیہ کرلیا ہے۔

صوفیہ: ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ونے: سخت خونریزی ہوگی۔

صوفیہ: ضرور ہوگی۔

دفعتاً ایک والنیٹر نے آکر ونے کو نمسکار کیا۔اور بولا۔ آج تو ادھر کا راستہ بند کر دیا گیاہے۔ مسٹر کلارک راجپوتانہ سے حاکم ضلع کی جگہ پر آگئے ہیں۔ مسٹر سیناپتی معطل کر دیے گئے ہیں۔

ونے: اچھا مسٹر کالارک آگئے۔ کب آئے؟

والنیٹر: آج ہی چارج لیا ہے۔ سنا جاتا ہے۔ سرکار نے انھیں اسی کام کے لیے خاص طور سے تعینات کیا ہے۔

ونے: تمھارے کتنے آدمی وہاں ہوں گے؟

والنیٹر: کوئی پچاس آدمی۔

ونے کچھ سوچنے لگے۔ والنیٹر نے کئی منٹ کے بعد پوچھا۔ آپ کوئی خاص حکم دینا چاہتے ہیں۔

ونے نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ خواہ مخواہ آگ میں مت کودنا۔ اورحتی الامکان عوام کو وہاں جانے سے روکنا۔

والنیٹر: آپ بھی آئیں گے؟

ونے نے کچھ اداس ہوکر کہا۔ دیکھا جائے گا۔

والنیٹر کے چلے جانے پر ونے کچھ دیر تک سوچتے رہے۔سوال تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ دونوں کے متعلق سوچ بچار ہونے لگا۔ میں جاکر کیا کروں گا۔ حکام کی جو مرضی ہوگی ویسا تو وہ ضرور ہی کریں گے۔ اب سمجھوتہ کی کوئی امید نہیں۔ لیکن یہ کتنی ذلت کی بات ہے کہ شہر کے باشندے تو وہاں جانے کے لیے تیار ہوں اور میں جس نے یہ معرکہ چھیڑا ہے منہ چھپا کر بیٹھا رہوں۔ اس موقع پر میرا الگ رہنا مجھے زندگی بھر کے لیے بدنام کردے گا۔ میری حالت مہیندر کمار سے بھی زیادہ گئی گزری ہوجائے

گی۔ لوگ سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک طرح سے میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ آج بھی گولیاں چلیں۔ ضروری چلیں گی کون کہہ سکتا ہے کیا ہوگا؟ صوفیہ کس کی ہوکر رہے گی۔ آہ میں نے ناحق عوام میں یہ جوش پھیلایا۔ اندھے کا جھونپڑا گر گیا ہوتا اور ساری باتیں ختم ہوجاتیں۔ میں نے ہی ستیہ گرہ کا جھنڈا کھڑا کیا۔ سوتے ہوئے شیر کو جگایا۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالی۔

انھوں نے اپنے دل کو ملامت کرتے ہوئے سوچا آج میں اتنا پست ہمت کیوں ہو رہا ہوں؟ کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ موت سے کیا ڈر؟ مرنا تو ایک دن ضرور ہی ہے۔ کیا میرے مرنے سے ملک سونا ہوجائے گا؟ کیا میں ہی نکھیا ہوں؟ کیا دوسرے بہادروں کی پیدا کرنے والی ماں ملک بھی موجود ہی نہیں ہے۔

صوفیہ کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے ان کی طرف تاکتی رہی۔ دفعتاً وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ میں وہاں جاتی ہوں۔

ونے نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ آج جانا خطرناک ہے۔ سنا نہیں سارے ناکے بند کردیے گئے ہیں؟

صوفیہ: عورتوں کو کوئی نہ روکے گا۔

ونے نے صوفیہ کا ہاتھ پکڑلیا اور نہایت منت آمیز انداز سے کہا۔

جان من: میرا کہنا مانو۔ آج نہ جاؤ۔ آثار اچھے نہیں نظر آتے۔ کوئی برا واقعہ ہونے والا ہے۔

صوفیہ: یہی تو میں چاہتی ہوں۔ اوروں کے لیے خوف مانع ہو تو میرے لیے بھی کیوں ہو؟

ونے: کلارک کا آنا برا ہوا۔

صوفیہ: اسی لیے میں اور جانا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے سامنے کوئی وحشیانہ حرکت نہ کرسکے گا۔ اتنی شرافت ابھی اس میں ہے۔

یہ کہہ کر صوفیہ اپنے کمرہ میں گئی۔ اس نے اپنا پرانا پستول شلوار کی جیب میں رکھا۔ گاڑی تیار کرنے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ باہر نکلی تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس نے جاکر ونے سنگھ کے کمرہ میں دیکھا وہ وہاں نہ تھے۔ پھر وہ دروازہ پر کچھ دیر تک

کھڑی رہی۔ ایک نامعلوم خوف نے کسی آنے والی مصیبت کے اندیشہ نے اس کے دل کو ڈانواڈول کردیا۔ وہ اپنے کمرہ میں واپس جانا چاہتی تھی کہ کنور صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ صوفیہ ڈری کہ یہ کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔ وہ فوراً گاڑی میں جابیٹھی اور کوچوان کو تیزی سے لیے جانے کا حکم دیا۔ لیکن جب گاڑی کچھ دور نکل گئی تو وہ سوچنے لگی کہ ونے کہاں چلے گئے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہو کہ مجھے جانے پر آمادہ دیکھ کر وہ مجھ سے پہلے ہی چلے گئے ہوں؟ اسے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں ناحق یہاں آنے کو تیار ہوئی۔ ونے کی خواہش نہ تھی۔ وہ میرے ہی اصرار سے آئے ہیں۔ ایشور۔تم ان کی حفاظت کرنا۔ کلارک ان سے جلا ہی ہوا ہے۔ کہیں ہنگامہ نہ ہوجائے۔ میں نے ونے کو نکما سمجھا۔ میری کتنی زیادتی ہے؟ یہ دوسرا موقعہ ہے کہ میں نے ان پر جھوٹا الزام لگایا۔ میں شاید اب تک انھیں نہیں سمجھی۔ وہ دل کے جری ہیں۔ یہ میری کم ظرفی ہے کہ ان کے بارہ میں اکثر مجھے بدگمانی ہوجاتی ہے۔ اگر میں ان کی راہ کا کانٹا نہ بنی ہوتی تو ان کی زندگی کتنی پاک و صاف کتنی روشن ہوتی۔ میں ہی ان کی کمزوری کا سبب اور میں ہی ان پر الزام عائد کرنے والی ہوں ایشور کرے وہ یہاں نہ آئے ہوں۔ ان کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں آئے یا نہیں چل کر دیکھ لوں۔ اس نے کوچوان کو اور تیز ہانکنے کا حکم دیا۔

ادھر ونے سنگھ دفتر میں جاکر سمیتی کے جمع خرچ کا حساب لگا رہے تھے۔ ان کا دل بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اپنے چاروں طرف مغموم نگاہوں سے دیکھتے اور پھر حساب لکھنے لگتے۔ نہ جانے وہاں سے لوٹ کر آنا ہو یا نہ ہو۔ اس لیے حساب کتاب ٹھیک کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ کام ختم کرکے انھوں نے دعائیہ انداز سے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر باہر نکلے۔ بائسکل اٹھائی اور تیزی سے چلے۔ پیچھے مڑمڑ کر مکان، باغ اور درختوں کو اتنی مشتاق نگاہوں سے دیکھتے جاتے گویا وہ انھیں پھر نہ دیکھیں گے۔ گویا یہ ان کا آخری نظارہ ہے۔ کچھ دور جا کر انھوں نے دیکھا کہ صوفیہ چلی جا رہی ہے۔ اگر وہ اس سے مل جاتے تو شاید صوفیہ بھی ان کے ساتھ لوٹ پڑتی مگر انھیں یہ دھن سوار تھی کہ میں صوفیہ کے پہلے وہاں جا پہنچوں۔ موڑ پر آتے ہی انھوں نے سائیکل کو پھیر دیا اور دوسرا راستہ پکڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ

میدان جنگ میں پہنچے تو صوفیہ ابھی وہاں نہ آئی تھی۔ ونے نے دیکھا کہ گرے ہوئے مکانوں کی جگہ سینکڑوں چھولداریاں کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے چاروں طرف گورکھے کھڑے ہوئے گشت لگا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اندر جاسکے۔ ہزاروں آدمی ارد گرد جمع ہیں۔ گویا کسی بڑے تماشہ کو دیکھنے کے لیے تماشائی لوگ ایک حلقہ بنا کر کھڑے ہوگئے ہوں۔ درمیان میں سورداس کا جھونپڑا اسٹیج کی طرح موجود تھا۔ سورداس جھونپڑے کے سامنے لاٹھی لیے کھڑا تھا گویا ناٹک کو شروع کرنے کے لیے کھڑا ہو۔ سب لوگ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ ونے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ سمیتی کے جانباز والنٹیر راتوں رات جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ ونے نے فیصلہ کیا کہ میں بھی وہیں جاکر کھڑا ہوجاؤں۔

یکا یک کسی نے پیچھے سے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اُنھوں نے چونک کر دیکھا تو صوفیہ تھی۔اُس کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔ گھبرائی ہوئی آواز سے بولی۔ تم کیوں آئے؟

ونے: تمھیں تنہا کیسے چھوڑ دیتا؟

صوفیہ: مجھے بڑا خوف معلوم ہو رہا ہے۔ یہ توپیں کیوں لگا دی گئی ہیں؟

ونے نے توپیں نہ دیکھی تھیں۔ واقعی تین توپیں جھونپڑی کی طرف منہ کر کے کھڑی کر دی گئی تھیں۔ گویا تماشا گاہ میں دیو آگئے ہوں۔

ونے: شاید آج ستیاگرہ کو ختم کردینے کا فیصلہ ا ہے۔

صوفیہ: میں یہاں ناحق آئی۔ مجھے گھر پہنچا دو۔

آج صوفیہ کو پہلی بار محبت کی کمزوری کا احساس ہوا۔ ونے کی سلامتی کے خیال سے وہ کبھی اتنی بدحواس نہ ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ ونے کا فرض ان کی عزت ان کی نیک نامی یہاں رہنے ہی میں ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ان کو یہاں سے ہٹالے جانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی کوئی فکر نہ تھی اپنے کو وہ بالکل بھول گئی تھی۔

ونے : ہاں تمھارا یہاں رہنا خطرناک ہے۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا پر تم نے نہ مانا۔

صوفیہ ونے کا ہاتھ پکڑ کر انھیں گاڑی میں بیٹھا دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً اندو رانی کا موٹر آپہنچا۔ موٹر سے اتر کر وہ صوفیہ کے پاس گئیں اور بولیں۔ کیوں صوفیجاتی ہو

کیا؟

صوفیہ نے بات بنا کر کہا۔ نہیں جاتی نہیں ہو ذرا پیچھے ہٹ جانا چاہتی ہوں۔

صوفیہ کو اندو کا آنا کبھی اتنا ناگوار نہ ہوا تھا۔ ونے کو بھی برا معلوم ہوا۔ بولے تم کیوں آئیں؟

اندو: اس لیے کہ تمھارے بھائی صاحب نے آج خط کے ذریعہ مجھے منع کر دیا تھا۔

ونے: آج کی حالت بہت نازک ہے ان لوگوں کے صبر وتحمل ہمت وجوانمردی کا آج سخت ترین امتحان ہوگا۔

اندو: تمھارے بھائی صاحب نے بھی تو اس خط میں یہی بات لکھی تھی۔

ونے: کلارک کو دیکھو کتنی بیدردی سے لوگوں کو ہنٹر مار رہا ہے۔ مگر کوئی ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ عوام کا ضبط وتحمل اب آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔

عوام اس قدر مشتعل مزاج اور وفا شعار ہو سکتے ہیں۔ اس کا احساس ونے کو آج ہی ہوا۔ ہر شخص سرفروشی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں نایک رام کسی طرف سے آ گئے۔ انھوں نے ونے کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ آج تم ادھر کیسے بھول پڑے بھیا؟

اس سوال میں کتنا طنز کتنی حقارت کتنی ملامت تھی۔ ونے تلملا گئے۔ بات ٹال کر بولے کلارک بڑا بے رحم ہے۔

نایک رام نے انگوچھے ہٹا کر ونے کو اپنی پیٹھ دکھائی۔ گردن سے کمر تک ایک نیلا سرخ خط کھنچا ہوا تھا۔ گویا کسی نوک دار کیل سے کھرچ دیا گیا ہو۔ ونے نے پوچھا۔ یہ زخم کیسے لگا؟

نایک رام: ابھی یہی ہنٹر کھائے ہوئے چلا آتا ہوں۔ آج جیتا بچا تو سمجھوں گا۔ غصہ تو ایسا آیا تھا کہ ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لوں مگر ڈرا کہ کہیں گولی نہ چل جائے تو ناحق سب آدمی بھون جائیں۔ تم نے تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ عورت کا مایا جال بڑا کٹھن ہے۔

صوفیہ نے اس جملہ کا آخری لفظ سن لیا بولی۔ تم پرمیشور کا شکر ادا کر لو کہ تم اس مایا جال میں نہیں پھنسے۔

صوفیہ کی چٹکی نے نایک رام کو گدگدادیا۔ سارا غصہ فرو ہوگیا۔ بولے بھیا مس صاحب کو جواب دو۔ مجھے معلوم تو ہے پر کہتے نہیں بنتا۔ ہاں کیسے؟

ونے: کیوں تمھیں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اب عورتوں کے نزدیک نہ جاؤں گا۔ بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ یہ اسی روز کی بات ہے جب میں صوفیہ کی ملامت سن کر اودے پور جا رہا تھا۔

نایک رام: (شرماکر) واہ بھیا تم نے تو میرے ہی اوپر جھونک دیا۔

ونے: اور کیا کہوں؟ سچ کہنے میں کیا تامل؟ خوش ہوں تو مصیبت، ناراض ہوں تو مصیبت۔

نایک رام: بس بھیا میرے من کی بات کہی۔ ٹھیک یہی بات ہے ہر طرح مردوں پر ہی مار۔ راجی ہو تو مصیبت ناراضی ہوں تواس سے بڑی مصیبت۔

صوفیہ: جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مرد کیوں اسے اپنے سر مڑھتے ہیں؟ جسے دیکھو وہی اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ کیا دنیا کے سبھی مرد جاہل ہیں۔ کسی کو تمیز نہیں چھو گئی؟

نایک رام: بھیا مس صاحب نے تو میرے سامنے پتھر لڑھکا دیا۔ بات تو سچی ہے کہ جب عورت اتنی بری مصیبت ہے تو مرد کیوں اس کے پیچھے حیران رہتے ہیں؟ ایک کی درد سا دیکھ کر دوسرا کیوں نہیں سیکھتا؟ بولو بھیا ہے کچھ جواب؟

ونے: جواب کیوں نہیں ہے ۔ ایک تو تمھیں نے میری درد سا سے سیکھ لیا۔ تمھاری طرح اور بھی کتنے ہی پڑے ہوں گے۔

نایک رام (ہنس کر) بھیا تم نے پھر میرے ہی سرڈال دیا یہ تو کچھ ٹھیک جواب نہ بن پڑا۔

ونے: ٹھیک وہی ہے جو تم نے آتے ہی آتے کہا تھا کہ عورت کا مایا جال بڑا کٹھن ہے۔

انسان فطرتاً تفریح پسند ہے ۔ایسے رنج کے وقت بھی اسے ہنسی سوجھتی ہے۔ پھانسی پر چڑھنے والے لوگ بھی ہنستے دیکھے گئے ہیں۔ یہاں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ مسٹر کلارک گھوڑا اچھالتے اورآدمیوں کو کچلتے ہوئے وہاں آپہنچے۔ صوفیہ پر نگاہ پڑی تیر سا

لگا۔ ٹوپی اوپراٹھا کر بولے یہ وہی ناٹک ہے یا کوئی دوسرا شروع کردیا؟

نشتر سے بھی تیز اور پتھر سے بھی سخت۔ یہ بے دردانہ جملہ تھا۔ مسٹر کلارک نے اپنی دلی مایوسی۔ اپنے رنج اپنی بے اعتقادی اپنے غصہ کو ان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔

صوفیہ نے بر جستہ جواب دیا۔ نہیں بالکل نیا۔ اُس وقت جو دوست تھے وہی اب دشمن ہیں۔

کلارک طنز کو سمجھ کر تلملا اٹھے بولے یہ تمھاری بے انصافی ہے میں اپنے اصول سے ذرا بھی منحرف نہیں ہوا۔

صوفیہ: کسی کو ایک بار پناہ دینا اور دوسری بار تلوار اٹھانا کیا ایک ہی بات ہے؟ جس اندھے کے لیے کل تم نے یہاں کے رؤسا کا مقابلہ کیا تھا۔ جس کے لیے بدنام ہوئے تھے۔ جس کا خمیازہ اٹھایا تھا۔ اسی اندھے پر تلوار چلانے کو آج راجپوتانہ سے دوڑے آئے ہو ۔کیا دونوں ایک ہی بات ہے؟

کلارک: ہاں مس سیوک۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں۔ اپنے ذاتی جذبات وخیالات پر عمل پیرا ہونے کے لیے نہیں۔ جہاز سے اترتے ہی ہم اپنی شخصیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ہمارے انصاف ہماری ہمدردی۔ ہمارا اخلاق سب کا ایک ہی مقصد ہے ۔ ہمارا اول اورآخر مقصد ہے حکومت کرنا۔

مسٹر کلارک کا اشارہ صوفیہ کی طرف اتنا نہیں جتنا ونے کی طرف تھا۔ وہ ونے کو کنایتاً دھمکا رہے تھے۔ صاف الفاظ میں ان کا مطلب یہی تھا کہ ہم کسی کے دوست نہیں ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں اور جو ہمارے کام میں مداخلت کرے گا اسے بیخ وبن سے اڑا دیں گے۔

صوفیہنے کہا: نامنصفانہ حکومت حکومت نہیں بلکہ جنگ ہے۔

کلارک: تم نے پھاوڑے کو پھاوڑا کہہ دیا۔ ہم میں اتنی شرافت نہیں۔ اچھا میں تم سے پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر انھوں نے گھوڑے کو مہمیز لگائی۔صوفیہ نے بلند لہجہ میں کہا۔ نہیں ہرگز نہ آنا۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔

آسمان ابرآلود ہو رہا تھا۔ شام سے پہلے شام ہوگئی تھی۔ مسٹر کلارک ابھی گئے تھے کہ مسٹر جان سیوک کا موٹر آپہنچا۔ وہ جیوں ہی موٹر سے اترے کہ سینکڑوں آدمی ان کی طرف لپکے۔ لوگ حکام سے دبتے ہیں۔ ان کی طاقت کا انھیں علم ہوتا ہے اور احساس بھی۔ جہاں اس طاقت کا خوف نہیں ہوتا وہاں وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ مسٹر سیوک پر حکام کی مہربانی تھی مگر وہ خود حاکم نہ تھے۔ وہ اپنی جان بچاکر گورکھوں کے کیمپ کی طرف بھاگے۔ سر پر پیر رکھ کر دوڑے مگر ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ مسٹر کلارک نے گھوڑے پر سے انھیں دوڑتے دیکھا تھا۔ انھیں گرتے دیکھا تو سمجھے کہ لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے فوراً گورکھوں کی ایک جماعت کو ان کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ مجمع نے بھی خطرناک صورت اختیار کی۔چوہے بلی لڑنے کو تیار ہو گئے۔ سورداس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ یہ ہل چل سنی تو خوفزدہ ہوکر بھیرو سے بولا۔ تم مجھے جرا اپنے کندھے پر بیٹھا لو۔ ایک بار اور لوگوں کو سمجھا دوں۔ کیوں لوگ یہاں سے ہٹ نہیں جاتے۔ سینکڑوں بار کہہ چکا۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔ کہیں گولی چل گئی تو آج اس دن سے بھی زیادہ کھون کھرابہ ہوگا۔

بھیروں نے سورداس کو کندھے پر بیٹھا لیا۔ اس مجمع سے اس کا سر بالشت بھر اُونچا ہوگیا۔ لوگ ادھر اُدھر سے اس کی باتیں سننے دوڑے۔ بہادروں کی پرستش کرنا عوام کا ذاتی خاصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندھا یونانی دیوتا اپنے عقیدت مندوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

سورداس نے اپنی بے نور آنکھوں سے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔ بھائیو۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھرجائیں۔ آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ گھر چلے جائیں۔ یہاں جمع ہوکر حاکم لوگوں کو کڑھانے سے کیا پھائدہ ؟ میری موت آوے گی تو آپ لوگ کھڑے رہیں گے اور میں مرجاؤں گا۔ موت نہ آوے گی تو میں توپوں کے منہ سے بچ کر نکل جاؤں گا۔ آپ لوگ اصل میں میری مدد کرنے نہیں آئے۔ مجھ سے دشمنی کرنے آئے ہیں۔ حاکموں کے من میں، پھوج کے من میں، پولیس کے من میں، جو دیا اور دھرم کا کھیال آتا۔ آپ لوگوں نے جمع ہوکر اس کھیال کو گسا بنادیاہے۔ میں حاکموں کو دکھا دیتا کہ ایک گریب اندھا آدمی پھوج کو کیسے پیچھا ہٹا دیتا ہے۔ توپ کا منہ کیسے

بند کر دیتا ہے۔ تلوار کی دھار کیسے موڑ دیتا ہے۔ میں دھرم کے بل پر لڑنا چاہتا تھا۔

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مسٹر کلارک نے اسے کھڑے ہوکر کچھ بولتے ہوئے سنا تو سمجھے کے اندھا لوگوں کو فساد کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک روح یہاں موجود رہے گی اعضاء کی حرکت کبھی بند نہ ہوگی۔ اس لیے روح کو جدا کر دینا ضروری ہے۔ منبع کو بند کر دینے سے چشمہ کی روانی خودبخود بند ہوجائے گی۔ وہ اسی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ اس خیال کو کسی طرح عمل میں تبدیل کریں۔ مگر سورداس کے گرد روز ہی آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ کلارک کو مناسب موقع نہ ملتا تھا۔ اب جو اس کے سر کو اوپراٹھا ہوا دیکھا تو انھیں وہ موقع مل گیا۔ وہ سنہرا موقع تھا جس کے ملنے پر ہی اس جنگ کا خاتمہ ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اسے وہ جانتے تھے۔ مجمع میں جوش پیدا ہوگا۔ وہ پتھر برسائے گا۔ گھروں میں آگ لگائے گا۔ سرکاری دفتروں کو لوٹے گا۔ ان شرارتوں کو مٹا دینے کے لیے ان کے پاس کافی طاقت تھی۔ اصل چیز تھی اندھے کو رزم گاہ سے ہٹادینا۔ یہی زندگی کا مرکز ہے۔ یہی حرکت دینے والی طاقت ہے۔ انھوں نے جیب سے پستول نکالا۔ اور سورداس پر فائر کر دیا۔ نشانہ بے خطا تھا۔ گولی سورداس کے کندھے میں لگی۔ سر لٹک گیا اور خون بہنے لگا۔ بھیرو اسے سنبھال نہ سکا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ روحانی طاقت مادی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکی۔

صوفیہ نے مسٹر کلارک کو جیب سے پستول نکالتے اور سورداس کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔ اس کو زمین پر گرتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ قاتل نے اپنا کام پورا کر دیا۔ فٹن پر کھڑی تھی۔ نیچے کود پڑی اور مقتل کی طرف دوڑی جیسے کوئی ماں اپنے بچہ کو کسی آنے والی گاڑی کی زد میں دیکھ کر بے تحاشا دوڑ پڑے۔ ونے اس کے پیچھے پیچھے اسے روکنے کے لیے دوڑے۔ وہ کہتے جاتے تھے۔ صوفیہ ایشور کے لیے وہاں نہ جاؤ۔ مجھ پر اتنا رحم کرو۔ دیکھو گورکھے بندوقیں سنبھال رہے ہیں۔ ہائے تم نہیں مانتیں یہ کہہ کر انھوں نے صوفیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن صوفیہ نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر دوڑی۔ اسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا۔ نہ گولیوں کا خوف تھا نہ سنگینوں کا۔ لوگ اسے دوڑتے دیکھ کر خودبخود راستہ سے ہٹتے جاتے۔ گورکھے سپاہی

سامنے کھڑے تھے۔ مگر صوفیہ کو دیکھ کر وہ بھی ہٹ گئے۔ مسٹر کلارک نے پہلے ہی سخت تاکید کر دی تھی کہ کوئی سپاہی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ونے اس فوجی دیوار کو پار نہ کر سکے۔ رقیق شے سوراخ کے راستہ نکل گئی مگر ٹھوس چیز نہ نکل سکی۔

صوفیہ نے جا کر دیکھا تو سورداس کے شانہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اعضاء سست پڑ گئے تھے۔ چہرہ بگڑ گیا تھا مگر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سکون، قناعت اور صبر کی چمک تھی۔ ان میں عفو تھا۔ غصہّ اور خوف کا نام نہ تھا۔ صوفیہ نے فوراً رومال نکال کر زخم پر باندھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ انھیں شفاخانہ بھیجنا چاہیے۔ ابھی جان ہے۔ ممکن ہے بچ جائیں۔ بھیرو نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ صوفیہ اسے اپنی گاڑی تک لائی اس پر سورداس کو لٹا دیا۔ خود گاڑی پر بیٹھ گئی۔ اور کونچوں کو شفا خانہ چلنے کا حکم دیا۔

مجمع مایوسی اور غصہّ سے دیوانہ ہوگیا۔ ہم بھی یہیں مر مٹیں گے! کسی کو یہ ہوش نہ رہا کہ یوں مر مٹنے سے اپنے سوائے دوسرے کا کیا نقصان ہوگی۔ بچہّ جلتا ہے تو جانتا ہے کہ ماں مجھے بچائے گی۔ یہاں کون ماں تھی جو اِن جلنے والوں کو حفاظت کرے۔ لیکن غصہّ میں دور اندیشی کے کواڑ بند ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا سمندر امنڈتا ہوا گورکھوں کی طرف چلا۔ موقع کے والنٹیر گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھر تے تھے لیکن ان کی فہمائش کا کسی پر اثر نہ ہوتا تھا۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اینٹ کنکر پتھر جمع کر رہے تھے۔ کھنڈروں میں ملبا کی کیا کمی۔ دیکھتے دیکھتے جگہ جگہ پتھروں کے انبار لگ گئے۔

ونے نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے آن واحد میں سینکڑوں جانوں پر بن جائے گی۔ فوراً ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر بولے۔ دوستوں یہ غصہّ کا موقع نہیں ہے۔ انتقام کا موقع نہیں ہے۔ بلکہ حق کی فتح پر خوشی اور جشن منانے کا موقع ہے۔

ایک آدمی: ارے یہ تو کنور ونے سنگھ ہیں۔

دوسرا: واقعی خوشی اور جشن منانے کا موقع۔ منایئے شادی مبارک ہو۔

تیسرا: جب میدان صاف ہوگیا تو آپ مردوں کی لاش پر آنسو بہانے آئے ہیں۔ جایئے

خواب گاہ میں مزے اڑائیے۔ یہ تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں۔
ونے: ہاں یہ خوشی منانے کا موقع ہے کہ اب بھی گری ہوئی پامال اور خستہ حال قوم میں اتنی عجیب روحانی طاقت ہے کہ ایک بے کس مجہول اندھا بھکاری طاقت ور حکام کا اتنی مردانگی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔
ایک آدمی نے طنز سے کہا ایک بے کس اندھا جو کچھ کر سکتا ہے وہ راجے بھی نہیں کر سکتے۔
دوسرا: محل کے بالاخانہ میں جاکر سوئیے۔ دیر ہو رہی ہے۔ ہم بدنصیبوں کو مرنے دیجیے۔
تیسرا: سرکار سے کتنا انعام ملنے والا ہے۔
چوتھا: آپ ہی نے تو راجپوتانہ دربار کی طرف ہوکر رعایا کو آگ میں جھوک دیا تھا۔
ونے: میری ملامت کا موقع پھر آئے گا۔ گرچہ میں چند خاص وجوہ سے ادھر آپ کا ساتھ نہ دے سکا مگر ایشور جانتا ہے کہ میری ہمدردی آپ ہی کے ساتھ تھی۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کی طرف سے غافل نہ تھا۔
ایک آدمی: یارو یہاں کھڑے کھڑے کیا بکواس کررہے ہو؟ کچھ دم ہو تو چلو کٹ مریں۔
دوسرا: یہ لکچر باجی کا موقع نہیں ہے۔ آج ہمیں دکھانا ہے کہ ہم حق کے لیے کتنی دلیری سے جان دے سکتے ہیں۔
تیسرا: چل کر گورکھوں کے سامنے کھڑے ہوجاؤ۔ کوئی شخص پیچھے قدم نہ ہٹاوے۔ وہی اپنی لاشوں کا ڈھیر لگا دو۔ بال بچّوں کو خدا پر چھوڑو۔
چوتھا: یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آگے بڑھ کر للکاریں کہ بزدلوں کا خون بھی جوش کھانے لگے۔ ہمیں سمجھانے چلے ہیں۔ گویا ہم دیکھتے ہی نہیں کہ سامنے فوج بندوقیں بھرے کھڑی ہے اور ایک ہی باڑھ میں ہمارا ستھراو کر دے گی۔
پانچواں: ہم غریبوں کی جان سستی ہوتی ہے۔ رئیس زادہ ہوتے تو ہم بھی دور ہی سے کھڑے تماشہ دیکھتے۔
یہ حقارت آمیز طنزیہ اور سخت الفاظ ونے کے دل میں تیر کی طرح اتر گئے۔

ہائے رے قسمت۔ میری زندگی بھر کی خدمت قربانی اور نفس کشی کا یہی نتیجہ ہے۔ اپنا سب کچھ قومی خدمت کی قربان گاہ پر چڑھا کر روٹیوں کو محتاج ہو جانے کا یہی صلہ ہے کیا ریاست کی بد نامی میرے سر سے کبھی نہ دور ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بھول گئے کہ" میں یہاں عوام کی حفاظت کرنے آیا ہوں۔ گورکھا فوج سامنے کھڑی ہے۔ میں یہاں سے ہٹا کہ ایک لمحہ میں انسانوں کا وحشیانہ قتل ہونے لگے گا۔ میرا خاص فرض عوام کو آخیر تک روکے رہنا ہے۔ کوئی مضایقہ نہیں اگر انھوں نے طعنے دیے۔ میری تحقیر کی۔ مجھے بدنام کیا۔ نا ملائم الفاظ کہے۔ میں قصور وار ہوں۔ اگر نہیں ہوں تو بھی مجھے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے یہ سبھی باتیں وہ بھول گئے۔ موقع شناس آدمی وقت کے موافق کام کرتا ہے۔ جہاں دبنا چاہیے وہاں دب جاتا ہے۔ جہاں تیز پڑنا چاہیے وہاں تیز پڑتا ہے۔ اسے عزت یا ذلت سے خوشی یا رنج نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہیں برابر اپنے مقصد پر رہتی ہے ۔وہ پر جوش ثابت قدمی کے ساتھ اسی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن سادہ مزاج غیرت مند اور صاف دل لوگ بادلوں کی مانند ہوتے ہیں جو بادِ موافق کو پاکر زمین کو سیراب کردیتے ہیں۔ اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے منتشر ہوجاتے ہیں۔ سیاست دان شخص کے لیے اپنا معیار ہی سب کچھ ہے۔ ضمیر کی اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں۔ باعزت آدمیوں کے لیے اپنی اخلاقی قوت ہی سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے اخلاق پر کیے گئے حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا اپنی معیار پسندی سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ونے کا خوبصورت چہرہ تمتما اٹھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ وہ دیوانہ وار متحرک مجمع کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور بولے۔ کیا آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رئیسوں کے بیٹے کیوں کر جان دیتے ہیں؟ دیکھئے۔

یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا۔ اس کی نال سینہ میں لگائی اور جب تک لوگ دوڑیں زینہ پر گر پڑے۔ لاش تڑپنے لگی۔ دل کی ساری تمنائیں خون کا فوآرہ بن کر نکل گئیں۔ اسی وقت بارش ہونے لگی گو یا جنت کی روحیں پھول برسارہی ہوتھیں۔

زندگی کا رشتہ کتنا نازک ہے! کیا پھول سے بھی زیادہ نازک نہیں۔ جو ہوا کے جھونکے سہتا ہے اور مرجھاتا نہیں؟ کیا وہ بیلوں سے زیادہ نازک نہیں جو درختوں

کے جھونکے سہتی اور ان سے لپٹی رہتی ہے؟ کیا وہ حباب آپ سے زیادہ نازک نہیں جو موجوں پر تیرتے ہیں اور ٹوٹتے نہیں؟ دنیا میں اور کون سی چیز اتنی ثبات ہے جس کے لیے ایک طنز ایک سخت لفظ بھی برداشت اور مہلک ہے! اس نازک بنیاد پر کتنے زبردست اور عالیشان محلوں کی تعمیر کی جاتی ہے۔

مجمع ششدر اور دم بخود رہ گیا جیسے آنکھوں اندھیرا چھاجائے۔ ان کا غصہ رحم کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ چاروں طرف سے دور دوڑ کر لوگ آنے لگے۔ونے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو پاک بنانے اور ان کی لاش پر چار بجا آنسو بہانے کے لیے جو دشمن کا فرض ہوتا ہے جو عیش پسند تھا وہی ایک لمحہ میں دیوتا کی طرح ایثار کا مجسمہ لوگ کا پیارا اور قوم کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ جو لوگ گورکھوں کے سامنے پہنچ گئے تھے وہ بھی واپس آئے۔ ہزاروں غمگین آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی جو قدرتی بارش سے مل کر زمین کو سیراب کرتی تھی۔ ہر دل فرط غم سے بے قرار تھا۔ ہر دل اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا ہر دل پشیمان ہو رہا تھا۔ آہ یہ ہمارے ہی طعنوں ہماری سخت کلامی کا نتیجہ ہے ہمیں اس کے قاتل ہیں۔اس کا خون ہماری ہی گردن پر ہے۔ ہائے کتنا بہادر، کتنا بردبار، کتنا متین، کتنا فراخدل، کتنا غیرت مند، کتنا خوددار، غریبوں کا کتنا سچا خدمت گزار اور انصاف کا کتنا سچا پجاری تھا۔ جس نے اتنی بڑی ریاست کو کچھ نہ سمجھا اور ہم کم ظرفوں نے اس کا خون کر ڈالا اسے نہ پہچان سکے۔

ایک نے روکر کہا۔ خدا کرے میری زبان جل جائے میں نے ہی شادی پر مبارک بادی کا طعنہ دیا۔

دوسرا بولا: واقعی میں اس کی لاش پر فدا ہو جاؤں اس پر نثار ہو جاؤں۔ اس کے قدموں پر گر کر قربان ہو جاؤں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر سے تلوار نکالی۔ اپنی گردن پر پھیر لی اور وہیں تڑپنے لگا۔

تیسرا سر پیٹتا ہوا بولا۔ کتنا پرجلال چہرہ ہے ہائے میں کیا جانتا تھا کہ میرا طنز بجلی کا کام کرے گا۔

چوتھا۔ ہمارے دلوں کا یہ زخم ہمیشہ ہرا رہے گا۔ ہم اس فرشتہ خصلت انسان کو کبھی نہ بھول سکیں گے۔ کتنی بہادری سے جان دے دی جیسے کوئی ایک پیسے نکال کر

بھکاری کے سامنے پھینک دے۔ رئیس زادوں میں یہی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ اگر جینا جانتے ہیں تو مرنا بھی جانتے ہیں۔ رئیس کی یہی پہچان ہے کہ بات پر مر مٹے۔

اندھیرا ہوتا جاتا تھا۔ پانی موسلادھار برس رہا تھا۔ کبھی ذرا دیر کے لیے بوندیں ہلکی پڑجاتیں اور پھر زوروں سے گرنے لگتیں۔ جیسے کوئی رونے والا تھک کر ذرا دم لے لے اور پھر رونے لگے۔ زمین نے پانی کی چادر میں منہ چھپالیا تھا۔ ماتا منہ پر آنچل ڈالے رورہی تھی۔ رہ رہ کر ٹوٹی ہوئی دیواروں کے گرنے کا دھماکا ہوتا تھا۔ جیسے کوئی سینہ پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہا ہو۔ لمحہ لمحہ پر بجلی گوندتی تھی جیسے آسمان پر روحیں ماتم کر رہی ہوں۔ دم کے دم میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اندو مسٹر جان سیوک کے ساتھ تھی۔ یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر گر پڑی۔

ونے کی لاش پر ایک چادر تان دی گئی۔ چراغوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اب بھی پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ دیکھنے والے آتے تھے۔ روتے تھے۔ اور عزاداروں کی صف میں کھڑے ہوجاتے تھے۔ کوئی کوئی پھولوں کی مالا رکھ دیتا تھا۔ جانباز لوگ یوں ہی مرتے ہیں تمنائیں ان کے گلے کی زنجیر نہیں ہوتیں۔ نفسانی خواہشات ان کے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں۔ انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میرے بعد کون ہنسے گا اور کون روئے گا۔ انھیں اس کا خوف نہیں ہوتا کہ میرے بعد کون سنبھالے گا؟ یہ سب دنیا سے لپٹنے والوں کے بہانے ہیں۔ بہادر لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ جب تک جیتے ہیں بے فکر سے جیتے ہیں۔ جب مرتے ہیں بے فکر سے مرتے ہیں۔

ہم داستانِ غم کو کیوں طول دیں؟ جب بیگانوں کی آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہ نکل پڑتی ہے تو یگانوں کا کہنا ہی کیا۔ نایک رام سورداس کے ساتھ شفاخانہ گئے تھے۔ لوٹے ہی تھے کہ یہ منظر دیکھائی دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر ونے کے قدموں پر سر رکھ دیا اور زار وقطار رونے لگے۔ ذرا طبعیت ٹھکانے ہوئی تو صوفیہ کو خبر دینے چلے جو ابھی شفا خانہ ہی میں تھی۔

نایک رام راستہ بھر دوڑتے ہوئے گئے مگر صوفیہ کے پاس پہنچے تو گلا اتنا بھر گیا کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کی طرف دیکھ کر سسک کر رونے لگے۔ صوفیہ کے دل میں درد سا اٹھا۔ ابھی نایک رام گئے اور الٹے پاؤں واپس آئے۔ ضرور کوئی

بری خبر ہے۔ پوچھا۔ کیا ہے پنڈا جی؟ یہ پوچھتے ہی اس کا گلا بھی بھر آیا۔

نا یک رام کی سسکیاں فریاد وفغاں میں تبدیل ہوگئیں۔ صوفیہ نے دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑا لیا اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا۔ کیا ونے؟ یہ کہتے کہتے فرط غم کی حالت میں شفا خانہ سے نکل پڑی اور پانڈے پور کی طرف چلی۔ نا یک رام آگے آگے لالٹین دکھاتے ہوئے چلے۔ پانی نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کے درخت جو اب پانی میں کھڑے تھے۔ سڑک کا پتہ دے رہے تھے۔ صوفیہ کا رنج ایک لمحہ میں پشیمانی کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ ہائے میں ہتیارن ہوں۔ کیوں آسمان سے بجلی گر کر مجھے جلا نہیں دیتی؟ کیوں کوئی سانپ زمین سے نکل کر مجھے ڈس نہیں لیتا؟ کیوں زمین پھٹ کر مجھے نگل نہیں جاتی۔ ہائے آج میں وہاں نہیں گئی ہوتی تو وہ ہر گز نہ جاتے میں کیا جانتی تھی کہ مقدر مجھے تباہی و بربادی کی طرف لیے جاتا ہے۔ میں دل میں ان پر جھنجھلا رہی تھی۔ مجھے یہی شک بھی ہورہا تھا کہ یہ ڈرتے ہیں۔ آہ یہ سب میرے کارن ہوا۔ میں ہی اپنی بربادی کا سبب ہوں۔ میں اپنے ہی ہاتھوں لٹ گئی۔ ہائے میں ان کی محبت کے معیار کو نہ پہنچ سکی۔

پھر اس کے دل میں خیال آیا کہیں یہ خبر غلط نہ ہو۔ انھیں صرف چوٹ لگی ہو اور وہ بے ہوش ہوگئے ہوں۔ آہ کاش میں ایک بار ان کی باتوں سے اپنے دل کو پاک بنالیتی۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہیں۔ ایشور مجھ پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے۔ میں نے کبھی کسی مخلوق کو ایزا نہیں پہنچائی۔ میں کبھی بد اعتقاد نہیں ہوئی۔ پھر وہ مجھے اتنی سخت سزا کیوں دے گا؟

جب صوفیہ موقع واردات کے قریب پہنچی تو اس پر ایک زبرست خوف کا غلبہ ہوا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک میل کے پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہاں کیسے جاؤں؟ کیسے انھیں دیکھوں گی؟ ان کی موت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ان کی لاش خاک وخون میں لپٹی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اسے اس نے گویا جیتے جاگتے دیکھا تھا۔ اسے اس بری حالت میں وہ کیسے دیکھے گی؟ اسے اس وقت زبردست خواہش ہوئی کہ وہاں جاتے ہی میں بھی ان کے قدموں پر گر کر جان دے دوں گی۔ اب دنیا میں میرے لیے کون سا آرام ہے۔ ہائے یہ صبر آزما جدائی کیسے برداشت ہوگی؟ میں نے

اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ ایسے اعلیٰ آدمی کو مذہب کی وحشیانہ نمونہ پر قربان کردیا۔

اگرچہ وہ جانتی تھی کہ ونے کا انتقال ہوگیا۔ پھر بھی اسے ایک چھوٹی امید ہورہی تھی کہ کون جانے انھیں صرف غش آگیا ہو۔ دفعتاً اسے عقب سے ایک موٹر کار پانی کو چیرتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اس کی تیز روشنی میں پھٹا ہوا پانی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دونوں طرف سے آبی جانور اس پر حملہ کر رہے ہوں۔ وہ نزدیک آکر رکا۔ رانی جانھوی تھیں۔ صوفیہ کو دیکھ کر بولیں۔ بیٹی تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ آؤ میرے ساتھ چلو۔ کیا گاڑی نہ ملی؟

صوفیہ چیخ مارکر رانی سے لپٹ گئی مگر ان کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور نہ چہرہ پر آثارغم۔ ان کی آنکھوں میں غرور کا نشہ چھا رہا تھا اور چہرہ پر فاتحانہ مسرت کی نمودار تھی۔ صوفیہ کو گلے سے لگاتی ہوئی بولیں۔ کیوں روتی ہو بیٹی؟ ونے کے لیے؟ یہاں بہادروں کی موت پے آنسو نہیں بہائے جاتے، خوشی کا راگ گایا جاتا ہے۔ میرے پاس ہیرے جواہرات ہوتے تو اس کی لاش پر لٹا دیتی۔ مجھے اس کے مرنے کا غم نہیں ہے۔ غم ہوتا اگر وہ آج جان بچاکر بھاگتا۔ وہ تو میری دیرینہ خواہش تھی۔ نہایت دیرینہ۔ جب میں نوجوان تھی اور بہادر راجپوتوں اور رجپوتنیوں کی قربانی کی داستانیں پڑھا کرتی تھی۔ اسی وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی سپوت دیتا جو انھیں جانبازوں کی طرح موت سے کھیلتا، جو اپنی زندگی کوملک وقوم کی خدمت میں قربان کر دیتا۔ جو اپنے خاندان کا نام روشن کرتا۔ میری وہ خواہش پوری ہوگئی۔ آج میں ایک جاندار بیٹے کی ماں ہوں۔ کیوں روتی ہو؟ اس سے اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔ تم نے تو مذہبی کتابیں پڑھی ہیں۔ انسان کبھی مرتا ہے؟ روح تو غیرفانی ہے۔ اسے تو ایشور بھی فنا نہیں کر سکتا۔ موت تو صرف نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ایک بلند تر زندگی کا راستہ۔ ونے پھردنیا میں آئے گا۔ وہ اور زیادہ نیک نام ہوگا۔ جس موت پر گھر والے روئیں وہ بھی کوئی موت ہے۔ وہ تو ایڑیاں رگڑنا ہے۔ شاندار موت وہی ہے جس پر بیگانے روئیں اور یگانے خوشی منائیں۔ شاندار موت شاندار زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ شاندار زندگی میں بدنام ہوکر مرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاندار موت میں یہ اندیشہ کہاں؟ کوئی زندگی شاندار نہیں ہے جب تک کہ اس کا انجام بھی ویسا ہی

نہ ہو۔ یہ لو پہنچ گئے۔ کتنے زور کی بارش ہے۔ کیسا گھٹا ٹوپ اندھرا ہے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی اس کی لاش پر آنسو بہار ہے ہیں۔ کیا یہ رونے کا مقام ہے؟

موٹر رکا۔ صوفیہ اور جاہنوی کو دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ اندو دوڑکر ماں سے لپٹ گئی۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو گر نے لگے۔ رانی ونے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اسے سینہ سے لگا یا۔ اس کا بوسہ لیا اور ماتمی مجمع کی طرف فخر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ یہ نوجوان جس نے ونے پر اپنی جان نچھاور کردی۔ ونے سے بڑھ کر ہے۔ کیا کہا؟ مسلمان ہے! فرض کے دائرے میں ہندومسلمان کا فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ ڈوبیں گے تو دونوں، بچیں گے تو دونوں۔ میں اس بہادور شخص کا یہیں مزار بنواؤں گی۔ شہید کے مزار کو کون کھود کر پھینک دے گا؟ کون اتنا سفلہ اور کمینہ ہوگا؟ یہ سچّا شہید تھا۔ تم لوگ کیوں روتے ہو؟ ونے کے لیے۔ تم لوگوں میں کتنے ہی نوجوان ہیں کتنے ہی بال بچّوں والے ہیں۔ نوجوانوں سے میں کہوں گی۔ جاؤ اور ونے کی طرح قربان ہونا سکھو۔ دنیا صرف پیٹ پالنے کی جگہ نہیں ہے۔ ملک کی آنکھیں تمھاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ تمھیں اس کا بیڑا پار لگاؤ گے۔ گرہستی کے جال میں نہ پھنسو۔ جب تک ملک کا کچھ کام نہ کر لو۔ دیکھو ونے کیا ہنس رہا ہے۔ جب بچہ تھا اس وقت کی یاد آتی ہے۔ اسی طرح ہنستا تھا۔ کبھی اسے روتے نہیں دیکھا۔ کتنی عجیب ہنسی ہے۔ کیا اس نے دولت کے لیے جان دی ہے؟ دولت اس کے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ اس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر ؔی نہیں دیکھا۔ برسوں ہوگئے پلنگ پر نہیں سویا۔ جوتے نہیں پہنے۔ پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھو اس کے پیروں میں کیسے گھیٹے پڑ گئے ہیں۔ وہ سادھو تھا۔تم لوگ بھی ایسے ہی سادھو بن جاؤ۔ بال بچے والوں سے میری التجا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کو چکی کا بیل نہ بناؤ۔ خانہ داری کا غلام نہ بناؤ۔ ایسی تعلیم دو کہ زندہ رہیں۔ زندگی کے غلام بن کر نہیں بلکہ زندگی کے مالک بن کر۔ یہی تعلیم ہے جو اس سرفروش نے تمھیں دی ہے۔ جانتے ہو اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہی پیاری لڑکی میری بہو بننے والی تھی کسی نے ایسا دلکش حسن ایسا روحانی جلوہ دیکھا ہے؟ رانیاں اس کے آگے پانی بھریں۔ علم میںاس کے سامنے کوئی پنڈت منہ نہیں کھول سکتا۔ زبان پر سرسوتی ہے گھر کا اجالا ہے۔ ونے کو اس سے

کتنی محبت تھی یہ اسی سے پوچھو لیکن کیا ہوا؟ جب موقع آیا تو اس نے محبت کے رشتہ کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا۔ اسے اپنی توہین کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اس پر اپنے مقصد کو قربان نہیں کیا۔ پیارو پیٹ پر اپنی جوانی کو اپنی روح کو اپنی امنگوں کو نہ قربان کرو۔ اندو تم کیوں روتی ہو؟ کس کو ایسا بھائی ملا ہے؟

اندو کے دل میں بڑی دیر سے آگ سی جل رہی تھی۔ وہ ان سارے دکھوں کا اصلی سبب اپنے شوہر کو سمجھتی تھی۔ اب تک آگ دل میں تھی اب باہر نکل پڑی یہ خیال نہ رہا کہ میں اتنے آدمیوں کے سامنے کیا کہتی ہوں؟ جواز کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ ماتا جی اس خون کا الزام میرے سر ہے۔ میں اب اس شخص کا منہ نہ دیکھوں گی جس نے میرے دلاور بھائی کی جان لے کے چھوڑی اور یہ صرف اپنی خود غرضی کو پورا کرنے کے لیے۔

رانی جانھوی نے تیز لہجہ میں کہا۔ کیا مہیندر کو کہتی ہے؟ اگر پھر میرے سامنے منہ سے ایسی بات نکالی تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیا تو انھیں اپنا غلام بنا کر رکھے گی؟ تو عورت ہو کر چاہتی ہے کہ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے تو وہ مرد ہو کر کیوں نہ ایسا چاہیں؟ وہ دنیا کو کیوں تیری ہی آنکھوں سے دیکھیں؟ کیا بھگوان نے انھیں عقل نہیں دی۔ تیری سمجھ میں اور میری سمجھ میں اور یہاں جو لوگ ہیں ان کی سمجھ میں وہی راستہ اچھا ہے۔ جس پر وہ چل رہے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں وہ راستہ خطرناک ہے۔ دردوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا برا ماننا کیا؟ اگر تجھے ان کی باتیں پسند نہیں آتیں تو کوشش کر کہ پسند آئیں۔ وہ تیرے سوامی ہیں۔ تیرے لیے ان کی خدمت سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔

دس بج گئے تھے۔ لوگ کنور بھرت سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب دس کے گھنٹہ کی آواز کانوں میں آئی تو رانی جانھوی نے کہا۔ ان کی راہ نہ دیکھو وہ نہ آئیں گے اور نہ آسکتے ہیں۔ وہ ان باپوں میں سے ہیں، جو بیٹے کے لیے جیتے ہیں اور بیٹے کے لیے مرتے ہیں۔اور بیٹے کے بیٹوں کے لیے منصوبے باندھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہوگا۔ تمام دنیا سونی معلوم ہوتی ہوگی۔ بے ہوش پڑے ہوں گے۔ ممکن ہے مر بھی گئے ہوں۔ ان کا مذہب ان کا فرض ان کی زندگی ان کی موت ان کا

دین ان کی دنیا سبھی کا انحصار اسی اکلوتے بیٹے پر تھا۔ اب وہ بے سہارا ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد کوئی معیار نہیں۔ وہ اب ہرگز نہ آئیں گے۔ آہی نہیں سکتے۔ چلو ونے کے ساتھ اپنا آخری فرض پورا کر لوں۔ انھیں ہاتھوں سے اسے چتا پر رکھ دوں۔ انھیں ہاتھوں سے اسے کھانا کھلاتی تھی۔ انھیں ہاتھوں سے اسے گنگا جل پلا دوں۔

(44)

گنگا سے لوٹتے لوٹتے دن کے نو بج گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم، گلیاں تنگ اور کیچڑ سے بھری ہوئیں قدم قدم پر پھولوں کی بارش۔ والنٹیروں کے قومی گانے۔ گنگا تک پہنچتے ہی پہنچتے سویرا ہو گیا تھا۔ لوٹتے ہوئے جانہوی نے کہا۔ چلوذرا سورداس کو دیکھتے چلیں۔ نہ جانے مرا کہ بچا۔ سنتی ہوں۔ زخم کاری تھا۔

صوفیہ اور جانہوی دونوں شفا خانہ گئیں تو دیکھا کہ سورداس برآمدہ میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ بھیرو اس کے پائنتے کھڑا ہے۔ اور سبھاگی سرہانے بیٹھی پنکھا جھیل رہی ہے۔ جانہوی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس کی حالت کیسی ہے؟ بچنے کی کوئی امید ہے۔

ڈاکٹر نے کہا کسی دوسرے آدمی کو ایسا زخم لگا ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اس کی قوت برداشت حیرت انگیز ہے۔ دوسروں کو نشتر لگاتے وقت کلوروفارم دینا پڑتا ہے۔ اس کے کندھے میں دو انچ گہرا اور دو انچ چوڑا نشتر دیا گیا پر اس نے کلوروفارم نہ لیا۔ گولی نکل آئی ہے۔ مگر بچ جائے تو کہیں۔

صوفیہ کو رات بھر کی سخت روحانی تکلیف نے اتنا گھلا دیا تھا کہ اس پہچاننا مشکل تھا۔ گویا کوئی پھول مرجھا گیا ہو۔ چال سست چہرہ اترا ہوا۔ آنکھیں بجھی ہوئیں گویا مادی دنیا میں نہیں بلکہ خیالی دنیا میں حرکت کر رہی ہے۔ آنکھوں کو جتنا رونا تھا روچکی تھیں۔ اب اس کا بال بال رورہا تھا۔ اس نے سورداس کے پاس جا کر کہا۔ سورداس، کیسا جی ہے؟ رانی جانہونی آئی ہیں۔

سورداس: دھنیہ بھاگ۔ اچھا ہوں۔

جانہوی: درد بہت ہو رہا ہے۔ بہت تکلیف ہے؟

سورداس: کچھ تکلیف نہیں ہے۔ کھیلتے کھیلتے گر پڑا ہوں۔ چوٹ آگئی ہے۔ اچھا ہو

جاؤں گا۔ ادھر کیا ہوا؟ جھونپڑی بچی کہ گئی؟

صوفیہ: ابھی تو نہیں گئی ہے۔ پر شاید اب نہ رہے۔ ہم لوگ تو ونے کو گنگا کی گود میں سونپے چلے آتے ہیں۔

سورداس نے کمزور آواز میں کہا۔ بھگوان کی مرضی۔ بیروں کا یہی دھرم ہے۔ جو غریبوں کے لیے جان دیتا ہے وہی سچا بیر ہے۔

جانہوی: تم سادھو ہو۔ ایشور سے دعا کرو کہ ونے کا پھر اسی دیش میں جنم ہو۔

سورداس: ایسا ہی ہوگا ماتا جی ایسا ہی ہوگا۔ اب مہمان پرس (بڑلوگ) ہمارے ہی دیس میں جنم لیں گے۔ جہاں انیائے اور ادھرم ہوتا ہے وہیں دیوتا لوگ جاتے ہیں۔ ان کے سنسکار انھیں کھینچ لے جاتے ہیں۔ میرا من کہہ رہاہے کہ کوئی مہاتما تھوڑے ہی دنوں میں اس دیس میں جنم لینے والے ہیں۔

ڈاکٹر نے آکر کہا۔ رانی جی میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ سورداس سے باتیں نہ کریں۔ ورنہ زور پڑنے سے ان کی حالت بگڑ جائے گی۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ خیال اس امر کا ہونا چاہیئے کہ مریض کی طاقت زائل نہ ہو۔ اسے ضعف نہ آنے پائے۔

شفاخانہ کے مریضوں کو جب یہ پتہ لگا کہ ونے سنگھ کی ماں آئی ہوئی ہیں تو سب ان کی زیارت میں جمع ہوگئے۔ کتنوں ہی نے ان کے قدموں کی خاک ماتھے پر چڑھائی۔ یہ دیکھ کر رانی کا دل غرور سے پھول گیا۔ ہنستے ہوئے سبوں کو دعائیں دے کر یہاں سے جانے لگیں تو صوفیہ نے کہا۔ ماتا جی۔ آپ کی اجازت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں۔ سورداس کی حالت خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں وہ مجذوبیت ہے جو موت کی خبر دے رہی ہے۔ میں نے اسے ہوش میں ایسی باتیں کرتے کبھی نہیں سنا۔ رانی صوفیہ کو گلے لگا کر بخوشی اجازت دی۔ دراصل صوفیہ سیوابھون (ونے کا مکان) نہ جانا چاہتی تھی۔ وہاں کی ایک ایک چیز وہاں کے پھول پتے حتیٰ کہ وہاں کی ہوا بھی ونے کی یاد دلائے گی۔ جس گھر میں ونے کے ساتھ رہی اس میں ونے کے بغیر رہنے کا خیال ہی اسے تڑپائے دیتا تھا۔

رانی کے چلے جانے پر صوفیہ ایک مونڈھا لے کو سورداس کی چارپائی کے پاس

بیٹھ گئی۔ سورداس کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ پر ایک دلآویز سکون چھایا ہوا تھا۔ صوفیہ کو آج معلوم ہوا کہ دل کا سکون ہی اصلی حسن ہے۔

صوفیہ کو وہاں بیٹھے بیٹھے سارا دن گزر گیا۔ وہ بے آب ودانہ اُداس بیٹھی ہوئی گزری ہوئی خوشی کی باتوں کا خواب دیکھ رہی تھی اور جب آنکھیں بھر جاتی تھیں تو آڑ میں جا کر رومال سے آنسو پونچھ آتی تھی۔ اسے اب سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ میں نے ونے کی کوئی آرزو نہ پوری کی۔ انھیں ہمیشہ محروم ہی رکھا۔ ان کی محبت کی یاد اس کے دل کو ایسا مسوس رہی تھی کہ وہ بہت ہی مضطرب و بے قرار تھی۔ شام ہوگئی تھی صوفیہ لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی سورداس کو خداوند یسوع کے سوانح حالات سنا رہی تھی۔ سورداس ایسا محو ہورہا تھا گویا اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ دفعتاً راجہ مہیند کمار آ کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے صوفیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیہ جیوں کی تیوں بیٹھی رہی۔ اس نے راجہ صاحب سے ہاتھ نہ ملایا۔

سورداس: کون ہے۔ مس صاحب؟

صوفیہ: راجہ مہیند کمار ہیں۔

سورداس نے تعظیماً اٹھنا چاہا مگر صوفیہ نے لٹا دیا اور کہا۔ ہلومت ورنہ زخم کھل جائے گا۔ آرام سے پڑے رہو۔

سورداس: راجہ صاحب آئے ہیں ان کا اتنا آدر بھی نہ کروں؟ میرے ایسے بھاگ تو ہوئے۔ کچھ بیٹھنے کو ہے؟

صوفیہ: کرسی پر بیٹھ گئے ہیں۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ سورداس۔ کیسا جی ہے؟

سورداس: بھگوان کی دیا ہے۔

راجہ صاحب جن باتوں کو ظاہر کرنے یہاں آئے تھے انھیں صوفیہ کے سامنے زبان پر لاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر بولے۔ سورداس میں تم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی زندگی کو تمھاری زندگی سے بدل لیتا۔

سورداس: سرکار ایسی بات نہ کہئے۔ آپ راجا ہیں۔ میں بھیکاری ہوں۔آپ نے جو

کچھ کیا۔ دوسروں کے لیے کیا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا دھرم سمجھ کر کیا۔ میرے کارن آپ کو اپجس ملا۔ کتنے گھر ناس ہوئے یہاں تک کہ اندردت اور کنور ونے سنگھ جیسے دوانمول رتن ہاتھ سے کھوگئے۔ پر اپنا کیا بس ہے ہم تو کھیل کھیلتے ہیں۔ جیت ہار بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جیسا ٹھیک سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ بس اپنی نیت ٹھیک ہونی چاہیے۔

راجہ: سورداس نیت کو کون دیکھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی پر ہی نگاہ رکھی، پر آج تمام شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے کمینہ خود غرض بے ایمان اور گناہ گار نہ سمجھتا ہو۔ اور تو کیا۔ میری بیوی بھی مجھ سے نفرت کر رہی ہے۔ ایسی باتوں سے دل کیوں نہ اداس ہوجائے؟ کیوں نہ دنیا سے نفرت ہو جائے؟ میں تو اب کہیں منہ دکھانے لائق نہیں رہا۔

سورداس: اس کی چنتا نہ کیجئے۔ پھائدہ۔ نکسان جینا مرنا۔ نیک نامی بدنامی سب تکدیر کے ہاتھ ہے۔ ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ سبھی کھلاڑی من لگا کر کھیلتے ہیں۔ سبھی چاہتے ہیں کہ ہماری جیت ہو۔ پر جیت تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا اس سے ہارنے والے ہمت ہارجاتے ہیں؟ وہ پھر کھیلتے ہیں۔ پھر ہار جاتے ہیں۔ تو پھر کھیلتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو ان کی جیت ہوتی ہے۔ جو آج آپ کو برا سمجھ رہے ہیں وہی کل آپ کے سامنے سرجھکائیں گے۔ ہاں نیت ٹھیک رہنی چاہیے۔ مجھے کیا ان کے گھر والے برا نہ کہتے ہوں گے جو میرے کارن جان سے گئے۔ اندردت اور کنور ونے سنگھ جیسے دولعل جن کے ہاتھوں سنسار کا کتنا اپکار ہوتا سنسار سے اٹھ گئے۔ جس اپجس (نیک نامی بدنامی) بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا یہاں کیا بس ہے؟

راجہ: آہ سورداس۔ تمھیں نہیں معلوم کے میں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ تمھیں برا کہنے والے اگر دس پانچ ہوں گے تو تمھارا جس گانے والے بہت ہیں۔ یہاں تک کہ حکام بھی تمھارے صبر، تمھاری مضبوطی کی تعریف کررہے ہیں۔ میں تو دونوں طرف سے گیا۔ رعایا اور سرکار دونوں سے باغی ہوا۔ حکام اس ساری گڑبڑ کا الزام میرے سرتھوپ رہے ہیں۔ ان کی سمجھ میں بھی میں نالائق، کوتاہ اندیش اور خود غرض ہوں۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔

سورداس: نہیں نہیں۔ راجہ صاحب۔ نراس ہونا کھلاڑیوں کا دھرم نہیں ہے۔ اب کے ہار ہوئی تو پھر کبھی جیت ہوگی۔

راجہ: مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ پھر کبھی میری عزّت ہوگی مِس سیوک آپ میری کمزوری پر ہنس رہی ہوں گی۔ پر میں بہت ہی دکھی ہوں۔

صوفیہ نے بے اعتباری کے لہجہ میں کہا۔ عوام کے مزاج میں عفو کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اگر اب بھی آپ عوام کو یہ دکھا سکیں کہ اس حادثہ پر آپ کو دلی افسوس ہے تو شاید وہ آپ کی پھر عزّت کرنے لگیں۔

راجہ نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ سورداس بول اٹھا۔ سرکار نیک نامی اور بدنامی بہت سے لوگوں کے گل مچانے سے نہیں ہوتی۔ سچّی نیک نامی اپنے من میں ہوتی ہے۔ اگر اپنا من بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہی مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے سوا کچھ اور کرنا مجھے اُچت نہ تھا۔ تو وہی نیک نامی ہے۔ اگر آپ کو اس مار کاٹ پر دکھ ہے تو آپ کا دھرم کہ لاٹ صاحب سے اس کی لکھا پڑھی کریں۔ وہ نہ سنیں تو جو ان سے بڑا حاکم ہو اس سے کہیں اور جب تک سرکار پرجا کے ساتھ نیائے نہ کرے دم نہ لیں۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہی آپ کا دھرم تھا۔ اپنے سوارتھ کے لیے آپ نے کوئی بات نہیں کی۔ تو آپ کو تنک بھی دکھ نہ کرنا چاہیے۔

صوفیہ نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ سرکار کے طرفداروں کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان میں خود غرضی کا شائبہ نہیں ہے۔

راجہ: مِس سیوک۔ میں آپ کو صدق دلی سے یقین دلاتا ہوں کہ میں نے حکّام کے ہاتھوں عزت و وقار پانے کے لیے ان کی طرفداری نہیں کی اور عہدہ کا لالچ تو مجھے کبھی نہیں رہا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی بات تھی جس نے مجھے سرکار کی طرف کھینچا۔ ممکن ہے۔ نقصان کا خوف ہو یا صرف خوشامد۔ پر میری کوئی غرض نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے اس جماعت کی نکتہ چینیوں اس کے پوشیدہ حملوں یا اس کی طعنہ زنیوں سے ڈرکر ایسا کیا ہو۔ میں خود ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سرکار سے موافقت رکھ کر رعایا کی جتنی بھلائی کر سکتا ہوں۔ اتنی سرکار سے مخالفت رکھ کر نہیں کر سکتا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ وہاں بھلائی ہونے کی جتنی امید ہے اس سے کہیں زیادہ خوف برائی

ہونے کا ہے۔ عزّت و نیک نامی کا راستہ وہی ہے جسے سورداس نے اختیار کیا۔ سورداس دعا کرو کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ پر چلنے کی سکت دیں۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ سورداس نیند میں غافل تھا۔ اتنی باتیں کرنے سے وہ تھک گیا تھا۔ سبھاگی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لیے ہوئے آئی اور سورداس کے پائنتے بچھا کر پڑی رہی۔ شفاخانہ کے ملازمین چلے گئے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیہ گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ دس بجے ہوں گے۔ رانی جی شاید گاڑی بھیجنا بھول گئیں۔ انھوں نے شام ہی کو گاڑی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیسے جاؤں؟ کیا ہرج ہے۔ یہیں بیٹھی رہوں؟ وہاں رونے کے سوا اور کیا کروں گی۔ آہ میں نے ونے کو تباہ کر دیا۔ میرے ہی سبب سے وہ دوبار فرض کے راستہ سے منحرف ہوئے۔ میرے ہی سبب سے بالآخر آج ان کی جان پر بنی! اب اس موہنی مورت کو دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ ہم پھر ملیں گے پر نہیں جانتی کہ کب؟

اسے وہ دن یاد آگئے۔ جب پھولوں کے گاؤں میں اس وقت وہ دروازہ پر بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کیا کرتی تھی اور وہ کمبل اُڑھے ننگے سر، ننگے پیر، ہاتھ میں ایک لکڑی لیے آتے تھے۔ اور مسکرا کر پوچھتے تھے کہ مجھے دیر تو نہیں ہوگئی؟ وہ دن یاد آیا جب راجپوتانہ جاتے وقت ونے نے اس کی طرف بے قرار اور مایوس نگاہوں سے دیکھا تھا۔ آہ وہ دن یاد آیا جب اس کی طرف دیکھنے پر رانی جی نے انھیں تیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اوروہ سر جھکائے باہر چلے گئے تھے۔ صوفیہ رنج سے بے چین ہوگئی جیسے ہوا کے جھونکے زمین پر پڑی ہوئی گرد کو اوپر اٹھا دیتے ہیں۔ اُسی طرح اس خاموش رات نے اس کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس کا دل ہی سراپا یاد بن گیا۔ وہ بے قرار ہوکر کرسی سے اُٹھی اور ٹہلنے لگی۔ جی نہ جانے کیا چاہتا تھا۔ کہیں اُڑ جاؤں۔ مرجاؤں۔ کمبخت دل کو کہاں تک سمجھاؤں؟ کہاں تک صبر کروں؟ اب نہ سمجھاوں گی۔ روؤں گی تڑپوں گی۔ خوب جی بھر کر، وہ مجھ پر جان نچھاور کرتا تھا۔ دنیا سے اُٹھ جائے اور میں اپنے کو سمجھاؤں کہ اب رونے سے کیا ہوگا! میں روؤں گی اتنا روؤں گی کہ آنکھ پھوٹ جائیں گی۔ لہو خون ہوکر آنکھوں کے راستہ نکلے گا اور گلا بیٹھ جائے گا۔ آنکھوں کا اب کرنا ہی کیا ہے؟ وہ اب کسے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ دل بھی اب متحرک ہوکر کیا

کرے گا۔

اتنے میں کسی کی آہٹ سنائی دی۔ مٹھو، اور بھیرو بر آمدہ میں آئے مٹھوانے صوفیہ کو سلام کیا اور سورداس کی چارپائی کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ سورداس نے چونک کر پوچھا کون ہے بھیرو۔

مٹھوا : دادا میں ہوں۔

سورداس: بہت اچھے آئے بیٹا۔ تم سے بھینٹ ہوگئی اتنی دیر کیوں ہوئی؟

مٹھوا: کیا کروں دادا؟ بڑے بابو سے سانجھ سے چھٹی مانگ رہاتھا۔ مگر ایک نہ ایک کام لگا دیتے تھے۔ ڈاؤن نمبر تھری کو نکالا۔ اب نمبر ون کو نکالا۔ پھر پارسل گاڑی آئی تو اس پر مال لدوایا۔ ڈاؤن نمبر تھری کو نکال کر تب آ پایا ہوں۔ اس سے تو کلی تھا تبھی اچھا تھا کہ جب جی چاہتا تھا جاتا تھا۔ کوئی روکنے والا نہ تھا۔ نہیں تو اب نہانے کھانے کی چھٹی نہیں ملتی۔ بابو لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ کسی کو نوکر رکھنے کی سائی تو ہے نہیں سینت میت میں کام نکالتے ہیں۔

سورداس: میں نہ بلاتا تو تم اب بھی نہ آتے۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اندھا آدمی ہے نہ جانے کیسے ہوگا۔ چل کر جرا حال احوال پوچھتا آؤں۔ تم کو اس لیے بلایا ہے کہ مرجاؤں تو میرے کریا کرم کرنا۔ اپنے ہاتھوں سے پنڈا دینا برادری کو بھوج دینا۔ اور ہوسکے تو گیا کر آنا۔ بولو اتنا کروگے؟

بھیرو: بھیا تم اس کی چنتا نہ کرو۔ تمھارا کریا کرم اتنی دھوم دھام سے ہوگا کہ برادری میں کبھی کسی کا نہ ہوگا۔

سورداس: دھوم دھام سے نام تو ہوگا۔ پر مجھے پہنچے گا تو وہی جو مٹھوا دے گا۔

مٹھوا: دادا۔ میری ننگا جھوری لے لو۔ جو میرے پاس دھیلا بھی ہو۔ کھاتے بھر کو تو ہوتا ہی نہیں۔ بچے گا کیا۔

سورداس: ارے تو کیا تم میرا کریا کرم بھی نہ کروگے؟

مٹھوا: کیسے کروں گا۔ دادا؟ کچھ پلّے پاس ہو تب نا۔

سورداس: تو تم نے یہ آسا بھی توڑدی۔ میرے بھاگ میں تمھاری کمائی نہ جیتے جی بدی تھی نہ مرنے کے پیچھے۔

مٹھوا: دادا۔ اب منہ نہ کھلواؤ۔ پردہ ڈکا رہنے دو مجھے چوپٹ کرکے مرے جاتے ہو۔ اس پر کہتے ہو۔ میرا کریا کرم کر دینا۔ گیا پراگ کردینا۔ ہماری دس بیگھے موروثی زمین تھی کہ نہیں؟ اس کا ماوجہ دو پیسے چار پیسے کچھ تم کو ملا کہ نہیں؟ اس میں سے میرے ہاتھ کیا لگا؟ گھر میں بھی میرا کچھ حصہّ ہوتا ہے یا نہیں۔ حاکموں سے بیر نہ ٹھانتے تو اس گھر کے سو ۱۰۰ سے کم نہ ملتے۔ پنڈا جی نے کیسے پانچ ہزار مار لیے؟ ہے ان کا گھر پانچ ہجار کا؟ درواجے پر میرے ہاتھوں کے لگائے دو نیم کے پیڑ تھے۔ کیا وہ پانچ پانچ روپے میں بھی مہگے تھے؟ مجھے تو تم نے ملیا میٹ کردیا۔ کہیں کا نہ رکھا۔ دنیا بھر کے لیے اچھے ہوگے۔ میری گردن پر تو تم نے چھری پھیردی۔ مجھے تو حلال کر ڈالا۔ مجھے بھی تو ابھی بیاہ لگائی کرنی ہے۔ گھر دوار بنوانا ہے۔ کریا کرم کرنے بیٹھوں تو اس کے لیے کہاں سے روپے لاؤں؟ کمائی میں تمھارے سک نہیں۔ مگر کچھ اڑایا کچھ جلایا۔ اب مجھے بنا چھاہنہ کے چھوڑے چلے جاتے ہو۔ بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ اب تک میں چپ تھا۔ نابالگ تھا۔ اب تو میرے بھی ہاتھ پاؤں ہوئے۔ دیکھتا ہوں کہ میری جمین کا ماوجہ کیسے نہیں ملتا! صاحب لکھ پتی ہوں گے تو اپنے گھر میں ہوں گے۔ میرے حصہّ کیسے دبا لیں گے۔ گھر میں بھی میرا حصہّ ہوتا ہے۔ مِس صاحب پھاٹک پر کھڑی ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتیں؟ اور سن ہی لیں گی تو مجھے کیا ڈر؟ صاحب نے سیدھے سے دیا تو دیا نہیں تو پھر میرے من میں بھی جو آئے گا وہ کروں گا۔ ایک سے دوجان تو ہوں گی نہیں مگر ہاں انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی کا حق چھین لینا دل لگی نہیں ہے۔

سورداس بھو چکا سارہ گیا۔ اسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا کہ مٹھوا کے منہ سے مجھے ایسی سخت باتیں سننی پڑے گی۔ اسے بے انتہا رنج ہوا۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ باتیں اس وقت کہی گئیں جب وہ سکون اور ہمدردی کا خواستگار اور مستحق تھا۔ جب اسے خواہش تھی کہ میرے عزیز و اقارب میرے پاس بیٹھے ہوئے میری تکالیف کے دفعیہ کی تدبیریں کرتے ہوتے۔ یہی وقت ہے اب انسان کو اپنی بڑائی سننے کی خواہ ہوتی ہے۔ جب اس کا کمزور دل بچوّں کی طرح گود میں بیٹھنے کے لیے پیار کے لیے خاطرداری کے لیے خدمت کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ جسے اس نے بچپن سے بیٹے کی

طرح پالا۔

جس کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا تکلیفیں سہی۔ وہ آخر وقت آکر اس سے اپنے حصہ کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اسے اپنا حق جتا رہا تھا۔ سورداس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے بولا۔ بیٹا میری بھول تھی کہ تم سے کریا کرم کرنے کو کہا۔ تم کچھ مت کرنا چاہے میں پنڈا اور جل کے بنا رہ جاؤں۔ پر یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ تم صاحب سے اپنا ماوجہ مانگو۔ جانتا تھا کہ تم اتنا کانون جان گئے ہو۔ نہیں تو پیسہ پیسہ کا حساب لکھتا جاتا۔

مٹھوا: میں اپنے ماوجے کا دعویٰ جرور کروں گا۔ چاہے صاحب دیں چاہے سرکار دے۔ چاہے کالا چور دے۔ مجھے تو اپنے روپے سے کام ہے۔

سورداس: ہاں سرکا ہی دے دے پر صاحب سے کوئی مطلب نہیں۔

مٹھوا: میں تو صاحب سے لوں گا۔ وہ چاہے جس سے دلائیں۔ نہ دلائیں گے تو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا وہ کروں گا۔ صاحب کچھ لاٹ تو ہیں نہیں۔ میری جائداد انھیں ہجم نہ ہونے پائے گی تم کو اس کا کیا کلک تھا۔ سوچا ہوگا کہ کون میرے بیٹی بیٹا بیٹھا ہوا ہے چپکے سے بیٹھ رہے۔ میں چپکا بیٹھنے والا نہیں ہوں۔

سورداس: مٹھوا کیوں میرا دل دُکھاتے ہو؟ اس جمین کے لیے میں نے کون سی بات اُٹھا رکھی؟ گھر کے لیے تو جان دے دی اب اور میرے کئے کیا ہوسکتا تھا۔ لیکن بھلا بتاؤ تو کہ تم صاحب سے کیسے روپے لے لوگے؟ عدالت میں تو تم ان سے لے نہیں سکتے۔ وہ روپے والے لوگ ہیں۔ اور عدالت روپے والوں کی ہے۔ ہاریں گے بھی تو تمھیں بگاڑ دیں گے۔ پھر تمھاری جمین سرکا نے جاپطے سے لی ہے۔ تمھارا دعویٰ صاحب پر چلے گا کیسے؟

مٹھوا: یہ سب پڑھے بیٹھا ہوں۔ لگا دوں آگ، سارا گودام جل کر راکھ ہوجائے گا۔ (آہستہ سے) بم گولہ بنانا جانتا ہوں۔ ایک گولہ رکھ دوگا تو پتلی گھر سواہا ہوجائے گا۔ میرا کوئی کیا کرلے گا۔

سورداس: بھیرو سنتے ہو اس کی باتیں۔ جرا سمجھاؤ۔

بھیرو: میں تو راستہ بھر سمجھاتا آرہاہوں سنتاہی نہیں۔

سورداس: تو پھر میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ اس سے ہوسیار رہیں۔
مٹھوا: تم کو گئو مارنے کی ہتیا لگے جو تم صاحب یا کسی اور سے اس بات کی چرچا تک کرو۔ اگر میں پکڑا گیا تو تمھیں کو اس کا پاپ لگے گا۔ جیتے جی میرا برا چیتا اب مرنے پر بھی میرے لیے کانٹے بونا چاہتے ہو۔ تمھارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔

یہ کہہ کر مٹھوا! غصّہ سے بھرا ہوا چلا گیا۔ بھیرو روکتا ہی رہا۔ پر اس نے نہ مانا۔ سورداس آدھ گھنٹہ تک غشی کی حالت میں پڑا رہا۔ یہ صدمہ گولی کے زخم سے بھی زیادہ مہلک تھا۔ مٹھوا کی بدمعاشی اس کے انجام کا خوف، اپنی ذمہ داری، صاحب کو آگاہ کردینے کا فرض یہ پہاڑ سی قسم۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چاروں طرف سے بندھا ہوا تھا۔ ابھی اسی شش وپنج میں پڑا ہوا تھا کہ مسٹر جان سیوک آئے۔ صوفیہ بھی پھاٹک سے ان کے ساتھ چلی۔ صوفیہ نے دور ہی سے کہا سورداس۔ پاپا تم سے ملنے آئے ہیں۔ اصل میں تو مسٹر سیوک سورداس سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ صوفیہ سے ماتم پرسی کا فرض ادا کرنے آئے تھے۔ دن بھر فرصت نہ ملی۔ مل سے نو بجے چلے تو یاد آئی سیوا بھون گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ صوفیہ ہسپتال میں ہے۔ گاڑی اس طرف پھیر دی۔ صوفیہ رانی صاحبہ کی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی اسے گمان بھی نہ تھا کہ پاپا آتے ہوں گے۔ انھیں دیکھ کر رونے لگی پاپا مجھے چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے ہمیشہ یقین رہا۔ واقعی تھی بھی یہی بات۔ مسٹر سیوک کو ہمیشہ صوفیہ کی یاد آتی رہتی تھی۔ کاروبار میں بے حد مصروف رہنے پر بھی وہ صوفیہ کی طرف سے بالکل بے فکر نہ تھے۔ البتہ اپنی بیوی سے مجبور تھے۔ جس کا ان پر قابو تھا۔ صوفیہ کو روتے دیکھ کر انھیں ترس آگیا۔ اسے گلے سے لگا لیا اور اس کی دلجوئی کرنے لگے۔ انھیں بار بار اس کارخانہ کو کھولنے پر افسوس ہوتا تھا۔ جو کسی مزمن مرض کی طرح ان کے گلے پڑ گیا۔ اس کے سبب خاندانی امن میں خلل واقع ہوا۔ سارا کنبہ بارہ باٹ ہوگیا۔ تمام شہر میں بدنامی ہوئی۔ ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ گھر سے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے اور ابھی تک منافع کی کوئی امید نہ تھی۔ اب مستری اور مزدور بھی کام چھوڑ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اُدھر شہر اور صوبہ میں اس کارخانہ کے خلاف تحریک جاری تھی۔ پر بھو سیوک کا ترک، سکونت چراغ بن کر ان کے دلوں کو جلا رہا تھا۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا۔

مسٹر سیوک کوئی نصف گھنٹہ تک صوفیہ کو اپنی مصیبت کی داستان سناتے رہے۔ آخر میں بولے۔ صوفیہ تمھاری ماما کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ مگر مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ کنور ونے سنگھ جیسا بیٹا یا داماد پا کر ایسا کون ہے جو اپنے کو خوش نصیب نہیں سمجھتا؟ مذہبی اختلاف کی مجھے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ مذہب ہماری حفاظت اور بہتری کے لیے ہے۔ اگر وہ ہماری روح کو سکون اور جسم کو آرام نہیں دے سکتا تو میں اسے پرانے کوٹ کی طرح اُتار کر پھینک دینا ہی پسند کروں گا۔ جو مذہب ہماری روح کی زنجیر ہوجائے اس سے جتنی جلدی ہم اپنی گلوخلاصی کر لیں اتنا ہی اچھا۔ مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہے گا کہ باواسطہ یا بے واسطہ طریقہ پر میں تمھارا دشمن ہوا۔ اگر مجھے ذرا بھی معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اتنا طول کھینچے گا اور اس کا انجام اتنا، افسوس ناک ہوگا تو میں اس آبادی پر قبضہ کرنے کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے سمجھا تھا کہ باشندے کچھ مخالفت ضرور کریں گے۔ لیکن دھمکا نے پر ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ لڑائی چھڑ جائے گی۔ اور اس میں میری ہی ہار ہوگی۔ یہ کیا بات ہے صوفیہ کہ آج رانی جانھوی نے میرے ساتھ مہذبانہ اور منکسرانہ سلوک کیا؟ میں تو چاہتا تھا کہ باہر ہی سے تمھیں بلالوں۔ لیکن دربان نے رانی صاحب سے کہہ دیا اور وہ فوراً باہر نکل آئیں۔ میں پشیمانی و ندامت سے گڑا جاتا تھا۔ اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں۔ بڑا وسیع دل ہے۔ پہلی کی سی رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صوفیہ ونے سنگھ کی ناوقت وفات کا کسے رنج نہ ہوگا۔ مگر ان کی قربانی نے سینکڑوں جانیں بچالیں ورنہ مجمع آگ میں کود پڑ نے کو تیار تھا۔ بڑا غضب ہوجاتا۔ مسٹر کلارک نے سورداس پر گولی چلادی تھی۔ مگر عوام کا رخ دیکھ کر سہمے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا ہو۔ بہادر شخص تھا۔ بڑا ہی دلیر اور جانباز!

اس طرح صوفیہ کو تسکین دینے کے بعد مسٹر سیوک نے اس سے گھر چلنے کا اصرار کیا۔ صوفیہ نے بات ٹال کر کہا۔ پاپا اس وقت مجھے معاف کیجیے۔ سورداس کی حالت بہت نازک ہے۔ میرے یہاں رہنے سے ڈاکٹر اور دیگر ملازمین خاص توجہ کرتے ہیں۔ میں نہ ہوں گی تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ آیئے ذرا دیکھئے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس حالت میں بھی وہ کتنا باہوش ہے اور کتنی دانشمندانہ گفتگو کرتا ہے۔ مجھے تو

وہ انسان قالب میں کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

سیوک: میرے جانے سے اسے رنج نہ ہوگا۔

صوفیہ: کبھی نہیں پاپا۔ اس کا تو خیال ہی تو دل میں نہیں لائے۔ اسے کینہ یا کدورت چھوتک نہیں گئی۔

دونوں سورداس کے پاس گئے تو وہ پریشانیوں کی تکلیف سے بے قرار ہورہا تھا۔ مسٹر سیوک بولے۔ سورداس کیسی طبیعت ہے؟

سورداس: صاحب سلام۔ بہت اچھا ہوں۔ میرے دھنیہ بھاگ۔ میں مرتے مرتے بڑا آدمی ہوجاؤں گا۔

سیوک: نہیں نہیں۔ سورداس۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہوجاؤ گے۔

سورداس: (ہنس کر) اب جی کر کیا کروں گا۔ ں سے مروں گا تو بکینٹھ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو؟ جیسے کھیت کٹنے کا ایک بکھت ہے۔ ویسے ہی مرنے کا بھی ایک بکھت ہوتا ہے۔ پک جانے پر کھیت نہ کٹے تو اناج سڑ جائے گا۔ میری بھی وہی دسا ہوگی۔ میں کئی آدمیوں کو جانتا ہوں جو آج سے دس برس پہلے مرتے تو لوگ ان کا جس گاتے۔ آج ان کی برائی ہورہی ہے۔

سیوک: میرے ہاتھوں تمھیں بہت نقصان پہچا۔ اس کے لیے مجھے معاف کرنا۔

سورداس: میرا تو آپ نے کوئی نکسان نہیں کیا۔ مجھ سے اور آپ سے دشمنی ہی کون سی تھی؟ ہم اور آپ آمنے سامنے کی پالیوں میں کھیلے۔ آپ نے بھرسک جور لگایا۔ میں نے بھی بھرسک جور لگایا۔ جس کو جیتنا تھاجیتا۔ جس کو ہارنا تھا ہارا۔ کھلاڑیوں میں بیر نہیں ہوتا۔ کھیل میں روتے تو لڑکوں کو بھی لاج آتی ہے۔ کھیل میں چوٹ لگ جائے چاہے جان نکل جائے۔ پر بیر نہ ہونا چاہیے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

سیوک: سورداس اگر اس فلسفہ کو زندگی کے اس بھید کو میں بھی تمھاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے میرے کار خانہ کو آگ سے بچایا تھا۔ میں تمھاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل ڈالتا۔ تم اس لڑائی میں ہوشیار ہو سورداس۔ میں تمھارے سامنے نادان بچہّ ہوں۔ دنیا کی نظروں میں میں جیتا اور تم ہارے۔ مگر میں جیت کر بھی دکھی ہوں۔ اور تم ہار کربھی سکھی ہو۔ تمھارے نام کی پوجا ہو رہی ہے،

میرا پتلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔ میں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمھارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔ سرکار کی آڑ سے لڑا۔ مجھے جب موقع ملا میں نے تمھارے اوپر ناجائز حملے کیے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔

مرتے ہوئے آدمی کی وہ لوگ بھی کھلے دل سے تعریف کرتے ہیں۔ جن کی زندگی اس سے دشمنی کرنے ہی میں گزری ہو۔ کیونکہ اب اس سے کسی نقصان کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

سورداس نے فراخدلی سے کہا۔ نہیں صاحب۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی۔ دگا کرنا مجوروں کا ہتھیار ہے۔ بلوان کبھی نیچے نہیں ہوتا۔

سیوک: ہاں سورداس۔ ہونا وہی چاہیے جو تم کہتے ہو پر ایسا ہوتا نہیں۔ میں ٹھیک قاعدہ پر کبھی نہیں چلا۔ میں دنیا کو کھیل کا میدان نہیں بلکہ لڑائی کا میدان سمجھتا رہا۔ اور لڑائی میں دغا، فریب، چھپا وار سبھی کچھ کیا جاتا ہے۔مذہبی جنگ کا زمانہ اب نہیں رہا۔

سوراس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مٹھوا کی بات صاحب سے کہہ دوں یا نہیں؟ اس نے کڑی قسم کھلائی ہے مگر کہہ دینا ہی مناسب ہے۔ لونڈا ضدّی اور بد چلن ہے پھر اس پر گھیسو کا ساتھ۔ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرے گا۔ قسم کھا دینے سے تو مجھے ہتیا لگتی نہیں۔ کہیں کچھ کر بیٹھا تو صاحب سمجھیں گے کہ اندھے نے مرنے کے بعد بھی کسر نکالی۔ بولا۔ صاحب ۔آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

سیوک: کہو۔شوق سے کہو۔

سورداس نے چند لفظوں میں مٹھوا کی بیہودہ باتیں مسٹر سیوک سے کہہ دیں اور آخر میں کہا۔ میری آپ سے اتنی ہی بنتی ہے کہ اس پر کڑی نگاہ رکھئے گا۔ اگر پاگیا تو چوکنے والا نہیں ہے۔ تب آپ کو بھی اس پر گسا آہی جائے گا اور آپ اسے دنڈ دینے کا اپائے سوچیں گے۔ میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں چاہتا۔

مسٹر سیوک: دیگر دولتمند لوگوں کی طرح بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ متفکرانہ لہجہ میں بولے۔ سورداس تم نے مجھے ہوشیار کردیا۔ اسُ کے لیے تمھارا احسان مند ہوں۔ مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے۔ میں تمھیں کبھی یوں نہ چتاتا۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں

تمھاری گردن کٹتے دیکھ کر بھی شاید مجھے رحم نہ آتا۔ قصائیوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ (صوفیہ سے انگریزی میں) بڑا راستی پسند شخص ہے۔ شاید دنیا ایسے آدمیوں کے رہنے کا مقام نہیں ہے۔ مجھے ایک چھپے ہوئے دشمن سے بچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ تو بھتیجا ہے مگر بیٹے کی بات ہوتی تو بھی مجھے ضرور خبر کردیتا۔

صوفیہ: مجھے تو اب یقین ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم دغا بازوں کو پیدا کرتی ہے اور قدرت بھلے آدمیوں کو۔

جان سیوک کو یہ بات پسند نہ آئی۔ تعلیم کی اتنی ہجو وہ نہ برداشت کر سکتے تھے بولے۔ سورداس میرے قابل اور کوئی خدمت ہو تو بتلاؤ۔

ورداس: کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

سیوک: نہیں نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا پس و پیش کہو۔

سورداس: طاہر علی کو پھر نوکر رکھ لیجئے گا۔ ان کے بال بچے بڑی تکلیف میں ہیں۔

سیوک: سورداس مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ کسی بدنیت آدمی کا نوکر رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ مجھے تمھاری بات نہ ماننے کا بہت رنج ہے مگر یہ میری زندگی کا ایک خاص اصول ہے۔ اور میں اسے توڑ نہیں سکتا۔

سورداس: رحم کرنا بھی اصول کے خلاف نہیں ہوتا۔

سیوک: میں اتنا کر سکتا ہوں کہ طاہر علی کے بچوں کی پرورش کرتا رہوں لیکن اسے نوکر نہ رکھوں گا۔

سورداس: جیسی آپ کی مرجی۔ کسی طرح ان غریبوں کی پرورش ہونی چاہیے۔

ابھی یہی باتیں ہورہی تھیں کہ رانی جانھوی کا موٹر آپہنچا۔ رانی اتر کر صوفیہ کے پاس گئیں اور بولیں۔ بیٹی معاف کرنا مجھے بڑی دیر ہوگئی۔ تم گھبرائیں تو نہیں فقیروں کو کھلانے کے بعد یہاں آنے کو گھر سے نکلی تو کنور صاحب آگئے۔ باتوں باتوں میں ان سے بکواس ہوگئی۔ بڑھاپے میں کیوں آدمی اتنا دولت پرست ہو جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتی کیوں مسٹر سیوک۔ آپ کا کیا تجربہ ہے۔

سیوک: میں نے دونوں طرح کے آدمی دیکھے ہیں۔ اگر پربھو سیوک دولت کو ہیچ سمجھتا ہے تو میرے والد صاحب کو پھیکی چائے۔ سادی چپاتیاں اور دھندلی روشنی ہی پسند

ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر گنگولی ہیں کہ جن کی آمدنی خرچ کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اور پھر راجہ مہندر کمار سنگھ جن کے یہاں پائی پائی کا حساب لکھا جاتا ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے لوگ موٹروں کی طرف چلے۔ مسٹر سیوک اپنے بنگلہ کو گئے اور صوفیہ رانی کے ساتھ سیوا بھون کو۔

(45)

پانڈے پور میں گورکھے ابھی تک پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے اُپلو کے جلنے سے چاروں طرف دھواں تھا۔ اس پھیلی ہوئی تاریکی میں آبادی کے کھنڈر خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ یہاں اب بھی دن میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا۔ جو ان دو تین دنوں میں یہاں ایک بار نہ آیا ہو۔ یہ مقام اب مسلمانوں کی شہید گاہ اور ہندوؤں کا تیرتھ استھان بن گیا تھا۔ جہاں ونے سنگھ شہید ہوئے تھے وہاں لوگ جاتے تو پیر سے جوتے اتار دیتے۔ کچھ لوگوں نے وہاں پھول پتے بھی چڑھائے تھے۔ یہاں کی خاص چیز سورداس کے جھونپڑے کا نشان تھا۔ پھوس کے ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ لوگ یہاں آکر گھنٹوں کھڑے رہتے اور فوجوں کو غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ ان آدمیوں نے ہمیں ذلیل کیا اور اب بھی یہیں جمے ہوئے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بجرنگی، ٹھاکر دین، نایک رام، جگدھر وغیرہ بھی اپنا زیادہ وقت یہیں گھومنے میں لگاتے۔ گھر کی یاد بھولتے بھولتے ہی بھولتی ہے۔ کوئی اپنی بھول سے چھوڑی ہوئی چیز تلاش کرنے آتا۔ کوئی پتھر یا لکڑی خریدنے اور بچّوں کو تو اپنے گھروں کے نشانات دیکھنے ہی میں لطف آتا تھا۔ ایک پوچھتا۔ اچھا بتاؤ ہمارا گھر کہاں تھا۔ دوسرا کہتا۔ جہاں کتا لیٹا ہوا ہے۔ تیسرا کہتا۔ جی کہیں ہو نہ؟ وہاں تو بیجو کا گھر تھا۔ دیکھتے نہیں۔ یہ امرود کا پیڑ اسی کے آنگن میں تھا۔ دوکاندار وغیرہ بھی یہیں شام صبح آتے اور گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے جیسے گھر کے لوگ مرے ہوئے آدمی کے چاروں طرف جمع ہوجاتے ہیں یہ میرا آنگن تھا۔ یہ میری دالان تھی۔ یہیں بیٹھ کر تو میں بہی کھاتا لکھتا تھا۔ ارے میرے گھی کی ہانڈی پڑی ہوئی ہے۔ کتوں نے منہ ڈال دیا ہوگا۔ نہیں تو لیتے چلتے۔ کئی سال کی ہانڈی تھی۔ میرا پرانہ

جوتہ پڑا ہوا ہے۔ پانی میں پھول کر کتنا بڑا ہوگیا ہے! دوچار آدمی ویسے بھی تھے جو اپنے بزرگوں کا دفینہ کھوجنے آیا کرتے تھے۔ عجلا، میں انھیں گھر کھودنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دادا بنگال کی ساری کمائی اپنے سرہانے گاڑ کر مر گئے۔ کبھی اس کا پتہ نہ بتایا۔ کیسی ہی گرمی پڑے۔ کتنا ہی مچھر کاٹیں وہ اپنی کوٹھری ہی میں سوتے تھے۔ پتا.جی کھودتے کھودتے رہ گئے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں شور نہ مچ جائے۔ جلدی کیا ہے؟ گھر ہی میں تو ہے۔ جب .جی چاہے گا۔ نکال لیں گے۔ میں بھی یہی سوچتا رہا۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے نہیں تو پہلے ہی سے کھود نہ لیا ہوتا۔ اب کہاں پتہ ملتا ہے؟ جس کے بھاگ کا ہوگا وہ پائے گا۔

شام ہوگئی تھی۔ نایک رام بجرنگی اور ان کے دیگر احباب آکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

نایک رام: کہو بجرنگی۔ کہیں کوئی گھر ملا؟

بجرنگی: گھر نہیں۔ پتھر ملا۔ شہر میں رہوں تو اتنا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ گھاس چارا کہاں ملے؟ اتنی جگہ کہاں ملی جاتی ہے؟ ہاں اوروں کی طرح دودھ میں پانی ملانے لگوں تو گجر ہوسکتا ہے۔ پر یہ کرم عمر بھر نہیں کیا تو اب کیا کروں گا۔ دیہات میں رہتا ہوں تو گھر بونا پڑتا ہے۔ جمین دار کو نجر نہ دو تو جمین نہ ملے۔ایک ایک بسوے کے دو دو سو مانگتے ہیں۔ گھر بنوانے کو الگ ہجار روپیہ چاہیے۔ اتنے روپے کہاں سے لاؤں۔ جتنا ماوجہ ملا ہے اتنے میں تو ایک کوٹھری بھی نہیں بن سکتی۔ میں تو سوچتا ہوں کہ جانوروں کو بیچ ڈالوں اور یہیں پتلی گھر میں مجوری کروں سب جھگڑا مٹ جائے گا۔ طلب تو اچھی ملتی ہے۔ اور کہاں کہاں ٹھکانا ڈھونڈتے پھریں؟

جگد ھر: یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بنا بنایا مکان رہنے کو مل جائے گا۔ پڑے رہیں گے۔ کہیں گھر بیٹھے کھانے کو تو ملے گا نہیں۔ دن بھر کھونچہ لیے نہ پھرے۔ یہیں مجبوری کریں۔

ٹھاکردین: تم لوگوں سے مجبوری ہوسکتی ہے کرو، میں تو چاہے بھوکوں مر جاؤں پر مجوری نہیں کر سکتا۔ مجوری سودروں کا کام ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنا رتبہ کیوں کھوئیں۔ بھگوان کہیں نہ کہیں ٹھکانہ لگائیں گے ہی۔ یہاں تو اب کوئی مجھے سیت میت رہنے کو

کہے تو نہ رہو۔ بستی اُجر جاتی ہے تو بھوتوں کا ڈیرا ہو جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کیسا سیا پا چھایا ہوا ہے۔ نہیں تو اس بیلا یہاں کتنا گل جار رہتا تھا۔

نایک رام: مجھے کیا صلاح دیتے ہو بجرنگی؟ دیہات میں رہو گے کہ سہر میں؟

بجرنگی: بھیا تمھارا دیہات میں نباہ نہ ہوگا۔ کہیں آگے پیچھے ہٹنا ہی پڑے گا۔ روج سہر کا آنا جانا ٹھہرا۔ کتنی مسکل ہوگی۔ پھر تمھارے جاتری تمھارے ساتھ دیہات میں تھوڑے جائیں گے۔ یہاں سے تو سہر اتنا دور نہیں تھا۔ اس لیے سب چلے آتے تھے۔

نایک رام: تمھاری کیا صلاح ہے۔ جگدھر؟

جگدھر: بھیا میں تو سہر میں رہنے کو نہ کہوں گا۔ کھرچ کتنا بڑھ جائے گا۔ مٹی بھی مول ہے۔ پانی کے بھی دام دو۔ چالیس پچاس کو تو ایک چھوٹا سا مکان ملے گا۔ تمھارے ساتھ ہر بکھت دس بیس آدمی رہا چاہیں۔ اس لیے بڑا گھر لینا پڑے گا۔ اس کا کرایہ سو سے نیچے نہ ہوگا۔ گائیں بھینسیں کہاں رکھو گے؟ جاتریوں کو کہاں ٹکاؤ گے تمھیں جتنا ماوجہ ملا ہے اتنے میں تو اتنی جمین بھی نہ ملے گی۔ گھر بنوانے کی کون کہے؟

نایک رام: بولو بھائی بجرنگی۔ سال کے بارہ سو کرایہ کے کہاں سے آئیں گے؟ کیا ساری کمائی کرایہ میں ہی کھرچ کردوں گا؟

بجرنگی: جمین تو دہات میں بھی مول لینی پڑے گی۔ سینت تو ملے گی نہیں۔ پھر کون جانے کس گاؤں میں جگہ ملے۔ بہت سے آس پاس کے گاؤں تو ایسے بھرے ہوئے ہیں کہ وہاں اب ایک جھونپڑی بھی نہیں بن سکتی۔ کسی کے دوار پر آنگن تک نہیں ہے۔ پھر جگہ مل گئی تو گھر بنوانے کے لیے سارا سامان سہر سے لے آنا پڑے گا۔ اس میں کتنا خرچ پڑے گا۔ نو کی لکڑی سے نوے کھرچ۔ کچا مکان بنواؤ گے تو کتنی تکلیپھ۔ ٹپکے، کیچڑ ہو، روج منوں کوڑا نکلے، ساتویں دن لیپنے کو چاہیے۔ تمھارے گھر میں کون لیپنے والا بیٹھا ہوا ہے۔ تمھارے رہا کچے مکان میں نہ رہا جائے گا۔ سہر میں آنے جانے کے لیے سواری رکھنی پڑے گی۔ اس کا کھرچ بھی پچاس سے نیچے نہ ہوگا۔ تم کچے مکان میں تو کبھی رہے نہیں۔ کیا جانو دیمک، کیڑے مکوڑے، سیل، پوری چھچھا لیدر ہوتی ہے۔ تم تماش بین آدمی ٹھہرے۔ پان پتہ ساگ بھاجی۔ دہات میں کہاں؟ میں تو یہی کہوں گا کہ دہات کے ایک کی جگہ سہر میں دو کھرچ ہوں تب بھی سہر ہی میں رہو۔

وہاں ہم لوگوں سے بھی بھینٹ بھلائی ہو جایا کرے گی۔ آ کھر دودھ دہی لے کر سہر تو روج جانا ہی پڑے گا۔

نایک رام: واہ بہادر واہ۔ مان گیا۔تمھارا جوڑ تو بھیرو تھا۔ دوسرا کون تمھارے سامنے ٹک سکتا ہے۔ تمھاری بات میرے من میں بیٹھ گئی۔ بولو جگدھر۔ اس کا کچھ جواب دیتے ہو۔تو دونہیں تو بجرنگی کی ڈگری ہوتی ہے۔ سوروپے کرایہ دینا منجور۔ یہ جھنجھٹ کو سر پر نہ لے گا۔

جگدھر: بھیا۔ تمھاری مرجی ہے تو سہر میں چلے جاؤ۔میں بجرنگی سے لڑائی تھوڑے ہی کرتا ہوں۔ پر دہات دہات ہی ہے۔سہر سہر ہی ہے۔ سہر میں پانی تک تو اچھا نہیں ملتا۔ وہی بمبے کا پانی پیو۔دھرم جائے اور کچھ سواد نہ ملے۔

ٹھاکر دین: اندھا آگم جانی تھا۔ جانتا تھا کہ ایک دن یہ تپلی گھر ہم لوگوں کو بن باس دے گا۔جان تک گنوائی پر اپنی جمین نہ دی۔ہم لوگ اس کرنٹے کے چکمے میں آ کراُس کا ساتھ نہ چھوڑتے تو صاحب لاکھ سر ٹپک کر مرجاتے ایک نہ چلتی۔

نایک رام : اب اُس کے بچنے کی کوئی آسا نہیں معلوم ہوتی۔آج میں گیا تھا بُرا حال تھا۔ کہتے ہیں کہ رات کو ہوس میں تھا جان سیوک صاحب اور راجہ صاحب سے دیر تک باتیں کیں مٹھواسے باتیں کیں۔ سب لوگ سوچ رہے تھے کہ اب بچ جائے گا۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کُھد کہا کہ اندھے کی جان کا کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ مگر سورداس یہی کہتا رہا کہ آپ کو میری جو سانئست کرنا ہے کر لیجیے پر میں بچوں گا نہیں۔ آج بول بند ہے مٹھوا بڑا کپوت نکل گیا۔ اُس کی کپوتی نے اندھے کی جان لی نہیں تو ابھی کچھ دن اور جیتا۔ ایسے بیرپرے ہی کہیں ہوتے ہیں۔آدمی نہیں دیوتا تھا۔

بجرنگی: سچ کہتے ہو بھیا۔آدمی نہیں تھا دیوتا تھا۔ایسا مرد آدمی کہیں نہیں دیکھا سچائی کے سامنے کسی کی پرواہ نہیں چاہیے کوئی اپنے گھر کا لاٹ ہی کیوں نہ ہو۔ گھیسو کے پیچھے میں اُس سے بگڑ گیا تھا۔ پر اب جو سوچتا ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سُورداس نے کوئی انیائے نہیں کیا۔ کوئی بدماس ہماری ہی بہو بیٹی کو بُری نگاہ سے دیکھے تو بُرا لگے گا کہ نہیں۔ اس کے کُھون کے پیاسے ہوجاؤگے۔ گھات پائیں گے تو سر اُتار لیں گے۔ اگر سُور نے ہمارے ساتھ وہی برتاؤ کیا تو کیا بُرائی کی؟ گھیسو کا چلن بگڑ گیا تھا۔ سجانہ پاتا

تو نہ جانے کیا اندھیر کرتا۔
ٹھاکر دین: اب تک یا تو اُسی کی جان گئی ہوتی یا دوسروں کی۔
جگدھر: چودھری۔ گھر گاؤں میں اتنی سچّائی نہیں برتی جاتی۔ اگر سچّائی سے کسی کا نکسان ہوتا ہو تو اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ سورداس میں اور سب باتیں اچھی تھیں۔ بس اتنی ہی بات بری تھی۔
ٹھاکر دین: دیکھو جگدھر۔ سورداس یہاں نہیں ہے کسی کی پیٹھ پیچھے نندا (ہجو) نہیں کرنی چاہیے۔ نندا کرنے والے کی بات ہی کیا۔ نندا سننے والوں کو بھی پاپ لگتا ہے۔ نہ جانے پورو جنم میں کون سا پاپ کیا تھا کہ ساری جما جتھا چور موس لے گئے۔ یہ پاپ اب نہ کروں گا۔
بجرنگی: ہاں جگدھر۔ یہ بات اچھی نہیں۔ میرے اوپر بھی تو وہی پڑی ہے۔ جو تمھارے اوپر پڑی۔ لیکن سورداس کی نندا نہیں سن سکتا۔
ٹھاکر دین: ان کی بہو بیٹی کو کوئی گھورتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔
جگدھر: بہو بیٹی کی بات اور ہے۔ ہرجائیوں کی بات اور۔
ٹھاکردین: بس اب چپ ہی رہنا چاہیے جگدھر۔ تمھیں ایک سبھا گی کی سپھائی دیتے پھرتے تھے۔ آج ہر جائی کہتے ہو۔ لاج بھی نہیں آتی؟
نایک رام: یہ عادت بہت کھراب ہے۔
بجرنگی: آسمان پر تھوکنے سے تھوک اپنے ہی منہ پر پڑتا ہے۔
جگدھر: ارے تو میں سورداس کی نندا تھوڑے کر رہا ہوں۔ دل دکھتا ہے تو بات منہ سے نکل ہی آتی ہے۔ تمھیں سوچو کہ بدّیا دھراب کس کام کا رہا؟ پڑھانا لکھانا سب مٹی ہو گیا کہ نہیں؟ اب نہ سرکار میں نوکری ملے گی۔ نہ کوئی دوسرا آدمی رکھے گا۔ اس کی تو جند گانی کھراب ہوگئی۔ بس یہی دکھ ہے۔ نہیں تو سورداس کا سا آدمی کوئی کیا ہوگا۔
نایک رام: ہاں اتنا میں بھی مانتا ہوں کہ اس کی جندگانی کھراب ہوگئی۔ جس سچائی سے کسی کا ان بھل ہوتا ہو اس کا منہ سے نہ نکلنا ہی اچھا۔ پر سورداس کو سب کچھ ماپھ ہے۔
ٹھاکردین: سورداس نے بدّیا تو نہیں چھین لی۔

جگدھر: وہ بدّیا کس کا م کی جب نوکری چاکری نہ کر سکے۔ دھرم کی بات ہوتی تو یوں بھی کام دیتی۔ یہ بدّا ہمارے کس کام آوے گی۔

نا یک رام: اچھا یہ بتاؤ کہ سورداس مر گئے تو گنگا نہانے چلوگے یا نہیں۔

جگدھر: گنگا نہانے کیوں نہ چلوں گا؟ سب کے پہلے چلوں گا۔ کندھا تو آدمی بیری کو بھی دے دیتا ہے۔ سورداس ہمارے بیری نہیں تھے۔ جب انھوں نے مٹھوا کو چھوڑا۔ جسے بیٹے کی طرح پالا تو دوسروں کی بات ہی کیا۔ مٹھوا کیا وہ اپنے کھاس بیٹے کو نہ چھوڑتے۔

نا یک رام: چلو دیکھ آئیں۔

چاروں آدمی سورداس کو دیکھنے چلے۔

(46)

چاروں آدمی شفاخانہ پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ آسمان خواب میں مست آنکھیں بند کیے ہوا تھا مگر زمین بیدار تھی۔ بھیرو کھڑا ہوا سورداس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گر نے لگے۔ سرہانے کی طرف بیٹھی ہوئی صوفیہ بے قرار آنکھوں سے سورداس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سبھاگی انگیٹھی میں آگ بنا رہی تھی کہ تھوڑا سا دودھ گرم کر کے سورداس کو پلائے۔ تینوں کی شکل سے مایوسی برس رہی تھی۔ چاروں طرف وہ سکوت تھا جو موت کا پیش خیمہ ہے۔

صوفیہ نے غمگین لہجہ میں کہا۔ پنڈا جی۔ آج سوگ کی رات ہے۔ ان کی نبض کا کئی کئی منٹوں تک پتہ نہیں چلتا۔ شاید آج کی رات مشکل ہی سے کٹے۔ ہیبت تبدیل ہوگئی ہے۔

بھیرو: دوپہر سے یہی حال ہے۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کو پہچانتے ہیں۔

صوفیہ: ڈاکٹر گنگولی آتے ہی ہوں گے۔ ان کا تار آیا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ یوں تو موت کی دوا کسی کے پاس نہیں مگر ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی کے ہی ہاتھوں جس بدا ہو۔

سبھاگی: میں نے شام کو پکارا تھا آنکھیں کھولی تھیں پر بولے کچھ نہیں۔

ٹھاکر دین: بڑا اکبالی پرس تھا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک موٹر آیا اور کنور بھرت سنگھ، ڈاکٹر گنگولی اور رانی جانہوی اُتر پڑے۔ گنگولی نے سورداس کے چہرہ کی طرف دیکھا اور مایوسانہ تبسم سے بولے۔ ہم کو دس منٹ کا بھی دیر ہوتا تو ان کا درسن بھی نہ پاتا۔ بلاوا آچکا ہے۔ کیوں دودھ گرم کرتا ہے۔ بھائی۔ دودھ کون پیئے گا؟ جمراج (فرشتہ موت) تو دودھ پینے کا مہلت نہیں دیتا۔

صوفیہ نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب؟

گنگولی: بہت کچھ ہوسکتا ہے مس صوفیہ؟ ہم جمراج کو ہرا دے گا۔ ایسے لوگوں کا اصلی جندگی تو موت کے پیچھے ہی ہوتا ہے۔ جب وہ مٹی پانی ہوا، آگ۔ آکاش۔ ان پانچوں کے بندھن کو توڑ دیتا ہے۔ سورداس ابھی نہیں مرے گا۔ بہت دنوں تک نہیں مرے گا۔ ہم سب مرجائے گا۔ کوئی آج کوئی کل۔ کوئی پرسوں۔ سورداس تو امر ہوگیا۔ اُس نے تو کال کو جیت لیا۔ ابھی تک اس کا جندگی مٹی پانی وگیرہ پانچوں سے بندھا تھا۔ اب وہ پھیلے گا اور سارے صوبہ اور سارے ملک کو جگا دے گا۔ ہم کو کام کرنے کا بیر بننے کا بات بتائے گا۔ یہ سورداس کا موت نہیں ہے۔ صوفیہ یہ اس کی جندگی کا بڑھاوا ہے۔ ہم تو اسی ماپھک سمجھتا ہے۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور اس کے کئی قطرے سورداس کا منہ کھول کر حلق میں ٹپکا دیے۔ فوری اثر نمودار ہوا۔ سورداس کے بے رونق چہرہ پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑگئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر تاکتے ہوئے ہنسا۔ پھر گراموفون کی سی بناوٹی اور بیٹھی ہوئی آواز سے بولا۔ بس بس۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟ تم جیتے اور میں ہارا۔ یہ باجی تمھارے ہاتھ رہی۔ مجھ سے کھیلتے نہیں بنا۔ تم منجھے ہوئے کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اُکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو ملا کر کھیلتے ہو اور تمھیں حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ ہانپنے لگتے ہیں۔ ہم کھلاڑیوں کو ملا کر نہیں کھیلتے۔ آپس میں جھگڑتے ہیں۔ گالی گلوچ مار پیٹ کرتے ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں مانتا۔ تم کھیلنے میں ہوسیار ہو اور ہم اناڑی ہیں۔ بس اتنا پھرک ہے۔ تالیا کیوں بجاتے ہو؟ یہ تو جیتنے والوں کا دھرم نہیں۔ تمھارا دھرم تو ہے ہماری پیٹھ ٹھونکیں۔ ہم ہارے تو کیا۔ میدان سے بھاگے تو نہیں۔ ارے روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی۔ پھر کھیلیں گے۔ جرا دم لے

لینے دو۔ ہار ہار کر تمھیں سے کھیلنا سیکھیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی۔ ضرور ہوگی۔

ڈاکٹر گنگولی اس بکواس کو آنکھیں بند کئے کچھ اس طریقہ پر محو ہوکر سنتے رہے۔ گویا کلام خدا ہو۔ پھر عقیدت کے لہجہ میں بولے۔ بڑے کھیال کا آدمی ہے۔ ہمارے تمام آپس کے سوشل اور پولیٹیکل جند گی کو بڑا اچھا تصبیر کھینچ دیا اور تھوڑے میں۔

صوفیہ نے سورداس سے کہا۔ سورداس۔ کنور صاحب اور رانی جی آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سورداس نے مجذوبانہ سرگرمی سے کہا۔ ہاں ہاں ہاں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اب ان کے چرنوں کی دھول میرے ماتھے پر لگا دو۔ تر جاؤں۔ نہیں نہیں مجھے اٹھا کر بیٹھا دو۔ کھول دو یہ پٹی۔ میں کھیل چکا۔ اب مجھے مرہم پٹی نہیں چاہئے۔ رانی کون؟ بنے سنگھ کی ماتا نا؟ کنور صاحب ان کے پتا نا؟ مجھے بیٹھا دو۔ ان کے پیروں پر آنکھیں کھل جائیں گی۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اسیس دو۔ ماتا۔ ہاں اب میری جیت ہوگی۔ اوہو۔ وہ سامنے ونے سنگھ اور اندردت سنگاسن پر بیٹھے ہوئے مجھے بلا رہے ہیں۔ ان کے چہرہ پر کتنا تیج ہے! میں بھی آتا ہوں۔ یہاں تمھاری کچھ سیوانہ کر سکا اب وہیں کروں گا۔ ماتا پتا۔ بھائی بند۔ سب کو سورداس کا رام رام! اب جاتا ہوں۔ جو کچھ بنا بگڑا ہو ماپھ کرنا۔

رانی جانہوی نے آگے بڑھ کر فرط عقیدت سے سورداس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سورداس کے پیر آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کنور صاحب نے آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور کھڑے کھڑے رونے لگے۔

سورداس کا چہرہ پھر اُداس ہوگیا۔ دوا کا اثر زائل ہوگیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

نایک رام گنگا جل لانے دوڑے۔ جگدھر نے سورداس کے قریب جاکر زور سے کہا۔ سورداس میں ہوں جگدھر۔ میرا اپرادھ چھما کرو۔

سورداس منہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں ہاتھ جوڑے، آنسو کی دو بوندیں گالوں

پر بہہ آئیں اور کھلاڑی میدان سے رخصت ہوگیا۔

ایک لمحہ میں چاروں طرف خبر پھیل گئی۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، عورت مرد، بوڑھے، جوان ہزاروں کی تعداد میں نکل پڑے۔ سب ننگے سر۔ ننگے پیر۔ گلے میں اگوچھے ڈالے شفا خانہ کے میدان میں جمع ہوگئے۔ عورتیں منہ ڈھانکے کھڑی رورہی تھیں۔ گویا اپنے گھر کا کوئی آدمی مرگیا ہو۔ جسؔ کا کوئی نہیں ہوتا اسی کے سب ہوتے ہیں۔ سارا شہر اُمڑا چلا آتا تھا۔ سب کے سب اس کھلاڑی کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی ہار میں بھی جیت کی شان تھی۔ کوئی کہتا تھا سادھو تھا۔ کوئی کہتا تھا وہی تھا، کوئی دیوتا کہتا تھا، پر اصل میں وہ کھلاڑی تھا۔ وہ کھلاڑی جس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں پڑی۔ جس نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ جس نے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ جیتا تو خوش رہا ہارا تو خوش رہا۔ ہارا تو جیتنے والے سے کینہ نہیں رکھا۔ جیتا تو ہارنے والے پر تالیاں نہیں بجائیں۔ جس نے کھیل میں ہمیشہ صفائی برتی۔ کبھی دھاندلی نہیں کی۔ کبھی مخالف پر چھپ کر وار نہیں کیا۔ بھکاری تھا، مجہول تھا، اندھا تھا، بیکس تھا، کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوا کبھی بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملا۔ مگر دل برداشت عفو۔ سچائی اور ہمت کے جذبات سے معمور تھا۔ بدن پر گوشت نہ تھا مگر دل میں انکسار، اخلاق اور ہمدردی تھی۔

ہاں وہ سادھو نہ تھا، دیوتا نہ تھا، فرشتہ نہ تھا۔ بلکہ ایک حقیر اور کمزور انسان تھا۔ مکروہات دنیا سے گھر ہوا۔ جس میں برائیاں بہت۔ غصہّ حرص، تلوّن، غرور، یہ سبھی برائیاں اس میں موجود تھیں۔ وصف صرف ایک تھا مگر یہ سبھی کمزوریاں اس ایک وصف سے مل کر نمک کی کان میں جاکر نمک ہوجانے والی چیزوں کی طرح خوبیوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ غصہ جائز غصہ ہوجاتا ہے۔ تلوّن جوش کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔حرص محبت بن جاتی تھی۔ اور غرور خوداری کی صورت میں۔ وہ وصف کیا تھا۔ حق پرستی۔ انصاف پسندی۔ ایثارنفسی یا ہمدردی یا اس کا اور جو نام چاہے رکھ لیجئے۔ ناانصافی دیکھ کر اس سے نہ رہا جاتا تھا۔ زیادتی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

جنازہ کس دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ باجے گاجے نہ تھے۔ ہاتھی گھوڑے نہ تھے۔ مگر آنسو بہانے والی آنکھوں اور تعریف کرنے والی

زبانوں کی کمی نہ تھی۔ بڑا ہجوم تھا۔ سورداس کی سب سے بڑی جیت یہ تھی کہ دشمنوں کو بھی اس سے دشمنی نہ تھی۔ اگر عزاداروں میں صوفیہ، گنگولی، جانہوی، بھرت سنگھ، نایک رام تھے تو مہیندر کمار سنگھ۔ جان سیوک جگدھر حتی کہ مسٹر کلارک بھی تھے۔ صندل کی چتا تیار کی گئی تھی۔ اس پر فتح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چتا میں آگ دینے کی رسم کون ادا کرتا؟ مٹھوا ٹھیک اسی وقت روتا ہوا آپہنچا۔ سورداس نے جیتے جی جو نہ کر پایا تھا اسے مرکر کیا۔

اسی مقام پر کئی روز پہلے یہی رنج و سوگ کا منظر دکھائی دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس روز لوگوں کے دل میں غم تھا اور آج فتح کا غرور۔ وہ ایک بہادر کی بہادرانہ موت تھی۔ یہ ایک کھلاڑی کا آخری کھیل۔ ایک بار پھر آفتاب کی شعاعیں چتا پر پڑیں۔ اُن میں غرور کی چمک تھی۔ گویا آسمان سے فاتحانہ گیت کے نغمے آرہے تھے۔

لوٹتے وقت مسٹر کلارک نے راجہ مہیندر کمار سے کہا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ میرے ہاتھوں ایسے نیک انسان کا خون ہوا۔

راجہ صاحب نے طنز سے کہا۔ خوش نصیبی کہئے۔ بدنصیبی کیوں؟

کلارک: نہیں راجہ صاحب بدنصیبی ہی ہے۔ ہمیں آپ جیسے انسانوں سے خوف نہیں۔ خوف ایسے ہی آدمیوں سے ہے جو عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ حکومت کرنے کی سزا ہے کہ اس ملک میں ہم ایسے آدمیوں کو قتل کرتے ہیں۔ جن کی انگلینڈ میں ہم پرستش کرتے۔

صوفیہ اسی وقت ان کے پاس سے ہوکر گزری۔ یہ الفاظ اس کے کان میں پڑے۔ بول اُٹھی۔ کاش یہ الفاظ آپ کے دل سے نکلے ہوتے۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ مسٹر کلارک اس طنز سے تلملا گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ گھوڑا بڑھا کر بولے۔ یہ تمھارے اس ظلم کا نتیجہ ہے جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔

صوفیہ آگے بڑھ گئی یہ بات اس نے نہ سنی۔

آسمانی راہ گیر جو پردۂ ابر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ لاش کے ساتھ جانے والے بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ پر

صوفیہ کہاں جاتی۔ اسی دوبدھا میں کھڑی تھی کہ اندو مل گئی۔ صوفیہ نے کہا۔ اِندو ذرا ٹھرو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔

(47)

شام ہو گئی تھی۔ مل کے مزدور چھٹی پا گئے تھے۔ آج دونی مزدوری دینے پر بھی بہت تھوڑے مزدور کام کر نے آئے تھے۔ پانڈے پور میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں اب مکانات کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں درخت ابھی تک بدستور کھڑے تھے۔ وہ چھوٹا سا نیم کا درخت اب سورداس کی جھونپڑی کا نشان بتلاتا تھا۔ پھوس لوگ اُٹھا لے گئے تھے۔ زمین ہموار کی جارہی تھی۔ اور کہیں کہیں نئے مکانوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ صرف بستی کے آخری حصّہ میں ایک چھوٹا سا کھپریل کا گھر اب تک آباد تھا۔ جیسے کسی خاندان کے سب آدمی مرگئے ہوں۔ اور صرف ایک بوڑھا کمزور اور مریض آدمی نام لیوا باقی رہ گیا ہو۔ یہی کلثوم کا گھر ہے جسے اپنے وعدہ کے ایفا، میں سورداس کی خاطر سے مسٹر جان سیوک نے گرانے نہیں دیا۔ دروازہ پر نسیمہ اور جابر کھیل رہے ہیں اور طاہر علی ایک ٹوٹی چار پائی پر سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے ان کی حجامت نہیں بنی۔ بدن کمزور ہے۔ چہرہ اُترا ہوا ہے۔ آنکھیں آگے کو نکل آئی ہیں۔ سر کے بال بھی کھچڑی ہوگئے ہیں۔ قید کی تکلیفوں اور گھر کی فکروں نے کمر توڑدی ہے۔ وقت کی رفتار نے ان پر برسوں کا کام مہینوں میں کر ڈالا ہے۔ ان کے اپنے کپڑے جو جیل سے چھوٹتے وقت واپس ملے ہیں اُتارے سے معلوم ہوتے ہیں۔ آج صبح وہ نینی جیل سے آئے ہیں اور گھر کی درد ناک حالت نے انھیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ بال بنوانے تک کو جی نہیں چاہتا۔ ان کے آنسو نہیں تھمتے۔ دل کو سمجھانے پر بھی نہیں تھمتے۔ اس وقت بھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ وہ تکلیفیں یاد آرہی ہیں جو انھوں نے خاندان کے لیے خوشی سے جھیلی تھیں۔ وہ ساری تکلیفیں ساری قربانیاں بیکار گئیں۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں؟ اسی دن کے لیے اپنے خون سے خاندان کے درخت کو سینچا تھا۔ یہی کڑوے پھل کھانے کے لیے؟ آخر میں جیل میں ہی کیوں گیا تھا۔ میری آمدنی میرے بچوں کی پرورش کے

لیے کافی تھی۔ میں نے جان دی خاندان کے لیے۔ ابا نے جو بوجھ میرے سر رکھ دیا تھا وہی میری تباہی کا سبب ہوا۔ غضب خدا کا مجھ پر یہ ستم! مجھ پر یہ قہر! میں نے کبھی نئے جوتے نہیں پہنے۔ برسوں کپڑوں میں پیوند لگا لگا کر دن گزارے۔ بچے مٹھائیوں کو ترس ترس کر رہ جاتے تھے۔ بیوی کے سر کے لیے تیل بھی میسرّ نہ ہوتا تھا۔ چوڑیاں پہننا نصیب نہ تھا۔ ہم نے فاقے کیے۔ زیور اور کپڑوں کی کون کہے، عید کے دن بھی بچوں کو نئے کپڑے نہ ملتے تھے۔ کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بیوی کے لیے ایک لوہے کا چھلا بنواتا۔ اُلٹے اس کے سارے گہنے فروخت کر کرکے کھلا دیے۔ اس تمام نفس کشی کا یہ نتیجہ اور وہ بھی میری غیر حاضری میں۔ میرے بچے اس طرح گھر سے نکال دیے گیے گویا کسی غیر کے بچے ہیں۔ میری بیوی کو رو رو کر دن کاٹنے پڑے۔ کوئی آنسو پونچھنے والا بھی نہ تھا۔ اور میں نے اسی کمبخت لونڈے کے لیے غبن کیا تھا۔ اسی کے لیے امانت میں خیانت کی تھی۔ کیا میں مرگیا تھا؟ اگر وہ لوگ میرے بال بچوں کو اچھی طرح عزت آبرو سے رکھتے تو کیا میں ایسا گیا گزرا تھا کہ ان کے احسان کے بار سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کرتا؟ نہ دودھ گھی کھلاتے نہ تنزیب ادھی پہناتے۔ روکھی روٹیاں ہی دیتے۔ گزی گاڑھا پہناتے مگر گھر میں تو رکھتے۔ وہ روپیوں کے پان کھا جاتے ہوں گے اور یہاں میری بیوی کو سلائی کرکے اپنا گزر بسر کرنا پڑا۔ ان ہی جیسوں سے تو جان سیوک ہی اچھے جنھوں نے رہنے کا مکان تو نہ گرایا۔ مدد کرنے کے لیے آئے تو۔

کلثوم نے یہ مصیبت کے دن سلائی کرکے گزارے تھے ۔ دیہات کی عورتیں اس کے یہاں اپنے لیے کرتیاں، بچوں کے لیے ٹوپ اور کرتے سلاتیں۔ کوئی پیسے دے جاتی، کوئی اناج، اسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی۔ طاہر علی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی اس سے زیادہ آرام نہ دے سکتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت سر پر اپنا شوہر تھا اور اب کوئی نہ تھا۔ اس بے کسی نے مصیبت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ تاریکی میں تنہائی زیادہ خوفناک ہوجاتی ہے۔

طاہر علی سرجھکائے غمگین بیٹھے تھے کہ کلثوم نے دروازہ پر آکر کہا۔ شام ہوگئی اور ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ چلو۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ طاہر علی نے سامنے کے

کھنڈروں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ماہر تھانہ ہی میں رہتے ہیں یا کہیں اور مکان لیا ہے؟

کلثوم: مجھے کیا خبر۔ یہاں تب سے جھوٹوں بھی تو نہیں آئے۔ جب یہ مکانات خالی کرائے جارہے تھے۔ جبھی ایک روز سپاہیوں کو لے کر آئے تھے۔ نسیمہ اور صابر چچا چچا کہہ کر دوڑے، پر انھوں نے دونوں کو پھٹکار دیا۔

طاہر علی: ہاں کیوں نہ پھٹکار تے۔ ان کے کون ہوتے تھے۔

کلثوم: چلو دو لقمے کھالو۔

طاہرعلی: ماہر میاں سے ملے بغیر مجھ پر آب و دانہ حرام ہے۔

کلثوم: مل لینا۔ کہیں بھاگے جاتے ہیں۔

طاہرعلی: جب تک جی بھر کر اس سے باتیں نہ کر لوں گا۔ دل کو تسکین نہ ہوگی۔

کلثوم: خدا انھیں خوش رکھے۔ ہماری بھی تو کسی طرح کٹ ہی گئی۔ خدا نے کسی نہ کسی حیلہ سے رزق پہنچا تو دیا۔ تم سلامت رہوگے تو ہماری پھر آرام سے گزرے گی اور پہلے سے زیادہ آرام سے۔ دو کو کھلا کر کھائیں گے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اس کا ثواب اور عذاب ان کو خدا سے ملے گا۔

طاہر علی: خدا ہی انصاف کرتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی؟ اس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اتنے میں ایک بڑھیا سر پر ٹوکری رکھے آکر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ بہو۔ لڑکوں کے لیے بھٹے لائی ہوں۔ کیا تمھارے میاں آگئے کیا؟

کلثوم: بڑھیا کے ساتھ کوٹھری میں چلی گئی۔ اس کے کچھ کپڑے سیے تھے۔ دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

اندھیری رات دریا کی لہروں کی طرح مشرق سے دوڑی چلی آرہی تھی۔ وہ کھنڈر ایسے بھیانک معلوم ہوتے تھے گویا کوئی قبرستان ہے۔ نسیمہ اور صابر دونوں آکر طاہر علی کی گود میں بیٹھ گئے؟

نسیمہ نے پوچھا۔ ابّا اب تو ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ گے؟

صابر: اب جائیں گے تو میں انھیں پکڑ لوں گا۔ دیکھیں کیسے چلے جاتے ہیں۔

طاہرعلی: میں تمھارے لیے مٹھائیاں بھی نہیں لایا۔

نسیمہ: تم تو ہمارے ابّا جان ہو تم نہیں تھے تو چچا نے ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا تھا۔

صابر: پنڈا جی نے ہمیں پیسے دیے تھے۔ یاد ہے نا نسیمہ؟

نسیمہ: اور سورداس کی جھونپڑی میں ہم تم جا کر بیٹھے تو اس نے ہمیں گڑ کھانے کو دیا تھا۔ مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔

صابر: اس بیچارے کو ایک صاحب نے گولی ماردی ابّا۔ مرگیا۔

نسیمہ: یہاں پلٹن آئی تھی۔ ابّا۔ ہم لوگ ڈر کے مارے گھر سے نہ نکلتے تھے۔ کیوں صابر؟

صابر: نکلتے تو پلٹن والے پکڑ نہ لے جاتے!

بچّے تو باپ کی گود میں بیٹھ کر چہک رہے تھے مگر باپ کا دھیان ان کی طرف نہ تھا۔ وہ ماہرعلی سے ملنے کو بے قرار تھے۔ اب موقع پایا تو بچوں سے مٹھائیاں لانے کا حیلہ کر کے چل کھڑے ہوئے۔ تھانا میں پہنچ کر پوچھا۔ تومعلوم ہوا کہ داراغہ جی اپنے دوستوں کے ساتھ بنگلہ میں رونق افروز ہیں۔ طاہرعلی بنگلہ کی طرف چلے جو پھوس کا ایک ہشت پہل جھونپڑا تھا۔ بیلوں سے سجا ہوا۔ ماہرعلی نے برسات میں سونے اور اپنے احباب کی صحبت کا لطف اُٹھانے کے لیے اسے بنوایا تھا۔ چاروں طرف سے ہوا جاتی تھی۔ طاہرعلی نے سامنے جاکر دیکھا تو کئی اصحاب مسند لگائے بیٹھے تھے۔ بیچ میں اگالدان رکھا ہوا تھا۔ خمیرہ تمباکو دھواں دھار اُڑ رہی تھی۔ ایک طشتری میں پان الائچی رکھے ہوئے تھے۔ وہ چوکیدار کھڑے پنکھا جھل رہا تھا۔ اس وقت تاش کی بازی ہورہی تھی۔ درمیان میں مذاق بھی ہونے لگتا تھا۔ طاہرعلی کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہاں یہ جلسے ہورہے ہیں ۔ یہ عیش کی گرم بازاری ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا نہیں۔ روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنا پان تمباکو میں اُڑ جاتا ہوگا اتنے میں میرے بال بچّوں کی پرورش ہوجاتی۔ غصہ سے ہونٹ چبانے لگے۔ خون کھولنے لگا۔ بے دھڑک مجلس میں گھس گئے۔ اور غم و غصّہ سے دیوانہ ہوکر بولے۔ ماہر! مجھے پہچانتے ہو کون ہوں؟ غور سے دیکھ لو۔ بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے

ہوئے کپڑوں نے میری صورت اتنی بدل ڈالی ہے کہ پہچانا نہ جاسکوں۔ بدحالی صورت کو نہیں تبدیل کرسکتی۔ دوستو۔ آپ لوگ شاید نہ جانتے ہوں گے۔ میں اس بے وفا، دغاباز، کمینہ آدمی کا بھائی ہوں۔ اس کے لیے میں نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو اپنی بیوی کو۔ اپنی ذات کو اس کے لیے مٹا دیا۔ اس کی ماں اور اس کے بھائیوں کے لیے میں نے وہ سب کچھ برداشت کیا جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اسی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس کے شوق اور تعلیم کا خرچ کا ادا کرنے کے لیے میں نے قرض لیا۔ اپنے آقا کے مال میں تصرف کیا اور جیل بھی گیا۔ ان تمام نیکیوں کا بدلہ یہ ہے کہ اس کم ظرف نے میرے بال بچوں کی بات بھی نہ پوچھی۔ یہ اسی روز مرادآباد سے آیا جس روز مجھے سزا ہوئی تھی۔ میں نے اسے تانگہ پر آتے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسوں بھر آئے۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا کہ میرا بھائی ابھی آکر میری تشفی کرے گا۔ اور گھر کو سنبھالے گا۔ مگر یہ احسان فراموش سیدھا چلا گیا۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں، منہ پھیر لیا۔ اُس کے دو چاردن بعد یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ میرے بچوں کو وہیں ویرانہ میں چھوڑدیا۔ یہاں مجلس سجی ہوئی ہے۔ عیش ہو رہا ہے اور وہاں میرے تاریک مکان میں چراغ بتی کی بھی صورت نہیں۔ خدا اگر منصف ہوتا تو اس کے سر پر اُس کا قہر بجلی بن کر گرتا۔ لیکن اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا۔ آپ لوگ اس ظالم سے پوچھیے کہ کیا میں اسی بیدردانہ سلوک کا سزاوار تھا؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے فقیروں کی سی زندگی بسر کی تھی؟ اس کو شرمندہ کیجیے۔ اُس کے چہرہ پرکا لکھ لگایئے۔ اس کے منہ پر تھوکیے۔ نہیں، آپ لوگ اس کے دوست ہیں۔ مروت کے سبب انصاف نہ کرسکیں گے۔ اب مجھی کو انصاف کرنا پڑے گا۔ خدا گواہ ہے، اور خود اس کادِل گواہ ہے کہ آج تک میں نے اِسے کبھی تیز نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسے کھلاکر خود فاقہ کیا۔ اسے پہناکر خود برہنہ رہا۔ مجھے یاد ہی نہیں آتا کہ میں نے کبھی نئے جوتے پہنے تھے ۔کبھی کپڑے بنوائے تھے۔ اس کے اتارے ہوئے جوتوں اور کپڑوں ہی پر میری بسر ہوتی تھی۔ ایسے ظالم پر اگر خدا کا عذاب نہیں نازل ہوتا تواس کا سبب یہی ہے خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیاہے۔

طاہر علی نے تیزی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور قبل اس کے ماہر علی کچھ

جواب دیں یا جواب سوچ سکیں طاہر علی نے جھپٹ کر قلمدان اٹھالیا۔ اس کی سیاہی نکال لی اور ماہر علی کی گردن زور سے پکڑ کراس سیاہی کو اُن کے چہرہ پر مل دیا۔ پھر تین بار انھیں جھک کرسلام کیا اور آخر میں یہ کہہ کر وہیں بیٹھ گئے۔ میرے ارمان نکل گئے۔ میں نے آج سے سمجھ لیا کہ تم مرگئے۔ اور مجھے تو تم نے پہلے ہی سے مَرا ہوا سمجھ لیا ہے۔ بس ہمارے اور تمھارے درمیان اتنا ہی رشتہ تھا۔ آج وہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں اپنی تمام تکالیف کا صلہ اور انعام پاگیا۔ اب تمھیں اختیار ہے مجھے گرفتار کرو۔ مارو یا ذلیل کرو۔ میں یہاں مرنے ہی کے لیے آیا ہوں۔ زندگی سے سیر ہوگیا ہوں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں اتنی دغا ہے اتنی بے وفائی ہے، اتناحسد ہے، اتنا کینہ ہے کہ یہاں زندہ رہ کر کبھی خوشی نہیں حاصل ہوسکتی۔

ماہر علی دم بخود سے بیٹھے رہے۔ مگر اُن کے ایک دوست نے کہا۔ مان لیجئے۔ انھوں نے بے وفائی کی۔

طاہر علی نے کہا۔ مان کیا لوں صاحب۔ بھگت رہاہوں۔ رو رہا ہوں۔ ماننے کی بات نہیں ہے۔

دوست نے کہا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اُنھوں نے ضرور بے وفائی کی۔ لیکن آپ بزرگ ہیں۔ یہ حرکت شرافت سے بعید ہے کہ کسی کو سرِ مجلس بُرا بھلا کہا جائے اور اُس کے چہرے پر سیاہی لگادی جائے۔

دوسرے دوست نے کہا۔ شرافت سے بعید ہی نہیں ہے دیوانگی ہے۔ ایسے شخص کو پاگل خانہ میں بند کر دینا چاہیے۔

طاہر علی: جانتا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ شرافت سے بعید ہے لیکن میں شریف نہیں ہوں۔ پاگل ہوں۔ دیوانہ ہوں۔ شرافت تو آنسو بن کر آنکھوں کی راہ بہہ گئی۔ جس کے بچّے گلیوں میں دوکانوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہوں۔ جس کی بیوی پڑوسیوں کا آٹا پیس کر اپنا گزر کرے۔ جس کی کوئی خبر لینے والانہ ہو۔ جس کے رہنے کو گھرنہ ہو۔ جس کے پہننے کو کپڑے نہ ہوں وہ شریف نہیں ہو سکتا اور نہ وہ آدمی شریف ہوسکتا ہے جس کے بے رحم ہاتھوں نے میری یہ دُرگت بنائی۔ اپنے جیل سے لوٹنے والے بھائی کو دیکھ کر مُنہ پھیر لینا اگر شرافت ہے تو یہ بھی شرافت ہے۔ کیوں میاں ماہر بولتے

کیوں نہیں۔ یاد ہے تم نئی اچکن پہنتے تھے اور جب تم اُسے اُتار کر پھینک دیا کرتے تھے تو میں پہن لیتا تھا؟ یاد ہے میرا مشاہرہ کل پچپن روپے ماہوار تھا اور وہ سب کا سب میں تمھیں مرادآباد بھیج دیا کرتا تھا۔ یاد ہے؟ دیکھو ذرا میری طرف دیکھو! تمھارے تمباکو کا خرچ میرے بال بچوں کے لیے کافی ہوسکتا تھا۔ نہیں تم سب کچھ بھول گئے۔ اچھی بات ہے بھول جاؤ۔ نہ میں تمھارا بھائی ہوں نہ تم میرے بھائی ہو۔ میری ساری تکلیفوں کا معاوضہ وہی سیاہی ہے جو تمھارے مُنہ پر لگی ہوئی ہے۔ لو رخصت اب تم پھر یہ صورت نہ دیکھوگے۔ اب حساب کے دن تمھارا دامن نہ پکڑوں گا۔ تمھارے اوپر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہہ کر طاہر علی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس اندھیرے میں جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔ جیسے ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور نکل جائے۔ ماہر علی نے بڑی دیر کے بعد سر اُٹھایااور فوراً صابون سے مُنہ دھو کر تولیہ سے صاف کیا۔ بعدہٗ آئینہ میں منہ دیکھ کر بولے۔ آپ لوگ گواہ رہیں۔ میں ان کواِس حرکت کا مزہ چکھاؤں گا۔

ایک دوست: اجی جانے بھی دیجیے۔ مجھے تودیوانہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرادوست: دیوانہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی سمجھداروں کا کام ہے؟

ماہر علی: ہمیشہ سے بیوی کے غلام رہے جس طرف چاہتی ہے ناک پکڑ کر گھما دیتی ہے۔ آپ لوگوں سے خانگی دُکھڑا کیا روؤں؟ میری ماں کی، بھائیوں کی اور خود میری بھاوج کے ہاتھوں جو دُرگت ہوئی ہے وہ کسی دُشمن کی بھی نہ ہو۔ کبھی بلا روئے دانہ نہ نصیب ہوتا تھا۔ میری البتہ یہ ذرا خاطر کرتے تھے۔ سمجھتے رہے ہوں گے کہ اس کے ساتھ ذرا ظاہر کردو جس سے زندگی بھر کے لیے میرا غلام ہوجائے گا ایسی عورت کے ساتھ نباہ کیوں کر ہوتا؟ یہ حضرات توجیل میں تھے۔ وہاں اُس نے ہم لوگوں کو فاتحہ کرانے شروع کیے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ بڑی مُصیبت میں پڑا۔ وہ توکہیئے۔ دور اندیشی کرنے سے یہ آسامی مل گئی، ورنہ خدا ہی جانے کہ ہم لوگوں کی کیا حالت ہوتی۔ ہم نہارمنہ تمام دن بیٹھے رہتے تھے۔ اور مٹھائیاں منگا منگا کر کھائی جاتی تھیں۔ میں ہمیشہ سے ان کا ادب کرتا رہا۔ یہ اسی کا صلہ ہے جو آپ نے عطا فرمایا ہے، آپ لوگوں نے دیکھا کہ میں نے اتنی ذلت گوارا کی مگر سر تک نہیں اٹھایا۔ زبان تک نہیں کھولی۔

نہیں ایک دھکا دیتا تو بیسوں قلابازیاں کھاجاتے۔ اب بھی دعویٰ کردوں توحضرت بندھے بندھے پھریں مگر اس وقت دنیا یہی کہے گی کہ بڑے بھائی کو ذلیل کیا۔
ایک دوست: جانے بھی دو میاں گھروں میں ایسے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بے حیاؤں کی بلادور کردوں کے لیے شرم نہیں ہے۔ لاؤ تاش اٹھاؤ۔ اب تک تو ایک بازی ہوگئی ہوتی۔
ماہر علی: قسم کلام شریف کی۔ ابّاں جان نے اپنے پاس کے دو ہزار روپے ان لوگوں کو کھلادیے۔ ورنہ پچیس روپیوں میں یہ بیچارے کیا کھاکر سارے خاندان کا خرچ سنبھالتے۔
ایک کانسٹیبل: ہجور۔ گھر گرستی میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔جانے دیجیے۔ جوہوا سو ہوا۔ وہ بڑے ہیں آپ چھوٹے ہیں دنیا اُنھیں کوتھوکے گی۔ آپ کی بڑائی ہوگی۔
ایک دوست: میرا شیر کیسا لپکا ہو گیا اور قلمدان سے سیاہی اُنڈیل کر مل ہی تو دی۔ مانتا ہوں۔
ماہرعلی: حضرت۔ اس وقت دل نہ جلایئے قسم خدا کی بڑا ملال ہے۔

طاہر علی یہاں سے چلے تو ان کی حالت میں وہ اضطراب نہ تھا۔ دل میں پچھتا رہے تھے کہ ناحق اپنی شرافت میں بٹہ لگایا۔ گھر آئے تو کلثوم نے پوچھا کہاں غائب ہوگئے؟ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ بچّے روکر سوگئے کہ ابّا پھر چلے گئے۔
طاہر علی: ذرا ماہر علی سے ملنے گیا تھا۔
کلثوم: اس کی ایسی کیا جلدی تھی؟ کل مل لیتے۔ تمھیں یوں پھٹے حالوں دیکھ کر شرمائے تو نہ ہوں گے۔
طاہر علی: میں نے انھیں ایسی سنائی کہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔ زبان تک نہ کھلی۔ اسی غصّہ میں میں نے اس کے چہرہ پر کالکھ بھی لگا دی۔

کلثوم اُداس ہوگئی۔ بولی۔ تم نے بڑی نادانی کا کام کیا۔ یہ کالکھ تم نے اس کے منہ میں نہیں بلکہ اپنے منہ میں لگائی ہے۔ تمھاری زندگی بھر کے کئے دھرے پر سیاہی پھر گئی۔ تم نے اپنی ساری نیکیوں کو ملیا میٹ کو دیا۔ آخر یہ تمھیں سوجھی بھی کیا۔

تم تو اتنے غصہ ور کبھی نہیں تھے۔ اتنا صبر نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی ہی تھے۔ ان کی پرورش کی تو کون سی حاتم کی قبر پر لات ماری۔ چھی چھی۔ انسان کسی غیر کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہے۔ تو وہ دریا میں ڈال دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ قرض وصول کرتا پھرے۔ تم نے جو کچھ کیا، خدا کی راہ میں کیا۔ اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ قرض نہیں دیا تھا کہ معہ سود واپس لے لو۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے، نہ رکھا۔ ابھی دنیا ان کو ہنستی تھی۔ اب تمھیں ہنسے گی۔ دنیا ہنسے یا نہ ہنسے۔ اس کی پرواہ نہیں۔ اب تک خدا اوررسول کی نظروں میں وہ خطا وار تھے۔ اب تم خطا وار ہو۔

طاہر علی نے نادم ہوکر کہا۔ حماقت تو ہوگئی۔ مگر میں تو بالکل دیوانہ ہوگیا تھا۔

کلثوم: بھری مجلس میں انھوں نے سرتک نہ اُٹھایا۔ پھر بھی تمھیں غیرت نہ آئی۔ میں تو کہوں گی تم سے کہیں زیادہ شریف وہی ہیں ورنہ تمھاری آبرو ریزی کر دینا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔

طاہر علی: اب یہی خوف ہے کہ کہیں مجھ پر دعوا نہ کر دے۔

کلثوم: ان میں تم سے زیادہ انسانیت ہے۔

کلثوم نے اتنا شرمندہ کیا کہ طاہر علی روپڑے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر بہت منانے پر کھانا کھانے کو اُٹھے اور کھاپی کر سوئے۔ تین روز تک وہ اسی کوٹھڑی میں پڑے رہے۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کہاں جائیں کیا کریں۔ کیسے گزر بسر کریں؟ چوتھے دن گھر سے نوکری کی تلاش میں نکلے مگر کہیں کوئی صورت نہ نکلی۔ یکا یک انھیں سوجھی کہ کیوں نہ جلدبندی کا کام کروں۔ جیل خانہ میں وہ اس کام کو سیکھ گئے تھے۔ ارادہ پختہ ہوگیا۔ کلثوم نے بھی پسند کیا۔ بلا سے تھوڑا ملے گا۔ کسی کے غلام تو نہ رہوگے۔ سند کی ضرورت نوکری ہی کے لیے ہے۔ وہاں جیل سے آئے ہوؤں کا گزر نہیں۔ پیشہ وروں کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ ان کا کام ہی ان کی سند ہے۔ چوتھے روز طاہر علی نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر کے دوسرے محلّہ میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر جلد بندی کا کام کرنے لگے۔

ان کی بنی ہوئی جلدیں بہت خوبصورت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ کام کی کمی نہیں ہے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ انھوں نے اب دو تین جلدسازوں کو نوکر رکھ لیا

ہے اور شام تک دو تین روپے کی مزدوری کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی اتنے مرفہ حال نہ تھے۔

(48)

بنارس کے میونسپل بورڈ میں مختلف سیاسی عقائد کے لوگ موجود تھے۔ بادشاہت سے لے کر جمہوریت تک سبھی خیالات کے لوگ تھے۔ ابھی تک دولت وثروت کا بول بالا تھا۔ مہاجنوں اور رئیسوں کی کثرت تھی۔ جمہوریت پسند فرقہ کمزور تھا۔ اسے سر اُٹھانے کی ہمّت نہ پڑ تی تھی۔ راجہ مہندر کمار کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی ان کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ مگر پانڈے پور کے ستیاگرہ نے جمہوریت پسندوں میں‌ایک نئی اجتماعی قوت پیدا کردی۔ اس سانحہ کا سارا الزام راجہ صاحب پر عاید کیا جانے لگا۔ تحریک شروع ہوئی کہ ان پر بد اعتقادی کی تجویز پیش کی جائے۔ تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ جمہوریت کے حامیوں نے طے کر لیا کہ موجودہ انتظام کا خاتمہ کر دینا چاہیے جس کی وجہ سے عوام کو اتنی مصیبت برداشت کرنی پڑی۔ راجہ صاحب کے لیے یہ ایک سخت امتحان کا موقع تھا۔ ایک طرف تو حکّام ان سے بدظن تھے۔ دوسری طرف یہ مخالف جماعت اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل میں پڑے۔ انھوں نے جمہوریت پسندوں کی مدد سے حکّام کی مخالفت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کے سیاسی عقائد میں بھی کچھ تغیر واقع ہوگیا تھا۔ وہ عوام کو ساتھ لے کر میونسپلٹی کا کام کرنا چاہتے تھے۔ پر اب کیا ہو؟ اس تجویز کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ جمہوریت پسند طبقہ کے رہنماؤں سے ملے۔ ان کی بہت کچھ تشفی کی کہ آئندہ ان کی مرضی کے خلاف کو ئی کام نہ ہوگا۔ اِدھر اپنی جماعت کو بھی مضبوط کرنے لگے۔ جمہوری خیالات والوں کو وہ ہمیشہ سے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے لیکن اب مجبوراً انھیں کی خوشامد کرنی پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ بورڈ میں یہ تجویز رکھ دی گئی تو اس کا منظور ہوجانا یقینی ہے۔ خود دوڑتے تھے۔ اپنے دوستوں کو بھی دوڑاتے تھے کہ کسی طرح یہ بلا سر سے دور ہو مگر پانڈے پور کے جلاوطنوں کا تمام شہر میں روتے پھرنا ان کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے۔ ہمیں کیوں کر یقین ہو کہ ایسی حالت میں آپ پھر خود سری سے کام نہ کریں گے۔ سورداس ہمارے شہر کا ایک رتن تھا۔ ونے سنگھ اور اندردت انسانی جماعت

کے دو رتن تھے۔ ان کا خون کس کی گردن پر ہے۔

بالآخر وہ تجویر حسب ضابطہ بورڈ میں پیش ہی کردی گئی۔ اس روز تڑکے ہی سے بورڈ کے احاطہ میں لوگوں کا مجمع ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے دس بارہ ہزار آدمی جمع ہوئے۔ ایک بجے تجویز پیش ہوئی۔ راجہ صاحب نے کھڑے ہوکر نہایت دردناک انداز پر اپنی صفائی دی۔ ثابت کیا کہ میں مجبور تھا اگر اسی حالت میں میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ وہی کرتا جو میں نے کیا۔ کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ''مجھے عہدہ کی پرواہ نہیں عزت کی پرواہ نہیں۔ صرف آپ کی خدمت کی پرواہ ہے۔ اب اور بھی زیادہ اس لیے کہ مجھے پرائسچت کرنا ہے جسے اس عہدہ سے سبکدوش ہوکر میں نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ اس کا ذریعہ ہی میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ سورداس سے مجھے اتنی ہی عقیدت ہے جتنی کسی اور شخص کو ہوسکتی ہے۔ آپ لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں نے شفاخانہ میں جاکر ان سے معافی مانگی تھی اور سچے دل سے افسوس ظاہر کیا تھا۔ سورداس ہی کا حکم تھا کہ میں اپنے عہدہ پر قائم رہوں ورنہ میں نے تو پہلے ہی سے استعفا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کنور ونے سنگھ کی ناوقت وفات کا رنج جتنا مجھے ہے اتنا ان کے والدین کے علاوہ کسی کو نہیں ہو سکتا وہ میرے بھائی تھے۔ ان کی وفات میرے لیے شرم ناک ہے جس کا اندوہ تاحیات رہے گا۔ اندردت سے بھی میری گہری دوستی تھی کیا میں اتنا کمینہ اتنا مکار ہوں کہ اپنے ہاتھوں اپنے بھائی اپنے دوست کی گردن پر چھری پھیرتا۔ یہ الزام بالکل نامنصفانہ ہے۔ یہ میرے جلے ہوئے پر نمک چھڑکنا ہے۔ میں اپنے ضمیر اور خدا کے سامنے بے گناہ ہوں۔ میں آپ کو اپنی خدمتوں کی یاد نہیں دلانا چاہتا وہ تو مسلم ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کی خدمت میں اپنا کتنا وقت صرف کیا ہے۔ کتنی محنت کتنی جانفشانی کی ہے۔ میں رعایت نہیں چاہتا۔ صرف انصاف چاہتا ہوں۔

تقریر نہایت موثر تھی۔ مگر جمہوریت پسندوں کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکی۔ پندرہ منٹ میں کثرت رائے سے ریزولیوشن منظور ہوگیا اور راجہ صاحب نے بھی اسی وقت استعفے دے دیا۔ جب وہ بورڈ کے کمرہ سے باہر نکلے تو عوام نے جنھیں ان کی

تقریر سننے کا موقعہ نہ ملا تھا ان پر اتنی بھپتیاں اُڑائیں اتنی تالیا ں بجائیں کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے موٹر تک پہنچ سکے۔ پولیس نے کافی احتیاط نہ برتی ہوتی تو ضرور فساد ہوجاتا۔ راجہ صاحب نے ایک بار مڑ کر بورڈ کے کمرہ کو آبدیدہ ہو کر دیکھا اور چلے گئے۔ نیک نام ہونا ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ اور اس کا یاس انگیز نتیجہ بھی۔ زندگی بھر کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا، ساری نیک نامی، ساری عزت، ساری شہرت عوام کے غصہ کے سیلاب میں بہہ گئی۔

راجہ صاحب وہاں سے چلے گئے گھر آئے تو دیکھا کہ اندو اور صوفیہ دونوں بیٹھی ہوئی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی اندو بولی۔ مس صوفیہ سورداس کا مجسمہ نصب کرنے کے لیے چندہ جمع کر رہی ہیں۔ آپ بھی تو اس کی جانبازی کے مداح تھے۔ کتنا دیجئے گا؟

صوفیہ: اندو رانی نے ایک ہزار روپے دیے ہیں اور اس کے دوگنے سے کم دینا آپ کے لیے نازیبا ہوگا۔

مہندر کمار: میں اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔

صوفیہ: میں پھر کب آؤں؟

مہندر کمار نے ظاہر داری سے کہا۔ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھیج دوں گا۔

صوفیہ نے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا تو تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ تو راجہ صاحب نے اندو سے کہا۔ تم مجھ سے بلا پوچھے ایسا کام کیوں کر گزرتی ہو جس سے میری سراسر بے عزتی ہوتی ہے؟ میں تمھیں کتنی بار سمجھا کر ہار گیا۔ آج اسی اندھے کی بدولت مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ بورڈ نے مجھ پر بے اعتمادی کا روزولیوشن پاس کردیا اور اسی کے مجسمہ کے لیے تم نے چندہ دیا اور مجھے بھی دینے کو کہہ رہی ہو۔

اندو: مجھے کیا خبر تھی کہ بورڈ میں کیا ہورہا ہے۔ آپ نے بھی تو کہا تھا کہ اس روزولیوشن کے پاس ہونے کا امکان نہیں ہے۔

راجہ: کچھ نہیں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو۔

اندو: آپ اس روز سورداس کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ چندہ دینے

میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں کسی کے دل کی بات تھوڑی جانتی ہوں۔ آخروہ روزولیوشن پاس کیسے ہوگیا۔

راجہ: اب میں کیا جانوں کہ کیسے پاس ہوگیا۔ اتنا جانتا ہوں کہ پاس ہوگیا۔ ہمیشہ سبھی کام اپنی مرضی یا اُمید کے موافق تو ہوا نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر میرا کامل اعتماد تھا انھیں نے دغا کی وہ بورڈ میں آئے ہی نہیں۔ میں اتنا متحمل مزاج نہیں ہوں کہ جس کے سبب میری ذلّت ہو اُسی کی پرستش کروں۔ میں حتےٰ الامکان اس مجسمہ والی تحریک کو سرسبز نہ ہونے دوں گا۔ بدنامی تو ہوہی رہی ہے۔ اور ہو اس کی پرواہ نہیں۔ میں سرکار کو ایسا بھر دوں گا کہ مجسمہ نصب نہ ہونے پائے گا۔ ملک کو نفع پہنچانے کی طاقت اب چاہے نہ ہو پر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے اور یہ طاقت روز بروز بڑھتی جائے گی۔ تم بھی اپنا چندہ واپس لے لو۔

اندو: (متحیر ہوکر) دیے ہوئے روپے واپس کرلوں؟

راجہ: ہاں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔

اندو: آپ کو کوئی ہرج نہ معلوم ہوتا ہو۔ میری تو اس میں سراسر ذلّت ہے۔

راجہ: جس طرح تمھیں میری ذلّت پرواہ نہیں اسی طرح اگر میں کبھی تمھاری ذلّت کی پرواہ نہ کروں تو کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

اندو: میں آپ سے روپے تو نہیں مانگتی۔

بات پر بات نکلنے لگی۔ حتےٰ کہ ردّوکد پر نوبت پہنچی۔ پھر طنز کی باری آئی حتےٰ کہ ایک لمحہ میں بدزبانی ہونے لگی۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق دونوں حق پر تھے۔ اس لیے کوئی نہ دبتا تھا۔

راجہ صاحب نے کہا۔ نہ جانے وہ کون سا دن ہوگا کہ مجھے تم سے نجات ملے گی۔ موت کے سوا شاید اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

اندو: آپ کو اپنی عزت و نیک نامی مبارک رہے۔ میرا بھی ایشور مالک ہے۔ میں زندگی سے تنگ آگئی۔ کہاں تک لونڈی بنوں؛ اب حد ہوگئی۔

راجہ: تم میری لونڈی بنوگی! وہ دوسری ستی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں پر جان نچھاور کر دیتی ہیں۔ تمھارا بس چلے تو مجھے زہر دے دو اور دے ہی رہی ہو۔ اس سے

بڑھ کر اور کیا ہوگا؟

اندو: یہ زہر کیوں اگلتے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ جانتی ہوں کہ آپ کو میرا رہنا شاق گزرتا ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ اسی دن جان گئی تھی۔ جب میں نے ایک مہری کو اپنی ساڑی دے دی تھی اور آپ نے مہا بھارت مچایا تھا۔ اسی دن سمجھ گئی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ جتنے دن یہاں رہی۔ کبھی آپ نے یہ سمجھنے نہ دیا کہ یہ میرا گھر ہے۔ پیسے پیسے کا حساب دے کر بھی گلا نہیں چھوٹا۔ شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ میرے ہی روپے کو اپنا کہہ کر من مانا خرچ کرتی ہے اور یہاں آپ کا ایک دھیلا چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ کے ساتھ بیاہ ہوا ہے آپ کے ہاتھوں کچھ اپنا ضمیر نہیں فروخت کر دیا۔

مہندر نے ہونٹ چبا کر کہا۔ بھگوان سب دکھ دے، پر برے کا ساتھ نہ دے۔ موت پہلے ہی دے دے۔ تم جیسی عورت کا گلا گھونٹ دینا بھی ثواب میں داخل ہے۔ اس حکومت کی خیریت مناؤ کہ چین کر رہی ہے۔ اپنی حکومت ہوتی تو یہ قینچی سی چلنے والی زبان تالو سے کھینچ لیتا۔

اندو: اچھا اب چپ رہیئے بہت ہوگیا۔ میں آپ کی گالیاں سننے نہیں آئی ہوں۔ یہ لیجیے اپنا گھر۔خوب پیر پھیلا کر سوئیے۔

راجہ: جاؤ۔کسی طرح دفان بھی ہو۔ بلّی بخشے چوہا اکیلا ہی بھلا۔

اندو نے دبی زبان سے کہا۔ یہاں کون تمھارے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔

راجہ نے غضبناک ہو کر کہا۔ گالیاں دے رہی ہو۔ زبان کھینچ لوں گا۔

اندو جانے کے لیے دروازہ تک گئی تھی۔ یہ دھمکی سن کر لوٹ گئی۔ اور شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ اس بھروسہ پر نہ رہئے گا۔ بھائی مرگیا ہے تو کیا گڑکا باپ کولھو تیار ہے۔ سر کے بال نہ بچیں گے۔ ایسے ہی بھلے مانس ہوتے تو دنیا میں اتنا اُپہس (رسوائی) کیسے کماتے؟

یہ کہہ کر اندو اپنے کمرہ میں بیٹھ گئی۔ ان چیزوں کو سمیٹا جو اسے مایکہ میں ملی تھیں۔ وہ سب چیزیں الگ کردیں جو یہاں کی تھیں۔ فکر نہ تھی، غم نہ تھا۔ ایک آگ تھی جو اس کے نازک جسم میں زہر کی طرح پھیل رہی تھی۔ منہ سرخ تھا۔ روئیں

روئیں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ذلت ایک آتشیں شے ہے۔

اپنی سب چیزیں سنبھال کر اندو نے اپنی خاص گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی تیار ہونے تک وہ برآمدہ میں ٹہلتی رہی۔ جیوں ہی پھاٹک پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ جس گھر کی وہ رانی تھی جسے وہ اپنا سمجھتی تھی جس میں کہیں ذرا سا کوڑا پڑا ہوا دیکھ کر وہ نوکروں کے سر ہوجاتی تھی۔ اسی گھر سے نکل گئی جیسے روح قالب سے۔ اسی قالب سے جس کی وہ ہمیشہ حفاظت کرتی تھی اور جس کی ذرا ذرا سی تکلیف سے خود بے چین ہوجاتی تھی۔ کسی سے کچھ نہ کہا اور نہ کسی کی ہمت پڑی کہ اس سے کچھ پوچھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد مہرا جن نے جاکر مہیندر سے کہا۔ سرکار رانی بہو نہ جانے کہاں چلی جارہی ہیں! مہیندر نے اس کی طرف گھور کر کہا۔ جانے دو۔

مہراجن: سرکار۔ صندوق اور صندوقچے لیے جاتی ہیں ۔

مہیندر: کہہ دیا جانے دو۔

مہراجن: سرکار روٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی دور نہ گئی ہوں گی۔ آپ منالیں ۔

مہیندر: میرا سر نہ کھا۔

اندو اپنا سب سامان لیے ہوئے سیوابھون پہنچی تو جانھوی نے کہا۔ تم لڑ کر آرہی ہو۔ کیوں؟

اندو: کوئی اپنے گھر نہ رہنے دے تو کیا زبردستی ہے؟

جانھوی: صوفیہ نے آتے ہی آتے مجھ سے کہا تھا۔ آج خیریت نہیں ہے۔

اندو: میں لونڈی بن کر نہیں رہ سکتی۔

جانھوی: تم نے ان سے بلا پوچھے چندہ کیوں لکھا؟

اندو: میں نے کسی کے ہاتھوں اپنا ضمیر نہیں بیچا۔

جانھوی: جو استری اپنے پرش کی ہتک کرتی ہے اسے لوک پر لوک کہیں شانتی نہیں مل سکتی۔

اندو: کیا آپ چاہتی ہیں کہ یہاں سے بھی چلی جاؤں؟ میرے زخم پر نمک نہ چھڑکیے۔

جانھوی : پچھتاؤ گی اور کیا۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی پر تم نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔
اندو یہاں سے اٹھ کر صوفیہ کے کمرہ میں چلی گئی۔ ماں کی باتیں اسے زہر سی لگیں۔

یہ جھگڑا اب ازدواجی دائرہ سے نکل کر سیاسی دائرہ میں پہنچا۔ مہیندر کمار اُدھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ اور صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی اٹھا رہے تھے۔ اِدھر اندو صوفیہ کے ساتھ چندہ وصول کرنے میں مصروف تھی۔ مسٹر کلارک ابھی تک راجہ صاحب سے کینہ رکھتے تھے۔ اپنی ذلّت بھولے نہ تھے۔ انھوں نے عوام کی اس تحریک میں دست اندازی کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ صاحب کی ایک نہ چلی۔ چندہ کثرت سے وصول ہونے لگا۔ ایک ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ آ گیا۔ کسی پر کسی طرح کا دباؤ نہ تھا۔ کسی سے کوئی سفارش نہ کرتا تھا۔ دونوں دیویوں کی کوششوں کا معجزہ تھا۔ نہیں ان شہیدوں کی جانبازی کی کرامات تھی۔ جنھیں یاد کر کے لوگ ابھی رویا کرتے تھے۔ لوگ خود آ کر چندہ دیتے تھے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ۔ مسٹر جان سیوک نے بھی اپنی خوشی سے ایک ہزار روپے دیے۔ اندو نے اپنا چندہ ایک ہزار تو دیا تھا۔ اب اپنے کئی قیمتی زیورات بھی دے ڈالے جو بیس ہزار کو فروخت ہوئے۔ راجہ صاحب کے دل پر سانپ سا لوٹتا رہتا تھا۔ پہلے پوشیدہ پھر علانیہ طور سے مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ گورنر کے پاس خود گئے۔ رؤسا کو بھڑکایا۔ سب کچھ کیا جو ہونا تھا وہ ہوکر رہا۔

چھ مہینے گزر گئے۔ سورداس کا مجسمہ بن کر آ گیا۔ پونا کے ایک مشہور کاریگر نے اسے ایک قومی خدمت سمجھ کر بنا دیا تھا۔ اسے پانڈو پور میں نصب کرنے کی تجویز تھی۔ جان سیوک نے بخوشی اجازت دے دی۔ جہاں سورداس کا جھونپڑا تھا وہیں اسے نصب کیا گیا۔ نیک ناموں کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے انسانوں کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ اشوک کی یاد بھی تو اس کے سنگین ستونوں کی تحریروں سے تازہ ہے۔ والمیک، دیاس، ہومر اور فردوسی سب کو تو نہیں ملتے۔

پانڈے پور میں بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہو رہا تھا۔ شہر کے لوگ اپنے کام چھوڑ کر اس میں شامل ہوئے تھے۔ رانی جانھوی نے اس مجسمہ کو قائم کیا۔ اس کے بعد

دیر تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ پھر قومی رہنماؤں کی پراثر تقریریں ہوئیں اور پہلوانوں نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ شام کو ایک دعوت دی گئی۔ چھوت اور اچھوت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ یہ سورداس کی سب سے بڑی فتح تھی۔ رات کو ایک ناٹک منڈلی نے سورداس نامی ناٹک کھیلا جس میں سورداس ہی کے حالت بیان کئے گئے تھے۔ پر بھوسیوک نے انگلستان سے یہ ناٹک بنا کر اسی موقع کے لیے بھیجا تھا۔ بارہ بجتے بجتے جلسہ ختم ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ وہاں سناٹا چھا گیا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور اس کی اجلی روشنی میں سورداس کی مورت ایک ہاتھ میں ٹیکتی ہوئی اور دوسرا ہاتھ کسی غیبی داتا کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔ وہی کمزور جسم تھا۔ ہنسلیاں نکلی ہوئی کمر جھکی ہوئی۔ چہرہ پر مسکینی اور سادگی چھائی ہوئی، مجسم سورداس معلوم ہوتا تھا ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ متحرک تھا اور یہ ساکن۔ وہ گویا تھا اور یہ خاموش۔ اور بنانے والے نے اس میں ایک ایسی محبت کی نمود بھری تھی جس کا اصل میں پتہ نہ تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیکنٹھ کا بھکاری دیوتاؤں سے سنسار کے کلیان کی بھیک مانگ رہا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایک شخص سائیکل پر سوار ہو کر مجسمہ کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی اوزار تھا۔ اس نے لمحہ بھر تو مورتی کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اور پھر اسی اوزار سے اس پر وار کیا۔ تڑاق کی آواز ہوئی اور وہ سنگین بت دھما کے ساتھ زمین پر آگرا اور اسی شخص پر جس نے اسے توڑا تھا۔ وہ شاید دوسرا وار کرنے والا تھا کہ اتنے میں بت گر پڑا ۔ وہ بھاگ نہ سکا۔ اسی کے نیچے دب گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا تو راجہ مہیدر کمار سنگھ تھے۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی کہ راجہ صاحب نے سورداس کی مورت توڑ ڈالی اور خود اسی کے نیچے دب گئے۔ جب تک جیا سورداس کے ساتھ دشمنی رکھی اور اس کے مرنے پر بھی دشمنی نہ چھوڑی۔ ایسے حاسد انسان بھی ہوتے ہیں۔ ایشور نے اس کا پھل بھی فوراً دے دیا۔ جب تک جئے۔ سورداس سے نیچا دیکھا اور مرے بھی اسی مجسمہ کے نیچے دب کر۔ دشمن قوم قاتل مکار۔ دغا باز اور اس سے بھی زیادہ ثقیل الفاظ میں ان کا ذکر کیا گیا۔

کاریگروں نے پھر مسالہ سے مورت کے پیر جوڑے اور کھرا کیا۔ لیکن اس ضرب

کے نشانات ابھی تک پیروں پر بنے ہوئے ہیں اور چہرہ بھی بگڑ گیا ہے۔

(50)

اِدھر سورداس کی یاد گار قائم کرنے کے لیے چندہ جمع کیا جارہا تھا۔ اُدھر قلیوں کے مکانات کی سنگ بنیاد رکھنے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ شہر کے معززین مدعو کیے گئے تھے۔ صوبہ کے گورنر سے سنگ بنیاد رکھنے کی استدعا کی گئی تھی۔ ایک گارڈن پارٹی ہونے والی تھی۔ بنگلہ کی صفائی اور آرائش ہو رہی تھی۔ جھالریں وغیرہ بنائی جارہی تھی۔ انگریزی بینڈ بلایا گیا تھا۔ مسٹر کلارک نے سرکاری اہلکاروں کو مسٹر سیوک کی مدد کے لیے تعینات کردیا تھا۔ اور خود بھی چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے۔

مسٹر سیوک کے دل میں اب ایک نئی امید پیدا ہوگئی تھی۔ شاید ونے سنگھ کی موت سے صوفیہ اب مسٹر کلارک کی طرف متوجہ ہو۔ اس لیے وہ مسٹر کلارک کی اور بھی خاطر ومدارت کررہی تھیں۔ صوفیہ کو خود جاکر ساتھ لانے کا قصد کر چکی تھیں۔ جیسے بنے گا ویسے لاؤں گی۔ خوشی سے نہ آئے گی تو جبراً لاؤں گی۔ پیروں پڑوں گی اور بغیر ساتھ لائے اس کا گلا نہ چھوڑوں گی۔

مسٹر جان سیوک کمپنی کی سالانہ رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ سال گزشتہ کا منافع ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے اسی موقع کو پسند کیاتھا۔ اگر واقعی منافع بہت کم ہوا تھا۔ مگر جمع خرچ میں حسب دلخواہ تصرف کرکے وہ اُمید سے بڑھ کر منافع دکھلانا چاہتے تھے کہ کمپنی کے حصص کا نرخ چڑھ جائے اور لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اِدھر کے نقصان کو وہ اس حکمت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ کلرکوں کو رات رات بھر کام کرنا پڑتا تھا۔ اور خود مسٹر سیوک حساب کے بنانے میں اس سے کہیں زیادہ محنت کررہے تھے۔ جتنا کہ جلسہ کی تیاری میں ۔

لیکن مسٹر ایشور سیوک کو یہ تیاریاں جنھیں وہ فضول خرچی کہتے تھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ بار بار جھنجلاتے تھے۔ بیچارے بوڑھے آدمی کو صبح سے شام تک سرکھپاتے گزرتا تھا۔ کبھی بیٹے پر جھلاتے۔ کبھی بہو پر۔ کبھی منتظموں پر کبھی ملازموں پر۔ یہ تو پانچ من برف کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لوگ اس میں نہائیں گے۔ من بھر کافی

تھی۔ کام تو نصف من سے ہی چل سکتا تھا۔ اتنی شراب کی کیا ضرورت؟ کوئی پر نالہ بہانا ہے یا مہمانوں کو پلا کر ان کی جان لینا ہے؟ اس سے کیا فائدہ کہ لوگ پی پی کر بدمست ہو جائیں اور آپس میں جوتی پیزار ہونے لگے؟ لگا دو گھر میں آگ یا مجھی کو زہر دے دو نہ زندہ رہوں گا نہ جلن ہوگی۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں لے۔ اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے۔ فوجی بینڈ کی کیا ضرورت؟ کیا گورنر کوئی بچہ ہے جو باجہ سن کر خوش ہوگا یا شہر کے رؤسا باجہ کے بھوکے ہیں۔ یہ آتشبازیاں کیا ہوں گی۔ غضب خدا کا! ایک سرے سے سب بھنگ پی گئے ہیں؟ گورنر کا خیر مقدم ہے پانچوں کا کھیل؟ پٹاخے اور چھچھوندریں کس کو خوش کریں گی؟ مانا کہ پٹاخے اور چھچھوندریں نہ ہوں گی۔ انگریزی آتشبازی ہوگی مگر کیا گورنر نے آتشبازی نہیں دیکھی؟ فضول کام کرنے سے کیا مطلب؟ کسی غریب کا گھر جل جائے۔ کوئی اور حادثہ ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ہندوستانی رئیسوں کے لیے یہ پھل میوے اور مربے مٹھائیاں منگانے کی کیا ضرورت؟ وہ ایسے بھوکے نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ایک ایک سگریٹ کافی تھا۔ ہاں پان الائچی کا بندوبست اور کردیا جاتا بس۔ وہ یہاں کوئی دعوت کھانے تو آئیں گے نہیں۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ سننے آئیں گے۔ ارے اوخانساماں سور! ایسا نہ ہو کہ میں تیرا سر توڑ کر رکھ دوں۔ جو جو وہ پگلی (مسز سیوک) کہتی ہے تو وہی کرتا ہے۔ تجھے بھی کچھ تمیز ہے کہ نہیں؟ جانتا ہے آج کل چار روپے سیر انگور ملتے ہیں۔ ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ خبردار جو یہاں انگور آئے۔ خلاصہ یہ کہ کئی دنوں کی لگاتار بکواس سے ان کی طبیعت کچھ خراب سی ہورہی تھی۔ کوئی ان کی سنتا نہ تھا۔ سب من مانی کرتے تھے۔ جب وہ بکتے بکتے تھک جاتے تو اٹھ کر باغ چلے جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آپہنچتے اور پہلے کی طرح لوگوں پر بگڑنے لگتے۔ یہاں تک کہ جلسہ کے ایک ہفتہ قبل جب مسٹر جان سیوک نے یہ تجویز کیا کہ گھر کے سب نوکر وں اور کارخانہ کے چپراسیوں کو الگن مل کی نئی وردیاں دی جائیں تو مسٹر ایشور سیوک نے غصہ کے مارے وہ انجیل جسے وہ ہاتھ میں لیے ہوئے ظاہرا عینک کی مدد سے مگر دراصل اپنے حافظہ سے پڑھ رہے تھے اپنے سر ٹپک لی اور بولے۔ یا خدا مجھے اس جنجال سے نکال! سر دیوار کے قریب تھا۔ یہ دھکا لگا تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ نوے برس کی عمر۔ کمزور جسم (وہ تو کہو پرانی ہڈیاں تھیں جو

کام دیتی تھیں) بے ہوش ہوگئے۔ دماغ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا۔ آنکھیں نکل آئیں ہونٹ کھل گئے اور جب تک لوگ ڈاکٹروں کو بلائیں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ خدا نے ان کی آخری دعا قبول کرلی۔ انھیں اس جنجال سے نکال لیا۔ یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی موت کا خاص سبب کیا تھا۔ چوٹ کا صدمہ یا خانگی تفکرات کا صدمہ۔

صوفیہ نے یہ خبر سنی تو اس کی کشیدگی جاتی رہی۔ اپنے گھر میں اب اگر کسی کو اس سے محبت تھی تو وہ ایشور سیوک ہی تھے۔ صوفیہ کو بھی ان سے عقیدت تھی۔ اس نے فورا ماتمی لباس پہنا اور اپنے گھر گئی۔ مسز سیوک دوڑ کر اس سے گلے ملیں اور ماں بیٹی نے مل کر ایشور سیوک کی لاش پر خوب آنسو بہائے۔

رات کو جب ماتمی دعوت ختم ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے تو مسز سیوک نے صوفیہ سے کہا۔ بیٹی تم اپنا گھر ہوتے ہوئے دوسری جگہ رہتی ہو۔ کیا یہ ہمارے لیے شرم وافسوس کی بات نہیں ہے؟ یہاں اب تمھارے سوا اور کون وارث ہے؟ پربھو کا اب کیا ٹھکانہ گھر آئے یا نہ آئے۔ اب تو جو کچھ ہو تمھیں ہو۔ ہم نے اگر سخت بات کہی ہوگی تو تمھارے بھلے کے لیے۔ میں کچھ تمھاری دشمن تو ہوں نہیں۔ اب اپنے گھر میں رہو۔ یوں آنے جانے کے لیے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ رانی صاحب سے مل آیا کرو۔ پر رہنا یہیں۔ خدا نے اور تو سب ارمان پورے کر دیے۔ تمھاری شادی بھی ہو جاتی تو بے فکر ہو جاتی۔ پربھو سیوک جب آتا دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں کا ماتم کم نہیں ہوتا۔ اب وقت گزارنا مناسب نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب کی تمھاری شادی ہوجائے اور گرمیوں میں ہم سب دوتین ماہ کے لیے منصوری چلیں۔

صوفیہ نے کہا۔ جیسی آپ کی مرضی کرلوں گی۔

ماں: اور کیا صوفی۔ زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ہماری زندگی کا کیا بھروسہ۔ تمھارے بڑے پاپا یہ ارمان لیے ہی چلے گئے۔ تو میں تیار کروں؟

صوفیہ: کہہ تو رہی ہوں۔

ماں: تمھارے پاپا سن کر پھولے نہ سمائیں گے۔ کنور ونے سنگھ کی میں برائی نہیں کرتی۔ بڑا جوانمرد تھا مگر بیٹی اپنے ہم مذہب شخص کی بات ہی کچھ اور ہے۔

صوفیہ: ہاں اور کیا۔

ماں: تو اب رانی جانہوی کے یہاں نہ جاؤ گی نہ؟

ماں: آدمیوں سے کہہ دوں۔ تمھاری چیزیں اٹھا لائیں؟

صوفیہ: کل رانی صاحبہ خود ہی بھیج دویں گی۔

مسز سیوک خوش خوش دعوت کا کمرہ صاف کرنے گئیں۔ مسٹر کلارک ابھی وہیں تھے۔ انھیں بھی یہ مژدہ سنایا۔ سن کر پھڑک اٹھے۔ باچھیں کھل گئیں۔ دوڑے ہوئے صوفیہ کے پاس گئے اور بولے۔ ''صوفیہ تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ آہا میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ مگر تم ایک بار اپنے منہ سے میرے سامنے کہہ دو۔ تم اپنا وعدہ پورا کروگی۔

صوفیہ: کروں گی۔

ابھی بہت سے لوگ موجود تھے پس مسٹر کلارک صوفیہ کو پیار نہ کر سکے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور ہوائی قلعے بناتے اپنے گھر گئے۔

علی الصباح صوفیہ کا اپنے کمرہ میں پتہ نہ تھا۔ تلاش شروع ہوئی۔ مالی نے کہا کہ میں نے انھیں جاتے تو نہیں دیکھا پر جب یہاں سب لوگ سوگئے تھے تو ایک بار پھاٹک کھلنے کی آواز آئی تھی۔ لوگوں نے سمجھا کہ کنور بھرت سنگھ کے یہاں گئی ہوگی۔ فوراً ایک آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہاں بھی پتہ نہ تھا۔ بڑی ہل چل مچی۔ کہاں گئی۔

جان سیوک: تم نے رات کو کچھ کہا سنا تو نہیں تھا؟

مسز سیوک: رات کو تو شادی کی بات چیت ہوتی رہی۔ مجھے تیاریاں کرنے کو بھی کہا۔ خوش خوش سوئی۔

جان سیوک: تمھاری سمجھ کا قصور تھا۔ اس نے تو اپنے دل کی بات ظاہر کردی۔ تم کو جتا دیا کہ میں کل نہ ہوں گی۔ جانتی ہو۔ شادی سے اس کا مطلب کیا تھا۔ فدا ہوجانا! اب ونے سے اس کی شادی ہوگی۔ جو یہاں نہ ہوسکی وہ بہشت میں ہوگی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ تم نے رات کو شادی کا تذکرہ چھیڑ کر اسے خوف زدہ کردیا۔ جو بات کچھ دنوں میں ہوتی وہ آج ہی ہوگئی۔ اب جتنا رونا ہو رو لو۔ میں تو پہلے ہی رو چکا ہوں۔

اتنے میں رانی جانھوی آئیں۔ آنکھیں روتے روتے سرخ ہوگئی تھیں۔ انھوں نے ایک خط مسزسیوک کے ہاتھ میں رکھ دیا اوز ایک کرسی پر بیٹھ کر منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

یہ صوفیہ کا خط تھا۔ ابھی ڈاکیہ نے دیا تھا۔ لکھا تھا:۔

مادر محترمہ۔ آپ کی صوفیہ آج دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ جب ونے نہ رہے تو یہاں میں کس کے لیے رہوں؟ اتنے روز تک دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتی رہی۔ سمجھتی تھی کہ کتب کے مطالعہ میں اس دکھ بھری یاد کو غرق کردوں گی۔ اور اپنی زندگی کو خدمتی فرائض کی انجام دہی میں گزاردوں گی۔ مگر میرا پیارا ونے مجھے بلا رہا ہے۔ میرے بغیر اسے وہاں ایک لمحہ بھی چین نہیں ہے۔ اس سے ملنے جاتی ہوں۔ یہ جسم ہی میرے اور ان کے درمیان میں حائل ہے۔ اسے میں یہیں چھوڑدوں گی۔ اسے میں گنگا کو سونپے دیتی ہوں۔ میرادل بشاش ہے۔ پیر اُڑے جارہے ہیں۔ خوشی روئیں روئیں میں سمارہی ہے۔ اب جلد ہی مجھے ونے کے درشن ہوں گے۔ آپ میرے لیے غم نہ کیجئے گا۔ مجھے کھوجنے کی بے فائدہ کوشش بھی نہ کیجئے گا۔ کیونکہ جب تک یہ خط آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ صوفیہ کا سر ونے کے قدموں پر ہوگا۔ مجھے ایک زبردست طاقت کھینچے لیے جارہی ہے۔ اور بیڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹتی جارہی ہے۔ ماما اور پاپا سے کہہ دیجئے گا۔ کہ صوفیہ کا بیاہ ہوگیا۔ اب اس کی فکر نہ کریں۔''

خط کے ختم ہوتے ہی مسزسیوک دیوانہ وار کرخت لہجہ میں بولیں۔ تمھیں بس کی گانٹھ ہو۔ میری زندگی کو برباد کرنے والی میری اُمیدوں کو پامال کرنے والی، میری عزت بگاڑنے والی کالی ناگن تمھیں ہو۔ تمھیں نے اپنی شیریں کلامی سے اپنی چال بازی سے اپنی جادوگری سے میری سیدھی سادی صوفیہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور آخر اسے تباہ کردیا۔ یہ تمھیں لوگوں کو ترغیب وتحریک کا نتیجہ ہے کہ میرا لڑکا آج نہ جانے کہاں اور کس حالت میں ہے۔ اور میری لڑکی کا یہ حشر ہوا۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملادیے۔

وہ اسی حالت غیظ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتیں کہ مسٹر جان سیوک ان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچ لے گئے۔ رانی جانھوی نے ان نالائم اور اہانت آمیز الفاظ کا

کچھ جواب نہ دیا۔ مسز سیوک کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں اور پھر بلا کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

مسز سیوک کی تمام خواہشوں پر پالا پڑ گیا۔ اس روز سے پھر انھیں کسی نے گرجا جاتے نہیں دیکھا۔ وہ پھر کبھی گاؤن اور ہیٹ پہنے ہوئے نہیں دکھائی دیں۔ پھر یوروپین کلب میں نہیں گئیں۔ پھر انگریزی دعوتوں میں شریک نہیں ہوئیں۔ دوسرے دن علی الصباح پادری پم اور مسٹر کلارک ماتم پرسی کے لیے آئے۔ مگر مسز سیوک نے دونوں کو وہ پھٹکار سنائی کہ اپنا سامنہ لے کر واپس گئے۔ خلاصہ یہ کہ اسی روز سے ان کی عقل میں فتور آگیا۔ دماغ اتنی سخت چوٹیں نہ سہ سکا۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔ مگر زندہ درگور۔ انسانوں کی صورت سے نفرت ہوگئی۔ کبھی ہنستی ہیں، کبھی روتی ہیں، کبھی ناچتی ہیں، کبھی گاتی ہیں۔ کوئی سامنے جاتا ہے تو دانت نکالے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔

رہے مسٹر جان سیوک۔ وہ مایوسانہ استقلال کے ساتھ صبح سے شام تک اپنے تاجرانہ مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ انھیں اب دنیا میں کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں۔ دولت سے انھیں بے غرضانہ محبت ہے۔ کچھ وہی محبت جو اولیائے کرام کو خدا سے ہوتی ہے۔ دولت ان کے لیے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ خود مقصد ہے۔ نہ دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ نفع بھی روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے یا نہیں۔ اس میں شک ہے۔ ملک میں کوچہ کوچہ۔ دوکان دوکان۔ اس کارخانہ کے سگار اور سگریٹوں کی کثرت ہے۔ وہ اب پٹنہ میں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کیونکہ صوبہ بہار میں تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دولت کی ہوس علم کی ہوس کی طرح آسودہ نہیں ہوتی۔

(50)

کنور ونے سنگھ کی بہادرانہ موت کے بعد رانی جانھوی کا جوش دوناہوگیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگیں۔ ان کے روئیں روئیں سے غیر معمولی سرگرمی ظاہر ہونے لگی۔ عالم ضعیفی کی کاہلی شباب کی تیزی میں تبدیل ہوگئی۔ انھوں نے کمر بستہ ہوکر سیوا سمیتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ رنواس چھوڑ کر میدان عمل میں

قدم رکھا اور اتنے جوش سے کام کرنے لگیں کہ سمیتی کو جو فروغ کبھی نہ حاصل ہوا تھا وہ اب ہوا۔ روپیہ کبھی اتنا زیادہ نہ تھا اور نہ والنیٹروں کی تعداد ہی کبھی اس قدر کثیر تھی۔ ان کا خدمتی دائرہ بھی کبھی اتنا وسیع نہ تھا۔ ان کے پاس جتنی ذاتی دولت تھی۔ وہ سب سمیتی کو وقف کر دی ہے حتی کہ اپنے لیے ایک زیور بھی نہ رکھا۔ سنیاسی کا بھیس لے کر دکھا دیا کہ موقع پڑنے پر عورتیں کتنا کام کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر گنگولی کی اُمیدواریاں بھی بالآخر اپنی برہنگی میں ظاہر ہوگئیں۔ انھیں معلوم ہوگیا کہ موجودہ حالت میں کوئی امید رکھنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے کونسل میں مسٹر کلارک کے خلاف بڑا واویلا مچایا مگر وہ سب نالہ صحرا ثابت ہوا۔ مہینوں کی بحث اور سوالوں کی بھر مار سب بے سود ہوئی۔ وہ گورنمنٹ کو مسٹر کلارک کی تنبیہ کے لیے مجبور نہ کر سکے۔ اس کے برعکس مسٹر کلارک کے عہدہ میں ترقی ہوگئی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اتنے برانگیختہ ہوئے کہ آپے میں نہ رہ سکے۔ وہیں بھری سبھا میں گورنر کو خوب سخت سست کہا۔ یہاں تک کہ صدر صاحب جلسہ نے انھیں بیٹھ جانے کو کہا۔ اس پر وہ اور بھی گرم ہوئے اور صدر صاحب کی بھی خبر لی۔ اس پر صدر نے انھیں کونسل ہاؤس سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور پولیس سے مدد لینے کی دھمکی دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا غصہ اب بھی فرو نہ ہوا۔ وہ بگڑ کر بولے۔ آپ حیوانی طاقت سے مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ میں جواز و انصاف کی قوت نہیں ہے۔ آج میرے دل سے وہ اعتقاد اٹھ گیا جو گزشتہ چالیس برسوں سے مجھے تھا کہ گورنمنٹ انصاف کی طاقت سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ آج اس طاقت کی قلعی کھل گئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا اور ہم گورنمنٹ کو اس بے حجابانہ اور برہنہ شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ صرف ہم کو پیل کر تیل نکالنے کے لیے ہماری ہستی مٹانے کے لیے، ہماری تہذیب وانسانیت کا خون کرنے کے لیے، ہم کو غیر محدود زمانہ تک چکی کا بیل بنائے رکھنے کے لیے، ہم پر حکومت کی جارہی ہے! اب تک جو کوئی مجھ سے ایسی باتیں کرتا تھا تو میں اس سے لڑنے پر آمادہ ہوجاتا تھا۔ میں رپن۔ ہیوم اور بسنٹ وغیرہ کی تعریف کر کے اسے لاجواب کر دینے کی کوشش کرتا تھا مگر اب معلوم ہوگیا کہ مقصد سب کا ایک ہے۔ صرف حصول کے ذرائع میں

فرق ہے۔

وہ زیادہ نہ بولنے پائے پولیس کا ایک سارجنٹ انھیں وہاں سے باہر نکال لے گیا۔ اور ممبر بھی وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ پہلے تو لوگوں کو اندیشہ تھا کہ سرکار ڈاکٹر گنگولی پر مقدمہ چلائے گی مگر شاید کارکنان متعلقہ کو ان کی پیرانہ سالی پر رحم آگیا خصوصاً اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسی روز گھر آتے ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔

وہ اسی دن وہاں سے روانہ ہوگئے اور تیسرے روز کنور بھرت سنگھ سے آملے۔ کنور سنگھ نے کہا۔ تم تو اتنے غصہ ور نہ تھے۔ یہ تمھیں ہو کیا گیا؟

گنگولی: ہوکیا گیا۔ وہی ہوگیا جو آج سے چالیس برس قبل ہونا چاہیے تھا۔ اب ہم بھی آپ کا ساتھی ہوگیا۔ اب ہم دونوں سمیتی کا کام کھوب حوصلہ سے کرے گا۔

کنور: نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا۔ ونے کے ساتھ سب چلا گیا۔ جاھنوی البتہ آپ کی مدد کریں گی۔ اگر اب تک کچھ شک تھا تو آپ کے اس طرح چلے آنے سے وہ دور ہوگیا کہ سیوا سمیتی سے حکام اعلیٰ بدظن ہیں اور اگر میں اس سے علیحدہ نہ رہا تو مجھے اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہماری قسمت میں غلامی ہی لکھی ہوئی ہے......

گنگولی: یہ آپ کو کیسے یقین ہوا؟

کنور: حالات کو دیکھ کر اور کیا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی رہیں گے تو میں اپنی جائداد کیوں تلف کروں؟ جائداد بچی ہے گی تو ہم اس معذوری کی حالت میں بھی اپنے غریب بھائیوں کے کچھ کام آسکیں گے۔ اگر وہ بھی نکل گئی تو ہمارے دونوں ہاتھ کٹ جائیں گے۔ ہم رونے والوں کے آنسو بھی نہ پوچھ سکیں گے۔

گنگولی: آہا۔ تو کنور ونے سنگھ کی موت بھی آپ کے اس بیڑی کو نہیں توڑ سکا۔ ہم سمجھا تھا۔ اب آپ چھوٹ گیا پر دیکھتا ہے۔ تو وہ بیڑی ویسا ہی آپ کے پیروں میں پڑا ہوا ہے۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہم کیوں جائداد والون پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ تو اپنی جائداد کا گلام ہے۔ وہ کبھی سچائی کا لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ جو سپاہی سونے کا اینٹ گردن میں باندھ کر لڑنے چلے وہ کبھی نہیں لڑ سکتا۔ اس کو تو اپنے اینٹ کا پھکر لگا رہے

گا۔ جب تک ہم لوگ موہ کا تیاگ نہیں کرے گا ہمارا مطلب کبھی نہ پورا ہوگا۔ ابھی تک ہم کو کچھ سک تھا پر وہ بھی مٹ گیا کہ جائداد والا آدمی ہمارا مدد کرنے کے بدلے الٹا ہمیں نکسان پہنچائے گا۔ پہلے آپ نراس والا تھا۔ اب آپ جائداد والا ہوگیا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی بددلی کے ساتھ وہاں سے اٹھے اور جانھوی کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ انھوں نے دیکھتے ہی ہنس کر ان کی تعظیم کی۔ پھرکہا۔ اب تو آپ بھی میرے رفیق ہوگئے۔ میں جانتی تھی کہ ہم لوگ ایک نہ ایک روز آپ کو ضرور کھینچ لیں گے۔ جن میں خودداری کا جذبہ ہے۔ ان کے لیے وہاں جگہ نہیں ہے۔ وہاں انھیں کے لیے جگہ ہے جو یا تو خود غرض ہیں یا اپنے کو دھوکا دینے میں مشاق۔ ابھی یہاں دو ایک روز آرام کیجئے گانا؟ میں تو آج کی گاڑی سے پنجاب جا رہی ہوں۔

گنگولی: آرام کرنے کا وکھت تو اب کریب آگیاہے۔ اس کا کیا جلدی ہے؟ تب بہت آرام کرے گا۔ ابھی تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے گا۔

جانھونی: کیا کروں۔ بیچاری صوفیہ نہ ہوئی ورنہ اس سے بڑی مدد ملتی۔

گنگولی: ہم کو تو اس کا حال وہیں ملا تھا۔ اس کی جندگی اب دکھ میں کٹتا۔ وہ کھتم ہوگیا۔ یہ بہت اچھاہوا۔ پریم سے نراس ہوکر وہ کبھی سکھی نہیں رہ سکتاتھا۔ کچھ بھی ہو وہ ستی تھا اور ستی کا یہی دھرم ہے۔ رانی اندو تو آرام سے ہے نا۔

جانھوی: وہ تومہیندر کمار سے پہلے ہی روٹھ کر چلی آئی تھی۔ اب یہیں رہتی ہے۔ وہ بھی تو میرے ساتھ جارہی ہے۔ اس نے اپنی ریاست کے انتظام کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کرنا طے کیاہے۔ جس کے پریسڈنٹ آپ ہوں گے۔ اسے ریاست سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

اتنے میں اندو آگئی اور ڈاکٹر گنگولی کو دیکھ کر انھیں نمسکار کر کے بولی۔

''آپ خود آگئے۔ میرا تو ارادہ تھا کہ پنجاب ہوتے ہوئے آپ کی خدمت میں بھی حاضرہوں۔''

ڈاکٹرگنگو نے کچھ کھانا کھایا اور شام کے وقت تینوں آدمی یہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کے دلوں میں ایک ہی لگن تھی۔ ایک ہی آگ تھی۔ انھیں ایشور پر پورا

بھروسہ تھا۔

کنور بھرت سنگھ اب پھر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر وہی سیر و شکار ہے۔ وہی رئیسانہ تکلفات، وہی امیرانہ نخرے، وہی نمود ونمائش۔ ان کے مذہبی اعتقاد کی جڑ اُکھڑ گئی ہے۔ اس زندگی کے بعد اب ان کے لیے لامتناہی خلا اور غیر محدود نیستی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دنیا ناپائدار ہے۔ عقبیٰ بھی ناپائدار ہے۔ جب تک زندگی ہے ہنس کھیل کر گزار دو۔ مرنے کے پیچھے کیا ہوگا سوکون جانتا ہے؟ دنیا سدا اسی طرح رہی اور اسی طرح رہے گی۔ اس کا انتظام نہ کسی سے ہو سکا ہے نہ ہوسکے گا۔ بڑے بڑے دانا، بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے رِشی منی مر گئے اور کوئی یہ بھید نہ جان سکا۔ ہم محض جیو ہیں اور ہمارا کام فقط جینا ہے۔ حب الوطنی، انسانیت، خدمت، ایثار، یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اب ان کے مایوس دل کو انھیں خیالات سے تسکین ملتی ہے۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے۔ پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعد ازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ دینک ٹریبون چنڈی گڑھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔